

سینس ڈائجسٹ کا مقبول سلسلہ

روتہ کی سوداگر

PDFBOOKSFREE.PK



PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY

www.pdfbooksfree.pk

سپس ڈائجسٹ میں شائع ہونے والا دلچسپ ترین سلسلہ

مذہبوں کی کہانی، ہوش مندوں کے لئے

ایک نوجوان کی خودکشت جو انہوں کے ہاتھوں برباد ہو کر منزل کا نشان کھو بیٹھا تھا۔ ان نوجوانوں کی داستان عبرت جن کی پرورش رشوت کے مال سے ہوئی تھی۔ ان ذر پرستوں کا احوال جنہیں سونے چاندی کی خیرہ کن چمک نے پیاکی سے محروم کر دیا تھا۔ موت کے ان سوداگروں کا ماجرا جو اپنے بھوں کو اپنے ہی ہاتھوں زہر پارہے ہیں۔

مقبول ترین کہانی کا راقلم عظیم کے قلم سے

موت کے سوداگر

دسواں حصہ

ترتیب و پیشکش: سعید خان



PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

کتابیات پبلی کیشنز

پوسٹ بکس نمبر 23 رمضان چیمبر زلموریا اسٹریٹ آئی آئی چندر گپروڈ کراچی 74200

خليفة علي

ایک نوجوان کو خود نوشت۔
 ذاتی طور پر حاذق نہ تھا اور وطن
 شہر شہر تک درباروں میں
 نوجوان کا شعر ہو گیا مگر
 بھی اپنی طرف سے کوئی
 جوا بھی تک جاری ہے۔

”اس دور میں ہوں۔ اس دوران میں ہم واپس لوٹ آئیں گے۔“

اور کشادہ ذہن پھلانگتا ہوا آٹا ٹانا میں اپنے کمرے کے بند دروازہ کے سامنے پہنچ گیا۔ چند ثانیوں تک بیسوت رہنے کے بعد شیر شاہ بھی لپٹکا ہوا میرے پیچھے آگیا تھا۔

میری مضطربانہ دھچک کے جواب میں اندر سے سلطان شاہ کی جھلٹائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”کون ہے؟ دروازہ مت توڑو۔ میں آ رہا ہوں“ اس نے اندر سے دروازہ منقٹل کیا ہوا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی میں نے بے اختیار ہو کر، والمانہ انداز میں اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ کر سینے سے لگا لیا۔ سلطان شاہ سمجھ ہی نہ سکا کہ میں اتنا جذباتی کیوں ہو رہا تھا۔

”خدا کا شکر ہے کہ تم صحیح سلامت ہو۔“ میں اس کے ساتھ اسی حالت میں کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا ”دروںہ میں تو فکر مند ہو گیا تھا کہ کیسں تم آگ میں نہ گھر گئے ہو۔“

”ہم نے تمہیں اس مکان میں چھوڑا تھا۔ تم یہاں کب اور کیسے پہنچ گئے؟“ شیر شاہ نے میرے تہجرے کو ناکافی سمجھتے ہوئے ایک ہی فقرے میں پوری صورت حال کی وضاحت کر ڈالی۔ ”دیر! وہاں کس وقت پہنچی تھی؟“ شیر شاہ کے خاموش ہوتے ہی میں نے سوال کر دیا۔

سلطان شاہ بے ساختہ ہنس پڑا اور بولا ”تم دونوں بے درپے سوالات کئے جا رہے ہو۔ کم از کم مجھے جواب دینے کا موقع تو دو۔ اب بوکھلانے کی کیا ضرورت ہے؟ میں زندہ و سلامت تمہارے سامنے موجود ہوں۔ دراصل وہاں جو کچھ ہوا“ اس میٹھوڑے داری مجھ پر ہی آئی ہے۔“

”وہی تو میں بھی جانتا چاہتا ہوں کہ صورت حال یک بیک تمہارے قابو سے باہر کیسے ہو گئی؟“ میں نے آرام سے صوفے پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔ میرے اشارے پر شیر شاہ بھی بیٹھ چکا تھا۔ ”وہرا کا سایہ بھی نظر نہیں آیا۔ یہ سارا کیا دھڑا ای بد نصیب ملازم کا تھا جو اپنے کمرے میں بندھا ہوا بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ وہ بہت بری موت مرا ہے۔ خود مصیبت اور آگ میں کھرا ہوا ہونے کے باوجود اس کا شہر دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔“

”اب تجس برحانے کے بجائے پوری کمائی ہی سنا ڈالو تو زیادہ بہتر رہے گا۔“ شیر شاہ نے کہا۔ ”باس کو تمہاری طرف سے ناقابل بیان پریشانی لاحق ہو گئی تھی جو کمائی سن کر ہی دور ہو سکتی ہے۔“ سلطان شاہ بسزیر بیٹھتے ہوئے بولا ”دراصل میں نے میرا کبر خان کے پالتو طوطے کا گلا کاٹ کر اس کا خون احتیاط سے ایک پیالے میں جمع کر لیا تھا جو کچن ہی میں موجود تھا.....“

”یہ کس طوطے کا ذکر ہے؟“ شیر شاہ نے اس کی بات کاٹ کر پوچھا۔

میں نے برا سامنہ بنا کر اسے گھورا اور کہا ”پہلے اسے اپنی بات پوری کر لے دو۔ یہ جرح بعد میں کر لیں۔ وہ تاج چکا ہے کہ وہ میرا کبر خان کا پالتو طوطا تھا اور تم اس کا شجرہ جاننا چاہ رہے ہو۔“

وہ شرمسار ہو کر خاموش بیٹھا رہا اور سلطان شاہ پھر بولنے لگا۔ ”میرے نزدیک اہم نکتہ یہ تھا کہ میرا کبر خان کے بے گناہ ملازم کو ہلاک نہ کیا جائے بلکہ اسے ہوش میں آتے ہی اس قدر خوفزدہ کیا جائے کہ وہ فرار ہونے کے بعد دوبارہ اصرار نہ کرنے کی ہمت نہ کر سکے۔ تمہارے چلے جانے کے بعد‘ غیر متوقع طور پر وہ جلد ہی چلے چلے لگا۔ اس کے ہوش میں آنے کے آثار دیکھتے ہی میرے ذہن میں ایک نئی تدبیر آئی۔ میں نے کچن میں جاکر طوطے کا خون اپنے دہانے کے ارد گرد لگایا اور دوبارہ اس کے سر پر سوار ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ہوش میں آیا تو مجھے دیکھتے ہی خوفزدہ ہو گیا۔ میں نے کسی خونخوئی کے سے انداز میں اس کی کھوپڑی کو بار بار چومتے ہوئے اسے آزاد کیا اور اسے بتایا کہ مجھے انسانی مغز اور کھوپڑیاں‘ غذا کے طور پر بہت پسند ہیں۔ میں نے جب اسے اپنے ساتھ لے جاکر میرا کبر خان کی بغیر سر کی لاش دکھائی تو وہ بد خواص ہو گیا۔ میں نے اسے ڈرانے کے لئے مزید کہا کہ اس کے مالک کا منفر چھوٹا تھا اس لئے ہو سکتا ہے کہ صبح ہونے تک اس کی بھی باری آجائے۔ میرے چرے اور آکبر کی جلی ہوئی گردن پر لگے ہوئے خون کی بنا پر شاید اسے یقین ہو گیا کہ وہ کسی آدم خور کے ہتھے چڑھا چکا ہے۔ اس سے فضول باتیں کرتے ہوئے میں نہ صرف نشے میں ہونے کی اداکاری کرتا رہا بلکہ میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ انسانی مغز اور بری میں زبردست شمار ہوتا ہے۔ اگر مجھے اس کا خیال نہ ہوتا تو میں اس کے مالک کو ٹھکانے لگانے کے بعد گتھوں سوتا رہتا۔ میں دانستہ اس کی طرف سے بے پروائی اختیار کر کے اسے ڈھیل دیتا رہا جس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا اور وہ متوقع طے ہی دروازہ کھول کر فرار ہو گیا۔ دروازہ منقٹل کر کے منہ ہاتھ دھوئے میں مصروف ہو گیا کہ باہر نکلنے کے قابل ہو سکوں۔ لیکن اسی اثنا میں میرے تختوں میں پڑول کی بو آئی جسے میں نے نظر انداز کر دیا۔“

”تھوڑی دیر بعد پڑول کی بو تیز ہو گئی تو مجھے تشویش ہونے لگی۔“ قدرے توقف کے بعد اس نے دوبارہ بتانا شروع کیا۔ ”میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ باہر کوئی کارروائی ہو رہی ہوگی۔ میں مختلف کمروں میں جھانکتا پھر رہا تھا کہ اچانک باہر سے بھق کی ایک زوردار آواز آئی جیسے آتش گیر مادے کے کسی ذخیرے نے آگ پکڑ لی ہو۔ اسی کے ساتھ کھڑکیوں پر پڑے ہوئے دیڑ پر دڑوں کے پیچھے سے تیز روشنی اندر پڑنے لگی۔ اس وقت مجھے ہوش آیا اور میں تیزی سے عقبی دروازے کی طرف دوڑا۔ دروازہ کھولتے ہی ہوا کے زور سے شعلے اندر آنے لگے اور فضا میں دلخراش انسانی چیخیں سنائی دیں۔ گھر میں دیوانہ وار پھرانے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ مکان کے چاروں طرف پڑول ڈال کر آگ لگائی گئی تھی۔ کئی مقامات پر وہ آگ مکان کے اندر داخل ہو چکی تھی۔ پردوں کے ساتھ ہی قالین اور خشک فرنیچر بھی دھڑا دھڑ جلتا شروع ہو گیا تھا۔ میں بدقت تمام ایک ایسے مقام تک پہنچنے میں کامیاب

سے شدید تشویش اور فکر لاحق تھی لیکن اس سے ملاقات ہونے کے بعد مجھے غزالہ کی فکر دامن گیر ہو گئی تھی۔ وہ ویرا کی سفالت و قید میں تھی۔ اس بار ویرا کے عزائم بھی بہت سنگین تھے۔ وہ شہر میں موجود تھی یا سرک کے راستے وہاں سے ایران کے لئے روانہ ہو چکی تھی، یہ امر یقینی تھا کہ وہ اپنے پیغام کے مطابق، میرا کبر خان کی خیریت معلوم کرنے کی کوشش ضرور کرتی اور جب اسے معلوم ہوتا کہ میرا کبر خان بد قسمتی کی زد میں آچکا ہے تو وہ لانا ساری ذمہ داری مجھ سے منسوب کر کے غزالہ کے ساتھ بد سلوکی پر قتل جاتی۔ ان امکانات کی وجہ سے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ ہم جلد از جلد ویرا تک پہنچیں۔

اس وقت مجھے اول خان کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی تھی اگر وہ کراچی میں موجود ہوتا تو اس کی مدد سے ویرا کے گرد گھیراؤ کیا جاسکتا تھا۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہوتی کہ اول خان اپنے رسوخ سے کام لے کر کسی سرکاری یا نیم سرکاری ادارے سے کسی پہلی کا پڑ کا بندوبست کر سکتا تھا جس کے ذریعے کراچی سے، جب کے راستے کو سنہ جانے والی نیم پختہ اور ناپختہ سرک پر ایک طویل پرواز کر کے چند گھنٹوں میں یہ پتا چلایا جاسکتا تھا کہ سیاہ کار اس راستے پر مئی تھی یا نہیں۔

سیاہ فورڈ کے دیکھ لئے جانے کی صورت میں سارا کھیل وہیں ختم ہو سکتا تھا۔ اونچے اونچے ریشیلے نیلیوں اور چٹائی سسٹلوں کے درمیان سے گزرنے والی نام نہاد سرک پر سفر کرنے والے لوگ، کسی بھی فضائی مشن کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ فضا سے کارروائی کر کے، غزالہ کو اس کی تحویل سے آزاد کرایا جاسکتا تھا۔

دوسری طرف اول خان کی نفرتی شہر میں پھیل کر سیاہ فورڈ کی تلاش کی بھرپور مہم شروع کر سکتی تھی۔ لیکن یہ بد قسمتی ہی تھی کہ وہ کسی ناکورہ جرم کی پاداش میں شہید نہ کیا جاسکا تھا۔

میں نے اس امکان پر بھی غور کیا کہ اول خان میرا ذاتی دوست نہیں تھا۔ اس سے میری ملاقات ایک اہم افسر کے ایما پر ہوئی تھی جسے جانو انجی کے آدمیوں کے ہاتھوں، محفوظ ماموں اور ان کے لواحقین کے انتقامی قتل کی تفتیش پر مامور کیا گیا تھا۔ بعد میں اول خان کے خلوص اور ذاتی خوبیوں کی بنا پر میرے اور اس کے تعارف نے گہرے ذاتی مراسم کی صورت اختیار کر لی۔ ایک صورت یہ بھی ہو سکتی تھی کہ میں اسٹیشن ٹانک فورس میں اول خان کے عہدے پر آنے والے نئے شخص سے پرانے حوالوں سے ملاقات کر کے اس کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کرتا لیکن وہ کوئی سہل کام نہیں تھا۔ اول خان کے جانشین سے تعارف حاصل کرنے کے بعد میں اسے مطمئن کرنے کا پابند ہو جاتا جس کی وجہ سے میری آزادی متاثر ہوتی جب تک وہ مطمئن ہوتا، ویرا میرے ہاتھ سے نکل سکتی تھی۔

دوسری طرف اول خان بہت ہوشیار اور فراخ دل آدمی تھا۔

ہوا جہاں آگ کا زور کم تھا۔ میں شعلوں کو عبور کر کے باہر نکلا تو اکبر خان کا ملازم ایک طرف پڑا ہوا بری طرح بلبلا رہا تھا۔ اس کے کپڑوں میں آگ لگی ہوئی تھی اور احاطے میں جا بجا پٹرول کے خالی کین بکھرے ہوئے تھے۔ میں ابھی تک یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اکبر کے مکان میں اتنا زیادہ پٹرول کیوں موجود تھا اگر ایک بات یقینی نظر آ رہی تھی کہ مکان کے گرد پٹرول ڈالتے ہوئے، غالباً اس کا لباس بھی پٹرول میں بیگ گیا تھا اور جب اس نے مکان کو نذر آتش کرنے کی کوشش کی تو اس کے لباس نے بھی آگ پکڑ لی۔ جب میں نے اسے دیکھا تو وہ آگ میں جھلس کر ناقابل شناخت ہو چکا تھا اور چند ہی لمحوں کا مسلمان تھا۔

”وہاں سے نکلتے ہی تم سیدھے ہو مل بھاگ آئے؟“ میں نے پوچھا۔

”اس وقت میرے اوسان خطا ہو چکے تھے۔ ہولناک شعلوں میں زندہ بل جانے کا تصور ہی لرزہ خیز تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ تم اپر پورٹ کا پٹرولنگا کرویں واپس آؤ گے لیکن اس ڈراؤنے تجربے سے گزرنے کے بعد مجھ میں وہاں رکے رہنے کی ہمت نہیں تھی۔ آگ بجھ گئی۔ وہاں بھیڑ لگی شروع ہو گئی تھی۔ میرے وہاں رکے میں کچھ خطرات بھی مضمر تھے اس لئے میں زسری سے ٹیکسی پکڑ کر ہو مل چلا آیا۔ میرا خیال ہے کہ گھوڑ فارم کے اثرات سے نبات پانے کے بعد وہ گزرے ہوئے واقعات کو فراموش کر بیٹھا تھا۔ میرے خون آلود چہرے اور ہاتھوں کے ساتھ ہی اپنے ٹانگ کا بے جان دھڑ دیکھ کر وہ سمجھا ہو گا کہ میں کوئی آدم خون جاتی مخلوق ہوں جسے آگ ہی سے فدا کیا جاسکتا ہے اور وہ آتش زنی کی کارروائی میں ملوث ہو گیا۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے نیم مفلوج ذہن میں بحیرا العقول طلسماتی کانیوں کا وہ تصور جاگ اٹھا ہو کہ میرے جلنے ہی اس کا آقا اپنے سر سمیت دوبارہ زندہ ہو سکتا تھا۔“

”یہ سب فضول باتیں ہیں۔ اگر وہ کوئی عام گھریلو ملازم ہوتا تو اپنی جان بچنے پر خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا اور اپنی ساری وفاداریوں کے باوجود بگٹ کسی محفوظ جگہ پر پناہ کی طرف بھاگ لیتا۔ اس نے وہاں رک کر جو خوفناک حرکت کی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شہر کا کوئی کارندہ تھا۔ وہ اپنی حماقت اور کم فہمی کی وجہ سے مارا گیا ورنہ وہ اکبر کی موت کا انتقام لے کر اپنے بڑوں کے سامنے سرخرو ہو سکتا تھا۔“

”تم نے ویرا کے بارے میں کیوں سوال کیا تھا؟“ سلطان شاہ نے پوچھا۔

”اس کا کہیں سراغ نہیں مل سکا۔ میرا کبر خان کی سیاہ فورڈ بھی اہل ہے۔“

”اس کا مطلب ہوا کہ ہم جہاں تھے، وہیں کھڑے ہوئے ہیں۔“ میرے جواب سے اسے ناہوشی ہوئی تھی۔

جب تک سلطان شاہ سامنے نہیں آیا تھا، مجھے اس کی طرف

سے بات کرتی تھیں ضرور اسے ہٹا لیا جانے کا مشورہ دیتا۔
وہ کھسکے ہوئے انداز میں ہنس کر رہ گیا۔ کیونکہ میری وضاحت نے اسے لاجواب کر دیا تھا۔

سینڈو کی موت بلکہ قتل کے بعد اسے مافیا میں ابھرنے کا نیا نیا موقع ملا تھا۔ مقامی مافیا میں چیف کے بعد میری دوسری پوزیشن تھی۔ اس نے شیر شاہ میرے ساتھ رہ کر اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا وہ سنہری موقع گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ شرف آباد والے فلیٹ کے اہتمام سے واقعے اور پھر راضی روز پر تاجے کی بدترین ناکامی نے بھی اسے سخت سے دوچار کیا ہوا تھا۔ اس لئے اس نے میرے ساتھ رکے رہنے پر خاصا اصرار کیا لیکن اس کی موجودگی میری سرگرمیوں سے میل نہیں کھاتی تھی۔ اس لئے میں نے جتنی کے ساتھ اسے روانہ کر دی دیا۔

اس کے چلے جانے کے بعد میں نے سلطان شاہ کے ساتھ کھل کر تبادلہ خیال شروع کر دیا۔

ایران سے اہم ایسی آلات اور ساز و سامان کی پاکستان منتقلی کے ذکر پر اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ اس کے لئے یہ بات تشریح نامک تھی کہ اس قدر اہم کارروائیوں کی خبریں دشمنوں تک کیسے پہنچ جاتی ہیں۔ وہ یہ بات بھول رہا تھا کہ پاکستان کے خلاف ایک سپر پاور کی پروردہ شہی میدان میں اتار دی ہوئی تھی جسے جدید ترین ایجادات اور سولتوں تک رسائی حاصل تھی۔ سیٹلائٹ فون، چپ کے ذریعے نقل و حرکت کی نگرانی اور کارڈز یا مینٹرنگ یونٹ کی کارکردگی کی کمائیاں وہ خود سن چکا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ کموڈ کے لئے در آمد کئے جانے والے ساز و سامان کو کڑی دیکھ بھال کے بعد موقع پر پہنچایا جاتا ہے کیونکہ ان میں ایسے خفیہ سیزر چسپائے جانے کے امکانات دن بہ دن قوی ہوتے جا رہے تھے جو ہزاروں میل دور سے فائر کئے جانے والے میزائلوں کی رہنمائی کر سکیں اور ان تمام کارروائیوں میں کسی نہ کسی طرح اور کہیں نہ کہیں ضرور ملوث تھی۔

کافی دیر کی بحث کے بعد مجھے اس نکتے پر قائل ہونا پڑا کہ غزالہ کا تحفظ بے شک میرا ذاتی معاملہ تھا لیکن ایران اور پاکستان کے درمیان اہم ترین نوعیت کے ساز و سامان کا تبادلہ ایک بہت بڑا قومی مسئلہ تھا۔ جسے اپنی ذات تک محدود رکھنا بھرانہ غفلت کے مترادف تھا۔ وہ معاملہ فوری طور پر ملکی سلامتی کے ذمے داروں کے علم لایا جانا ضروری تھا تاکہ اس محاذ پر تمام ترقیاتی دسائل کو بروئے کار لا کر سازش کو ناکام بنایا جاسکے۔

شہی کے مقابلے میں، میں پیشہ افغانی جنگ لڑتا رہا اور اسے بھاری نقصانات پہنچا کر کامیابی کے ساتھ اپنا دفاع کرتا رہا۔ البتہ اول خان سے ملاقات ہونے کے بعد صورت حال یکسر بدل گئی۔ اسی کے ساتھ ساتھ شہی کی ناکامیوں کے تناسب میں بھی اضافہ ہو گیا جس میں مارا سرکاری موت اور گھوڑا کریم کے واقعات سرفہرست

اس نے میری کمزوریوں سے واقف ہونے کے باوجود کبھی ان جرائم کے حوالے سے مجھ پر دباؤ ڈالنے کی کوشش نہیں کی جو ملکی قوانین کے تحت عین جرائم میں شمار کئے جاتے تھے۔ وہ سمجھتا تھا کہ مجھ سے ایسے جرائم حالات کے ناقابل برداشت دباؤ کے تحت سرزد ہوئے تھے اور ان کے ارتکاب میں کسی ذاتی منفعت کے حصول سے زیادہ ملکی مفاد کے تحفظ کا جذبہ کارفرما تھا۔ اگر اس کا جانشین اس سے مختلف ذہنی ساخت کا مالک ہوتا تو ان ہی جرائم کی بنیاد پر مجھے نہ صرف خود رگید سکتا تھا بلکہ اس کے بعد پولیس کے حوالے بھی کر سکتا تھا۔ اس لئے میں نے اس خیال کو اپنے سر سے جھٹک دیا۔

یہ غیبت تھا کہ اس بار ویرا کی تلاش کی مہم پر نکلنے سے پہلے میں نے سینٹھ حبیب جیوانی کو ایک حد تک اعتماد میں لے لیا تھا۔ اسے غزالہ کے معاملے کی بھنگ بھی نہیں ملنے دی تھی۔ لیکن یہ ضرور بتایا تھا کہ میں ویرا کا قتلہ پیشہ کے لئے ختم کرنا چاہتا تھا۔ اسی وجہ سے میں نے شیر شاہ کو اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ میرا بر خان سے ہونے والی گفتگو سے اسے دور رکھ کر میں نے غزالہ کا معاملہ سینڈو رازی میں ہی رکھا تھا۔ اس کے نزدیک سارا معاملہ صرف اتنا تھا کہ ویرا خطرہ بھانپ کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ لیکن ہم نے اس کے ایک اہم حصے کو جنم واصل کر دیا تھا جبکہ دوسرا اپنی ہی غلطی کی وجہ سے الگ میں جل مرا تھا۔

لیکن درحقیقت بات صرف اتنی ہی نہیں تھی۔ میں سلطان شاہ سے ایسی ساز و سامان کی چھ سوئٹھ ورنی اس کھپ کے بارے میں بات کرنا چاہتا تھا جو ایران سے پاکستان منتقل کی جانے والی تھی۔ میرے لئے جہاں غزالہ کی ذات اہم تھی وہیں یہ بھی ضروری ہو گیا تھا کہ ویرا کا آخری مشن کامیاب نہ ہو سکے۔

”تم نے بھی ساری رات جاتے ہوئے گزاری ہے۔“ اپنا ذہن بتا لینے کے بعد میں نے مکاری اختیار کرتے ہوئے شیر شاہ سے کہا۔ ”سلطان شاہ کی خبریت مل جانے کے بعد ویرا کی تلاش کی مہم رہ جاتی ہے جو کسی بھی وقت شروع کی جاسکتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم جا کر آرام کرو، ضرورت ہوئی تو میں تمہیں طلب کر لوں گا۔ چیف سے بات ہو تو اسے اب تک کے حالات سے آگاہ کر دیتا۔“

”اور اگر اس نے یہ جانتا چاہا کہ ویرا ایران کی طرف کیوں فرار ہوئی ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”اول تو ہمیں اب تک یقین ہی نہیں ہوسکا کہ وہ یہیں ہے یا بھاگ گئی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے آدمی نے مارنے سے پہلے ہمیں غلط راہ پر ڈالنے کی کوشش کی ہو اور اگر وہ فرار ہو بھی گئی ہے تو چیف یہ اہتمام سوال ہرگز نہیں کرے گا۔ یہ سوال ہر اس منزل کے بارے میں کیا جاسکتا ہے جدھر ویرا گئی ہو۔ بالفرض یہ سوال کر ہی لیا جائے تو میں یہی کہہ سکوں گا کہ اس نے اپنی منزل کے انتخاب میں مجھ سے کوئی مشورہ لینے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ وہ مجھ

ہے۔" میں نے کہا۔
 "تمہارا کوئی نہ کوئی نام بھی ہوگا؟" اس کی آواز سپاٹ اور مٹھ
 سے عاری تھی۔

"بہتر ہو تا کہ میری بات براہ راست اسی سے ہوتی۔ اب تم
 مٹھرتو بتائے دیتا ہوں کہ میرا نام ڈینی ہے۔"
 "ڈینی!" دوسری طرف سے اس کی تحرزدہ آواز ابھری۔ "تم
 کہاں ہو؟ تم سے تو میں بھی ملنے کا متنی ہوں۔ میرا نام مظفر ہے اور
 اول خان کی جگہ میرا ہی تقرر ہوا ہے۔"

اس کی حوصلہ افزا گفتگو سن کر میرا دل خوش ہو گیا۔ یہ عجیب
 اتفاق تھا کہ میں اس سے تعارف حاصل کرنے کے لئے معتبر
 حوالوں کی تلاش میں تھا جبکہ وہ خود ہی میری تلاش میں تھا۔

"میں اسی شرمیں ہوں اور تم ہی سے بات کرنا چاہ رہا تھا لیکن
 تعارف نہ ہونے کی وجہ سے مجید کا سہارا لینا چاہ رہا تھا۔ میرا خیال
 ہے کہ اب اس کی نیند خراب کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔"
 "اگر تم جاگ ہی رہے ہو تو یہاں کیوں نہیں آجاتے مگر اگر

کانی پیٹے ہوئے باتیں کرنے میں بڑا لطف آئے گا۔"
 "اس وقت جاگنا میری مجبوری ہے لیکن تم اپنے اسٹیشن کے
 سب سے سینئر افسر ہونے کے باوجود، اپنے ماتحتوں کو سلا کر خود
 کیوں جاگ رہے ہو؟ میرا اندازہ تھا کہ مجھے تم تک رسائی میں
 خاصی دشواری ہوگی۔"

ریسیور پر اس کا جاندار قہقہہ سنائی دیا۔ "اول خان کی
 رپورٹوں میں تمہاری بہت تعریف کی گئی ہے لیکن تم اتنے سمجھدار
 معلوم نہیں ہوتے۔ ارے بھائی، ہمارا ڈپلن سویلین اداروں سے
 بہت زیادہ مختلف ہے۔ وہاں ماتحتوں پر سارا بوجھ رہتا ہے اور افسر
 عیش کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ دیر سے آتے ہیں، جلدی چلے جاتے
 ہیں، دفترمیں دوستوں کی تحفیلیں سجاتے ہیں لیکن ہم لوگ اپنے
 ماتحتوں کے لئے ہر وقت مثالیں قائم کرنے میں لگے رہتے ہیں۔
 اس وقت میں باہر سے آنے والی کچھ رپورٹوں کا انتظار کر رہا ہوں
 کیونکہ رپورٹیں لینے کے بعد مجھے اگلی ہدایات بھی دینی ہیں۔"
 "لیکن تم مجھ سے کیوں ملنا چاہ رہے تھے؟" میں نے قدرے
 توقف کے بعد سوال کیا۔

"دلبر اور محب وطن لوگوں سے مل کر مجھے ہمیشہ خوشی ہوتی
 ہے۔ ویسے مجھے اس وقت ایک اہم معاملہ بھی درپیش ہے۔ ہو سکتا
 ہے کہ تم اس سلسلے میں میری کوئی مدد کر سکو۔ اگر تم آتے ہو تو اب
 فون پر وقت ضائع نہ کرو۔ میرے پاس صرف دو لائیں ہیں جن پر
 کسی بھی لمحے اہم پیغامات آنے کی توقع ہے۔"

"ٹھیک ہے، میں آ رہا ہوں۔ مگر میرا ایک دوست میرے ساتھ
 ہو گا۔" میں نے کہا۔

"اگر میری یادداشت دھوکا نہیں دے رہی تو شاید اس کا نام
 سلطان شاہ ہے؟" اس کی قیاس آرائی سنائی دی۔

تھے۔ اس اعتبار سے میرے سامنے اسٹیشن ٹارگٹ فورس کے علاوہ
 کوئی ایسا ادارہ نہیں تھا جس کی مدد سے ویرا کے عزائم کو ناکام
 بنانے میں مدد مل سکتی۔

ان دنوں صوبے میں امن وامان کی صورت حال بہت زیادہ
 مجبوری ہوئی تھی۔ سنگین جرائم میں پولیس کے ٹھکے کی کالی بھڑوں
 کے ٹوٹے ہوئے کی خبریں آتے دن چلی آ رہی تھیں۔ جن کی وجہ
 سے نیک نام پولیس افسران دل برداشتہ ہو کر بہت زیادہ جھلائے
 ہوئے تھے۔ ان قانونی اداروں کا اپنا طریقہ کار تھا۔ وہ لوگ گناہ
 ذرائع سے ملنے والی بڑی سے بڑی خبر کو نظر انداز کر دینے کے لئے
 آزاد تھے۔ انہیں اعتماد میں لینے کے لئے سب سے پہلے ہی ضروری
 تھا کہ میں خود ان کے سامنے آتا اور جب اطلاع دہندہ سامنے
 آجائے تو وہ لوگ اس کی لائی ہوئی خبر سننے سے پہلے اس کا ماضی کرید
 کر اس کی اہلیت، ذمہ داری اور حب الوطنی کے بارے میں اپنے
 اندازے قائم کرتے ہیں۔ اس کے بعد کہیں خبر سننے اور اس پر کوئی
 کارروائی کرنے کی نوبت آتی۔ جبکہ میں ان کے ابتدائی معیار پر ہی
 پورا نہیں اترتا تھا۔ میرے جن جرائم کو اول خان نے نظر انداز
 کر دیا تھا وہ میری ناقابلِ جگہ گرفتاری تک کا جواز بن سکتے تھے۔

خاصی سوچ بچار کے بعد میں نے ایس ایف کے اسٹیشن فور
 ٹون کرنے کا ارادہ کر لیا۔ جو ویرا کے حشوکہ مکان میں قائم تھا۔
 اول خان اپنے تبادلے تک وہیں مامور تھا اور اس کے ماتحت عملے
 کے کچھ افراد بھی مجھ سے بخوبی واقف تھے۔ میرا ارادہ تھا کہ ان
 تحت افراد ہی کے ذریعے اول خان کے جائشیں سے غائبانہ
 حشوکہ حاصل کیا جائے تاکہ وہ میری باتوں پر فوری توجہ دے کر
 مجھ پر کارروائی کا آغاز کر سکے۔

اس وقت صبح کے چار بجے کا عمل تھا۔ میں نے ہوٹل کے
 سوچ بورڈ آپریشن سے درخواست کر کے لائن اپنے کمرے ہی میں۔ لے
 لیا۔ اس کی آواز نیند کے حشوکہ سے بوجھل ہو رہی تھی اس لئے اس
 نے آسانی کے ساتھ میری درخواست قبول کر لی تاکہ دوبارہ حشوکہ
 خرگوش کے حشوکہ لے سکے۔

میرا اندازہ تھا کہ مجھے دوسری طرف سے جواب کے لئے کافی
 دیر تک انتظار کرنا ہو گا۔ لیکن ادھر سے دوسری ہی شخص پر ریسیور
 اٹھالیا گیا۔ بولنے والے کی دھنگ آواز اور شائستہ لہجے سے ظاہر
 ہوا تھا کہ وہ کوئی تعلیم یافتہ اور سلجھا ہوا شخص تھا جو پوری رات
 گزر جانے کے باوجود اتنی صحن فون سے لگا ہوا بیٹھا تھا۔

"میں مجید سے بات کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے اول خان کے
 ایک ماتحت کا نام لیتے ہوئے کہا۔

"مجید اس وقت گہری نیند سویا ہوا ہے۔ کوئی ضروری کام ہو تو
 اسے جگا دیا جائے۔" وہی بھاری آواز ابھری۔ "تم کون بول رہے
 ہو اور اتنی صحن مجید سے کیا کام ہے؟"

"میں اول خان کا ایک گہرا دوست ہوں۔ مجید مجھے جانتا

اس کے دفتر میں دونوں فون کالیں پر رکھے ہوئے تھے وہ صوفے پر دراز ہو گیا اور ہم نے بھی اس کے قریب ہی صوفوں پر نشستیں سنبھال لیں۔ ہمارے بیٹھے ہی ایک شخص بھاپ اڑائی کافی کی پیالیوں کے ساتھ دیگر لوازمات بھی لے آیا اور ہمارے سامنے میز پر پھینے لگا۔

”بات صرف کافی کی ہوئی تھی۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
”لیکن تم نے بہت زیادہ تکلف کر لیا۔“

”تھوڑی دیر میں ناشتے کا وقت ہونے والا ہے۔ تم آگئے ہو تو تمہارے بھانے میں بھی ناشتا کراؤں گا ورنہ صبح ہونے تک خالی کافی ہی پر گزارہ ہوتا رہتا۔“ اس نے بے تکلفانہ لہجے میں کہا۔

کافی نوشی بلکہ ناشتے کے دوران میں وہ ماضی کے ان واقعات کا ذکر لے بیٹھا جن میں اول خان نے قابل رشک کارکردگی کا مظاہرہ کر کے ایس نی ایف کو سرخروئی دلانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

”لیکن اس کا تاول عجیب وغریب انداز میں ہوا۔“ ایک بار موقع ملنے ہی میں اپنے دل کی بات زبان پر لے آیا۔ ”یہ محسوس ہوا جیسے اسے کسی بد عملی کے الزام میں سزا دی گئی ہو۔“

”یہ تم سے کس نے کہہ دیا؟“ اس نے حیرت سے پوچھا پھر کہا۔ ”اس نے اپنی بھاط سے بڑھ کر کام کیا تھا۔ آپریشن گھوڑا کریک نے سفارتی حلقوں میں کھلبلی مچا رکھی ہے۔ پریس کو دانستہ اندھیرے میں رکھا جا رہا ہے۔ اگر اول خان کو فوری طور پر یہاں سے نہ ہٹایا جاتا تو دشمن اس کی جان لینے میں کامیاب ہو جاتا۔ اسے تو ترقی کے ساتھ ہی ہماری اقتدار عام دیا گیا ہے۔“

”یہ میرے لئے نئی خبر ہے۔“ میں نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ ”اس کے یہاں سے تبادلے پر اس کی بیوی بہت پریشان تھی اور یہ مجھے سے قاصر تھی کہ اسے آرام یا تیاری کا کوئی وقفہ دے۔
لیبر پرائیٹ ابہر کیوں بھیج دیا گیا۔“

”میں نے سنا ہے کہ یہاں سے جاتے ہوئے اول خان بھی اور اس تھا لیکن نیا چارج لینے کے ساتھ ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ اس کی شخصی عزت افزائی کی گئی ہے۔ اس نے اپنی فیملی بھی اپنے پاس بلا لی ہے اور میں اس کے چھوٹے ہوئے معاملات میں سرکھپا رہا ہوں جن کا کوئی سرا نہیں ملتا۔“

”میرا خیال ہے کہ گھوڑا کریک اس کا آخری کیس تھا جیسے وہ مکمل کر کے گیا ہے۔“

”غلام رسول کے اغوا کا معاملہ ابھی تک لاٹنل ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ اسے مجرموں کے کسی منظم گروہ نے پولیس کی تحویل سے آزاد کرایا ہے لیکن وہ کہاں ہے یہ کوئی نہیں جانتا نہ ہی اس کے اغوا کا کوئی مقصد سامنے آیا ہے۔ اب ہم بھی اس کیس پر کام کر رہے ہیں مگر کامیابی کی امید نہیں ہے۔“

”اگر اگلے چند روز تک کراچی انٹروپورٹ کی کڑی نگرانی کی

میں بے اختیار ہنس پڑا۔“ تم میری توقع سے زیادہ ذہین اور حاضر باع ہو۔“ میں فون کا سلسلہ منقطع کر کے گھوما تو سلطان شاہ کے چہرے سے مسرت چھوٹی پڑ رہی تھی۔

”یہ بہت اچھا ہوا کہ تمہارا ایس نی ایف سے پھر رابطہ استوار ہو گیا۔ اول خان کے چلے جانے کے بعد ہم بالکل بے آسرا اور ختم ہو کر رہ گئے۔ اب وہ ہمارے ہاتھ سے نہیں بچ سکے گا۔“

محم دوں نے پھرتی کے ساتھ اپنا علیہ درست کیا اور ظفر سے طے کے لئے روانہ ہو گئے۔

اسٹیشن فور میں اول خان موجود نہیں تھا۔ لیکن اس مکان کے گیٹ پر پہنچنے کے بعد ہمیں اس کی کئی کا کوئی احساس نہیں ہوا۔ محافظ انہی میں سے تھا جو ہمارے پرانے شناسا تھے۔ شاید ظفر اسے پہلے ہی ہدایت دے چکا تھا اس لئے جوں ہی میں نے ہیڈ لیمپس بجھائے اور اس نے ہمیں پچھانا، اتنی گیٹ کھول دیا گیا اور میں بلا روک ٹوک کار اندر لیتا چلا گیا جہاں ایس نی ایف کی تین گاڑیاں پہلے سے موجود تھیں۔

ہمارے کار سے اترتے ہی پہلے ایک صحت مند اور متوسط قامت شخص برآمدے میں آچکا تھا۔ اس نے نہایت تپاک کے ساتھ ہم دونوں کا استقبال کیا۔ خاص بات یہ تھی کہ اس نے محض تحریری رپورٹوں کی بنیاد پر ہم دونوں کو فردا فردا پہچان کر ہمارے ناموں سے مخاطب کیا تھا۔

اول خان ہی کی طرح وہ بھی فراخ دل اور خوش اخلاق تھا۔ اس سے مل کر یہ احساس ہوا کہ ہماری بہت پرانی شناسائی ہو۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ اسپیشل ٹاسک فورس جیسے مایہ ناز خفیہ ادارے کو اول خان کی ذات سے وابستہ سمجھ کر ہم نے ایک سنگین غلطی کی تھی۔ اچھے اور مستحکم اداروں کی خولی ہی یہی ہوتی ہے کہ اعلیٰ ترین عہدوں تک بہترین افراد کے آنے جانے سے اداروں کے استحکام اور کارکردگی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سارے کام طے شدہ ضابطوں کے مطابق اپنی نیج پر چلتے رہتے ہیں جبکہ ہمارے ملک میں اداروں کو بھول کر افراد کو ہیرو دینے کی ریت چلی ہوئی ہے۔ جو جہاں ہوتا ہے خود کو ناگزیر بنائے رکھنے کی بیماری میں مبتلا رہتا ہے۔ اس کے حواری اور خوشامدی وھول پیٹ پیٹ کر اس کی ناگزیریت کے افسانوی قصے تراشتے ہیں لیکن جب وہ اچانک ہی چلا جاتا ہے تو یہ عقدہ کھٹکتا ہے کہ اچھائیاں تو اب شروع ہوئی ہیں اس سے پہلے ہر طرف گول مال اور گھپلوں کی اندھیر مگرمی چل رہی تھی۔ ہم دونوں

اسی نظام کے پروردہ تھے۔ اس لئے اول خان کے تبادلے یا سزایابی پر یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ اس کے جاتے ہی اسپیشل ٹاسک فورس کا مقامی ڈھانچہ مندم ہو گیا تھا اور ہمارے لئے وہاں کے دروازے بیٹھ کے لئے بند ہو چکے ہوں گے لیکن وہاں کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ ایک فرد کے علاوہ وہاں کا مجموعی مزاج اور ماحول تک وہی تھا جو ہم پہلے دیکھ چکے تھے۔

لجے میں پوچھا۔

”یہ تو وہی جانتی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ وہ سڑک کے راستے ایران کی طرف روانہ ہو چکی ہے۔“

”تم اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہو؟“ اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

”حالات!“ میں نے کہا۔ اور پھر اسے ان واقعات کا خلاصہ سناتے لگا جو میرا کبر خان سے باز پرس کے بعد سے رونما ہوتے چلے آئے تھے۔ وہ حیرت سے منہ کھولے میری کہانی سن رہا تھا۔

”وہ کارائز پورٹ پر نہیں ملی اس لئے تم سمجھ رہے ہو کہ ویرا سڑک کے راستے ایران کی طرف روانہ ہو گئی ہوگی؟“ میری کہانی ختم ہونے پر اس نے تائید طلب لجے میں پوچھا۔

میں نے سگریٹ سگاتے ہوئے اپنا سر اثبات میں ہلادیا۔ کیونکہ ویرا کے بارے میں میرے پاس اور کوئی سراغ نہیں تھا۔

”تم سمجھو اس کارائز میک ماڈل رنگ اور نمبر بتاؤ میں ابھی وائر لیس پر سارے یونٹوں کے لئے پیغام نشر کر دیتا ہوں۔ وہ راست بہت خراب ہے“ اگر ویرا اور دوسری سے گئی ہے تو ہم چننے سے پہلے کوئی نہیں پہنچ سکے گی۔ وہ راستے میں جہاں بھی ہوئی وہیں دھری جانی گی۔ ہتھیاروں وغیرہ کی اسمگلنگ کے سدباب کے لئے اس روٹ پر ہمارے کئی پلانے تعینات ہیں۔ وہ کہیں نہ کہیں سے گھمیں گئے۔ بلو کر اس ڈیل کا معاملہ ہر چیز پر فوقیت رکھتا ہے۔ ہمیں سب کچھ بھول بھال کر دیر انکو روکنا ہوگا۔ وہ کامیاب ہوئی تو ہمیں شدید جھکاٹ لگے گا۔“

”وہ تقریباً دس سال پرانی سیاہ فورڈ ہے۔“ میں نے بتانا شروع کیا، مگر میری بات ادھوری رہ گئی۔

”پرانی سیاہ فورڈ!“ اس نے اپنی ران پر زور سے ہاتھ مار کر مضطربانہ انداز میں دہرایا اور اضطرابی طور پر صوف چموز کر دیا ہو گیا۔ ”یہ اتنی اہم بات ہے اور تم مجھے اب بتا رہے ہو۔“

میں اسے حیرت سے سمجھوتے ہوئے بولا۔ ”یہ تم نے پوچھا ہی کب تھا جو یوں بگڑے ہو؟“

”نمبر..... مجھے نمبر بتاؤ اس کار کا!“ وہ مجھے جھنجھوڑتے ہوئے بولا ”ایسی ایک کار تو کل رات سے انڈین کاؤنسلٹ میں گئی ہوگی۔“ اور اب تک واپس نہیں لوٹی۔ وہ کار پہلی بار وہاں گئی ہے اس لئے مجھے تشویش تھی۔“

میں نے میرا کبر خان کا دیا ہوا نمبر دہرایا تو وہ مسرت سے اچھل پڑا۔ ”یہ بالکل وہی کار ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ویرا ابھی ہماری دسترس میں ہے۔ اب میں دیکھوں گا کہ وہ وہاں سے نکل کر کیسے پہنچتی ہے۔“

”تمنا! یہ جوش اور جذبہ قابل رشک ہے مگر ایک امکان اور بھی ہے۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔

”بولو بولو! جودل میں آ رہا ہے وہ کہہ ڈالو۔ پتا نہیں تم اور لیا

جائے تو کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔“ میں نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”ادھر ادھر وقت ضائع کرنے سے بچو حاصل نہیں ہوگا۔“

”اس کا مطلب ہے کہ اس بارے میں تم بہت کچھ جانتے ہو۔“ وہ صوفے میں پلو بدل کر بولا۔

”صرف اتنا کہ وہ کراچی ہی میں رکھا گیا ہے اور کسی بھی وقت اسے ملک سے باہر بھیجے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ اس کا معاملہ اس قدر پیچیدہ ہے کہ میری دانست میں اسے گرفتار کر کے عدالت میں لے جانے کے بجائے گولی مار دینا ہی بہتر رہے گا۔ وہ ایک بیک بہت سے ناپائیدہ لوگوں کا منظور نظر بن گیا ہے۔“

”ہماری حکومت بھی دیر پردہ اس کی تلاش میں ہے۔“ اس نے انکشاف کیا۔ ”وہ لوگ اسے سندھ میں بدامنی پھیلانے کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں ماسرکار کی موت کا علم نہیں ہے۔ لیکن اس کی طویل مدت کے لئے ان کی صفوں میں تشویش کی لہر دوڑا رہی ہے۔ ہمیں ان پر کوئی کام نہ کرنا ہی بہتر ہے۔“

”تو کیا آج کل انڈین کار سلیٹ کی خبرانی دوسری ہے؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔

”ہاں!“ اس وقت بھی میں ان ہی لوگوں کی رپورٹوں کا انتظار کر رہا ہوں جو ان خبیثوں کی بو پر لگے ہوئے ہیں۔“ وہ بولا۔ ”انہوں نے یہاں ضرورت سے زیادہ علم رکھا ہوا ہے جس میں جوان خوروں اور بے باک لڑکیوں کی بہتات ہے جو بارہ سوخ مقامیوں کو بہت آسانی کے ساتھ شیشے میں اتار لیتی ہیں۔ یہ فاضل علم دن رات لوگوں سے دوستیاں بنانے اور اپنا کام مکمل کرنے میں لگا رہتا ہے۔“

”دوسری طرف ویرا ابھی بھڑک اٹھی ہے۔“ میں نے اسے آگاہ کیا۔ ”آپریشن گھوڑا کرک کے کامیابی میں اس نے بہت اہم اور قابل تعریف کردار ادا کیا تھا۔ لیکن اس کے بعد ہی ہے وہ پھر اپنی اصل کی طرف لوٹ گئی ہے۔ اس بار وہ ایران میں ایسی سازو سامان کی چھ سوئیں ورنی ایک کھپ کر کتاہ کرنے کے درپے ہے جو ایران کی حکومت خیرگامی کے طور پر پاکستان کو دینے کا فیصلہ کر چکی ہے۔“

”اوہ!“ میرے انکشاف پر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ”تو ان لوگوں کو بلو کر اس ڈیل کے بارے میں بھی علم ہو چکا ہے؟ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم کتنے محاذوں پر اپنے دشمنوں کا مقابلہ کریں گے!“

”میرا خیال ہے کہ محاذ ایک ہی ہے۔“ میں نے پر تشویش لجے میں کہا۔ ”مشائقی کا پورا سفارتی عمل، میری کیسز اور اس کا سفارت خانہ اور ویرا ایک ہی پھیلی کے پنے بٹے ہیں اور ہماری سرزمین کے خلاف ان کے مفادات کیساں اور مشترک ہیں۔ وہ ایک جگہ مار کھاتے ہیں تو دوسری طرف پورا زور لگا دیتے ہیں۔“

”ویرا اب کہاں ہے اور کیا کر رہی ہے؟“ اس نے مضطربانہ

کیا جانتے ہو۔“

سوار تھے۔“ میں نے مسین امیز انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔
”میری اطلاعات تمہارے بیان کی تائید کرتی ہیں۔ ایک
خوبو، سفید فاق عورت کار چلا رہی تھی۔ اس کے برابر میں ایک
نوجوان مقامی لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔“ اس نے آگاہ کیا اور فوراً ہی
فون کی طرف متوجہ ہو گیا۔

فون پر اس نے کسی کو ہدایت دی کہ ٹرانسپیر ہر زہیر اور اور
بے سی دن کو بتادیا جائے کہ سیاہ فورڈ بہت اہم ہے۔ کاریا اس کے
مسافروں کے نظر آتے ہی اسے خبر کیا جائے۔
”پھر اب کیا ہو دگر ام ہے؟“ اس کے قدرے نارمل ہو جانے
کے بعد میں نے پوچھا۔

”یہ بات تو طے ہے کہ دیر ایساں سے نکل کر ایران کی طرف
نہیں جاسکے گی۔“ ظفر نے مضبوط اور پُر عزم لہجے میں کہا۔ ”البتہ
غزالہ کی رہائی کا معاملہ ذرا تاخیر نظر آتا ہے۔“

”میرا کبر خان پر اسرار حالات میں مرنیکا ہے۔ اس کی بغیر سر
کی لاش جل چکی ہے۔ اس کا گھروہ ملازم بھی جل کر مر گیا ہے اور
اس کی کار بھارتی کاؤ نیلیٹ میں موجود ہے۔ کیا اس بنیاد پر اپنے
خصوصی اختیارات کے تحت وہاں کوئی کارروائی نہیں کر سکتے۔“
میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر سنجیدگی سے کہا۔

وہ جیسے سے ہنس، ”تم بھول رہے ہو کہ ہم کوئی سرکاری
ملازم نہیں ہیں۔ اس سنے ہمارے کوئی اختیارات نہیں ہیں۔ ہم
جس کی لاٹھی اس کی بیٹیس کے اصول پر عمل کرتے ہیں اور اپنے

حرفوں کو پوری طاقت سے کچل کر غائب ہو جاتے ہیں۔ وارا دھچا
پڑے تو ہمیں نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ جو کچھ تم نے تجویز لیا اب اس
پر پولیس عمل کر سکتی ہے لیکن سفارتی معاملات میں بہت سی
پیچیدگیاں ہوتی ہیں انہیں دور کئے بغیر ضابطے کی کوئی کارروائی نہیں
کی جاسکتی۔ اس وقت تک وہاں کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔“

”معلوم افراد پر مشتمل کوئی مسلح گروہ وہاں حملہ آور ہو کر اپنا
کام دکھا سکتا ہے۔“ سلطان شاہ کا ذہن بھی اسی مسئلے میں الجھا ہوا
تھا اور اس کی تجویز قابل عمل بھی نظر آتی تھی۔

”سفارتی عمارت کا تحفظ، میزبان حکومت کی پوری ذمہ
داری ہوتی ہے۔ وہاں کوئی حملہ ہوا تو نہ صرف ہماری حکومت کی
بدنامی ہوگی بلکہ اس واقعے سے زبردست سیاسی اسکیٹل کھڑا
ہو جائے گا۔ دوسری طرف ہم اس عمارت کی ساخت سے ناواقف
ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کسی گورنر کارروائی کی افرا تقری میں غزالہ ہی
ہماری یا کسی اور کی گولیوں کا نشانہ بن جائے۔ اور اسے اٹھالانے کا
مقصد فوت ہو کر رہ جائے۔“ ظفر نے اس تجویز کے ہر پہلو پر روشنی
ڈالنے ہوئے کہا۔ ”بہترین صورت یہی ہوگی کہ صبر اور خاموشی کے
ساتھ ان کے باہر نکلنے کا انتظار کیا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ دیر
زیادہ دیر تک وہاں نہیں رکے گی۔ اگر اسے بلو کر اس میں تباہ کرنے
پر مامور کیا گیا ہے تو اسے بہت جلد اور بہت تیزی کے ساتھ حرکت

”میری منگیت کو اس نے پر غمال بنایا ہوا ہے اور اسے اپنے
ساتھ لئے پھر رہی ہے۔ ایران کے سفر میں غزالہ اس کے لئے کئی
دشواریاں کھڑی کر سکتی ہے۔ اس لئے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دیر
اسے انڈین کاؤ نیلیٹ میں چھوڑنے کی نیت سے وہاں گئی ہو اور
اس سے جان چھڑانے کے بعد کسی اور کاریں وہاں سے نکل گئی
ہو۔“

میری بات سن کر ظفر کو شدید ذہنی جھٹکا لگا اور وہ فوراً ہی اپنی
میز کی طرف بڑھ گیا۔ میرا نکتہ اپنی جگہ پر تھا لیکن یہ حقیقت تھی کہ
میرا کبر خان کی کار کا سراغ ملنے سے مجھے دلی مسرت ہوئی تھی۔ دیر
اور غزالہ میں سے کوئی بھی وہاں ہوتی یا نہ ہوتی لیکن یہ امید ضرور
بندھ چلی تھی کہ اس کاؤ نیلیٹ پر محنت کر کے ان کا سراغ لگایا
جاسکتا تھا۔

”جہاں تک میری معلومات کا تعلق تھا میری کینیز اور اس
کے دفاتر سے دیر کے گھرے مراسم تھے۔ لیکن گھوڑا کریک پر
الحید کے چکڑے جانے کے بعد ان مراسم میں یکجہت سرد مری
سرايت کر گئی تھی۔ لیکن بھارتی کاؤ نیلیٹ سے دیر کا کوئی رابطہ
نہیں تھا یا کم از کم اس نے مجھے اپنے کسی رابطے کی ہوا نہیں لگنے
دی تھی۔ جن دنوں ملا سرکار کے لئے ہتھیاروں کی کھپ کی فراہمی
کا معاملہ نیا نیا اٹھا تھا تو دیر نے اسلام آباد میں واقع بھارتی
سفارت خانے کے ایک افسر کا ذکر ضرور کیا تھا جس کا نام کرمل

میش پال تھا۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا تھا
کہ اس کی میش پال مناصت پر ”شی“ ملا سرکار کو لاٹھوں ڈال کر کے ہتھیار
دینے پر آمادہ تھی۔

لیکن میش پال کو سلطان شاہ نے اسلام آباد سے اغوا کر لیا تھا
اور آخر کار وہ موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ اس کے بعد دیر
بیش یہی ظاہر کرتی رہی تھی کہ بھارتی سفارت خانے یا کاؤ نیلیٹ
میں اس کا کوئی شناسا نہیں تھا۔ لیکن وہ غزالہ کے ساتھ جس بے
دھڑک انداز میں کاؤ نیلیٹ پہنچی تھی اس سے پتا چلتا تھا کہ اس
نے وہاں دیر پر وہ اپنے تعلقات قائم کئے ہوئے تھے۔ لیکن کسی برس
وقت کی پیش بینی میں اس نے وہ راز مجھ سے چھپایا ہوا تھا۔

”اس کار کے اندر جانے کے بعد اس عمارت سے دو گاڑیاں
روانہ ہوئی ہیں، ایک میں ڈرائیور کے ساتھ حملے کے تین ارکان
تھے، دوسری گاڑی میں تین مرد تھے اور ایک ہندوستانی عورت۔
اس کا مطلب ہے کہ دیر یا غزالہ میں سے کوئی بھی واپس نہیں
گیا۔“ ظفر نے میز پر پڑے ہوئے ایک کانفہ کا مطالعہ کرتے ہوئے
ہنس آگاہ کیا۔

”اگر تمہیں اتنی تفصیلی اطلاعات ملتی رہتی ہیں تو یہ بھی بتایا گیا
ہو گا کہ کاؤ نیلیٹ میں داخل ہوتے وقت سیاہ فورڈ میں کتنے لوگ۔“

میں آتا ہوگا۔

وہ ایک عجیب اتفاق تھا کہ ظفر سے ملاقات ہوتے ہی میری خاصی الجھنیں دھو گئی تھیں اور میں سڑک کے راستے کو سٹری طرف دھلتا ہوں گا اور وہ ترک کر کے بھارتی کاؤ نسلٹ پر اپنی توجہ مرکوز کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ جہاں پورے دھوکے کے ساتھ غزالہ کی موجودگی کی نشاندہی کی گئی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ ہماری عاجلانہ اور جذباتی تجویز کے مقابلے میں ظفر کی رائے صائب اور قابل عمل تھی۔

ایک نکتے پر متفق ہونے کے بعد ہم نے دیر کو گھیر کر غزالہ کو نکالنے کے منصوبے کے عملی پہلوؤں پر جوش و خروش سے تبادلہ خیال شروع کر دیا۔

پھر اچانک ہی فون کی تیز گھنٹی نے ہم تینوں کو بری طرح چونکا دیا۔ پہلی گھنٹی بند ہونے سے پہلے ہی اس کمرے میں گھبراہٹ مچا گیا۔ کیونکہ ظفر نے فوراً ہی ریسیور اٹھا لیا تھا۔

وہ خاموشی سے دوسری طرف کی رپورٹ لے رہا تھا اور اس کے جبرے بے تیزی سے بدلتے ہوئے تاثرات دیکھ کر میرا دل اچسک رہا تھا۔

وہ فوجی تھا، نہ نیم فوجی لیکن آدمی بہت کھڑا تھا۔ اس کا گفتگو کرنے کا انداز بھی ’اول خان‘ کی طرح دل کو موہ لینے والا تھا جس وجہ تھی کہ اس کے ساتھ چند ہی لمحوں کی رفاقت کے بعد کم از کم مجھے یہ محسوس ہونے لگا تھا جیسے وہ برسوں سے میرا دوست اور شہسار ہوا۔ اس کے بارے میں سلطان شاہ کے دلی جذبات تانے کا کوئی پیمانہ نہیں تھا لیکن اس کے انداز سے بھی یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بھی ظفر سے مانوس ہو چکا تھا۔

ظفر کی منٹ تک ریسیور کان سے لگائے، دوسری طرف کی گفتگو سنتا رہا۔ اس دوران اس نے اختصار کے ساتھ دونوں ہاں کرنے کے علاوہ کچھ نہیں کہا اور پھر خاموشی کے ساتھ ریسیور کی پل ڈال دیا۔

اس کے ہونٹ بھیچے ہوئے تھے، آنکھوں میں فکر و تشویش کے مائے لہر رہے تھے اور چہرے پر سختی کی علامات نمایاں تھیں۔ اس فون کال پر ظفر کا تردد آمیز رویہ غل و غلیظ دیکھنے میں نے اسے جھجھکا مناسب نہ سمجھا اور اس کے خود ہی بولنے کے انتظار میں وقت گزاری کے لئے ماچس کی تیلیوں سے کھیلنے لگا۔

”تمہارے آتے ہی واقعات میں تیزی پیدا ہو گئی ہے۔“ چند ثانیوں کے توقف کے بعد ظفر نے اونچی آواز میں بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے کہ وہ ضبیث میری اور تمہاری ملاقات کے انتظار میں خاموش بیٹھے ہوئے تھے ورنہ اتنی صبح حرکت میں آنے کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟“

میں خاموشی کے ساتھ کچھ دیر تک اس کے دوبارہ بولنے کا

انتظار کرتا رہا لیکن وہ کسی زخم خوردہ شیر کی طرح خاموشی اور تیزی کے ساتھ کمرے میں ٹھٹھا رہا۔ اس کے انداز سے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اپنے دفتر میں ہماری موجودگی کو یکسر فراموش کر بیٹھا ہو۔

آخر کار مجھے اس کو ٹھٹھانا پڑ گیا۔ ”میں سمجھ نہیں سکا کون لوگ حرکت میں آگئے ہیں؟“

وہ چونک کر میری طرف گھوما اور پچھلی ہنسی کے ساتھ بولا۔

”اسی کاؤ نسلٹ کے عملے کا ذکر ہے جہاں دیر انکھی ہوئی ہے۔“

تھوڑی دیر پہلے ایک ڈرائیور سیاہ فورڈ لے کر وہاں سے نکلا تھا۔

اس کے پیچھے عمارت سے ایک اسکوٹر سوار روانہ ہوا تھا جس کا

چوہا ہیلٹ میں پوشیدہ تھا۔ میرے آدمیوں نے دونوں کا تعاقب کیا

تو وہ لوگ میٹرو پول اور پل کائنٹی نیٹل سے ہو کر پولو گراؤنڈ کی

طرف چلے گئے اور سیاہ فورڈ میدان کے کنارے چوڑ کر، دونوں

آدمی اسی اسکوٹر پر واپس کاؤ نسلٹ کی طرف چلے گئے۔ میرا ایک

آدمی فورڈ کے پاس رک گیا۔ دوسرا اسکوٹر کا پیچھا کرتا رہا جب کہ

تین افراد پیشہ ور اور نشہ باز بھکاریوں کے روپ میں کاؤ نسلٹ کے

آس پاس کی فٹ پاتھوں پر جتے ہوئے تھے۔ میرے آدمی نے

میدان صاف ہونے پر سیاہ فورڈ کی تلاشی لینے کی کوشش کی تو ایک

دھماکے کے ساتھ کار کی ڈکی میں آگ لگ گئی جس نے پڑول کی ٹنگی

کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ نتیجتاً ہی دیکھتے وہ کار آگ کی نذر ہو گئی۔“

”اس کا مطلب ہے کہ دیر کو میرا کبر خان اور اس کے مکان

کے انجام کا ظلم ہو گیا۔“ میں نے ایک گھبراہٹ سے لے کر کہا۔ ”اس

کے بعد ہی ان لوگوں نے سیاہ فورڈ سے جھٹکارا حاصل کرنے کی

کوشش کی ہوگی کیونکہ اس کی وجہ سے ان کا اور میرا کبر خان کا

تعلق ثابت ہو سکتا تھا۔“

”دیرا کے گٹھ جوڑ سے وہ لوگ کوئی بڑا ہی کھیل کھیلنے کے چکر

میں نظر آ رہے ہیں۔ ان کی ریشہ دوانیوں کا سدباب کرنے کے لئے

ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔“

اس معاملے میں ظفر کی فکر مندی بالکل بجا تھی۔ وہ کوئی

سرکاری اہل کار نہیں تھا۔ قانونی طور پر اس کی بھی وہی پوزیشن

تھی جو میری تھی۔ اگر قانون سے ماوراسی کارروائی کے دوران

میں وہ خود یا اس کا کوئی ماتحت گرفت میں آجاتا تو اس کے ساتھ

بالکل وہی سلوک کیا جاتا جو عام قانون شکنوں کے ساتھ کیا جاتا

ہے۔ اسٹیشن ٹاکس فورس سے وابستگی کا وہ انکار کر سکتا تھا اور نہ

اس بنا پر کسی قانونی رعایت کا حقدار بن سکتا تھا۔ یہ اور بات تھی

کہ ایس بی ایف کی در پردہ سرپرستی کرنے والے پارسوخ افراد

ناہیدہ اور دیگر بلا کر مقدمہ گزرو کرادیے اور ان لوگوں کو قانون کے

چنگل سے نجات مل جاتی لیکن اس کنزرو قانونی پوزیشن کے باوجود

ظفر کی ذہنی ساخت کچھ ایسی تھی کہ وہ ملک کے خلاف ہونے والی

میں دے کر خود ایران کی طرف نکل جائے اور وہاں اپنا مشن پورا کرنے کے بعد دوبارہ غزالہ کو اپنے قبضے میں لے لے۔

مقدمہ کے لیے میری کیسنگز یا اس کے سفارتی کاروبار کے لیے کچھ ممنوعہ بنے ہوئے تھے۔ میرا کبر خان کی جاری قوت اس کے اکلوتے ملازم تک محدود تھی جسے وہ اپنے غزالہ کی قید کے لیے ناکافی تصور کیا ہو گا۔ ان حالات میں لے دے کر انڈین کاؤنسلٹ ہی رہ جاتا تھا جہاں دیر کی پڑائی کی جاسکتی تھی۔ ماضی کے خفیہ یا کمزور مراسم کو تقویت دینے کے لیے اس نے ان لوگوں کو ملا سربکار کی دردناک موت سے بھی تیار کر دیا ہو گا۔ وہ ایک قریبی پیر محل کے سفارت کار تھے۔ انہیں دیر آسانی کے ساتھ پیشہ میں آنا سکتی تھی۔ چند گھنٹوں کی قلیل سی مدت میں اس کی کامیابی کے ثبوت سامنے آچکے تھے۔ ان لوگوں نے دیر کو غزالہ سمیت قبول کر لیا تھا اور آخری خبریں آنے تک وہ دونوں اسی سفارتی مہارت میں مقیم تھیں۔ ان دونوں کے باہر نکلے بغیر دیر کو میرا کبر خان کے گھر پر آگ لگے کا علم ہو چکا تھا اور وہ معلومات یعنی طور پر کاؤنسلٹ کے کسی ملازم نے فراہم کی تھیں جس کے جواب میں دیر نے میرا کبر خان کی سیاہ فورت سے نجات حاصل کرنے کے لیے آتش زنی کا ہی سہارا لیا تھا۔ کار کو جلائے اسے دو فائدے حاصل ہوئے تھے۔ اول یہ کہ پولیس کی تحقیقات غلط راہ پر جاسکتی تھی۔ مکان اور کار کو یکساں طور پر نذر آتش کئے جانے کو کسی ایک ہی دشمن کی کارروائی قرار دینا بہت سہل ہوتا۔ دوسری طرف جلی ہوئی کار میں سے دیر وغیرہ کے نشانات انکھت تلاش نہیں کئے جاسکتے تھے۔ خاص دیر کی بحث و تکرار کے بعد ظفر کو میرے اندازوں سے اتفاق کرنا پڑا لیکن وہ دیر اور میری کیسنگز کے درمیان کشیدگی کا نظریہ قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔

میری کیسنگز نے میری آواز دیر کے ایک دوست کے طور پر سنی ہوئی تھی لیکن وہ میرے نام سے لاعلم تھا۔ اس لئے میں نے اسی وقت اسے خفیہ سے بیدار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

چوتھی گھنٹی بجنے پر مجھے دوسری جانب سے میری کیسنگز کی نیند سے بوجھل آواز سنائی دی۔

”مجھے تمہاری نیند خراب کرنے پر افسوس ہے۔“ میں نے ہماری اور بات کہتے میں کہا۔ ”لیکن ایسا کرنا ناگزیر تھا کیونکہ دیر معصومیت کے تحت مانا جاتا ہے۔“

دیر ادا نام سننے پر اس کی نیند کا فوہو گئی کیونکہ اس بار اس کی آواز صاف اور واضح ہو گئی تھی۔ ”دیر اگر تم کو بول رہے ہو؟ کیا میں کسی دیر کو مانا ہوں؟“

”انجان بننے کو شش۔“ کہو۔ ”میں نے سخت آواز میں کہا۔ ”دیر! کیا میری موت ہو گئی؟“ میں نے فون پر بات کرتی رہی ہے۔ میری آواز ابھی ہمارے لئے اجنبی نہیں ہے۔ اب بھی ہمارے حاشیے نے کام کرنا چھوڑا ہوا ہے۔ تو ہمیں وہ گفتگو ضرور یاد ہو گئی

کسی بھی سازش پر مضطرب ہوئے بغیر ہمیں رہ سکتا تھا۔ اس لیے نزدیک دیر اور انڈین کاؤنسلٹ کا گٹھ جوڑ بہت خطرناک ہو سکتا تھا۔

لیکن میرا خیال ظفر سے مختلف تھا۔ میری دانست میں اس وقت اصل اہمیت صرف دیر کی تھی۔ انڈین کاؤنسلٹ سے اس کے پرانے مراسم جیسے بھی رہے ہوں لیکن یہ بات یقینی تھی کہ اس نے ان لوگوں کو ملا سربکار جیسے اہم سیکرٹ ایجنٹ کی موت کی خبر نہیں پہنچائی تھی۔ دوسری طرف میری کیسنگز کے دفتر کی اپنی جوہریاں تھیں۔ وہ لوگ ملا سربکار کی موت کے سب سے بڑے گواہ تھے لیکن انہیں دشمنی کے بھارتی الزام سے بچنے کے لئے انہوں نے ملا سربکار کے بارے میں چپ ساہرہ رکھی تھی جس کے نتیجے میں بھارتی سیکرٹ سروس اور اس کے سفارتی گروہ کے پوری تہذیب کے ساتھ ملا سربکار کی تلاش میں لگے ہوئے تھے۔

میری طرف سے مایوس اور دل برداشتہ ہونے کے بعد دیر اور میری کیسنگز کی طرف نہیں کی تھی اس کے اسباب بہت واضح تھے۔ وہ لوگ سیاسی مالی اور معلوماتی اعتبار سے بہت مضبوط تھے۔ ان کا خفیہ سرانجامی کا نظام جدید ترین اور ناقابل شکست تھا اس لئے وہ دیر پر بالادستی قائم کرنے کی پوزیشن میں تھے۔ دیر ایک بار وہاں جا کر بہت بری طرح پھنس چکی تھی۔ اسے اہم مہمان قرار دے کر ’مصلح پہرے میں عملاً قیدی بنالیا گیا تھا اور اگر میری کیسنگز نے اسے گھوڑا کریم بیچنے کی حماقت نہ کی ہوتی تو دیر اس کے لئے ان لوگوں کی قید سے لکھنا محال ہو جاتا۔ الحید سے آنے والے ہتھیاروں کے پکڑے جانے کی ساری ذمہ داری دیر پر ڈال کر جی لائیڈ سے شکایت کی جاتی اور دیر کا مستقبل بے یقینی کا شکار ہو جاتا۔ یہ اور بات تھی کہ گھوڑا کریم سے میرے ساتھ نکل آنے کے بعد اس نے فون پر نہایت چالاکی و مکاری کے ساتھ میری کیسنگز کو خوفزدہ کر کے زبان بند رکھنے پر مجبور کیا تھا لیکن وہ اچھی طرح جانتی ہو گئی کہ وہ دوبارہ میری کیسنگز کے ہاتھ لگ گئی تو وہ اسے بے قابو کر کے اپنے اگلے پچھلے حساب بے باق کرنے سے نہیں چوڑے گا۔

مجھ سے دوبارہ بانی ہو کر اس نے غزالہ کو ایک بار انوارا کر لیا تھا لیکن اسی کے ساتھ اس کو بلو کر اس ذلیل تباہ کرنے کا مشن سونپا گیا تھا جس کے لئے دیر کو ایران کے اجنبی ماحول میں کام کرنا تھا۔ اس لئے اس مرحلہ پر غزالہ اس کے گلے کی چھچھوہ رہ گئی۔

اس نے دوستی کی آواز اور اعتماد میں غزالہ کو انوارا تو کر لیا تھا لیکن غزالہ سے یہ بات زیادہ دور تک پوشیدہ نہیں رہ سکتی ہو گی کہ وہ دیر کی قیدی بن چکی تھی۔ اگر دیر اسے اپنے ساتھ ایران لے جانے کی حماقت کرتی تو غزالہ بے سلا موقع ملنے ہی اس کی غیاربوں کا بھانڈا پھوڑ کر اسے پکڑا سکتی تھی۔ اسی کے ساتھ ساتھ غزالہ دیر کی گئی قیدی میں تھی۔ اب سرباشی کا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا اس لئے دیر اچھا رہی ہو گی کہ غزالہ کو کراچی ہی میں کسی کی تحویل

میں یولا۔ ”یہ سارے ہی انڈین ڈیلومیت، مکار سازشی اور کینہ پرور ہوتے ہیں۔ شری مان کل دیر تک ہلکی کھل پارتی میں پیتا پلاتا رہا لیکن اس نے ہلک کر بھی دیر کے بارے میں ایک لفظ نہیں بتایا۔ یہ میرا اور اس کا معاملہ ہے۔ میں اس مرد سے اچھی طرح منٹ لوں گا۔ وہ صبح اپنے گھر سے تاشا لینے کے لئے بی بی جاتا ہے۔ میں آج ہی اپنے آدمیوں سے اس کی مرمت کروا ڈالوں گا۔ اس معاملے کا ویرا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ شری مان نے میرے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے۔“

”میں ان سمجھیوں میں نہیں پڑتا۔“ میں نے بے زاری کا اظہار کرتے ہوئے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

ظفر اس دوران آنکھیں پجڑ کر حیرت سے مجھے گھورے جا رہا تھا۔ میرے فارغ ہوتے ہی وہ ایک دم پھٹ پڑا۔

”یہ تم نے کیا کیا کہ اسے دیرا کی کہیں گاہ کا پتا بتا دیا۔ اب وہاں کسی بھی لمحہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ تم ان امریکہ کی خود غرضی سے بے خبر ہو۔ کوئی بڑا مفاد سامنے آجائے تو یہ دشمن کے ساتھ اپنوں کو بھی بے رحمی کے ساتھ پس ڈالتے ہیں۔ اب کوئی گڑبڑ ہوئی تو اس کی ذمہ داری تم پر ہوگی۔“

”تم نے یلطفہ گفتگو سنی ہے اس لئے بگڑ رہے ہو۔“ میں نے حمل کے ساتھ کہا۔ ”پوری بات سنو گے تو خوش ہو جاؤ گے۔ پہلی بات یہ ہے کہ ویرا نے امریکہ کی لاطینی اقلیت کی ہوئی ہے۔“

”اچھی بات ہے کہ تمہارا ایک اندازہ درست ثابت ہو گیا۔“ اب دوسری بات بتاؤ۔“

اس کے تیر خراب تھے چہرے پر بھی برہمی کے آثار تھے لیکن اس کے ایک ایک لفظ اور انداز میں کوٹ کوٹ کر اپنائیت بھری ہوئی تھی اس لئے میں نے برا مانا۔ بغیر بات شروع کر دی۔

دو طرفہ گفتگو کا خلاصہ سن کر ان دونوں کی آنکھیں حیرت سے پھیلنے لگیں۔ مجھے خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ میری ایک سرسری سی فون کال کے نتائج اتنے سنسنی خیز اور حیرت ناک ثابت ہوں گے۔

جو ویرا نے نیپ کر لی تھی۔“

”خاموشی رہو! اس کی اضطرابی آواز ابھری۔“ امتحانہ باتوں کی ضرورت نہیں! یہ بتاؤ وہ مجھ سے کب اور کہاں ملنا چاہتی ہے؟ میں تو اس کے بارے میں یہ رپورٹ دیتا رہا ہوں کہ ہم اچانک اس کا سراغ کھو بیٹھے ہیں۔ اس طرح ملنا ہم دونوں کے حق میں نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ مجھ سے دور رہنا خود اس کے مفاد میں ہے۔ ایسی ہی کوئی ضروری بات تھی تو تمہارے بجائے وہ خود مجھ سے فون پر بات کر سکتی تھی۔ ملاقات کا مقام طے کرنے کے بجائے تم میرا پیغام اس تک پہنچانے ہو؟“

”میں حکم کا بندہ ہوں مسٹر کیمبرجی! میں نے ظفر کو آگے مار دیا ہے۔“ ویرا نے حکم دیا تو اس کا پیغام تم تک پہنچا دیا اب تم جو کہو گے وہ اسے سنا دوں گا۔ مجھے تمہارا جواب درکار ہے۔ اس وقت میں تمہیں کوئی مشورہ دینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔“

”تو پھر اس سے کہو مجھ سے فون پر بات کرے۔ یہ صرف میری نوکری ہی کا نہیں بلکہ میری اور اس کی زندگی کا بھی معاملہ ہے۔ اوپر والوں کی نظروں میں ویرا کی پوزیشن بہت مشکوک ہو چکی ہے۔ خود اس کا پاپ بھی ان ہی لوگوں میں شامل ہے۔“

”بہت بہتر۔“ میں نے کہا کیونکہ میں اپنے مطلب کی بات معلوم کر چکا تھا۔

”ویسے وہ آجکل کہاں ہوتی ہے؟“ اس نے جلدی سے پوچھا تھا۔ شاید اسے دھماکہ میں اپنی بات پوری کرتے ہی فون کا سلسلہ منقطع نہ کر دوں۔

اس کے سوال پر مجھے یاد آیا کہ ویرا کو بولھانے کے لئے کیوں نہ ہیری کیمبرجی کو اس سے بھڑا دوں۔ پھر میں نے پل بھر میں فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میرے خیال میں تم سے سمجھوتا جانے کے بعد رازداری کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی ہے۔ کل وہ کہاں ہوگی؟ اس بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن وہ اس وقت انڈین کاؤنسل میں آرام کر رہی ہے۔ چاہو تو تم خود ہی اسے فون کر لو۔“

”اوہ!“ ایک بار پھر اس کی اضطرابی آواز سنائی دی۔ ”یہ شری مان سنگھ بھی پکا بلاڈی باسٹڑ ہے۔ ہر وقت فون کر کے بلیک کیٹ لی اور اگلے پلان کے بارے میں پوچھتا رہتا ہے لیکن اس نے مجھے ہوا بھی نہیں لینے دی کہ ویرا اس کی گود میں چڑھی بیٹھی ہے۔“

میں نے نریش لیے میں اس کی بات کاٹ دی۔ ”زبان سنبھال کر بات کو! یہ نہ بھولو کہ میں اس کا خیر خواہ ہوں۔ شاید میں نے اس کا پتا کرکٹ کے کھیل کے بارے میں تو سمجھتا ہوں لیکن اس کی آدمی ہی۔ شری مان سنگھ کی آڑ لے کر تم نے ویرا کی مزید کوئی توہین کی تو میں تمہاری زبان کھینچ لوں گا۔“

”تم غلط سمجھ رہے ہو۔“ وہ فوراً ہی سنبھل کر مصالحتانہ لہجے

”مجھے اچانک ہی ان دونوں کو لا دینے کا خیال آیا تھا۔ اب وہ آپس میں ایک دوسرے کا خون چرنے کی فکر میں لگے رہیں گے اور ہم چین سے بیٹھ کر ان کا تماشا دیکھیں گے۔“ میں نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے آخر میں ایک قہقہہ کے ساتھ کہا۔

”ہیری کیمبرجی نے شری مان سنگھ کے معمولات کے بارے میں جو کچھ کہا وہ سو فیصد درست ہے۔“ ظفر نے میرے قہقہے کا اثر لئے بغیر فکر آہستہ آہستہ کیساتھ کہا ”وہ ڈینس اتھارٹی کے فیئر نو میں رہتا ہے اور روز صبح سات بجے اپنا تاشا لینے ڈینس مارکیٹ آتا ہے۔“ مجھے حیرت ہے کہ یہ لوگ آپس میں کمری دوستیاں رکھنے کے باوجود ایک دوسرے کے معاملات کی اتنی کڑی نگرانی کراتے ہیں۔“

مشتبہ آدمی سائے کی طرح اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔
اس کی باتوں میں بہت وزن تھا۔ بہری کو ہلکاتے ہوئے میں نے ان باریکیوں کا تصور تک نہیں کیا تھا لیکن وہ تیرہ میری کمان سے نکل چکا تھا جسے واپس لانا محال تھا۔

”اس نے جس طرح کل کی کاک ٹیل پارٹی کا ذکر کیا ہے اس سے ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ ویرا کی نقل و حرکت کے بارے میں لاطم ہے۔“ سلطان شاہ نے کہا۔ ”وہ سمجھ رہا ہے کہ ویرا اکل سے انڈیا کاؤنسلٹ میں ہے جبکہ وہ پچھلی رات ہی وہاں پہنچی ہے۔“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ ظفر نے آہستگی سے کہا۔ ”اصل بات یہ ہے کہ ڈینی نے سوچے سمجھے انداز میں بہری کے دل میں شریمان سنگھ کے لئے شہادت پیدا کر دی ہے۔ اور اب ہمیں شریمان سنگھ کی حفاظت کا کوئی نہ کوئی بندوبست کرنا پڑے گا۔ ہمارے ملکوں کے تعلقات ایسی سطح پر چل رہے ہیں کہ ان سنگھ کو کوئی کتا بھی کاٹ لے تو شور مچا دیا جائے گا کہ پاکستانی حکومت نے بھارتی سفارت کار پر کتے چھوڑ دیے۔ ایسی ناسازگار فضا میں ہم کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے۔“

”کیوں نہ مان سنگھ کو فون کر کے ہوشیار کر دیا جائے تاکہ وہ اگلے دو چار روز کے لئے اپنے معمولات تبدیل کر لے۔ گمان فون کال کے ذریعے یہ کام بہ آسانی کیا جاسکتا ہے۔“ میں نے خفت آمیز لہجے میں کہا۔ اپنی حرکت کے پیچیدہ مضمرات سامنے آنے پر میں دل ہی دل میں نادم ہوا جا رہا تھا۔

”ہوئے کو بہت کچھ ہو سکتا ہے مگر اسی وقت جب دونوں طرف کشیدگی کی فضا نہ پائی جاتی ہو۔ موجودہ حالت میں گمان فون کالز کو بھی غلط معنی پہنچا دیے جاسکتے ہیں۔ یہ تک کہا جاسکتا ہے کہ کسی سرکاری ایجنسی نے ان سنگھ کی تہلیل اور تحقیر کا پروگرام بنایا ہو گا مگر اس ایجنسی میں موجود کسی ڈرپوک ہمدرد نے خود سامنے آئے بغیر مان سنگھ کو ہوشیار کر دیا۔ اس طرح وہ پڑے بغیر ہمیں بدنام کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔“

”تو اب تم بھی اسے پھانسنے کا ارادہ رکھتے ہو؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”جب ہر طرح سے بدنامی اپنے سر آنے کا خطرہ ہے تو گمان بے لذت کیوں کیا جائے؟ ویسے بھی شخص شے کی بنا پر راہ چلے لوگوں کو نہیں پکڑا جاسکتا۔ بہری کے آدمی جب شریمان سنگھ کی مرمت کریں گے تو ان پر ہاتھ ڈال دیا جائے گا تاکہ اس کی زیادہ نوٹ چھوٹ نہ ہو سکے۔“

”جب تمہیں کوئی اختیار ہی حاصل نہیں ہے تو تم ان لوگوں کو کیسے پکڑ سکو گے؟“

”فسادی اور شریمانہ افراد کو ہر امن پرور شہری پکڑ سکتا ہے۔“ ظفر نے تڑپے ہوئے لہجے میں کہا۔

”تم بھول رہے ہو کہ ہم کراچی میں ہیں۔“ میں نے ہنستے

”دشمنوں کے ساتھ ساتھ دوستوں کے سیاہ کرتوتوں کا ریکارڈ رکھنے کا رواج بھی امریکا ہی نے دنیا کو سکھایا ہے تاکہ سنگین اختلاف رائے کی صورت میں دوستوں کو بھی ہلکے میل کیا جاسکے۔“ میں نے کہا۔ ”اس اعتبار سے دیکھا جائے تو بہری کیسے بھڑکا امریکی نظریہ آتا ہے۔“

”لیکن اس وقت تم نے سنگین غلطی کی ہے۔ یہ وقت بھڑکوں کے جتنے کو چھیننے کے لئے سازگار نہیں تھا۔ اگر بہری اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنانے پر قن کیا تو ہمارے لئے دشواریاں کمزور ہو جائیں گی۔“

”بہری اور شریمان کے جھگڑے میں ہمارا کیا ملے گا؟“ ظفر کی تاویل میرے لئے ناقابل فہم تھی۔

اس کی نظر آمیز نظرس میرے چہرے پر جم گئیں۔ ”تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ بہری کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ وہ خود شریمان سنگھ کی ٹھکانا نہیں کرے گا۔ یہ کام کرائے کے مقامی غنڈوں کو سونپا جائے گا۔“ وہ ایک لمحہ کے لئے خاموش ہوا پھر گہرا سانس لے کر بولا۔ ”بھارتی حکومت اس واقعہ کی ساری ذمہ داری ہماری حکومت پر ڈال کر عالمی سطح پر واہلہ چائے گی اور سستی انتہائی کارروائی کے طور پر بھارت میں ہمارے کسی سفارت کار کے ساتھ سرکاری غنڈے کوئی بڑی زیادتی کر سکتے ہیں۔“

اس کی بات میری سمجھ میں آنے لگی۔ میں نے رائے دی۔ ”ہمیں بہری کے عزائم کا پیشگی علم ہو چکا ہے۔ ہم شریمان کی نگرانی کر کے ان غنڈوں کو رنگے ہاتھوں پکڑ سکتے ہیں۔ اس طرح بہری خود ہی بے نقاب ہو جائے گا۔ بلکہ یہی راستہ زیادہ بہتر ہے کیونکہ اس طرح بھارتی اور امریکی سفارتکاروں میں غلط فہمیاں پھیل جائیں گی جن کے نتیجے میں ان کا گٹھ جوڑ ٹوٹ سکتا ہے۔“

ظفر کے ہونٹوں پر اداسی مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ حسرت آمیز لہجے میں بولا۔ ”کاش یہ سب اسی قدر آسان ہوتا! ہم ایسے کئی واقعات سے دوچار ہو چکے ہیں۔ تم ان کی پیچیدگیوں سے لاطم ہو۔ ایسے واقعات میں اصل مجرم بھی سامنے نہیں آتا۔ تشدد اور مار پیٹ کے نتیجے میں وہ غنڈے کسی اور مقامی کی نشانددی کریں گے اور دو تین ماہوں کے بعد یہ سلسلہ کسی ایسے مقامی بدعاش پر جا کر ختم ہو جائے گا جسے کسی نے فون پر اس کام کے لئے تیار کیا ہو گا۔ فون پر کام اور معاوضہ ملے ہو جانے کے بعد اسے کسی مقررہ مقام پر معاوضے کا لحاظ رکھا ہو ملا ہو گا اور اس نے اپنا کمیشن رکھ کر وہ کام کسی اور کو سونپ دیا ہو گا۔ بہری کیسے بھڑکے گا! ایجنٹ کپتے کاموں میں کبھی ہاتھ نہیں ڈالتے۔ غنڈوں کو پکڑ کر بھی اس کے خلاف کچھ ثابت نہیں کیا جاسکتا گا۔ تم نے میرے لئے ایک نیا نام پیدا کر دیا ہے۔ اب دو چار آدمی شریمان سنگھ کی حفاظت پر بھی مامور کرنے پڑیں گے۔ اس کو اپنی نگرانی کا شہہ ہو گیا تو نیکی بڑا نشانہ لازم والی مثل صادق آئے گی۔ وہ شور مچا دے گا کہ کچھ مسلح اور

معاملہ بازک صورت اختیار کرتے کرتے رہ گیا تھا۔ اس لئے اس نے جلدی سے اپنی بات عمل کر کے پہلے فون کا سلسلہ منقطع کیا اور ریسیور پر میرے ہاتھ سے ریسیور لے لیا۔
 ”اوئی! میں لگتا ہوں!“ میں نے ظفر کی مستفسرانہ نگاہوں کے جواب میں اطمینان انداز میں کہا۔

”بولو! میں سن رہا ہوں۔“ ظفر نے اپنا کوئی کوڑھرائے بغیر تھکمانہ لہجے میں کہا۔ اس کے ماتحت شاید اس کی آواز پچانتے تھے کیونکہ ظفر کے چہرے کے آثارات سے ظاہر ہوا کہ اس کے مخاطب نے اس کی آواز سننے ہی اپنی کھانسی شروع کر دی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ میری توقع سے کہیں زیادہ ختم ثابت ہوئی۔ ظفر ریسیور رکھ کر پلانا تو اس کا چہرہ خوش سے دمک رہا تھا اور آنکھوں میں وحشتانہ چمک پیدا ہو چکی تھی۔

”تم نے اچانک ہی افرا تفری پھیلا دی ہے۔“ اس نے میرا شانہ مضبوطی سے تھام کر کہا۔
 ”میں نے کیا کیا؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے معصومیت سے پوچھا۔

”تم نے میری کیسٹنجر کی دم پر پیر رکھ دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم سے بات کرنے کے بعد وہ چند گھنٹے تک صبر نہ کر سکا۔ غالباً اس نے ویار کے لئے انڈین کاؤ نسلٹ فون کیا ہوگا اور وہ بوکھلا کر وہاں سے نکل بھاگی ہے۔ میرا آدمی اسی کے بارے میں اطلاع دے رہا تھا۔“

”غالباً ہم سب بھی اسے جلد از جلد انڈین کاؤ نسلٹ سے نکالنا چاہ رہے تھے۔ میری نے پیش میں آکر ہمارا کام آسان کر دیا ہے ورنہ ہم نہ جانے کب تک اس کے نکلنے کا انتظار کرتے رہتے؟“

”آؤ۔ وہ گاڑی لے کر تیزی کے ساتھ کلفٹن کی طرف گئی۔ میری دو گاڑیاں اس کے پیچھے لگی ہوئی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اجالا پھیلنے سے پہلے یہ قصہ بھی منٹ جائے گا۔“ اس نے نکاسی کے راستے کی طرف بڑھتے ہوئے جوشیلی آواز میں کہا۔
 ”یہ وہ اکیلی ہے یا اس کے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟“ سلطان شاہ نے پوچھا۔

”اکیلی ہے، خودی کار چلا رہی ہے۔“ ظفر نے جواب دیا۔ ”وہ بتا رہا تھا کہ وہ بے پروائی کے ساتھ بہت تیز اور فزائیوگ کر رہی ہے۔“
 ”فون کرتے ہوئے اس نے یہ سب کیسے دیکھ لیا؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ جتنے بولے۔“ مجھے معلوم تھا کہ تم یہ سوال ضرور کرو گے۔ بڑے شہروں میں اہم سمات پر ہمارا عملہ وائزلیس، ٹرانسمیٹر کے علاوہ موبائل فون سے بھی گیس رہتا ہے۔ تووٹے

ہوئے سبے میں کہا۔ ”یہاں آج کل بیشتر پولیس والے ملزموں کو چھوڑ کر دخل در معقولات کرنے والے امن پرورشروں کو جوتے لگاتے ہیں۔ ان کی وائٹ میں شکر کو کتنا صرف ان ہی کے فرائض میں داخل ہے۔ ان کے علاوہ جو بھی امن و امان قائم رکھنے کی ذمہ داری سنبھالنے کی کوشش کرتا ہے وہ سرکاری کام میں داخلہ لے جانے عین جرم کا ارتکاب کرتا ہے۔۔۔۔۔“

”تم بلاوجہ میرا دماغ خراب کر رہے ہو۔“ وہ جھٹا ہٹ آمیز مسٹر ایٹ کے ساتھ بولا۔ ”جو چاہو تم کتنا چاہ رہے ہو وہ میں اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔ شری مان۔ نگہ کی حفاظت پر میرے آدمی مامور نہیں کئے جائیں گے۔ البتہ ہم کسی متعلقہ شخص کو اس طرف متوجہ کریں گے۔“

اس نے فوری طور پر فون اٹھالیا اور سلسلہ مل جانے پر کسی ٹائٹل میں بولنا شروع کر دیا۔

”تمہاری کھوپڑی ہر وقت کوئی نہ کوئی گل کھاتی رہتی ہے۔“ سلطان شاہ نے میرے کان کے نیچے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ”آخر تمہیں ان دونوں کو لڑانے کی کیا ضرورت تھی؟“

”جو اس موت کروا!“ میں اس پر آنکھیں نکال کر دھیمی آواز میں غرایا۔ ”یہ سب باتیں تمہاری عقل سے بالا ہیں۔ اپنی زبان بند رکھو اور بدلتے ہوئے حالات پر غور کرتے رہو۔“

میری پراعتاد پھٹکارنے سے خاموش ہو جانے پر مجبور کر دیا۔ ظفر فون پر اپنی پراسرار گفتگو میں مصروف تھا کہ اچانک دوسرے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ شاید ظفر کی خاصی گفتگو باقی تھی کیونکہ دوسری بار گھنٹی بجتے ہی اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ میں ریسیور اٹھا کر وہ کال سن لوں۔ میں نے پشیمانداز میں ریسیور اٹھا کر اپنے کان سے لگا لیا۔

”اوئی گرین لگوں!“ ریسیور اٹھاتے ہی میرے کانوں میں یگان آمیز آواز آئی اور میں چونک پڑا۔ میرے لئے وہ الفاظ ممل نہیں تھے تو قابل فہم بھی نہیں تھے۔

”بولو کرو، کمانڈر دوسرے فون پر مصروف ہے۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔

”کیا بکتا ہے؟ تم کہہ رہے ہو بول رہا ہے؟“ میری ہدایت سن کر دوسری طرف والے کا پارہ یک بیک چڑھ گیا۔

”انیشین فور سے۔۔۔ تم ذرا صبر سے کام لو!“ میں نے اس کے اضطراب کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”میں کمانڈر کا سمان ہوں۔ اس نے مجھے فون اٹھانے کا اشارہ کیا تھا۔“

”سوری سمان!“ اس کی معذرت خواہانہ آواز سنائی دی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے کوئی جیتا جاگتا انسان کسی بت سے اپنے آپ کے بعد اس سے معذرت کرنی شروع کر دے۔

ظفر فون پر اپنی بات تیزی سے نثار رہا تھا لیکن اس نے جان میری طرف ہی لگے ہوئے تھے۔ شاید اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ میرا

اندھیرے میں ڈوب گئی جیسے اس کے کمین اول شب سے ہی گری
نیز سوتے رہے ہوں۔

اس وقت رات ڈھل چکی تھی اور وقت کا پتہ صبح کے اولین
نحات میں داخل ہوا چاہتا تھا۔ اتنی صبح سویرے اگر پتہ لوگ ویرا
کی پذیرائی کے لئے مستعد اور حاق وچہ بند بیٹھے ہوئے تھے تو صاف
ظاہر تھا کہ وہ ویرا اور اندھین کاؤ نسلیت کے حامیوں اور ہمدردوں
میں سے تھے، جن کے ساتھ کوئی روایت نہیں کی جانتی تھی۔
اس لئے ظفر نے فوراً ہی اپنے جوانوں کو اس عمارت کے کمر، پچیل
کمر اس کی کڑی تابندی کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس کی بدایت
تھی کہ وہاں سے چڑیا کا پتہ بھی نہ ملے پائے۔

میں نے ویرا کے ساتھ کمری دوستی سے لے کر ماضی تک کا
ایک طویل عرصہ گزارا تھا لیکن میں کبھی اس عورت کی کمرانیوں کا
ادراک نہیں کر سکا تھا۔ جب جب میرے اور اس کے مراسم آجیتے
رہے، میں اس خوش فہمی میں مبتلا رہا کہ میں اس کے بارے میں
سب کچھ جانتا ہوں لیکن ظفر کے ساتھ لینڈ روور میں سفر کرتے
ہوئے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ ویرا نے مجھے کبھی اپنی تمام کی ہوا نہیں
لگنے دی تھی۔

کراچی میں واقع اندھین کاؤ نسلیت سے اس کے تعلق نے مجھے
پسلا دہشتی جھکا لگایا تھا۔ وہ ان سے اس قدر قریب تھی کہ اب ہر
وقت آنے پر غزالہ کو ان کی تحویل میں چھوڑ کر آتی تھی۔ اور
میرا معاملہ اس مکان کا تھا جہاں اس نے اب پناہ لی تھی۔ وہ کون
لوگ تھے؟ ویرا نے ان کا کیا تعلق تھا؟ اور ان کو کس طرح زبردستی
بانا تھا؟ یہ سب ایسے سوال تھے جن کا میرے پاس کوئی جواب
نہیں تھا۔

ظفر نے شاید میرا ذہن چھ لیا کیونکہ وہ اسی لمحے بولا "ان
اطراف میں لے دے کر ایک موتی ال ال بی کامکان ایسا ہے جہاں
وہ جا سکتی ہے۔ اگر ایسا ہوا ہے تو یہ ہمارے حق میں بہت بڑا
ہوگا۔"

"کیوں؟ یہ موتی لال کون ہے؟" میں نے چونک کر سوال کیا۔
"موتی ال ال ایک زمانے میں شراب خانے والی ایک مشہور عمارت
کے نیچوں کا مقامی ایجنٹ رہ چکا ہے۔ اس کا نام ہماری لسٹ پر ہے۔
کئی بار اس کی نگرانی بھی کرائی گئی لیکن وہ بہت محتاط و عظیم ہوتا
ہے۔ کبھی بھی ہماری گرفت میں نہیں آسکا۔ وہ اسی علاقے میں رہتا
ہے جہاں وہ رہتا ہے۔"

"موتی لال پر کس قسم کا شبہ کیا جاتا رہا ہے؟" میں نے
پوچھا۔

"وہ پچیس پدم ملک، دشمن اور دہشت گرد، افراد، مالی اور اخلاقی
اعانت کرتا رہا ہے۔" ظفر نے کہا۔ "مگر یہ ابھی تک ایک خیال
ہے جس کو ثابت نہیں کیا جاسکا۔ اسی لئے وہ آج تک آزاد اور
زندہ ہے۔"

دونوں کی بات ہے، پھر پاکستان میں بھی لوگ عرب شیوخ کی طرح چلتے
پھرتے فون پر باتیں کرتے نظر آتے ہیں۔"

ان لوگوں کا ڈسپن اتنا سخت اور عمل تھا کہ اپنے دفتر سے نکلنے
ہوئے ظفر کو کسی سے کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں پڑی۔ اسے
چلتے ہی اس کے تین آدمی لینڈ روور جپ میں جا بسے تھے۔ ان
تینوں نے ہی اگلی نشست پر قبضہ کر لیا تھا۔ ان میں سے ایک نے جپ
کا طاقتور انجن اشارت کیا اور پھر ہم اس کشادہ جپ کی درمیانی
نشست پر برائمان ہو گئے۔

جپ کے حرکت میں آتے ہی چھانک نکلا اور ہم سب رفاہی
سے باہر نکل گئے۔

ان اثاثوں ظفر کے ماتحتیوں میں سے ایک نے کار میں موجود
ممبران فون کی نمبر، مگر اسسٹروٹ اس کے حوالے کر دیا
تھا۔

دوسری طرف سے رابطہ ہونے پر ظفر بولے لگا۔ "ہم چل
پڑے ہیں اب کیا پوزیشن ہے؟"

"اس طرف زیادہ آبادی نہیں ہے۔" چند غائبوں تک
غاموش رہ کر دوسری طرف کی رپورٹ سننے کے بعد وہ بولا۔ "اپنے
ہیڈ کیمپس کل رکھو اور اس گاڑی کو کسی قیمت پر اپنی نگاہوں سے
اوتھل نہ ہونے دو۔ ضرورت ہو تو اپنی رفتار بڑھا کر تم اسے نظر
بھی مار سکتے ہو لیکن یہ خیال رہے کہ وہ عورت دہشت گرد ہے۔
اس کے پاس جدید ہتھیاروں کے علاوہ ہم بھی دوسلے ہیں۔ وہ اس
طرف مڑی ہے تو یقینی طور پر کسی کمین گاہ کا رخ کرے گی۔ اس
اتے وہاں سے نکلنے کا موقع نہیں ملنا چاہئے۔"

وہ اپریش کان سے لگاتے سنا رہا۔ پھر بولا "اوہن پر رہ کر
پوزیشن دیتے رہو۔ میں سن رہا ہوں۔ ضرورت کبھی تو ہدایات بھی
دیتا رہوں گا۔"

"پل سے اترنے کے بعد وہ تین ٹکڑوں سے اپنی طرف
مڑی ہے۔" ظفر نے اپریش کان سے ہٹائے بغیر ہمیں اور اپنے
ساتھیوں کو آگاہ کیا۔ اس کی آواز یقینی طور پر دوسری طرف بھی سنی
جاری ہوگی لیکن ظفر کو اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ کہہ رہا تھا
"رفتار تیز کرو۔ اس سے پہلے کہ اسے کہیں گھس کر سنبھلنے کا موقع
ملے، ہمیں اس پر بے پول دینا چاہئے۔"

لینڈ روور غرائی اور اچھٹی ہوئی شرکی تاہور شاہراہوں پر
دوڑتی رہی۔

ہم کلفٹن کے علاقے سے دور تھے کہ اطلاع ملی، ویرا کار
سمیت ایک وسیع و عریض مکان کے احاطے میں داخل ہو چکی ہے۔
اس مکان کے کمینوں کو شاید پہلے سے ویرا کی آمد کی اطلاع مل چکی
تھی کیونکہ وہاں چھانک کی روشنیاں جلی ہوئی تھیں اور چھانک بھی
کھلا ہوا تھا لیکن ویرا کی کار اندر داخل ہوتے ہی چھانک بند کر کے
لیٹ لیمپس بجھا دیے گئے اور چند منٹ بعد پوری عمارت یوں

کوئی ثبوت نہ ہونے کے باوجود میرا دل گواہی دیتا ہے کہ وہ مجرم ہے اور کسی مجرم کو کیفر کردار تک پہنچانے بغیر میں چین سے نہیں رہ سکتا۔

”میرا خیال ہے کہ تم مورس کو ڈک بھول رہے ہو۔“ میرا فقرہ عمل ہونے سے پہلے ہی ظفر اچھل پڑا۔

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اس طرف کسی کا دھیان ہی نہیں آیا تھا۔ جلتنگ بجاتے ہوئے وہ مورس کو ڈک کے انداز میں اپنا پیغام کھلے بندوں سنا سکتا ہے۔ متعلقہ آدمی اس سے رابطہ کئے بغیر سمجھ جاتے ہوں گے کہ انہیں کہاں کیا کرنا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی بات نہیں ہو سکتی۔“

”یہ مورس کو ڈک کیا بلا ہے؟“ سلطان شاہ نے ابھین آہیز لیے میں سوال کیا۔

میں اسے سمجھانے لگا کہ مورس کو ڈک ٹیلی گراف کی بنیاد کی پہلی اینٹ ہے جس میں ایک مشین کے ذریعے حروف تہجی کو صوتی اشاروں میں تبدیل کیا جاتا ہے اور دوسری جانب والی مشین تک تک، ٹکا تک کی ان بے معنی آوازوں کو وصول کر کے ایک کانڈ پر حروف اور الفاظ کی صورت میں ٹاپ کر دیتی ہے۔ اگر موت لال جلتنگ بجاتے ہوئے ایسے اشارے بھی دینے لگے تو مورس کو ڈک سے واقفیت رکھنے والا ہر شخص اس کی دھن میں پوشیدہ پیغام سمجھ کر اپنا کام شروع کر سکتا ہے۔ وہ مورس کو ڈک کی قدرے بدلی ہوئی صورت کپی جاسکتی تھی کیونکہ اصل مورس کو ڈک میں ہر صوتی اشارے کو قطعے اور مختصری لکیری ڈاٹ اور ڈیش کی مختلف ترتیبوں سے ظاہر کرنے کا کلیہ ایجاد کیا گیا جو آگے چل کر ٹیلی گراف کی بنیاد بن گیا۔

جب تک ویرا بھارتی کاؤ نسلٹ میں پناہ گزین یا کراچی کی سڑکوں پر رواں تھی تو وہی ہماری گفتگو کا محور بنی ہوئی تھی لیکن اس کے سنے ٹھکانے پر چلے جانے کے بعد ہماری گفتگو کا رخ یک بیک موت لال کی طرف ہو گیا تھا جو کراچی کی شہری زندگی میں ایک معزز اور مقبول سرمایہ دار ہونے کے ساتھ مشہور افراد کی فہرست میں بھی شامل تھا اور کسی حد تک اپنی ٹامک فورس اور ظفر کی کمزوری بنا ہوا تھا۔

ہالی ڈے ان کے سامنے سے گزرتے ہوئے ہمیں خیال آیا کہ ہماری منزل تیزی کے ساتھ قریب آتی جا رہی تھی لیکن ہم نے وہاں کے لئے اپنی حکمت عملی کے بارے میں کچھ نہیں سوچا تھا۔ میرے خیال دلانے پر ظفر بولا ”اگر وہ موت لال کے مکان ہی میں گئی ہے تو وسیع و عریض رستے پر پھیلا وہ مکان میرا دیکھا ہوا ہے۔ بظاہر وہاں کوئی غیر معمولی حفاظتی نظام نہیں ہے۔ صرف گیٹ پر ایک دو چوکیدار رہتے ہوں گے۔ وہاں غیر معمولی بات صرف یہ ہے کہ اس مکان کے احاطے کی دیواریں نو دس فٹ اونچی ہیں جنہیں عبور کر کے اندر داخل ہونا قدرے دشوار ثابت ہوگا۔“

”لیکن اس شبے کی کوئی بنیاد بھی تو رہی ہوگی؟“ سلطان شاہ نے پوچھا۔ ”ب تک یہاں شراب ممنوع نہیں ہوتی تھی تو اس کی ایجنسی بھی قابل اعتراض نہیں تھی۔ پھر موت لال تو ویسے بھی مسلمان نہیں ہو سکتا۔ صرف اس رپا پر اسے مشتبہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔“

”چند برس پہلے شہر میں آتش زنی اور قاتلانہ حملوں کی لہر چلی ہوئی تھی۔ ان وارداتوں میں سات دہشت گرد پکڑے گئے تھے جن کی عدالتوں سے ضمانت ہو گئی۔ بعد میں کمزور اور نا کافی شہادتوں کی وجہ سے وہ بری ہوئے میں کامیاب ہو گئے۔ بعد میں ان کی ضمانت کے کاغذات کی جانچ پڑتال کی گئی تو یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ جن جانیہ ادوں کے کاغذات زر ضمانت کے بدلے جمع کرائے گئے تھے وہ تمام جانیہ ادیں کسی نہ کسی وقت موت لال کی ملکیت رہ چکی تھیں۔ بس وہیں سے وہ ہماری نظروں میں آیا تھا۔“

”اس کے بعد اس کے خلاف کیا شواہد سامنے آئے؟“ میں نے پوچھیں۔

”میں نہیں بتا چکا ہوں کہ وہ بہت محتاط آدمی ہے۔ اس لئے ہمیں کوئی ثبوت نہیں مل سکا لیکن بعد میں یہ حیرت ناک بات سامنے آئی کہ جس دن وہ کسی پروگرام میں جلتنگ بجاتا ہے اس کے اگلے ہی دن شہر یا صوبے میں دہشت گردی کی کوئی بڑی واردات رونما ہو جاتی ہے۔“

”جلتنگ؟“ میں نے حیرت سے دہرایا۔ ”یہ جلتنگ کا کیا قصہ ہے؟“

”موت لال جلتنگ بجانے کا شوقین ہے۔ چاندی، پتیل اور کانسی کی پالیوں میں مختلف سطحوں تک پانی بھر کر جب وہ چوٹی ڈنڈوں سے ان پر ضرب لگاتا ہے تو سناں باندھ دیتا ہے۔ اس کے جاننے والوں میں اس کی بجائے ہونڈی دھنیں بے حد مقبول ہیں۔ اس کے کسی دوست یا شناسا کے ہاں کوئی تقریب ہو تو راگ ورنگ کی محفل سجے یا نہ سجے لیکن موت لال کا فرمائشی پروگرام ضرور ہوتا ہے۔“

”حیرت ہے کہ ایسے بے ضرر شوق کا بھی دہشت گردی سے کوئی تعلق ہے۔“ سلطان شاہ نے کہا۔ لینڈرور میں اگلی نشست پر بیٹھے ہوئے تینوں افراد نے ہماری گفتگو سے لا تعلق اختیار کی ہوئی تھی۔ چپے وہ بالکل ہی گنگے اور ہیرے ہوں۔

”ہم نے ہر طرح دیکھ لیا لیکن ایسی تقریبات میں اس کے قریب کسی مشتبہ شخص کی پرچھائیں تک نظر نہیں آتی لیکن اگلے دن کوئی نہ کوئی بڑی واردات ضرور ہو جاتی ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ اس مسئلے پر زیادہ مغز زنی نہیں کی جنی ورنہ اس کا حل زیادہ مشکل نہیں ہونا چاہئے تھا۔“ میں نے پوچھ کر انداز میں کہا۔

”تمہارے ذہن میں کوئی بات آئی ہو تو مجھے ضرور بتاؤ۔ بظاہر

”تو کیا تم اس عمارت میں کھسنے کا ارادہ رکھتے ہو؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”بلیو کراس ذیل کو تباہی سے بچانے کے لئے ویرا کو لے بس کرنا ضروری ہے۔ ہمیں اس کی کہیں گاہ میں داخل ہونا ہی پڑے گا۔ وہ شرافت سے ہتھیار نہیں ڈالے گی۔“ ظفر نے جواب دیا۔ ”میرے ذہن میں تمہارے اختیارات کا معاملہ تھا۔ اگر وہاں مزاحمت کی گئی تو خاصی خون ریزی ہو سکتی ہے۔ اگر ہمارے پاس پولیس کی نفری بھی ہو تو ہم قانون کے نام پر یہ آسانی اندر داخل ہو سکتے ہیں۔ صرف ویرا کو بچانے کے لئے موتی لال اپنی سادھ اور عزت تباہ کرنے کا خطرہ مول نہیں لے گا۔“

”پولیس کو ساتھ لینے سے معاملہ بگڑ جائے گا۔ آج کل یہ اندازہ لگانا بہت مشکل ہو گیا ہے کہ کس وردی میں کون چھپا بیٹھا ہے۔ ایسی ہی عجیبی پیش آجائے تو ہم پولیس کے بجائے رینجرز یا فوج سے رجوع کر لیتے ہیں لیکن اس کارروائی میں کافی وقت صرف ہوتا ہے۔ جلد ہمارے پاس بالکل وقت نہیں ہے۔“ اسی لئے ظفر کے دوبائیل فون پر باہر سے کال آنے کا اشارہ دیا۔ ”معاذ اللہ۔ ویرا کے نائب ہونے کے بعد اس نے اپنے آدمیوں سے رابطہ منقطع کر لیا تھا۔“

ظفر نے سوچ سکا کہ وہ کال وصول کی پھر دھمی آواز میں یہ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ ”اسے ایک آدمی گاڑی میں اسٹیشن فور لے جائے ہم بس پیچھے ہی والے ہیں۔“ ”کیا ہوا؟“ پے در پے بدلتی ہوئی صورت حال کی وجہ سے میں تجسس میں مبتلا تھا۔

”جس کار میں ویرا وہاں پہنچی تھی اسے لے کر ایک آدمی وہاں سے بہت تیزی کے ساتھ روانہ ہوا تھا۔ میرے آدمی اسے روکنے میں ناکام رہے تو انہوں نے ایک موٹر پر اپنی بھاری پک اپ سے سائیڈ مار کر کار کو الٹ دیا۔ ڈرائیور کافی زخمی ہوا ہے۔ میں نے اسے اسٹیشن فور روانہ کر دیا ہے۔ تصادم اور کار الٹنے کا شور کافی زیادہ تھا۔ یہی طور پر اس مکان میں بھی سائیڈ مار کیا جائے گا۔ اگلے کے بعد اس مکان کی پچھت پر تاریک اور ناقابل شناخت ہیروں کی نقل و حرکت نوٹ کی گئی ہے۔“

ہم کافین کا پل عبور کر کے داہنی طرف مڑے۔ پھر فریج کاؤ سنلیٹ کے سامنے سے گزرے تو پرائیوٹ نمبریلیٹ والی ایک براؤن یوٹا کر اوٹن سڑک کے کنارے الٹی ہوئی نظر آئی۔ فریج کاؤ سنلیٹ کے سلاخوں والے آئینی گیٹ کے عقب سے مسلح محافظ اس کا جائزہ لے رہے تھے۔ ڈیوٹی کے بارے میں سخت ہدایات کی وجہ سے ان میں سے کسی نے باہر آنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

چند منٹ بعد لینڈ روور ایک نیلی پک اپ کے قریب بارکی جہاں دو مضبوط مگر سادہ پوش افراد مستعد کھڑے ہوئے تھے۔ وہاں پہنچنے ہی مجھے اونچی دیواروں والے اس مکان کو پہچاننے میں کوئی

دقت نہیں ہوئی جہاں ویرا نے پناہ لی ہوئی تھی۔ لینڈ روور کا ڈرائیور اپنی نشست پر تیار رہا۔ اچھے دو افراد بیٹھے اتر آئے۔

”یہ موتی لال ہی کا مکان ہے۔“ ظفر نے ایک گھرا سانس لے کر کہا۔ پھر وہاں پہلے سے موجود آدمیوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”اندرونی کیا خیریت ہے؟ آدمی کہاں کہاں ہیں؟“ وہ ظفر کو تفصیلی رپورٹ دینے لگا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ کار کے حادثے کے بعد پچھت پر نظر آنے والی پراسرار نقل و حرکت کے علاوہ اندر کے حالات معمول پر تھے۔ بظاہر ان لوگوں کو یہ اندازہ نہیں ہوا کہ کیا وہ ویرا کے وہاں پہنچنے ہی اس عمارت کا محاصرہ لیا جا چکا تھا۔

ظفر اس مکان میں کبھی داخل نہیں ہوا تھا لیکن اپنے شہادت کی تصدیق یا تردید کے لئے متعدد بار اس کا طواف کر چکا تھا اس لئے اس نے وہیں کھڑے کھڑے اپنی کارروائی کے بارے میں حکمت عملی ترتیب دینی شروع کر دی اور اسی کے ساتھ ہم مکان کی باہر کی طرف ہونے والے اسٹریٹ لائٹس نہ ہونے کی وجہ سے تاریک پڑی ہوئی تھی۔ ظفر کے ایما پر دونوں گاڑیاں ابھری چلی پڑی تھیں۔

اس وقت رات دم توڑ چکی تھی اور فضا پر چھائی ہوئی گھور تاریکی دھندلائے ہوئے مدھم سے اجالے میں مدھم ہوئی جارہی تھی اس لئے ظفر اور اس کے آدمیوں کے پاس وقت کم تھا۔ وہ لوگ قانون کا کوئی سارا لئے بغیر ویرا کے فتنے کا سدباب کرنا چاہ رہے تھے اس لئے یہ ضروری تھا کہ اجالا چلنے اور اس علاقے کے مکینوں کے بیدار ہونے سے پہلے پوری کارروائی مکمل کر لی جائے تاکہ کسی غیر متعلقہ ذہن کی طرف سے مداخلت کا کوئی اندیشہ نہ رہے اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ وہ لوگ ویرا کے معاملے سے فارغ ہوں تو پھر غزالہ کی پابالی کی فکر کی جائے۔ وہ اس وقت انڈین کاؤ سنلیٹ میں قید تھی لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ ظفر نے آدمی بدستور اس سفارتی عمارت کی گمرانی پر مامور تھے یا ویرا کے فرار کے بعد اس کے تعاقب میں چل دیے تھے۔ مجھے یہ فکر لاحق تھی کہ گمرانی نہ ہونے کی صورت میں غزالہ کو وہاں سے ہٹا دیا جاتا تو ہمیں ہوا بھی نہ لگتی اور ہم غلامی ہاتھ پیرماتے رہ جاتے لیکن پوری گفتگو میں ایسا کوئی موقع نہیں آسکا تھا کہ میں انڈین کاؤ سنلیٹ کی گمرانی کے بارے میں ظفر سے کوئی سوال پوچھ سکتا۔

اس وقت ظفر نے اپنی پوری توجہ ویرا کو گھیرنے پر مرکوز کی ہوئی تھی وہ اسے بے خبری میں اپنے آہنی چنگل میں دبوچ لینا چاہتا تھا۔ چنانچہ سے عمارت میں داخل ہونے کی صورت میں تصادم اور وہاں رہنے والوں کے ہوشیار ہوجانے کا خطرہ مضمر تھا۔ اس لئے ظفر نے احتیاط کیے اور اسے اپنے آدمی اندر پہنچانے کا منصوبہ بنایا تھا اس کو ریا کارروائی میں وہ لوگ سرعت اور خاموشی کے ساتھ

”میں ٹھیک ہوں، سر!“ اس کی قدرے نحیف سی آواز سنائی دی۔ ”بجلی کا بجنا کھنا کمرے میں اپنی چیخ پر قابو نہیں پا سکا۔ چند منٹ کے بعد میں ربر کے دستانے پہن کر دوبارہ کوشش کروں گا۔“

”تم آرام کرو، کام کرنے والے اور لوگ بھی موزوں ہیں۔ تم میں بہت جو تو میں ذرا سی پچھڑ چھاڑ کر لیتا چاہتا ہوں۔ طبی امداد کی ضرورت محسوس نہیں کرتے ہو تو فوراً واپس چلے جیے۔“

”نہیں، سر!“ وہ ایک دم سیدھا ہوا، بڑبڑایا۔ ”مجھے کچھ نہیں ہوا۔ اس وقت ڈوبی زیادہ اہم ہے۔ تم جو کچھ کرنا چاہتے ہو، کرو۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

ظفر نے اس کے لئے بھرپور تعریفی کلمات اور اس کے حکم پر لینڈرور واپس کھمبائی گئی۔ پیچھے آنے والی پک اپ نے بھی اس کی تحیہ کی اور ہمارا رخ موٹن الال کے آہنی پچانک کی طرف بڑھ گیا۔

”نیا ارادہ ہے؟“ میں نے سرگوشیاں لیتے میں ظفر سے پوچھا۔ ”جی جی سن کر پچانک والوں کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ کوئی شخص برقی رو کا شکار ہوا ہے۔ وہ لوگ صورت حال کا اندازہ لگانے کے لئے زور زور سے بھڑکے ہوئے ہوں گے۔ اس وقت ہم آسانی کے ساتھ پچانک پر قابض ہو کر اندر داخل ہو سکتے ہیں۔“ اس نے کہا۔

”اگر آہنی پچانک میں بھی برقی رو موزوں ہوئی؟“ میں نے

اپنا جواب حاصل کر سکتے تھے۔ اس متعدد کے حصول کے لئے یہ سب کچھ کرنا تھا کہ اس کا ایک آدمی کسی محفوظ مقام سے احاطے کی دیوار پر چڑھ کر اندر کا جائزہ لے اور اس کے اشارے پر ہتھیار تین افراد، چھٹی پھرتی سے اندر کود جائیں۔ دیگر افراد جو موتن الال کے مکان کے گرد اہم مقامات سے نگرانی کر رہے تھے، انہیں چھیننے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی۔

وہ شخص نہایت اطمینان کے ساتھ احاطے کی دیوار کے نیچے پہنچ گیا۔ دیوار کا اوپر کی سر اس کے ہاتھوں کی رسائی سے باہر تھا۔ اس نے دو تین بار اپیل کر اپنے ہاتھ کنارے پر پکڑنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اس صورت حال کو دیکھ کر ہمارے پاس موزوں افراد میں سے ایک تیزی کے ساتھ اس کی طرف لپکا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ اسے اپنے کندھوں پر اٹھا کر دیوار سے اوپر کی کنارے تک پہنچانے کا ارادہ رکھتا تھا، کراس کے حرکت میں آتے ہی پہلے شخص کو ایک بڑا سا پتھر نظر آیا، دیوار کے قریب ہی پڑا ہوا تھا۔ وہ تیزی کے ساتھ اس پتھر کی طرف گیا، اس پر چڑھ کر اوپر کی طرف اچھا، اس کے دونوں ہاتھ احاطے کی دیوار سے کناروں کی طرف لئے پھر یہی وقت گئی باقی رونما ہو گئی۔ دونوں نے ہم سب کو مضطرب کر دیا۔

دیوار کے اس حصے پر آواز کے ساتھ ایک نیندوں شعلہ ایک کر معدوم ہو گیا۔ اسی کے ساتھ دیوار پکڑنے کی کوشش کرنے والے کے مطلق سے ایک دردناک چیخ بلند ہوئی اور وہ بول اچھیل کر نیچے آ رہا جیسے کسی نا دیدہ وجود نے اسے پکڑ کر دور اچھال دیا۔ احاطے کی اس دیوار پر دور سے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ لیکن وہاں لازمی طور پر نہایت مہارت کے ساتھ ننگے برقی تار پھیلائے گئے تھے جن میں درمیانی درجے کی برقی رو دوڑ رہی تھی۔ اگر وہ طاقتور برقی رو ہوتی تو اس کا نشانہ بننے والا فوراً ہی ہلاک ہو جاتا لیکن اس نے گرتے ہی زمین سے اٹھنے کی کوششیں شروع کر دی تھیں جو اس کی زندگی کی مظاہر تھیں۔

جو کچھ ہوا وہ اس قدر اچانک اور غیر متوقع تھا کہ ہم سب کو اپنی جگہ جم کر رہ جانا چاہئے تھا۔ ہمارا ہنر ہی یہ تھا۔ دونی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس نامانی حالت سے بعد ہمیں کیا کرنا چاہئے تھا۔ مگر وہ واقعہ ایسے ہی ایف والوں کے اعصاب پر اتنی شدت کے ساتھ اثر انداز نہیں ہو سکا۔ مشینی انداز میں دونوں گاڑیوں کے انجن بیدار ہوئے، دو آدمی برقی زودہ شخص کی طرف لپکے ظفر مجھے کھینچتا ہوا لینڈرور میں سوار ہو گیا۔ سلطان شاہ کو میری تقلید کرنی پڑی۔

آٹا فانا میں وہ شخص لینڈرور کے عقبی حصے میں پہنچایا جا چکا تھا اور دونوں گاڑیاں میدان صاف چھوڑ کر آگے بڑھ چکی تھیں۔

”کیا حال ہے، رحیم دادا!“ ظفر نے پیچھے مڑ کر اس شخص کی مڑان پر سی کی۔

مشورہ نفسیات ڈاکٹر جی ایم ہسٹن کی شہرہ آفاق تصنیف



آزادواری نفسیات

آپ کی زندگی میں کیا تبدیلیاں آئی ہیں؟ کیا آپ کی زندگی میں تبدیلیاں آئی ہیں؟ کیا آپ کی زندگی میں تبدیلیاں آئی ہیں؟

- زندگی میں تبدیلیاں
- تعلیم کی تبدیلی
- شغل کی تبدیلی
- شادی کی تبدیلی
- اولاد کی تبدیلی
- صحت کی تبدیلی
- مالی حالت کی تبدیلی
- دیگر تبدیلیاں

کتابت نفسیات پرنٹنگ پریس ۱۹۴۳ء

سوال کیا۔

اندھیرے میں ہتھیاروں سے لیس ہو کر کسی بھی بری کھڑی کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھے۔ راکفل کے ذریعے وہ لوگ کافی دور سے ہمیں نشانہ بنا سکتے تھے لیکن ہمارے ہتھیاروں کی مار اتنی لمبی نہیں تھی۔

ظفر کسی کچھ کہنے سننے کا موقع دیے بغیر اپنی سب مشین گن لے کر چپ سے اتر گیا اور لمحہ بھر بعد ہی فضا اس کی بارعب اور تھکسانہ آواز سے گونجنے لگی۔

”ہم قانون کے نام پر آئے ہیں۔ اگر دوسری بار گول چلائی گئی تو ہم سمجھیں گے کہ تم بدعتی کے ساتھ ہم سے مقابلے پر آمادہ ہو اور اس عمارت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے گی۔ خیریت چاہتے ہو تو اپنے ہتھیار گرا کر روشنی کرو دو ورنہ برے انجام کے لئے تیار ہو جاؤ۔“

اچانک چپ کے ذریعہ نے ہیڈ لیمپس روشن کر دیے۔ روشنی کی اس چادر میں عمارت کا برآمدہ بھی منور ہو گیا جہاں دو مسلح افراد کھڑے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک صحت مند نوجوان تھا اور دوسرا ادھیڑ عمر گرو جیہ شخص تھا جو شب خرابی کے لباس پہ گاؤں پہنے کھڑا تھا۔ وہ دونوں ہی بڑے پور کی شکاری راکفلوں سے مسلح تھے۔

روشنی کی زد میں آتے ہی ان کی راکفلوں کی اٹھی ہوئی تالیں جھکتی چلی گئیں۔ نوجوان اچھل کر ایک ستون کی اوٹ میں چھپ گیا لیکن ادھیڑ عمر شخص جہاں تھا وہیں کھڑا رہا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہی موتن الال ہو سکتا تھا۔

فضا میں ظفر کی مشین گن کا ہلکا سا برٹ گونجا اور اس نے غصیلی آواز میں کہا ”تم دونوں اپنی راکفلیں گرا کر روشنی میں آئے تو چھلکی کر دیے جاؤ گے۔“

برآمدے سے ہمارا فاصلہ بہت زیادہ نہیں تھا اور لینڈروور کے ہیڈ لیمپس کی روشنی اتنی تیز تھی کہ ہم نے موتن الال کے چرے پر تذبذب کے آثار دیکھے پھر اس نے جھک کر اپنی راکفل آہستہ سے فرش پر ڈال دی۔ اس کی وہ راکفل غالباً بہت قیمتی تھی جسے وہ ہاتھ سے نیچے پھینکنے کی ہمت نہ کر سکا۔ پھر اس نے ایک طرف سر گھما کر کسی سے کچھ کہا اور ستون کی آڑ سے اس کا ساتھی نوجوان بھی باہر آگیا۔ اس بار اس کے ہاتھوں میں راکفل موجود نہیں تھی۔

ہم لوگ چپ میں تیزی کے ساتھ برآمدے کی طرف بڑھ گئے۔ ظفر ہمارے پیچھے اندھیرے میں پیدل آتا رہا۔ ہمیں پہلے پہنچ کر وہ ان دونوں کا رد عمل دیکھنا چاہ رہا تھا۔

چپ رکٹے ہی میں سلطان شاہ کے ساتھ نیچے اتر گیا۔ ہم نے اپنی سب مشین گنیں شولڈر اسٹریپ کے ذریعے شانوں سے لٹکائی گئیں۔

وہ دونوں ہماری پیشوائی کے لئے برآمدے کے کنارے تک آگئے تھے۔ دونوں کے چہروں سے سراسیمگی اور تشویش ہو رہی تھی۔

”انہوں نے یہ حماقت نہیں کی ہوگی۔ چھانک پر چوکیداروں کی موجودگی کافی ہوتی ہے۔ اتنے وسیع احاطے کی دیوار کی حفاظت کرنا مشکل کام ہے۔ اس لئے دیواروں پر خفیہ بنی باڑھ لگائی گئی ہوگی۔“

اس بار ایک واضح پروگرام بن چکا تھا اس لئے دونوں گاڑیاں بہت تیزی کے ساتھ بند آہنی چھانک کے سامنے پہنچ گئیں۔ ان کا رخ چھانک کی طرف گھماتے ہی ہیڈ لیمپس وغیرہ گل کر دیے گئے پھر ایک آدمی باہر نکلا اس نے بہت احتیاط اور پھرتی سے چھانک کو چھو کر اس کے محفوظ ہونے کا اندازہ لگایا اور پھر چھانک کی ڈرائیون والی سلاخوں میں پیر پھنسا تا ہوا کسی بندر کی سی پھرتی کے ساتھ اوپر چڑھتا چلا گیا۔

اس بار ظفر کا اندازہ سو فیصد درست ثابت ہوا کیونکہ اندر غائب ہونے کے بعد بھی وہاں سے کوئی احتجاج آمیز آواز نہیں سنائی دی اور چند ثانیوں بعد ہی چھانک اندر سے کھول دیا گیا۔

اس وقت تک سب لوگ غیر مسلح تھے لیکن چھانک کھلتے ہی ہر ایک نے نشستوں کے نیچے سے بھرے ہوئے خود کار ہتھیار نکال لئے۔ میگزین والی ایک سب مشین گن اس شخص کو تھمادی گئی جو چھانک پر چڑھ کر اس احاطے میں داخل ہوا تھا۔

”تم دونوں کے لئے بھی کاشٹکو فین اور ان کے فاضل میگزین موزوں ہیں۔“ ظفر نے ہمیں آگاہ کیا اور آگلی لمبے میں ہم دونوں بھی مسلح ہو چکے تھے۔ میں نے ایک بھرا ہوا فالتو میگزین بھی ساتھ لے لیا تھا۔

بجلی کا جھٹکا کھانے والے شخص کو لینڈروور سے اتار کر کپ اپ میں منتقل کر دیا گیا اور وہ چپ ہم تینوں سمیت چھانک سے دور واقع رہائشی عمارت کی طرف بڑھ گئی۔

اچانک ہمیں سے ”کون ہے؟“ کی تیز آواز بلند ہوئی۔ شاید احاطے میں بٹکتے بوٹھانے کسی چوکیدار نے چھانک کے ذریعے موندنا۔ والی تبدیلیاں، لچکی ہیں۔ ٹرینڈروور کا ڈرائیور اس ناکارہی پر آگے بغیر چپ کو آگے لیتا چلا گیا۔

رہائشی عمارت کی تمام کھڑکیاں تاریک پڑی ہوئی تھیں۔ عمارت کے کمین ساری روشنیاں گل کر کے گہری خند کے مزے لے رہے تھے یا پھر ان کھڑکیوں پر دھیر پردے پڑے ہوئے تھے جن سے روشنی کو کوئی کرن باہر نہیں آ سکتی تھی۔

اچانک عمارت کے تاریک برآمدے سے مڑبول دھماکے کے ساتھ ایک شعلہ فضا میں بلند یوں کی طرف تیر گیا اور اس بار لینڈروور کے ڈرائیور نے بوٹھا کر پوری قوت سے بریک لگا دی۔

وہ راکفل فائر تھا جو ہمیں روکنے کے لئے فضا میں اٹھایا تھا۔

عمارت کے کمین بالکل ہی غافل اور بے خبر نہیں تھے بلکہ

چلا گیا۔

موتن لال چند ثانیوں تک خاموش کھڑا اس کے قدموں کی آواز سنتا رہا۔ جب وہ روزانہ کھول کر اندر چلا گیا تو موتن لال ایک گھبراہٹ سے کہنے لگا "میں ایک معزز آدمی ہوں میرا خیال ہے کہ تمہیں بھیج کر کسی نے میرے ساتھ معین مذاق کرنے کی کوشش کی ہے....."

"وقت برباد مت کرو!" ظفر نے بات کاٹ کر اسے ڈانٹا۔ "حقائق کی بات کرو یا پھر نتائج بھگتے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ ہم یہاں تمہاری کمائیاں بننے نہیں آئے ہیں۔"

موتن لال کا چہرہ زرد پڑ گیا اور وہ بھکاتے ہوئے سخت آمیز لہجے میں بولا "وہ..... وہ میری خواب گاہ میں ہے۔ میرے چوکیدار کے علاوہ کسی کو اس کی موجودگی کا علم نہیں ہے۔"

اس کے لب و لہجے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ رنگیلا بڑا تھا اور دیر کو ایک تحفے کے طور پر اس کے پاس بھیجا گیا تھا لیکن قابل ذکر بات یہ تھی کہ اندین کاؤنسلٹ میں اس کا کوئی ایسا بے تکلف دوست موجود تھا جو اس کے خفیہ مشاغل کی تسکین کے لئے دیر کو وہاں بھیج سکتا تھا۔

"اس کا نام کیا ہے؟" ظفر نے اسے پیچھے دھکیل کر برآمدے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

"میری..... میری سلائیٹ!" وہ رازدارانہ لہجے میں بولا "اگر تمہیں اس پر کوئی شبہ ہے تو تم اسے اپنے ساتھ لے جاؤ لیکن مہن کو ان معاملات کی ہوا نہیں لگنی چاہئے۔"

"اپنی خواب گاہ کی طرف چلو!" ظفر نے اس کی بات نظر انداز کر کے حقارت سے کہا "جوان اولاد کی موجودگی میں جو باپ رنگ رلیاں مانتا ہو وہ کسی پر حمیا ہمدردی کا مستحق نہیں ہوتا۔"

موتن لال نہایت حالاک اور مکار آدمی تھا۔ اپنی حرکتوں کی وجہ سے اس نے اپنی خواب گاہ کے لئے اس مکان کا بالکل انتخاب لیا ہوا تھا جو راجداری کے سرے پر ہی واقع تھا۔ اس کی لاٹھی میں وہاں آمد و رفت جاری رہنے میں کمی نہ رہتی تھی۔

لیکن اس اڑکنڈ شیڈ خواب گاہ میں داخل ہوتے ہی وہ خود بھی بھونچکا رہ گیا کیونکہ شکن آلود بستر خالی پڑا ہوا تھا اور ایک کھڑکی کا ٹوٹا ہوا شیشہ دیر کے فرار کی کمائی بنا رہا تھا۔

دیر اوہاں خطرے کے بادل منڈلاتے ہوئے محسوس کر کے بھاگ نکلی تھی لیکن ظفر کو شاید یہ خیال تھا کہ اس کے باہر پھیلے ہوئے آدمی دیر کے فرار کو ناکام بنا دیں گے اس لئے وہ کسی بوکھا ہٹ کا مظاہرہ کئے بغیر موتن لال کے ساتھ درشت رویے پر اتر آیا۔

"وہ کوئی عام اور آوارہ لڑکی نہیں بلکہ بہت بڑی مجرمہ تھی۔ اگر وہ نکلے میں کا سیاب ہو گئی تو میں تمہاری کھال میں بھس بھروادوں گا۔" اس نے اذیت دیتے ہوئے کہا۔

ادید عمر شخص کے مقابلے میں نوجوان زیادہ پریشان نظر آ رہا تھا۔ "ہم موتن لال سے ملنے آئے ہیں۔" میں نے پیچھے آتے ہی جھکنا نہ لیجے میں کہا۔ "برآمدے میں روشنی کرو اور فوری طور پر اسے بلانے کا بندوبست کرو۔"

نوجوان برآمدے کی روشنی کرنے کے لئے واپس مڑ گیا۔ سلطان شاہ اس کے پیچھے گیا اور اس نے فرش پر پڑی ہوئی دونوں رانٹیں اپنی تحویل میں لیں۔

اس اثنا میں ادید عمر شخص دھستے مگر احتجاج آمیز لہجے میں مجھ سے مخاطب ہو گیا۔ "میرا ہی نام موتن لال ہے اور وہ میرا لڑکا مہن لال ہے۔ اگر تمہارا تعلق پولیس کے محکمے سے ہے تو میں حیران ہوں کہ تمہاری وردیاں کہاں ہیں؟ میرے چوکیدار کہاں مرے ہوئے ہیں اور تم کسی اطلاع کے بغیر زبردستی اندر کیوں آئے ہو؟ ان باتوں کا جواب ملے بغیر میں تم کو خوش آمدید نہیں کہہ سکوں گا۔"

"ہمارا تعلق اسپیشل برانچ سے ہے۔" میرے عقب سے ظفر کی آواز ابھری۔ "ہمارا عملہ وردی استعمال نہیں کرتا۔ اپنے چوکیداروں کے بارے میں تم کو باخبر ہونا چاہئے۔ ان کی طرف سے کوئی جواب نہ ملے پڑی ہم یہاں تک کھول کر اندر آئے ہیں....."

"اور چند منٹ پہلے ابھرنے والی چیخ کیسی تھی؟" موتن لال نے اشتباہ آمیز لہجے میں پوچھا۔

"اس کا جواب تم دو گے۔" ظفر نے آگے بڑھ کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ "کچھ دیر پہلے ایک سفید فام مجرمہ یہاں پہنچی ہے۔ تمہارے گھر سے ذرا آگے ایک کار حادثے میں تباہ ہوئی ہے جس کا فحشی ڈرائیور تمہارے نام کی مالا چپ رہا ہے پھر یہاں سے کسی کی چھین سٹائی دی ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ تم نے چھت کے نیچے مجرموں کو پناہ دی ہے اور وہ کسی قیدی پر زبردستی کر رہے ہیں۔ ہم حقائق جاننے سے ناگوار ہیں ان مجرموں و اپنی تحویل میں لینا چاہتے ہیں۔ اگر تم نے ہمارے ساتھ تعاون کرنے میں جیل و جہت سے کام لیا تو ہم تمہیں بھی باندھ کر اپنے ساتھ لے جائیں گے۔"

ان دونوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر موتن لال اپنے لڑکے سے بولا "تم اندر جاؤ" میں اس سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"میں یہیں رکوں گا بابا!" لڑکے نے اصرار کیا۔ "چنانچہ تنہائی میں یہ تمہارے ساتھ کیا سلوک کریں! مجھے ان کے تیور خراب نظر آتے ہیں۔"

"انہیں اپنے سوالات کے تسلی بخش جوابات مل گئے تو یہ کسی کو نہیں ستائیں گے۔ تم یہاں سے چلے جاؤ۔ ابھی میں اپنی حفاظت آپ کر سکتا ہوں۔" موتن لال نے سختی سے کہا۔ "جوان بیٹے پر اس کا اتنا رعب تھا کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی زبردستی ہو رہا تھا۔"

”اللہ... لیکن مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔“ وہ خوف زدہ لمبے میں ہوا۔ ”مجھے یوں بتایا گیا تھا کہ وہ ایک ٹھنڈی لڑکی ہے جو ہر وقت نیت سے تجربات کے لئے آمادہ و تیار رہتی ہے۔ اسے میرے پاس بھیجنے والے نے مجھے اس سے آگے ایک لفظ بھی نہیں بتایا تھا۔“

”اسے بھیجئے والا کون تھا؟“ ظفر نے سوال کیا پھر موتن لال کے چہرے پر پس و پیش کے آثار دیکھ کر غرایا۔ ”اب تم نے وقت برباد کیا تو قانونی کارروائی سے پہلے میں تمہارے تمام ٹکڑوں کو یہاں جمع کر کے، انہیں تمہارے سیاہ کرتوتوں سے آگاہ کر دوں گا اور وہ سب تمہارے منہ پر تھوکیں گے۔“

”وہ لڑکی شاید انڈین کاؤسلیٹ سے آئی تھی مگر مجھے شری مان سنگھ نے اسے گم سے فون کیا تھا“ اس سے بات ہونے کے بعد ہی وہ یہاں آئی تھی۔“

”شری مان سنگھ کون ہے اور انڈین کاؤسلیٹ سے تمہارا کیا تعلق ہے؟“

”شری مان سنگھ میرا گہرا دوست اور کاؤسلیٹ کا سینئر پروڈیوکل آفیسر ہے۔ وہ آکسفورڈ میں میرا کاس فیلو تھا۔ اس کے علاوہ کاؤسلیٹ سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔“

”میری سلائیٹ کی گائز یہاں سے کون لے گیا تھا؟“ ظفر اس بات پر حیران ہوا۔

”وہ... وہ میرا بیورو تھا، صبح میری کار یہاں موجود ہوتی تو گھر میں اس کے بارے میں قیاس آرائیاں شروع ہو سکتی تھیں اس لئے میں نے وہ کار سڑک کے کنارے چھوڑ دینے کی ہدایت کی تھی۔ بعد میں میری وہاں سے اپنی کار لے سکتی تھی۔“

”تم جیسے ہو۔ اگر اب بھی تم راہِ راست پر نہ آئے تو مارے جاؤ گے۔“ وہ ہوا۔

”میں حلفیہ کہہ رہا ہوں کہ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ بالکل درست اور سچ ہے۔“

”اور جو کچھ نہیں کہا اس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“ ظفر نے زہریلے لہجہ میں پوچھا۔

”جی نہیں تم کیا کہنا چاہ رہے ہو۔“ وہ بے بسی سے ہوا۔ ”تم اگر میری سلائیٹ کو مجرم سمجھتے ہو تو تمہیں اس کا تعاقب کرنا چاہئے تھا۔ وہ دور نکل گئی تو پھر تمہارے ہاتھ نہیں آسکتی اور تم مجھے پریشان کرتے رہو گے۔“

”میں اپنے کام سے اچھی طرح واقف ہوں، تم بے فکر رہو، اس مکان سے جیسا کہچہ بھی فرار نہیں ہو سکتے گا۔ باہر میرے آدمی پہلے ہوئے ہیں۔ تم بتاؤ کہ جل ترکنگ کا کیا قصہ ہے؟“

”وہ ہری طرح چونکا پھر سنبھل کر ہوا۔ ”کچھ بھی نہیں، وہ میرا بے ضرر شوق ہے۔“

”ہمارے پاس تمہاری زہریلی دھنوں کے ٹیپ موجود ہیں اور ہم نے ان میں موجود کوڈ حل کر کے وہ پیغام پکڑ لئے ہیں جو تم اپنے

جل ترکنگ کی دھنوں میں پوشیدہ پیغامات کا ذکر آتے ہی موتن لال نے سمجھ لیا تھا کہ اس کا برا وقت آیا ہے۔ اس کے اعصاب کشیدہ ہو گئے تھے، چہرہ پر تان کے کسی مریض کی طرح زرد ہو گیا تھا مگر پھر بھی اس نے اپنی زبان سے کوئی اعتراف نہیں کیا، جب ظفر نے اسے گرفتاری کی دھمکی دی تو اس نے تعاون کرنے سے صاف انکار کرتے ہوئے کہہ دیا کہ وہ وارنٹ اور باوردی افسران کی موجودگی کے بغیر، جان دے دے گا لیکن اپنی دہلیز سے ہیرا ہر نہیں نکالے گا۔

اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس کا کن لوگوں سے واسطہ پڑا ہے۔ اس کی شرائط پر ظفر نے بظاہر اسے دھیل دے دی لیکن موقع ملتے ہی اس کی کنپٹی پر اپنی داہنی پھٹی کی ایسی پتی تلی ضرب لگائی کہ وہ منہ سے کوئی آواز نکالے بغیر مسمیٰ پری ڈھیر ہو گیا۔

میں نے سلطان شاہ کے ساتھ اندرونی راستے کی گہرائی سنبھالی تاکہ موتن لال اچانک ہی اس طرف نہ آ سکے۔ اس دوران میں ظفر نے بے ہوش موتن لال کو اپنے کندھے پر لا کر لینڈرودر میں پہنچا دیا۔

اسی لمحہ اچانک فضا میں ہسٹل کی فائزنی آواز گونجی پھر بہت سی سب مشین گنیں چلنے لگیں۔ سب بھاگ کر مکان سے باہر نکل آئے۔

غور کرنے پر اندازہ ہوا کہ فائزنگ کا سارا جوش و خروش اس عمارت کے عقبی حصے میں مرکوز تھا، ہم تینوں جیب میں سوار ہوئے تو ٹرانسپیر آن تھا۔ ڈرائیور نے بتایا کہ چند لمحہ پہلے اطلاع آئی تھی کہ مکان کے عقبی احاطہ میں ہسٹل سے ایک فائزنی دیا تھا جس کے نتیجے میں ایس بی ایف والوں نے نامعلوم افراد کو خوف زدہ کرنے کے لئے احاطہ کی دیوار پر فائزنگ شروع کر دی تاکہ کوئی اس سمت سے فرار ہونے کی ہمت نہ کر سکے۔ ظفر نے وہ پیغام سن کر برا سامنے بنایا اور ٹرانسپیر پر فائزنگ روک دینے کا حکم جاری کر دیا جس کے چند ثانیوں کے بعد ہی فضا پر سکون ہو گئی۔

اس کے بعد مکان اور احاطہ میں ویرا کی تلاش کی مہم کا آغاز ہوا لیکن میری توقع کے عین مطابق اس کا سایہ تک دریافت نہیں ہو سکا۔

دیرا بہت چالاک اور مکار عورت تھی۔ شاید اسے ابتدائی سے خدشہ رہا تھا کہ وہ موتن لال کے مکان میں پھنس سکتی ہے اس

موتن لال کا لڑکا موہن لال تھا جو ان کا دروازیوں پر رہ رہ کر احتجاج کر رہا تھا۔ اس نے اپنے باپ کے بارے میں جاننے کی کوشش کی لیکن اس کے کسی سوال کا جواب نہیں دیا گیا۔ جب وہ کام میں رکاوٹ کا سبب بنے گا تو ظفر نے اس کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جو اس سے پہلے اس کے باپ کے ساتھ کر چکا تھا اور اسے موتن لال کی خواہگاہ میں بند کر کے نکال دیا۔ اس طرح ظفر اور اس کے آدمیوں نے سورج طلوع ہونے تک اس مکان میں اپنی کارروائی مکمل کر لی اور جب آسمان کے مشرقی گوشوں سے سورج سر اُبھار رہا تھا تو تین گاڑیوں پر مشتمل کارروائی موتن لال سمیت واپس روانہ ہو چکا تھا۔ تیسری گاڑی نوٹوٹا کر اوڑان کے زخمی ڈرائیور کو اسٹیشن فوجیوں کو واپس لوٹ آئی تھی۔ ہماری روانگی کے وقت موتن لال کے ملازمین خاموش ضرور تھے لیکن ان کے بشروں سے ناقابل بیان حیرانی و پریشانی کا اظہار ہو رہا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ انہوں نے تینوں گاڑیوں کے نمبر ضرور نوٹ کر لئے ہوں گے اور موہن لال بوش میں آتے ہی ان نمبروں کے حوالے سے ایس ٹی ایف والوں کے لئے دشواریاں کھڑی کر دے گا۔ مگر ظفر نے مجھے یہ بتا کر مطمئن کر دیا کہ اس کا ملکہ ہر قسم کی مہمات کے لئے اعلیٰ ترین تربیت کا حامل تھا اس لئے ان گاڑیوں پر دوہرے نمبروں والی پلٹیں لگی ہوئی تھیں جنہیں ذرا سے اشارے پر الٹ پلٹ کر حسب مرضی اصلی یا نقلی نمبر سامنے لائے جاسکتے تھے اور اس مہم میں ہر گاڑی کے نمبر جعلی تھے۔

”یہ سب باتیں اپنی جگہ پر درست اور حوصلہ افزا ہیں لیکن اس بات کا افسوس رہے گا کہ ویرا ہمیں جمل دے کر نکل جانے میں کامیاب ہو گئی۔“ میں نے راستے میں اس سے کہا۔

”ہاں!“ اس کے لہجے سے بھی مایوسی مترشح تھی ”اور اس بار ہم اس کا سراغ بھی کھو بیٹھے ہیں۔ کچھ نہیں کہ اس نے موتن لال کے گھر سے نکل کر کہاں کارخ کیا ہوگا؟“

”یہ بتاؤ کہ اس وقت انڈین کاؤنسلٹ کی نگرانی ہو رہی ہے یا تمہارے سب آدمی ویرا کے پیچھے دوڑ پڑے تھے؟“ اس مرحلہ پر مجھے وہ سوال کرنے کا موقع مل گیا جو بت ویر سے میرے دل میں غلط پیدا کرنے کا سبب بنا ہوا تھا۔

”پیشہ و گرد اگرلوں کے روپ میں دو آدمی اب بھی وہیں موجود ہیں۔“ اس کے جواب سے مجھے اپنے دل و دماغ پر سے ایک بڑا بوجھ ہٹا ہوا محسوس ہوا۔ وہ کہہ رہا تھا ”تمہیں معلوم ہے کہ ہم تمہارے آنے سے پہلے ان کی نگرانی کر رہے تھے۔ تمہاری کمائی سننے کے بعد میں نے انہیں ویرا اور غزالہ پر بھی نگاہ رکھنے کے لئے کہا تھا۔ ویرا اب ہار گئی لیکن غزالہ ابھی اندر ہے اس لئے وہاں سے نہیں ہٹ سکتے۔ اس کے علاوہ جب تک انہیں کلیرنس نہ ہو جائے وہ چوبیس گھنٹے زیر نگرانی رہیں گے۔“

”غزالہ کی سلامتی کے لئے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ ویرا اب

لے کار کے اٹنے کے شور اور پھر ایک انسانی چیخ نے اسے پوری طرح چوکنہ کر دیا اور جب موتن لال اسے خواب گاہ میں تھا پیچھڑ کر باہر نکلا تو برا غامدہ شی سے ایک شیش توڑ کر کھلی فضا میں نکل گئی جہاں وہ اپنی مرضی کی راہ کا انتخاب کر سکتی تھی۔

اسے اندازہ رہا ہو گا کہ مکان محاصرہ کی حالت میں ہے اس لئے اس نے اپنے بلاؤز میں چوبیس گھنٹے موجود رہنے والے ہسپتال سے ایک ہوائی فائر کیا جس کے نتیجے میں فطری طور پر ہر ایک کی توجہ اسی طرف مبذول ہو گئی اور ویرا کسی اور سمت سے نکل کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی۔

لیکن میرے اس نظریہ میں ایک بہت بڑا جھول تھا۔ پچانک پر ایس ٹی ایف والے موجود تھے اس لئے اس سمت سے ویرا کا باہر نکلنا خارج از امکان تھا۔ دوسری طرف احاطہ کی دیوار پر چبھے ہوئے نیچے تاروں میں ہتی زردود ڈری تھی۔ اگر ویرا دیوار پچاند کر باہر نکلی تو اس نے ہتی باڑھ کا کیا تو کیا تھا؟

اس سوال کا ایک ہی جواب ہو سکتا تھا کہ موتن لال نے تحفہ میں ملی ہوئی اپنی من موہنی محبوبہ کی دیوبنی کے لئے اسے بتا دیا ہو کہ دیواروں پر ہتی باڑھ موجود تھی جسے عبور کر کے کوئی اندر نہیں آسکتا اور ویرا نے فرار کے وقت اس خطرے کے سدباب کے لئے ربر کے دستاں استعمال کئے ہوں یا کسی تدبیر سے ہتی باڑھ کو ناکارہ بنادیا ہو۔

تھوڑی دیر بعد اس سوال کا جواب بھی سامنے آ گیا، احاطہ کی دیوار پر ایک موٹے تار کا لنگر لٹکا ہوا پایا گیا تھا۔ اس نرم اور موٹے تار کے دونوں سروں پر پتھر بندھے ہوئے تھے جن کے سارے وہ لنگر دیوار کی دونوں جانب جھول رہا تھا۔ اس ننگے تار نے باڑھ کی لائوں کو شارٹ کر کے پوری باڑھ کا فیوز اڑا دیا تھا جس کے نتیجے میں دیواریں بے ضرر ہو چکی تھیں۔ اس انٹرنی دریافت یہ ثابت کرنے کے لئے کافی تھی کہ ویرا کو موتن لال کے احاطہ کی دیواروں پر ہتی باڑھ کی موجودگی کا علم تھا۔

وہ لنگر دریافت ہونے کے بعد ظفر نے اس سمت میں موجود اپنے ماتحت سے سختی کے ساتھ پوچھ گچھ کی تو اس نے اعتراف کر لیا کہ ہسپتال کے پہلے فائر کی آواز سننے ہی اس نے اضطرابی طور پر اپنی جگہ چھوڑ کر جانے واردات پر پہنچنے کی کوشش کی تھی لیکن جوں ہی اسے احکام یاد آئے، وہ فوری طور پر اپنی جگہ پر واپس پہنچ گیا تھا۔ اس دوران میں بمشکل چند منٹ کے لئے احاطہ کا وہ مخصوص حصہ اس کی نظروں سے اوجھل رہا تھا جہاں سے ویرا دیوار پچاند کر فرار ہوئی تھی۔

موتن لال کے گھر کے چکیدار اور سامنے آنے والے لاکو کا ملازم ایسیل ٹامک فورس والوں کے طاقت کے نتیجہ میں ہارے سے بی طرفانہ تھے اس لئے ان میں سے کسی نے بھی مزاحمت نہیں کی۔ گھر کے دیگر مکیں گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ دے کر

کر لیا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ موتن لال ویرا کے لئے اجنبی رہا ہوگا۔ ویرا کے لئے اس کا نام انڈین کاؤ نیلیٹ ہی کے کسی ملازم نے تجویز کیا ہوگا اور ویرا انڈینوں کی دلداد ایک مغربی لڑکی کے روپ میں وہاں پہنچ گئی۔

اس کے لئے واقعات کی لڑیاں کجا کر کے یہ سمجھنا دشوار نہیں رہا ہوگا کہ ہیری کو آسانے والا کون ہو سکتا ہے۔ سفارتی حلقوں میں ویرا کی رسائی سے میرے اور سلطان شاہ کے علاوہ کوئی تیسرا فرد واقف نہیں تھا اس لئے ویرا کو خدشہ محسوس ہوا ہوگا کہ ہیری کے ساتھ ہی ہم لوگ بھی اس امر سے واقف ہو چکے تھے کہ وہ انڈین کاؤ نیلیٹ میں چھپی ہوئی تھی۔ ان حالات میں وہ خود تو وہاں سے نکل کر کہیں بھی جاسکتی تھی لیکن غزالہ جیسی لڑکی کو ساتھ لئے پھرنا محال تھا۔ غزالہ کسی بھی وقت اس کے لئے بدترین مسائل پیدا کر سکتی تھی۔ اس وجہ سے ویرا اکیلی ہی موتن لال کے مکان کی طرف چل پڑی۔ غزالہ کو اس نے امانتاً انڈین کو نیلیٹ میں چھوڑ دیا تاکہ بہتر وقت آنے پر اسے دوبارہ اپنی تحویل میں لے سکے۔

واقعات کے تسلسل میں میرا نام ہر جگہ سامنے آتا رہا تھا اس لئے موتن لال کے گھر بلکہ خواب گاہ میں قدم رکھنے ہی جب وہاں بھی مسائل نے سر اٹھانا شروع کیا ہوگا تو ویرا یہ سوچنے پر مجبور ہوگئی ہوگی کہ میں کسی ناپیدہ جو تک کی طرح اس کے پیچھے لگا ہوا تھا اور کسی بھی وقت اس پر ہاتھ ڈال سکتا تھا۔

میرے بارے میں اس کے وہ قیاسات اسے آپے سے باہر کر دینے کے لئے کافی تھے اور جب وہ کسی بات پر مشتعل ہو جاتی تھی تو دنیا و انہما کو بھول کر اسی ایک بات کے پیچھے لگ جاتی تھی۔

اس بار بھی مجھے یہ نظر آ رہا تھا کہ غصہ اور جھگڑا میں وہ ایران سے آنے والے چھ سو سن و زنی سازو سامان کی تباہی کے مشن کو پس پشت ڈال کر اپنی پوری توجہ میری ذات پر مرکوز کر دے گی تاکہ مجھ سے میری بہتر جوتی ہوئی گستاخیوں کا انتقام لے سکے۔

مگر میں اس کی دسترس سے باہر تھا۔ جب تک مجھے ایسٹ انڈین ایف کی غیر مشروط حمایت حاصل تھی، ویرا کے فرشتے بھی میرے قریب نہیں پہنچ سکتے تھے۔ دوسری طرف وہ اس امر سے واقف ہو چکی تھی کہ میں اس کی نقل و حرکت کے بارے میں پوری طرح باخبر رہنے کی کوشش کر رہا تھا اس لئے اس بات کا قوی امکان تھا کہ وہ فوری طور پر غزالہ کو انڈین کاؤ نیلیٹ کی تحویل سے نکال کر اس پر مجاہدہ تشدد کا آغاز کر دیتی۔ اس مقصد کے حصول کے لئے اس کا ہنسنے نہیں اس سفارتی عمارت میں جانا ناگزیر تھا جہاں غزالہ قید تھی۔

اس پوری کہانی اور اس کے تجربے سے ظفر نے پوری طرح اتفاق کیا۔ اس کا ویرا سے کہیں سابقہ نہیں پڑا تھا لیکن اس جیسی ذہنیت رکھنے والے مجرموں کو وہ بارہا زیر کر چکا تھا اس لئے پوری بات نہایت آسانی کے ساتھ اس کی سمجھ میں آگئی اور اس نے

دوبارہ انڈین کاؤ نیلیٹ میں نہ ٹھنکے پائے۔ "میں نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

"تو کیا وہ دوبارہ کراخ کرنے کی حماقت بھی کر سکتی ہے؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"تم اسے نہیں جانتے اس لئے یہ سوال کر رہے ہو۔" میں نے پچھلی جہی کے ساتھ کہا۔ "وہ ضدی اور مشتعل مزاج ہے۔ اس کی انا مجھوں ہو جائے تو وہ اندھا ہوا بھی کھیل گزرتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہر مرتبہ اس کے ستارے یاوری کر جاتے ہیں اور وہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔"

"کھل کر بات کرو تاکہ میں بھی کچھ سمجھ سکوں۔ پوری بات سمجھ لینے کے بعد میں اس کے خلاف بہتر حکمت عملی ترتیب دے سکوں گا۔ ویرا کے بارے میں میں وہی کچھ جانتا ہوں جو فائلوں میں لکھا ہوا ہے لیکن تم جانتے ہی ہو کہ کسی شخصیت کے بارے میں کتابی معلومات عمل نہیں ہوتیں۔"

مجھ سے دلی برداشت ہو کر ویرا نے غزالہ کو فریب دے کر اغوا کیا تو یہ سیدھا میرا کبر خان کی طرف گئی تھی۔ وہاں ملنے والے اس کے خط کے مندرجات سے ظاہر ہو گیا تھا کہ وہ جلد یا بدیر میرے وہاں پہنچنے کی توقع رکھتی تھی۔ اس لئے اکبر کے مکان کے سامنے ایک مشتبہ آدمی کو دیکھتے ہی اس نے نہ صرف اسے ہلاک کر دیا بلکہ فوراً ہی وہاں سے نکل کھڑی ہوئی۔ اکبر سے اس نے دانستہ ایسی گفتگو کی کہ اگر میں اپنے کسی حربے کے ذریعے اس کی زبان کھولانے میں کامیاب ہو جاؤں تو مجھے ویرا کے اصل پردہ کرام کی بجائے مل سکے بلکہ میں گمراہ ہو جاؤں۔

ہوا بھی یہی کہ میں ویرا کو خبریں تلاش کرنے لے بجائے اٹھ پورٹ وغیرہ کی خاک چھانتا رہا۔ اگر میں اتفاقی ظفر سے ملنے کا فیصلہ نہ کر لیتا تو میرے فرشتوں کو بھی علم نہ ہو پاتا کہ میں میرا کبر خان کی جس سیاہ فورا کو ڈھونڈتا پھر رہا ہوں وہ ٹھنسنے سے انڈین کاؤ نیلیٹ میں کھڑی ہوئی ہے۔

میری جھپٹ چھاڑ کے نتیجے میں امریکی کاؤ نیلیٹ کے سیکرٹ ایجنٹ ہیری کیسٹر نے لازمی طور پر ویرا سے بات کرنے کے لئے انڈین کاؤ نیلیٹ فون کیا ہوگا۔ ویرا نے اس سے بات کی یا نہیں کی وہ اس کا ذاتی معاملہ تھا لیکن ہیری کے فون پر وہ بھڑک اٹھی ہوگی، ہیری کے بارے میں اس کے تجربات بہت تلخ تھے۔ وہ ویرا کی حیثیت کو خاطر میں لائے بغیر اس سے بلا دستی کے ساتھ پیش آتا تھا۔

پھر شاید ویرا کو یہ بھی معلوم تھا کہ ہیری اور شری مان سنگھ میں گمراہ دوستانہ مراسم تھے۔ اگر ہیری اس کے لئے انڈین کاؤ نیلیٹ فون کر سکتا تھا تو اس سے ملنے کے لئے بہ ذاتِ خود وہاں آ بھی سکتا تھا اس لئے ویرا نے اپنی خود مختاری پر زور دینے کے لئے فوری طور پر انڈین کاؤ نیلیٹ سے موتن لال کے گھر جانے کا فیصلہ

ہم نے دوسرے حصوں کا کوئی لحاظ کئے بغیر، اسے بے توجہ اور غریبہ جا رہا تھا۔ امرکار کی دلدوز چہنچیں اور پھر اس کی آمادگی بھی ظفر پر اثر انداز نہیں ہو سکی۔

وہ وحشت زدہ انداز میں اس مار سے بچنے کی ناکام کوشش کرتا رہا پھر اس نے اسی میں عافیت سمجھی کہ زخموں کی تاب نہ لا کر فرش پر گر جائے۔ اس کے گرنے کے بعد ظفر نے اسے دو تین اختیاتی ٹھوکریں لگائیں اور پھر بارودھاڑ کا وہ سلسلہ موقوف ہو گیا۔

”جلدی سے بولنا شروع کرو ورنہ اسی طرح تمہاری پوری کھال اڑا لی جائے گی۔“ میں نے کہا ”ہمارے پاس عدالت“ مجسٹریٹ یا ریاضہ کا کوئی سلسلہ نہیں ہوتا اس لئے تمہیں کہیں پناہ نہیں مل سکے گی۔ اپنی زبان کھول کر ہی تم سکھ سے رہ سکو گے۔“

”سینٹھ موتن لال حرای کا بچہ ہے۔۔۔۔“ وہ اپنے اور کراہتے ہوئے بولا۔ ظفر کی زبردست مارنے اس کے دماغ سے نمک طحالی اور وفاداری کا ہر تصور نچوڑ لیا تھا۔

”بڑے لوگ باپ اور بد معاشیاں کرتے ہیں لیکن مصیبت چھوٹے لوگوں کو اٹھانی پڑتی ہے۔ شراب اس کے گھر کی بھتیجی ہے اور شہر میں درجنوں عورتوں سے اس کی دوستیاں ہیں۔“ وہ گھرے گھرے سانسوں کے درمیان کہہ رہا تھا۔ ”وہ اپنی شائیں ان ہی کے ٹھکانوں پر گزرتا ہے۔ جب چھوٹا باپو شریا ملک سے باہر ہوتا ہے تو وہ میرے ذریعے عورتوں کو اپنی خواہگاہ میں بھی بلا لیتا ہے لیکن وہ چند گنی جتنی عورتیں ہیں۔ اس کے گھر والوں کو پتا بھی نہیں پتا کہ وہ باہر والے کمرے میں کیا کھلنا رہتا ہے۔ صبح سویرے۔۔۔ میں ان عورتوں کو ان کے گھر چھوڑ آتا ہوں۔ گوری لڑکی آتی چلی بارہا ہاں آتی تھی۔ مجھے کچھ معلوم نہیں کہ وہ کون تھی اور کہاں سے آتی تھی۔ ہاں، میں دوسری تمام عورتوں کے نام اور پتے بتا سکتا ہوں۔ میم کے آنے کے بعد سینٹھ نے مجھے اس کی کار بار پر مارک کرنے کے لئے کہا تھا کہ تم لوگوں نے مجھے گھیر لیا۔“

”موتن لال بڑے سرکاری افسروں سے بھی ملتا ہو گا؟“ ظفر نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

”پاریوں میں تو سب ہی لوگ جمع ہوتے ہیں لیکن وہ خاص طور پر کسی سے نہیں ملتا۔ جب تک وہ گھر سے باہر رہتا ہے تو میں اس کی ڈیوٹی میں رہتا ہوں۔ پچیس برس سے مجھے ایک گھنٹے کی بھی چھٹی نہیں ملی۔ جب چھٹی کی بات کرتا ہوں وہ دو چار سو روپے دے کر میرا منہ بند کر دیتا ہے۔ حد یہ ہے کہ نثار اور دیناری تک میں اس کی ڈیوٹی سے جان نہیں چھوٹی۔“

”اس کے خاص دوستوں میں کون لوگ شامل ہیں؟“ ظفر نے اٹھا سوال کیا۔

امرکار نے یکے بعد دیگرے متعدد نام لئے جن میں شری مان ٹکھ کے علاوہ کسی کا نام میرے لئے شناسا نہیں تھا۔ شاید ظفر کا بھی ویسا ہی معاملہ تھا کیونکہ اس نے ان سب میں سے صرف شری مان

راستی ہی میں اپنے نئے اقدامات پر غور کرنا شروع کر دیا۔ انیشز فور پر موتن لال کا ڈرائیور بری طرح سما ہوا تھا۔ اس نے بچائے جانے کے بعد نہ صرف اسے بہتر طبی امداد دی گئی تھی بلکہ اس کی خوردنوش کی ضروریات بھی انی الفور پوری کی گئی تھیں۔ وہ یہ سوچ سوچ کر ہی بہشت زدہ ہوا جا رہا تھا کہ کھلانے پانے کے بعد اس کے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔

موتن لال کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک عود کر آئی۔ غالباً اس کے لئے یہ احساس طمانیت کا باعث تھا کہ انجان لوگوں میں وہ اکیلا نہیں رہا تھا بلکہ اس کا مالک بھی اسی کشتی میں سوار تھا۔

بے ہوش موتن لال کو پتہ لگ دوسرے کمرے میں لے گئے تاکہ اسے ہوش میں لایا جاسکے اور ظفر اپنے ہاتھ میں بید سنبھال کر خواہ مخواہ رتوں کے ساتھ اس کے ڈرائیور کے سر پر مسلط ہو گیا۔

”تمہارا نام؟“ ظفر نے اسے گھورتے ہوئے درشت لہجہ میں پتلا سوال کیا۔

”امرکار“ اس نے ایک قدم پیچھے سرکتے ہوئے، سہمی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

”موتن لال کے کن کن کرتوتوں سے واقف ہو؟ شہر کی کن عورتوں سے اس کا بیل بول ہے؟ آج اس کے پاس آنے والی کون تھی؟ جو کچھ جانتے ہو فوری طور پر اگنا شروع کرو ورنہ ادھیڑ والے جاؤ گے اور یہاں کوئی تمہیں بچانے کے لئے نہیں آئے گا۔“

”تم لوگ مالک کو بھی لے آئے ہو۔“ وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر روہنے والی آواز میں بولا ”میں تو ان ہی کے حکم کا غلام ہوں۔ بہت سی باتوں پر سوچے سمجھے بنا عمل کر بیٹھتا ہوں۔ یہ باتیں تم ان ہی سے پوچھ لو تو زیادہ اچھا رہے گا ورنہ وہ ہماری چیز کی گواہی دے گا۔“

وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا لیکن ظفر نے مجنوناہ انداز میں اس پر حملہ کر دیا۔

میرے لئے یہ سمجھنا دشوار تھا کہ ظفر کی بیک اتار ہم کیونکہ ہو گیا۔ اس کا بید والا ہاتھ بے رحمانہ انداز میں بہت تیزی کے ساتھ حرکت کر رہا تھا اور بید شائیں شائیں کی آوازوں کے ساتھ امرکار کی جلد ادھیڑ رہی تھی۔ ابتدا میں اس نے اُدھر ادھر اچھل کر خود کو بید کی زد سے بچانا چاہا لیکن چند ہی شدید ضربات نے اسے کی ذبح ہوتے ہوئے درندے کی طرح گھلا چھاڑ کر چیخنے پر مجبور کر دیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے امرکار کا لباس تار تار ہو کر اس کے زخموں سے رستے ہوئے لٹو سے رنگیں ہونے لگا۔ اس نے کئی بار بید کو اپنی گرفت میں بھی لیا لیکن ہر بار چٹنی اور اس کے اپنے خون میں تردید پھسل کر اس کے ہاتھوں سے نکل گئی۔ ظفر اس کے چہرے گردن یا

ہوئے وہ رقعہ میری طرف بڑھا دیا۔

ڈٹھیں گے۔ بہائیتِ علاقے میں انڈین فارن آفس کے شری بار سنگھ کی کار کے انجن میں دھماکا ہوا۔ شیشے ٹوٹنے کی وجہ سے وہ زخمی بھی ہوا لیکن پولیس اسٹیشن جانے کے بجائے وہ ٹیکسی میں اپنے دفتر چلا گیا۔ بعد میں اُس کے عملے کے افراد اس کی کار ایک جگہ سے ہٹا کر لے گئے۔ ان لوگوں نے اس واقعہ پر اسرار خانہ کی اختیار کی ہوئی ہے اور ایف آئی آر درج کرانے کا ارادہ نہیں رکھتے۔

وہ غالباً کوئی پیغام تھا جو شاید ژانسیئر پر وصول کیا گیا تھا۔ یہ نئے کاغذ ظفر کو لوٹایا۔

”میری اپنی بات کا پکا ہے۔ اس نے جو کہا، کر دکھایا۔ پولیس والے ہوا میں منہ اٹھائے رہ گئے ہوں گے۔“ میں نے پچھلے مسکراہٹ کے ساتھ کہا ”ہم لوگ بھی غنڈوں اور حملہ آوروں تک سوچ کر رہ گئے تھے جب کہ میری ہر وقت جدید سے جدید تر ذرائع استعمال کرنے کی فکر میں رہتا ہے۔“

”معاملات بہت تیزی کے ساتھ الجھتے جا رہے ہیں“ ظفر پُر تشویش لہجے میں بولا ”دھماکا ہوا“ وہ خود بھی زخمی ہوا لیکن رپورٹ درج نہیں کرائی گئی۔ مجھے تو یہ اچھی خاصی پہلی معلوم ہوتی ہے جب کہ وہ لوگ ہماری حکومت اور انتظامیہ کے خلاف پروپیگنڈا کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔“

”یہ معاملہ سمجھنے کی نشانی ہے۔ رات کو مان سنگھ کو اس کے گھر پر اطلاع دی جا چکی تھی کہ میری نے دیرا کے لئے کاؤ سلیٹ میں فون کیا تھا۔ اس کے بعد ہی مان سنگھ نے موت لال کو میری سلامتی کی کہانی سنا کر دیرا کو میری بنا کر وہاں بھیجا ہوگا۔ دیرا کی ذات میں میری کی گہری دلچسپی سامنے آنے کے بعد مان سنگھ کو اندازہ ہوگا ہوگا کہ دیرا کی سرپرستی کر کے اس نے غلط معاملہ میں ہاتھ ڈالا ہے۔ جنگل کے قانون میں شیر کے شکار پر منہ مارنے والے کو کڑی سزا ملتی ہے۔ مان سنگھ سمجھ گیا ہوگا کہ وہ دھماکا اس کے لئے ایک تازیانہ درجہ رکھتا ہے۔ دوسری مرتبہ کوئی طاقتور دھماکا کار کے ساتھ اس کے بھی کلزے اڑا سکتا ہے۔ وہ اب تک میری سے بات بھی کرچکا ہوگا۔“

”آپس میں گہری دوستی ہونے کے باوجود اس نے میری ک اشتقاقی کارروائی کا برا نہیں منایا ہوگا؟ دھماکا بے شک ہلکا رہا لیکن پٹرول کی لائن آگ پکڑ گئی تو بہت کچھ ہو سکتا تھا۔“

”کھل کر میری اعتراف کرے گا نہ مان سنگھ اس پر الزام لگائے گا۔ یہ سب سفارتی کٹاوتے ہوتے ہیں اور پیشہ ورانہ رقابت ہر تعلق با دوستی پر حاوی رہتی ہے۔ اگر میرے قیاسات درست ہیں تو اب انڈین کاؤ سلیٹ والے دیرا کی مدد اور حمایت سے ہاتھ کھینچ لیں گے۔ ان کے لئے میری کی خوشنودی دیرا سے زیادہ اہم ہوگی کیونکہ سندھ میں گڑبڑ پھیلانے کے معاملے میں ان دونوں کے

سنگھ ہی کے بارے میں سوال کیا تھا۔ ”مان سنگھ کون ہے؟“

”وہ ہندی سفارت خانے کا بہت بڑا افسر ہے۔ دونوں اکثر ساتھ رہتے اور کھاتے پیتے ہیں۔“ اس کی تمام مزاحمت دم توڑ چکی تھی اور وہ خود کو ہر طرف سے بے دست و پا محسوس کرنے کے بعد اپنے مالک کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کرنے کے موڈ میں آچکا تھا۔

”موتن اس کے دفتر بھی جاتا ہوگا؟“ ظفر نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

”نہیں“ وہ دوستوں کے گھروں پر ملتے ہیں۔ وہاں شراب کے ساتھ عورتیں بھی ہوتی ہیں مگر مان سنگھ بڑا افسر ہونے کے باوجود پکا ڈال ہے۔ اس کی بیوی چھپ چھپ کر ہواٹوں کے کمرے میں موتن لال سے ملتی رہتی ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ مان سنگھ اس کی حرکتوں سے بے خبر ہے مگر اس کو سب کچھ معلوم ہے۔ اس کے باوجود اس کی اور سیٹھ کی دوستی میں کوئی فرق نہیں آیا۔“

”موتن شہر کے بد معاشرے سے بھی میل جول رکھتا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”اس کے پاس دلائی شراب کے ساتھ ہی دسی شراب کی انجنی بھی ہے۔ وہاں ہر طرح کے لوگ آتے رہتے ہیں۔ وہ ان میں سے کسی سے ملتا جلتا ہو تو مجھے نہیں معلوم۔“

”شری مان سنگھ کی بیوی کا نام کیا ہے؟“ اس بار میں نے سوال کیا تھا۔

”دلی پتی اور بہت خوب صورت عورت ہے۔ اس کا نام رجنی ہے۔ دیکھو تو ٹیکسوں میں الگ نظر آئے گی۔ پتا نہیں وہ سیٹھ موتن کی کس ادا کو پسند کرتی ہے!“

وہ جس رتبے کا آدمی تھا اس سے اسی سطح کے متعدد سوالات کئے گئے اور جب اس کی گفتگو میں موضوع کی تکرار ہونے لگی تو ظفر بے پروا نہ انداز میں اس کمرے میں سے نکلتا چلا گیا۔ میں نے اس کی تقلید کی۔

”تم نے غیر ضروری طور پر اس کے ساتھ نہایت بے رحمانہ سلوک کیا ہے“ ظفر کے دفتر میں آنے کے بعد میں نے حیرت آمیز لہجے میں کہا ”وہ اس سے کہیں کم تشدد میں راہِ راست پر آسکتا تھا۔“

”میں غیر ضروری حرکتوں سے عام طور پر دور رہتا ہوں“ وہ مسکراتے ہوئے پُر سکون لہجے میں بولا ”اس کی ٹھیک ٹھاک مرمت کے بعد موتن لال آسانی سے ہتھیار ڈال دے گا۔ یہ تمام محنت میں نے اسی کے لئے کی ہے ورنہ امرکار تو دو چار ہی تھپڑوں میں سیدھا جا سکتا تھا۔“

اچانک ایک شخص ایک رقعہ لے کر دفتر میں داخل ہوا اور ہم دونوں خاموش ہو گئے۔

اس کے چلے جانے کے بعد ظفر نے ایک گہرا سانس لیتے

سب سے موثر مزا صرف موت ہو سکتی ہے اور تم ابھی تک اسے اور اس کے خوابوں کو زندہ پکڑنے کے خواب دیکھ رہے ہو۔

”تم مجھے بتاتے کیوں نہیں کہ اس کے اور اس کے بدردوں کے بارے میں تم کیا جانتے ہو اور تمہارے جوئے کا اس کی ذات سے کیا تعلق ہے؟“ اس نے چڑ کر قدرے تیز لہجے میں کہا۔

”میری ان لوگوں تک رسائی ہے۔ وہ غیر سیاسی عزائم رکھنے والے عام مجرم ہیں۔ انہوں نے ہماری معاوضہ کے لالچ میں غلام رسول کو پولیس کی تحویل سے اغوا کر کے اپنے قبضہ میں رکھا ہوا ہے اور موقع ملنے ہی کسی بھی پرواز سے اسے باہر روانہ کرنا چاہتے ہیں تاکہ اسے بھارتیوں کی تحویل میں دے کر اپنا باقی معاوضہ وصول کر سکیں“ میں نے فایا کی کمائی میں حسب ضرورت ترمیم کرتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ اور اگر تم چاہو تو ان کے ٹھکانے تک ہماری رہنمائی بھی کر سکتے ہو؟“ اس نے مضطربانہ لہجے میں سوال کیا۔ وہ میری گفتگو سے آگے ہی چلا نکلیں لگا رہا تھا۔

”ہاں“ یہ درست ہے“ میں نے اپنی سنجیدگی پر قرار رکھتے ہوئے کہا ”اس کے اغوا کا مقصد میں نے نہیں بتا دیا لیکن بھارتیوں کو غلام رسول سے محبت نہیں ہے۔ وہ اسے ایک طاقتور مردہ کے طور پر استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا کاؤ سلیٹ اس کے لئے ہر قیمت ادا کرنے پر تیار ہو جائے گا۔“

”کھل کر بات کرو“ وہ مضطربانہ انداز میں بولا ”تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟“

”اگر میں مان سگھ سے قیدیوں کے تبادلے پر بات کروں تو وہ فوراً میرے جال میں پھنس جائے گا“ میں نے اس کے چہرے پر نظرسنما کر ابھٹکی سے کہا۔

وہ مٹھیاں بھیج کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور میری طرف پشت کر کے بولا ”تم نے سب کچھ تباہ کر دیا“ ذہنی مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم جیسا شخص بھی محبت کے معاملہ میں اتنا خود غرض ہو سکتا ہے۔ میرے دل میں تمہارا مقام بہت بلند تھا لیکن غلام رسول سے غزالہ کے تبادلے کی بات کر کے تم نے خود کو بہت سکڑ لیا ہے۔ اب میں کچھ نہیں سنوں گا۔ مجھے ان لوگوں کے نام پہنچے بتاؤ جنہوں نے غلام رسول کو اپنی حفاظت میں رکھا ہوا ہے۔ میں ان سب کے کلرے اڑا دوں گا“ ان کو فٹا کر دوں گا۔“

”کوئی آخری رائے قائم کرنے سے پہلے سکون سے بیٹھ کر میری پوری بات سنو!“ میں نے اکھڑے ہوئے، سرد لہجے میں کہا ”وہ تیزی سے میری طرف پلٹا تو اس کی آنکھوں میں برہمی کے آثار تھے۔“

”اپنے تیرور درست کرو!“ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا ”میں موت سے پہلے کبھی ڈرا ہوں نہ اب ڈرتا ہوں۔ اگر تم نے اپنا توہین آمیز رویہ نہ بدلا تو میں خون خرابا

مغادات یکساں ہیں۔ وہ دونوں اپنی اپنی حکومتوں کی نمائندگی کرتے ہیں جب کہ دیرا فرد واحد ہے۔“

”اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ اب دیرا ان لوگوں کی تحویل سے غزالہ کو حاصل نہیں کر سکے گی؟“ ظفر نے چونک کر سوال کیا۔ ”یہاں ہونا تمہارے حق میں بہتر ہو گا۔“

”بھیری کو غزالہ کی اہمیت کا علم ہے نہ اس کا اس سازش میں کوئی کردار ہے اس لئے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا۔ اس کے انجام کا دارومدار انڈین کاؤ سلیٹ کے رویے پر ہے۔ ان لوگوں نے دیرا کو ایک بار بھی قریب آنے کا موقع دیا تو وہ غزالہ کو نکال لے جائے گی۔“

”وہ لوگ غزالہ کو چارے کے طور پر بھی استعمال کر سکتے ہیں۔“ ظفر بولا ”دیرا کو بلائیں اور پکڑ کر بھیری کے خوالے کر دیں۔ اس طرح ان کے درمیان تیزی سے مغایت بڑھ سکتی ہے۔“

”چھ تو غزالہ بھی ماری جائے گی۔ اس کے بچاؤ کی ایک ہی صورت ہے کہ اب دیرا خطرہ بھانپ کر خودی انڈین کاؤ سلیٹ سے دور رہنے کا فیصلہ کر لے۔ مگر یہ سب قیاسات ہیں۔ میں وقت کھوتا نہیں چاہتا اس لئے تمہاری رضامندی سے ایک جوا کھیلنا چاہتا ہوں۔“

”وہ کیا؟“ ظفر صوفے پر آگے جھک کر ہمد تن گوش ہو گیا۔ ”تمہیں یاد ہو گا کہ تم غلام رسول کے بارے میں فکر مند تھے تو میں نے تمہیں ہوائی اڈوں کی طرف توجہ دینے کا مشورہ دیا تھا؟“ میں نے سنجیدگی کے ساتھ ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

”ہاں“ ”اچھی طرح یاد ہے۔“ اس نے پہلو بدل کر اضطراری لہجے میں کہا ”لیکن اس وقت غلام رسول کا ذکر کہاں سے آگیا؟ کیا تم اس کے بارے میں کچھ اور بھی جانتے ہو؟“

”خوش قسمتی سے میں ان لوگوں سے واقف ہوں جو اسے پولیس کی تحویل سے نکال کر لے گئے تھے“ میں نے ایک گہرا سانس لے کر کہا اور ظفر فرط حوش میں اپنی جگہ چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ ”اتنی اہم بات تم اب تک اپنے دل میں لئے بیٹھے ہو؟ مجھے ان لوگوں کے بارے میں بتاؤ اور پھر دیکھو کہ میری فورس ان کا کیا حشر کرتی ہے۔ غلام رسول کا معاملہ تمہارے اندازوں سے کہیں زیادہ عجیب ہے۔“

”سب کچھ درست ہے لیکن تم بھول رہے ہو کہ میں نے پہلے بھی تمہیں مشورہ دیا تھا کہ غلام رسول کو دیکھتے ہی گولی مار دیتا“ اس فتنے کا یہی انجام سب سے بہتر اور سودمند رہے گا۔ اس کے خلاف جرائم کی فرست بہت سنگین اور لمبی ہے لیکن عدالتوں میں بعض جرائم ثابت نہیں کئے جا سکیں گے اور وہ ان الزامات سے بری ہو جائے گا۔ اسی کے ساتھ اس کے کہیں میں ایسے ایسے نیک ناموں اور پردہ نشینوں کے کثرت سامنے آئیں گے کہ ملک کا پورا سلامتی اور سیاسی شیرازہ کھم کر رہ جائے گا۔ اس کے لئے واحد اور

شروع ہو جائے گا۔ میں ذلت کی زندگی پر عزت کی موت کو ترجیح دیتا ہوں۔“

اس نے اتنی قوت کے ساتھ اپنے دانت بھیجے کہ اس کے جڑوں پر ویدیں اُھر آئیں پھر وہ ایک جھٹکے سے یوں صدمے پر بیٹھ گیا جیسے وہ کوئی ناپسندیدہ فعل رہا ہو۔ پھر بولا ”کہو!“

”میں خود غرض ہوتا تو یہ تبادلہ تم کو اعتماد میں لے بغیر بھی کر سکتا تھا“ میں نے برہمی سے کہا ”اس کے لئے مجھے کسی سورا کا سارا لینے کی ضرورت نہیں تھی“ میں کن آنکھیں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن وہ مسلسل فرش کی طرف ٹھکراں تھا اور اپنے داہنے جوتے کی نوک سے پختہ فرش پر یوں ٹھکرائیں لگا رہا تھا جیسے یوں ہی اسے ادھر ڈالنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ میرے تلخ و ترش الفاظ پر اس نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا تھا بلکہ بالکل خاموشی اور توازن کے ساتھ اسی شغل میں مصروف رہا تھا۔

”غزالہ میرے لئے سب کچھ نہیں تو بہت کچھ ضرور ہے“ میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”میں اسے بے یار و مددگار نہیں چھوڑ سکتا اسی وجہ سے میرے ذہن میں غلام رسول کا خیال آیا تھا۔ وہ لوگ غزالہ کو لائیں گے اور میں غلام رسول کو لے جاؤں گا۔ تمہاری نفی انتظار کرے گی اور جوں ہی تبادلہ عمل ہو گا تو تمہارے آدمی چھاپا مار کر بھارتی سفارت کاروں کو غلام رسول سمیت پکڑ لیں گے۔“

اس نے پہلی بار سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور کافی دیر تک چلیں جھپکے بغیر یوں ہی دیکھتا رہا۔ اس کے ایک دوسرے میں پوسٹ لب جدا ہو گئے تھے، دانتوں کی مشقت ختم ہو گئی تھی، جڑوں کی ویدیں جلد میں معدوم ہو چکی تھیں اور چہرے کے سنے ہوئے عضلات ڈھیلے پڑ گئے تھے پھر ایک اس کی دونوں آنکھوں میں نمی اُٹھ آئی، اس کے حلق سے پھلکی جیسی ایک خفیف سی آواز برآمد ہوئی اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر پوری قوت کے ساتھ مجھ پر آچرا۔

میں بیٹھا ہوا تھا، وہ کھڑا ہوا تھا۔ اس لئے پوری طرح بغل گیر ہونا ممکن نہیں تھا لیکن اس نے اپنا پورا وزن میرے شانوں پر ڈالا ہوا تھا اور اس کا بدن طوفان کی زد میں آئے ہوئے کسی خزاں رسیدہ پہنے کی طرح تیزی سے لرز رہا تھا ”مجھے معاف کرو“ مجھے معاف کرو“ ڈیٹی! میں تمہاری عظمت کو لاکھوں سلام کرتا ہوں۔ میری جلد بازی نے تمہارا دل دکھایا ہے، مجھے معاف کرو!“

وہ پتھریوں اور سسکیوں کے درمیان میں بھرائی ہوئی آوازیں کہہ رہا تھا۔

میرا سینہ غور سے پھول گیا۔ میری انا کو بڑی مدتوں کے بعد بھرپور خوراک میسر آ رہی تھی۔ میں نے دانستہ جواب دینے میں تاخیر کی۔ بس اتنا کہ اس کی پشت سلانا رہا۔ سلطان شاہ بھی ہمارے قریب آکھڑا ہوا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس ڈرامائی صورتحال میں کیا کرے۔

”اپنی جگہ پر بیٹھو!“ آخر کار میں نے زبان کھولی ”غیبت کہ تم کو فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ورنہ آن واقعی بیٹھ جاتی نہ رہتا۔ دشمنوں کے بدترین الزامات بھی انسان بن کر بردہ رہے لیکن دوستوں کے برے تیور بھی دلوں میں گھاؤ ڈال دیتے ہیں غیبت یہ ہے کہ تم کو فوراً ہی اپنی غلطی کا اندازہ ہو گیا ورنہ تناہ دوستی ایک دن بھی برقرار نہ رہ پاتی۔“

سلطان شاہ نے اسے سارا دیا اور مجھ سے الگ کر کے اس کی جگہ پر بٹھایا۔

ان چند ہی منٹوں میں ظفر کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں اور چہرے سے ہی دل گرفتہ نظر آ رہا تھا۔ خاصی دیر تک ہم اس ناخوش گوار واقعے کے اثرات کو ذائل کرنے کی کوششوں میں مصروف رہے اور آخر کار ظفر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لانے میں کامیاب ہو گئے۔

”مجھ میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ میں منافقانہ انداز پر بھی دشمن کی تعریف برداشت نہیں کر سکتا اور اس وقت میری یہ خرابی میری شرمندگی کا باعث بن گئی۔“

”خدا کسی پر ایسا برا وقت نہ لائے لیکن کبھی کبھار دشمن کی فو میں رہ کر وہ سب سنا اور برداشت کرنا پڑتا ہے جس کا قصور مجھ حال ہے“ سلطان شاہ نے کہا ”ہم لوگوں نے بارہا دشمنوں کی غفلت میں رہ کر کام کیا ہے اس لئے ایسے معاملات میں جذبات کے بجائے عقل سے کام لینے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ایسے ہر موقع پر خود کا قہ نہ رکھا جائے تو زندگی بہت مختصر ہو سکتی ہے۔“

”میری خوش قسمتی یہی ہے کہ میں نے آج تک کسی دشمن کی قید کا مزا نہیں چیکھا“ وہ پہلی بار پشیم مسکراہٹ کے ساتھ بولا ”لیکن آج تمہارے ساتھ مجھے جو ذہنی جھکا ملا ہے“ اسے میں زندہ بھر فراموش نہیں کر سکوں گا۔ مجھے خوشی ہے کہ اس ناخوش گوار واقعے کے بعد بھی ہماری دوستی قائم ہے۔“

”پھر اب یہ بتاؤ کہ غلام رسول کے تبادلے کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟“ میں نے قدرے توقف کے بعد سوال کیا ”اس مشن کی کامیابی کا تمام تر انحصار تمہاری کارکردگی پر ہو گا۔“

”اپنے معاملات کو تم بہتر طور پر سمجھتے ہو لیکن میرا اندازہ ہے کہ غلام رسول کو اغوا کرنے والے اتنی آسانی کے ساتھ اس تمہارے حوالے کرنے پر آمادہ نہیں ہوں گے۔“ اس نے کہا۔

میں اسے کیا بتاتا کہ غلام رسول کسی اور کی نہیں بلکہ سلطانہ مافیا کی قید میں تھا جہاں سارے عملی اختیارات میرے پاس تھے۔ میں سینہ حبیب جوانی کو کوئی بھی پیڑھا کر غلام رسول کو۔ آسانی اپنے ساتھ باہر لا سکتا تھا۔ اس سے آگے اس کی اور مان گئے۔ مگر قمار کی کاسینوئل بننا تو میں بے آسانی ساری ذمہ داری مان گئے۔ ڈال کر اپنی گردن بچا سکتا تھا۔

”وہ ایک اگم مسئلہ ہے“ میں نے کہا ”اگر غلام رسول قید

بتایا جاسکتا تھا کہ اس کی بیوی موتن لال سے خفیہ ملاقات کے لئے جاتے ہوئے اغوا کی گئی ہے۔ اس طرح اس واقعے میں اس کی عزت نفس بھی داؤ پر لگ جاتی اور وہ جلد از جلد خفیہ انداز میں اس معاملے کو نمٹانے کی کوششوں میں مصروف ہو جاتا۔

ظفر کا خیال تھا کہ شاید ہم اس کی تجویز سے اتفاق نہیں کریں گے لیکن جب ہم نے کھل کر اس کی تجویز کی داد دی تو اس کے

میں نہیں تو پروگرام پر عمل ہوگا ورنہ اسے وہیں ٹھپ کر دیا جائے گا۔ اگر تم راضی ہو تو میں کم از کم شری مان سنگھ سے مذاکرات کی وارنٹیں ڈال سکتا ہوں۔ اس طرح ہم دیر کے لئے ہر راہ مسدود کر دیں گے۔“

”میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ اس شکار کے لئے غلام رسول ضرورت سے زیادہ بڑا چارہ ہے۔ ہم تشہیر اور ابلاغ کے معاملے میں بھارتیوں سے بہت پیچھے ہیں۔ وہ اس واقعے کو ہمارا بتایا ہوا ایکٹیل ثابت کر دیں گے اور ہمارے لئے دشواریاں کھڑی ہو جائیں گی۔“

”یہ تم اس لئے کہہ رہے ہو کہ ہم یہاں بیٹھ کر منصوبہ بنا رہے ہیں۔ باہر کے آدمی کی نگاہ سے دیکھو گے تو ہمیں اس منصوبے میں کوئی نقص نظر نہیں آئے گا۔“

”سب سے بڑا اور بنیادی نقص تو یہ ہے کہ اس واقعے کے بعد غزالہ کا نام بھی اخبارات میں آئے گا۔ وہ ایک گمراہ سانس لے کر بولا ”شری مان سنگھ اس موضوع پر اپنی زبان بند نہیں رکھے گا اور اگر ویرا بھی اس آگ پر تیل چھڑکنے پر تیل مٹی تو ہمارا نام بھی اس کمائی سے تقبی ہو جائے گا اور تم پاکستان میں آزادانہ زندگی بسر کرنے کے حق سے ایک طویل مدت کے لئے محروم ہو جاؤ گے۔“

اس کی وہ دلیل بہت وزنی تھی۔ سچی بات یہ ہے کہ اس بارے میں ہم میں سے کسی نے غور ہی نہیں کیا تھا۔ قومی سطح کے اس واقعے کے ہر کردار کے بارے میں مقامی اخبارات اپنے ذرائع سے معلومات حاصل کرتے اور میرا ماضی ایک مرتبہ پھر ڈراؤنا خواب بن کر میرے سامنے آ جاتا۔

”اتفاق کی بات ہے کہ اس وقت ہمارے پاس ایک مہرہ اور بھی ہے“ ظفر نے چند ثانیوں کی خاموشی کے بعد کہا ”اپنی ذہانت سے تم اسے بھی استعمال کر سکتے ہو۔ میرا خیال ہے کہ مان سنگھ بھی اس واقعے کو خاموشی کے ساتھ نمٹنا چاہے گا اور غزالہ بہ آسانی تمہاری تحویل میں آجائے گی۔“

”وہ کیا؟“ ہم دونوں نے بیک وقت متحسانہ لہجے میں سوال کیا۔

”موتن لال ہماری مضبوط گرفت میں ہے۔ اس کا ڈرائیور ہمیں بتا چکا ہے کہ شری مان سنگھ کی بیوی ”رجنی“ موتن لال کے عشق میں جلا ہے۔ ہم موتن لال کو مجبور کر سگے کہ وہ فون کر کے رجنی کو ملاقات کے لئے طلب کرے۔ مان سنگھ اس وقت دفتر میں ہے۔ رجنی فوراً دوڑی چلی آئے گی اور اسے اغوا کر کے یہاں لے آیا جائے گا۔ تم مان سنگھ سے غزالہ کے بدلے میں رجنی کی واپسی کا سودا طے کر سکتے ہو۔“

ظفر کی وہ تجویز سن کر میں مسرت سے اچھل پڑا۔ وہ واقعی بالکل سامنے کی اور سہل تجویز تھی جس پر کسی کا دھیان نہیں جاسکتا تھا۔ مان سنگھ کو بھرپور انداز میں بلیک میل کرنے کے لئے یہ

معیاری نفسیاتی علمی کتابیں

ان کتابوں کا مطالعہ آپ کی شخصیت کے کھارنے، آپ کو صحت مندر کھنے اور کامیابیاں حاصل کرنے کے لیے مددگار ثابت ہو گا۔

۳۰/-	دست شناسی کے نئے رخ	۳۰/-	ٹیلی پسی، مستقبل بینی
۲۵/-	تحریر اور شخصیت	۳۰/-	ٹیلی پسی کی جدید تحقیقات
۳۰/-	مسائل اور حل	۲۵/-	ہیٹائزم
۲۵/-	باخبری	۳۰/-	ہیٹائزم کے عملی طریقے
۲۵/-	چھترت انگریز طوم	۳۰/-	ہیٹائزم کی جدید تحقیقات
۲۵/-	احسا کی مٹری	۵۰/-	ذاتی ہیٹائزم
۲۵/-	گرینٹ نوشی چھوڑیے	۲۵/-	خوابوں کے اسرار
۲۵/-	کامیابی	۳۰/-	عورتوں کی نفسیات
۳۰/-	کرائے	۳۰/-	متناظریات
۲۵/-	مٹاپا اور اس کا سترواب	۳۰/-	ازدواجی نفسیات
۲۵/-	خوف شرم اور اس کا سترواب	۳۰/-	خوف شرم اور اس کا سترواب
۲۵/-	استھان میں کامیابی	۲۵/-	ظفر کی گزشتہ اور اس کا سترواب

افندون ملک ڈاک خرق ایک یا دو کتابوں کا ۱۰ روپے۔
۳ یا ۴ کتابوں کا ۱۳ روپے ہوگا۔ رقم صرف فی آرڈر کے ذریعے بھیجیں

بیرون ملک اخراجات

بیرون ملک ڈاک خرق مشرق وسطیٰ ۳۰ روپے فی کتاب اور
مشرق بعید ۳۰ روپے فی کتاب آسٹریلیا و امریکا ۳۰ روپے فی کتاب
رقم چیک ذریعہ ڈرافٹ ارسال فرمائیں کہ قسم کی
نقد رقم فغانے میں نہ رکھیں۔ ڈرافٹ اس نام پر بنوائیں۔

MAKTABA NAFSIAT A/C 688 H. B. L
MANSFIELD STR. BR. KARACHI

مکتبہ نفسیات، پوسٹ بکس ۱۲۲، کراچی ۱

چرے سے وہ تمام اداسی دھل گئی جو غلام رسول والی تلخ بحث کے بعد اس کے چرے پر جم کر رہ گئی تھی۔

ظفر کے استخار پر پتا چلا کہ موتن لال کافی دیر پہلے ہوش میں آچکا تھا اور اپنی عمرانی پر مامور افراد کو بار بار دھمکیاں دے رہا تھا۔ ظفر کے ایما پر امرکار کے زخموں کی کوئی دیکھ بھال نہیں کی گئی تھی۔ ویسے بھی اسے کوئی شدید اندرونی ضرب نہیں لگائی گئی تھی بلکہ سارے ہی چلدی زخم تھے جو کوئی علاج نہ ہونے کے باوجود بھی چند روز میں بھر سکتے تھے۔ اس لئے وہ خون آلود، تار تار لباس میں اسی حالت میں فرش پر پڑا ہوا تھا۔

موتن لال کو دو گز مل جوانوں نے زبردستی اس کمرے میں پہنچایا تو وہاں قدم رکھتے ہی موتن لال اپنی ساری چوڑی بھول گیا۔ اس کی خوف سے پھٹی ہوئی نگاہیں امرکار کے زخموں پر جم کر رہ گئی تھیں۔

اسے دیکھ کر امرکار کے درم آلود، زخمی ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ ابھر آئی اور وہ زہریلے لہجے میں بولا ”سیٹھ، دیکھ لو کہ تمہاری حرکتوں کی وجہ سے میں کس حال کو پہنچا ہوا ہوں۔ میں نے کسی شریف آدمی کی نوکری کی ہوتی تو اس انجام سے دوچار نہ ہوا ہوتا۔ ویسے تم فکر نہ کرو۔ یہ لوگ تمہارے ساتھ بھی کوئی رعایت نہیں کریں گے۔ تمہیں مجھ سے زیادہ حصہ ملے گا۔“

”تو پاگل ہو گیا ہے، امرکار؟“ موتن لال اس پر آنکھیں نکال کر غریبا ”میں نے کون سی مباحثی کی ہے جس کا تعلق طعنہ دے رہا ہے۔“

اچانک ظفر نے موتن لال کے منہ پر ایک زنانے وار تھپڑ رسید کیا اور وہ لڑکھاتا ہوا اپنی قدم پیچھے چلا گیا۔ اس غیر متوقع تھپڑ نے اس کے اوسان خطا کر دیے تھے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس سے کسی باز پرس کے بغیر ابتدا ہی زوردار تھپڑوں سے ہوگی۔

امرکار اپنے سیٹھ کی اس تواضع پر زور سے ہنسا اور بولا ”میری بید سے پانی ہوئی تھی۔ قیمت ہے کہ انہوں نے تمہیں چمار نہیں سمجھا اور ہاتھ سے مارا ہے۔۔۔۔۔“

”میاں آواز نیچی رکھو، سیٹھ، موتن لال!“ ظفر نے امرکار کی یکو اس کی پروا کئے بغیر بڑیوں میں پوست ہو جانے والی کاٹ دار آواز میں کہا ”میاں امرکار تمہارا نوکر نہیں بلکہ تمہاری ہی طرح ہمارا ایک قیدی ہے اور قیدیوں کو ڈانٹنا پھنکارنا ہمارا حق ہے۔“

”تم کون لوگ ہو اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“ وہ اپنا رخسار سلالتے ہوئے کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ وہ ایک معزز شہری بنا ہوا تھا اس لئے ظفر کے بے رحمانہ سلوک نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

”دوسری بات یہ بھی یاد رکھنا کہ ہم اپنے کسی قیدی کو سوال کرنے کا کوئی حق نہیں دیتے۔“ ظفر نے یہ کہتے ہوئے، آگے بڑھ کر پھر ایک تھپڑ رسید کیا جو اس کے ہاتھوں پر پڑے کیوں کہ اس نے

اپنے دونوں رخسار ہاتھوں سے چھپائے ہوئے تھے۔ ظفر کہہ رہا تھا ”ویسے تم نے پوچھ ہی لیا ہے تو سنو کہ ہم لوگ تمہاری دھمنوں پررجی بانی کا مجرا دیکھنا چاہتے ہیں اس لئے فوری طور پر فون کر کے اسے لال کو ٹھہرے بلالو، ہمارے آدمی اسے عزت اور احترام کے ساتھ یہاں لے آئیں گے۔“

اس نے خوف، دہشت اور بے بسی سے امرکار کی طرف دیکھا جس کے چرے پر زخموں کے باوجود شیطانی چمک نظر آ رہی تھی لیکن موتن لال زبان سے ایک لفظ بھی نکالنے کی ہمت نہیں کر سکا۔

سلطان شاہ کمرے سے باہر رکھا ہوا اسپیکر فون اٹھا کر اندر لے آیا۔

”فون کرو!“ ظفر نے غرا کر موتن لال کو حکم دیا۔

”مہم..... مگر میں اس سے کیا کہوں گا؟“ موتن لال رو دینے والی آواز میں کراہا۔

”وہی جو آج سے پہلے بار بار کہتے رہے ہو“ ظفر نے زہریلے لہجے میں کہا ”لیکن یہ یاد رکھنا کہ وہ لال کو ٹھہرے آئے گی اس فون پر اس کی آواز بھی ہمیں سنائی دے گی۔ تم نے کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو میں فوراً ہی تمہارا رخسار بادلوں گا۔“

”لل..... لیکن ابھی بت سو رہا ہے اس کا پتی گھر ہو گا۔ میں بیشہ دوسرے کے قریب اس سے بات کرتا رہا ہوں۔ جب وہ گھر میں اکیلے ہوتی ہے“ وہ رک رک کر بے چارگی کے ساتھ بولا۔ ظفر نے اس پر بس ویش کے تمام دروازے سے پہلے ہی بند کر دیے تھے۔

”مان سنگھ دفتر میں ہے، وہ گھر پر اکیلے ہی ہوگی۔ تم نے اس سے روتی ہوئی آواز میں بات کی تو میں تمہاری زبان گدی سے کھینچ لوں گا۔ وہ خوش ہوگی کہ آج تم اس کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے کا ارادہ رکھتے ہو۔“

”پہلے مجھے پانی چاہئے۔ میرا گلا خشک ہو رہا ہے“ اس کی آواز واقعی حلق میں پھنسن رہی تھی۔

پانی پینے کے بعد وہ ایک ڈیڑھ منٹ تک اپنے اوسان بحال کرتا رہا۔ جب وہ فون کی طرف بڑھا تو ظفر امرکار کی طرف گھوم گیا ”اب تم اپنی زبان بند رکھو گے۔ بولے تو بری طرح دھتکاؤ گے۔“

امرکار اثبات میں سر ہلا کر گیا اور ظفر نے مٹن دیا کر اسپیکر فون آن کر دیا۔

دوسری تھنٹی کے بعد وہ کمرے کی فضا ایک مترنم نسوانی تیلو سے گونج اٹھی۔

”ہائے موتی ڈارنگ! تم کہاں ہو؟“ بولنے والی اس کا نام سننے ہی ایک دم سرور میں آگئی ”میں دس بار تمہارے گھر فون کر چکی ہوں لیکن تمہارے دونوں نمبر ڈیڈ پڑے ہوئے ہیں۔ مان سنگھ بھی

رغبت سے کھاتے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ یہ علاج دس پندرہ منٹ میں ہی اثر دکھانے لگتا ہے۔“

”ان دہشت گردوں سے میرا دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں تھا۔ میرا قصور صرف اتنا تھا کہ میں اپنی برادری کے بڑے کی ہدایت پر اپنی چھٹی موتی جاکر اسی نام قیت پر ایسے ضرورت مندوں کو دیتا رہا جنہیں میں خود نہیں جانتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری وہ بھلائی ایک دن میرے گلے پڑ جائے گی۔“

”حالاں کہ تمہارے بیشتر خریدار مسلمان تھے۔ صرف ایک مکان تم نے کسی ہندو کو بیچا تھا۔“

”وہ مذہب ذات اور برادری کی بات نہیں تھی۔ چودری نے جس کا نام دیا میں نے اسی کو مالک بنایا۔ شاید اسے پہلے سے سب کچھ معلوم تھا اور وہ آنے والے دنوں کے لئے انہیں پال رہا تھا۔“

”وہ کون ہے؟“ ظفر نے برف کی طرح سرد اور چرسکون لہجے میں پوچھا۔

”چودری رام دیو۔ لیکن وہ پچھلے برس ایک حادثے میں مر چکا ہے۔ اس کی جگہ لینے والے نے آج تک مجھ سے ایسا کوئی کام نہیں لیا جو کچھ لیتا ہے، برادری اور کنہہ کے لئے لیتا ہے۔“

”اور جل ترنگ کا کیا ڈھونگ ہے؟“ ظفر کا باز پرس کا انداز موتی لال کو دھلائے دے رہا تھا۔

”مجھے کچھ علم نہیں کہ ان دھون میں کیا ہوتا ہے۔ رجنی خود بھی جل ترنگ بجانے میں بہت ماہر ہے۔ پروگرام سے ایک دو دن پہلے وہی مجھ کو مشق کرائی ہے۔ دھنیں اس کی ہوتی ہیں میں صرف بجاتا ہوں۔ میں ہاتھ جوڑ کر کہہ رہا ہوں کہ میرے بارے میں تمہیں بھگایا گیا ہے۔ میں شراب اور عورتوں کا شوقین ضرور ہوں لیکن یہ سب پیسے والوں کے فیشن ہیں میں تم کو بیسیوں نیک نام اور پارسا مسلمان دوسرے نام گنوا سکتا ہوں جن کے ساتھ میرا اٹھنا بیٹھنا لگتا ہے۔ تم نے بلاوجہ مجھ اکیلے کو پکڑ لیا ہے۔“

”ٹھیک ہے موتی ڈارنگ!“ ظفر نے خشک لہجے میں کہا ”اس وقت تم آرام کرو۔ تمہاری مسئلہ پر ہم بعد میں غور کریں گے۔ تم بے گناہ ہوئے تو تمہاری گلو خلاصی ہو جائے گی۔“

موتی لال اظہار ممنونیت میں دونوں ہاتھ جوڑ کر رکوع کی حالت میں جھک گیا اور ہم تینوں اس کمرے سے نکل آئے جہاں دونوں قیدی موجود تھے۔

”موتی لال تم کو متاثر کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے“ ظفر کے دفتر میں آنے کے بعد میں نے کہا۔

”ہرگز نہیں!“ اس نے مکارانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا ”مجھے اس کی ایک بات پر بھی یقین نہیں ہے۔ غزالہ کا معاملہ نمٹ جائے پھر اس کی لگامیں کھینچوں گا۔ اس وقت میں اس پر مزید تشدد سے گریز کر رہا ہوں۔“

وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ جب تک غزالہ بخیر رعایت ہماری

آج مارکیٹ سے سیدھا دفتر چلا گیا۔ اس نے فون کیا تھا کہ اس کی کار بیکری سے پہلے خراب ہو گئی تو وہ ٹیکسی سے سیدھا دفتر چلا گیا۔ ہمارے وہاں سے مسز بیج سکے۔ وہ آواز سے پریشان لگ رہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس کے ساتھ آج کوئی گزربز ہوئی ہے۔ میں نے اسی لئے تمہیں فون کیا تھا۔“

”تمہیں اس کی اتنی فکر کب سے ہو گئی؟ اسے چھوڑو اور لال کو غمی آجاؤ۔ میرا پرانا ڈرائیور بیمار ہے۔ میں کسی اور کو بھیجوں گا۔ ملو گی تو پھر باتیں ہوں گی“ اس نے کہا ”میں ہوٹل میں تمہارا منتظر رہوں گا۔“

”ہاؤ سویت ڈارنگ! میں ابھی نکلتی ہوں۔ مجھے مان گھک کی طرف سے بہت فکر ہے۔ تم سے ملوں گی تو ذہن پر سے بوجھ کچھ کم ہو جائے گا۔ تم میرا کتنا خیال رکھتے ہو!“

ان دونوں میں مزید چند بے ہودہ اور لچر مکالمات کا تبادلہ ہوا اور پھر موتی لال ہی نے بات مختصر کر کے فون منقطع کر دیا اور اپنی عرق آلود پیشانی کو آستین سے خشک کرنے لگا۔ گفتگو ختم ہونے کے بعد بھی وہ اندامت کی وجہ سے کسی سے نظریں چار نہیں کر رہا تھا۔ اس کے اضطرابی رد عمل سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ عیاش اور رنگین مزاج ضرور تھا لیکن اس میں شرم دھماکا عنصر بالکل ہی ختم نہیں ہوا تھا۔

رجنی کو لینے کے لئے میں نے جانا چاہا لیکن ظفر نے مجھے روک دیا۔ موتی لال کی بتائی ہوئی نشانیوں کی بنا پر کوئی انجینی بھی اسے بہ آسانی پہچان سکتا تھا اس لئے ظفر نے اپنے عملے کے ایک آدمی کو سمجھا بجھا کر رجنی کو لانے کے لئے بھیج دیا اور خود اسی کمرے میں لوٹ آیا جہاں ہم لوگ موجود تھے۔

”تم دیکھ چکے ہو کہ ہم سیدھے سادے لوگ ہیں“ اس نے آتے ہی موتی لال سے گفتگو شروع کر دی ”جس کے دشمن ہوتے ہیں اس سے ذرا سی بھی رعایت نہیں کرتے اور تم بد قسمتی سے ہمارے دشمن ہی ہو اس لئے میں تم سے صرف دو سوالات کے جواب سنتا چاہتا ہوں۔ اول یہ کہ ضمانت پر رہا ہونے اور پھر بری ہونے والے سات دہشت گردوں سے تمہارا کیا تعلق تھا اور دوم یہ کہ تم اپنی دھنوں میں کس کے لئے پیغام مرتب کرتے ہو؟ وہ کون لوگ ہیں اور ان سے تمہارے دیگر روابط کیا ہیں؟“

”میں کسی کو نہیں جانتا۔ میں یہاں کا شہری ہوں اور قانون کا پورا پورا احترام کرتا ہوں“ وہ خوف زدہ آواز میں بولا مگر ظفر کے سوالات پر اس کا چہرہ دھواں ہو چکا تھا۔

”پھر مجھے تمہاری یادداشت واپس لانے کا بندوبست کرنا پڑے گا“ ظفر نے اسے گھورتے ہوئے ترحم آمیز لہجے میں کہا ”رجنی کو تمہیں اس حال میں دیکھ کر صدمہ ہوگا۔ میں تمہاری دونوں ٹانگیں جبر کرختوں پر ایک ڈنڈا بندھواؤں گا اور تمہارے جسم پر سرخ جیوتے چھوڑ دیے جائیں گے جو انسانی گوشت کے ریشے بہت

پہلی بار غلط نمبر لگا، دو مرتبہ مان سنگھ کی لائن مصروف تھی۔ چوتھی کوشش بار آور ہوئی اور دوسری طرف سے ”ہیلو! مان سنگھ اسپیکنگ“ کی آواز سنتے ہی میرا دل اچھل کر حلق میں آیا۔

”میں تمہارا ایک ہمدرد بول رہا ہوں“ میں نے بھاری اور سیاہ آواز میں کہنا شروع کیا ”اور یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تمہاری بیوی اس وقت میری تحویل میں ہے۔“

”رک کیوں گئے؟ بات پوری کرو!“ اس کا لہجہ چڑانے والا تھا۔

”شاید تمہیں رجنی کی زندگی عزیز نہیں ہے جو اس لیے میں بات کر رہے ہو“ میں غریبا۔

”رجنی کے نام سے تمہارا واقف ہونا اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ وہ واقعی تمہارے قصبے میں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ اس وقت شہر کے کسی بڑے ہوٹل میں میرے گہرے دوست کے ساتھ ہوگی۔ پھر میں تمہاری بات پر کیسے یقین کر سکتا ہوں۔ تم گھٹیا سپنس پیسہ اگر کے ملاؤ میرا اور اپنا وقت برباد کر رہے ہو۔“

اس کے الفاظ سے مجھے شدید ذہنی جھٹکا لگا ”اگر تم اس قدر خبیث اور بے غیرت انسان ہو کہ اپنی بیوی کی ٹوہ میں لگے رہنے کے باوجود اس پر کوئی روک ٹوک عائد نہیں کرتے تو.....“

”بس!“ اس نے فوراً میری بات کا ٹدی ”میں اس کی ٹوہ میں رہتا ہوں یا وہ میرے مشورے سے ہر جگہ آتی جاتی ہے؟ یہ ہمارے ذاتی معاملات ہیں۔ تم اس میں دخل دینے والے کون ہوتے ہو؟“

”میں تمہیں یہ بتا رہا تھا کہ تمہارا موتن لال نامی جگہری دوست بھی ہمارے پاس ہے اور رجنی اس سے ملنے ملانے کے لئے یہیں لائی گئی ہے“ میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔

”اوہ! تو تم اس کا نام بھی جانتے ہو!“ اس بار شری مان سنگھ کی آواز قدرے پُر تشویش تھی ”اگر تم رجنی سے میری بات کرو اسکو تو میں تمہاری کمائی پر اعتبار کر لوں گا۔“

”فی الحال موتن لال سے بات ہو سکتی ہے“ میں نے ہنسنے ہوئے لہجے میں کہا۔

”شاید وہ مجھ سے بات نہ کرنا چاہے.... چلو، تم فی الحال ای سے بات کر دو!“

اسے لائن ہولڈ کرانے کے بعد موتن کو فوری طور پر وہاں طلب کیا گیا لیکن جوں ہی اسے بتایا گیا کہ اسے فون پر مان سنگھ سے بات کر کے رجنی کے وہاں موجود ہونے کا یقین دلانا ہے تو دہتے سے اکھڑ گیا اور بدک کر فون سے دور ہٹ گیا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ مان سنگھ اس کے اور رجنی کے تعلق سے بے خبر تھا۔ وہ رجنی کے حوالے سے گفتگو کر کے اپنی برسوں پرانی دوستی کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا تھا۔ جب ظفر نے ذہریلے لہجے میں اسے بتایا کہ مان سنگھ نہ صرف ان کے میل جول بلکہ تازہ ترین ملاقات کے تفصیلی پروگرام سے بھی واقف ہے تو موتن لال کا چہرہ زور پڑ گیا اور اس

تحویل میں نہ آجاتی، کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ کہاں موتن لال کی ضرورت پیش آجاتی۔ جب تک اس کی چمڑی پچی ہوئی تھی، وہ ہم سے بے چوں و چرا تعاون کرتا رہتا لیکن جس دن جو تم میزبان کی کھلی ابتدا ہو جاتی، وہ ہٹ دھرمی پر آمادہ ہو سکتا تھا۔

ظفر نے مجھے مان سنگھ کو فون کرنے کا مشورہ دیا لیکن میں رجنی کے آنے سے پہلے ایسا کوئی قدم اٹھانے کے حق میں نہیں تھا۔ حالات نے مجھے یہ تلخ سبق سکھایا تھا کہ بعض اوقات جیتتی ہوئی بازی بھی آخری چند لمحات میں الٹی ہو جاتی ہے اس لئے آتش کی اصطلاح میں جب تک آخری پتہ نہ کھیل لیا جائے، بیت کا گمان اچھا نہیں ہوتا۔

تھوڑی دیر بعد ایس ٹی ایف کا ایک لبا ترنگا جوان اپنے شملے پر ایک سبک اندام بے ہوش لڑکی کو لادے رہا داری میں سے گزرا تو میں اس حسین چہرے کی ایک جھلک دیکھنے ہی بھونچکا رہ گیا۔

”یہ تو بے ہوش معلوم ہو رہی تھی!“ سلطان شاہ نے احتیاط انداز میں تبصرہ کیا۔

”جہنیں واپس جانا ہو“ انہیں بے ہوشی کی حالت میں ہی یہاں لایا جاتا ہے۔ اس کے سامنے جانے سے پہلے ہم لوگ اپنے چہروں پر نقائیں بھی چڑھالیں گے تاکہ رہا ہونے کے بعد وہ ہماری نشان دہی نہ کر سکے۔ دنیا بہت چھوٹی ہو چکی ہے پتا نہیں اس سے کہاں آتنا سامنا ہو جائے۔“

”ابھی تو وہ بے ہوش ہے۔ میں اسے ایک نظر دیکھ کر آتا ہوں“ میں نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔

ایس ٹی ایف کے آدمی نے بے ہوش رجنی کو احتیاط کے ساتھ اس کمرے کے فرش پر لٹا دیا تھا جہاں موتن لال امرکار کے ساتھ قید تھا۔ میں نے رجنی کو دیکھا اور اس کے حسن سے مرعوب و مبسوت ہو کر رہ گیا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے موسم سے تراشی ہوئی ایک معصوم اور قدر آدم گزیا فرش پر لیٹی ہوئی ہو۔

موتن لال ولمانہ انداز میں اس کے قریب آتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور اس نے رجنی کا سر ننگے فرش سے اٹھا کر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ اسے میری موجودگی کا لحاظ نہ ہوتا تو وہ رجنی کو اسی وقت اپنی بانہوں میں سیٹھ لیتا اور دنیا و مافیہا سے تعلق ہو جاتا۔

میں کئی سکنڈ تک اسی حالت میں کھڑا رجنی کا چہرہ دیکھتا رہا۔ معاً میرے ذہن میں اس کی اور موتن لال کی فون پر ہونے والی گفتگو گونجنے لگی اور رجنی کا رنگ روپ یکفخت اپنی کنش کھو بیٹھا۔ وہ ایک معزز شخص کی بیوی تھی لیکن بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ اپنے شوہر کو قریب دے کر، اس کے جگہری دوست سے دوستی بھاری تھی۔ میں ایک جھٹکے کے ساتھ فوراً ہی واپس حل دیا۔

اس دوران میں ظفر نے اپنے آدمی کے ذریعے شری مان سنگھ کا فون نمبر تلاش کر لیا تھا۔ میں فون اپنی گود میں لے کر، دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ نمبر لگانے میں مصروف ہو گیا۔

لوگوں کو میرے بارے میں تفصیلی معلومات فراہم کر دی تھیں تاکہ میرے خلاف وہ محاذ بھی سرگرم عمل ہو جائے۔
 ”میرا خیال تھا کہ وہ اپنی بیوی کے اغوا کی خبر سننے ہی تباہی پر رضامند ہو جائے گا لیکن اس نے رجنی سے بات کرنے کی جو شرط عائد کی ہے اس سے معاملہ مشکوک ہو گیا ہے“ کچھ دیر خاموشی کے بعد سلطان شاہ نے فکر مند انداز میں کہا۔
 ”اگر اس نے تباہی سے انکار کر دیا تو ہم رجنی کو کہاں لے جائیں گے؟“ ظفر نے پوچھا۔

”اس کی نوبت نہیں آئے گی“ میں نے مضبوط لہجے میں کہا ”وہ ایک سفارت کار ہے اور ہر سفارت کار مذاکرات میں اس قسم کے آخری حربے استعمال کر کے اپنے حریف پر نفسیاتی دباؤ بڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ بس اپنے کانوں سے رجنی کی آواز سننا چاہتا ہے۔“
 ”لیکن تم خود کہہ رہے تھے کہ اس کے آخری فقرے بہت معنی خیز تھے“ سلطان شاہ بولا۔

”ضرور تھے۔ لیکن پھر وہی بات آجاتی ہے کہ اس کا پیشہ ہی ایسا ہے۔ بیوی تو پھر بیوی ہے۔ انسان اپنی چوکھٹ پر پلے ہوئی کتے سے بھی اس طرح دست بردار نہیں ہو سکتا۔ اب رجنی سے اس کی گفتگو کراتے ہوئے ہم اسپیکر فون استعمال کریں گے تاکہ ہم سب ہی پوری گفتگو لفظ بہ لفظ سن سکیں۔“

اسی وقت اطلاع ملی کہ رجنی ہوش میں آچکی ہے۔ اس کمرے میں اسپیکر فون کی منجھب کے بعد رجنی کو دہن بلایا گیا۔ اس کے بشرے سے فکر مندی کے ساتھ برہنہ بھی عیاں تھی۔
 ”یہ کون سی جگہ ہے اور یہاں کا سربراہ کون ہے؟“ اس نے دفتر میں داخل ہوتے ہی غصیلی آواز میں سوال کیا۔ غصہ میں اس کے حسن کو چار چاند لگ گئے تھے۔

”شاید تمہیں علم نہیں کہ تم اغوا کی جا چکی ہو اور اب ہماری یرغمالی ہو“ ظفر نے اس سے ذرا بھی مرعوب ہوئے بغیر، رشت لہجے میں کہا ”یہ نہ سمجھنا کہ تم ہم لوگوں کو اپنی اداؤں یا آسودوں سے رام کر سکو گی۔ یہاں عورتوں پر تشدد کے ماہرین بھی موجود ہیں جو پل بھر میں تمہارے تیوروں کو درست کر سکتے ہیں۔“

”یہ سراسر غیر قانونی حرکت ہے جس کے لئے میرا سفارت خانہ بھر پور احتجاج کرے گا۔“

”ضرور کرتا رہے لیکن پہلے شری مان سنگھ کو فون کرلو“ سلطان شاہ چڑ کر بولا ”وہ تمہاری فکر میں گھلا جا رہا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ صدمے سے اس کا ہارٹ ٹل ہو جائے۔“

رجنی تین دنوں کے ساتھ ہی چھلاک بھی تھی۔ اس نے اسپیکر فون آن کرنے کے بجائے ریسیور اٹھا کر بات کرنے پر اصرار کیا لیکن اس کی ایک نہ چل سکی۔ ظفر تو ویسے ہی دل کی جگہ پتھر لے پھرتا تھا مگر سلطان شاہ بھی تازہ واداکھانے والی عورتوں سے

نے ظفر کی خوشخوار نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے ریسیور لے لیا۔
 ”مائی! یہ لوگ درست کہہ رہے ہیں“ رجنی ان کی تحویل میں ہے اور میں بھی ان ہی کا قیدی ہوں“ اس نے ریسیور لیتے ہی مشینی انداز میں کہنا شروع کیا اور میں نے فوراً ریسیور اس کے ہاتھ سے واپس لے لیا۔

”یاد رہے کہ شرمندہ ہو رہے ہو“ میرے کانوں میں مان سنگھ کی آواز آئی۔ وہ اپنی دانست میں موت لال سے گفتگو کر رہا تھا۔ میں دانست خاموش رہا۔

”عورتیں کسی کی جاگیر نہیں ہوتیں“ وہ کہہ رہا تھا ”ہم دن رات نجانے کہاں کہاں منہ مارتے پھرتے ہیں۔ اگر رجنی نے دل بدلانے کے لئے تم سے یا کسی اور سے دوستی کر لی تو کیا برا کیا؟ میرے لئے تو اتنی سی کافی ہے کہ وہ مجھے سچے دل سے اپنا بتاتی ماتی ہے اور جب تک میں زندہ ہوں وہ کسی اور سے شادی نہیں کرے گی۔ اونچے طبقے میں سب کچھ چلتا ہے۔ یہ تمام خمرے اب چلی اور متوسط کلاس تک رہ گئے ہیں۔ ہم اور تم تو ان پابندیوں سے بہت آگے ہیں۔ یہ بتاؤ کہ یہ لوگ اب کیا چاہتے ہیں؟“

”تمہارے کاؤنسلٹ میں ایک مقامی عورت قید ہے۔ ہم اس کے بدلے.....“

اس نے میری بات درمیان ہی سے اڑا لی اور تیز وہ آواز میں بولا ”اگر تم غزالہ سے رجنی کے تباہی کی بات کر رہے ہو تو تم ڈیڑی ہی ہو سکتے ہو۔“

”مفتول قیاس آرائیوں کے بجائے کام کی بات کرو۔ اس نے مجھ جیسے بہت سے لوگوں کو برے وقتوں کے لئے پالا ہوا ہے۔ اس کی ہدایت ہے کہ تمہاری طرف سے بشت جواب نہ ملنے کی صورت میں کل دوسری کارروائی کا آغاز کیا جائے اور وہ تمہارے لئے تباہ کن ہوگی۔“

”میں رجنی سے بات کئے بغیر کچھ نہیں کہہ سکتا“ لمحہ بھر کے سکوت کے بعد اس کی آواز سنائی دی ”مجھے اس سے بے انتہا محبت ہے لیکن میں کچھ اصولوں پر زندگی گزارنے کا قائل ہوں۔ اس سے بات کرنے کے بعد ہی میں اندازہ کر سکوں گا کہ میں آج کس مقام پر ہوں۔“

”وہ ہوش میں آئے گی تو تمہاری بات کروادی جائے گی“ میں نے فون بند کر دیا۔

اس وقت ساری گفتگو عام انسٹرمنٹ پر کی گئی تھی اس لئے جب میں نے انیس پوری گفتگو سے آگاہ کیا تو رجنی اور مان سنگھ کے بارے میں وہ دونوں ہی حیران رہ گئے وہ ایک ایسا نازک موضوع تھا جس پر ان کے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں تھا اس لئے بات شری مان سنگھ کی قیاس آرائی کی طرف مڑ گئی لیوں کہ اس نے غزالہ کا ذکر آتے ہی مجھے ڈیڑی قرار دیا تھا جس کا مطلب تھا کہ دیرانے انڈین کاؤنسلٹ میں اپنے مختصر قیام کے دوران ان

دھیمی ہو گئی۔

”کیوں؟“ میں نے حیرت سے پوچھا ”تم تو ہزبات سے واقف ہو پھر اب یہ مطالبہ کیوں؟“

اسپیکر فون پر اس کا دم سم سا بڑیا نی قہقہہ سنائی دیا پھر وہ عجیب سی آوازیں بولا ”وہ اور بات تھی۔ اور یہ اور بات ہے۔ تم جلد ہی ان دونوں کا فرق سمجھ لو گے۔ اب یہ بتاؤ کہ بتاؤ لے کا کیا ارادہ ہے؟“

”یہ باہمی سہولت کی بات ہے۔ دونوں عورتیں جتنی جلد اپنے ٹھکانوں پر پہنچ جائیں اتنی ہی بہتر ہو گا۔“

”لیکن میں دیر کو کیا جواب دوں گا؟ غزالہ اس کی امانت ہے۔“

”یہ تمہارا اپنا مسئلہ ہے۔ اس کا حل تم ہی کو سونپنا ہو گا۔ دیے وہ میری سلائیٹ بن کر ایسی فرار ہوئی ہے کہ اب شاید ہی تمہاری طرف کا رخ کر سکے۔“

”اوہ! تو اس کا مطلب ہے کہ موت لال کے مکان کے ٹیلی فونوں کی لائنیں تم ہی لوگوں نے کاٹی تھیں اور شاید اسے گھر ہی سے اٹھایا گیا ہے۔“

”تمہارے اندازے درست ہیں لیکن اب کام کی بات کرو!۔“

”آج شام چھ بجے فریڈال کے لان میں آجاؤ، میں غزالہ کو لے آؤں گا۔ تم رجنی کو لے آنا۔ اگر تم نے وعدہ خلافی کی تو یہ یاد رکھنا کہ میں نتائج کی پروا کئے بغیر غزالہ کے سینے میں وہیں گولی اتار دوں گا۔ اگر ذہنی آسکے تو زیادہ بہتر رہے گا۔ میں اس سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے، تمہارا پیغام اس تک پہنچا دیا جائے گا۔“ میں نے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

اسی وقت مکان کے کسی حصے سے موت کے درد میں ڈوبی ہوئی ایک دلدوز جیج بلند ہوئی اور ہم تینوں ہڑباز کر باہر کی طرف دوڑ پڑے۔

وہ دو ٹاک جیج سننے ہی میرے ذہن میں پسلا خیال یہ آیا تھا کہ کیسے رجنی نے واپس پہنچنے ہی کوئی کام نہ دکھایا ہو۔ جب وہ اسپیکر فون پر اپنے شوہر، شری مان سنگھ سے بات کر رہی تھی تو میں نے اس بات پر دھیان نہیں دیا تھا کہ شری مان سنگھ نے رجنی کو اس امر کی ہدایت کی تھی کہ وہ موت لال کو پوکا یاد دلا دے لیکن موت کے ٹکرب میں ڈوبی ہوئی جیج سننے ہی مجھے خیال آیا کہ پوکا یقینی طور پر کوئی اہم کوڈورڈ تھا۔ اس کا تعلق واقعی موت لال سے تھا یا اس لفظ میں خود رجنی کے لئے کوئی پیغام پوشیدہ تھا؟ اس کا اندازہ قیدیوں والے کمرے میں پہنچ کر ہی ہو سکتا تھا۔

ہم تینوں راستے ہی میں تھے کہ اچانک فضا میں دلی دلی انسانی چیخیں اور غراہیں گونجنے لگیں جیسے کسی کو بے رحمانہ تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہو۔ اور اس بار وہ آوازیں نمایاں طور پر موت لال کی

بری طرح چتا تھا جب کہ رجنی کی نجی زندگی ہم تینوں کے سامنے کھلی کتاب کی طرح آچکی تھی۔

سلسلہ ملنے پر دوسری طرف سے مان سنگھ نے ریسیور اٹھایا اور صرف ہلو کہا۔

”مانی ڈارلنگ! یہ میں کس مصیبت میں گرفتار ہو گئی ہوں؟“

اسنے شوہر کی آواز سننے ہی وہ روپائی آواز میں بولی ”موت لال بھی ان کی قید میں پھنسا ہوا ہے۔“

”شاید تم اسپیکر فون استعمال کر رہی ہو؟“ خیف سے توقف کے بعد مان سنگھ کی آواز ابھری۔

”ہاں! لمحہ بھر کے لئے رجنی حیران ہو گئی ”تمہیں کیسے پتا چلا؟“

”تمہارے سر پر گردش کرنے والے عینکے کی آواز میرے کانوں تک پہنچ رہی ہے۔“ مان سنگھ کی آواز سپاٹ اور جوش و خروش سے عاری تھی۔ اس نے پوچھا ”تم واپس آنا چاہتی ہو یا اس زندگی سے الٹا گئی ہو؟“

”کیسی باتیں کر رہے ہو تم؟ اب تو یہی میری زندگی ہے۔ یہاں میں غنڈوں میں پھنسی ہوئی ہوں اور تم کو سوال سوچ رہے ہیں۔ یہاں میرا دم گھٹ جائے گا۔“

”تمہارے ساتھ کوئی زیادتی تو نہیں ہوئی؟“ دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

”بے ہوش کئے جانے کے علاوہ اب تک کوئی اور زیادتی نہیں کی گئی لیکن یہ لوگ وحشی درندے ہیں۔ انہوں نے موت لال کے ڈرائیور کو اچھڑ کر خون میں نہلایا ہوا ہے۔ مجھے تو اس کی طرف دیکھنے سے ہی جھنجھریاں آ رہی ہیں۔“

”موت لال کو پوکا یاد دلا دیتا۔ میں ان لوگوں سے بات کرتا ہوں۔“

ظفر نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور ایک جوان رجنی کو زبردستی وہاں سے باہر لے گیا۔ اس نے دفتر میں موجود رہنے کے لئے زور آزمائی کی لیکن اس کی آوازیں سن کر مان سنگھ نے اسپیکر فون پر ہی اسے ہدایت کی کہ وہ جب تک قیدی ہے، قید کرنے والوں کی ہدایات پر عمل کرے۔

”اب کو، تمہاری کیا دوائے ہے؟“ میں نے رجنی کے چلے جانے کے بعد پوچھا۔

”تم لوگ بہت بے رحم ہو۔ اسے خوف زدہ کرنے کے لئے ایک زخمی قیدی کے ساتھ رکھا ہوا ہے جب کہ غزالہ کو یہاں ہر طرح کا آرام میسر ہے۔ وہ وہی آنکی بی کی طرح رہ رہی ہے۔“

”مجھے افسوس ہے، مانی!“ میں نے اس کی بات کا اثر لیتے ہوئے سنجیدگی سے کہا ”ہمارے پاس جگہ کی کمی ہے۔ پھر وہ آنکی تو بے ہوش تھی۔ ہم زخمی قیدی کو وہاں سے ہٹا دیں گے۔“

”تمہیں موت لال کو بھی وہاں سے ہٹانا ہو گا؟“ اس کی آواز

رجنی کی حالت سے ظاہر ہو رہا تھا کہ امرکار کے قتل کی واردات میں اس کا ہاتھ نہیں تھا۔ دوسری طرف ایس بی ایف کے جوانوں نے موت لال کو جس بے دردی کے ساتھ اپنا نشانہ بنایا ہوا تھا۔ اس سے پتا چلتا تھا کہ انہوں نے موت لال کی کوئی نہ کوئی ایسی حرکت دیکھ لی تھی جس کی بنا پر وہ رجنی کو بھول کر موت لال پر نوٹ پڑے تھے مگر ای کے ساتھ یہ حقیقت فراموش کر بیٹھے تھے کہ اگر موت لال ہی امرکار کا قاتل تھا تو اس کے پاس کوئی ایسا خفیہ ہتھیار موجود تھا جس کی مدد سے وہ اپنے حریف کو آٹا خانہ میں موت کی فیئر سلاکتا تھا۔ ہاتھ پائی کے دوران میں ذرا سا بھی موقع ملے ہی وہ اُن دونوں یا ان میں سے کسی کو ذہریلے ہتھیار کا مزہ چکھا سکتا تھا۔

”چھوڑو“ اسے فوراً چھوڑ دو!“ میں نے اندر مچھتی ہی بل بھر میں صورتِ حال کی یقینی کا ادراک کرنے کے بعد تقریباً ہڈیانی انداز میں تیزی سے کہا۔

میری آواز میں کچھ ایسی تاثیر تھی کہ وہ دونوں ہی اچھل کر موت لال سے دور ہٹ گئے۔

موت لال گلو خلاصی ہوتے ہی ”اپنے چاروں ہاتھ بیروں کے بل پر کسی چپائے کی طرح فرش سے اٹھنے کی کوشش کرنے لگا اور رجنی دوڑ کر ہم تینوں کی طرف آگئی۔

”اسے کس نے مارا ہے؟“ میں نے رجنی کو گھورنے کی کوشش کرتے ہوئے سرو لیجے میں سوال کیا مگر اچانک مجھے یاد آیا کہ میرے چہرے پر نقاب منڈھا ہوا تھا اس لئے میرے چہرے کے تاثرات رجنی کے لئے غیر اہم تھے۔

”کیا یہ مرگیا؟“ رجنی نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے امرکار کے بے حس و حرکت جسم کی طرف دیکھتے ہوئے سہمی ہوئی آواز میں بے ساختہ سوال کیا۔

”زندہ ہوتا تو ہڑ بومگ سے فائدہ اٹھا کر اب تک بھاگ نکلا ہوتا“ میں نے اسی لہجے میں کہا۔

”مجھے کچھ پتا نہیں“ وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی ”یہ کھڑے کھڑے چیخ مار کر گرا اور پھر ایک دم چپ سا دلے۔ میں تو سمجھ رہی تھی کہ یہ صرف بے ہوش ہوا ہے۔۔۔۔۔ یہاں کیا ہو رہا ہے؟۔۔۔۔۔ تم لوگ اپنے چہرے نقابوں میں کیوں چھپائے ہوئے ہو؟ ماسٹے آکر بات کیوں نہیں کرتے؟“

اس وقت تک موت لال لاکھڑا ہوا ”اپنے قدموں پر کھڑا ہونے میں کامیاب ہو چکا تھا اور اسی مقام پر کھڑا ہوا جھوم رہا تھا۔ اس میں اپنی جگہ سے قدم ہلانے کی سکت باقی نہیں رہی تھی۔

”عورت بھی بد معاش ہے“ سرا“ ایس بی ایف کے نقاب پوش جوانوں میں سے ایک نے اکھڑ لیجے میں کہا ”اس کے آنے سے پہلے امرکار اور موت لال ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ اس عورت نے اندر آتے ہی پوچھا کیا۔ ہم چونک کر

جب۔۔۔۔۔ بے اختیار میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ اگر موت لال زندہ تھا اور تشدد کا نشانہ بنا ہوا تھا تو وہ دردناک چیخ کسی اور کی نمی میں نے وہ چیخ سننے ہی اندازہ لگایا تھا کہ وہ جو کوئی بھی رہا ہو“ اسے پہنچنے کے بعد اٹھا سانس لینے کی ذرا سی بھی سہلت نہیں مل سکی ہوگی۔

میرے ساتھ ہی ”شاید ظفر بھی اسی نتیجہ پر پہنچا اور اس نے ایک نکتہ مضطرب ہو کر اپنی رفتار تیز کر دی۔ میری طرح اسے بھی شک ہوا ہو گا کہ اگر موت لال زندہ تھا تو پھر مرنے والا ایس بی ایف کا کوئی جوان ہی ہو سکتا تھا جو موت لال کی کسی منتقامہ کارروائی کا شکار ہوا ہو۔

اس وقت ہم تینوں کے چروں پر نقاب چڑھے ہوئے تھے۔ خود کو رجنی کی شناخت سے محفوظ رکھنے کے لئے وہ احتیاطی تدابیر ناگزیر تھیں۔ ظفر کے قول کے مطابق ایسے قیدیوں کے ساتھ بہت احتیاط سے کام لیا جاتا تھا جنہیں وہاں سے زندہ واپس لوٹانا مقصود ہوتا تھا۔ چروں پر منڈھی ہوئی جست نقابوں کی وجہ سے ہمارے لئے ایک دوسرے کے تاثرات کا اندازہ لگانا محال تھا لیکن میں دل میں ظفر کی دلی کیفیت کو خوب سمجھ رہا تھا۔ اس سے میری جان پہچان زیادہ طویل نہیں تھی لیکن اس کے پیشرو ”اول خان کے ساتھ میری شناسائی خاصی طویل رہی تھی اور میں نے دیکھ لیا تھا کہ وہ اپنے جوانوں سے اولاد جیسی محبت کرتا تھا۔ اپنے کسی بھی ماتحت کی تکلیف پر اول خان یوں تڑپ اٹھتا تھا جیسے وہ خود کسی کرب سے گزر رہا ہو۔ ظفر اسی کا جاشیں تھا اس لئے اپنے ایک کڑیل جوان کی موت کے غم سے پر اس کا مضطرب ہونا بعد از قیاس نہیں تھا۔

لیکن ہم قیدیوں والے کمرے میں پہنچے تو وہاں کا منظر ہماری توقعات کے برعکس تھا۔ وہاں امرکار فرش پر غیر فطری حالت میں بالکل بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔

اس کا اوپری دھڑچٹ پڑا ہوا تھا لیکن داہنی ٹانگ مڑ کر، جسم کے نیچے لیٹی ہوئی تھی۔ داہنا بازو فرش پر پھیلا ہوا تھا جب کہ بائیں بازو پشت کے نیچے دب گیا تھا۔ اس کی حالت سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کھڑے کھڑے اچانک ہی فرش پر گرا اور مرتے ہی مر گیا تھا۔ اس کی موت اس قدر اچانک اور تیزی سے ساتھ دونوں ہوتی تھی کہ اسے تڑپنے یا اٹھا سانس لینے کی سہلت نہیں ملی تھی اور وہ یقینی طور پر کسی سریلے الاثر زہر کے استعمال کی علامات تھیں۔

رجنی قدرے حیرت اور خوف کے عالم میں ایک گوشے میں سہمی ہوئی کھڑی تھی جب کہ ایس بی ایف کے دو جوانوں نے موت لال کو فرش پر اوندھا کر اگر پس پٹوں اور ٹھوکروں کی برسات کی ہوئی تھی۔

کر میں نے اس پورے منظر پر ایک نگاہ ڈالتے ہی کچھ نتائج اخذ

ی میں نے بولنا شروع کر دیا "تمہیں مارنا تو ہمیں اپنے چروں پر
غائب چڑھانے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ سب ہم نے اس وجہ سے
کیا ہے کہ تم رہا ہونے کے بعد ہم کو شناخت نہ کر سکو۔"
"تم جھوٹ بول رہے ہو" اس نے بے اعتباری سے میری
بات کاٹ دی "اس سے پہلے میں تمہارے چہرے دیکھ چکا ہوں۔
اس وقت تم نے یہ احتیاط کیوں نہیں کیا؟"
"خیال آنے پر ہم نے اپنی اس غلطی کا ازالہ کر لیا" میں نے
سنجیدگی سے کہا۔

"لیکن زندگی کی امید دلا کر بھی تم مجھ سے کچھ نہیں
اگلا سکو گے" وہ اپنا ہاتھ فضا میں لہرا کر بولا "مجھے معلوم ہے کہ
جلتھک کا کاراز فاش ہو جانے کے بعد میں عزت کے ساتھ زندہ نہیں
رہ سکوں گا۔ پولکا ہمارے ہر سانس کے لئے زندگی کا آخری پیغام
ہوتا ہے۔ میں جس کے بل پر اچھلتا تھا، آج اس نے بھی پولکا
کھلو کر اپنے ہاتھ اٹھا دیے ہیں۔ میں نے اپنی ساری عمر اپنی مرضی
سے گزاری ہے۔ میں نے زندگی کے ہر ہر دن کو اچھی طرح نچوڑا
ہے۔ اب اگر میں مری بھی جاؤں تو میرے دل میں کوئی حسرت میرے
ساتھ نہیں جائے گی۔"

کہتے ہیں کہ گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کی طرف بھاگتا
ہے۔ اسی طرح آدمی کی موت آتی ہے تو سب سے پہلے اس کی عقل
ماؤف ہوتی ہے۔ اس وقت موت لال پر کچھ ایسا جذباتی دورہ زار
وہ اپنے برے بھلے کی تیز کھوکھور بھٹکتے لگا۔ وہ اپنی تقریر جاری رکھتے
ہوئے کہہ رہا تھا "رجنی بھی میرے لئے ایک خواب تھی۔ اسے
میں دیکھ لیتا تھا لیکن یہ میری دسترس سے باہر تھی۔ یہ باتوں مجھے دور
دور سے لہجاتی اور رجحانی رہی لیکن پھر یہ کہے ہوئے چلنے کی طرح
میری گود میں آگئی۔ میرا خیال تھا کہ میں نے اسے اپنی کوششوں
سے جیتا ہے اور شہر مان سگھے ہے خبری کے بازار میں رہ رہا ہے
لیکن آج مجھے پتا چلا کہ یہ سب رجنی اور اس کے پتی کی ملی بھگت
تھی۔ اس نے رجنی کو میرے حوالے کر کے مجھ سے میرا سب کچھ
چھین لیا اور میں اس راستے پر اتنی دور تک جا چکا ہوں کہ اب میرا
واپسی ممکن نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تم آج مجھے چھوڑ گئے تو
صرف اور صرف اس امید پر کہ میرا چچا کر کے میرے ساتھیوں کا
پتا ٹھکانا معلوم کر سکو۔ میں دوسری بار تمہارے ہاتھ آیا تو میرا
حشر اور برا ہو گا۔ میرے بارے میں امرکار بہت کچھ جانتا تھا۔
اسے میں نے پہلے ہی چنا کر دیا۔ اب میرے پاس میری یہ انگوٹھی
گئی ہے" اس نے اپنی پائیں منھ کی بند کر کے فضا میں لہرائی۔ جس کی
دوسری انگلی میں سرخ نگینے والی ایک طلائی انگوٹھی جھللا رہی تھی۔
"یہ یا قوت نہیں زہر کا کیپول ہے" وہ کہہ رہا تھا "یہ زہر
ایک سوئی سے بدن میں داخل ہوتا ہے۔ سوئی کیپول کے اندر
پوشیدہ ہے۔ میں نے یہ انگوٹھی امرکار کی ران پر ماری تو کیپول
دبا اور باریک سوئی باہر آکر اس کی ران کی جلد میں چھ گیا۔"

اس کی طرف مڑے اور اسی لمحے امرکار چیخ مار کر فضا میں اچھلا اور
فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ یہ سب ہمیں ہو گیا۔ ہمیں پتا بھی نہیں چل
سکا کہ موت لال نے اس کے ساتھ کیا حرکت کی تھی۔
"میں بے تصور ہوں" رجنی رو دینے والی آواز میں بولی "مجھے
شبہ بھی ہو تاکہ پولکا کے پاس روڑے سے یہاں ایسا وحشتانہ کشت و خون
شروع ہو جائے گا تو میں اپنی زبان ہی نہ کھولتی۔ تمہارے سامنے
شری مان سنگھ نے آپیکرفون پر مجھے ہدایت کی تھی کہ میں موت لال
کو پولکا یاد دلا دوں۔ اس سے آگے مجھے کچھ معلوم نہیں۔ یہ
لوگ بلاوجہ مجھ پر الزام لگا رہے ہیں۔"

"میں جانتا ہوں" ظفر نے زہریلی آوازیں کہا "تم جیسی آوارہ
اور بد چلن عورتیں عشق و محبت کی رنگینیوں میں ڈوب کر یہ بھول
جاتی ہیں کہ ایسے معاملات کی انتہا بیشہ سنگین اور ناقابلِ فہم ہوتی
ہے۔ تمہیں اپنے لائے ہوئے کوڈ کے رد عمل کا علم رہا ہو یا نہ رہا ہو
لیکن یہ ایک برہنہ حقیقت ہے کہ تم اس چھت کے نیچے ایک قتل کے
ارتکاب میں شرکت کر چکی ہو اور تم کو اس کی سزا بھگتنی ہوگی۔"
ظفر کے الفاظ پر رجنی نے باقاعدگی کے ساتھ رونا شروع کر دیا
لیکن ظفر کی ڈانٹ پھٹکار پر اس نے مثنوی انداز میں لکھتے خاموشی
اختیار کر لی لیکن اس کے سینے کے زیرِ پو سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ
اندری اندر ٹھٹھکتے گھٹ کر سسکیاں لے رہی تھی۔

"اس کی جامہ تلاشی لی گئی تھی؟" ظفر نے اپنے آدمیوں کی
طرف متوجہ ہو کر موت لال کے بارے میں سوال کیا۔

"نہیں" سر" ان میں سے ایک نے مختصر جواب دیا۔
"اسے ہیڈ زاپ کرا کے، گن پوائنٹ پر تفصیلی جامہ تلاشی
لو" ظفر نے حکم دیا "یہ ذرا سی بھی گڑبڑ کرے تو اسے بے دریغ گولی
مار دیتا۔"

"نچوڑا جو کوئی میرے قریب آیا" موت لال ہلکے سے
بولا۔ تشدد کی وجہ سے شاید اس کی زبان کٹ چکی تھی جس کی وجہ
سے اس کی آواز میں لکت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اپنی جگہ پر قدرے
لراتے ہوئے کہہ رہا تھا "جو بھی میرے قریب آیا" میں اسے امرکار
کے پیچھے روانہ کر دوں گا۔"

"ہم قریب آئے بغیر ہی تمہارا بدن گولیوں سے چھلکی کر سکتے
ہیں" ظفر نے غصے سے کہا۔

موت لال کے زخمی چہرے اور متورم آنکھوں کی کیفیت ایک
دم بدل گئی جیسے وہاں مایوسیوں نے ڈیرے ڈال دیے ہوں۔ میں نے
وہ تبدیلی فوراً ہی بھانپ لی۔ وہ جو ان بیٹے کا باپ اور ایک بڑے
گھرانے کا معزز سربراہ ضرور بنا ہوا تھا لیکن اول درجے کا مکار اور
عیاش بھی تھا۔ دنیا کے ہر بے کردار اور عیاش آدمی کی طرح اسے
بھی زندگی بہت عزیز تھی، خواہ اس کے لئے اسے کوئی بھی قیمت
کیوں نہ ادا کرنی پڑے۔
"لیکن ہم تم پر گولی نہیں چلائیں گے" ظفر کا فقرہ پورا ہوتے

میں الجھاکر اس جوان کو مزید چند منٹ کی مسلت دے دیتا تو وہ عقب سے حملہ کر کے نہایت آسانی کے ساتھ موتن لال کو بے بس کر سکتا تھا۔

”لیکن اصلیت وہی ہے جو میں تم کو بتا چکا ہوں“ میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”آج سے پہلے شری مان سنگھ ہمارے خلاف محاذ آرائی تھا لیکن آج اس کی غلط فہمی دور ہو گئی ہے کیونکہ اسے معلوم ہو گیا ہے کہ غلام رسول ہمارے قبضے میں ہے اور وہ ہر قیمت پر غلام رسول کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔“

”غلام رسول! موتن لال کے دہانے سے تھیرزدہ آواز برآمد ہوئی ”وہ تمہارے قبضے میں ہے؟“

میں نے اپنے سر کو پر غور انداز میں ”اثبات میں جنبش دی۔

”تم لوگ جھوٹے اور مکار ہو“ وہ لمحہ بھر بعد ہی اپنے سر کو زور سے جھٹکتے ہوئے بولا ”میں تمہاری کسی بات پر یقین نہیں کر سکتا۔ اپنا الو سیدھا کرنے کے لئے تم کوئی بھی کمائی نہایت ہو۔“

”تم غلام رسول کو پہچانتے ہو تو ہم تمہیں اس سے ملوا سکتے ہیں۔“

”اے تو ہر بڑھا کھسا آدمی پہچانتا ہے۔ سکر کے واقعات سے پہلے قوی اخبارات میں ہر روز ہی اس کی تصویریں اور بیان چھپا کرتے تھے لیکن میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اس سے تمہارا کیا تعلق ہے اور وہ تمہارے قبضے میں کیسے آیا؟ اس کے لئے تو بڑے بڑے لوگ ہر طرف جال ڈالتے پھر رہے ہیں۔“

”خوب! یہ اچھی بات ہے کہ تم غلام رسول کی اہمیت سے پوری طرح آگاہ ہو۔ پورا قصبہ یہ ہے کہ غلام رسول کے بارے میں ہم نے شری مان سنگھ سے پچاس لاکھ میں سودا طے کیا تھا لیکن جب ہم نے غلام رسول کو پولیس کی تحویل سے اُڑایا تو مان سنگھ اپنے وعدے سے منکر گیا۔ اب وہ ہمیں دس لاکھ میں ٹرخانا چاہ رہا ہے۔ وہ

سپہل پر پڑنے والے دباؤ کی وجہ سے ذہر کھوکھلی سوئی میں سے اس کی شراؤن میں اتر گیا اور وہ پلک جھپکتے میں آرام سے مر گیا۔

تم میں سے جو بھی میرے قریب آیا وہ اس انگوٹھی کا شکار ہو جائے گا۔ تمہارے لئے ہمتی ہے کہ میرا راستہ چھوڑ دو تاکہ میں اپنے گھر والوں کے درمیان مر سکوں۔ میں تمہاری کسی بات کا جواب نہیں دوں گا۔ اگر تم نے میرے ساتھ زبردستی کرنے کی کوشش کی تو میں نے ذہر اپنے بدن میں اتار لوں گا۔ پوکا کا مطلب یہی ہے تھا کہ میں خود کشی کروں مگر میرے لئے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ امر کار مارا جائے اس کی طرف سے سکون ہو جانے کے بعد میں تو جب چاہوں جا سکتا ہوں۔“

”تم ہمارے بارے میں غلط فہمی میں مبتلا معلوم ہوئے ہو“ میں نے اسے رام کرنے کی نیت سے کہا ”ہم سرکاری آدمی نہیں ہیں جو عمر بھر تمہارا پیچھا کرتے رہیں۔ ہمارے تصادم کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے مفادات یکساں اور مشترک ہیں۔ ہم بھی اسی راہ پر چل رہے ہیں جس پر تم گامزن ہو۔“

”تم مجھے بھلائے کی کوشش کر رہے ہو“ وہ براسائڈ بنا کر بولا۔

”تمہاری ودیاں اتری ہوئی ہیں لیکن میں تمہارا ڈسٹن دیکھ چکا ہوں۔ تمہاری باز پرس کا محور ہی یہ سر زمین اور اس کی سلاستی رہی ہے۔ میں کیسے مان لوں کہ تم ملٹری سیکرٹ سروس کے آدمی نہیں ہو؟“

”ہم تمہارے ذریعے رجنی پر ہاتھ ڈالنا چاہتے تھے۔ اس کھیل میں تمہارا اس سے زیادہ کوئی مصرف نہیں تھا۔ رجنی ہمارے قبضے میں آئی اور ہم شری مان سنگھ کو اپنے سامنے جھکانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس سے ہماری مصالحت ہو چکی ہے۔ اس نے رجنی کو ہماری ہدایات پر عمل کرنے کا حکم دیا ہے۔ تم چاہو تو خود رجنی سے اس بات کی تصدیق کر سکتے ہو۔ اب شری مان سنگھ ہمارے دوستوں میں سے ہے اور اس کے دوست ہمارے دوست ہیں۔ خود کشی کر کے تم بلاوجہ خود کو ضائع کرو گے اور تمہارا خاندان الگ بدنام ہو گا۔“

”لیکن جب تم میری سلاٹ کا پیچھا کرتے ہوئے میرے گھر آئے تھے تو انجیل براؤچ والے بنے ہوئے تھے“ اس کا انداز استہزائیہ ہو گیا ”اور میری سلاٹ ایک خطرناک بین الاقوامی مجرمہ تھی جو تم لوگوں سے بچنے کے لئے، شری مان سنگھ کے ذریعے میری خواب گاہ میں آگئی تھی۔“

”فردوس کے تحت سب کچھ کرنا پڑتا ہے“ میں نے اپنی گفتگو میں زیادہ دلچسپی پیدا کرنے کے لئے اس کی بات کاٹ کر کہا میں دیکھ چکا تھا کہ میری اور موتن لال کی گفتگو کے درمیان میں ظفر موقع پا کر اپنے ایک جوان کو اشارہ کر چکا تھا اور وہ اپنے قدم فرش سے اٹھائے بغیر ایڑیوں اور پنچوں کے نکل پر غیر محسوس انداز میں پشت سے موتن لال کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اگر میں موتن لال کو اپنی باتوں

ایک مقبول ترین سلسلہ

شاطر

جلد نمبر 23 | قیمت 50 روپے | آئیڈی 5802552-5896513

کتابی شکل میں شائع ہو گیا ہے

کتابیات پبلی کیشنز

رضوان پور، احمد علی چنگر گٹ

فون: 5802552-5896513 | فیکس: 5802551

کراچی 74200 | کتابیات1976@yahoo.com

ہے۔ وہ مرنے پر گلا ہوا تھا اور تم لوگ ہر ایک کو مار ڈالنے پر آمادہ ہوئے نظر آ رہے ہو۔ یہ سب میرے لئے ناقابل برداشت ہے۔
 ”اس کی تلاشی لو!“ ظفر نے رجنی کی باتوں پر دھیان دے کر اپنے ایک آدمی سے کہا ”یہاں وہ کہہ رہی ہیں اپنی مظلومانہ باتوں پر الجھا کر یہ بھی جنم حاصل ہو جائے۔“
 ”دیکھ لو“ اچھی طرح دیکھ لو۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے، رجنی نے روتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ آگے پھیلا دیئے مجھے سر کے تصور ہی سے نفرت ہے۔“

اس کی جامہ تلاشی واقعی بے سود ثابت ہوئی۔ اس کے پاس کوئی ہتھیار تھا نہ کوئی خفیہ زہر یا ٹھیکڑ۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ کچھ کہہ رہی تھی وہ درست ہی تھا۔

”مجھے ان لاشوں سے دشت ہو رہی ہے۔“ ہمیں واپسی پر آدھہ پار کو وہ ہماری راہ میں حائل ہو گئی۔ ”مجھے ان کے ساتھ ایک کھنڈے بھی رہنا پڑا تو میری حالت کسی مردے سے بھی بدتر ہو جائے گی۔ ان لاشوں کو یہاں سے ہٹاؤ یا میرے لئے کسی اور کرے! بندوبست کرو!“

”یہ تمہارے باوا جان کی حویلی نہیں ہے جہاں ہر کام تمہاری مرضی کے مطابق ہوتا رہے۔“ سلطان شاہ نے پہلی بار زبان کھولتے ہوئے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”زندگی میں موت لال کے ساتھ رنگ رلیاں مٹاتی تھیں تو اب اپنے موتی ڈارنگ کی لاش بھی تھوڑی دیر آنسو ہالو۔“

ہم تینوں وہاں سے واپسی کے لئے مڑ گئے۔ رجنی نے ہمارے پیچھے آنے کے لئے بہت زور لگایا لیکن ظفر کے دونوں نقاب پوش ماتحتوں نے سختی کے ساتھ اسے کمرے میں دھکیل کر دروازہ باہر سے لوث کر دیا اور خود وہیں جم کر کھڑے ہو گئے۔ وہ رجنی کی دلا فرما سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوئے تھے۔

راستے ہی میں ہم تینوں نے نقابوں سے چھٹکارا حاصل کر لیا اور میں نے اپنے چہرے سے پینڈہ خٹک کرتے ہوئے ظفر سے کہا۔ ”موتن لال سے ہمیں بہت کچھ معلوم ہو سکتا تھا۔ وہ زندہ رہتا تو اپنی سرزمین کے ان غداروں کے ناموں سے واقف ہو سکتے تھے۔ موتن لال کے خفیہ پیغام سن کر انہیں عملی جامہ پہنایا کرتے تھے۔“
 ”میرا خیال ہے کہ وہ ان لوگوں سے بے خبر تھا۔“ ظفر نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اسی وجہ سے پیغام رسانی کے لئے وہ انوکھا اور پیچیدہ طریقہ اختیار کیا گیا۔ ایسی ہر سازش میں گلیڈی ایبٹ کی آخری فرد کی ہوتی ہے جو عملی طور پر منصوبے یا اس کے کسی سے پایہ تکمیل تک پہنچاتا ہے۔ شری مان سنگھ نے ایسے ہی کسی بہت وقت کے لئے اپنے اہم کرگوں کو موتن لال کی نظروں سے چھایا تھا۔“

”لیکن پھر بھی وہ غلام رسول کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا اور کچھ نہ سہی تو ہم اسی کے بارے میں موتن لال کی زبان

چلے بمانے سے وقت گزار رہا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ پولیس و فیو کے خوف سے ہم زیادہ دنوں تک غلام رسول کو اپنی قید میں نہیں رکھ سکیں گے اور اس کی نئی پیکش قبول کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اس نے ہم سے حکمین وعدہ غلامی کی ہے جس کی سزا دینے کے لئے ہم نے تمہارے ذریعے رجنی کو اغوا کر لیا ہے اب وہ ناک رگڑ کر ہمیں ساتھ لاکھ روپے دینے پر آمادہ ہو گیا ہے۔ اس میں پچاس لاکھ غلام رسول کے اور دس لاکھ رجنی کی واپسی کے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ وہ آج شام تک پوری رقم ہمارے حوالے کر دے گا اور۔۔۔“

میرے دل و دماغ میں جو کچھ بھی جھوٹ سچ آتا رہا، مسلسل اور فی البدیہہ بولتا چلا گیا کہ کوئی موتن لال کے عقب میں دپے قدموں پیش قدمی کرنے والا اس سے خطرناک حد تک قریب ہوتا جا رہا تھا اور اگر ایک لمحے کے لئے بھی موتن لال کی توجہ میری طرف سے ہٹتی تو وہ اپنے پیچھے نمودار ہونے والے خطرے سے آگاہ ہو سکتا تھا۔ غنیمت یہ ہوا کہ ان شخصیات میں میرے ذہن نے تیزی سے کام کرنا شروع کر دیا جس کے نتیجے میں میں ایک جھوٹی مگر مربوط کہانی سنانے میں کامیاب ہو گیا جو موتن لال کے لئے تحیر خیز ثابت ہوئی۔

پھر جون ہی ایس ٹی ایف کے نقاب پوش جوان نے موتن لال پر جھپٹنے کے لئے پوزیشن لی تو میں کوشش کے باوجود اپنی بات جاری رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔

عین اسی وقت موتن لال نے کچھ کہنے کے لئے اپنا ہاتھ فضا میں لیرایا اور اس کا وہ ہاتھ ایس ٹی ایف کے جوان کی گرفت میں آنے سے رہ گیا۔ وہ موتن لال کے بدن سے کسی جو تک کی طرح لپٹا اور اسے اپنے ساتھ لیتے ہوئے فرش پر گر گیا۔

موتن لال اس ناگہانی وار کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس نے فوری طور پر اندازہ لگایا کہ اس کے لئے اپنے حریف کی مضبوط گرفت سے لٹکانا آسان نہیں تھا۔ اس نتیجے پر پہنچتے ہی اس نے اپنی بائیں عضلی بند کر کے اپنی کینٹی پر زہریلی انگوٹھی سے ضرب لگائی اور ایک تیز چٹ کے ساتھ اس کا بدن ساکت ہو گیا۔

اس کی پٹنی پٹنی آنکھوں کی پتلیاں ساکت ہو چکی تھیں۔ اس کے بدن سے لپٹے ہوئے ایس ٹی ایف کے جوان نے بھی اندازہ لگایا کہ اس کا شکار زندگی کے بندھن سے نجات حاصل کر چکا تھا۔ اس لئے وہ موتن لال کو چھوڑ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

”ایسی انگوٹھی تمہارے پاس بھی ہے؟“ ظفر نے رجنی کی طرف مڑ کر سوال کیا۔

”نہیں میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔“ وہ روتے ہوئے بولی۔ ”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہاں کیا ہوا ہے۔ مجھے شبہ بھی ہوا کہ پولکا کا مطلب خود کشی کرنا ہے تو میں شری مان سنگھ کا پیغام ہرگز موتن لال تک نہ پہنچاتا۔ یہاں تو ہر ایک کے سر پر خون سوار

انہوں نے غلام رسول کو ادھر ادھر کر دیا ہو۔ غلت میں کی مٹی، ہماری کوئی بھی اندھا دھند کارروائی نہ صرف ناکام ہوگی بلکہ وہ لوگ بھی بھڑک کر ہوشیار ہو جائیں گے۔ میں ایسا کوئی خطرہ منول لینے کے موذیں نہیں ہوں۔“

”بس! بس!“ وہ جلدی سے بولا ”تم میری بات سمجھ گئے مجھے بھی یہی ڈر ہے کہ تاخیر کی صورت میں وہ ہمارے ہاتھ سے نہ نکل جائے تم لوگوں نے اسے پولیس کے حوالے کر کے بہت بڑی غلطی کی۔ اگر وہ اسی قدر خطرناک مجرم تھا تو تمہیں اسی وقت اسے مار دینا چاہئے تھا۔“

”اس وقت تک ہمیں یہ اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ کون کون سی قوتیں اس کی پشت پناہ اور مددگار ہیں اور اس کی مدد کے لئے کہاں تک جا سکتی ہیں۔ یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ بہر حال اب میری یہی کوشش ہوگی کہ ہم جلد از جلد اس فتنے کا سد باب کر دیں۔“

”تمہیں یہ جان کر خوشی ہوئی چاہئے کہ میں نے تمہارے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اپنے بھائیوں کو ہوشیار کر دیا ہے اور اس وقت تک ملک کا ہر ایگریٹ کنٹرول پوائنٹ ہمارے آدمیوں کی نگرانی میں آچکا ہوگا۔ اس کی روز مٹو کی اخباری بیان بازیوں کی وجہ سے اس کی تصدیق کی فراہمی بھی آسان ثابت ہوئی ہوگی۔“

”مجھے امید ہے کہ اب میری روانگی تک تم چوتھی بار یہ ذکر نہیں چھیڑو گے!“ میں نے ظفر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا اور وہ سخت آمیز انداز میں اپنا سر ہلا کر رہ گیا۔

”اور شام چھ بجے والے پروگرام کا کیا رہے گا؟“ سلطان شاہ نے میرے ذہن کی بات چرائی۔

”میرا خیال ہے کہ عورتوں کے تبادلوں کا مرحلہ کسی الجھن کے بغیر ختم جانا چاہئے۔“ ظفر نے چڑخیال لہجے میں کہا ”تمہاری اور شری مان کی پوزیشن میں کوئی فرق نہیں ہے اس لئے وہ دھوکا دینے کی کوشش نہیں کر سکتے گا۔ لیکن پھر بھی میں پورا معاملہ تمہاری صوابدید پر چھوڑتا ہوں کیونکہ تمہارا غزالہ سے بہت نازک جذباتی رشتہ ہے۔ اس معاملے میں ذرا سی بھی لغزش ہوئی تو کھیل بگڑ سکتا ہے اس لئے جو تم چاہو گے وہی ہوگا۔“

”میرا خیال تم سے مختلف ہے۔“ میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے تردید آمیز لہجے میں کہا۔ ”شری مان کچھ ایک گھاگ اور بد معاش ڈپلومیٹ ہے۔ وہ اپنے مفاد کے حصول کے لئے رنجی کو جس طرح استعمال کرنا رہا ہے وہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس نے اپنے پیشرانہ مقاصد کے حصول کے لئے اپنی بیوی کو موت لال کے حوالے کیا ہوا تھا تو اس کے نزدیک غزالہ کی کیا اہمیت ہو سکتی ہے؟ پھر اس کی یہ خواہش بھی میرے ذہن میں کلک رہی ہے کہ غزالہ اور رنجی کے تبادلوں کے موقع پر وہ مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔“

”کھل کر بتاؤ کہ تم کیا سوچ رہے ہو؟“ ظفر میری گفتگو سے

”ہاں! یہ امکان ضرور نظر آیا تھا۔“ ظفر نے اعتراف کیا پھر چونک کر پوچھا۔ ”لیکن تم غلام رسول کے بارے میں اسے جو کہانی بنا رہے تھے وہ میرے سر سے گزر گئی۔ اس وقت میں خود کو اول درجے کا احمق محسوس کر رہا تھا۔ تم نے مجھ سے تو کوئی ذکر نہیں کیا تھا کہ شری مان سے تمہارا کوئی سودا ہوا تھا۔“

اس کے اشتباہ آمیز انداز پر میں بے اختیار ہنس پڑا مگر میری ہنسی بوجھل تھی۔

”وہ ایک بلف تھا۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اسے باتوں میں الجھائے رکھنے کے لئے میں الٹی سیدھی کجواس کر رہا تھا تاکہ تمہارے آدمی کو اس پر آسانی کے ساتھ ہاتھ ڈالنے کا موقع مل جائے لیکن بد قسمتی سے آخری لحات میں اس کا بیاں ہاتھ آزاد ہو گیا اور اسے خود کشی کرنے کا موقع مل گیا۔“

”یہ سب درست ہے لیکن تم نے جتنی روانی کے ساتھ غلام رسول کا نام اپنی کہانی سے نتھی کیا تھا اس کی بنا پر میرا اندازہ ہے کہ تم اس سہوئے سیاستدان کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہو۔“

”اسے اول خان نے ہی گرفتار کیا تھا۔ اس کے بارے میں سب کچھ تمہاری فائلوں میں موجود ہوگا۔“

”ہمارے یہاں کوئی روایتی فائل نہیں ہوتی۔ جو کچھ اول خان کو معلوم تھا وہ میرے علم میں آچکا ہے لیکن میں اس کی موجودہ کہیں گاہ کا ذکر کر رہا تھا۔ میرا اندازہ ہے کہ تم اس کی پناہ گاہ سے واقف ہو۔ تم خود بھی کہہ چکے ہو کہ تم چاہو تو ہمیں وہاں تک لے جانے کی کوشش کر سکتے ہو۔ میں تمہارے اس مشورے کی افادیت کا قائل ہونا چاہتا ہوں کہ ہم لوگوں کو غلام رسول کو گرفتار کر کے قانون کے حوالے کرنے سے گریز کرنا چاہئے کیونکہ اس کو بچانے کے لئے وہ تمام ذی اثر لوگ حرکت میں آجائیں گے جو غلام رسول کے زبان کھولنے پر بے نقاب ہو سکتے ہیں۔ سیاست اور اقتدار کی جنگ میں بعض لوگ بھوکے درد مندوں کی طرح سفاک اور بے رحم ہو جاتے ہیں اور غلام رسول کے ہمدردوں کا تعلق ایسے ہی لوگوں سے ہوگا۔

”غرض چاہتا ہوں کہ اس معاملے کو زیادہ طول نہ دیا جائے۔ غلام رسول ایک زہریلا اور موذی سانپ ہے۔ اگر ہم اس تک پہنچ کر اس کا سر کھینچ لیتے ہیں تو ہمیں اس نیک کام میں تاخیر نہیں کرنی چاہئے۔“

”میں خود بھی اس بوجھ کو اپنے سر سے اتار دیتا چاہتا ہوں۔“ میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”لیکن تم یہ بات بار بار بھول رہے ہو کہ میں اسے لے جانے والوں سے ضرور واقف ہوں مگر وہ میری تحویل میں نہیں ہے۔ میری یہ تم سے پہلی ملاقات ہے اور کم از کم اس وقت تم نے میری مرتبہ غلام رسول کا ذکر چھیڑا ہے۔ مجھے کم از کم اتنی مسلت تو دہ کہ میں واپس جا کر ان لوگوں کو مزید کھپکھپاؤں۔ وہ میرے پابند نہیں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی مناسب موقع ملے ہی

اس کی برجستہ قلابازی پر ہم تینوں ہی حیران رہ گئے۔ نظریہ حیرت قابل دید تھی۔ وہ عورت واضح طور پر اپنی دانست میں اور خان کے کسی ماتحت پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”ہم سب ہی مضبوط بندے ہوتے ہیں۔“ میں نے انتظار لیجے میں کہا۔ ”مضبوط نہ ہوں تو اس فورس میں آئی نہیں کے اور گھبراہ سے ہر سارس دورہ کر ہم اکثر بھی ہو جاتے ہیں۔ تم نے مل کر مجھے دلی خوش ہوگی۔ ویسے نام کیا ہے تمہارا؟“

فون پر اس کی مخصوص اور شکستہ ہوئی ہنسی کی آواز ابھری۔ ”مجھے دیکھ کر تم جو نام رکھو گے وہ میں قبول کر لوں گی دیے بغیر سوزی کہتے ہیں۔ تم چاہو تو ہم آج ہی مل سکتے ہیں۔“

”کلب اور کہاں؟“ میں نے تجسس اور بے صبری کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”ایک بچے سرسز کلب کے قریب میں تمہارا انتظار کر رہی۔“ اس کی آواز میں لگاؤ کی چاشنی عود کر آئی تھی کیونکہ اسے شکار جال میں پھنستا ہوا نظر آ رہا تھا۔

”مگر میں تمہیں کیسے پہچانوں گا؟“ میں نے پُر اشتیاق لیجے پر سوال کیا۔

”سرسز کلب کے عقبی پچانک کے قریب میں رنگین چھتری لگائے رکھوں گی۔ وہاں سے ہم لچ کے لئے کیس چلیں گے۔ تمہاری شناخت کیا ہوگی؟“

”تم کو تو میں بھی رنگین چھتری لگا کر آ جاؤں۔“ میں نے والمانہ انداز میں کہا۔

”کراچی میں چھتریوں کا رواج نہیں ہے اس لئے دو چھتریاں معھک خیز نظر آئیں گی۔ لوگ بلاوجہ ہماری طرف متوجہ ہو جائیں گے۔ تم میرے قریب آکر بلیک بیٹی کہنا، میں تمہیں پہچان لوں گی۔“

”دیری گڈ! یہ ترکیب زیادہ آسان اور قابل عمل ہے۔ تم ایک بچے پہنچ جاؤں گا۔“

”اچھا! یہ بتاؤ کہ ڈینی کہاں ہے؟“ وعدہ وصال کے فوری اس نے وہ سنگین سوال داغ دیا۔

”کون ڈینی؟“ میں نے مصعومانہ حیرت کے ساتھ بے سائلم سے جوابی سوال کر ڈالا۔

”اول خان کا ایک خواری بلکہ خوشامدی ہے جو ہزارہ جرائم کرنے کے باوجود تم لوگوں کے سینوں پر مونک دل رہا ہے۔ شاید اضطرابی طور پر اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔“

”تم شاید تو خیر صاحب کی بات کر رہی ہو جو بے ترنگ اور بہت خوبصورت ہیں؟“

”ہاں ہاں وی۔“ اس کے لیجے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ بہت تعریف اسے گراں گزری تھی۔

”وہ کبھی آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔“ میں نے پروایانہ لیجے میں کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ اس وقت بھی اندر رہیں۔“

پریشان ہو گیا۔ ”شری مان سنگھ میرے ساتھ کئے گئے وعدے پر پورا نہیں اترے گا۔“ میں نے کہا۔

”لیکن کیوں؟ تمہارے اس شبہ کی کچھ وجوہ بھی ضرور رہی ہوں گی!“ وہ بولا۔

”میرا تجربہ بتاتا ہے کہ اس جیسے لوگ اپنے قول و فعل کے کھلے تضاد سے دوسروں کو متحیر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور ان پر بھروسہ کرنے والے منہ کی کھاتے ہیں۔“

”پھر تم۔“ نظریہ بات ادھوری رہ گئی کیونکہ اچانک اسپیکر فون کی گھنٹی بج اٹھی تھی۔

نظریہ دو سری گھنٹی بجتے پہاڑتہ بڑھا کر اسپیکر فون آن کر دیا۔ ”ہیلو! کمرے میں گونجنے والی غصیلی نسوانی آواز سن کر میرے فرشتے کوچ کر گئے۔“

”کیا یہ اسپیشل ٹانک فورس کا کوئی یونٹ ہے؟“ اس نے برہمی کے عالم میں پوچھا۔

سلطان شاہ نے حیرت سے دیدے نہ چائے۔ اس طرز خطاب پر نظریہ پریشان نظر آنے لگا تھا۔ میں نے پھر لکے کے ساتھ اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور خود فون کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”تم کو کس سے بات کرنی ہے؟“ میں نے آواز بدل کر کھدوے انداز میں سوال کیا۔

”اول خان کہاں ہے؟“ میرے سوال پر اس کا غصہ اپنے عروج پر پہنچ گیا۔

”وہ باہر گئے ہوئے ہیں۔ پیغام بتا دو۔ وہ آئیں گے تو انہیں بتا دیا جائے گا۔“ میں نے سپاٹ اور روٹے لیجے میں جواب دیتے ہوئے نظریہ کو آنکھ ماری جو کسی ہوشی کی طرح منہ کھولے بیٹھا تھا۔

”اوہ! تو میرا خیال درست ہی نکلا کہ تم لوگ ابھی تک میرے ہی گھر پر قید جمائے بیٹھے ہو!“ وہ شاید دانت پین کر بڑبڑاتی تھی۔

”اگر یہ تمہارا گھر ہے تو تم بھی یہاں رہ سکتی ہو۔“ میں نے اسے چرانے کی نیت سے کہا۔ ”میاں کمرہ اور بستر کی خاصی کمی ہے لیکن میں تمہیں اپنے دل میں جگہ دے سکوں گا۔ مجھے خوبصورت اور منہ پھٹ عورتیں بہت پسند ہیں۔ اول خان سے تمہارا کوئی چھڑا ہے تو میں انہیں بھی سمجھا لوں گا۔“

”تو کا پٹھا!“ فون پر اس کی اضطرابی بڑبڑاہٹ ابھری۔

”کیا کہا؟“ میں نے بوکھلائے ہوئے لیجے میں سوال کیا۔

”اوہ ڈیڑا! وہ سنبھل کر زری سے بولی۔“ میں نے تمہیں نہیں ”اول خان کو کچھ کہا تھا۔ اس سے واقعی میرا چھڑا ہے مگر تم ایچھے آدمی معلوم ہوتے ہو اس لئے میں تمہیں اپنے اور اس کے درمیان نہیں ڈالنا چاہتی۔“

اکھڑ اور مضبوط مرد میری کڑوری میں اسی لئے میں اول خان کو برداشت کرتی چلی آ رہی ہوں۔ ویسے تم چاہو تو میں تم سے بھی دوستی کر سکتی ہوں۔“

ایک مرتبہ پھر میری کینجہ کے کان بھرے ہیں اور اسے بند ستانی کاؤنسلٹ میں میری موجودگی سے آگاہ کر کے ان دونوں سفارتی مشنوں کو آپس میں لڑانے کی کوشش کی ہے۔

”غزالہ بخیر و خوبی مجھے واپس مل جائے تو یہ عہد آرائی اب بھی ختم ہو سکتی ہے ورنہ میں باتال میں بھی تمہارا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔ تم دیکھ یہ چکی ہو کہ ابھی تک تمہارا کوئی بی خواہ میری گرفت سے محفوظ نہیں رہ سکا۔ تم ہوش کے ناخن لیتیں تو میرا کبر خان کی موت کے بعد ہی تمہیں ہتھیار ڈال دینے چاہئے تھے۔“

”لیکن اب تم میرے سامنے کو بھی نہیں پہنچ سکو گے۔“ اس کی جھٹائی ہوئی آواز ابھری۔

”تم نام بدل کر مجھ سے بچ سکی ہو نہ ملک بدل کر محفوظ رہ سکو گی۔“ میں نے ایران کا ذکر کرتے بغیر دانستہ چٹکی لیتے ہوئے کہا ”میں تمہاری بو پر لگا ہوا ہوں۔۔۔“

”اتنے ہی باخبر بن رہے ہو تو تمہیں یہ بھی معلوم ہو گا کہ غزالہ اب کہاں ہے؟“

”وہ کہیں بھی ہو“ اسے مجھ تک پہنچانا تمہاری ذمہ داری ہے۔ اس کا بال بھی بیکا ہوا تو میں تمہارے جسم کا ریٹھ ریٹھ ادھیڑ کر رکھ دوں گا۔“

”ملک بدلنے والی کس بات کا ذکر کر رہے تھے؟“ قدرے توقف کے بعد اس نے پوچھا۔

”یہ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کیونکہ وہ پروگرام تمہاری ہی ہے۔“ میں نے سرد مہری سے کہا۔

”اس کا مطلب ہے کہ میرا کبر خان اپنی زبان پر قابو نہیں رکھ سکا۔“

”اس کا جواب دی دے سکے گا اور وہ غالباً جہنم میں آگ تاپ رہا ہو گا۔“

”تمہاری حرکتوں کی وجہ سے غزالہ اب میری گرفت سے نکل چکی ہے۔“ ایک گھرے سانس کے بعد اس کی آواز ابھری۔ ”اسے تم تک پہنچانا بعد کی بات ہے“ اس وقت تو میں خود بھی اس تک رسائی حاصل نہیں کر سکتی لیکن میں اتنا ضرور رکھتا چاہوں گی کہ میں نے غزالہ کے اعضا کاٹنے کی جو دھمکی دی تھی وہ میرے وقتی اشتعال کا نتیجہ تھی ورنہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔“

”اور تم چاہتی ہو کہ میں تمہارے اس مسئلہ خیز دعوے پر یقین کر لوں؟“

”تمہیں یقین کرنا چاہئے کیونکہ اتنے دن گزر جانے کے باوجود میں نے غزالہ کا کچھ نہیں دیکھا۔“

”وہ تمہاری مجبوری تھی۔ اسے لے جانے کے بعد تم ایک دن کے لئے بھی سکھ چین کے ساتھ کہیں نہیں رک سکیں کیونکہ میں تمہارا پیچھا کر رہا ہوں۔ تم کو اتنی سہولت ہی نہیں مل سکی کہ تم اس کے وجود پر نشتر زنی کے قابلِ نفرت ارادے کو، عملی جامہ پہنانے

اول خان کا انتظار کر رہے ہوں۔“

”اگر وہ موجود ہے تو ذرا اس سے میری بات کر دو لیکن یہ خیال رکھنا کہ وہ مجھ سے جلتا ہے۔ اس کی الٹی سیدھی باتوں میں آکر مجھ سے ملنے کا پروگرام نہ بدل سکتا۔“

”تم فکر نہ کرو۔ میں اسے اپنی اور تمہاری باتوں کی ہوا بھی نہیں لگنے دوں گا۔ کسی کی باتوں میں آکر میں اتنی اچھی دوستی کی پیکش کو نہیں ٹھکرا سکتا۔“

”میری گند۔ تم میری توقع سے زیادہ ذہین اور ہوشیار ہو۔ ہم دونوں کو مل بیٹھنے کا موقع مل گیا تو میں تمہیں ایسے جہانوں کی سر کر اؤں گی جو تمہارے خواب و خیال میں بھی نہیں ہوں گے۔“

”تمہاری باتیں سن کر میرے دوشیں دوشیں میں سنسنی کی لہرں دوڑ رہی ہیں۔ تم لائن ہولڈ کرو، میں تو یہ صاحب کو دیکھ کر آتا ہوں۔“

ظفر نے ہاتھ کے اشارے سے دریافت کیا کہ وہ فون کس کا تھا اور میں نے ایک کانڈ پر دیر کا نام لکھ دیا۔ نام پڑھتے ہی ظفر کی آنکھیں حیرت سے کھل رہی تھیں۔

خامسے وقفے کے بعد میں نے کرسی میں اپنی پوزیشن درست کی اور اسپیکر فون کے سامنے اپنی اصلی آواز میں ہیلو کہا۔ دوسری طرف دیرانے فوراً ہی میری آواز پہچان لی۔

”اب میں تمہاری زندگی جہنم بنا دوں گی۔“ وہ بلا کسی تمہید غصیلی آواز میں غرائی۔ ”تم نے دیکھ لیا کہ میں یہاں بھی تمہارا کھوج نکالنے میں کامیاب ہو گئی۔“

”ناکامیوں نے شاید تمہارا دماغ الٹ دیا ہے۔“ میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میری اور اول خان کی دوستی سے واقف ہونے کے بعد کوئی خارش زندہ کتیا بھی دم بھاتی ہوئی یہاں تک پہنچ سکتی تھی۔ تم نے فون کر کے کون سا تیر مارا ہے؟ ہمیں نے پہلے ہی تمہیں بتا دیا تھا کہ اول خان کا یونٹ اس گھر میں براجمان ہے۔“

”میں اب بھی تمہیں وارننگ دے رہی ہوں کہ میرا پیچھا چھوڑ دو ورنہ میں تمہارا شتر خراب کر دوں گی۔“ وہ مجھ پر ہمت زیادہ برہنہ محسوس ہو رہی تھی۔

”تمہارے ستارے اچھے تھے جو تم موتن لال کی خواب گاہ سے بچ کر نکلنے میں کامیاب ہو گئیں ورنہ میں وارننگ دے بغیر تمہارا مستقبل تارک کر سکتا تھا۔ تم میرے لئے آستین کا سانپ بنی ہوئی ہو۔ اگر تم نے غزالہ کو اغوا کرنے کی حماقت نہ کی ہوتی تو ہم خوش اسلوبی کے ساتھ ایک دوسرے سے الگ ہو سکتے تھے۔“

”تم نے دیدہ و دانستہ مجھے ہیری کیسنگ سے تصادم کی راہ پر ڈالا تھا کہ میں کبھی اس کی مدد حاصل نہ کر سکوں۔ تمہاری دے درپے برائیوں کی وجہ سے تم سے کسی بھلائی کی امید نہیں کی جا سکتی تھی اور تم ابھی تک اپنی اوجھی حرکتوں سے باز نہیں آئے ہو۔ تم نے

میں کوئی قابل قدر اضافہ کرنے میں ہرگز کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ میرا مشن کامیاب ہوا یا کام ناکم لیکن چھ سو سن و زنی آلات کی کھپ کو دنیا کی کوئی طاقت تباہی سے نہیں بچا سکے گی۔

”مجھے عالمی مفادات یا سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں تو صرف تمہاری ٹانگ مھیشوں گا۔ اس کے بعد جو ہوتا ہے وہ ہو کر رہے گا۔“

”حالا نکہ تم میرے سامنے حب الوطنی کے بڑے دعوے کرتے رہے ہو۔“ اس کا لہجہ طنز یہ تھا۔

”دعووں کے باوجود یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ میں ایک عام آدمی سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہوں۔“

”یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ قانون میرے ساتھ ہی تمہارا بھی دشمن ہے لیکن ہم دونوں کے لئے آج تک قانون کے محافظوں سے کوئی خطرہ پیدا نہیں ہوا۔ وقت، حالات اور تجربات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہم دونوں کو سب سے زیادہ نقصان ایک دوسرے سے پہنچا ہے۔ ہم جب بھی آپس کی محاذ آرائی میں الجھتے ہیں تو ہمیں ہماری نقصانات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس لئے میری رائے ہے کہ ہمیں دشمنی اور محاذ آرائی کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دینا چاہئے۔ اگر ہم ایک دوسرے کے دوست اور خیر خواہ نہیں رہ سکتے تو ہمیں انجینیو کی طرح زندہ رہنے کا طریقہ سکھانا ہوگا۔ دشمنی اور بدخواہی ہم دونوں کو ہی ایک دن لے ڈوبے گی۔“

”ہر بار ابتدا تمہاری طرف سے ہوئی ہے۔ اب میں تمہاری زبان پر اعتبار نہیں کر سکتا۔“

”میں تمہیں سمجھا رہی ہوں کہ میری بات مان لو۔“ اس کا لہجہ ناصحانہ ہو گیا۔ ”مجھے سے لڑ کر تم خسارے میں رہو گے۔ چوٹی بھی ہیر کے نیچے دبتی ہے تو کاٹ لیتی ہے، میں تو پھر ویرا ہوں۔ تم نے میرا وہ دور بھی دیکھا ہے جب میں بلیک کوئین کے نام سے ایک ہوائی ہوئی تھی اور بڑے بڑے بد معاش میرے نام سے کانپتے تھے۔“

”میں اس وقت بھی تم سے خائف نہیں تھا۔ ہمارے جھوٹے عشق کی ابتدا شاید ان ہی دنوں میں ہوئی تھی۔“ میں نے طنز یہ لہجہ میں اسے یاد دلایا۔ ”دنیا جہان کو دہشت زدہ کرنے والی بلیک کوئین میری بانہوں میں آتی ہی سردی کھائے ہوئے کسی بے ضرر پلے کی طرح کانپنے اور لرزنے لگتی تھی۔“

”اس کا مطلب ہے کہ تم میری مصالحت کی پیشکش ٹھکرا رہے ہو؟“

”مصالحت برابری کی سطح پر کی جاتی ہے۔ تم تو اب کسی بھی لمحے ڈھیر ہونے والی ہو۔“

”یہ تمہاری بھول ہے، ڈینی!“ وہ یک بیک بھڑک اٹھی۔ ”مجھے تمہارا ٹھکانا معلوم ہو گیا ہے۔ اب میں تمہاری زندگی اجیرن کر دوں گی۔ تمہارا سایہ بھی تمہیں کاٹنے کو دوڑنے لگے گا۔“

”اس بھول میں نہ رہنا کہ میں نے ایس ٹی ایف، اے، کے

کے بارے میں سوچ سکتیں اور اب تم بالکل ہی بے بس ہو گئی ہو کیونکہ بقول تمہارے، اب غزالہ تمہارے ہاتھوں سے نکل چکی ہے اس لئے تم مجھے اپنی نیک نیتی کا جھوٹا یقین دلانے کی کوشش کر رہی ہو۔ اب میں تمہارے کسی فریب میں آنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔“

”اپنی نیک نیتی کا یقین دلانے کے لئے میں یہ بھی بتانے کو تیار ہوں کہ اس وقت غزالہ کہاں ہے۔“

”تم ایک لمحے کے لئے بھی میری نظروں سے اوجھل نہیں رہی ہو۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میرا کبر خان کی سیاہ فورڈ کس نے کب اور کہاں تباہ کی تھی۔ تم جس جہے دان سے تنہا فرار ہوئی ہو، غزالہ اب بھی وہیں ہوگی لیکن میری ان اطلاعات کی بنا پر تم اپنی ذمہ داریوں سے بری نہیں ہو سکتیں۔“

”تم اتنے ہی باخبر ہو تو اب تک مجھے ڈھیل کیوں دے رہے ہو؟“ وہ شاید جل کر بولی تھی۔

”تمہیں بھگا بھگا کر تھکانا چاہتا ہوں۔“ میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”مجھے معلوم تھا کہ تم غزالہ کو اس کی مرضی کے خلاف کسی دوسرے ملک میں نہیں لے جا سکو گی۔ اپنا نیا مشن پورا کرنے کے لئے تم خود غزالہ کو یہاں چھوڑنا چاہ رہی تھیں لیکن نئے حالات کے تحت تمہارا کام خود بخود آسان ہو گیا۔ یہ اور بات ہے کہ اب تم چاہو بھی تو غزالہ کو دوبارہ بلکہ سہ بارہ اپنی تحویل میں نہیں لے سکو گی۔“

”میرے نئے مشن کے بارے میں تم کیا جانو؟“ اس نے تیزی کے ساتھ پوچھا۔

”چھ سو سن و زنی ایٹمی سازو سامان کے بارے میں خبروں کو چھپانا آسان نہیں ہوتا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ تمہارے لئے، شے میں اپنی ساکھ بحال کرنے کا آخری موقع ہوگا۔ تم نے یہ موقع گنوا دیا تو تمہیں دودھ میں پڑی ہوئی کھسی کی طرح نکال پھینکا جائے گا۔“

”اس کا مطلب ہے کہ تم میری راہ میں روڑے اٹکانے کی کوشش کرو گے؟“

”فلٹ سے غزالہ کے ساتھ فرار ہو کر تم نے مجھے جو چیلنج دیا ہے اس کے بعد ایسا نہ کرنا بزدلی اور کم ہمتی کے مترادف ہوگا۔ مجھے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔“

”تم کچھ بھی نہیں کر سکو گے۔“ اس کی سخت آواز ابھری۔


”بد قسمتی یا خوش قسمتی کی بات یہ ہے کہ آج کل امریکا والے دنیا بھر کی بھکاری قوموں کے اُن داتا بن بیٹھے ہیں اور سنگول اٹھائے پھرنے والی کوئی قوم ان کے حکم کی خلاف ورزی کر کے نہیں ہنپ سکتی۔ ہمیری سبب سبب کی ناراضی کے خوف سے انہیں کاؤنٹیلٹ والے میری حمایت سے فوری طور پر دست بردار ہو گئے۔ اسی طرح تمہارا ملک بھی امریکوں کی مرضی کے خلاف اپنی ایٹمی صلاحیتوں

رابطہ کر لوں گا۔" میں نے سلطان شاہ کو آنکھ مار کر فون میں کہا۔ اس کی تیز ہنسی کی آواز سنائی دی پھر وہ بولی "جس طرح میں نے تمہیں تلاش کیا ہے اسی طرح تم بھی مجھے ڈھونڈ لیتا۔ اور ہاں ذرا اس آدمی سے تو بات کرادو جس نے میری کال وصول کی تھی۔"

"میں اس وقت اکیلا ہوں۔" میں نے زہرب مسکراہٹ کے ساتھ کہا "وہ باہر کیسے بھٹک رہا ہوگا۔ کیا اب اس پر بھی دورے ڈالنے کا ارادہ کر رہی ہو؟"

"تمہاری ذہانت بہت پست اور گھٹیا ہے۔" اس کی چڑچی آواز سنائی دی۔ "تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میں ہر گز پڑے مرو کے پیچھے نہیں بھاگتی۔ مردوں کا شکار کھیلنے کے میرے اپنے اصول ہیں۔ جنہیں میں ہر حال میں ملحوظ رکھتی ہوں۔ اور اب تو تم بھی میرے معیار سے بہت نیچے گر چکے ہو۔"

اُس کے ان بلند بانگ وعودوں پر میرا دل چاہا کہ اسے بتا دوں کہ پہلے میں جس نے ہی آواز بدل کر اس سے بات کی تھی لیکن میں نے فوراً ہی وہ ارادہ ترک کر دیا۔ اول تو دیرا شرمندہ ہونے والی مخلوق نہیں تھی دوم یہ کہ ابتدائی گفتگو کے حوالے سے یہ امکان موجود تھا کہ شاید ایک بچے سرور سڑک کے قریب سے اسے پکڑا جاسکے اس لئے میں نے بات کو مذاق میں ڈال دینا مناسب سمجھا اور دیرانے جھکا کر فون بند کر دیا۔

"یہ تو بہت خطرناک اور  صفت عورت معلوم ہوتی ہے۔ فون بند ہوتے ہی ظفر ایک گھبراہٹ سے لے کر بولا "تم کو اس سے بات آگے بڑھانی چاہئے تھی تاکہ یہ معلوم ہو سکا کہ بلیو کراس ڈیل کے سلسلے میں ان لوگوں کے کیا عزم ہیں؟"

"میں جس بات میں دلچسپی لیتا وہ اسی کو ابھانا شروع کر دیتی۔ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ تمہاری نوک جھونک سے چڑ کر بہت کچھ اگلی جارہی تھی۔"

"تمہارے لئے وہ باتیں اہم رہی ہوں گی مگر وہ ہمارے مشترکہ راز تھے۔ اس نے کوئی بھی ایسی بات نہیں کہی جو پہلے سے میرے علم میں نہ رہی ہو۔" میں نے اسے بتایا۔

"گھٹیا یہ درست ہے کہ تم دونوں ایک دوسرے کے عشق میں جلا رہ چکے ہو؟" ظفر نے جھٹکتے ہوئے پُر اشتیاق لہجے میں سوال کیا اور میں بے اختیار ہنس پڑا۔

"اُس کے بارے میں" میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" میں نے کہا۔ "البتہ جہاں تک میرا تعلق ہے، وہ عشق نہیں بلکہ سرکش جذباتوں کی آوارگی تھی۔ کیونکہ دیرا بہت زیادہ حسین ہونے کے ساتھ ہی جوان سال بھی ہے۔ ایک ایسی لڑکی پردہ پر ہی آئناہ وہ تو بڑے بڑے زاپادوں کی بھی رال ٹپک سکتی ہے۔ بظاہر وہ خود کو لئے دیے رکھتی ہے اور اس کی مرضی کے بغیر کوئی اس کی طرف پیش قدمی کی

پاس پناہ لی ہوئی ہے۔ میں یہاں آتا ضرور ہوں لیکن رہتا اپنے ٹھکانے پر ہوں۔ تم نے ادھر کا رخ کیا تو یہ تمہارے ساتھ بہت بے دردی کے ساتھ پیش آئیں گے ان کے مارے ہوئے لوگوں کی لاشوں تک کا پتا نہیں چلتا۔"

"میں تو اب تماشا دیکھوں گی۔" ہلکی سی ہڈیانی ہنسی کے ساتھ اس کی آواز ابھری۔ "اب تمہارا جگر دوست جہانگیر ہی تمہارا سرا ناک کر میرے سامنے لائے گا۔"

"جہانگیر!" اس کا نام سننے ہی میرے ذہن کو ایک بدترین جھٹکا لگا۔ وہ شی کے عروج کے زمانے میں اس کے مقامی بیویوں میں شمار کیا جاتا تھا لیکن شی کی سرگرمیاں موہوم اور پھر محسوس ہونے کے بعد سے وہ ہر کام سے الگ تھلک ہو کر رہ گیا تھا۔ دیرا پہلے بھی ایک بار کہہ چکی تھی کہ جہانگیر کام سے ضرور لے تعلق تھا لیکن عملی طور پر بدستور شی کا حلقہ پائندہ وفادار تھا اور وقت پڑنے پر وہ تنظیم کے کسی کام سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اب دیرانے اتنے وثوق کے ساتھ جہانگیر کا ذکر کر کے مجھے بری طرح چونکا دیا تھا۔

"ہاں جہانگیر!" میری اضطرابی تکرار پر اس کی ہنسنے آواز ابھری۔ "ایک وقت تھا کہ وہ میرے نام بلکہ سامنے تک سے دہشت زدہ رہتا تھا لیکن تمہاری وجہ سے جب میں اس سے بھی بے تکلف ہو گئی تو اب وہ مجھے مانتا ہے نہ شی میں میری اقداری کو تسلیم کرتا ہے لیکن میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ اپنی بات کس طرح منوانی جاتی ہے۔ تم دیکھ لیتا کہ اب وہی تمہیں ٹھکانے لگائے گا۔" "تو کیا تم نے صرف اتنی سی بات بتانے کے لئے مجھے فون کیا تھا؟" میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

"میں تم سے آخری بار بات کر لی چاہ رہی تھی۔ اب مجھے اطمینان رہے گا کہ میں نے تمہیں آخری موقع فراہم کیا تھا جسے تم نے خود گھرا دیا۔"

"تم دو غلی اور قابل نفرت ہو دیرا!" میں نے غصے میں کہا "تم جہانگیر کو پہلے ہی میرے خلاف اکسا چکی ہو۔ اس کا مطلب ہے کہ تم چند منٹ پہلے تک نیتی، دوستی اور مصالحت کی جو باتیں کر رہی تھیں وہ سب فریب پر مبنی تھیں۔ اگر تمہارے دل میں ذرا سادھی ظلموں ہو تا تو تم جہانگیر کو میرے خلاف بھڑکانے سے پہلے مجھ سے بات کرتیں۔ میرے انکار کے بعد تمہیں اپنا ہر حربہ آزمانے کی کھلی جھوٹ ہوتی...."

"میرے پاس تمہارا کوئی سراغ نہیں تھا۔" اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔ "میں نے میرا گھر خان کی موت کے بعد ہی تم سے سمجھوتے کی ضرورت محسوس کر لی تھی لیکن تم روپوش تھے۔ آج میں نے آخری کوشش کے طور پر اپنے پرانے گھر کے نمبر پر فون کیا تھا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ اول خان اب بھی یہیں جہا بیٹھا ہوگا۔" "تمہاری یہ وضاحتیں بے سود ہیں۔ ہو سکے تو مجھے اپنا پتا ٹھکانا بتا دو۔ اگر میرے خیالات میں کوئی تبدیلی رونما ہوئی تو میں تم سے

”خدا کے لئے تم تو ایسی باتیں نہ کرو!“ اس کی آواز روہانی ہو گئی۔ ”ویرا بہت حرام زادی ثابت ہوئی ہے۔ وہ میرا اکلوتا بچہ لے گئی ہے۔ اس کی جدائی کے غم میں سملی کا ذہنی توازن خراب ہو گیا ہے۔ وہ اسپتال میں ہے اور میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کیا کروں۔ ویرا نے فون پر مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہیں قتل کر کے ہی اس سے اپنا بچہ واپس لے سکتا ہوں ورنہ وہ اسے مار دے گی۔“

جناگیر کی کہانی سن کر میں سکتے میں رہ گیا۔ ویرا نے اس کے معصوم اور شیرخوار بچے کو اغوا کر کے اپنی کیسیوں کے سارے اگلے پچھلے ریکارڈ توڑ دیے تھے۔

”لیکن یہ سب ہوا کیسے؟“ میں نے سرسراہٹ ہوئی، ”الم زدہ آواز میں پوچھا۔“

میرے جواب میں اس نے روتے اور سکتے ہوئے جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ ویرا پچھلے روز اس کے گھر پہنچی اور ادھر ادھر کی باتوں کے بعد جناگیر کے شیرخوار بچے کے لئے کچھ تحفے وغیرہ خریدنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ قدرے پس و پیش کے بعد سملی اس کے ساتھ جانے پر تیار ہو گئی اور وہ دونوں عورتیں بچے سمیت بازار کے لئے روانہ ہو گئیں۔ شہر کے ایک مشہور اسٹور میں ویرا نے بچے کے لئے بہت سی چیزیں خریدیں۔ بچہ اسی کی گود میں تھا۔ اسی اثنا میں سملی زنا نے کپڑوں کے شعبے میں اپنی خریداری میں منہمک ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ فارغ ہوئی تو ویرا اپنے سمیت غائب تھی۔ وہ سمجھی کہ ویرا باہر چلی گئی ہوگی۔ اس نے دیوانہ وار ہر طرف تلاش کیا پھر مایوس ہو کر جناگیر کو فون کیا تو اسے وہ بری خبر پہلے ہی مل چکی تھی۔ ویرا نے اس اسٹور سے غائب ہونے ہی کسی پبلک ہتھیار سے جناگیر کو فون کر کے بتادیا تھا کہ بچہ اس کی تحویل میں تھا۔ ان لوگوں کو پولیس تھانے سے رجوع کرنے کے بجائے اس کی اگلی فون کال کا انتظار کرنا چاہئے۔ جناگیر کو فوراً ہی گڑبڑ کا اندازہ ہو گیا لیکن اس نے سملی کو تسلی دی کہ ویرا بچے کو لے کر کہیں چلی گئی ہے اس لئے وہ خاموشی سے گھر لوٹ آئے۔

وہ دونوں ہی بہت مضطرب اور بے چین رہے۔ سملی کی چھٹی حس نے اسے بھی خطرے کا احساس دلایا لیکن اصل معاملے سے وہ دونوں لاعلم تھے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ویرا نے اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لئے ان کے اکلوتے بیٹے کو دھوکے سے اغوا کر لیا ہوگا۔

ان پر اصل صورت حال اس وقت واضح ہوئی جب بیڑہ کھنچے بعد ویرا کا دوسرا فون آیا۔

اس بار ویرا کالاب و لوجہ یکسر دلا ہوا تھا۔ اس نے ان کے جذبات کی پروا کئے بغیر دو نوک الفاظ میں کہا کہ ان کا بچہ اس کے پاس بطور پرغمال محفوظ تھا۔ اس کی واپسی کی ایک ہی صورت تھی کہ جناگیر کھینچے تلاش کر کے خود ہلاک کرے یا کرائے کے کسی قاتل سے مجھے ختم کرا دے۔

جرات نہیں کر سکتا لیکن اندر سے وہ بہت دل پھینک اور رنگین مزاج ہے۔ اس کا کردار کسی سیکرٹ ایجنٹ کی طرح ہے اور وہ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے اپنی ذہانت سے لے کر جسمانی حسن و نساں تک ہر چیز کو داؤ پر لگا دیتی ہے۔“

”تو تم ایک بچے اس سے لٹے جاؤ گے؟“ ظفر نے معنی نیر مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

”مجھے اُس سے ایسی کسی حفاظت کی امید کم ہی ہے لیکن میں وہاں ضرور جاؤں گا۔“

”میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔ ہم لوگوں کا ایسے رنگین جرائم سے واسطہ نہیں پڑتا۔“

”ساتھ نہیں چلوں گے بلکہ اصل رول تم ہی کو ادا کرنا ہوگا۔“

میں نے ہنستے ہوئے کہا ”اگر ویرا ایک بچے سرورسز کلب کی طرف آنے کی غلطی کر بیٹھی تو تم ہی اسے گھیر گھاڑ کر پکڑ دو گے۔ میں سامنے گیا تو وہ بدکر مقابلے پر آئے گی اور ہو سکتا ہے کہ فرار ہونے میں کامیاب ہو جائے۔“

”میرا خیال ہے کہ اسے یہیں لانا ہوگا؟“ ظفر نے سوچتے ہوئے سوال کیا۔

”فی الحال ہمارے پاس کوئی اور ٹھکانا نہیں ہے اس لئے مجبوری ہے۔“

”لیکن میں نے ابھی یہ نہیں کہا ہے کہ ایک دوسرے کے خلاف اپنے دلوں میں بغض و عناد رکھنے کے باوجود تم دونوں ایک دوسرے کو دیدہ و دانستہ قتل نہیں کر سکو گے۔ کھلے مقابلے میں کوئی مارا جائے تو ادبیات ہوگی ایسی صورت میں ویرا کو پکڑ کر یہاں لانے کا کیا فائدہ ہوگا؟“

”سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہوگا کہ وہ ایران کا رخ نہیں کر سکے گی اور بلوچر اس ڈیل کسی دخل اندازی کے بغیر مکمل ہو جائے گی۔“

دوم یہ کہ وہ یہاں میری نہیں بلکہ تم لوگوں کی قیدی ہوگی اور اس کے مستقبل کا انحصار تمہارے فیصلے پر ہوگا۔ اس میں میرا کوئی دخل نہیں ہوگا۔“

”لیکن جناگیر والی بات ناقابل فہم ہے۔“ سلطان شاہ بولا۔

”ویرا نے اسے کس طرح شیشے میں اتارا ہوگا؟“

”یہ ابھی دیکھے لیتے ہیں۔“ میں نے اسپیکر فون اٹھا کر اپنی گود میں رکھتے ہوئے کہا۔

دوسری طرف سے جناگیر نے پہلی تھنسی بجتے ہی ریسیور اٹھا لیا۔

”تم کہاں ہو؟ میں دو دن سے سخت اذیت کے عالم میں ہوں۔“ میری آواز سنتے ہی جناگیر پھٹ پڑا۔ اس کی وحشت زدہ آواز سے پریشانی بھٹک رہی تھی۔

”میں کراچی میں ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ تم میزے سر کے طلبگار ہو گئے ہو؟“

ہے کہ وہ بچے کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔ اس سے پہلے ہی ہم اسے اپنی تحویل میں لینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔
 ”میں بہت اداس اور تنہا ہوں“ ڈینی! اس کی کرب آلود آواز ابھری ”کیا یہ ممکن نہیں کہ تم کچھ دیر کے لئے میرے پاس آجاؤ، تمہاری ذات سے مجھے بہت ڈھارس ملتی ہے۔“
 ”میرا وہاں آنا بچے کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے“ میں نے سنجیدگی سے کہا ”دیر! کو میری وہاں آمد اور خیریت کے ساتھ واپسی کی بجائے بھی مل گئی تو وہ کوئی غلط حرکت کر کر زورے گی۔“
 ”اس نے مجھے بالکل ہی بے بس اور تنہا کر دیا ہے“ وہ ہلک کر رو پڑا۔

اس سے مزید چند منٹ کی گفتگو کے بعد میں نے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

”یہ عورت تو آفت کی پرکالہ معلوم ہوتی ہے“ ظفر تشویش آمیز لہجے میں بولا ”اپنے کسی شناسا کے ساتھ ایسی گھٹیا حرکت کرنے کے لئے جتنی کراہت ہونا ضروری ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمہاری دشمنی نے اس کا دماغ ہی الٹ کر رکھ دیا ہے جب ہی وہ ان حروں پر اتر آئی ہے۔“

وہ جنونی طبیعت کی مالک ہے“ میں نے متحضر لہجے میں کہا۔
 ”جس چیز یا کام کے پیچھے جڑ جاتی ہے، دن رات ای کی دھن میں لگی رہتی ہے۔ آج کل اس کے سر پر ہر لمحہ یہی ہے۔“
 ”جنا نکیر کے بچے کا معاملہ عجیب ہے اب غزالہ کے ساتھ ادھر کی بھی فکر کرنی ہوگی“ سلطان شاہ پُر تشویش لہجے میں بولا۔
 ”اے کچھ ہوا تو میں دیر! کو بھی معاف نہیں کر سکوں گا۔“
 ”نی الحال میں اس معاملے پر سوچنا چاہتا ہوں۔ مجھے تنہا چھوڑ دو! میں نے تجھے ہونے لہجے میں کہا ”شاید میں اس کا کوئی حل تلاش کر سکوں۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں سلیٹی اس صدمے سے مر ہی نہ جائے۔“

سلطان شاہ خاموش ہو گیا۔ ظفر نے مجھے ایک علیحدہ کمرے میں، جہاں سونے کا بندوبست تھا، آرام کرنے کی پیشکش کی جو میں نے فوراً ہی قبول کر لی کیوں کہ اس وقت صبح کے دس بج چکے تھے۔ بارہ بجے میرا ارادہ سرومز کلب کی طرف جانے کا تھا تاکہ دیر! کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی میں اپنا مورچا جاسکوں۔ اس کے بعد چھ بجے رجنی کا غزالہ سے تبادلہ کرنے کا مرحلہ آجاتا۔ ان مصروفیات کے درمیان میں کہیں بھی اتنا وقفہ نہیں تھا کہ میں وہاں سے جا کر واپس آنے کی گنجائش نکال سکتا۔

”موتن لال اور امرکار کی لاشوں کا کیا کیا جائے؟“ مجھے اٹھنے دیکھ کر ظفر نے سوال کیا۔

”میں کسی سب کے بغیر مردوں کی مٹی پلید کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ پھر یہ تو سیدھا سادہ قتل اور خودکشی کا کیس ہے۔ موتن لال کی انگوٹھی کے کھینے کا راز فاش ہوتے ہی پولیس کا کام آسان

دیر! کی شرط سن کر جنانگیر کے مہر و ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ اس نے دیر! کو بتایا کہ اس کے لئے وہ شرط قابل قبول نہیں تھی کیونکہ وہ ماضی سے اپنے سارے رشتے توڑ چکا تھا۔ اس نے دیر! کو بھاری رقم اور پھر اپنے تمام اثاثوں کی پیشکش کی۔ وہ دنیا کی ہر نعمت سے دست بردار ہو کر صرف اور صرف اپنے بچے کو زندہ و سلامت حاصل کرنا چاہتا تھا مگر دیر! اپنی اسی شرط پر اڑی رہی اور آخر کار جنانگیر کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔

دیر! نے اسے دھمکی دی تھی کہ بچے کی بازیابی کے لئے پولیس سے رجوع کیا گیا اس کا چھپچھا کرنے کی کوشش کی گئی تو وہ بلا تاخیر بچے کو ہلاک کر کے اس کی لاش کسی کوڑے دان میں پھکوا دے گی۔ جنانگیر کی زبانی اصل صورت حال سے واقف ہوتے ہی سلیٹی پر بڑائی کیفیت طاری ہو گئی اور وہ ہسپتالی انداز میں جھنجھٹے ہوئی ہو گئی۔ وہ ہوش میں آئی تو اس کی آنکھوں میں روج کو لرزادینے والی دیر! نے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ وہ اپنے گم شدہ بچے کو یاد کر کے کبھی ہونے لگتی تھی اور کبھی اچھل اچھل کر قہقہے لگاتی تھی کہ اس کا بیٹا جنت کی کھڑکی سے ہلک ہلک کر اسے بلا رہا ہے۔

جنانگیر نے اسے ایک نفسیاتی اسپتال میں داخل کر دیا تھا اور خود پریشان تھا کہ کیا کرے۔

”تم گھنٹے دل کے ساتھ سوچ کر مجھے بتاؤ کہ تم کیا چاہتے ہو؟“ اس کی پوری کہانی سن کر اسے دلاسا دینے کے بعد میں نے سوال کیا ”میں پوری طرح تمہارا ساتھ دینے کے لئے تیار ہوں۔“
 ”اپنے بچے کی واپسی کے علاوہ میں کچھ نہیں چاہتا۔ تمہیں معلوم ہے کہ خدا نے ہمیں کتنی منتوں اور آرزوؤں کے بعد اس نعمت سے نوازا تھا۔ پتا نہیں دیر! اس کے ساتھ کیا سلوک کر رہی ہوگی۔ اولاد کا دکھ درد اولاد والے ہی سمجھ سکتے ہیں۔ وہ تو زنی فاش اور بدکار عورت ہے۔“

”دیر! کی شرط تم قبول کر چکے ہو۔ چاہو تو میں خود تمہارے گھر آسکتا ہوں۔“

”خدا کے لئے میں کمرہ“ وہ بے اختیار جع پڑا اور رندھی ہوئی آواز میں بولا ”میں نے کوئی شرط قبول نہیں کی۔ اس حرام زادی نے وہ شرط میرے اوپر توہین ہے۔ اپنی اولاد کے لئے میں تم جیسے دوست کا تو کیا، کسی کا بھی خون اپنے سر نہیں لے سکتا۔ بچے کی زندگی ہے تو وہ ہر حال میں مجھے مل جائے گا۔ اگر اس کی موت دیر! کے ہاتھوں لکھی ہوئی ہے تو تم بھی دعا کرنا کہ پروردگار مجھے اس کا بدل عطا کرے۔ یہ مجھے باپ بننے کے بعد معلوم ہوا کہ اولاد کے بغیر زندگی کتنی پھلکی، سولی اور بھینک ہوتی ہے۔“

”آج کل میں رُپوش ہوں“ میں نے ایک گھبراہٹ سے لے کر کہا ”دیر! کا فون آجائے تو اس سے یہی کہنا کہ تم میری تلاش میں لگے ہوئے ہو۔ ویسے میں خود اس کے پیچھے لگا ہوا ہوں۔ میرا خیال

ڈرائیو جگ سیٹ سنبھال لی۔

”تمہارا یہ خیال کیوں تھا کہ دیرا سروسز کلب آنے کی حماقت نہیں کرے گی؟“ راستے میں ظفر نے مجھ سے پوچھا۔

”میں میرا خیال ہی تھا کیوں کہ میں اسے جانتا ہوں۔ وہ اتنی آسانی کے ساتھ گرفت میں آنے والوں میں سے نہیں ہے۔ دیے یہ بھی ممکن ہے کہ آج وہ میرے اندازے کو غلط ثابت کر بیٹھے۔“

”لیکن اسے تو آخر تک اندازہ نہیں ہوسکا تھا کہ اس نے دونوں بار تم ہی سے بات کی تھی۔ تم نے بت کا سیاہی کے ساتھ اپنی آواز کے ساتھ لب و لہجہ تک بدل لیا تھا۔ وہ تو یہی سمجھ کر آئے گی کہ ایس ٹی ایف کا کوئی مہم جو جو اس کے حسن کے چگل میں پھنسنے والا ہے۔“

”میرے پاس اپنے اندازے کی تائید میں کچھ بھی نہیں ہے۔ خود میری دعا ہے کہ خدا کرے میرا اندازہ غلط ثابت ہو۔ ایسا ہوا تو جاکتیر کے بیٹے کے ساتھ ہی بلبر کراس ذیل کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔“

”سروسز کلب کا عقبی گیٹ کون سا ہوگا؟“ اچانک سلطان شاہ پوچھ بیٹھا۔

”کلب انیس کی پارکنگ لائٹ والا گیٹ جو میزوپول کے پیچھے اور ایم پیٹر کے برابر میں ہے۔“ میں نے کہا۔

”اگر وہاں پہنچنے سے پہلے ہی دیرا کہیں نظر آجائے تو ہم کیا کریں گے؟“ سلطان شاہ نے پھر پوچھا۔

”تم ڈرامہ دیکھ کر بھاگ لینا، ہم اسے پکڑنے کی کوشش کریں گے۔“ میں نے بتا کر کہا۔

”تو پھر اسے پکڑنے کی تیاری کرو۔ وہ ہمارے پیچھے تیری گاڑی ڈرائیو کر رہی ہے۔“ سلطان شاہ کے وہ الفاظ میرے اعصاب

کے لئے دھماکا خیز ثابت ہوئے لیکن میں نے فوری طور پر پیچھے ہٹنے کی حماقت نہیں کی۔ ظفر بھی یک۔ یک مڑ جوش نظر آنے لگا تھا۔

”کیا وہ ہمارا پیچھا کر رہی ہے؟“ میں نے بیجان آمیز آواز میں پوچھا۔

”نی الحال تو شاید اس نے ہمیں دیکھا بھی نہیں ہے۔ میں عقب نما آئینوں میں خود کو اس سے بچانے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن راستہ لٹنے پر وہ کسی بھی وقت اچانک ہمارے برابر میں آن سکتی ہے۔“

وہ بہت سنسنی خیز لحاظات تھے۔ لمحہ بھر کے لئے میرے دل میں خیال آیا کہ ہم دو ہیں اچانک بریک لگا کر ٹھنک جام کر رہے۔ اپنی گاڑی سے نیچے اتر کر دیرا کو اس کی کار سے باہر کھینچ لیں۔

لوگوں کے پاس ہتھیار بھی موجود تھے لیکن ایک بھری بڑی گلی ہماری کامیابی کے امکانات کم تھے۔ دیرا ہمارے پیچھے کی جھلک دیکھتے ہی غصہ بھانپ لیتی اور اپنی کار سے اتر کر سروسز کلب

شروع کر دیتی تو وہاں اچھا خاصا تماشا بن سکتا تھا اور بیخ ہو۔

ہو جائے گا اس لئے لاشیں کسی ایسی جگہ پر ڈلوادو جہاں پولیس آسانی سے پھنسنے۔“

”اگر کار کی ادھڑی ہوئی جلد پر بید کے بے شمار نشانات واضح ہوں گے۔“ سلطان شاہ نے ہمیں یاد دلایا۔ ”پولیس کے لئے ان کا بھی کوئی جواز ہونا چاہئے تاکہ یہ معاملہ ہمیں ختم ہو جائے۔“

”میں اپنی خون آلود بید بھی وہاں ڈلوادوں گا۔“ ظفر مسکراتے ہوئے بولا۔ ”دیے تم فکر نہ کرو۔ یہ قصہ آگے بڑھایا بھی گیا تو کوئی

ہماری طرف رخ نہیں کر سکے گا۔“

میرے لئے وہ گھر اجنبی تھا۔ دیرا کے قیام کے دوران میں میں وہاں بکھرت آیا کرتا تھا۔ پھر بلیک کیٹ ٹی یا ٹا سرکار نے اسی گھر کے ڈرائنگ روم میں لاسکی مواصلاتی نظام سے خشک اسپیکر اور

مائیکروفون چھپا کر دیرا کو اپنے مقاصد کے حصول کے لئے بلیک میل کرنا شروع کیا تھا۔ اس وجہ سے مجھے ظفر کے بتائے ہوئے

کمرے تک پہنچنے کے لئے کسی کی رہنمائی کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

وہ کمرہ دیرا اپنی خواب گاہ کے طور پر استعمال کرتی تھی۔ فرش پر دھڑ اور پیش قیمت قالین موجود تھا۔ کھڑکیوں پر اتنے دھیر۔ دھیر۔

پردے پڑے ہوئے تھے کہ دن دہاڑے بھی اس کمرے میں رات کا سماں بندھا ہوا تھا۔ کنگ سائز بیڈ پر بے آسانی تین بلکہ چار افراد بھی

بیک وقت آرام سے سو سکتے تھے۔ اس خواب ناک باجول میں انٹرکنڈیشنر کے چلنے کی آواز بھی گھون گھون کے علاوہ کوئی آواز

نہیں تھی۔ خشک اور آرام دہ ماحول میرے آتے ہی میں جوتے اتارے بغیر بستر پر گر گیا اور تقریباً فوراً ہی غودگی کی لہر نے مجھے

آلیا۔



ٹھک سوا باہر بجے ہم تینوں دیرا سے ملاقات پر جانے کے لئے تیار ہو چکے تھے۔

میں گدھے گھوڑے بیچ کر ایسی گہری نیند سوا تھا کہ اگر سلطان شاہ باہر بجے مجھے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بیدار نہ کرتا تو میں شاید رات ہی

کی خبر لاتا۔ اتنی گہری نیند کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ مجھے اپنے سونے کا اندازہ ہی نہیں ہوسکا تھا۔ نیند کے عالم میں بھی میں دیرا اور

غزالہ کے پیچھے بھاگتا رہا۔ کبھی جاکتیر کے شیر خوار بیچے کی بازیابی کی فکر میں الجھا رہا۔ جب میں بیدار ہوا تو میرے ذہن میں وہ سارے

خواب تازہ تھے جن میں بہت سے کارآمد اشارے بھی موجود تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ عالم خواب میں بھی میرا لاشعور پوری تندی کے

ساتھ کام کرتا رہا تھا۔

لیکن اس وقت ان نکات پر تبادلہ خیال کا موقع نہیں تھا اس لئے میں تیار ہو کر فوراً ہی ان لوگوں کے ساتھ نکل کھڑا ہوا۔ اس

مہم کے لئے ظفر نے جیب کے بجائے ایک کارنگھوانی تھی۔ میرے ایمپرا اس نے اپنے ڈرائیو کو وہیں چھوڑ دیا اور سلطان شاہ نے

”اور کمال کی بات یہ ہے کہ مغرب نثار ہونے کے باوجود ہم لوگوں سے بہتر اردو بولتی ہے۔ اگر ہم راستے ہی میں اس سے الجھنے کی کوشش کرتے تو اس کے ایک اشارے پر اس کے سیکڑوں حمایتی پیدا ہو جاتے اور ہماری گلو خلاصی مشکل ہو جاتی۔“

”میں نے یہی سوچ کر اپنا راستہ بدلنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اب دیکھنا ہے کہ وہ کیا کھل کھاتی ہے۔“

ہم نے دو مرتبہ ہوٹل میٹروپول کا طواف کیا لیکن ویرایا اس کی سیاہ کار کا کسی پتا نہیں تھا۔ سروسز کلب کے وسیع احاطے کی دیوار کے ساتھ بنی ہوئی فٹ پاتھ پر معمول کے مطابق لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی لیکن اس بھڑ میں دور دور تک رنگین توکیا، کوئی سیاہ چھتری بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔

میری رست واپس میں اس وقت ایک بجتے میں دس منٹ باقی تھے۔ میں نے اپنی کار ہوٹل میٹروپول کے عقبی فٹ پاتھ کے کنارے ایسی جگہ رکھ رکھی جہاں سے سروسز کلب انٹیکسی کا پھاٹک صاف نظر آ رہا تھا۔

”میرا خیال ہے کہ اب تم جاؤ، رام بھلی کرے گا“ میں نے ظفر کے شانے پر ہاتھ مار کر کہا ”وہ پڑی پر آجائے تو اسے ٹیکسی میں لے جانا ہم لوگ تمہارا پیچھا کریں گے۔“

وہ گاڑی سے اتر کر سڑک پار کرنے کے لئے آگے ہوٹل کے عقبی راستے کی طرف بڑھ گیا۔

”وہ آئے گی یا نہیں آئے گی؟“ اس نے پلے جانے کے بعد سلطان شاہ نے پوچھا۔

”چند منٹ بعد صورت حال خود بخود واضح ہو جائے گی“ میں نے گول مول جواب دے کر اسے ٹال دیا۔

وقت گزرا رہی کے لئے میں نے سیٹ کی پشت گاہ ڈھلکا کر سگریٹ سلگائی۔ سلطان شاہ نے کیسٹ پلیئر کے لئے سوچ آن کر کے عطا اللہ عینی فیلوی کا ایک کیسٹ لگا دیا جس کی ابتدا ہی ایک دردناک نغمے سے ہوئی تھی۔ گلوکار کے پرسوز انداز نے گیت کے بولوں میں درد کے سمندر بھر دئے تھے۔

ایک بجتے میں پانچ منٹ پر ایک موٹر سائیکل سروسز کلب کے گیٹ سے ذرا آگے رکی اور اس پر سوار مرد اپنے پیچھے ہنسی ہوئی دو غلی نسل کی ایک اسارٹ سی لڑکی کو وہاں اتار کر چلا گیا۔

ایک بیک سرمنی نسل کی وہ لڑکی میری توجہ کا مرکز بن گئی۔ اس کے بدن پر چست اسکرٹ اور بلاؤز میں اتنی متجاش نہیں تھی کہ وہ اس کے داہنے ہاتھ میں ایک پرس تھا اور اسی بٹل میں ایک بند چھتری دبی ہوئی تھی۔ اس لڑکی نے فٹ پاتھ پر قدم رکھتے ہی چھتری کھول کر اپنے سر پر تانی تو وہ رنگین تھی۔

میں نے معنی خیز نظروں سے سلطان شاہ کی طرف دیکھا تو وہ زہر لب کچھ بددرا کر رہ گیا۔

مجھ لازمی طور پر اسی کا معانی ہو جاتا۔ دو سرا خطہ یہ تھا کہ آگے ہماری گاڑی کے نکلنے کا راستہ دانستہ مسدود کر دیا جاتا کیوں کہ عام لوگوں کے لئے وہ اغوا کی واردات ہی ہوتی جس میں تین قوی ہیکل فٹبے ”اردو بولنے والی ایک سفید فام حسینہ کو اٹھالے جانے کی کوشش کر رہے ہوتے۔“

یہ ایک عجیب اتفاق تھا کہ وہ بھی اسی سمت میں جاری تھی۔ چارہم سڑک پر تھے۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ بھی مقررہ وقت پر سروسز کلب کے پھاٹک پر پہنچنے کا ارادہ رکھتی ہے اس لئے بہتر یہی ہو گا کہ ہماری پڑی سڑک پر اس سے الجھنے کے بجائے اسی کے چال میں چھانا جائے۔ مقررہ مقام سے ہٹا چھٹا کر یہ آسانی نہیں بھی لے جاسکتا تھا۔ اور اگر ہم سڑک پر اس سے الجھ جیتے اور وہ ہمیں جل دے کر نکل جانے میں کا سیاب ہو جاتی تو پھر وہ کسی بھی قیمت پر سروسز کلب والی فٹ پاتھ کا رستہ نہ کرنی اور ہم ہاتھ ملتے رہ جاتے۔

”اپنی گاڑی موقع ملتے ہی بائیں طرف گھما لو“ میں نے چند ہی ثانیوں میں پوری صورت حال کا تجزیہ کرنے کے بعد فوری طور پر سلطان شاہ کو ہدایت کی ”اسی وقت ہمیں ہر قیمت پر اس کی نظروں سے بچنا ہے۔ اس نے ہمیں دیکھ لیا تو وہ ہوشیار ہو جائے گی۔“

”شاہی تم اس کالی کار کی بات کر رہے ہو جسے ایک سفید فام لڑکی چلا رہی ہے؟“ ظفر نے سلطان شاہ سے سوال کیا۔ شاید اس اثنا میں وہ پیچھے کا جائزہ لینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

”ہاں پتا نہیں وہ کب سے ہمارے پیچھے چلی آ رہی ہے؟ میں نے تو تھوڑے دیر پہلے ہی اسے دیکھا ہے“ اپنی بات مکمل کرتے ہوئے سلطان شاہ نے کار بائیں سمت کی بٹلی سڑک پر گھمادی۔ ظفر مڑ کر پیچھے دیکھ رہا تھا۔ لمحہ بعد ہی اس نے اعلان کیا کہ ویرایا کار شاہراہ پر سیدھی ٹھٹکی چلی گئی تھی۔

”میرا خیال ہے کہ وہ بھی ہماری طرح سروسز کلب کی طرف جاری ہے“ ظفر نے جو شبلی آواز میں کہا ”آج اگر ہمارے مقدر نے یاد دہی کی تو وہ ضرور پکڑی جائے گی۔“

”اب میرے لئے کیا حکم ہے؟“ سلطان شاہ نے پوچھا ”اسی سڑک پر چلتا رہو یا یوٹرن لے کر واپس شاہراہ کا رخ کرنا ہے؟“

”واپس پرانے راستے پر چلو۔ مجھے خوشی ہے کہ تم آنکھیں کھول کر ڈرائیونگ کر رہے ہو۔“

”تو کیا آنکھیں بند کر کے بھی ڈرائیونگ کی جاسکتی ہے؟“ سلطان نے تسخیرانہ انداز میں پوچھا۔

”خدا کا شکر ادا کرو کہ تم اس وقت چپکنے کے قابل ہو۔ اگر وہ ہمیں اور نیک کرتی تو ب سے پہلے تم ہی اس کی نظروں میں آتے اور وہ خاموشی سے تمہاری کھوپڑی میں سوراخ کر دیتی“ میں نے کہا۔

”واقعی بہت حسین عورت ہے وہ“ ظفر نے تعریفی لہجے میں کہا۔

معاوضے پر اس لڑکی کی خدمات حاصل کی تھیں اور وہ ویرا کا بکرا ہوا حلیہ بتانے کے علاوہ کوئی مدد نہیں کر سکتی تھی۔

ظفر مرزا مٹی اور حوصلے کا پیکر تھا۔ اسے طاقت، ذہانت اور دلیری کے ذریعے دشمن پر غلبہ پالنے میں خصوصی مہارت حاصل تھی لیکن وہ جس جرم کو رٹین سمجھ کر اس میں کودا تھا وہ جرم سنگین اور پیچیدہ تر ہوتا تھا۔ نظر آ رہا تھا۔ وہ اپنی پیشانی مٹا ہوا چند تانوں تک اسی ایک مقام پر ٹٹکتا رہا۔ اس کی ان اضطرابی حرکات کا مشاہدہ کرنے والا کوئی بھی شخص یہ سمجھ سکتا تھا کہ رٹین چھتری والی کی طرح وہ بھی کسی کا انتظار کر رہا تھا۔

لیکن ظفر نے فیصلہ کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔ ٹھیک ایک بجے وہ رٹین چھتری والی کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس کی پشت اور لڑکی کا چہرہ ہماری طرف تھا۔ چند تانوں تک لڑکی کے چہرے پر شرم مسکراہٹ لہرائی رہی۔ اس نے اپنے سر میں سے کوئی کاغذ یا لٹاؤ نکال کر ظفر کی طرف بڑھایا۔ چند ٹانے گزر گئے۔ شاید ظفر اس پیغام کا مطالعہ کر رہا تھا پھر شاید اس نے کوئی خطرناک بات کہی کیوں کہ لٹکھٹ لڑکی کا منہ ہوا بدن ڈھلا پڑ گیا اس کا چہرہ دھواں ہو گیا ساتھ ہی اس نے اپنے سر پر تکی ہوئی رٹین چھتری بھی سمیٹ لی۔ ان دونوں نے ایک ساتھ ایم بیڑی کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ لڑکی کی چال میں بھی مردنی پیدا ہو گئی تھی۔ بس وہ ظفر کے ساتھ گھٹنے جاری تھی۔ اس دوران میں ان دونوں میں مذاکرات جاری تھے۔ ایک بار ظفر نے سر اٹھا کر سڑک کے اس پار ہوٹل میزوپال کی کئی منزلہ عمارت کی طرف بھی دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اس لڑکی کو چاہئے پلانے لے جا رہا تھا لیکن کافی دور نکل جانے کے بعد وہ دونوں واپس پلٹ پڑے۔

آخر کار ظفر واپس آئے لگا۔ لڑکی اس سے فارغ ہوتے ہی تیزی کے ساتھ آواری ماورڈ کی طرف چل پڑی جیسے جلد از جلد ظفر سے دور نکل جانا چاہتی ہو۔

ظفر نے ہم سے کافی فاصلے پر سڑک عبور کی پھر اچانک دوڑنا ہوا ہماری طرف آیا اور بہت تیزی کے ساتھ پچھلی سیٹ پر گرتے ہوئے بولا ”میاں سے پوری رفتار سے نکل چلو۔“

سلطان شاہ نے گاڑی حرکت میں لاتے ہوئے کیست پیٹر آف کر دیا۔

”کیا بات ہے؟ تم بہت جگت میں واپس آئے ہو“ میں نے سوال کیا۔ اس وقت شارع فیصل کی طرف سگنل سرخ تھا اس نے سلطان شاہ نے کار واپسی طرف کھمبائی۔

”تم نے دیکھ لیا کہ وہ آج پھر جیل دے گئی“ وہ مایوسی اور غصے کے عالم میں بولا۔

”مجھے پہلے ہی شبہ تھا کہ وہ اتنی آسانی کے ساتھ قابو میں آئے والی نہیں ہے۔ تم اپنی کمائی سناؤ کہ رٹین چھتری والی سے کیا بات ہوئی اور تم اتنی تیزی سے واپس کیوں لوٹے تھے؟“

وہ سرو سز کلب انٹیکس کے گیٹ کے سامنے سے گزر کر چند قدم کے فاصلے پر فٹ پاتھ پر رک گئی۔ لحظہ بہ لحظہ بعد اس نے اضطرابی طور پر اپنی برست واپچ پر نظر ڈالی۔ اس کی ایک ایک حرکت سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ وہاں کسی کا انتظار کر رہی تھی۔

”یا مظرا بھابھا!“ سلطان شاہ کی تھیر زوہ آواز ابھری ”یہ ویرا کی کا یا پلٹ کیسی ہو گئی؟“

”ہوش میں رہنا“ میں نے کہا ”اپنے رہائے ہوئے ڈرامے کا انجام دیکھنے کے لئے وہ خود بھی میاں منڈلا رہی ہوگی۔ ایسا نہ ہو کہ ہم حیرت اور بے خبری میں اس کا نشانہ بن جائیں۔“

اسے تنبیہ کرنے سے پہلے میں خود بھی گرد پیش کا جائزہ لیتا رہا تھا لیکن اس وقت تک مجھے کہیں بھی ویرا یا اس کی کار کا کوئی نشان نظر نہیں آیا تھا۔ رٹین چھتری والی نے جب اچھی طرح پوزیشن سنجال لی تو میں نے ظفر کی تلاش میں نظرس دوڑائیں۔ وہ پچانک کی دوسری طرف والی فٹ پاتھ پر بوکھلائے ہوئے انداز میں گھڑا تھا۔ بد قسمتی یہ تھی کہ وہ راستے میں ویرا کی ایک جھلک دیکھ چکا تھا اس لئے رٹین چھتری کے نیچے موجود سرمئی لڑکی کی طرف بڑھنے میں جھک رہا تھا۔ اگر اس نے ویرا کو نہ دیکھا ہوتا تو شاید دھوکا کھا جاتا اور چلہ کی رحمت کے نمایاں فرق کو ہماری بدذوقی سے منسوب کر کے رہ جاتا۔

میں اتنی دور سے دیکھ سکتا تھا کہ وہ تذبذب میں مبتلا تھا لیکن وہ ایک تجربہ کار شخص تھا جس نے ہتھالی یا کسی اشارے کی امید میں ہماری طرف دیکھنے کی حماقت نہیں کی تھیں اس کی پیچیدہ ذہنی حالت کا بخوبی اندازہ لگانا تھا۔

اسے معلوم تھا کہ وہ ویرا نہیں بلکہ اس کی طرف سے بھیجی گئی کوئی اور لڑکی تھی۔ اگر ویرا کوئی معاملے میں میری مداخلت کا خطرہ ہوتا تو اسے وہ ڈراما کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ میں دور ہی سے ویرا کی چال سمجھ کر اس لڑکی کو نظر انداز کر دیتا۔ ویرا جانتی تھی کہ جو شخص اس سے ملے آ رہا تھا وہ اسے نہیں پہچانتا تھا۔ ایسی صورت میں اسے رٹین چھتری کے نیچے موجود لڑکی سے مل کر بلیک پیٹی کے دو الفاظ کہنے ہوتے اور یہ سمجھ لیا جاتا کہ وہی ویرا کا مطلوبہ شخص ہے اس کے بعد دوسرے کوئی بھی واقعہ رونما ہو سکتا تھا۔

رٹین چھتری والی اسے پہچان لینے کے بعد کسی ایسے مقام پر لے جاتی جہاں ویرا اپنے نئے عاشق کے انتظار میں بیٹھی ہوتی۔ دوسرا امکان یہ بھی تھا کہ ویرا وہاں اس پاس ہی موجود ہوتی اور جب رٹین چھتری والی، بلیک پیٹی کے الفاظ سن کر کوئی مخصوص اشارہ کرتی تو ویرا دور ہی سے فائر کر کے اس کی زندگی کا چراغ گل کر دیتی۔ اس کی داستان میں اسٹیج ٹانک فورس کے ایک آدمی کو مار کر وہ مجھے خوف زدہ کر سکتی تھی۔ اس معاملے میں چھتری والی لڑکی کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ ویرا کا منصوبہ جو کچھ بھی رہا ہو لیکن یہ بات یقینی تھی کہ اس نے کسی مذاق وغیرہ کا بہانہ کر کے ہماری

رہتا ہے؟“ سلطان شاہ بولا۔

”یہ ہم رانگاں نہیں مٹی“ میں نے کہا ”اگر دیر واقعی ہوئی
میں موجود تھی اور دور بین سے سب کچھ دیکھ رہی تھی تو وہ کل ضرور
پھنس جائے گی۔“

”تو کیا تمہیں یقین ہے کہ دیر اوپر موجود رہی ہوگی؟“ اس
نے پوچھا۔

”میرا خیال ہے کہ کلارا نے وہی کچھ بتایا ہے جو اسے دیر
سے معلوم ہوا تھا“ ظفر بولا ”اگر دیر اسی نے اس سے جھوٹ بولا ہو
تو بات مختلف ہوگی۔“

”میرا خیال ہے کہ دیر موجود رہی ہوگی۔ اس نے سروسز
کلب کے عقبی گیٹ کا انتخاب اسی لئے کیا ہوگا کہ وہ کوئی خطرومول
لے بغیر اطمینان سے پوری کارروائی دیکھ سکتی تھی“ میں نے کہا۔

”جب دیر اپورٹ لینے کے لئے کلارا سے ملے گی تو وہ اسے
بتا دے گی کہ آنے والے نے تاوان کا حوالہ دے کر معلومات
حاصل کرنے کی کوشش کی تھی“ سلطان شاہ کے پاس اٹکا اعتراض
تیار تھا۔

”میں اس کا سدباب کر آیا ہوں“ ظفر تیزی سے بولا ”میں نے
اسے بتا دیا ہے کہ سوزی خطرناک عورت ہے اگر اسے علم ہو گیا کہ
کلارا اس کے اصل دھندے سے واقف ہو گئی ہے تو وہ نہایت
خاموشی سے اسے ذبح کر دے گی۔ میں نے تو اس خطرے کا بھی
سدباب کر لیا ہے کہ دیر اس کے خوف میں پھنس جائے گی اس کا سبب دریافت
کر بیٹھے تو اسے کیا کرنا ہوگا۔ وہ دیر کو گھاتنے کی اس سے ملاقات
کے بجائے محض رقتہ ملنے پر میں اس قدر مایوس ہوا کہ کلارا ہی پر
ڈورے ڈالنے لگا۔ میری اس بے باکی اور دیدہ دلیری نے اسے خوف
زدہ کر دیا کہ کہیں میں اس کے ساتھ زبردستی ہی شہر و نہ کر دوں۔
اس طرف سے تم کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔“

”اور چھ بجے والے پروگرام کے بارے میں کیا طے کیا گیا
ہے؟“ سلطان شاہ عجاظ طور پر اس ملاقات کے بارے میں زیادہ
فکر مند تھا جو سب سے اہم تھی۔

”وہاں جانا پڑے گا“ میں نے سوچتے ہوئے کہا ”اس کے علاوہ
کوئی راستہ نہیں ہے۔“

”اور اگر وہاں بھی دھوکا ہوا اور شری مان سنگھ، غزالہ کو نہ لایا
تو کیا ہوگا؟“

”ہم تمہاری کے ساتھ جائیں گے۔ رجنی کبھی ہند گاڑی میں ظفر
کے مسلح آدمیوں کی تحویل میں ہوگی۔ غزالہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ
لینے کے بعد ہی ہم اسے سامنے لائیں گے ورنہ وہ واپس یہیں
پہنچا دی جائے گی۔“

”رجنئی ساتھ نہ ہوئی تو شری مان سنگھ تمہیں کیسے پہچانے گا؟“
اس نے پوچھا۔

”اس سے بات بھی کی جا سکتی ہے۔ ویسے میں اسے اچھی

”اسے ایک مذاق کے نام پر مجھ تک لغاف پہنچانے کے پانچ سو
روپے دئے گئے تھے۔ رقم دینے والی ایک سفید فام عورت تھی۔
اس کا کہنا تھا کہ وہ ہوٹل میٹروپول کے کسی کمرے میں بیٹھی دور بین
سے ہم لوگوں کو دیکھ رہی ہوگی۔ مجھے ڈر تھا کہ ہم دونوں کو ایک
دوسرے سے الگ ہوتے ہوئے دیکھ لینے کے بعد وہ مجھے گھیرنے کے
لئے تیزی سے نیچے نہ آجائے وہ آجائی تو تم دونوں کی یہاں
موجودگی کا راز بھی فاش ہو سکتا تھا۔“

”تھانے میں کیا پیغام تھا؟“ میں نے تجسس کے ساتھ پوچھا
اور اس نے اپنی جیب سے ایک رنگین لغاف نکال کر میری گود میں
ڈال دیا۔

”اس کے سر پر تمہارا ہی بھوت سوار ہے۔ اب وہ کل دو بجے
فون کرے گی“ وہ منہ بنا کر بولا۔

میں نے لغاف کھول کر سفید کاغذ نکالا تو اس پر انگریزی میں تین
سطرں پاپ کی ہوئی تھیں۔

”تم یہاں تک آگئے ہو۔ اس کا مطلب ہے کہ تم واقعی مجھے
پہچانے لگے ہو۔ میرے لئے ڈبئی کی قیام گاہ کا پتا معلوم کرو۔ ملاقات
کے لئے میں کل دو بجے فون کروں گی۔ سوزی۔“

”لیکن چھتری والی تم سے گفتگو کے بعد کچھ دیر کے لئے خوف
زدہ بھی نظر آئی تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”بلکہ چنی کے الفاظ سننے ہی اس نے لغاف میرے حوالے کر
دیا۔ اس سے آگے وہ کچھ بتانے پر آمادہ نہیں تھی جس پر میں نے
اس سے کہا کہ وہ بد قسمتی سے لمبے تاوان کے ایک معاملے میں
لوٹ ہو گئی ہے جس کا مطالبہ اس کی خدمات حاصل کرنے والی
سفید فام عورت کر رہی ہے۔ میرا اس انکشاف پر وہ واقعی لرز کر
پڑ گئی تھی لیکن وہ زیادہ باتیں نہیں جانتی تھی۔ اس نے سفید فام
عورت اور ہوٹل کے اقامتی حصے میں اس کی موجودگی کے علاوہ کچھ
نہیں بتایا۔ اس کی بے گناہی کا اندازہ کرتے ہوئے میں نے اسے
چھوڑ دیا۔“

”تمہیں یہ نیا عشق مبارک ہو۔ اب کل تم ہی اس سے بات
کر لیں“ میں نے چپتے ہوئے کہا ”میری آواز تم نے سن لی تھی۔
اس کی نقل آسانی زیادہ دشوار نہیں ہوگی۔“

”وہ عورت نہیں کوئی چیل معلوم ہوتی ہے“ ظفر جھٹکا کر بولا۔
”کی کے بارے میں اتنی محسوس اور جامع منصوبہ بندی کرنا کسی عام
عورت کے بس کی بات نہیں ہے۔“

”فرق صرف اتنا ہے کہ وہ عام چیلوں کے برعکس بہت زیادہ
خوب صورت ہے۔ اس کی ایک جھلک تو تم دیکھ ہی چکے ہو۔“

”ایک بار دیکھا اور دوسری بار دیکھنے کی ہوس نہیں ہے“ وہ
اپنے کانوں کو ہاتھ لگا کر بولا ”مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس قدر
پہنچا شخصیت کی مالک ہوگی۔“

”یہ بھاگ دوڑ تو رانگاں مٹی“ اب دیکھو چھ بجے والی مم کا کیا

سارے مستقل طور پر دیں معیم ہو گئی تھی تو اسے ڈھونڈ نکالنا زیادہ دشوار نہیں تھا۔

دوسری اہم تر بات یہ تھی کہ ویرا فیشن پرست اور لائبرالی عورت تھی۔ اس کے لئے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ جہانگیر کے بیٹے کو ہر وقت اپنے سینے سے لگائے پھرتی۔ اس قدر کم سن بچے کے ساتھ نہ صرف اس کی آزادی متاثر ہوتی تھی بلکہ وہ غیر ضروری طور پر لوگوں کی توجہ کا مرکز بنی رہتی۔

کراچی اس کے لئے جانا بچانا شہر تھا۔ وہ یہاں کی تیزی سے بدلتی ہوئی سماجی اور معاشرتی روایات کا بھی گہرا ادراک رکھتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ افراط زر اور معاشی دباؤ کی وجہ سے تعلیم یافتہ خواتین میں ملازمت کرنے کا رجحان تیزی سے بڑھتا جا رہا ہے۔ ایسی شادی شدہ خواتین کی سولت کے لئے شہر میں جا بجا ایسے اسکول اور ادارے کھلے جا رہے تھے جو مناسب فیس کے عوض چند گھنٹوں سے لے کر دن رات تک کے لئے، ہر عمر کے بچوں کو داخل کر لیتے تھے۔ ویرا کے لئے سب سے آسان راہ یہ تھی کہ وہ اس لڑکے کو اپنی اولاد دکھا کر کہے ہوتے، اپنے کسی طویل غیر ملکی سفر کا بیان کرتی اور پیشگی فیس ادا کر کے ایک دو مہینوں کے لئے اس بچے کو کسی معتقل بورڈنگ ہاؤس میں ڈال دیتی جہاں شیر خوار بچوں کی مناسب دیکھ بھال کا بندوبست ہوتا۔ فیس مل جانے کے بعد بی بی کیٹر سینٹر والوں کو شبہ تک نہ ہونے پاتا کہ وہ اغوا شدہ بچے کی پرورش کی ذمہ داری قبول کر رہے ہیں اور ویرا بڑی آسانی کے ساتھ اس ناخوش گوار فرض سے اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو جاتی اور جب بھی چاہتی، واپس نمودار ہو کر اس ادارے سے بچے کو واپس حاصل کر سکتی تھی۔

میں اس نظریے پر جتنا غور کرتا رہا، میرا وہ خیال اسی قدر بڑھتا ہوتا چلا گیا۔ اس وقت ویرا کے سامنے ایران روایتی کا معاملہ سب سے اہم تھا۔ بچے سے گھوڑا صی حاصل کئے بغیر وہ اس سفر نہیں جا سکتی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ اس نے بچے کو اغوا کرنے سے پہلے اسے کہیں چھپانے کا بندوبست کیا ہو گا اور اگر ویرا کی تصاویر کی مدد سے ایسے اداروں میں چھان بین کی جاتی تو بچے کا سراغ لگا جاسکتا تھا۔

یہ ویرا کی بد قسمتی تھی کہ اس نے غزالہ کو اغوا کرنے سے پہلے قلیٹ میں خاصی فوٹو کرائی کی تھی۔ اس کا مقصد صرف اتنا معلوم ہوتا تھا کہ وہ جعلی سفری دستاویزات کی تیاری کے لئے غزالہ کی تصاویر بنا سکے لیکن اپنے مقصد کو پوشیدہ رکھنے کے لئے اسے بہت سی تصاویر بنانی پڑی تھیں جن میں غزالہ اور سلطان شاہ کی انارکلی ہوئی، اس کی اپنی تصاویر بھی شامل تھیں جو میری تحویل میں تھیں۔ ان تصاویر کی مدد سے ظفر کے آدمی دو تین دن میں کوئی نہ کوئی بچہ

اخذ کر سکتے تھے۔

میں نے سلطان شاہ کو اپنے اس خیال سے آگاہ کیا تو وہ حیرت

طرح بچاتا ہوں“ ظفر نے کہا ”ہم لوگ کافی دنوں سے ان کی گھرائی کر رہے ہیں۔“

وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ سرو سز کلب کے چھانک سے بے نیل مرام واپسی نے مکان کے ساتھ ہی بموک کا احساس بھی بگایا تھا اس لئے ہم تینوں نے راستے ہی میں ایک ہوٹل سے کھانا کھایا اور پھر واپس ایس ٹی ایف کے اسٹیشن فور ہیج گئے۔

وہاں پہنچتے پر پتا چلا کہ ٹھیک سوا بجے سوزی نامی کسی عورت کا فون آیا تھا جو خیر عرف ڈینی کے بارے میں دریافت کر رہی تھی لیکن ظفر کا عملہ اپنے فون پر باہر کے کسی آدمی کی کال وصول کرنے کا مجاز نہیں تھا لہذا اس کے اصرار کے باوجود اسے یہی بتایا گیا کہ وہاں اس نام کا کوئی آدمی ہے نہ وہ لوگ اس نام سے واقف ہیں۔ ویرا نے سوزی کے روپ میں شور مچایا کہ وہ چند گھنٹے قبل اسی فون نمبر پر ڈینی سے بات کر چکی ہے لیکن آپ میرے سردمری کے ساتھ اس کا دعویٰ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

میرے لئے ویرا کی دوسری فون کال کا وقت خاصا اہم تھا۔ ٹھیک سوا بجے ہم لوگ سرو سز کلب کے عقبی گیٹ کے سامنے سے روانہ ہوئے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ ویرا نے ظفر اور کارا کی ملاقات کے فوراً بعد فون کیا تھا لیکن میں کافی مغزنی کے باوجود اس فون کال کا کوئی مقصد دریافت نہیں کر سکا۔

ظفر کے پاس صرف ستارا ہی کام نہیں تھا اس لئے ہم دونوں اسے دفتر میں چھوڑ کر اپنی کسی خواب گاہ میں آگئے۔ سلطان شاہ کی پیشانی پر لیکچرس تھیں اور اس کی آنکھیں کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ میں اسے چھپڑے بغیر صوفے پر دراز ہو گیا۔

نیند کے دوران میں میرے دماغ نے جو کچھ کارگزاریاں دکھائی تھیں، ان پر غور کرتے ہوئے اچانک ہی میرے ذہن میں ایک نئے خیال نے سراپا ہمارا جس کا تعلق جہانگیر کے بیٹے کی بازیابی سے تھا۔ میں نے اپنے اس نظریے پر بار بار غور کیا اور وہ خیال میرے ذہن میں راسخ ہوتا چلا گیا۔

جہاں تک میری معلومات کا تعلق تھا، شہر میں ویرا کا کوئی مضبوط ٹھکانا باقی نہیں رہا تھا۔ ہیری کیسینجر اس کی آزادی کا دشمن ہو چکا تھا۔ انڈین کاؤنسلٹ والے ہیری کیسینجر سے خوف زدہ ہو کر نہ صرف اس کی حمایت سے دست بردار ہو گئے تھے بلکہ خیرنگالی کی فضا بحال کرنے کی فکر میں اس سے دشمنی بھی نکال سکتے تھے۔ میرا کبر خان مارا جا چکا تھا اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ اس سے اپنا کام نکالنے کے لئے اس نے پانچ سو روپے کے عوض کلارا کی خدمات حاصل کی تھیں جب کہ وہ خود ہوٹل کے ایک کمرے میں چھپی ہوئی تھی۔

پہلا کام تو یہ تھا کہ ہوٹل کے عقبی حصے کی تمام منزلوں پر معیم سفید فام خواتین کی فہرست کی مدد سے ویرا کا کھوج نکالنے کی کوشش کی جاتی۔ اگر وہ فرضی نام اور جعلی دستاویزات کے

وقت کوئی ایسی غلطی کر بیٹھے گی کہ ماری جائے" میں نے آہستگی سے کہا "وہ میرا سراغ لگانے کے لئے تمہاری ٹانگ فورس کو اپنے مقابلے میں اتارنے پر مجبور کرنا چاہتی ہے۔ تم خاموش رہو گے تو اس کی جھلٹا ہٹ اور بڑھے گی اور وہ ایسی ہی بے سرو پا حرکتیں کرتی رہے گی۔"

اس نے چند ثانیوں کے لئے میری آنکھوں میں جھانکنا پھر یوں "لیکن تم ایمان داری سے بتاؤ کہ ہمارے پاس خاموش رہنے کے علاوہ اور کیا راستہ ہے۔ ہم اس کے خلاف کب اور کہاں کارروائی کر سکتے ہیں؟"

"پولیس والے ایسے مواقع پر ہو سکتا کہ 'عملاً اندھا دھند گرفتاریوں اور چابوں کا سلسلہ شروع کر دیتے ہیں۔ شاید وہ ایس ٹی ایف سے بھی ایسی ہی کسی رد عمل کی توقع کر رہی ہو!"

"میں چاہوں بھی تو کہاں چھاپا ہوں؟" وہ واقعی شدید الجھن کا شکار تھا "وہ ہمارا گھر دیکھ چکی ہے۔ آج کو لیاں برسا کر چلی گئی" کل بم لے کر آسکتی ہے۔ ایسی جھلٹا دے کے خلاف ہم کیا کر سکتے ہیں؟"

"نی الحال حفاظتی انتظامات ضروری ہیں۔ سڑک کے دونوں سروں پر اپنے آویں مامور کر دو" میں نے تنبیہ کی کے ساتھ اسے مشورہ دیا "مجھے موہوم سا شبہ ہے کہ کہیں وہ اسی کمرے میں نہ چھپی بیٹھی ہو جہاں سے اس نے تمہاری اور کلارا کی ملاقات کا نظارہ کیا تھا۔ ہمیں اس ہوٹل کو بھی چیک کر لینا چاہئے۔"

"یہ بہت آسان کام ہے لیکن وہاں اپنے اصل نام سے تو نہیں ٹھہری ہوگی۔"

میں نے اسے دیر کی تصویر کے بارے میں آگاہ کیا اور اس نے فوراً ہی اپنے ایک آوی کو ہمارے ہوٹل کی طرف روانہ کر دیا۔ گھور اندھیرے میں وہ اس کے لئے امید کی سب سے مضبوط کرن تھی۔ تصاویر کے سارے وہ پورے شہر کی پولیس کو اس کی تلاش پر مامور کرانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

موقع پر اکریں نے جاکیر کے بیٹے کے بارے میں اپنی کمائی چھیڑ دی۔ وہ پوری توجہ اور اہتمام کے ساتھ ایک ایک لفظ سن رہا اور جب میں خاموش ہوا تو وہ میرے اندازے کی داد دے بغیر نہ رہ سکا۔

"اس قدر پریشان کن حالات میں یہ سب سوچنا تمہاری کام ہے۔ مجھے تو ڈر ہے کہ بچے کے مددے میں کہیں اس کی ماں مری نہ جائے۔ تمہارے دوست کے علاوہ یہ انسانی مسئلہ بھی ہے۔ دیر کی تصاویر آجائیں تو میں اس سمت میں بھی کام کا آغاز کرانے دیتا ہوں۔ کل تک نتائج سامنے آجائیں گے۔"

اور خوشی سے اچھل پڑا اور ہم دونوں نے فوراً ہی غفر سے بات کرنے کا ارادہ کر لیا تاکہ ہمارے سامان میں سے تصاویر لانے کا بندوبست کیا جاسکے۔

ہم دونوں اپنے کمرے سے باہر نکلتے ہی تھے کہ فضا کم از کم تین سب مشینوں کی مسلسل فائرنگ کے شور سے لرزا اٹھی۔ ہم غفر کے دفتر کے بجائے نکالی کے راستے کی طرف بھاگے تو چھانک کھلا ہوا تھا۔ پھر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے "ایس ٹی ایف" کی دو گاڑیاں برق رفتاری کے ساتھ باہر نکل کر اپنی طرف غائب ہو گئیں۔

حفاظت برامور محلے میں سسٹن پمپلی ہوئی تھی۔ دو تین سینٹر افراد مختل نظر آ رہے تھے۔ اسی اثنا میں غفر بھی وہیں آ پہنچا اور چھانک بری اپنے آدمیوں کے درمیان جا کھڑا ہوا۔ گاڑیاں روانہ ہونے کے بعد آہنی چھانک دوبارہ بند کیا جا چکا تھا اور دو محافظ فوری طور پر ہمت پر بھیج دئے گئے تھے۔

محافظوں سے پتا چلا کہ سیاہ رنگ کی چلتی ہوئی گاڑی سے اس مکان پر فائرنگ کی گئی تھی۔ گیت بند ہونے کی وجہ سے وہ لوگ گاڑی کا میک اور ماڈل نہیں دیکھ سکے لیکن آہنی چھانک کی جھریوں میں سے یہ ضرور دیکھا گیا کہ وہ شیرازیا سوزوکی کی قسم کی کوئی چھوٹی اور سیاہ کار تھی۔

"دوسرا کو دیر ابھی شیرازیا چلا رہی تھی" سلطان شاہ نے مجھے کان کے نیچے سرکوشی کی۔

اس محلے کو دہشت گردی کے علاوہ کوئی اور نام نہیں دیا جا سکتا تھا کہ ساری کو لیاں دیواروں میں ٹھسی تھیں یا چھانک سے نکل گئی تھیں۔ ایس ٹی ایف کے کسی آوی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔

تیز رفتاری کے ساتھ کار چلانے والے ماہر سے ماہر ڈرائیور کے لئے بھی یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ کسی سب مشین گمن سے مقصد سمت میں پورا راؤنڈ خالی کر سکے اس لئے یہ طے تھا کہ اس واردات میں دیر کے ساتھ کم از کم تین آوی شریک تھے اور وہ لاعلم کرانے کے آوی رہے ہوں گے۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں گاڑیاں جو حملہ آوروں کی تلاش میں روانہ ہوئی تھیں، واپس آ گئیں۔ انہیں اپنی برق رفتاری کے باوجود مغرور حملہ آوروں کا سراغ پانے میں ناکامی ہوئی تھی۔ غفر نے اپنے محلے کو چھوڑ کر اپنے کی ہدایت کی ہمت پر موجود محافظوں کا بازو لیا اور اپنے دفتر میں لوٹ آیا جہاں ہم دونوں اس سے پہلے ہی پہنچ چکے تھے اور اس نئی واردات پر تیار خیالات کر رہے تھے۔

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ دیر کیا چاہ رہی ہے؟" وہ آتے ہی الجھن آئینے لہجے میں بولا۔ اس کی آنکھوں میں ٹھہرنی کی علامات نمایاں تھیں۔

"وہ خود کو ہر طرف سے بے دست و پا محسوس کر رہی ہے۔ یہ سب اس کی جھلٹا ہٹ اور مایوسی کی علامات ہیں۔ اب وہ کسی بھی

گھما کر شری مان گھم کو بہ آسانی دھوکا دے سکتا تھا۔

بظاہر ہمارا مقابلہ ایک گھمے ہوئے سفارت کار سے تھا اور مجھے پوری امید تھی کہ شری مان گھم سے سارے معاملات مذاکرات کے ذریعے ہی طے پا جائیں گے لیکن ہم نے کسی بھی مشدائدانہ صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے پوری تیاری کر لی تھی اور پوری طرح ہتھیار بند ہو کر فیروزہاں کی طرف روانہ ہوئے تھے میرے ہاتھ میں نقلی انگوٹھی اور جب میں بھرا ہوا ہسپتال تھا جو شری مان گھم کو خورندہ کرنے کے لئے کافی تھا۔

میں خاصی تیز رفتاری کی ساتھ اسٹیشن فور سے روانہ ہوا۔ بند وین میرے پیچھے چلی آ رہی تھی۔ طویل اور بڑھوم راستوں سے ہوتے ہوئے ہم ایک مرتبہ پھر ہوٹل میوزیول کے سامنے سے گزرے اور پھر کلفٹن کی طرف جانے والی سڑک پر بائیں طرف مڑ گئے۔

اس وقت مجھے خیال آیا کہ شری مان گھم کے لئے فیروزہاں کا محل وقوع بہت مثالی تھا۔ اس کے سامنے امریکی قونصل خانے کی بڑھکھو عمارت تھی اور عقبی سڑک پر فیروزہاں ہی کی قطار میں بھارتی قونصل خانہ تھا اور وہ دونوں سفارتی عمارات اس کے بعد روڈ سے پڑھیں۔

امریکی کاؤنسلٹ کے بعد میں ہالی ڈسے ان سے بھی قدرے آگے نکل گیا پھر میں نے اپنی کار اس مختصری بند سڑک پر سوزلی جس کے اختتام پر میوزیم جانے والی سڑک کا بند آہنی بھاگے موجود تھا۔ اس بند گلی پر محفوظ سڑک پر پہلے سے کئی گاڑیاں موجود تھیں میں اپنی کار کا اگلی بند کر کے نیچے اترا تو میں نے فیروزہاں کے درجہ و عریض سبزہ زار پر سنسنی اور آفراتفری کے آثار دیکھے۔

گھاس پر سے بہت سے لوگ بیٹھے چلائے ہوئے عقبی حصے کی طرف بھاگ رہے تھے جو اس دوڑ میں شریک نہیں تھے وہ بھی اپنی جگہوں پر کھڑے ہوئے تھے اور اچانک اچانک کراسی سمت میں کچھ دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے جدھر ہرقیدہ لوگ دوڑے جا رہے تھے۔

فیروزہاں جیسے بڑھکھو تفریحی مقام پر وہ بھاگ دوڑ میرے لئے ناقابل فہم تھی۔ میں غیر ارادی طور پر پیچھے کی طرف مڑا اور پھر فوراً ہی متحسنانہ انداز میں سبزہ زار کی طرف متوجہ ہو گیا۔ کیونکہ پہلے طے شدہ پروگرام کے مطابق وین میرے ساتھ ساتھ وہاں تک نہیں آئی تھی بلکہ اسے فیروزہاں کے ابتدائی سرے پر روک دیا گیا تھا۔ ظفر کو اس طرف سے سبزہ زار میں داخل ہونا تھا جبکہ مجھے میوزیم والی سڑک کی سمت سے پیش قدمی کرنی تھی۔ میں غزالہ کی مدد سے شری مان گھم کو پہچان کر اس تک پہنچ جانا اور ظفر دور سے صورت حال پر گہری نظر رکھنے کی کوشش کرنا تاکہ شری مان گھم مجھے کوئی چوٹ نہ دے سکے۔

اندرو داخل ہوتے ہی میں نے بھانپ لیا کہ وہاں پھیلی ہوئی آفراتفری بے سبب نہیں تھی۔ میں فوری طور پر اس منظر نامے کی

رکشا تھا تاکہ ہماری واپسی تک ان کوششوں کے نتائج سامنے آئے شروع ہو جائیں لیکن ہم اس کے انتظار میں ضرورت سے زیادہ وقت بھی نہیں کٹوا سکتے تھے کیونکہ مان گھم سے فیروزہاں میں ہماری ملاقات کا وقت مقرر تھا۔

ہم دونوں سمیت، ایس ٹی ایف کے سارے اراکین رجسٹری سے اپنے چہرے چھپانے کی کوششوں میں کامیاب رہے تھے اور وہ ہمارے ساتھ خاصا وقت گزارنے کے باوجود ہم میں سے کسی کی صورت دیکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی جس کی بناء پر بعد میں شناخت کا کوئی ظفر دور پیش رہتا لیکن اسے اپنے ساتھ لے کر فیروزہاں جانے کا معاملہ بہت پیچیدہ تھا جس میں ایسی کسی احتیاط کی کوئی گنجائش نہیں تھی کیونکہ وہاں شری مان گھم سے دوبار ملاقات ہونی تھی اور اسے صرف ظفری پہچانتا تھا۔

بہر حال وہاں جانا ہی تھا اس لئے یہ فرض کر لیا گیا کہ شری مان گھم حسب وعدہ غزالہ کو اپنے ساتھ لے کر وہاں پہنچے گا اور وہاں غزالہ کے ساتھ جو بھی مرد نظر آیا، اسی سے مذاکرات شروع کر دیئے جائیں گے۔ ایسی صورت میں ظفر کو سامنے نہیں آنا پڑا اور میں خود ہی وہ قصہ نمٹا سکتا تھا کیونکہ شری مان گھم خود ہی مجھ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کر چکا تھا۔

رجسٹری کے مسئلے کا حل یہ سوچا گیا کہ اس کی آنکھوں پر بنی باندھ کر، ایک بند وین میں ایس ٹی ایف کے مسلح جوانوں کی نگرانی میں لے جایا جائے۔ حالت سازگار ہوتے تو پوری احتیاطی تدابیر کے ساتھ، اسے وین سے باہر نکال کر شری مان گھم کے حوالے کیا جاسکتا تھا ورنہ اسے اسی حالت میں واپس اسٹیشن فور پر لایا جاتا۔ یہ بالکل وہی حل تھا جو میں کچھ دیر پہلے اپنے طور پر سوچ چکا تھا۔ اس میں ترمیم یہ کی گئی تھی کہ ظفر اسی وین میں ڈرائیور کے برابر والی نشست پر ستر کرتا، سلطان شاہ وین کے بند حصے میں رجسٹری اور تین افراد کے ساتھ موجود ہوتا جبکہ مجھے ایک کار میں اکیلے روانہ ہونا تھا۔

موتن لال اور امرکار کی موت کے اسباب کی طرف پولیس کی رجسٹری کے خیال سے ہم نے موتن لال کی انگلی سے زہر لے دینے والی انگوٹھی نہیں اتاری تھی۔ عین آخری لمحات پر مجھے خیال آیا کہ میں شری مان گھم سے ملنے والا تھا اور وہ خطرناک انگوٹھی شاید اسی کی طرف سے موتن لال کو فراہم کی گئی تھی اسی لئے اس نازک موقع پر اس انگوٹھی کی میری انگلی میں موجودگی، شری مان گھم کے لئے سخت خطرے اور تشویش کا باعث بن سکتی تھی۔

ظفر میرے اس خیال سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے فوری طور پر اس سے ملتی جلتی انگوٹھی کی تلاش شروع کرا دی اور آخر کار اپنے ایک آدمی کے ہاتھ سے کم و بیش اسی ساخت کی انگوٹھی اتروانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس انگوٹھی کا ٹھیک مختلف تھا لیکن میرے پاس اس کا علاج موجود تھا۔ فیوزے کو بھیلی کی جانب

کی وہاں موجودگی کا جواز تلاش کر لیا۔

وہ غزال کے ساتھ یقیناً چٹانیں رہا ہو گا۔ اس کے آس پاس اس کے ساتھی موجود رہے مہل کے جو غزال کے تعاقب میں چلے گئے لیکن وہ مقررہ وقت ہو جانے کی وجہ سے اپنے ملاقاتی کے انتظار میں وہیں رکا رہا۔

میں نے ایک بار پھر قرب و جوار میں موجود لوگوں کا جائزہ لیا اور میرا شبہ یقین میں بدل گیا کہ اس کے علاوہ کوئی اور شری مان سنگھ نہیں ہو سکتا تھا لیکن اس کے ساتھ غزال کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے میں احتیاط سے کام لینا چاہتا تھا اس لئے اس سے رجوع کئے بغیر اس سے چند گز کے فاصلے پر گھاس پر ایسے زاویے سے بیٹھ گیا کہ کن آنکھوں سے اس کی نسل و حرکت پر نظر رکھ سکوں۔

چند ثانیوں بعد مجھے ظفر بھی نظر آیا جو کسی کئی چنگ کی طرح ادھر ادھر بھٹکتا ہوا بربزہ زار کے اس حصے میں آٹھا تھا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ اس کی تجسس نگاہوں نے دور ہی سے مجھے دیکھ لیا۔ اس وقت وہ سختی سا آدی میری طرف پست کئے ہوئے تھا۔ اس موقع کو غنیمت جان کر ظفر نے دور ہی سے مجھے اشارہ کر کے اس امر کی تصدیق کر دی کہ وہی میرا مطلوبہ آدی تھا۔

ظفر کو دیکھ لینے کے بعد یک بیک میرا حوصلہ بڑھ گیا۔ اسی کے ساتھ میں نے یہ بھی سوچا کہ میں خالی بیٹھ کر اپنا قیمتی وقت ضائع کر رہا ہوں۔ اس وقت شری مان سنگھ بالکل اکیلا تھا اور میں اسے ذرا دھمکا کر اس سے بچ اگوا سکتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس کے ساتھی لوٹ آتے تو پوزیشن بالکل ہی الٹ ہو سکتی تھی خطرناک بات یہ تھی کہ ہم دونوں اکیلے تھے اس کے ساتھ غزال نہ تھی میرے ساتھ رہتی۔ یہی بات ہم دونوں میں ٹھکار کا باعث بن سکتی تھی۔

اس قلیل سی مدت میں شری مان سنگھ نے پانچویں بار اپنی رست و اچ کی طرف دیکھا پھر کسی غم زدہ اوٹ کی طرح گردن اٹھا کر من روڈ کا جائزہ لیا اور ٹٹلنے میں مصروف ہو گیا۔

میں نے اپنی انگلی میں موجود انگوٹھی کا ٹک اپنی پٹیلی کی طرف سمٹا کر ٹٹلی بند کی اور اپنی جگہ چھوڑ دی اس بار شری مان سنگھ مخالف سمت میں مڑا تو میں نے تیزی سے پیش قدمی کی اور نرم گھاس پر تیز قدموں سے بڑھتے ہوئے اچھا کان اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

میرے مضبوط ہاتھ کا دباؤ پڑنے ہی وہ وحشت زدہ انداز میں بھڑک کر پلٹا لیکن اپنے شانے پر سے میرا ہاتھ ہٹانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔

”میری انگلی میں وہ انگوٹھی موجود ہے جو جیتے جانے انسان کو ہل بھر میں پوکا بنا دیتی ہے“ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سرد لہجے میں کہا۔ ”غزال کہاں ہے؟“

”وہ موقع پا کر بھاگ گئی۔ میرے دو آدی اس کے پیچھے گئے

طرف بڑھ گیا جو گرد و پیش سے بے نیاز پھولدار پودوں کی ایک بڑی کھاری کی گردائی کر رہا تھا۔ میرے قدموں کی آہٹ بھی اس کے اٹھنا پر اثر انداز نہیں ہو سکی تھی۔

”پاپا! آج یہ افزائش کیوں پھیل ہوئی ہے؟“ میں نے اس کی شانے کو چھو کر سوال کیا۔ اس نے اپنا ہاتھ روک کر سر نہ نظروں سے میری طرف دیکھا پھر اداسی کی ساتھ بولا۔ ”ایک لڑکی بھاگ گئی ہے اور ان لوگوں کو ایک تماشیا گیا ہے۔ اب تو شری مان کوئی جگہ اس قابل نہیں رہی جہاں شریف آدی اپنے بال بچوں کے ساتھ دو تین گھنٹے بیٹھ سکے۔ میں پچاس سال سے اس باغ کے ایک ایک پودے اور کوئل کی دیکھ بھال کر رہا ہوں لیکن پچھلے چند برسوں سے یہاں سب کچھ بدل گیا ہے جواری، شرابی، چرئی اور آوارہ گرد سب ہمیں مرے رہتے ہیں انہیں دوسروں کے سکھ چین کا زار سا بھی احساس نہیں ہوتا۔ آج کل کی لڑکیاں مجھے دار باتوں میں بیک کر گھر سے قدم نکال لیتی ہیں اور آوارہ گرد کوئے گھدروں کی تلاش میں تفریح گاہ میں دھکے کھاتے پھرتے ہیں پھر جب ان کے اندر کا جوان جاکتا ہے تو لڑکیاں خوفزدہ ہو کر بھاگ نکلتی ہیں وہ بھی ایسی ہی کوئی لڑکی ہو گی۔ اب تو میں نے ان کھیل تماشوں پر چونکا بھی چھوڑ دیا ہے۔“

انسانوں کے سمندر میں وہ ایک کزور اور بے باط سا فرد تھا لیکن اس کے حساس دل میں انسان زندہ تھا۔ میں نے اس کی دلجوئی کے لئے اسے آنے والے پھل و پتوں کی آگاہی کی اور وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ لڑکی کے فرائی خبر سن کر میرا دل پریشان ہو گیا تھا۔

فیروزہ ہال کے وسیع و عریض بربزہ زار پر بچوں سے عمر رسیدہ عورتوں تک سب ہی سنسنی اور پیمان میں مبتلا تھے۔ پھر مجھے وہ کلین شیو اور منحنی سا شخص بھی نظر آیا جو مین روڈ سے قریبی حصے میں اٹھنی بیٹوں میں ہاتھ ڈالے، بے چینی کے ساتھ ٹٹلے جا رہا تھا۔ اس کا مدخل وہاں موجود تمام لوگوں سے مختلف اور منفرد تھا اس لئے میری توجہ اسی کی طرف مبذول ہو کر رہ گئی۔

اس کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے یہ تفریح یا وہاں پھیلے ہوئے ٹٹلیں بربزہ زار سے کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ دوری سے اس کے چہرے پر اضطراب کے آثار پڑے جا سکتے تھے جیسے وہ وہاں سے جا چکا ہوتا ہو لیکن کسی وجہ سے اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے سے قاصر ہو۔ مجھے شبہ ہوا کہ وہی میرا مطلوبہ شخص تھا۔ یہ اور بات تھی کہ اس کے آس پاس غزال کا سرے سے وجود نہیں تھا۔

مجھے شبہ ہوا کہ کہیں بھاگ نکلتے والی لڑکی غزال ہی نہ رہی ہو۔ لیکن غزال بھاگ گئی تھی تو اس کا پچھا کرنے کے بجائے وہاں کیوں ٹٹلے جا رہا تھا؟

میں نے اپنی رست و اچ کی طرف دیکھا جو چھ بچ کر پانچ منٹ کا اعلان کر رہی تھی۔ وقت کا اندازہ ہوتے ہی میرے ذہن نے اس

”تم بلاوجہ مجھ پر الزام تراشی کئے جا رہے ہو۔“ وہ اچانک ہی مجھ پر آنکھیں نکال کر بولا ”پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ تم کون ہو؟ میں نے ایک خاص آدمی کو یہاں بلایا تھا۔“

”آواز بچی رکھو مان سنگھ!“ میں نے نیچی آواز میں غراتے ہوئے کہا ”میں وہی خاص آدمی ہوں“ میرا نام ڈینی ہے۔“ لمحہ بھر قفل میں اس کے چہرے پر زردی کا سایہ آکر گزرتے ہوئے دیکھ چکا تھا پھر میں نے اپنے نام پر اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک اُبھری دیکھی تو میں نے سچ اگوانے کے لئے اس پر اپنا دباؤ برھانے کا فیصلہ کرتے ہوئے قدرے توقف کے بعد اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”تمہاری اطلاع کے لئے میں یہ بتا دوں کہ میں مین بیچے سے یہاں آیا ہوا ہوں اور میں نے پورے واقعے کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ تم بار بار جن سیکڑوں کو اہوں کا حوالہ دے رہے ہو انہوں نے ایک لڑکی کو ضرور بھاگتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ مگر ان میں سے کوئی نہیں جانتا کہ وہ غزالہ تھی یا کوئی اور لڑکی۔ جب کہ میں غزالہ کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ تمہارے ساتھ آنے والی غزالہ نہیں تھی۔“

”یہ تمہاری ذہنی قلابازی ہے۔“ اس بار وہ کسی اضطرابی رد عمل کا مظاہرہ کئے بغیر چڑھے لیجے میں بولا۔ ”تم نے آتے ہی غزالہ کی بات کی تھی اور اب کسی دوسری لڑکی کا قصہ لے بیٹھے ہو۔ میں اس کی حفاظت کے خیال سے اسے سرے پیر تک برقع پوش کر کے لایا تھا۔ تم نے کیسے دیکھ لیا کہ وہ غزالہ نہیں تھی؟“

چالاکی کا مظاہرہ کرنے کی کوشش میں وہ خود ہی میرے جال میں پھنس رہا تھا۔ میں نے فوراً ہی اسے سیانے کو تے کو گھیر لیا۔ ”تم یہ بھول رہے ہو کہ میں اسے ہزاروں پردوں میں بھی پہچان سکتا ہوں۔ وہ لڑکی قد و قامت اور حجامت میں غزالہ سے مشابہ ضرور تھی لیکن اس کی چال ڈھال کو دیکھنا تمہارے بس سے باہر تھا۔ اب اگر تم نے مجھ سے کھل کر بات نہیں کی تو میں واپس چلا جاؤں گا اور رجنی تمہاری دسترس سے بہت دور نکل جائے گی۔“

”تمہارے باقی ساتھی کیا ہیں؟“ وہ اچانک ہی بے تکا سوال کر بیٹھا۔

”میں اپنے ساتھ زیادہ بھیڑ بھاڑے کر چلنے کا عادی نہیں ہوں لیکن پھر بھی میرے کچھ بھائی خواہ اس پاس ہی موجود ہیں تمہارے بھٹکے کی صورت میں وہ خود ہی سامنے آجائیں گے۔“

”میں بھی اکیلا نہیں ہوں۔“ اس کا وہ اعلان دھمکی آمیز تھا۔ میں برا سامنے بنا کر رہ گیا۔

”کیا تم نے صرف یہی بتانے کے لئے مجھ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا؟“ چند ثانیوں تک اسے گھورنے کے بعد میں نے خلک لیجے میں سوال کیا۔

”میں تم سے غزالہ کے بارے میں بات کرنی چاہتا تھا۔“ وہ بولا۔

جیسے امید ہے کہ وہ اسے پکڑ کر واپس لے آئیں گے۔“ اس نے میرے تعارف کی ضرورت محسوس کئے بغیر مشتاقانہ انداز میں کہا پھر قدرے خوفزدہ لیجے میں بولا۔ ”اپنا ہاتھ ہٹاؤ وہ بہت خطرناک انگوٹھی ہے تمہاری ذرا سی بھی بے احتیاطی میری جان لینے کا سبب بن سکتی ہے۔“

”اگر تمہارے آدمی غزالہ کو واپس لانے میں ناکام ہوئے تو مجھے دانستہ اس ملک بے احتیاطی کا مظاہرہ کرنا پڑے گا۔ میں یہ نہیں مان سکتا کہ غزالہ ایسے کھلے لان پر تمہارے دو آدمیوں کو بھل دے کر بھاگ نکلے میں کامیاب ہو سکتی ہے۔ مجھے یہ کوئی نا ڈراما معلوم ہوتا ہے۔“

”میں اس واقعہ کے سیکڑوں یعنی شاہدین موجود ہیں۔ تم جس سے چاہو پوچھ سکتے ہو۔ وہ اچانک ہی کسی چھلاوے کی طرح دوڑتی ہوئی غائب ہو گئی۔ لیکن میں بلاوجہ یہی ساری وضاحتیں کر رہا ہوں۔ تم رجنی کو اپنے ساتھ کیوں نہیں لائے؟“

”تم غزالہ کو لے آؤ، رجنی خود بخود آجائے گی۔“ بات کرتے ہوئے میں نے اس کے شانے پر اپنے ہاتھ کا دباؤ برھادیا۔ ”آؤ! یہاں سے کسی ویران گوشے میں نکل چلیں۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے مذاکرات بہت جلد ختم نہیں ہو سکیں گے یہاں لوگ تمہاری طرف متوجہ ہو سکتے ہیں۔“

”میرے آدمی غزالہ کو پکڑ کر یہاں لائیں گے۔ تم میرا شانہ چھوڑ کر آرام سے بات کرو۔ کوئی ہماری طرف متوجہ نہیں ہو سکے گا۔ لوگ یہاں جھمکن اتارنے اور تفریح کرنے کے لئے آتے ہیں دوسروں کی سن مگن لینے کے لئے نہیں آتے۔“ اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ اپنے شانے پر زہریلی انگوٹھی کے تلپنے کی موجودگی کے احساس سے وہ واضح طور پر خائف نظر آ رہا تھا۔

”یہ خیال رکھنا کہ تم نے ذرا سی بھی گڑبڑ کی تو تمہارا پوکا ہو جائے گا۔“

”تم بلاوجہ میری نیت پر شبہ کئے جا رہے ہو۔“ وہ قدرے برہمی کے ساتھ بولا ”میں اسے یہاں لایا تھا۔ اب اگر وہ بھاگ نکلے ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں؟ اس میں میری طرف سے کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی“ یہاں موجود سب ہی لوگوں نے اسے عجائب گھر کی عمارت کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھا ہوگا۔“

میں نے اس کے شانے پر سے ہاتھ ہٹا کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور بے رحمی کے ساتھ کہا ”تم نے غزالہ کے بجائے کسی دوسری لڑکی کو ساتھ لا کر اسے خود ہی بھگا دیا ہے تاکہ مجھ پر اپنی بے گناہی اور نیک نیتی ثابت کر سکو حالانکہ غزالہ کے معاملے میں تمہاری نیت بدل چکی ہے۔“

اس کے چہرے پر ایک لمحے کے لئے زردی سی پھیل کر معدوم ہو گئی۔ میرے مضبوط لیجے اور کاٹ دار الفاظ نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا لیکن اس نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا۔

انحراف نہیں کر سکتا۔ ”وہ ایک گہرا سانس لے کر بولا۔
”تمہارے اوپر والوں میں سفیر کے علاوہ نئی دہلی کے لوگ ہی ہو سکتے ہیں؟“

”ان باتوں سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہونا چاہئے۔“ وہ رکھائی کے ساتھ بولا ”تمہارے لئے اہم بات یہ ہے کہ ہم لوگ تمہاری خدمات حاصل کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں لیکن اس موضوع پر بات کرنے سے پہلے ہم کو رجنی کا معاملہ طے کر لینا چاہئے۔“

”اگر رجنی تمہارے لئے اتنی ہی ناقابل برداشت ہو گئی ہے تو وہ ماردی جائے گی۔“ میں نے بے پروائی سے کہا ”تمہاری وعدہ خلافی کے بعد میرے لئے اسے زندہ رکھنے کا کوئی حوالہ نہیں ہے۔“
”اور اس کا معاوضہ کیا ہو گا؟“ اس نے اشتباہ آمیز لہجے میں کہا۔

”کچھ بھی نہیں کیونکہ میں اسے تمہاری خواہش پر نہیں بلکہ اپنے انفرادی فیصلے کے تحت ہلاک کروں گا۔“
”لیکن اس کی لاش کیس نہ کیس سے دستیاب ہونی چاہئے۔“ وہ بولا۔

”اب تم غیر ضروری طور پر اس معاملے کو نہ کریدو۔“ میں نے ترشی سے کہا ”تمہیں رجنی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اس لئے تم اسے بھول جاؤ۔ اب اس کے مستقبل کا انحصار میری مرضی پر ہو گا۔“
”تم مجھے بلیک میل کرنے کے لئے اسے زندہ رکھ کر اپنی قید میں رکھ سکتے ہو۔“ وہ میری بات کاٹ کر بولا۔

”یہ بھی قابل قدر آئیڈیا ہے لیکن تمہیں رجنی کو نفی کر کے بات کرنی چاہئے۔“

”میں اس سے متغیر ضرور ہوں لیکن اسے تمہاری تحویل میں نہیں چھوڑ سکتا۔“

”تو پھر غزالہ کے ساتھ اس کا ہاتھ لے کر لے!“ میں نے سرد اور ساٹ لہجے میں کہا۔

”شاید میں تم پر اپنی بات واضح نہیں کر پا رہا۔“ وہ ایک گہرا سانس لے کر بولا ”مجھے اس سے ذرا سی بھی محبت نہیں ہے لیکن جب تک وہ زندہ رہے گی، میرے لئے عذاب بنی رہے گی۔ وہ میرے پاس ہوتی ہے تو میرے لئے یہ تصور بڑا کھٹکنا ہوتا ہے کہ وہ غلطی میں دو سروں کے ساتھ کس طرح پیش آئی ہوگی اور جب وہ میری نظروں سے دور ہوتی ہے تو مجھے مجبوراً سانس نہیں ہوتا کہ وہ کہاں اور کس کے ساتھ وقت گزار رہی ہوگی۔ اس جیسی بے وقار عورت کے ساتھ وصال میں لطف ملتا ہے نہ بھر میں کوئی لذت ہوتی ہے۔ اس عذاب کا اندازہ تو صرف وہی شوہر کر سکتا ہے جو ایسی کسی عورت کے ساتھ زندگی گزار رہا ہو۔ رجنی کی صورت میں، میں نبھانے کس کس کے گناہوں کی پوٹ پال رہا ہوں۔“

”غزالہ کا معاملہ تو خارج از بحث تھا۔ تمہیں اس کے بدلے میں رجنی کو حاصل کرنا تھا۔“
”رجنی میری قانونی بیوی ضرور ہے لیکن مجھے اس کی واپسی سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔“

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر حیرت سے کہا ”لیکن تم دونوں میں تو مثالی ہم آہنگی ہے۔ وہ تمہاری مرضی سے موافق لال اور دو سرے دوستوں سے ملتی رہی ہے!“

”مجبوری اور مرضی میں بہت فرق ہوتا ہے۔“ وہ زہریلے لہجے میں بولا ”خود سمجھ سکتے ہو کہ ایک موٹائی بیوی کو دو سروں سے کس حد تک میل جول بڑھانے کی آزادی دے سکتا ہے۔ رجنی بچکے بچکے عرصے سے ان حدود سے تجاوز کرتی رہی ہے اور میں جب ہنسائی کے خوف سے اپنی زبان بند رکھے پر مجبور ہوں۔“

”یہ تمہارے ذاتی مسائل ہیں۔ میں صرف غزالہ کی بازیابی چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”میں تمہیں یہی بتانا چاہ رہا تھا کہ رجنی اب میرے لئے اتنی غیر اہم ہو چکی ہے کہ میں اس کی خاطر اپنے پالتو کتے سے بھی دستبردار ہونا پسند نہیں کروں گا۔۔۔“

”پھر تم نے مجھے یہاں بلا کر میرا وقت کیوں ضائع کیا ہے؟“ مجھے واقعی غصہ آ گیا۔

”میرا خیال تھا کہ رجنی تمہارے ساتھ ہوگی اور میں تمہیں اشتعال دلا کر اس حد تک لے جانے میں کامیاب ہو جاؤں گا کہ تم اسے ہلاک کر دو گے۔ اب میں باعزت طور پر اس سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہوں۔“

”تم اسے طلاق کیوں نہیں دے دیتے؟“ میں نے بے زاری کے ساتھ کہا۔

”ایسے معاملات خاندان کی ساکھ کے لئے ٹھیک کا داغ ثابت ہوتے ہیں۔ میری تم سے التجا ہے کہ اسے واپس کرنے کے بجائے قتل کر دو تاکہ میں جیسے ہی نرگم میں سٹکنے سے بچ سکوں۔“

”سب کچھ ممکن ہے لیکن تم نے غزالہ کے بارے میں ابھی تک کوئی بات نہیں کی۔“

”رجنی کا غزالہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“ وہ جلدی سے بولا ”اس کے قتل کے لئے تم کو نہ مانگا انعام یا معاوضہ دینے کو تیار ہوں۔ غزالہ کے لئے اگ سے بات ہوگی۔“

اس کے ان الفاظ سے ظاہر ہو گیا کہ وہ غزالہ کو سرے سے اپنے ساتھ نہیں لایا تھا اور وہاں جس لڑکی کے فرار کا ڈھونڈ رہا تھا، کیا تھا وہ کوئی اور تھی۔

”اے کامطلب! یہ تمہارا وعدہ غلطی کا اعتراف کر رہے ہو۔“ میں نے اسے حوراً۔

”میں اپنی حیثیت میں خود بخیر نہیں ہوں۔ مجھے اوپر والوں کی پالیسی اور فیصلے کے مطابق عمل کرنا ہوتا ہے۔ میں اس سے سربم

الوطنی سے زیادہ تمہاری انا پرستی کا دخل تھا۔ آج کے دور میں ویسے بھی قوم اور وطن جیسے نظریات دم توڑتے جا رہے ہیں اور عالمی انسانی برادری کا نظریہ زور پکڑتا جا رہا ہے۔ ان حالات میں ہر سمجھدار آدمی خود کو ان عامیانہ نعروں سے دور رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور ہمیں امید ہے کہ تم خود بھی ماضی کو بھلا کر ہمارے ساتھ تعاون کرنے پر رضامند ہو جاؤ گے کیونکہ اسی میں تمہاری اور ہم سب کی بہتری مضمر ہے۔

”تم بولتے رہو۔ میں تمہارا ایک ایک لفظ سن رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”اس وقت اتفاق سے غزالہ ہماری تحویل میں ہے اور کچھ نہ سہی تو تم اس کی سلامتی کے لئے ہی ہم سے تعاون کرنے کی ضرورت محسوس کرو گے کیونکہ وہ لڑکی تمہارے لئے بہت اہم ہے۔“

”یہ تعاون اور دوستی کی پیش کش نہیں بلکہ کھلی ہوئی بلیک میلنگ ہے۔“ میں نے اپنے وجود کی گمراہیوں میں سے ابھرنے والی قرد و نفرت کی سرکش لہروں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”میں تم سے بحث نہیں کروں گا۔“ اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا ”تم اپنی سہولت کے لئے جو چاہو کہہ سکتے ہو۔ اصل بات دوستی اور تعاون کی ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی۔“

”تعاون کی نوعیت کیا ہوگی؟“ میں نے بھی بحث سے گریز کرتے ہوئے سوال کیا۔

”بہت محدود اور عارضی!“ وہ سوچے سمجھے انداز میں بولا ”ہم جانتے ہیں کہ تم جیسے افراد کو طویل مدت کے لئے اپنا پابند نہیں کیا جاسکتا۔ تمہارا حریف ملّا سرکار کافی دنوں سے لاپتا ہے۔ وہ زندہ ہے، مر گیا یا زخمی ہونے کے بعد کہیں چھپا ہوا ہے۔۔۔۔۔ اس بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے۔ ہم اپنے موجودہ وسائل سے اس کا سراغ حاصل کرنے میں ناکام ہو چکے ہیں اور اب اس سلسلے میں تمہاری مدد چاہتے ہیں۔“

میرا دل چاہا اس کی بات پر زور دار قبضہ لگاؤں اور اسے آگاہ کر دوں کہ ملّا سرکار کے چیخنے بے بہت دن گزر چکے ہیں۔ آسانی کے ساتھ حل کرنا مجھیلیں کی خوراک بن چکے ہیں اور اسے کچھ شبہ ہو تو وہ اپنے باپ بھیری کیسبھر سے اس امر کی تصدیق کر سکتا ہے۔

لیکن میں خاموش ہی رہا۔ جو بات اس کے لئے شدید الجھن اور پریشانی کا باعث بنی ہوئی تھی اسے اتنی آسانی کے ساتھ حل کرنا مناسب نہیں تھا۔ پھر بھیری کیسبھر کے ملک کے بھارتیوں کو اس امر کی ہوا بھی لگنے نہیں دی کہ انہوں نے ملّا سرکار سمیت متعدد اہم انڈین سیکرٹ ایجنٹوں کے جسموں میں دلی کی دھڑکنیں نشر کرنے والے ایسے نئے آلات چھپائے ہوئے تھے جن کی مدد سے وہ اپنے کارڈ پوائنٹرنگ یونٹ پر ان کی زندگی یا موت کے بارے میں پہل پہل کی خبر رکھتے تھے۔ میں اسے ضرور بتانا چاہتا تھا کہ ملّا سرکار کی موت

”لیکن تم نے موتی لال سے بات کرتے ہوئے تو بہت فراخ دلانہ باتیں کی تھیں اور عورتوں کی وفاداری کو متوسط اور پچھلے طبقوں کا خرافہ قرار دیا تھا۔“ میں نے اسے یاد دلایا۔

اس کے چہرے پر ایک کرب آلود مسکراہٹ ابھر آئی ”زندہ رہنے کے لئے انسان کو ڈھٹائی کے ساتھ بہت سے جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔ وہ بھی ایسا ہی ایک جھوٹ تھا۔ میں کس منہ سے یہ اعتراف کر سکتا تھا کہ رجنی میرے اور اپنے مقدس رشتے کو بے رحمی سے روند کر اس سے بیٹھیں بڑھا رہی تھی۔ دوسروں کی نظروں میں مذہب اور فرائض دل بننے کے لئے ہمیں اکثر اپنے ہی تاسووں پر نمک پاٹی کرنی پڑتی ہے۔“

میں نے اکتائے ہوئے انداز میں اس کی بات کاٹ دی۔ ”تم مسلسل اپنی ہی کئے جا رہے ہو۔ میں نے تمہیں اپنا آخری فیصلہ سنا دیا ہے اور اب میں غزالہ کے بارے میں تمہارے عزائم جانتا چاہتا ہوں۔“

”تم چاہو تو میرے دفتر چل سکتے ہو۔ ہم وہاں اطمینان سے باتیں کریں گے۔“

میں نے اختیار ہنس پڑا۔ ”اب تم مجھے چہ وہاں میں۔ لے جانے کی کوشش کر رہے ہو۔“

”تمہارے آدمیوں کی موجودگی میں ایسی کوئی حرکت خود کشی کے مترادف ہوگی۔ وہاں ہم سکون سے باتیں کر سکیں گے۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

”تو پھر تم میرے ساتھ چلو!“ میں نے اسے جوابی پیشکش کر ڈالی۔

پھر یہی جگہ مناسب ہے۔“ اس نے اندازہ لگایا کہ میں اس کے فریب میں آنے والا نہیں تھا۔

”ہم کچھ معاملات میں بری طرح الجھے ہوئے ہیں۔“ ایک نسبتاً پرسکون گوشے میں بیٹھنے کے بعد وہ بولا ”ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ تم سے ہمارا شدید تصادم رہا ہے۔ اس جھگڑ میں ہم اپنے بہترین ایجنٹوں سے بھی محروم ہوئے ہیں ان میں شانتی اور کرمل ہمیش کے نام سرفہرست ہیں لیکن ہم ماضی کی کشیدگی کو بھول کر اب تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا چاہتے ہیں۔“

وہ کام کی باتوں کی طرف آ رہا تھا اس لئے میں نے بولنے کا ارادہ ترک کر کے اس کی کمائی سننے پر اکتفا کرنے کا فیصلہ کر لیا ورنہ میرے لئے یہ خیال ہی سوہان روح تھا کہ میں ملک میں بڑے پیمانے پر تخریب اور دہشت گردی کے منصوبے بنانے والے ملک کے ایک اہم سفارتکار کی ذہن نشانی پر کان دھروں۔

”میں اس تبدیلی کا سبب بھی جانتا چاہوں گا۔“ میں نے اسے خاموش پا کر قلم دیا۔

”ملّا سرکار کے ذریعے ہمیں جو خبریں ملتی رہیں، ان کی بنا پر ہمارا خیال ہے کہ تمہارے اور اس کے تصادم میں تمہاری حب

وہ حربے نو آموز لوگوں کے لئے بہت کارگر ثابت ہوتے تھے۔ شرکی بڑی اور سماجی تقریبات میں بن سونر کر شریک ہونے کا شوق اور غیر ملکی تازہ نینوں کی ہم نشینی کا خمار بہترے نوجوانوں کو بھگانے کا سبب بن جاتا تھا لیکن شری مان سنگھ مجھ جیسے پرانے کھلاڑی پر بھی وہی حربہ آزمائے کا ارادہ رکھتا تھا جس کی کامیابی کا دور دور تک کوئی امکان نہیں تھا۔

مگر اس کے دل کی بات اگھوانے کے لئے اس سے اتفاق رائے ظاہر کرنا ضروری تھا اس لئے میں نے قدرے توقف کے بعد کہا ”غزالہ کی سلامتی کے لئے مجھے سمجھنا کرنا ہی پڑے گا۔“

”غلام رسول نامی صف اول کا نامور سیاستدان آج کل مانیفا کی تحویل میں ہے۔“ اس کے الفاظ سننے ہی میرا ذہن جھک سے اڑ گیا۔ وہ بہت اندر کی اور ایسی خبر تھی کہ جس کے بارے میں ظفر جیسا باخبر آدمی بھی کچھ نہیں جان سکا تھا۔ اگر میں نے اسے اعتماد میں نہ لیا ہوتا تو اس وقت بھی غلام رسول کے بارے میں بے خبری ہوتا لیکن شری مان سنگھ اس معاملے سے پوری طرح باخبر معلوم ہوتا تھا۔

”مانیفا والے اسے پاکستان سے نکال کر بھارت پہنچانا چاہتے ہیں لیکن ہر طرف کڑی عمرانی ہونے کی وجہ سے کامیاب نہیں ہو پا رہے۔“ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا ”ہماری اور پاکستانی حکومتوں کے درمیان کشیدگی ہونے کی وجہ سے اکثر و بیشتر ہماری عمرانی ہوتی رہتی ہے اس لئے ہم مسلسل کے ساتھ مانیفا والوں سے رابطہ نہیں رکھ سکتے اور ہمارا کام ایک آدھ ملاقات سے نہیں چلے گا۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ تم ہماری طرف سے ان سے ملو اور غلام رسول کو ہمارے قونصل خانے تک لے آؤ۔ اس سے آگے کا سارا کام ہم خود سنبھال لیں گے۔“

”تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ مانیفا کی تحویل میں ہے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا ”پولیس کے قبضے میں ہے اسے اغوا کیے جانے کی خبر تو میں نے اخباروں میں بھی پڑھی تھی لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ اسے اٹھالے جانے والے کون لوگ تھے۔“

”ہمارے پیسے میں خبوں کے ذرائع کبھی ظاہر نہیں کئے جاتے۔ تمہیں اتنی ہی بات بتائی جائے گی جس کا تعلق تمہارے کام سے ہوگا۔ تمہیں اس سے آگے کی فکر نہیں ہونا چاہئے۔“

”یہاں مانیفا کو کون لوگ چلا رہے ہیں؟“ میں نے تذبذب اور فکر مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”وہ بھی بتا دیا جائے گا لیکن پہلے تمہاری طرف سے رضامندی کا اظہار ہونا چاہئے۔“

”اس معاملے میں غزالہ کی مہمانی کا کوئی ذکر شامل نہیں ہے۔“ میں نے اسے یاد دلایا۔

”تمہاری پچاس فی صد کامیابی پر یعنی دو میں سے ایک کام پورا ہونے پر غزالہ تمہارے سپرد کو دی جائے گی۔“ اس نے محنت کے ساتھ کہا۔ ”اس وقت تک وہ ہمارے پاس رہے گی۔“

واقعہ ہوتے ہی بھری کیسنگھ کو اس کی خبر ہو گئی تھی جسے اس نے دیدہ و دانستہ دن سے چھپایا ہوا تھا لیکن اس خبر کے انکشاف کے لئے مجھے کسی مناسب موقع کا انتظار کرنا تھا جو اس وقت میسر نہیں تھا۔

”یہ تو صرف حقیق و تحقیق میں دماغ سوزی کا معاملہ ہے۔ اس میں مجھے کوئی عذر نہیں ہوگا۔“ میں نے سنجیدگی کیساتھ کہا ”آج کل میں عملی بھاگ دوڑ سے خود بھی دور رہتا ہوں۔“

”لیکن ایک کام اور بھی ہے۔ اس میں تمہارا اہم رول ہو گا۔“ اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

”اس کے بعد کوئی تیسرا کام تو پیدا نہیں ہو جائے گا؟“ میں نے تیریاں چھانک کر پوچھا۔

”نہیں۔“ اس نے پُر وثوق لہجے میں کہا ”اس کے بعد تم آزاد ہو جاؤ گے۔“

اس کے سفید جھوٹ پر میں دل ہی دل میں ہنس کر رہ گیا۔ مجھے اچھی طرح اندازہ تھا کہ جب تک میرا دامن صاف تھا وہ اپنا کام لینے کے لئے مجھے دیرا کے نام پر بلیک میل کر رہا تھا لیکن جب اس کے پاس میری ملک دشمن سرگرمیوں کے بارے میں ٹھوس ثبوت آجاتے تو وہ جب چاہتا میرے اوپر کوئی کام مسلط کر دیتا اور میں ساری عمر کے لئے اس کا غلام ہو کر رہ جاتا۔ میں اس کے احکام ماننے سے انکار کرتا تو وہ میرے خلاف موجود شہادتیں حکام کے حوالے کرنے کی دھمکی دے کر میرے انتخاب کی راہیں مسدود کر دیتا۔

وہ میرے شبہات نہیں تھے بلکہ سارے ہی سیکرٹ ایجنٹ دشمن ممالک کی سرزمین پر چھوٹے چھوٹے افراد اور بظاہر بے ضرر کاموں سے ابتدا کر کے ساتھ لوہ افرو اور خاص طور پر نوجوانوں کو چلاتے ہیں۔ ان کا شکار بننے والے مقامی افراد غدار یا ملک دشمن نہیں ہوتے بلکہ غیر ملکیوں، خصوصاً ترکیوں سے بے محافانہ دوستی کے شوق میں بعض ایسے کام کر گزرتے ہیں جو ان کی نظروں میں فضول اور بے ضرر ہوتے ہیں لیکن درحقیقت دور رس اثرات کے حامل ہوتے ہیں پھر یہ سلسلہ بڑھتا چلا جاتا ہے اور نوبت کھلے کھلے غدارانہ کاموں کے معاملے تک پہنچتی ہے تو انہیں ہوش آتا ہے۔ ان کی قوی غیرت و حمیت جوش میں آجاتی ہے اور وہ اپنے خمیر کی آواز پر ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوث ہونے سے صاف انکار کر دیتے ہیں اور اس مرحلے پر آئندہ ان کے سامنے سر کا دیا جاتا ہے۔ انہیں بتایا جاتا ہے کہ خمیر کی بیداری سے قبل وہ جو کچھ کرتے رہے وہ بھی اپنے نتائج کے اعتبار سے غداری اور ملک فروشی سے کم نہیں تھا اور اگر ان کے حکام کو ان کی ایسی سرگرمیوں کے بارے میں خبریں اور شہادتیں فراہم کر دی جائیں تو وہ وطن فروشی کے الزام میں فوراً دھر لئے جائیں گے اور انہیں اپنی خواہشات کے برعکس انکار ایجنٹوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑ جاتے ہیں۔

ہوئے گرجو شکی کے ساتھ بولا۔ ”اب سنو کہ مقامی مانیا کا سر
سیٹھ حبیب حیوانی نام کا مقامی سرابیہ دار ہے جو جرمنی میں بھی
اسکل کرنے کے جرم میں گرفتار ہو کر وہاں کی ایک جیل میں لٹا
کر چکا ہے۔“ مانیا اور اس کے سربراہ کے بارے میں شری مان
کی معلومات قابل رشک تھیں۔

”تو کیا وہ مردہ ہونے کے باوجود مانیا کی سربراہی کر رہا ہے؟
میں نے حیرت سے پوچھا۔

وہ سختی خیز انداز میں مسکرانے لگا۔ ”یہ قانونی پوزیشن ہے۔
وہ جیل سے نکل کر پاکستان آیا تھا۔ اس کے نام سے مرٹن والا
مفتض تھا جسے ہماری معاوضہ دے کر اصل مجرم کے بدلے میں
میں پہنچایا گیا تھا۔ غلام رسول کے بارے میں تم کو اسی سے معاملہ
ملے کہنے ہوں گے۔“

”تم اس سے ذاتی طور پر واقف ہو؟“ میں نے تجسس لیے ہوئے
پوچھا۔

”نہیں۔۔۔!“ اس نے سہلاتے ہوئے کہا اور اس کے بڑے
الفاظ ایک چیخ میں ڈھل گئے۔

وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھامے ہوئے منہ کے بل گھبرا
رہا تھا۔ اس کی چیخ سے پہلے گھٹ کی ایک سخت آواز آئی تھی۔
گرا تو اس کے سر کے عقبی حصے سے تیزی کے ساتھ خون جاری
تھا۔

قرب و جوار سے متعدد افراد ہم دونوں کی طرف لپکے تھے۔
میری نگاہیں ان دو خونخوار افراد پر جم کر رہ گئی تھیں جو اپنے ہاتھوں
میں کلاشکوفیں سنبھالے دوڑتے ہوئے اسی طرف آ رہے تھے۔

وہ دونوں شری مان عکس کے مسلح محافظ تھے جو اس سے
بہ کر اس کی حفاظت کا فرض سرانجام دے رہے تھے۔ ان دونوں

کی کلاشکوفوں میں میگزین چڑھے تھے اور وہ ضرورت پیش آنے
کسی بھی لمحے گولیاں برسانے کے لئے پوری طرح تیار تھے۔ ان کا
مستعدی اور فرض شناسی کا یہ عالم تھا کہ وہ میرے کچھ سوچنے کے بجائے

سے پہلے ہی میرے سر پر مسلح ہو چکے تھے اور ہم تینوں نے تقریباً
ایک وقت ہی سارا دے کر زخمی شری مان عکس کو گھاسا ہوا
اٹھانے کی کوشش کی تھی۔

”پتا نہیں یہ کس بد معاش کی شرارت تھی؟“ شری مان
ہمارے سارے اٹھتے ہوئے جھلکی ہوئی آواز میں بڑبڑایا۔ ”اب
سر پرکار کر رہ گیا۔“

اس کے سر کے عقبی حصے سے خون نکل رہا تھا اور اس کا

اس کی دوسری شرط نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ
جدید ترین مواصلاتی ترسیل کی وجہ سے دنیا بہت وسیع نہیں رہی
تھی لیکن مجھے یہ اندازہ بھی نہیں تھا کہ دنیا اتنی مختصر ہو چکی ہوگی
کہ ہر شخص ہر بات سے باخبر نظر آنے لگے گا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا
مجھے وہ سب سوت کے سوداگر ہوں کیونکہ سیاست ”غداہی“
سازشوں کی منصوبہ سازی اور ہوس ملک گیری کے اس گھناؤنے
کھیل میں بیرونی کا پیسہ چڑھ کر بول رہا تھا۔ اسی سے ہتھیار
خریدے جا رہے تھے اور وہی سازشیوں کو ایندھن فراہم کر رہا تھا۔
واقعات کے حقیقی تاثر میں بہری کیسینجر اور شری مان عکس کے
سفارت خانوں سے لے کر مقامی مانیا اور شری مان عکس سب ہی ایک
تھیلی کے چنے بنے نظر آ رہے تھے۔ ان کے روپ، چہرے اور محاذ
مختلف تھے لیکن ان سب کا مقصد ایک ہی تھا۔ ان تمام شیطانی
قوتوں میں ایک امر پر کوئی مقدس سمجھوتا ہو چکا تھا جس کا نچوڑ یہ تھا
کہ پاکستان کو سیاسی، معاشی، معاشرتی اور جغرافیائی اعتبار سے اس
قدر مجبور اور ناکاہ بنا دیا جائے کہ نظریے کے نام پر وجود میں آنے
والا یہ واحد ملک عالمی نقشے پر اپنی شناخت کھو بیٹھے۔

اس ضمن میں شری مان کا سازش کا پہلا مرحلہ کسی قابل
ذکر مزاحمت کے بغیر مکمل کر چکی تھی۔ اس کی تائید کچھ عرصہ پہلے
امریکی سفیر کی ایک اہم تقریر سے ہو سکتی تھی۔ اس نے طمانیت کے
بھرپور احساس کے ساتھ بتایا تھا کہ دنیا بھر کی زیر زمین منڈیوں کو
کنٹرول کرنے والے ملک میں انہم کی پیداوار اس حد تک گھٹادی
گئی تھی کہ وہ ملک اپنے ملک میں بیرون کے عادی افراد کی تیزی
سے بڑھتی ہوئی تعداد اور ضروریات کو پورا کرنے کے لئے خود
افغان قبائل سے آنے والی خام انہم اور بیرون کا محتاج ہو کر رہ گیا
تھا۔ شی نے ایک منظم سازش کے ذریعے میرے وطن میں بیرون
کو متعارف اور مقبول کرایا تھا اور اس کا ری ضرب کے بعد وہ اس
ملک کے وجود پر وار کرنے کی آخری تیاریوں میں مصروف تھی۔
مقامی مانیا بیرون کی عالمی منڈی میں اپنا حصہ بڑھانے کے لئے
کوشاں تھی مگر رہ مانیا کے زیر اثر اس کا جھکاؤ بھی ان ہی عناصر
کے طرف ہوتا ہوا نظر آ رہا تھا جو پاکستان کے خیر خواہ نہیں تھے۔
بہری کیسینجر اور شری مان عکس کے بارے میں کچھ سوچنا ہی بے سود
تھا کیونکہ وہ پاکستان کے ہر دشمن کے کمرے اور قابل اعتماد دوست
تھے۔

اور میں اپنی بد قسمتی کے طفیل ان شیطانی قوتوں کے جرم میں
اس بری طرح سے گھر کر رہ گیا تھا کہ ان میں سے ایک سے اپنا
گربان چھڑاتا تو دوسرا میرا دامن جکڑ لیتا تھا۔

”تمہاری شرارت اچھے قبول ہیں۔“ میں نے سختی ہوئی آواز میں
کہا ”میں فوری طور پر کام شروع کرنے کے لئے تیار ہوں۔“

”گنڈ! اچھے پوری امید تھی کہ مجھے تم سے براہ راست بات
کرنے کا موقع ملا تو تم مجھے ایس نہیں کہہ گے۔“ وہ مسکراتے

کیاں آیا؟

”یہ پھر کسی اور کے لگا ہوتا تو اس کے بارے میں بھی یہی کہہ جتی کی جاسکتی تھی۔“ میں نے اپنی رہی کا اہتمام کرنے کے لئے تڑپ سے کہا۔

”جیسے آپ بات نہ بڑھاؤ!“ شری مان عکھ نے دغل دیتے ہوئے اپنے آدمی کو روکا۔ ”تم لوگوں کو آپس میں اٹھنے کے بجائے کسی مشتبہ آدمی کی تلاش پر توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت تھی۔“

”میں اسے بے آواز ہتھول کا قاتل سمجھا تھا اور میں نے فوری ای تمہاری پشٹ پر نظریں دوڑائی تھیں لیکن وہاں کوئی مشتبہ آدمی موجود نہیں تھا۔“ میں نے کہا۔

شری مان عکھ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے میں نے وہ بات کہہ دی تھی لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس کے گرتے ہی میں نے غصہ کو درختوں کے ایک کچ کے پاس دیکھا تھا اور اس وقت بھی وہ بے پروا نہ انداز میں ہمارے قریب دھوا رہی سی منڈلا رہا تھا۔

”باتوں میں وقت ضائع نہ کرو!“ اسی دہلے پتلے حافظ نے مہیا نہ انداز میں شری مان عکھ کی پشٹ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”خون کم ضائع ہوا ہے مگر زخم پھول گیا ہے“ جیسے فوری امداد کی ضرورت ہے یہ باتیں بعد میں بھی کی جاسکتی ہیں۔“

”ہوش میں رہو ڈی!“ شری مان عکھ نے غصے سے اس کا ہاتھ دور جھٹک دیا۔ ”تم میرے باپ یا افسر نہیں ہو۔ میں اپنی ضروریات سے بخوبی واقف ہوں۔ جا کر گاڑی میں میرا انتظار کرو! میں فارغ ہو کر واپس آتا ہوں۔“ ۳۰ پتھارنے کے بعد شری مان عکھ نے اس کا مدد عمل دیکھنے کی کوشش کئے بغیر اپنا رخ گھمایا۔ وہ دونوں مجھے فشنک لگا ہوں سے گھورتے ہوئے واپس چلے گئے۔

”تم نے کہا تھا کہ یہاں تمہارے کچھ خیر خواہ بھی موجود ہیں۔“ چند غائبوں کے سکوت کے بعد شری مان عکھ نے استفسار طلب کیے میں کہا۔

”کہا تو تھا۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑ کر چیختی ہوئی آواز میں کہا۔

”کیا یہ ان میں سے کسی کی حرکت نہیں ہو سکتی؟“ اس نے مرحوب ہوئے بغیر سوال کیا۔

”ہوش کے ناخن لو!“ میں نے چڑچڑے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے تپوہاں چڑھا کر کہا۔ ”میرا نام ڈیٹی ہے۔ میرے آدمی پتھر نہیں گولیاں چلاتے ہیں۔ ان میں سے کوئی تم پر حملہ نہیں ہو گیا ہوتا تو تم اس وقت زندہ نہ ہوتے۔ یہ ایک اتفاق بھی ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ کسی بچے کا پھینکا ہوا پتھر تمہارے سر پر آگیا ہو۔“

”کاش وہ پتھر تمہارے لگا ہوتا!“ غصے اور بے بسی کے ساتھ بولا۔ ”میں اتنا نا تجربے کار نہیں ہوں کہ بچے کے پیچھے ہوئے بے ضرر پتھر اور پوری قوت سے مارے جانے والے پتھر میں فرق محسوس نہ کر سکوں۔ مجھے واضح طور پر نشانہ بنایا گیا تھا۔“

اٹھایا، اسی کے اپنے لہو سے رنگین ہو رہی تھیں۔ اس دوران میں دونوں مسلح آدمیوں نے کمری اور اشتباہ آمیز نظروں سے مجھے گھورا تھا لیکن ان میں سے کسی نے مجھ سے کوئی لفظ نہیں کہا تھا۔ شاید ان کی خاموشی کی وجہ یہ رہی ہو کہ شری مان زخمی ضرور ہو گیا تھا مگر وہ واضح طور پر کسی آنکھیں ہتھیار کا وار نہیں تھا۔ اس کے سر کے پچھلے حصے میں گولی لگی ہوئی تو وہاں نہ صرف خون کا تھاپ بن جانا بلکہ شری مان عکھ بھی پروانے کے لئے زندہ نہیں رہا ہوتا۔

فریڈرل کے سہو زار پر تفریح یا وقت گزاری کے لئے آنے والوں میں سے کسی کے پاس اتنی فرصت نہیں تھی کہ وہ دوسروں کی مصروفیات پر نظر رکھنے کی کوشش کرنا اس لئے ہمارے ارد گرد جمع ہونے والوں میں سے کسی کو یہ اندازہ نہیں ہو سکا کہ میں پہلے سے شری مان عکھ کے ساتھ وہاں موجود تھا۔

لوگوں نے دے دے، تجسس آمیز لہجے میں اس صورت حال کے بارے میں جاننے کی کوشش کی لیکن ان دونوں نے حکم آمیز لہجے میں لوگوں کو ڈانٹ پٹکار کر وہاں سے منتشر ہونے کے لئے کہا۔ اس وقت وہ اپنے لب و لہجے سے کسی اہم سرکاری عکھ کے ساتھ ہوش اہل کار معلوم ہو رہے تھے اس لئے کسی نے بھی ان سے اٹھنے کی کوشش نہیں کی اور وہ انہماک سے شری مان عکھ کی کمرہ کی کھنچے سے کھینچے کا معائنہ کرنے لگے۔

”کیا ہوا تھا؟“ میں نے ہوردانہ لہجے میں شری مان عکھ سے سوال کیا۔

اس کی نگاہیں میرے چہرے پر جم گئیں اور اس نے عجیب سے لہجے میں مجھ سے پوچھا۔ ”تو کیا نہیں واقعی علم نہیں کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے؟“

”مگر نہ کرو ڈس منٹ میں اس سے ہر بات اگوا لیں گے۔“ مسلح افراد کی جوڑی میں سے دہلے پتلے غصے نے دھیمی فراٹ کے ساتھ کہا۔ ”میرے سامنے۔“

لیکن شری مان عکھ نے نرمی کے ساتھ اس کی بات وہیں کاٹ دی اور جلدی سے بولا۔ ”۳۱ سے بد تمیزی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے میرے ساتھ باتیں کرنے میں مصروف قتلہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی پھر بہت تیزی کے ساتھ میرے سر پر لگا ہو۔ میرا بچہ گرا ضرب کی شدت سے زیادہ ہلکا ہٹ کا نتیجہ تھا۔ چند غائبوں تک تو مجھے بھی اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ میں پھر سے زخمی ہوا ہوں یا میرے سر میں گولی پست ہو چکی ہے۔“

”یہ اس کے کسی ساتھی کی حرکت بھی ہو سکتی ہے۔“ وہی غصے سے گھومتے ہوئے بولا۔ ”سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہاں مکمل افراد موجود ہیں۔ ان سب کو چھوڑ کر پھر تمہاری ہی طرف

رجنی، شری مان سنگھ کی بیوی تھی لیکن وہ اپنے شوہر کی پروراندہ کر دہریوں سے ناجائز قائمہ اٹھاتے ہوئے آزادی اور سبکدوشی کی تمام حدوں کو عبور کر چکی تھی۔ خاندان کی عزت اور رواج کو بچانے کے لئے شری مان سنگھ اس سے علیحدگی اختیار کر سکتا تھا۔ وہ دونوں میاں بیوی اپنے وطن سے دور پر دہس بن مقیم تھے اس لئے اُن کے خاندانوں کو اندر کی گھٹاؤنی کسانوں کا نہیں ہوگا۔ ان کے لئے بس یہی جاننا کافی تھا کہ وہ دونوں اپنے دھرم کے رشتے میں بندھے ہوئے زندگی گزار رہے تھے لیکن رجنی اپنی بے وفائیوں کی وجہ سے شری مان کے لئے ایک گالی بن چکی تھی۔ موتن لال کے ساتھ اس کے معاشرے کی پوری کمائی میر علم میں آچکی تھی۔ اس کے لئے یہ بات برداشت سے باہر تھی اس کی بیوی اس کے دوستوں بیٹھ ساؤں اور اجنبیوں کی خلوت میں کرتی پھرے۔ اس کی اولاد منٹ بیوی نے اسے خود اپنی ہی نگاہ میں گرا دیا تھا۔ ایسی سنگین اور حساس صورت حال میں اگر ان کے کو زیادہ ذلیل و خوار کیا جاتا تو اس کے وجود میں انتقام کی دبی دھڑلہ اٹک بھڑک سکتی تھی جو انسان کو درد مند بنا دیتی ہے۔ ایسی صورت میں وہ مجھے ذات ناپوسی اور بے بسی سے دوچار کرنے کے لئے قید میں موجود خزانہ کے بارے میں کچھ بھی کر گزرنے پر قادر تھا اس بارے میں اٹھا ہوا اس کا ایک قدم بھی میرے لئے زندگی بھر روگ بن سکتا تھا اس لئے میں نے اس کے وجود میں سوتے ہوئے بھڑیلے پر امن طعن کے تیر ہرسانے کا ارادہ خورای ترک کر دیا۔ ”یہ ایک علیحدہ پیشکش ہے میں اس پر غور کروں گا۔“ میں نے قدرے توقف کے بعد گہری سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا اور میری طرف ہاتھ لہرانے کے بعد آگے بڑھتا چلا گیا۔

میں اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، بے پروا یا نہ انداز میں دھنسلکا ہوا۔ اس وقت ظفر مجھ سے زیادہ دور نہیں تھا اور ہم دونوں ایک دوسرے کو بخوبی دیکھ سکتے تھے مگر اس نے بھی شری مان کے جاتے ہی میری طرف آنے کی حماقت نہیں کی بلکہ ٹھٹھکا ہوا طرف چل رہا تھا اس کی بندوبست کھڑی ہوئی تھی۔

شری مان سنگھ کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ وہ ایک اہم سٹاف مشن کا اعلیٰ عہدیدار تھا اور اپنی اس پوزیشن کی آڑ میں سنگین فوجی سازشی سرگرمیوں میں مصروف تھا اس لئے اُس کے بارے میں گمان نہیں کیا جاسکتا تھا کہ وہ اہم معاملات میں کسی بھی قسم کی ہدائی یا غفلت کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ وہ فہرست ال کے بندو باز آگے بنی ہوئی سرخ سیڑھیاں اتر کے غائب ہو چکا تھا۔ اس انتظار میں کھڑی ہوئی گاڑی بھی روانہ ہو چکی تھی لیکن مجھے یقین تھا کہ اس گھاگ سفارت کار نے میری عمرانی کے لئے کسی نہ کسی آدمی کو وہاں ضرور پھوڑا ہوگا۔ جو میرے ساتھ بچاؤ کے علاوہ میرا بچھاؤ کرنے کی کوشش بھی کرے گا۔

اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد میں بھی فہرست ال کے اس بندو باز

”فی الحال میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ میں نے بے پروائی اختیار کر لی۔ ”اپنے آدمیوں سے لئے کے بعد ہی میں اس پراسرار واردات کے بارے میں کوئی رائے قائم کر سکوں گا۔“

”میں نے دونوں کام تمہیں بتا دیے ہیں۔“ وہ یوں ”میرا فون نمبر تمہارے پاس ہے۔ جیسے ہی کوئی خبر ملے مجھ سے فون پر رابطہ کر لیتا۔ میں انتظار کروں گا۔“

”لیکن خزانہ کے بارے میں اپنا وعدہ یاد رکھنا۔“ میں نے اسے یاد دہانی کراتے ہوئے کہا۔

”تم فکر نہ کرو۔ رجنی کا معاملہ اعلیٰ ملاقات میں طے کیا جائے گا۔“ رجنی کا ذکر کرتے ہوئے اس کا دہانہ بڑھکا تھا۔

ڈپٹی کے نام سے مخاطب کیا جانے والا شخص اپنے ساتھی سمیت واپس جا چکا تھا اس لئے ہم دونوں بے فکری سے بات کر سکتے تھے۔ اس شخص کا قائمہ اٹھاتے ہوئے میں نے متنی خیر لہجے میں کہا۔ ”یہ یاد رکھنا کہ ہمارے آج کے معاہدے کا رجنی کی ذات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”مجھے یاد ہے۔“ اس کی آواز میں تعجبی عود کر آئی۔ ”لیکن تم بھی یاد رکھنا کہ میں نے اس کے قتل کے لئے تم کو مرنے کا معاوضہ دینے کی پیشکش کی ہے۔ میری شرط صرف اتنی ہے کہ اس کی لاش دستیاب ہوئی جائے یا اس کے قتل کا ناقابل تردید ثبوت موجود ہونا چاہئے۔“

وہ اپنی بے وفائی رجنی سے حد سے زیادہ مدفن تھا۔ میرے دل میں یہ آرزو چل رہی تھی کہ میں رجنی کے حسن و جمال اور دوسروں کے ساتھ اس کی فیاضیوں کے حوالے سے شری مان سنگھ کے ذغلوں پر نمک پاشی کروں لیکن میں اپنی اس آرزو کو عملی جامہ پہنانے کی جرات نہ کر سکا کیونکہ اس وقت تک خزانہ، شری مان سنگھ کی تحویل میں تھی اور میری زبان کے کچھ کے کھانے کے بعد وہ خزانہ کے ساتھ کوئی بھی نامور اسلوک کرنے پر مائل ہو سکتا تھا۔

کسی بھی انسان کے کردار اور گفتار کی ساری خیماں اسی وقت تک برقرار رہتی ہیں جب تک اس کی اتار کوئی کاری ضرب نہ آئی ہو اور اس کے دل و دماغ میں اپنی عزت نفس کا احساس پوری طرح زندہ ہو۔ اپنی یا اپنے اقربا کو لاشعین کی کسی نفرت کے نتیجے میں یہ عزت نفس ایک بار بھجھو ہو جائے تو انسان یک بیک اپنے بلند مقام سے گر کر ایک گھٹیا وحشی درد مند بن جاتا ہے۔ گزری ہوئی نفرت کو لوٹانا اور پھر اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرنا اس کے بس اور اختیار سے باہر ہوتا ہے اس لئے تحقیق اور تدبیر سے بچنے کے لئے اس کے سامنے واحد راہ یہی رہ جاتی ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش میں موجود تمام لوگوں کے چہروں پر غلاقت کی سیاہی مل کر انہیں ان کے بلند تر مقام سے ایک ایسے نچلے درجے پر گھسیٹ لائے جہاں وہ خود کو ان سب سے برتر نہ سمجھ سکی تو کم از کم برابر ضرور سمجھ سکے۔

”وہ بھاگنے والی لڑکی کا کیا پکر تھا؟“ غفر نے چہونٹے ہی مجھ سے سوال کیا۔

اس ذکر پر میرا منہ بن گیا۔ ”کچھ بھی نہیں وہ شری مان سنگھ کا فراڑ تھا۔“

”لیکن لوگ تو بتا رہے تھے کہ تھوڑی دیر پہلے کوئی جواں سال لڑکی بھاگ نکلی تھی جس کے پیچھے کئی آدمی بھی بھاگے تھے؟“ اس نے حیرت سے کہا۔ ”آخر وہ کون تھی؟“

سلطان شاہ پورے وقت دین میں بند رہا تھا اس لئے اُسے اس معاملے کے سربراہی کا کچھ پتا نہیں تھا اس لئے وہ ہم دونوں کی گفتگو پوری توجہ سے سن رہا تھا۔

”کسی مظلوم لڑکی کو وہ اپنے ساتھ لایا تھا جس نے آتے ہی دوڑ لگا دی تھی۔“

”اس کا مطلب ہے کہ وہ شروع ہی سے بد نیتی پر آمادہ تھا؟“

”لیکن اس نے رجنی کی دلچسپی کا مطالبہ تو کیا ہو گا؟“ سلطان شاہ نے بات سمجھ جانے کے بعد پہلی بار ہماری گفتگو میں شریک ہوتے ہوئے سوال کیا۔

”اے رجنی سے ذرا سی بھی دلچسپی نہیں ہے۔ ہمیں نے کہا۔

”کیا مطلب؟“ غفر میری طرح چونک کر میری طرف متوجہ ہو گیا۔

اس انٹیم بم غفر کے دفتر تک پہنچ چکے تھے اس لئے فطرتی سنبھالے تک میں خاموش رہا۔

”تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“ بیڑہ جانے کے بعد غفر نے مجھے ٹوکا۔

”وہ رجنی سے بیشہ کے لئے اپنا بیچھا چھڑانا چاہتا ہے۔ ہمیں نے آہستگی سے کہا۔

میرے اس انکشاف پر وہ دونوں ہی حیران رہ گئے جیسے میں نے کوئی اُن ہونی بات کہہ دی ہو۔

”لیکن یہ ملاقات تو رجنی اور غزالہ کے تھادلے کے لئے ہی طے ہوئی تھی؟“ سلطان شاہ بولا۔

”وہ ایک بہانہ تھا۔ ہمیں نے کہا اور پھر انہیں پوری کہانی سنانا چاہا گیا۔

اس کہانی کا ایک ایک لفظ ان کے لئے حیران کن تھا۔ میرے خاموش ہوتے ہی ان دونوں نے مجھ پر اپنے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔

”ممنہ کچھ بائنے سے پہلے مجھے دو چار سوالات کے جوابات دے چکے ہیں۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں ابھی تک یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ شری مان سنگھ کی کمپوزی پر کیا کڑی تھی۔“

میرے سوال پر غفر بے ساختہ ہنس پڑا۔ ”وہ میری حرکت تھی۔“ اس نے اعتراف کیا۔

کی طرف چل رہا تھا جہاں پختہ سڑک پر میری کار کھڑی ہوئی تھی۔

غفر نے اس کے ساتھیوں میں سے کسی نے میری طرف آنے کی کوشش نہیں کی اور میں اپنی گاڑی وہاں سے نکال کر روانہ ہو گیا۔

آگے سے یونٹ لینے کے بعد میں نے عقب نما آئینے میں ایک سفید کار دیکھی جس کا میرے نکلنے کے بعد ہی فریڈرئال کے سامنے والے حصے کے نزدیک سے حرکت میں آئی تھی۔ اس کی شکل ٹامک فورس والیں کی بند دین اس سفید کار کے پیچھے تھی۔

ٹریک چیلنر پر پہنچنے تک میں اپنا انحر عمل طے کر چکا تھا۔

ٹریک چیلنر کی سرخ روشنی سبز ہوتے ہی میں نے اپنی کار آگے بڑھادی اور ہوٹل میٹروپول کے عقبی حصے سے آگے جانے کے بجائے اسی سڑک پر سیدھا بڑھتا چلا گیا۔ بیشتر ٹریک شارع لیبل جانے کے لئے داہنی طرف مڑ گیا تھا مگر سفید کار میرے پیچھے لگی ہوئی تھی۔

اگلے چار رہے سے میں نے گاڑی دوبارہ اسی سمت میں مسمالی چڑھنے میں وہاں تک پہنچا تھا۔ میں اس حرکت سے سفید کار والے کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ مجھے اس پر شبہ ہو چکا تھا۔

لیکن اس کے پاس کوئی راہ نہیں تھی جس سے شری مان سنگھ کو جواب دیا تھا۔ اگر وہ میرا تعاقب ترک کر دیتا تو اس کے لئے جواب دی شکل ہو سکتی تھی اس لئے بات کھل جانے کے بعد اس نے زیادہ ڈھٹائی کے ساتھ میرا پیچھا کرنا شروع کر دیا۔

لیکن یہ سلسلہ زیادہ دراز نہیں ہو سکا۔ سروسز کلب کے آہنی چائنگ کے سامنے سے گزرتے ہوئے میرے کانوں میں کیے بعد دھمکے دھماکوں کی آوازیں آئیں اور عقب نما آئینے میں سفید کار دوڑ لگائی ہوئی منٹ ہاتھ کی طرف بڑھتی ہوئی نظر آئی۔ اس کی رفتار ایک بیک بہت دھیمی ہو گئی تھی۔ اس صورت حال کی بنا پر مجھے لگے یہ سمجھنا دشوار نہیں تھا کہ غفر کی بند دین کی اگلی نشست سے بے آواز فائر کر کے سفید کار کے کم از کم دو ٹائرز ناکارہ کر دئے گئے تھے۔

اگلے سو ڈھریک طرف راستہ لیتے ہوئے میں نے دیکھا کہ سفید کار سڑک کے کنارے رک چکی تھی اور بند دین میرے بالکل پیچھے پٹی آ رہی تھی۔

بقیہ سڑکی قابل ذکر واقعے کے بغیر نہایت تیز رفتاری کے ساتھ طے ہوا اور تھوڑی ہی دیر میں دونوں گاڑیاں آگے پیچھے اس مکان کے احاطے میں داخل ہو گئیں جہاں اسٹیشن ٹامک فورس کا ٹھکانا تھا۔

غفر دین کی اگلی نشست سے اترتے ہی تیزی کے ساتھ میری طرف آیا تھا۔ اس کے پیچھے سلطان شاہ تھا جب کہ ایس کی ایف کے بغیر آدمی وہیں رک گئے تھے کیونکہ انہیں رجنی کو پوری احتیاط کے ساتھ اندر لے جانا تھا کہ وہ اس مکان یا اس کے کیمپوں میں سے کسی کو شناخت نہ کر سکے۔

ظفر نے کہا۔

”وہ میری بات مدد کر سکتا ہے لیکن میری کیسبزی کی تصدیق کو نظر انداز نہیں کر سکے گا۔“

”میری کیسبزی کو کیا پڑی ہے کہ وہ تمہارے معاملے میں نامک لڑاؤ آتا ہے؟“

”اسے نامک اڑانی پڑے گی کیونکہ اس کی ایک دُکھی رگ میرے قبضے میں ہے۔“

”وہ کیا؟“ ظفر نے اضطرابی لہجے میں سوال کیا۔ وہ اول خان کے مقابلے میں خاصا بے مہر تھا۔

”میرے پاس کچھ بھی نہیں لیکن ویرا کے ساتھ مل کر میں اسے یہ یاد دہان کرانے میں کامیاب ہو چکا ہوں کہ میرے پاس اس کی فیروزے دارانہ گفتگو کا ایسا ناپ موجود ہے جو اس کے سفیر تک پہنچا دیا جائے تو... ملازمت سے برطانی کے ساتھ ہی اسے سرکاری رازوں کے افشاء کرنے کے سنگین الزام کا سامنا کرنے پڑے گا۔“

”یعنی تمہارا خیال ہے کہ وہ اپنی نوکری بچانے کے لئے تمہارے اشاروں پر ناپچنے لگے گا۔“

”ایک حد تک اسے جھٹکانی پڑے گا۔ میرے معاملات بہت بگڑ چکے تو شاید وہ بدک بھی جائے لیکن فی الحال مجھے اپنی کامیابی کا پورا یقین ہے۔“

”پھر غلام رسول اور مانیوالے معاملے کا کیا ہے؟“ سلطان شاہ نے پوچھا۔

”کیا شری مان سنگھ کا یہ دعویٰ درست ہے کہ غلام رسول مانیوالہ کی قید میں ہے؟“ سلطان شاہ کا سوال کھل ہوئے سی ظفر

سوال کر بیٹھا۔

”یہ درست ہے۔ ہمیں نے سہلا کر اقرار کیا۔“ یہ ایک ایسا راز ہے جس سے نہ صرف سرکاری ادارے بلکہ تم خود بھی بے خبر ہو۔ میرا خیال ہے کہ پاکستان میں گنتی کے چند آدمیوں کے علاوہ کسی کو معلوم نہیں کہ غلام رسول آج کل کہاں اور کس کی تحویل میں ہے لیکن شری مان سنگھ حیرت انگیز طور پر ہر بات سے باخبر ہے۔ ایک بار غزالہ میرے قبضے میں آجائے تو پھر میں دیکھوں گا کہ شری مان سنگھ کیا شے ہے اور اس کی پرواز کہاں تک ہے؟“

”تم نے مجھ سے یہ بات کیوں چھپائی کہ غلام رسول مانیوالہ کی قید میں ہے؟“ ظفر نے شکوہ کیا۔

”مجھے صرف شبہ تھا، شری مان سنگھ نے میرے دل کی بات کہہ کر اس کی تصدیق کر دی ہے“ میں نے مدافعتی لہجے میں جواب دیا۔

”مجھے تمہارے شبہات میں بھی شریک ہونے کا حق حاصل ہے“ ظفر بولا ”غلام رسول ان کے قبضے میں ہو یا نہ ہو، مانیوالے سانج دشمن عناصر کے گھرے میں آتے ہیں اور ان کی سرکوبی کرنا ضروری ہے پھر تمہیں تو یہ بھی معلوم ہے کہ یہاں ان کا سرغندہ سینہ حبیب جیوانی نامی شخص ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ تم نے اس کی کھوپڑی ہانک کر کوئی چہرہ مارا تھا۔ ہمیں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔“

”میں نے غلیل سے اس کے سر کا نشانہ لیا تھا۔“ وہ بدستور ہنسنے لگا۔

”تو کیا تم غلیل بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے؟“ سلطان شاہ نے حیرت سے پوچھا۔

”وہ ایک اتفاق تھا۔ میں وہاں ٹل رہا تھا تو میں نے ایک نو عمر لڑکے کو غلیل سے پرعدوں پر نشانے بازی کرتے دیکھ کر دوبار منع کیا لیکن وہ باز نہیں آیا تو میں نے اس سے غلیل چھین لی۔ جب وہ بید ہوا ہوا چلا گیا تو میں نے غلیل جہازوں میں پھینک دی۔“ مظفر نے کہنا شروع کیا۔

”جب شری مان سنگھ کو تم سے بات کرتے ہوئے کافی دیر ہو گئی تو مجھے بے چینی محسوس ہونے لگی۔ میں قریب آ کر تم دونوں کے مذاکرات کے بارے میں جاننا چاہتا تھا لیکن وہاں تک پہنچنے کے لئے کوئی بہانہ نہیں تھا۔ آخر کار مجھے غلیل کا خیال آیا اور میں نے لوگوں کی نظروں سے بچ کر ایک کنج میں سے غلیل چلا دی۔ میرا نشانہ ٹھیک رہا لیکن میرا مقصد پورا نہیں ہو سکا۔“

”تو میں کو دیکھتے ہی مجھے تمہاری طرف آنے کا ارادہ ترک کرنا پڑا۔ مجھے ابھنسنی تھی کہ غزالہ یا رجنی کے سامنے آئے بغیر تمہارے مذاکرات طویل کیوں پکڑ رہے تھے؟“

”اس کا مطلب ہے کہ شری مان نے صحیح اندازہ لگایا تھا؟“ میں نے گہرا سانس لے کر کہا۔

”اس کا کیا اندازہ تھا؟“ ظفر نے تجسس لہجے میں مجھ سے سوال کیا۔

”ٹھوس اور کند چیز کی ضرب پڑتی ہی اس نے سمجھ لیا تھا کہ وہ کوئی چہرہ تھا۔“ میں نے کہا پھر پوچھا۔ ”اور سفید کار کے ٹائروں کو کیا ہوا تھا؟“

”مجھے پہلے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ شری مان سنگھ کا آدمی ہے۔ ہم اسے اپنے پیچھے لگا کر یہاں تک لائے کہ غلطی ہوئی نہیں لے سکتے تھے اس لئے میں نے اس کے ٹائروں کو ناکام کر دیا۔“ وہ بولا۔

”میں نے ٹائروں کی آواز سننے کی آواز سننے ہی بے آواز قاتلوں کے بارے میں سوچا تھا۔“ سلطان شاہ بولا۔

”اب تم بتاؤ کہ یہ کیا پکڑ ہے؟“ ظفر پھر میرے پیچھے پڑ گیا۔

”اب وہ لوگ نہیں اپنا آلہ کار مانا چاہتے ہیں۔“

”ان کی کوششیں بار آور نہیں ہو سکیں گی۔“ میں نے کہا۔ ”یہ ایک حقیقت ہے کہ غلام سرکار دودناک موت کا شکار ہو چکا ہے اس بار تم لوگوں کی خاموشی میرے کام آئے گی۔ میں انہیں غلام سرکار کی موت سے آگاہ کر کے غزالہ کو ان کے چنگل سے نکالتے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔“

”وہ تمہارے انکشاف پر آسانی سے یقین نہیں کرے گا۔“

اچھوتی راہ نکالی تھی کہ ایک طرف ریاستی دباؤ کے ذریعے پاکستان میں ایٹم کی پیداوار کو ناقابل ذکر سطح تک گرانے کا بندوبست کر لیا گیا تھا اور دوسری طرف پاکستان میں ہیروئن کی طلب بڑھانے کے منصوبے پر کام شروع کر دیا گیا جس کے نتیجے میں میاں پیدا ہونے والی ایٹم مقامی منڈی کی ضروریات کے لئے ہی کم بنے تھی۔ اس خلا کو مرنے کے لئے افغانستان سے دس اور اسمگل ہونے والی ہیروئن کی ہماری مقدار پاکستان ہی میں کھپے گئی۔ اس مقصد کے حصول کے دوران شی کو اتنا اثر و رسوخ اور سرمایہ حاصل ہو گیا کہ وہ دوسرے معاشنی اور سیاسی جرائم میں بھی دخل ہونے لگی۔ مسلک ہتھیاروں کی غیر قانونی تجارت میں اس نے ایک اہم مقام حاصل کر لیا۔ ایک طرف اس کے ملک کے سفارت کار پاکستان میں سازشوں کی آبیاری کرنے میں لگے ہوئے تھے اور بھارتیوں کے ہاتھ مضبوط کر رہے تھے تو دوسری طرف شی ناجائز ذرائع سے ان کے لئے ہتھیار وغیرہ فراہم کرنے کی ذمہ داری قبول کر چکی تھی۔

ہیری کیسینز اور شری مان سنگھ کے سفارت خانوں نے شی کے ساتھ مل کر ایک خوفناک تلون بٹانی تھی اور اگر انجیل ٹاسک فورس کے ذریعے المیہ پر ہاتھ نہ ڈالا جاتا تو ملک میں ایک بہت بڑی تباہی پھیل سکتی تھی۔

اس پورے کھیل میں مافیا ابتدا ہی سے شی کی ایک کمزور حریف ثابت ہوتی چلی آئی تھی۔ ان دونوں مجرمانہ تنظیموں کے مقاصد میں دور دور تک کوئی ہم آہنگی نہیں تھی لیکن غلام رسول کا بیچلہ سامنے آتے ہی مافیا بھی پہلے سے قائم اس تلون میں شامل ہو گئی۔

”خدا کے لئے ان باتوں کی بنا پر کوئی کارروائی شروع نہ کرانا!“ میں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا ”فحس معلومات اور بھڑپوئیاری کے بغیر ایسے اقدامات نہیں کئے جاتے۔“

”غلام سرکار کے بارے میں معلومات فراہم کرنا تمہاری اور شری مان سنگھ کی ذیل کا پہلا حصہ ہے۔ جب تک تم غلام رسول کو اس کے حوالے نہیں کرو گے یا سینہ حبیب جیوانی سے مل کر فحس معلومات فراہم نہیں کرو گے، شری مان سنگھ تمہارے پیچھے لگا رہے گا۔“

”میں اسے نچاتا رہوں گا“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ایک بار غزالہ کا معاملہ صاف ہو جائے تو میں اسے تاکوں پنے چورادوں گا۔“

”مافیا والوں سے تمہارے مراسم کیسے ہیں؟“ ظفر کے اس غیر متوقع سوال نے مجھے بری طرح چونکا دیا۔

”مراسم؟“ میں نے قدرے بھڑک کر کہا ”میرے ان سے مراسم کیوں ہونے لگے؟“

”مراسم دوستانہ ہی نہیں بلکہ ناخوشگوار بھی ہو سکتے ہیں۔ تمہاری ماں سے ایسی کیا دشمنی ہے کہ تم ان کی بھی کھوج میں لگے رہے ہو؟“ ظفر مسکراتے لگا۔

”جب زیر زمین دنیا سے رابطہ رکھنا پڑتا ہو تو پھر ہر ایک کے بارے میں خیر خبر رکھنی پڑتی ہے۔ ہمارے میاں مافیا ابھی بہت زیادہ طاقتور نہیں ہو سکی ہے لیکن اس کے باوجود عام جرائم پیشہ افراد اس کی راہ سے بچ کر رہتے ہیں۔ شی کی بھڑپوئیاری سرگرمیاں، میاں مافیا کی ترقی میں رکاوٹ بنی رہی ہیں لیکن اب شاید حالات میں تبدیلی رونما ہونے لگی ہے۔“

”یہ تم کس بنا پر کہہ سکتے ہو؟“ سلطان شاہ نے پوچھا۔

”سامنے کی بات ہے۔ انہوں نے پولیس کی تحویل سے غلام رسول کو حلوہ کھلانے کے لئے اغوا نہیں کیا ہوگا۔ ان کے کچھ نہ کچھ پوشیدہ عزائم رہے ہوں گے۔ اب شری مان سنگھ نے ان کا قصہ پیچھے کر بات واضح کر دی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان دونوں فریقوں کے درمیان پہلے سے براہ راست یا بالواسطہ خفیہ مراسم رہے ہیں اور ان ہی کی بنا پر شری مان سنگھ غلام رسول کی ذات میں دلچسپی لے رہا ہے۔“

وہ موضوع بہت حساس اور سنگین تھا اس لئے ظفر کے ذہن میں بھانت بھانت کے سوالات پیدا ہو رہے تھے وہ سارے معاملات بظاہر ایک دوسرے سے مختلف تھے لیکن اندرون خانہ ان سب کا محور ایک ہی تھا۔ پیشہ ورانہ رقابتوں اور دشمنیوں سے قطع نظر ان سب کا مقصد ایک ہی نظر آ رہا تھا۔

شی بظاہر امریکی معاشرے کو ہیروئن کی یلغار سے بچانے کے لئے وجود میں لائی گئی تھی اور اس کا سربراہ براہ راست امریکی صدر کو جواب دہ تھا۔ ان لوگوں نے اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے یہ

دینی دین سے لے کر دنیاوی دنیا تک

رہنما سلطان خان کی آپ بیتی جنگ بیتی

اس جوان رتن سے زندگی کا رنگ مختلف تھا۔

دل دنگاروں کے سب رنگ ڈانچے کا تھیل سلاسل

بازی گھر

وہ تحریر جو دلوں کی دھڑکن ہے

کتابی محل میں چار حصے شائع ہو چکے ہیں

قیمت بیتی حصہ - 60/ روپے ڈاک خرچ بیتی حصہ - 23/ روپے

کتابیات پبلکیشنز
مفتی محمد رفیع الرحمن صاحب مدظلہ العالی
فون: 5802552-5805313
کراچی 74200
www.kabiyat.com

”اگر ختمِ مصر ہو تو میں شری مان سنگھ سے حبیب حیوانی کا کوئی سراغ حاصل کر کے تمہیں مطلع کروں گا لیکن میں پھر کہہ رہا ہوں کہ بھرپور تیاری کے بغیر ہمارا کوئی بھی اقدام ناکامی سے دوچار ہو سکتا ہے اور مافیا والے ایک بار ہمارے ہاتھوں سے پھسل کر نکل گئے تو ان پر دوبارہ ہاتھ ڈالنا مشکل ہو جائے گا۔“

اسی لمحے اطلاع ملی کہ ہمارے ہوٹل کی طرف بھیجا جانے والا شخص واپس آچکا ہے۔

ویرا اور جگتیر کے بیٹے کی تلاش کے سلسلے میں ویرا کی تصاویر بہت اہم تھیں اور شاید ہم تینوں ہی ان کے ہتھیار تھے کیونکہ ہم نے فوری اپنی گفتگو ختم کر دی اور آنے والے کو دوپٹے طلب کر لیا۔

وہ میری نشان دہی کے مطابق میرے ہوٹل سے وہ بریف کیس تولے آیا تھا جس میں دوسری تصاویر کے لفافے میں ہی ویرا کی متعدد تصاویر موجود تھیں لیکن اسی کے ساتھ اس نے ایک ایسے آدمی کے بارے میں بھی خبر سنائی جو پچھلے بیس گھنٹوں سے ہوٹل میں میرا انتظار کر رہا تھا۔

”بیس گھنٹوں سے انتظار کر رہا ہے؟“ ظفر نے حیرت اور بے یقینی سے پوچھا۔

”ہاں، اس کی حالت خاصی ابتر تھی۔ بے خوابی کی وجہ سے اس کی آنکھیں سرخ اور متورم تھیں۔ وہ بہت پریشان نظر آ رہا تھا۔ جب اسے پتا چلا کہ میں اس کمرے سے کچھ لینے آیا ہوں تو وہ میرے پیچھے پڑ گیا۔ اس نے بہت خوشامدیں کیں کہ میں اسے ان کا پتا بتا دوں یا ان تک پہنچا دوں۔“ اس شخص نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”میں بہت مشکل سے اپنا ہتھیار چھڑا کر آیا ہوں۔“

”لیکن وہ کون ہے اور اسے ڈینی سے ایسا کون سا کام درپیش ہے؟“ ظفر نے پوچھا۔

”اپنا نام شیر شاہ خان بتا رہا تھا۔ کام کے بارے میں اس نے ایک لفظ بھی نہیں بتایا۔ کہہ رہا تھا کہ کام کے بارے میں وہ تویر صاحب ہی سے بات کرے گا۔“

اس کی باتوں نے مجھے الجھن میں ڈال دیا۔ میں اس ہوٹل میں تویر کے نام سے ہی ٹھہرا تھا اور شیر شاہ اس ہوٹل سے واقف تھا۔

میرے لئے فکر کی دو باتیں تھیں۔ اول تو ظفر مجھ سے شیر شاہ کے بارے میں استفسار کرتا تو دوم مجھے یہ تشویش لاحق تھی کہ شیر شاہ کو مجھ سے ایسا کون سا کام آ رہا تھا جو وہ بیس گھنٹے سے وہاں بیٹھا میرے انتظار کی کڑی مشقت جھیل رہا تھا۔

سلطان شاہ، شیر شاہ کا نام سننے ہی معاملے کی سنگینی کو بھانپ گیا تھا اس لئے اس نے گفتگو میں حصہ لینے کے بجائے تصاویر کے لفافے میں سے ویرا کی واضح تصاویر چھاننی شروع کر دیں۔

”یہ شیر شاہ کون ہے؟“ اپنے آدمی کی کمائی سننے کے بعد ظفر میری طرف متوجہ ہو گیا۔

میں نے آنکھ کے اشارے سے اسے اپنے آدمی کی روانگی

بظاہر وہ سب ایک دوسرے سے الگ اور مختلف اکائیاں تھیں لیکن پاکستان کو ہر اعتبار سے نقصان پہنچانے کے معاملے پر ان میں مکمل اتفاق رائے پایا جاتا تھا۔

ظفر کے ذہن میں ان حوالوں سے متعدد سوالات جنم لے رہے تھے اور میں ان کے جوابات بھی دے رہا تھا لیکن میرا ذہن اس سے آگے تک الجھا ہوا تھا۔

ظفر کی معلومات مجھ سے کہیں کم تھیں۔ مجھے معلوم تھا کہ مڈر مافیا کی ہدایت پر غلام رسول کو پولیس کی تحویل سے نکال دیا گیا تھا اور اسے جلد از جلد پاکستان سے نکال کر بھارت پہنچانے کا پروگرام طے ہو چکا تھا۔ سیٹھ حبیب حیوانی نے وہ کام میرے ذمے ڈالا ہوا تھا اور میں اس کی انجام دہی میں بے پروائی برت رہا تھا لیکن شری مان سنگھ کی تازہ ترین گفتگو سے یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ ان لوگوں کو ہرات کا چٹکی علم تھا۔

اسے معلوم تھا کہ غلام رسول مافیا کے قبضے میں تھا۔ اس موذی سیاست داں کی منتقلی میں تاخیر ہونے کی وجہ سے بھارتی حکام اضطراب کا شکار ہو رہے تھے۔ اسی دوران میں ویرا کی بدنیاتی کی وجہ سے غزالہ کی بازاریابی کا مسئلہ کھڑا ہو گیا اور یوں شری مان سنگھ کو مجھ سے غلام رسول اور مافیا کے معاملات پر بات کرنے کا موقع مل گیا۔ اس کی گفتگو سے یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ وہ مافیا سے میرے تعلق سے بے خبر تھا لیکن جو لوگ مڈر مافیا تک رسائی رکھتے تھے، ان کے لئے ایسی باتیں جان لینا مشکل نہیں تھا۔

غلام رسول کو حاصل کرنے کے لئے بھارتیوں کے اضطراب کی وجہ سے اس امر کا امکان بھی پایا جاتا تھا کہ اگر میں شری مان سنگھ کو کوئی تسلی بخش جواب نہ دیتا تو وہ لوگ اپنے ذرائع سے دوسرے موثر روابط تلاش کر سکتے تھے جو میری بے خبری میں اپنا ہدف حاصل کر سکتے تھے۔

”تم مجھے سیٹھ حبیب حیوانی کا ٹھکانا بتاؤ!“ آخر کار ظفر نے بحث کو ختم کرتے ہوئے کہا ”میں اس کے حلق میں ہاتھ ڈال کر سب کچھ اگلاؤں گا۔“

”یہ نام مجھے شری مان سنگھ نے ہی بتایا تھا۔ اس کا ٹھکانا مجھے نہیں معلوم۔“

”شری مان سنگھ نے تمہیں اس سے رابطہ کرنے کا کوئی نہ کوئی ذریعہ تو بتایا ہو گا؟“

”سیٹھ حبیب حیوانی کا نام بتاتے ہی وہ تمہاری غلیل کا شکار ہو گیا تھا۔ وہ بہت اہم بات تھی لیکن بد قسمتی سے مجھے یاد رہی نہ اسے دھیان آیا۔“ میں نے پورے اعتماد سے کہا۔ حقیقت یہ ہے کہ شری مان سنگھ کی حد تک میرا وہ بیان سونیصد سچائی پر مبنی تھا۔

”پھر تم اس سے فون پر بات کرو“ ظفر کی آنکھوں سے فکر مندی جھانکنے لگی ”باقی معاملات تو چلے ہی رہیں گے لیکن جو شکار سامنے ہے اسے مار لینے میں تاخیر نہیں کرنی چاہئے۔“

کوئی خطرہ نہیں تھا۔ کیونکہ وہ مانیٹل پلادہ راست ماتحت تھا لیکن ظفر کی نظروں میں میرے لئے خطرات پیدا ہونے کا امکان تھا کیونکہ وہ اندر کی باتوں سے بے خبر تھا اور شیر شاہ کو میرا تجربہ سمجھ رہا تھا۔

ظفر میں خرابی یہ تھی کہ اپنے پیشے کی وجہ سے وہ کھیلے اور کانت دار انداز میں بات کرنے کا عادی تھا اور اپنے نئے سنے سوالات سے مخاطب کو چوٹ کا دینے کی بے پناہ صلاحیت رکھتا تھا لیکن کم از کم میری حد تک اس میں ایک بڑی خوبی بھی تھی کہ میں اس سے جو کچھ کہہ دیتا تھا وہ اس پر پوری طرح اعتبار کر لیتا تھا۔ اس وقت شیر شاہ کے بارے میں بھی بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔

وہ مہر تھا کہ مجھے حفاظتی تدابیر کے ساتھ ہوٹل کا رخ کرنا چاہئے۔ شیر شاہ وہاں تک پہنچ چکا تھا تو اس کے دیگر ساتھی بھی اس کے پیچھے لگ کر وہاں آ گئے تھے۔ میرے نمودار ہونے پر ان کی طرف سے کوئی جارحانہ پیش قدمی نہ ہوتی تھی میرے لئے گلو خلاصی کے راستے بند ہو جاتے۔ میں دل ہی دل میں سمجھ رہا تھا کہ اس کے اندیشے بے بنیاد تھے لیکن اس کی دلجوئی کے لئے مجھے اس کا مشورہ قبول کرنا پڑا۔

سلطان شاہ کو بہر حال میرے ساتھ جانا تھا۔ وہ پہلے سے مسلح تھا اس لئے میں نے اسٹیشن ٹاسک فورس کے صرف ایک آدمی کو اپنے ساتھ لینے پر اکتفا کیا۔ اسے جب کے ڈرائیور کے طور پر میرے ساتھ جانا تھا۔ ظفر کے دعوے کے مطابق ضرورت پڑنے پر وہ ڈرائیور ایک بے جگر لڑاکا اور چانٹنے باز ثابت ہو سکتا تھا مگر میرے لئے اس کے وہ خواص غیر اہم تھے۔

ظفر کے آدمی کے بیان کے مطابق شیر شاہ وحشت زدہ حالت میں ہوٹل ہی میں موجود تھا۔ میری اور سلطان شاہ کی جھلک دیکھتے ہی وہ بے تابانہ انداز میں ہماری طرف لپکا تھا۔ اسی نایف کے آدمی کو باہر کی عمرانی کے بہانے ہم نے جیب ہی میں چھوڑ دیا تھا۔

شیر شاہ بہت زیادہ پریشان اور گھبرا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس نے ہم سے ملنے ہی راز دارانہ لہجے میں اپنی کتھا شروع کرنی چاہی لیکن میں نے اشارے سے اسے روک دیا۔

”بابو! اپنے ہندوں کو کیوں تڑپاتے ہو؟“ ہوٹل کے مَنڈ پھٹتے استقبالیہ کلرک نے وہ منظر دیکھ کر مسکراتے ہوئے تقویٰ کیا۔ ”یہی بے قراری تو ملی کو جنموں کے لئے بھی نہیں ہوتی ہوگی۔“

”اُن دونوں کے درمیان تمہارے جیسا کوئی اُلو کا چھا موجود ہوتا تو وہ اس سے زیادہ حماقتیں بھی کر سکتے تھے“ میں نے خشک اور ورشت لہجے میں اسے پھنکار دیا اور اس کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

”آؤ!“ میں شیر شاہ کے شانے پر ہاتھ مارتا ہوا تیزی سے زینوں کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

”چیف باگل ہوا جا رہا ہے، پاس!“ اس نے کمرے میں پہنچنے ہی اپنی کمانی شروع کر دی ”میں تمہارا سراغ لگائے بغیر اس کے پاس

تک خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور کہا ”ایک جرائم پیشہ شخص ہے لیکن مجھے حیرت ہے کہ اسے مجھ سے کیا کام آ رہا ہے۔“ ظفر مجھے گھور کر رہ گیا اور میں بے پروایانہ انداز میں تصاویر کی طرف متوجہ ہو گیا۔

اس ڈھیر میں سے تین تصاویر منتخب کر کے ظفر نے اپنے مزید آدمیوں کو طلب کیا اور دو نفری دو ٹولیاں بنانے کے بعد وہ تصاویر ان کے حوالے کر دیں۔

ان میں سے ایک جماعت کو ہوٹل میزوپول میں دیر کی مزیدگی کا سراغ لگاتا تھا جب کہ دوسری ٹولی کو شہر کے معروف چائلڈ کیریسنٹر میں جا کر یہ معلوم کرنا تھا کہ ویرانے جمائیکے بیٹے کو ان میں سے کسی ادارے میں داخل نہ کرایا ہو۔ ظفر سے ہدایات لیتے ہی وہ چاروں افراد فوراً چلے گئے۔

”ہاں! اب بتاؤ کہ یہ شیر شاہ کا کیا چکر ہے؟“ ان کے جاتے ہی ظفر نے سوال کیا۔

میں نے ایک کمرہ سانس لے کر بے بسی سے سلطان شاہ کی طرف دیکھا اور کہا ”میرا خیال ہے کہ شیر شاہ مانیٹل کے لئے کام کرتا ہے۔ آج کل میں اسے دانہ ڈال رہا ہوں۔“

”پھر تو اس کی آمدیت اہم ہو سکتی ہے۔ تمہیں فوری طور پر اُس سے رابطہ کرنا چاہئے“ وہ بولا۔

”میری کوشش یہی ہوگی۔ تمہارے آدمی کے بیان کے مطابق وہ اب بھی ہوٹل ہی میں جمایا ہوا ہے۔ میں وہیں جا کر اُس سے بات کروں گا“ میں نے کہا۔

”تم اسے فون بھی کر سکتے ہو“ ظفر نے تجویز پیش کی ”تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو اسے اٹھا کر یہاں بھی لایا جاسکتا ہے۔ میرا آدمی اسے دیکھ ہی چکا ہے۔“

”بات میرے اعتراض کی نہیں! اس کی سلامتی کی ہے“ میں نے قدرے چڑ کر کہا ”اسے آنا ہی ہوتا تو وہ تمہارے آدمی کے ساتھ ہی آسکتا ہے۔ مانیٹل والوں کو بھگ بھی مل گئی کہ وہ ان کے خلاف کسی جوتو توڑ میں شریک ہے تو وہ اس کی کھال کھینچ ڈالیں گے اس کا مانیٹل میں رہنا خود ہمارے مفاد میں ہے۔ اسے کھودینے کے بعد ہم معلومات حاصل کرنے کے ایک بااعتماد ذریعے سے محروم ہو جائیں گے۔“

”لیکن اس سے حبیب حیوانی کے بارے میں ضرور معلوم کرنا“ ظفر نے تاکید کی ”اس کے بارے میں ہمیں کونج نکالنا ہوگا۔ میوزیوں کی ٹولی میں سے کوئی ایک بھی بچ نکلا تو ہم جین سے نہیں بندھ سکیں گے۔“

”تم فکر نہ کرو۔ ان لوگوں کے بارے میں“ میں نے اپنی ذمے داریوں کو پوری طرح سمجھتا ہوں۔ شری مان سنگھ کے مقابلے کے بعد میں شیر شاہ سے کل کر بات کر سکوں گا۔“

شیر شاہ سے ملاقات کے لئے جانے میں میرے لئے کسی قسم کا

واپس جاتا تو وہ بے دروغ مجھے گولی مار دیتا۔۔۔“

”میرے بارے میں اسے ایک بیک کیا تکلیف لاحق ہو گئی ہے؟“ میں نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

وہ اضطرابی طور پر اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور ٹپکتے ہوئے بولا ”شاید غلام رسول کے بارے میں اس پر اوپر والوں کا شدید دباؤ ہے۔ وہ بار بار تمہارے اور اس کے بارے میں پوچھتا رہا ہے۔ دوسری طرف غلام رسول کی حالت خراب ہے۔ میرے سامنے اسے خون کی دو الٹیاں ہو چکی تھیں۔“

”کیا تم لوگوں نے اس پر کوئی تشدد کیا تھا؟“ میں نے سرو لہجے میں پوچھا۔

”ہم نے تو اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ ہمارے لئے وہ اپنا ہی آدمی ہے۔“

”پھر اسے خون کی الٹیاں کیوں ہو رہی ہیں؟“ میں نے سوال کیا۔

”چیف کی ہدایت پر میں ڈاکٹر باری نامی ایک شخص کو ٹریڈ لائن کے دفتر لے گیا تھا۔ اس نے بتایا ہے کہ غلام رسول کے پھپھڑوں پر زخم آئے ہوئے ہیں۔ شاید پولیس والوں نے اسے بے رحمی سے مارا چاہا ہو گا۔ وہ لوگ قیدیوں پر اس طرح تشدد کرتے ہیں کہ ان کے جسم پر کوئی ضرب، زخم یا نشان نظر نہ آئے لیکن اندر سے ان کا بیڑا خرق ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر باری نے جب سے یہ بتایا ہے کہ غلام رسول کسی بھی وقت مر سکتا ہے“ اسی وقت سے چیف کا داغ الٹا ہوا ہے اور وہ تم سے بات کرنی چاہ رہا ہے۔“

”میں سے معلوم ہونا چاہئے کہ میں بھی کام میں مصروف ہوں“

”میں نے اسے بتایا تھا لیکن وہ کہتا ہے کہ دیرا جنم میں جائے۔ اس سے ہم کسی بھی وقت نمٹ سکتے ہیں۔ اس وقت غلام رسول کی دوا گئی سب سے اہم ہے۔ اگر وہ ہماری تحویل میں مر گیا تو اوپر والے ہم میں سے کسی کو معاف نہیں کریں گے۔ ہمارے پاس سے جانے کے بعد وہ زندہ رہے یا مرے، کم از کم ہم پر کوئی ذمے داری نہیں آئے گی۔ اس نے یہ کام تمہارے حوالے کیا ہوا ہے اس لئے وہ تم ہی پر برس رہا ہے۔“

”وہ ہر کام میرے حوالے کرتا ہے اور خود پیش کرتا رہتا ہے“ میں نے سچ لہجے میں کہا ”غلام رسول کی موت آہی گئی تو کوئی بھی اسے مرنے سے نہیں روک سکے گا۔ پتا نہیں چیف کیوں اتنا الجھ رہا ہے۔“

”شاید تم ہی اس سے کچھ پوچھ سکتے ہو۔ ہمیں تو وہ بات بات پر کہانے کو دوڑ رہا ہے۔“

”جیسا“ تم نیچے جا کر دھیان رکھو کہ ہوٹل کا آپریٹر ہماری گفتگو سننے کی کوشش نہ کرنے پائے، میں ابھی چیف سے فون پر بات کرتا ہوں“ میں نے کہا۔

”بڑی عجیب اور ناقابل فہم خواہش ہے چیف کی!“ شیر شاہ خان کے چلے جانے کے بعد سلطان شاہ نے استہزائیہ انداز میں کہا۔

”بالکل نہیں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”وہ بالکل مجھ خطوط پر سوچ رہا ہے۔“

”لیکن ابھی تو تم اسی بات پر بہم ہو رہے تھے“ وہ تنک کر بولا۔

”شیر شاہ کو کنفیوز کرنا ضروری تھا“ میں نے اسے چڑانے کی نیت سے کہا۔

”اور اب تم شاید مجھے کنفیوز کر رہے ہو۔ اس بات کی کیا اہمیت ہے کہ غلام رسول کس کی تحویل میں مرتا ہے؟ موت تو کہیں بھی آ سکتی ہے۔“

”وہ ہماری تحویل میں مرا تو خاموشی سے اس کی تدفین محل میں آجائے گی اور یہ ثابت کرنا دشوار ہو گا کہ واقعی مافیا نے اسے سرکاری تحویل سے نکالا ہے۔ وہ دوران سفر مرا تو یہ ایک بڑی خبر ہو گی۔ بھارتیوں کو یہ بتایا جائے گا کہ مافیا نے اسے پاکستان سے نکالا تھا لیکن اس کی زندگی نے اس کے ساتھ وفا نہیں کی اور دوران پرواز ہی مر گیا۔ ایسی صورت میں مافیا کو کچھ رعایتیں مل سکیں گی اور بھارتیوں کے ساتھ تعلقات میں بھی خاصی پیش رفت ہو سکے گی۔“

”پھر اب تم کیا سوچ رہے ہو؟“ اس نے اپنی کھوپڑی پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

”بہت کچھ“ میں نے کہا ”لیکن اس پر عمل کرنے کا انحصار حبیب جیوانی کے ساتھ ہونے والی گفتگو پر ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب کھیل جلد ہی سٹ جائے گا۔“

”تو پھر انتظار کس کا ہے؟ اسے فون کیوں نہیں کرتے؟“ غرایا۔

میں نے بستر کے سرہانے رکھے ہوئے فون کی طرف ہاتھ بڑھا ہی تھا کہ مجھے ایس ٹی ایف کی چیپ میں موجود موبائل فون کا خیال آیا اور میں نے ہوٹل کے فون پر بات کرنے کا خطرہ مول لے لے کا ارادہ ترک کر کے سلطان شاہ کو چیپ کی طرف دوڑا دیا۔

”شیر شاہ کو اوپر نہ بلانا!“ میں نے اسے دروازے پر روک کر کہا۔ ”میں نے جیسے بیٹھا رہے دو۔ میں اس لی علی حاضری میں بات سن چاہتا ہوں۔“

چند ثانیوں میں ہی سلطان شاہ موبائل فون لے آیا۔ ان دنوں موبائل فون کی سولت عام نہیں ہوئی تھی اور وہ عوام خواص میں عجوبہ تصور کیا جاتا تھا لیکن ایس ٹی ایف نے اپنے ذرائع سے اس سولت پر دسترس حاصل کی ہوئی تھی۔

فون پر میری آواز سننے ہی سیٹھ حبیب جیوانی ایک دم دم چٹ پڑا۔ میں نے چند ثانیوں تک خاموش رہ کر، اسے اپنے دل کا غبار

زیادہ بدسلوکی کی گئی ہے اور اس کی حالت کسی بھی وقت بگڑ سکتی ہے جب کہ ہمارے گرد مجبوریاں پھیلی جارہی ہیں اسی لئے میں نے ایک اور لائن پر کام شروع کر دیا تھا جس کے کچھ نتائج سامنے آچکے ہیں۔“

”مجھے معلوم تھا کہ تم کچھ نہ کچھ کر رہے ہو گے“ اس کی اضطرابی آواز ابھری ”لیکن تم سے کوئی رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے میں بالکل اندھیرے میں ہوں۔ میرے پاس ڈان قمری کو سنانے کے لئے کوئی چیز نہیں تھی اس لئے میں اس کی بجائے کھانے اور معذرت کرنے کے علاوہ کچھ نہیں کہہ سکا۔ تم کس لائن پر کام کر رہے ہو؟ اس کے نتائج کیا ہیں؟“

”نتائج تسلی بخش بلکہ حوصلہ افزا کے جاسکتے ہیں“ میں نے اس مردود کے اعصاب سے کھیلنے کی نیت سے بات کو طول دیتے ہوئے کہا ”ڈان قمری کو سمجھنا چاہئے کہ ہم یہاں ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اپنی پوری صلاحیت سے کام لے رہے ہیں۔۔۔۔۔“

”تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو!“ اس نے بے مہربانی کے ساتھ ایک مرتبہ پھر میری بات کاٹ دی ”ادھر والے سب ہی کچے حرامی اور اول درجے کے کام چور ہوتے ہیں۔ اپنے ماتحتوں کی مجبوریوں کا کوئی خیال کئے بغیر مشکل سے مشکل کام ان پر لاد دیتے ہیں اور پھر سرسوار ہو جاتے ہیں۔۔۔۔۔“

اس بار میں نے جیسے ہوئے اس کی بات کاٹ دی اور معنی خیز لہجے میں کہا ”یہ نہ بھولو“ چیف کہ تم بھی میرے ادھر والے ہو۔ شاید سب ادھر والے ایسے نہیں ہوتے!“

”یہ مذاق کا وقت نہیں ہے ڈینی!“ اس کی آواز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ میری نوک جھونک سے زچ گیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”مجھے جلد از جلد کام کی بات بتاؤ۔ مذاق بعد میں ہوتا رہے گا۔“

”ہماری حکومت غلام رسول کی ذات میں گہری دلچسپی لے رہی ہے اس لئے میں نے ان کے سفارتی عملے سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی جو بار آور ثابت ہوئی اور وہ غلام رسول کو اپنی تحویل میں لینے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ انہیں ہماری مشکلات کا بخوبی اندازہ ہے۔“

”تمہاری ملاقات کس سے ہوئی ہے؟“ اس کی آواز سے بے تابی جھلک رہی تھی۔

”میں خود اس کے نام اور چہرے سے لاعلم ہوں“ میں نے جھوٹ بولا۔

”لیکن اس کا کوئی نہ کوئی عہدہ تو ہو گا۔ تمہاری کس سے اور کس حوالے سے بات ہوئی تھی؟“ وہ ایک ہی سانس میں سب کچھ جان لینے کے لئے بے چین ہوا جا رہا تھا۔

”یہ لمبی کہانی ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ میں ان سے ابھی بات کروں تو وہ اسی وقت غلام رسول کو لینے کے لئے آجائیں گے“ میں

لپکا کرنے کا موقع دیا۔ جس سے اس نے پوری طرح استفادہ کیا۔ کچھ دیر تک ایک طرف بکواس کرنے کے بعد وہ آخر کار میری مسلسل خاموشی سے بھٹا گیا۔

”آخر تم بولتے کیوں نہیں؟ کیا میں بلاوجہ بھونکے جا رہا ہوں؟“ اس کی برہم آواز ابھری۔

”میں کیا کہہ سکتا ہوں“ چیف! ”میں نے معصومیت سے کہا۔ ”تم مجھے بولنے کا موقع ہی کب دے رہے ہو؟ تمہارا غصہ کچھ کم ہو تو میں اپنی کٹھا شروع کروں۔“

”اب چپ کیوں ہو گئے؟“ اس کی غراہٹ ابھری ”کیا مجھے اپنی خاموشی کا اعلان کرنا پڑے گا۔“

”میں دیر کے ساتھ غلام رسول والے معاملے پر بھی کام کرتا رہا ہوں“ میں نے کہا ”اسے ملک سے باہر نکالنا بہت مشکل نظر آ رہا ہے کیونکہ اس کی تصاویر ملک کی تمام سرحدوں اور بین الاقوامی ہوائی اڈوں پر پھنچا دی گئی ہیں۔ وہ جدھر بھی گیا فوراً ہی دھریا جائے گا۔“

”اور اتنی سی بات تک پہنچنے کے لئے تم جھک مارتے پھر رہے تھے؟“ میری بات کاٹ کر اس کی زہریلی آواز گونجی۔

”تم سے بات کرنے کے بعد مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ میں اب تک واقعی جھک مارتا رہا ہوں“ اس لئے اب میری بات چھوڑو اور مجھے بتاؤ کہ میں کیا کروں“ کیونکہ یہ وہ چیف تھی ہو“ میں نے قدرے توقف کے بعد سرول لیکن منہ ب لہجے میں کہا۔ اس کی تلخ کلامی سے میرا داغ واقعی سنک گیا تھا۔

میری بات سے شاید اسے ذہنی جھکا کا اور اس نے مہانپ لیا کہ اس کا لب و لہجہ مجھے پسند نہیں آیا تھا کیونکہ اس نے فوراً ہی نرمی اختیار کرتے ہوئے کہا تھا ”تم بات مجھے کی کوشش کرو!“ سچے مجھے کا وقت ہم گنوا چکے ہیں اور اب عمل کا وقت آچکا ہے۔ غلام رسول کسی بھی وقت جہنم واصل ہو سکتا ہے۔ ہمارے بلوں کو ہمارے مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ غلام رسول کو فوری طور پر یہاں سے چلا جانا چاہئے۔ اس کے بعد وہ زندہ رہے یا مرے“ یہ ان کا مسئلہ ہو گا۔“

”شاید انہوں نے تمہارے ساتھ خاصا درست رویہ اختیار کیا ہو ہے۔ کیونکہ تم ذہنی یکسوئی سے محروم معلوم ہو رہے ہو اسی وجہ سے باہر بھڑک رہے ہو“ اسے مصالحت اور نرمی پر آمادہ پا کر میں نے رنگین ضروری سمجھتے ہوئے کہا۔

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو“ اوقات مل جانے کے بعد وہ راہ راست پر آیا ”آج میرے پاس دو مرتبہ ڈان قمری کی کال آچکی ہے۔ میری کال آنے سے پہلے میں غلام رسول سے چھکارا حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ وہ صرف میرا نہیں، ہم سب کا مشترکہ مسئلہ ہے۔“

”مجھے اندازہ تھا کہ حراست میں غلام رسول کے ساتھ مت

ری ہے؟“

”اس لئے کہ یہ مافیا بلکہ سینہ حبیب حیوانی کی مجبوری ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ غلام رسول خود قریب المرگ ہے۔ وہ ہماری تحویل کے بجائے ہمارے قیدی کے قبضے میں مر گیا تو کون سی قیامت آجائے گی؟ اپنی موجودہ حالت میں وہ ان کے کسی بھی کام نہیں آسکے گا۔“

”یہ تمہاری خوش خیالی ہے۔ کوؤں کے کونے سے دھور نہیں مرا کرتے“ اس نے کہا۔

”ہائیں ہائیں!“ میں نے حیرت سے آنکھیں کھل کر کہا ”تم اتنی با محاورہ اردو ب سے بولنے لگے؟“

”کیس سی ہوئی کمات یاد آگئی تھی“ وہ بے پروائی سے بولا۔
”لیکن یہ یاد رکھو کہ کوئی بھی ڈاکٹر زندگی اور موت کے معاملے پر اطمینان نہیں ہو سکتا۔ میں ایسے کئی لوگوں کو جانتا ہوں جنہیں ڈاکٹروں نے چند روز کا مسمان قرار دے دیا تھا لیکن وہ برسوں گزر جانے کے باوجود زندہ اور صحت مند ہیں۔“

”تم کتنا کیا چاہتے ہو؟“ میں نے اس کی بحث سے زنج ہو کر پوچھا۔

”میری نفرت میں قریب المرگ کا لفظ سرے سے نہیں ہے۔ آدمی زندہ ہوتا ہے یا مردہ اور جب تک اس کے جسم سے آخری سانس بھی نہ نکل جائے وہ زندہ ہی رہتا ہے اور کلاتا ہے۔ تم غلام رسول کو شری مان سگھ کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر کے ایک سنگین غلطی کر رہے ہو۔ ہو سکتا ہے کہ ایک دو روز میں ہی اس کی حالت شعلنی شروع ہو جائے اور ہمارے اس کے ذریعے اپنا کدہ کھیل آگے بڑھانے کا موقع مل جائے۔ اس وقت تم اپنے غلبہ فیض پر بچتے ہو۔ علاوہ اور کچھ نہیں کر سکو گے۔“

”اگر اندرونی ضربات کی وجہ سے اس کے پیچھے پھڑے زخمی ہو گئے ہیں تو دنیا کی کوئی طاقت اسے نہیں بچا سکے گی“ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا ”ایسا ہی ہے تو ہم بھی اسے شری مان سگھ کے حوالے کرنے سے پہلے اچھی طرح ٹھوک بجائیں گے۔ اس وقت ہمیں مافیا میں اپنا وجود برقرار رکھنا ہے۔ اگر ہم نے یہ وقت گزرا دیا تو ڈان تھری مجھ سے بدظن ہو جائے گا۔ آج میں نے یہ معاملہ دایا ہے لیکن کسی نہ کسی وقت مافیا والوں پر یہ بات کھل سکتی ہے کہ شری مان سگھ نے غلام رسول کے حصول کے لئے خود مجھ سے رابطہ کیا تھا۔ اس وقت میرے پاس اپنے بچاؤ کے لئے کوئی بذر نہیں ہو گا اور مافیا والے مجھے بری طرح رگید کر رکھ دیں گے۔“

”اس کا سب سے آسان راستہ یہ ہے کہ تم ظفر کو اعتماد میں لے کر اسے مافیا کے بارے میں سب کچھ بتا دو۔ اس کی سچی ٹانک فورس ٹریڈ لائن پر چھاپا مار کر نہ صرف غلام رسول کو برآمد کر لے گی بلکہ حبیب حیوانی اور اس کے تمام گروہ کے بھی پکڑ لے جائیں گے۔“

نے جزئیات میں اچھے سے گریز کرتے ہوئے کہا۔

”لیکن واضح شناخت کے بغیر اتنے اہم معاملے میں اندھا جوا نہیں کھیلا جاتا۔“

”یہ اندھا جوا نہیں ہے۔ میں جو کچھ کہوں گا، یقین ہونے کے بعد ہی کہوں گا۔“

”دبی تو میں بھی جانتا چاہتا ہوں۔ تمہارے اعتماد کی بنیاد کیا ہے؟“

”کراچی میں ان کے کونسلٹ کا ایک سینٹر افسر درمیان میں ہو گا۔ اس کا نام شری مان سگھ ہے اور میں اسے ذاتی طور پر پہچانتا ہوں“ میں نے کہا۔

”اس معاملے میں مجھے دخل دینے کی ضرورت تو نہیں پڑے گی؟“

”میرا خیال ہے کہ میں خود ہی یہ معاملہ نمٹا لوں گا۔ مجھے بس تمہاری اجازت کی ضرورت ہے“ میں نے کہا ”تمہارے دخل انداز ہونے کی صورت میں یہ معاملہ بگڑ بھی سکتا ہے۔“

”ٹھیک ہے!“ اس کی آواز سے اطمینان مترشح تھا ”اب ڈان تھری کا فون آیا تو میں اس سے کم از کم یہ تو کہہ سکوں گا کہ ہماری شری مان سگھ سے بات چل رہی ہے بچاؤ کا کام تو خود میرے فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا کہ تم شری مان سگھ سے بھر رہے ہو۔“

”میرا خیال ہے کہ ڈان کا تیرا فون آنے سے پہلے یہ قصہ نمٹ چکا ہو گا۔“

”مجھے خبر نہ تھی کہ تم مجھے گہری نیند سے بھی جگا سکتے ہو۔ رات کو میں فون اپنی خواب گاہ میں ہی رکھتا ہوں“ میں تمہاری کاسیابی کے لئے دعا کرتا رہوں گا۔“

”نیند میں دعا نہ کرنا“ میں نے جلدی سے کہا ”فمار آکوو دعائیں راستے سے ہی لوٹ آتی ہیں۔“

”تم کسی بھی وقت بد معاشی سے باز نہیں آتے“ حبیب حیوانی کا فقرہ کھل ہوئے ہی لائن پر سنا تھا کیا اور میں نے بھی موبائل فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

”تو کیا تم واقعی غلام رسول کو شری مان سگھ کے حوالے کرنے کے بارے میں سمجھو؟“ میرے فارغ ہوتے ہی سلطان شاہ جھار کے کسی کانٹے کی طرح مجھ سے الجھ پڑا۔

”مجبوری ہے۔ اب اس کے علاوہ کوئی راستہ باقی نہیں رہا۔“
”میرا خیال تھا کہ تم غزالہ بھابی کے لئے اس حد تک ہرگز نہیں جاؤ گے“ وہ ملامت آمیز نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”اے یہ غزالہ کی وجہ سے نہیں ہو گا“ میں دانت پیس کر بولا۔ ”میں بتا چکا ہوں کہ صرف ماسر کار کی موت کی اطلاع دے کر بھی شری مان سگھ کو غزالہ کی واپسی پر آمادہ کر سکتا ہوں۔“

”پھر اب غلام رسول کو ان کے حوالے کرنے کی کیوں سوجھ

پہلے میں غفر سے مشورہ کرنا چاہتا تھا اس لئے میں نے اپنی دوسری فون کال کو انٹیشن فور واہی تک مؤخر کر دیا تھا۔

جس طرح میں نے اپنی اور شری مان سنگھ کی ملاقات کے اصل پس منظر کو حبیب جیوانی سے پوشیدہ رکھتے ہوئے اسے صرف کلیدی باتوں سے آگاہ کیا تھا اسی طرح میں نے غفر کو بھی اپنی اور حبیب جیوانی کی اصل گفتگو سے بے خبر رکھتے ہوئے صرف اتنا بتایا کہ شیر شاہ کے ذریعے مافیا والے اس امر پر آمادہ ہو گئے تھے کہ میں ان کی طرف سے غلام رسول کو بھارتیوں کے حوالے کر دوں۔ میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ مافیا والوں کی فوری آمادگی کا سبب یہ تھا کہ وہ خود بھی غلام رسول کو سرحد پار پہنچانے کے لئے کوشاں تھے لیکن گہڑے ہوئے حالات کی وجہ سے مجبور تھے۔ میری تجویز نے ان کا کام آسان کر دیا تھا۔ سرحد پار نہ سہی، سرحد میں ہی غلام رسول کو بھارتیوں کے حوالے کرنا ان کے مقاصد کے عین مطابق تھا۔

میں ہوٹل میں سلطان شاہ کی کھجی بھگت چکا تھا اس لئے میں نے جیش بندی کے طور پر غفر کو یہ بھی بتا دیا کہ غلام رسول کی حالت بہت اتر چکی اور وہ چند گھنٹوں یا زیادہ سے زیادہ چند دنوں کا مسمان تھا اس لئے ہم کوئی خطرہ مول لئے بغیر اسے شری مان سنگھ کے حوالے کر سکتے تھے۔ لیکن غفر اس معاملے میں سلطان شاہ سے زیادہ سخت ثابت ہوا۔

وہ غلام رسول کو کسی بھی قیمت پر شری مان سنگھ کے حوالے کرنے کے خلاف تھا۔ میں نے ایک بار پھر اپنے وہی دلائل دہرائے جن کے سارے میں سلطان شاہ کو لاجواب کر چکا تھا لیکن غفر کے بشرے پر پھیلی ہوئی تختی میں ذرا سی بھی نرمی پیدا نہیں ہو سکی۔

”میں تمہاری ہر بات ماننا ہوں۔“ اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”غلام رسول کے پچھڑے ہی نہیں بلکہ دوسرے اعضاءے رئیسہ بھی زخمی ہو سکتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارے ڈگری کا نشانہ بننے والے بہت کم زندہ بچتے ہیں۔ زندہ بچ بھی جائیں تو عمر بھر کے دوا بن جاتے ہیں مگر ہمیں پھر بھی کسی قسم کا پرسک نہیں لینا چاہئے۔ ایسے نازک اور پیچیدہ معاملات میں غلط فیصلے ملک ثابت ہوتے ہیں۔“

”ایک بار غلام رسول کی موت واقع ہو گئی تو تمہاری کیا کر سکیں گے؟“

”تم زندہ غلام رسول کی بات کر رہے ہو، میں تو اس کی لاش بھی بھارتیوں کے حوالے نہیں کرنا چاہوں گا۔ تم راکو نہیں جانتے۔ اس میں ایک سے ایک سڑدماغ پل رہا ہے۔ وہ لوگ رائی کا پھاڑ بنالینے میں سمارت رکھتے ہیں اور میں انہیں رائی فراہم نہیں کرنا چاہتا۔“

”آخر کچھ تو پتا چلے کہ تمہارے ذہنی تھخلات کیا ہیں؟“ میں نے عجب آکر کہا۔

”تم یہ بات بھول رہے ہو کہ شری مان سنگھ نے غزالہ کی رہائی کے لئے دو شرائط عائد کی ہیں۔ اگر غلام رسول کو ایس ٹی ایف والے پکڑ لیتے ہیں تو یہ باب بند ہو جائے گا اور شری مان سنگھ صرف لائسہ کار کے بارے میں خبر لٹنے کے بعد غزالہ کو آزاد نہیں کرے گا۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی نئی شرط زیادہ کڑی اور ناقابل قبول ہو۔ جب تک غزالہ اس کے قبضے میں ہے ہم اندھا دھند کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے۔“

بابی سے سلطان شاہ کا منہ لٹک گیا اور وہ بحث وہیں ختم ہو گئی۔

میں نے فوراً ہی شیر شاہ کو اوپر بلا کر ٹیڈ لائن جانے کی ہدایت کی۔ میں نے اسے بتا دیا کہ میری چیف سے بات ہو گئی تھی اور غلام رسول کے بارے میں کسی بھی وقت کوئی پیش رفت ہو سکتی تھی۔ اس لئے اسے اپنے آدمیوں کو ہر وقت تیار رکھنا تھا۔

”میرے سر سے بہت بڑا بوجھ مل گیا۔“ اس نے جاتے ہوئے کہا ”جب تک تم سے ملاقات نہیں ہوئی تھی، اس وقت تک مجھے ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آ رہا تھا۔“

میں نے اس کے جاتے ہی سلطان شاہ کو بھی اس کے پیچھے روانہ کر دیا تاکہ وہ اس امر کا اطمینان کر لے کہ شیر شاہ واقعی وہاں سے چلا گیا ہے۔ اگر وہ ابھر چھپ کر ہماری روانگی کا جائزہ لینے کی کوشش کرنا تو اس کے ذہن میں شبہات جنم لے سکتے تھے۔ ایس ٹی ایف کی چمکتی دھنکی ہوئی جیپ پر عام شہری نمبر پلیٹ تھی لیکن وہ ہارڈ ٹاپ جیپ اپنی بیج دج کے اعتبار سے بادی النظر میں کسی دفاعی ادارے سے وابستہ معلوم ہوتی تھی۔ ہمیں اس میں سوار ہونا دیکھ کر شیر شاہ اس وہم کا شکار ہو سکتا تھا کہ آخر کار ہم نے فوجی حکام سے تعاون کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کی یہ غلط فہمی میرے لئے بہت خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ اس سے پہلے مجھے اپنی ذرا سی بے اعتنائی کی وجہ سے سینڈو جیسے دہلوان والے نثار تخت کو اپنے ہاتھوں سے ہلاک کرنا پڑ گیا تھا۔ وجہ صرف اتنی سی تھی کہ اس نے مجھے ڈپٹی کے اس شیر آباد علاقے میں جہاں سے بعد میں حبیب جیوانی کی بیوی، مریم کی لاش دریافت ہوئی تھی، جاتے اور پھر تیزی سے واپس لوٹنے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ اپنی کسی نظر کش کی وجہ سے مجھے سینڈو کے بعد شیر شاہ کے ساتھ بھی وہی سفاکانہ کمائی دہرانے کی ضرورت پیش آئے۔

سلطان شاہ کے چلے جانے کے چند ثانیوں بعد میں بھی اپنا کمر خالی کر کے نیچے آ گیا۔ ایک بار منہ تو جواب مل جانے کے بعد اس بار منہ بہت استغناء پر فکر کے نے نہایت ادب اور خاموشی کے ساتھ میرا حساب بنا کر میرے سامنے رکھ دیا تھا۔



میں نے غلام رسول کے بارے میں سینڈو حبیب جیوانی سے مکمل اجازت لے لی تھی لیکن شری مان سنگھ سے بات کرنے سے

کوئی ایسا حل سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا جس میں غلام رسول زندہ مرہ ہماری ہی تحویل میں رہتا۔

”اس ابھن کا صرف ایک ہی حل ہے۔“ غلام نے سکوت کے بعد سلطان شاہ کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا ”غلام رسول کو شری مان سنگھ کے حوالے کر دیا جائے۔ اس طرح وہ کام ہو جائیگا کہ وہ مانیا والا کے خفیہ قید خانے سے باہر آجائے گا اور شری مان سنگھ کی بھی ایک شرط پوری ہو جائے گی۔ اسی کے ساتھ اسٹیشن ٹانک فورس کی حرکت میں لانا ہو گا۔ جون ہی غلام رسول شری مان سنگھ یا اس کے آدمیوں کے قبضے میں چلا جائے فورس کے جوان چھاپا مارا کر انہیں پکڑ لیں۔ غلام رسول کے ساتھ رکتے ہاتھوں پکڑے جانے کے بعد وہ لوگ الزامات کے خلاف زیادہ مزاحمت نہیں کر سکیں گے۔“

”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔“ ظفر نے خیال لیے میں بولا۔ ”اس طریقہ کار کے پیچیدہ سیاسی اور سفارتی مضمرات بھی ہو سکتے ہیں اور عام طور پر ایسی کارروائیاں حکومت اور قارن آفس کی کلیئرنس کے بعد ہی کی جاتی ہیں لیکن ہم مقامی پولیس کو ساتھ ساتھ کر یہ ہر ایک لے سکتے ہیں۔“

”بنیادی طور پر یہ کارروائی شری مان سنگھ یا اس کے سفارتی عملے کے خلاف نہیں ہوگی۔“ میں نے کہا۔ ”غلام رسول ایک نوپوش اشتہاری مجرم ہے۔ اگر اس کی بازیابی کی مہم میں کچھ لوگ بھی پکڑے جاتے ہیں تو اس پر حکومت یا قارن آفس کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔“

”لیکن شری مان سنگھ نے غلام رسول کو اپنے دفتر پہنچانے کے لئے کہا تو بات بگڑ جائے گی۔“ ظفر کارروائی کرنے سے پہلے کسی کی پہلو کو نظر انداز کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ ”سفارتی عمارت میں داخلہ پولیس تو کیا فوج کے بھی بس سے باہر ہوتی ہے۔ سفارت خانے یا کوئٹہ سٹیٹ سے باہر ہم ہر کارروائی کر سکتے ہیں۔“

”یہ تو شری مان سنگھ سے بات کرنے کے بعد ہی معلوم ہوئے گا کہ وہ کس مقام کا تعین کرتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اس میں میں مامور مرضی نہیں چل سکے گی۔“

مزید کافی بحث و تجویس کے بعد ہم نے فیصلہ کیا کہ شری مان سنگھ سے بات ضرور کرنی چاہئے۔ اس سے کوئی پروگرام طے کر کے بعد ہی ہم اپنا نچہ عمل تیار کر سکتے تھے۔

شری مان سنگھ کی بیوی ہماری قید میں تھی۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ ہی رہتی تھی۔ آزاد دہلی کی وجہ سے شدید ذہنی انتشار میں تھا اس لئے غالب امکان یہی تھا کہ وہ اپنے مسائل سے غائب ہونے کے لئے اپنا زیادہ وقت اپنی دفتری مصروفیات میں گزارا ہو گا۔

میں نے اس کے دفتر فون کیا تو وہ دوسری ہی طرف پھرتی پھرتی آیا۔

”غلام رسول زندہ رہے یا مر جائے، وہ اسے ایک بار اپنی سرزمین پر ضرور لے جائیں گے اور عالمی اخبارات اور نشریاتی اداروں کے حکام نمائندوں کی بیچمیں اس کی نمائش کریں گے۔ وہ زندہ رہا تو اس سے کوئی زہریلا بیان دلوائیں گے۔ اور وہ مر گیا تو اسے شدید بیمار ظاہر کر کے اس کی لاش دکھائیں گے۔ پھر لاش غائب کر دی جائے گی۔ اس پر ہیمنہ اور غیر انسانی تشدد کی کہانیاں تراش کر اس کی بدترین حالات کا ڈھنڈورا پیٹا جائے گا اور وہ لوگ اس کی موت کا راز چھپا کر اس کے نام سے ایک گھنٹائی مہم کا آغاز کریں گے جس کا کوئی توڑ نہیں کیا جاسکے گا۔ ہمارے ملک میں موجود عناصر غلام رسول کے نام سے چلائی جانے والی اس مہم کو خوب اچھالیں گے جس کے نتیجے میں حالات کوئی بھی خطرناک موڑ لے سکتے ہیں۔“

ظفر کی باتیں سن کر میرا دماغ چند لمحوں کے لئے سن ہو کر رہ گیا۔

سلطان شاہ کی سطحی بحث کے برعکس، ظفر نے بالکل ہی نئی اور چونکا دینے والی بات کی تھی جو بہت زیادہ ترین قیاس تھی اور میرے پاس اس کا کوئی توڑ نہیں تھا۔

”مرہ انہیں کو زندہ قرار دے کر ان کے نام سے مہم جوئی کا امکان تمہارا قیاس ہے یا کبھی ایسا ہو بھی چکا ہے؟“ میں نے شک کے لئے بے بسی ظفر سے سوال کیا۔

”دینا کے مذہب ملکوں میں ایسا کم ہی ہوتا ہے۔ تیسری دنیا کے کئی ممالک میں مستقبل عام سربراہان حکومت کی ناممکنی موت کو لوگوں سے کئی کئی دن تک پوشیدہ رکھنے کی کوششیں کی جاتی ہیں تاکہ ملک کو بد امنی اور خاندانہ جنگی سے بچا کر متبادل حکومتیں بنائی جاسکیں۔ لیکن بھارتی حکومت بدینے کے ساتھ کسی بھی ایسے ذرائع سے کبھی ہے۔ ناگا اور میلاو قبائل کے علاوہ سکھوں کو اس بارے میں حرج نہ تھا ہو سکتا ہے۔ بھارتی حکومت اپنے ہاتھ آئے ہوئے ہر کارڈ کو کھینچے پر کھینچ رہی رہتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس معاملے میں وہ ہم سے ذرا سی بھی رعایت سے کام نہیں لیں گے اور سندھ میں جتنی پر عمل چھوڑے گی ہوسکتی ہوگی کوئی نہ کوئی مل تو ہونا ہی چاہئے۔“

”یہ بہت ابھن ہوئی صورت حال ہے لیکن ہم سر جوڑ کر کوئی راہ نکال سکتے ہیں۔ اگر شری مان سنگھ نے غلام رسول کا معاملہ تمہارے سپرد نہ کیا ہو تو اس کا سیدھا معاملہ یہ تھا کہ ہم مانیا والوں کو دھوکا دے کر غلام رسول کو ان کی تحویل سے نکال کر اپنے قبضے میں لے لیتے لیکن اب ایسا نہیں کیا جاسکتا۔“

اس معاملے میں غلام رسول کی ذات ملوث تھی اس لئے میں بہت کمزور پوزیشن میں تھا۔ دویم یہ کہ ظفر کے دلائل نے مجھے بھارتیوں کی بدینے کے بارے میں قائل کر دیا تھا اس لئے میں اس معاملے کا

”لیکن میرے بھی کچھ مسائل ہیں جن کی وجہ سے میں زیرِ زمیں چلا گیا ہوں۔ وہ مجھ تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہو سکے گی۔ تمہیں اس کو میرے حوالے ہی کرنا ہوگا۔“
”اپنا فون نمبر دے دو۔ اس بارے میں صح بات کر لیں گے۔“
وہ بولا۔

”میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں زیرِ زمیں ہوں اس لئے میرے ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں۔ میں تمہیں اپنا کوئی فون نمبر نہیں دے سکتا۔“

”ٹھیک ہے۔ پھر تم صبح نو بجے فون کر لیتا۔ لیکن یہ یاد رکھنا کہ غلام رسول کو مقررہ مقام پر اتارنے کے بعد تم ایک لمحے کے لئے بھی وہاں نہیں رکھو گے۔“

”تم بے فکر رہو۔ میں بلاوجہ کسی جگہ ٹانگ نہیں اڑاتا۔ اور ہاں، تم نے یہ نہیں بتایا کہ تمہارے سر کے زخم کا کیا حال ہے؟“
”وہ معمولی سی ضرب تھی۔ تم نے اپنے آدمیوں سے اس بارے میں باز پرس کی تھی؟“

”ہاں، انہیں تم سے کوئی پراخاش نہیں تھی۔ تم پر سنگ زنی کرنے والا کوئی اور ہی تھا۔“

اس سے گفتگو اچیکر فون پر ہوئی تھی اس لئے غفر اور سلطان شاہ نے دونوں طرف کے مکالمات سنے تھے اور ان دونوں ہی کی رائے تھی کہ شری مان سنگھ اول درجے کا عیاد اور ہوشیار آدمی تھا جو خود کو کسی غیر ضروری خطرے میں الجھانے کی حماقت نہیں کر سکتا تھا۔

غلام رسول کو پہپائی دے کے مقررہ مقام تک پہنچانے میں میرا کوئی کردار نہیں تھا۔ شری مان سنگھ کی ہدایت کے مطابق غلام رسول کو ٹھیک گیارہ بجے کلکتہ، مہاراجا لے موڈ پر چھوڑ دیا تھا۔ شری مان سنگھ کے آدمی مقررہ وقت پر وہیں کہیں قریب وجوہ میں موجود رہے اور میدان صاف دیکھ کر اسے وہاں سے لے جاتے۔ میرا کام صرف اتنا تھا کہ شیر شاہ کو فون کر کے ہدایت دیتا اور وہ گیارہ بجے غلام رسول کو پہپائی دے پر چھوڑ دیتا لیکن ظفر کا کام خاصا پیچیدہ تھا۔

اگر اس کے آدمی مقررہ وقت پر جائے واردات پر پہنچنے تو یہ ممکن تھا کہ شری مان سنگھ کے آدمیوں کی نظروں میں آجائے اور وہ لوگ خطرہ بھانپ کر غلام رسول کے قریب بھی نہ پہنچتے اس سلسلے میں ضروری تھا کہ وہ فوری طور پر موقع پر پہنچ کر اپنی کمین کاہن قائم کر لیتے تاکہ انہیں مقررہ وقت پر بحر میں پروا دیا بولنے میں آسانی رہتی اور ان کا حریف بے خبری میں مارا جاتا۔

ظفر اس پروگرام سے اتفاق رائے ظاہر کرنے کے بعد مقررہ مقام کی پیشگی تاکہ بندی کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا اور میں نے شیر شاہ سے فون کا سلسلہ ملا لیا۔

”مبارک ہو۔ تمہارے مصائب ختم ہونے کی باری ابھی

”مبارک ہو، میں نے تمہارا آدھا کام سرانجام دے کر خود کو آزاد کیا واپس کا حق دار بنا لیا ہے۔“ اس کی آواز پچانتے ہی میں نے گر بجوٹی کے ساتھ کہا۔

”کس آدھے کام کی بات کر رہے ہو؟ ملا سرکار یا غلام رسول؟“ اس نے سوال کیا تو اس کی آواز میں خوشگوار حیرت رہی ہوئی تھی۔

”غلام رسول۔“ میں نے کہا ”وہ ابھی اور اسی وقت اسے میرے پر کرنے کے لئے تیار ہیں۔“

”ہاں؟ اس کی تحسین آمیز آواز ابھری۔“ اس کا مطلب ہے کہ تمہارے بارے میں میں نے جو کچھ سنا ہوا ہے وہ بے بنیاد نہیں ہے۔ تم واقعی کام کے آدمی ہو۔“

”کون تو میں ابھی غلام رسول کو تمہارے دفتر پہنچا دوں؟“ میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ کہا۔

”ہرگز نہیں!“ اس کی بوکھلائی ہوئی آواز ابھری ”بھول کر بھی ادھر کا رخ نہ کرنا۔ اس طرح سارا کھیل چھٹ ہو کر رہ جائے گا۔ تم اس وقت شر کے کس حصے میں ہو؟“

”میں بہادر آباد سے بول رہا ہوں۔“ میں نے معنی خیز نظروں سے ظفر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اور غلام رسول کہاں ہے؟“ اس نے تجسس لہجے میں انگھا سوال کیا۔

”وہ جہاں بھی ہے، مختصر ترین فوس پر شر کے کسی بھی حصے میں پہنچایا جاسکتا ہے۔“

”پھر تم اسے پہپائی دے پر کلکتہ، مہاراجا لے موڈ پر پہنچاؤ۔“ چند ثانیوں کی پرخیاالی خاموشی کے بعد شری مان سنگھ کی آواز ابھری۔

”سے لینے کے لئے تم خود آؤ گے؟“ میں نے سوال کیا۔
”کوئی بھی آسکتا ہے۔ اس وقت نو بجے ہیں۔ تم ٹھیک گیارہ بجے اسے مقررہ مقام پر اتار کر لوٹ آنا۔“

”اس دیرانے میں؟“ میں نے حیرت سے پوچھا ”وہ بیمار اور زخمی ہے۔ وہ تھوڑی دیر تک بھی بے یار و مددگار پڑا رہا تو اس کی حالت بگڑ سکتی ہے۔“

”تم فکر نہ کرو۔ اس کی سلامتی ہمیں تم سے زیادہ عزیز ہے۔“
”شاید تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں ہے جو اتنی رازداری برت رہے ہو۔“

”اعتماد نہیں بلکہ یہ ہمارا طریقہ کار ہے۔ ہم غیر ضروری خطرات مول لینے سے گریز کرتے ہیں۔“

”پھر غزالہ مجھ تک کیسے پہنچے گی؟“ میں نے بے تابی ظاہر کرتے ہوئے پوچھا۔

”وہ اس شہر میں اجنبی نہیں ہے۔ ہم اسے ہا کر دیں گے۔ وہ خودی تم تک پہنچ جائے گی۔“

ہے۔ میں نے رابطہ ہوتے ہی کہا۔

”میں ہر حال میں خوش رہنے کا عادی ہوں، باس۔“ اس کی سعادت مندانہ آواز ابھری۔ ”مجھے تو قیدی پر آج کی رات بہت بھاری نظر آ رہی ہے۔ اس کا سانس رک رک کر چل رہا ہے۔ اس پر غشی کی حالت طاری ہے لیکن وہ ہر سانس کے ساتھ دردناک آوازوں میں گرا رہا ہے۔ ایک بار اس کی آنکھوں کی پتلیاں بھی پھر مچی تھیں۔ میں پریشان ہو گیا تھا لیکن استاد قادر نے بتایا کہ موت آنے سے پہلے آدمی کی ناک کا پائنا ٹیزھا ہو جاتا ہے۔ کسی کو اپنے سامنے سبک سبک کر مرنے ہونے دیکھنا واقعی بہت دل گردے کا کام ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی جان کسی خاص چیز میں اٹکی ہوئی ہے ورنہ اسے اب سے بہت پہلے مرنا چاہیے تھا۔“

”وہ ہمارے پاس نہیں مرنا چاہتا۔“ میں نے بے رحمانہ لہجے میں کہا۔ ”اس طرح چیف کی مشکل آسان ہو جائے گی۔ اور تم بھی شکم کی نیند سو سکو گے۔“

”تو کیا اس کے بارے میں کوئی فیصلہ ہو گیا ہے؟“ اس کی آواز سے حیرت عیاں تھی۔

”اسے گیارہ بجے کلین معمار والے موڑ پر چھوڑ دو۔ تمہارا کام ختم ہو جائے گا۔“

”وہاں آبادی میں رات گئے تک رونق رہتی ہے لیکن پہاڑی دے کے اس حصے میں تو گیارہ بجے ہولناک سناٹا پھیل جاتا ہے۔ قیدی اپنے بیروں پر کھڑا ہونے کے بھی قابل نہیں ہے۔ ہم اسے وہاں ڈال آتے تو آواز دے کر ہی اس کے لاغر بدن کو شمشیر ڈالیں گے۔“

”ہو سکتا ہے کہ وہاں سے گزرنے والے کسی مال بردار ٹرک کا عملہ اسے دیکھ لے۔“ میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”یہ سب سوچنا ان لوگوں کا کام ہے جو ہمارے بعد اس کی سلامتی کے ذمے دار ہوں گے۔ تمہیں صرف اتنا ہی کرنا ہے جس کی ہدایت کی گئی ہے۔“

”تم بے فکر رہو۔ جو کچھ تم نے کہا ہے اس پر حرف۔ حرف عمل ہو گا لیکن میرے خیال میں اسے موجودہ حالت میں وہاں بھیجنے سے بہتر ہو گا کہ ہم اس کی پیشانی میں بارودی کھڑکی کھول کر اس کی لاش وہاں ڈال دیتے۔ اس طرح اس کی مشکل آسان ہو جاتی۔“

”تم بیک رہو۔ جو شیر شاہ! میں نے خشک لہجے میں اسے وارننگ دی۔ ”کیا تم بھول گئے کہ پچھلے چھتیس گھنٹوں سے چیف کی کیا حالت تھی؟ اس کی حالت جیسی بھی ہو، اہم ترین بات یہ ہے کہ اسے ہمارے قبضے میں نہیں مرنا چاہیے۔ اسی وجہ سے میں نے تم کو ڈوکر کے یہ بندوبست کیا ہے۔“

”سوری، باس!“ اس کی آواز یک بیک معذرت خواہانہ ہو گئی۔ ”غلام رسول کی ہمدردی میں چیف کی ضرورت میرے ذہن سے معدوم ہو گئی تھی۔“

”اپنی حدود کا خیال رکھو گے تو ایسی لغزش نہیں کرو گے۔“ میں نے سر دلیجے میں کہا۔ ”جس یہ یاد رکھنا کہ تمہارا آج رات کا سب سے اہم اور ضروری ہے۔ اس میں ذرا سی بھی کوتاہی کی گنجائش نہیں ہے۔ اس کام پر ہم سب کے مستقبل کا بھی دار و مدار ہے۔“

میں اس سے گفتگو کر کے فارغ ہوا تو سلطان شاہ نے خردی کی دیر کی تلاش میں گئے ہوئے دونوں افراد کچھ سستی خیز خبروں کے ساتھ لوٹ آئے تھے لیکن غفلت نے اس وقت غلام رسول والے قصبے کو ہریات پر مقدم رکھا ہوا تھا اس لئے اس نے ان خبروں پر زیادہ دھیان نہیں دیا تھا۔

ان دونوں کو تلاش کرنے میں مجھے زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ وہ لان پر لگی ہوئی پھولداری کے باہر ایک بچہ بیٹھے اپنے ساتھیوں سے گپ شپ میں مصروف تھے۔ ایس بی ایف کا لیڈر غلام رسول کو اول خان کے معتد دوست اور ساتھی کی حیثیت سے جانتا تھا۔ جو لوگ نئے تھے وہ بھی یہ جان چکے تھے کہ غفلت ہماری ضرورت سے زیادہ ناز برداری کر رہا تھا اس لئے ہمارے پیچھے ہی وہ سب اپنی باتیں اور حوری چھوڑ کر غاموش ہو گئے۔

میں ان دونوں میں سے ایک کو اپنے ساتھ لے کر غفلت کے دفتر میں آیا۔ غفلت اس وقت بھی عمارت کے کسی اور حصے میں مصروف تھا اس لئے مجھے اس شخص سے مکمل کربات کرنے کی آزادی تھی۔ تمی اور میں خائن کی بنا پر اپنی بے لگ ابگ رائے قائم کر سکتا تھا۔

ہوٹل کے رہائشی رستہ میں دیر الانیڈ کے نام سے کسی صمان کی آمد کا اندراج نہیں مل سکا تھا۔ نہ ہی ان اوراق میں سوزی کا نام تھا البتہ دیر کی تصاویر دکھانے پر پتا چلا کہ وہ ہوٹل کی مقبلی سمت کی دوسری منزل کے ایک کمرے میں مقیم تھی۔

وہ کمرہ حاصل کرنے کے لئے دیر نے سبز قبیلہ کلک کا نام استعمال کیا تھا۔ اس ہوٹل کے کلرک کو شاید دیر کا چہرہ بھی یاد نہ رہتا لیکن اس نے مقبلی حصے میں کمرے کا مطالبہ کر کے اسے خاصا تنگ کیا تھا جس کی وجہ سے کلرک کو دیر کی شکل یاد نہ آئی تھی۔

دیر نے وہ کمرہ اسی صبح حاصل کیا تھا لیکن جب ایس بی ایف کے افراد نے خود کو خفیہ پولیس کے کارندے ظاہر کر کے وہ منتقل کرنا کھلوا دیا تو وہاں دیر کی موجودگی کی کوئی علامت باقی نہیں تھی۔ شاید وہ دوسرے کو غفلت اور کلار کی ملاقات کا منظر دیکھنے کے بعد ہی وہاں سے کوچ کر گئی تھی۔ ہوٹل والوں کو وہ کمرے کی بد میں ایک یوم سے زیادہ کی رقم چھٹی دے چکی تھی اس لئے اس نے اپنی روانگی کا اندراج کرانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ کلرک کا خیال تھا کہ شاید دیر رات گئے ہوٹل میں لوٹ آئے گی لیکن ایس بی ایف والے جانتے تھے کہ انہیں جس کسی کے پیچھے لگا جانا ہے وہ چھلاوے سے کم نہیں ہوتا۔

دیر نے ہوٹل کے رجسٹر میں اپنے پاسپورٹ کے کوائف درج

میں اپنا ایسا پتہ کیوں چھوڑا جس پر اس کے پائے جانے کے قوی امکانات تھے۔ اس کے لئے سہل راستہ یہ ہوتا کہ وہ ہوٹل میں اپنا کوئی فرضی پتہ درج کراتی اور پھر انسانوں کے بے کراں سمندر میں کہیں بھی غائب ہو جاتی اور ہم اس کے لئے اپنا سرہینے رہ جاتے۔ اسٹیشن ٹائمک فورس کے اس تجربے سے تباہ خیال کے بعد مجھے ظفر سے بھی مختصر تباہ خیال کرنے کا موقع ملا اور مجھ پر اس کی سوچ واضح ہو گئی۔

اس کا خیال تھا کہ اگر ویرا اس وقت ڈی میلو نیلی کے ساتھ موجود تھی تو کسی پھیر چھاڑ کا آغاز ہونے تک اسے وہیں رہنا چاہئے تھا اس لئے وہاں بعد میں بھی کارروائی کی جاسکتی تھی۔ دوسری مجبوری یہ تھی کہ ظفر ویرا کے خلاف کی جانے والی کارروائی کی عمرانی بذات خود کوئی چاہتا تھا اور اس کے لئے بیک وقت دو مقامات پر موجود رہنا نامکن تھا اس لئے اس نے ویرا کے خلاف کارروائی کو اپنے فارغ ہونے تک مؤخر کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ دیے بھی ویرا نے کارا کی معرفت دئے گئے تحریری پیغام میں اگلے دن دو بجے فون کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اس وقت تک صورت حال میں کوئی نمایاں تبدیلی متوقع نہیں تھی اور وہ کام بعد میں کیا جاسکتا تھا۔

شرعی مان سمجھ نے غلام رسول کو سہرائی دے پر پہنچانے کے لئے دو گھنٹے کا وقت دیا تھا جو تیزی سے گزر آ جا رہا تھا اس لئے ظفر نے تیار یوں کی رفتار بھی تیزی کی ہوئی تھی۔

آخر کار دو گاڑیوں پر مشتمل ایک چھ نفری کارواں سراب گونڈھ کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس قافلے میں میرے اور ظفر کے علاوہ اسٹیشن ٹائمک فورس کے چار کمانڈوز شامل تھے جو کسی بھی کارروائی کو برق رفتاری سے پایہ تکمیل تک پہنچانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ان میں سے دو نے گاڑیوں کو چلانے کی ذمہ داری سنبھالی ہوئی تھی۔ سلطان شاہ کو اس مہم میں شریک نہیں کیا گیا تھا۔

دو گاڑیوں میں کل چھ نفوس سوار ہونے کی وجہ سے خاصی جگہ موجود تھی لیکن ظفر نے وہ جگہ غلام رسول اور متوقع قیدیوں کے لئے خالی رکھی تھی۔

شرعی سڑکوں پر برق رفتاری سے سفر کرتے ہوئے ہم لوگ جلد ہی سراب گونڈھ کے علاقے سے گزر گئے اور پھر سہرائی دے کا وہ مقام بھی گھبرا جہاں بائیں طرف سے ایک پختہ سڑک گلشن معمار کی طرف جاتی تھی اس سڑک پر بجلی کے کھمبے لگے ہوئے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ وہاں انسٹریٹ لائٹس بھی موجود رہی ہوں لیکن اس وقت وہاں اندھیرے کا راج تھا۔ اسی راستے پر کچھ فاصلے پر کثیر المنزل رہائشی عمارات کے فلیٹوں میں جلتے والی روشیاں جگمگاری تھیں۔

وہ سب اپنے کام میں مبتلا رہے۔ دونوں گاڑیاں رکنے تک

سرا نے کے بجائے ایک مقامی پتہ درج کرا دیا تھا اور کلرک کو بتایا تھا کہ اس کے جملہ سفری کاغذات مسز اور مسز ڈی میلو کی تحویل میں تھے اور وہ دونوں بد قسمتی سے یہاں شکرے ہوئے تھے۔

اس کا وہ انداز اس قدر معصومانہ اور بے ساختہ تھا کہ کلرک نے اس پر اعتبار کر لیا۔ دیے بھی وہ ہوٹلوں کے لئے مندرے کا زمانہ تھا اور ہر انتظامیہ کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ ان کے ہوٹل کی حدود میں قدم نہ بچھنے والا مسافر ان ہی کا مسمان ہو جائے اس لئے ویرا کو وہاں کرا حاصل کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔

اس سے آگے کی کمانی زیادہ دلچسپ اور سنسنی خیز تھی۔ ڈی میلو نیلی کا پتا ڈنٹس کے متحمل رہائشی علاقے کا تھا۔ وہ سراغ ملنے پر ایس بی ایف والوں نے ادھر کا بھی چکر لگانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ گیس کھینے کے کارکنوں کے روپ میں گیس لیک ہونے کی شکایت کی دیکھ بھال کے بہانے وہاں پہنچے تو مسز ڈی میلو اپنے سرسبز لان پر ایک سفید فام عورت کے ساتھ کچھ لکھنے پڑھنے میں مصروف تھے۔ چرتاک بات یہ تھی کہ وہ عورت ویرا لائیڈ کے علاوہ کوئی اور نہیں تھی۔

وہ دونوں گیٹ کے ساتھ 'احاطے کی دیوار پر لگے ہوئے گیس میٹر کی دیکھ بھال کے بعد واپس لوٹ آئے۔ ان کی ڈی میلو ویرا سے کوئی بات چیت نہیں ہوئی لیکن اس احاطے میں چند منٹ گزارنے کے بعد ان دونوں کو فرداً فرداً تعین کامل تھا کہ انہوں نے وہاں ویرا ہی کو دیکھا تھا۔

ان کی لائی ہوئی وہ اطلاع اس امر کی متقاضی تھی کہ ڈی میلو نیلی کی قیامگاہ پر فوری سی وھاوا بولا جاتا۔ اس طرح نہ صرف ویرا گرفت میں آسکتی تھی بلکہ اس سے جہانگیر کے مقوی بیٹے کی بازیابی کے بارے میں پیش رہا معلومات حاصل کی جاسکتی تھیں۔

لیکن دوسری طرف غلام رسول، شرعی مان سمجھ اور غزالہ کی بازیابی کا معاملہ تھا جو بہت اہم اور فوری نوعیت کا تھا۔ اگر میں غلام رسول والے معاملے کو چھوڑ کر اپنی توجہ ویرا کے مکان کی طرف مرکوز کرنا چاہتا تو پوری ذہنی یک سوئی کے ساتھ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا جب کہ ویرا ایک معزز شرعی کے مکان میں پناہ گزین تھی جہاں سے اسے برآمد کرنے کے لئے باقاعدہ منصوبہ بندی اور ایس بی ایف کی بھرپور مدد کی ضرورت تھی۔

جہاں تک جہانگیر کے بیٹے کی بازیابی کا تعلق تھا تو اس کی اہمیت اپنی جگہ پر مسلم تھی لیکن اطمینان کی بات یہ تھی کہ ایس بی ایف کی دو نفری جماعت اس کے بارے میں کھوج لگانے کی مہم پر نکل ہوئی تھی۔ ان کی کامیابی کا سو فیصد امکان نہ ہونے کے باوجود یہ امید ضرور تھی کہ وہ کچھ نہ کچھ معلومات ضرور لے آئیں گے اور شاہد ویرا کے تعاون کے بغیر ہی اس بچے کا سراغ لگایا جاسکتا۔

میں ویرا اور اس کی نفرت سے بخوبی واقف تھا۔ میرے ذہن میں یہ بات بھی طرح کلک رہی تھی کہ اس نے ہوٹل کے ریکارڈ

اسی کو چوتھی رہے گی۔ اس لئے مجھے اس بحث سے الگ ہی رکھو تو
بہتر ہے گا۔“

”یہ نامکن ہے۔ آج اس نے تمہیں رتین جھڑی کے سائے
میں کھارا سے لٹے دیکھ لیا ہے۔ تم شرافت سے راہ راست پر نہ
آئے تو وہ تمہیں اغوا بھی کر سکتی ہے۔“

ہم اسی نوک جھونک میں وقت گزارتے رہے۔ جب ساڑھے
دس بجے تک بھی وہاں کوئی مشتبہ نقل و حرکت نظر نہیں آئی تو مجھے
شبہ ہونے لگا کہ کہیں شری مان سنگھ نے آخری لمحات پر اپنا پروگرام
یہ نہ بدل دیا ہو یا پھر اس کے آدمی ہم سے بھی پہلے وہاں آچکے ہوں
اور اپنے مورچوں میں چھپے، ابتدا ہی سے ہماری نقل و حرکت کی
نگرانی کر رہے ہوں۔

شرکی طرف سے آنے والی ہر گاڑی کی تیز روشنی کی وجہ سے
یہ اندازہ لگانا دشوار ہوتا تھا کہ وہ کس ساخت اور رنگ کی گاڑی
ہے۔ ان کے آگے نکلنے کے بعد ہی ان کو تفصیلی طور پر دیکھا جاسکتا
تھا اس لئے ٹھیک گیارہ بجے وہاں جو گاڑی آئی اس کے ہیڈ لیمپس
کے درمیان فاصلے اور ان کی زمین سے بلندی کی پتہ صرف یہ
اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ کوئی کار ہے۔

وہ کار سپرائی وے سے اتر کر تھاموار راستے پر پائیس طرف
گھومی تو میں نے پہچان لیا کہ وہ ٹریڈ لائن کی گاڑی تھی۔ گلشن معمار
جانے والی ذیلی سڑک کے کنارے وہ کار چند ثانیوں کے لئے رکی اور
اندھیرے میں چند ہیولوں نے سہارا دے کر کسی وزنی شے کو باہر
نکالا۔ تمام سائے ایک بار نیچے جھکے پھر سیدھے ہو کر کار کی نشستوں
میں غائب ہو گئے۔

لحہ بھر بعد ہی وہ نیلی کار تیز رفتاری کے ساتھ شرکی طرف
واپس چلی گئی۔

غیر ارادی طور پر میری نگاہ اپنی پوسٹ واپج کے ریڈیم ڈائل کی
طرف گئی تو وہاں سونیاں گیارہ بجنے کا اعلان کر رہی تھیں جس کا
مطلب تھا کہ شیر شاہ نے اپنی ذمے داری نہایت خوش اسلوبی کے
ساتھ مقررہ وقت پر پوری کر دی تھی۔

شاید اس وقت غلام رسول کی حالت بہت اتر چکی ہو کہ وہ نیلی
کار کے چلے جانے کے بعد وہاں کوئی حرکت نظر آ رہی تھی اور نہ ہی
کوئی آواز تھی۔ وہ شاید زمین پر پڑا ہوا تھا کیونکہ اندھیرے میں پہلے
زمین پر کسی کیسے بولے کا وجود بھی مشغول تھا۔

جال میں چار لگایا جا چکا تھا اور شکار چارے کے لالچ میں کسی
بھی لمبے جال پر گر سکتا تھا۔ وقت دھیمے دھیمے گزر رہا تھا لیکن وہاں
ہر طرف یکسانیت کا راج تھا۔

اس اعصاب شکن ماحول میں مزید پندرہ منٹ گزر گئے تو ظفر
کے لئے وہاں بیٹھے رہتا محال ہونے لگا ”پتا نہیں کیا ہو رہا ہے۔ میں
سننے کے بل آگے بڑھ کر دیکھتا ہوں کہ غلام رسول زندہ ہے یا
مرچکا ہے۔ ابھی تک اس کی کوئی کراہ بھی نہیں سنائی دی ہے۔“

ان کی تجربہ کار نگاہوں نے اپنے لئے کہیں گاڑی تلاش کر لی تھیں۔
ان دنوں وہاں بڑے قطروالی لائسنس ڈالنے کے لئے کام ہو رہا تھا
اس لئے کمری ٹالیوں کے ساتھ ہی مٹی کے بے جھگم انبار لگے ہوئے
تھے۔ ان کے ساتھ ساتھ بڑے قطروالے، نگرے سٹ سے بنے ہوئے
ایسے پائپ جن میں آدمی آرام سے بیٹھ سکے موجود تھے۔

ان چاروں کے کودتے ہی ایک گاڑی ظفر نے سنبھالی اور
دوسری میرے حوالے کر دی گئی اور ہم دونوں وہ گاڑیاں قدرے
آگے نکال لے گئے جہاں ان کا دیکھا جانا آسان نہیں تھا۔

گاڑیوں کی اوٹ میں پوزیشن لینے کے بعد میں نے اپنی پوسٹ
واپج پر نگاہ ڈالی تو وہاں دس بیٹھے میں صرف چند منٹ رہ گئے تھے۔

میرا خیال تھا کہ شری مان سنگھ یا اس کے آدمی مقررہ وقت
سے پہلے وہاں آجائیں گے تاکہ تمام کارروائی اپنی نظروں سے دیکھ
سکیں لیکن وقت دھیمے دھیمے گزرتا رہا اور وہاں بدستور سناٹا چھایا
رہا۔ اس دوران میں اندر جانے والی لگاؤ کا گاڑیوں کے علاوہ ذیلی
سڑک پر کوئی ٹریفک نہیں تھا۔ سپرائی وے پر دو طرفہ ہماری ٹریفک
رواں تھا لیکن ہم ایسی جگہ پر چھپے ہوئے تھے جہاں شرے سے جانے
والے ٹرکوں وغیرہ کی تیز روشنیوں کی رسائی نہیں تھی۔

”آج کل شر میں گاڑیوں کی چیکنگ ہو رہی ہے۔ اگر غلام
رسول کو لانے والی پائری راستے میں دھری گئی تو ہماری یہ رات بیس
برباد ہو جائے گی۔“ ٹھوڑی دیر بعد ظفر بڑبڑایا۔

”وہ لوگ چالاک ہیں۔ غلام رسول کو پیار ظاہر کر کے نکل
آئیں گے۔ شر میں گشت کرنے والی پولیس پارٹیوں کو اس کی
تصاویر فراہم نہیں کی گئی ہوں گی۔“ میں نے کہا۔

”اخبارات میں اس کی اتنی تصاویر چھپتی رہی ہیں کہ شرکی
پولیس کو تو اس کے خدو خال یاد ہو جانے چاہئیں لیکن یہاں لوگوں
کو فرض نبھانے سے زیادہ پیسے بٹورنے سے دلچسپی ہوتی ہے۔“

”پولیس ہی نہیں، ہر ٹھکے کا کم و بیش یہی حال ہے“ میں نے
تسلی سے کہا ”جس کا بس چلتا ہے وہ بھوکے گدھے کی طرح لوگوں کو
نچنے کھسٹنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ پولیس والوں کا دن رات
لوگوں سے واسطہ رہتا ہے اس لئے وہ زیادہ ہی بدنام ہو رہے ہیں۔
خدا کرے کہ آج کوئی گزیر نہ ہو۔“

”یہاں کوئی پیش رفت نہ ہو سکی تو مجھے افسوس رہے گا کہ میں
نے دیرا کے معاملے پر توجہ کیوں نہیں دی“ وہ بولا ”اس کی سرکوبی
بھی کچھ کم اہم نہیں ہے۔“

”ظفر نہ کرو، وہ تمہارے عشق میں گرفتار ہو گئی ہے“ میں نے
ہنستے ہوئے کہا ”تم کل دو بجے والی فون کال پر اسے متاثر کرنے میں
کامیاب ہو گئے تو وہ خود ہی تمہارے پاس چلی آئے گی۔“

”عشق اسے مجھ سے نہیں، تم سے ہے“ وہ کھسپائے ہوئے
لہجے میں بولا ”اول تو وہ تمہیں مارنے سے گریز کرتی رہی ہے۔ اگر
اس نے غلطی سے تمہیں مار بھی دیا تو وہ تمہاری مٹی بنا کر دن رات

ہمارے ساتھ آئے ہوئے کمانڈوز کے پلے مقصد ملک
بھیار موجود تھے لیکن ان میں کوئی روپیہ گن نہیں تھی اس لئے یہ
تجسّس دشوار نہیں تھا کہ وہ فائر ایمرینس سے کئے گئے تھے لمحہ بھر
بعد کیے بعد دیگرے دو گولیاں چلیں۔ وہ دونوں بڑے بورے پستول
کے فائر تھے اس بار ایمرینس کے ہیڈ لیمپس کو نشانہ بنایا گیا تھا
کیونکہ چمکانے کی آوازوں کے ساتھ ہی وہ بتیاں ناکا ہو گئیں۔
اندھیرا ہوتے ہی شاید کسی کو بھاگ نکلنے کا موقع مل گیا اور
زمین پر کئی افراد کے دوڑتے ہوئے قدموں کی دھمک گونجنے لگی۔
ساتھ ہی کوئی کسی کو لاکار بھی رہا تھا۔

اسی لمحے ایمرینس اچانک حرکت میں آئی۔ اس کا انجن
ابتدا ہی سے جاگ رہا تھا۔ اس بار ایمرینس کی دھیمی بارنگ
لائٹس کے انکسار میں ایک سایہ نظر آیا۔ وہ ہماری بے خبری میں نہ
جانے کس وقت ایمرینس سے رینگ کر باہر نکلا تھا اور وہاں پھیلی
ہوئی افرا تفری سے لاندہ اٹھا کر غلام رسول کو اپنے کندھے پر لادے
سفید گاڑی کی طرف بڑھ رہا تھا۔

وہ تمام واقعات اس قدر تیزی اور تواتر کے ساتھ رونما ہوئے
کہ ہم دونوں ہی اپنی جگہ جمجھکے ہوئے رہ گئے۔ کچھ کچھ میں ہی نہیں
آ رہا تھا کہ وہاں حقیقی صورت حال کیا تھی اور کس کاپلہ ہماری تھا۔
اُن دنوں شرمیں اغوا اور ڈکیتی کی وارداتوں کا خاصا زور تھا
اس لئے قریب ہی سپرہالی وے سے گزرنے لڑھکے میں پے درپے
فائرزوں سے کوئی رکاوٹ نہیں پڑی تھی بلکہ وہاں سے گزرنے والی
گاڑیوں کی رفتار یک بیک تیز تر ہوئی تھی۔ مخدوش اور غیر یقینی
صورت حال میں کوئی بھی شریف ڈرائیور وہاں رک کر خود کو
ڈاکوؤں اور دہشت گردوں کے حوالے کرنے کا خطرہ مول لینے کے
لئے تیار نہیں ہو سکتا تھا۔

ایمرینس کو حرکت میں آتا دیکھ کر یقیناً ہی میری کھوپڑی پر
جھبی ہوئی برف پھلنے لگی۔

ایس ٹی ایف کے تین کمانڈوز اپنے دو حریفوں کے ساتھ خوں
ریز مقابلے میں اچھے ہوئے تھے۔ چوتھا نہ جانے کہاں غائب تھا۔
سوزوکی ایمرینس والے اس افرا تفری سے فائدہ اٹھا کر غلام
رسول سمیت بھاگ نکلنے کے مؤذم نظر آ رہے تھے۔

میں نے بجلی کی سی سرعت سے اپنی جگہ چھوڑ کر ایمرینس کی
طرف دوڑ لگا دی اور پھر غلام رسول کو کندھے پر لادے ہوئے قوی
البتہ شخص کو ایمرینس کے کھلے ہوئے دروازے تک پہنچانا نصیب
نہیں ہو سکا۔ میری چلائی ہوئی گولی اسے چاٹ گئی اور وہ ایک کمرہ
چھ کے ساتھ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

حالات کا پائنا یکایک ہی پلٹ گیا۔ ایمرینس میں سوار افراد
نے بھانپ لیا کہ انہوں نے وہاں رکے رہنے کی حماقت کی تو وہ
مارے یا پھرنے جا میں گئے۔ انہوں نے ایمرینس کو تیزی سے میں
روڈ پر بھاگ لے جانے کی کوشش کی لیکن ان کا وقت پورا ہو چکا تھا۔

”بچنے رہو!“ میں نے اس کا بازو دبا کر سرگوشیاں لیجے میں
کہا ”اور اندھیرے پر نظریں جمائے کی کوشش کرو۔ ہو سکتا ہے کہ
وہ بھی زمین سے چپک کر پیش قدمی کر رہے ہوں۔“
”سمجھ میں نہیں آتا کہ میرے آدی کیا کر رہے ہیں؟“ ظفر
اضطرابی لہجے میں بڑبڑایا۔

چند ثانیے اور گزر گئے پھر اچانک ہی فضا میں کسی مینڈک کے
ڑانے کی آواز تین مرتبہ ابھری اس کے بعد پھر وہی سکوت چھا گیا
جس میں صرف انجنوں کا ابھرتا اور ڈوبتا ہوا شور گونج رہا تھا۔
”دھرم بھی مکمل خاموشی ہے“ ظفر نے ایک کمراسانس لے
کر کہا۔

”کیا وہ تمہارے آدمیوں کا ٹیکل تھا؟“ میں نے تجسّس لیجے
میں پوچھا۔

”مینڈک کی تین آوازیں خیریت کے لئے ہیں۔ دو آوازوں کا
مطلب خطرناک ہو گا۔“

میری نگاہیں شہر کی طرف سے آنے والے راستے پر جمی ہوئی
تھیں۔ اچانک میں سے سڑک سے ہٹ کر کسی گاڑی کے ہیڈ لیمپس
روشن ہوتے دیکھے جس کا مطلب تھا کہ وہ گاڑی اپنی روشنیاں مکمل
کر کے پہلے سے اندھیرے میں گم ہوئی تھی۔

ہیڈ لیمپس چلتے ہی وہ گاڑی حرکت میں آئی اور تاحسوار کچے
راستے پر اچھلتی ہوئی شاہراہ کے اس حصے پر آئی جو آگے زرخیز
ہونے کی وجہ سے مسدود تھا۔ اس گاڑی کی رفتار اتنی تیز تھی
آٹا ٹانا میں ہمارے قریب آئی۔ گلشن معمار والا موڑ آتے ہی اس
گلد کی رفتار کم ہوئی اور وہ اس طرف محوم گئی جہاں پروگرام کے
مطابق غلام رسول کو موجود ہونا چاہئے تھا۔

تیز روشنی کی چادر کا رخ بدلتے رہیں نے دیکھا کہ وہ کوئی عام
کار نہیں تھی بلکہ سفید رنگ کی سوزوکی ہائی روف ایمرینس تھی
جس کی چھت پر ایمرینس لائٹ اور غالباً سائزن بھی نصب تھا۔

ایمرینس کے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں ہم نے پہلی بار اس
مخص کو دیکھا جو زمین پر بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ ایمرینس کے
رکتے ہی اس میں سے دو آدمی اتر کر آگے بڑھے۔ اسی لمحے کسی
جانب سے یک بیک تین دیو بیکل سائے نمودار ہوئے اور
ایمرینس کے پہلوؤں پر پھیلے ہوئے اندھیرے کی آڑے کر خاموشی
سے ان دونوں پر ٹوٹ پڑے اور ہلک جھپکتے میں ان دونوں کو
دیکھتے ہوئے روشنی سے دور لے گئے۔ غلام رسول کا بے حس و
حرکت بدن جہاں پڑا تھا وہیں پڑا رہا۔

پھر اچانک ہی ایک روپیہ گن چلی آئی بعد دیگرے تین مسلسل
فائر ہوئے لیکن کسی کا بال بھی نہ ہوا کیونکہ فائرزوں کے جواب
میں کوئی بے ساختہ چیخ نہیں ابھری تھی۔ البتہ اندھیرے میں لڑنے
والوں کی غراہٹوں اور چڑھے ہوئے سانسوں کی آوازیں واضح طور
پر سناں۔ ”رہی تھیں۔“

تھے پانچواں بے ہوش آدمی کو اٹھا کر لے جا رہا تھا کہ اسے کسی کی گولی چلت گئی۔
 ”تو کیا پانچواں مر گیا تھا؟“ میں نے قدرے حیرت کے ساتھ سوال کیا۔

”گولی شاید اس کے جسم کے کسی نازک حصے میں لگی تھی۔“ وہ بولا۔

اس کے بعد گاڑی میں خاموشی چھائی مگر میرا ذہن ان ہی واقعات میں الجھا رہا۔

ان کے پانچ میں سے تین آدمی یقیناً مارے گئے تھے۔ بقیہ دو کے بارے میں مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ وہ بھی اپنے بقیہ ساتھیوں کی طرح جنم واصل کر دئے گئے تھے یا بھاگ نکلے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

غلام رسول جیسے قریب المرگ بلکہ نیم مردہ شخص کی خاطر اتنے افراد کی بیعت غیر معمولی بات تھی لیکن مجھے ان کی موت سے زیادہ فکر اس امر کی تھی کہ ان میں شری مان سنگ شامل تھا یا نہیں؟ وہ جس قدر وقامت کا مالک تھا اس کی بنا پر میرا خیال تھا کہ وہ جسمانی شقت اور دھول دھبے کا عادی نہیں تھا۔ اگر وہ ایبوریس ہی میں موجود رہا ہو تو بات دیگر تھی۔

وہ لوگ شری مان سنگ کے سفارت خانے کے ملازمین تھے یا اس نے غلام رسول کے حصول کے لئے شہر کے پیش در بدر معاشوں کی خدمات حاصل کی تھیں؟ یہ بھی ایک اہم سوال تھا کیونکہ اسی کے جواب پر آنے والے واقعات کا دائرہ بڑھتا تھا۔

اس پورے قصے میں اسٹیشن ٹاؤک فورس کا ذکر ہی نہیں آتا تھا بلکہ ظفر نے پیشگی یہ بندوبست کر لیا تھا کہ ساڑھے گیارہ بجے پولیس کی ایک مسلح کشتی جماعت جائے واردات پر پہنچ کر کنٹرول سنبھال لے اور وہاں سے زخمی یا مردہ حالت میں ہاتھ لگنے والے قیدیوں کے حوالے سے ایک کمائی بنالے۔ کمائی میں غلام رسول کا گول مول ذکر ضرور ہوتا اور یہ بتایا جاتا کہ مجرم سپرائی دے کے ویرانے میں مشتبہ انداز میں جمع تھے جنہوں نے پولیس کے لٹکارنے پر فائر کھول دیا۔ خونریز تصادم کے بعد پولیس نے حالات پر قابو پایا تو ان لوگوں کے قبضے میں بدنام سیاست دان غلام رسول بھی موجود تھا جسے پولیس نے اپنی تحویل میں لے لیا۔

وہ پولیس والوں کی ابتدائی کمائی ہوتی جس میں بقیہ رنگ ظفر کی ہدایات کے مطابق بھرے جاسکتے تھے۔

پولیس رپورٹ کی مرطے وار اجرائی کی ضرورت اس لئے سمجھی گئی کہ پوری صورت حال واضح ہونے میں تاخیر ہونے کے سبب سے وہ کمائی صبح کے اخبارات میں شائع نہیں ہو سکتی تھی لیکن ساڑھے گیارہ بارہ بجے تک جاری ہونے والی ابتدائی کمائی سستی فز سرخیوں کے ساتھ اخبارات کی زینت بن سکتی تھی۔

ویسے تو شری مان سنگ کے افسران کو رات کو ۸-۷ طحہ

شاید چوتھا کمائو ایسے ہی کسی وقت کے اختصار میں اپنی کمین گاہ میں چھاپا بیٹھا تھا کیونکہ ایبوریس کی رفتار تیز ہوتے ہی ایک گھنٹا گھنٹا لیکن ہولناک دھماکا ہوا اور ایبوریس کے پرچے اڑنے کے ساتھ ہی اس کے لمبے نئے آگ پھٹا۔

اس واقعے نے مجھے بری طرح بوکھلا کر رکھ دیا اور میں نے واپس فٹری طرف دوڑ لگا دی۔

ظفر ایک گاڑی میں سوار ہو کر اُس کا انجن اشارت کر چکا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے اپنے طلق سے الو کی تیز آواز نکالی اور میری طرف متوجہ ہو گیا۔

”تیزی کے ساتھ گاڑی باہر نکالو! اب یہاں رکنا خطرناک ہو سکتا ہے۔“

دونوں گاڑیاں باہر نکلیں تو مختلف سمتوں سے چاروں کمائو دوڑتے ہوئے ہماری طرف آگئے۔ شاید الو کی چیخ ان کے لئے واپسی کا اشارہ تھی۔

اڑنے والے تین میں سے ایک کمائو بری طرح زخمی اور خون میں نہایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ وہ تینوں ہی فٹری گاڑی میں گھس گئے۔ چوتھا کمائو غلام رسول کے بے حس بدن کو اپنے کندھے پر لاد لایا تھا۔ وہ میری کار میں سوار ہو گیا۔

ہماری دونوں گاڑیاں وہاں سے شہر کی طرف روانہ ہوئیں تو ایبوریس کے چلتے ہوئے ڈھانچے کو دیکھ کر ٹریفک رکنا شروع ہو گیا تھا اور لوگ گاڑیوں سے اتر کر اسی طرف دوڑ رہے تھے۔

ایبوریس میں سوار افراد کے لرزہ خیز انجام کا تصور کر کے میں جھرجھری لے کر رہ گیا۔

”اس کا کیا حال ہے؟“ چند ٹائیوں کے بوجھل سکوت کے بعد میں نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے کمائو سے بھرتائی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

”میں نے اسے اٹھایا تو شاید یہ نزع کے عالم میں تھا۔“ اس کا لہجہ بالکل سرد اور بے جان تھا۔ ”اس نے میرے کندھے پر ہی دم توڑا ہے۔ اس کا بدن تیزی سے ٹھنڈا ہوتا جا رہا ہے۔“

”ایبوریس پر ہم نے ہی پھینکا تھا؟“ میں نے آہستگی سے پوچھا۔

”ہاں!“ اس کا لہجہ پہلے کی طرح سرد اور مشفق تھا۔ ”ہمیں ہدایت دی گئی تھی کہ آنے والوں میں سے کوئی بھی پتھر نہ پائے۔ میں ذرا سی بھی سستی دکھاتا تو وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتے۔ ہم مارنے سے پہلے میں نے انہیں رکنے کی وارننگ دی تھی لیکن ان کی موت آچکی تھی۔ انہوں نے میری وارننگ کی پروا کئے بغیر وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔“

”دین میں کتنے آدمی رہے ہوں گے؟“ چند ٹائیوں کے بعد میں نے پوچھا۔

”آخر میں کل دو آدمی نظر آ رہے تھے۔ دو پہلے ہی اتر گئے

دیکھتے ہی اس نے اپنی ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے دوسری طرف کھٹ لے لی۔

وہ دلبر اور قابل اعتماد دوست تھا۔ ہر رے وقت میں آنکھیں بند کر کے میرا ساتھ دیتا تھا۔ اس کے سہارے کی وجہ سے میں نے بڑی دشوار سمات سر کی تھیں لیکن یہ بھی ایک طے شدہ بات تھی کہ بعض اوقات وہ اپنی عقل کے استعمال میں بخل کر جاتا تھا۔ ایسے مواقع پر میرے ساتھ اس کا رویہ زود حس بوڑھوں جیسا ہو جاتا تھا۔

وہ مجھ سے اس بات پر ناراض تھا کہ میں نے ظفر سے اسے ساتھ لے جانے کے لئے اصرار کیوں نہیں کیا۔ خاصی دیر کی مغز زنی کے بعد میں اسے یہ بات ذہن نشین کرانے میں کامیاب ہو سکا کہ ظفر، اول خان کی طرح بہت زیادہ سادہ لوح نہیں تھا۔ وہ ہر مسئلے پر اپنی جداگانہ رائے رکھتا تھا اور تنہائی طور پر اس کے مطابق کارروائی کرنے میں یقین رکھتا تھا۔ ایسے آدمی سے راز دارا کی بات پر تکرار عموماً بدمزگی کا سبب بن جاتی ہے۔ جب کہ ہم اپنے مخصوص حالات کی وجہ سے اس سے بگاڑ مول لینے کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔

اس موضوع پر مصالحت ہونے کے بعد تازہ دم کے بارے میں گفتگو چمڑی۔

مجھے ابتداء ہی سے اس امر کا ادراک تھا کہ اسپیشل ٹاسک فورس نے شری مان سنگھ کا منصوبہ ناکام بنا کر غلام رسول کو اپنے قبضے میں لے لیا تو شری مان سنگھ اس ناکامی کو میری ہی کسی شرارت سے منسوب کر کے غزالہ کی واپسی کے وعدے سے کھر جائے گا۔

اس بارے میں اگر اور مگر کے ساتھ بہت سی خوش فہمیاں بھی تھیں لیکن میں سلطان شاہ کے اس خیال سے پوری طرح متفق تھا کہ سپہا کی وے پر آنے والے پانچ افراد میں سے ایک کا زندہ بچ نکلنا میرے حق میں ذہر ثابت ہو سکتا تھا۔ اگر وہ پانچواں شخص بھی مارا جاتا تو شری مان سنگھ کبھی بھی یہ نہیں جان سکتا تھا کہ جائے واردات پر درحقیقت کیا ہوا تھا۔ ایسی صورت میں اسے ان ہی کامیوں پر اعتبار کرنا پڑتا جو اخبارات کی زینت بنیں۔ شری مان سنگھ امپریلیٹس میں مارا گیا ہو یا دفر میں رہا ہو، دونوں صورتوں میں بچ نکلنے والا پانچواں آدمی بہت خطرناک تھا۔ وہ شری مان سنگھ یا اس کی ہلاکت کی صورت میں اس کے کسی معتد کو اصل کامیابی سے آگاہ کر سکتا تھا۔ وہاں پیش آنے والے اصل واقعات میں پولیس کا کوئی رول نہیں تھا۔ جائے واردات پر پولیس کی کوئی گاڑی تھی نہ اس کا کوئی باوردی اہل کار۔ جو کچھ بھی ہوا وہ ایس ٹی ایف کے سادہ پوش کمانڈوز کا کارنامہ تھا۔ وہ راز کھل جانے کے بعد میرے لئے واقعی دشواریاں کھڑی ہو سکتی تھیں۔

اسی اثنا میں مجھے خبر ملی کہ میری غیر حاضری میں وہ دور کنی جماعت بھی واپس آچکی تھی جسے جاکیر کے بیٹے کی تلاش میں شہر

ان کا معین ناکامی سے دوچار ہو چکا تھا۔ ان کے پیچھے ہوئے آدمیوں کی گشتی ناکامی کا کھلا اعلان ہوئی۔ شری مان سنگھ بذات خود مہم میں شریک ہوتا تو اسے کچھ بتانے کی ضرورت ہی نہیں تھی لیکن وہ اپنے دفتر میں موجود ہوتا تو اس کا اضطراب اپنے اوپر والوں سے کم نہ ہوتا۔ ان لوگوں کو اخبارات ہی سے یہ علم ہو سکتا کہ حکومت یا خانی انتظامیہ نے اس واقعے پر کیا موقف اختیار کیا ہے اور اس کی روشنی میں وہ اپنا رد عمل ظاہر کرنے کا فیصلہ کرتے۔

اسٹیشن فور پیچھے کے بعد پتا چلا کہ ہڑوئیک سے فائدہ اٹھا کر ہماگ نکلنے والے دو حرفوں میں سے ایک کمانڈوز کے ہاتھوں مارا گیا تھا جب کہ دوسرا بہت چالاک ثابت ہوا اور زخمی ہونے کے باوجود بڑے بڑے پانچوں میں گھس کر کسی ایسی سمت میں نکل گیا جہاں اس کا کوئی سراغ نہیں مل سکا اور دوا لگی کا سیکل ملنے کی وجہ سے کمانڈوز کو اس کی تلاش اور چوری چھوڑ کر واپس آنا پڑا۔

دست بدست جنگ میں ٹوٹ ہونے والے تینوں کمانڈوز زخمی ہوئے تھے۔ دو کے چروں اور جسموں وغیرہ پر معمولی خراشیں آئی تھیں جبکہ تیسرے کے زخم گہرے تھے۔ اس کی نہ صرف ناک کی پٹی ٹوٹ گئی تھی بلکہ اس کے شانے پر کسی تیز دھار آلے کا لہبا زخم بھی آیا تھا۔

ان تینوں کی متفقہ رائے تھی کہ ان کے حریف اتنا زنی یا تا تجربے کار نہیں تھے بلکہ لڑنے بھڑنے کے فن میں قابل رشک نہات رکھتے تھے جس کا توڑ آسان نہیں تھا۔

غلام رسول واقعی مرچکا تھا۔ اس کے زرد کاغذ اور بے نور چہرے پر روح کو لرزادینے والی ہشکار برس رہی تھی۔ اس نے اپنے منگ اور صوبے کے اُن گت خانہ دانوں کو دوسروں کی غلامی کا طوق پہنانے کی منصوبہ بندی کی تھی لیکن وہ خود اپنی آزادی کے لئے لڑتا ہوا ایک تاریک ویرانے میں ہے کسی کی موت مرا۔ اس کی عزت اور ذلت کے درمیان ایک بہت باریک سی حد فاصل تھی۔ وہ مر کر ہمارے قبضے میں آیا تو غدار کی کاٹک اس کے اٹھے کی سیاسی بنا ہوا تھا اور رسوائی اس کا مقدر بن گئی تھی۔ اگر وہ آخری لمحات پر فزوق خانی کی تحویل میں چلا جاتا تو مرنے کے بعد بھی اس کا نام چٹا رہتا۔ ہر عزت اور اعزاز سے نوازا جاتا لیکن قدرت کے فیصلے پیش اٹل اور درست ہوتے ہیں، قوتی اچل کے بے رحم ہاتھوں نے غلام رسول کو وہ موہوم سی حد فاصل عبور کرنے کی مہلت نہیں دی اور وہ جبرت کا نشان بن کر ہمارے قدموں میں آگرا۔

وہ بہت حساس اور سنگین نوعیت کا معاملہ تھا اس لئے ظفر واپس آتے ہی مصروف ہو گیا۔ اسے ہوم آفس کے ذمے داروں سے مل کر جزئیات طے کرنی تھیں اور غلام رسول کے جسد خاکی کو کبھی نہ کبھی ٹھکانے لگانے کا بندوبست کرنا تھا اس لئے میں اسے اُس کے دفتر میں چھوڑ کر جانا بنگر دم کی طرف چل دیا۔

دہاں سلطان شاہ منہ بھلائے آرام وہ بستر پر دراز تھا۔ مجھے

اُس نے اپنے سر کو نفی میں جنبش دی۔ ”والدین کے علاوہ کسی کو بچوں تک جانے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ میں نے اس ادارے کے ایک کلرک سے بات کی تھی۔ اس نے ویرا کی تصویر دیکھتے ہی پہچان لی تھی جس کا مطلب ہے کہ وہ بچہ وہیں موجود ہوا چاہئے۔“

”اس نے تمہیں کچھ اور بھی بتایا ہوگا؟“ میں نے پوچھا۔
”وہ تو بات کرنے پر ہی آمادہ نہیں تھا۔ پانچ سو روپے کا نوٹ مٹھی میں لینے کے بعد وہ تصویر دیکھنے پر آمادہ ہوا تھا مگر ڈر رہا تھا کہ مالکان کو اس بات کا علم ہو گیا تو وہ اسے بیک بنی دو گوش ملازمت سے نکال دیں گے۔ ان لوگوں کو غیر متعلقہ لوگوں سے بچوں کے بارے میں بات چیت کرنے کی ممانعت ہے۔“

”تم نے اُس سے کس زمانے سے بات کی تھی؟“ میں نے اٹھا سوال کیا۔

”میں نے اسے بتایا تھا کہ میں ایک گھر میں ملازم ہوں اور ہماری غیر ملکی مالکن اپنے شوہر سے لڑنے کے بعد اپنے شیر خوار بچے کو ساتھ لے کر گھر سے بھاگ گئی ہے۔ ہمارے مالک کا خیال ہے کہ اس کی بیوی بچے کو کسی فیل ٹائم کیرئیر سینٹر میں ڈال کر خود کسی ہوٹل میں عیش کر رہی ہوگی۔“

میں دل ہی دل میں اس کی حیلہ سازی کی واو دے بغیر نہ رہ سکا۔

”اگر بچہ وہیں ہے تو ہمیں اس کی بازیابی کے لئے فوراً حرکت میں آنا ہوگا۔“ میں نے کہا۔

”میں تیار ہوں۔ لیکن وہ بچہ ہم کیسے سنبھال سکیں گے؟“ اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

”بچے کا باپ ہمارے ساتھ ہوگا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”وہ بچے کو اس کی ماں تک پہنچا دے گا۔ بچے کی جدائی میں وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھی ہے۔“

”لیکن اتنی رات گئے وہاں ملازمین کے علاوہ کون بیٹھا ہوگا؟ وہ لوگ اتنی آسانی کے ساتھ بچے کو ہمارے حوالے نہیں کریں گے۔“ سلطان شاہ بولا۔

”پہلی بار میں وہاں ایک مسکین گھریلو ملازم کے روپ میں گیا تھا۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ ہمارے مالک نے مالکن کا سراغ لگانے پر پانچ ہزار روپے انعام رکھا ہے اسی وجہ سے اسے بھی پانچ سو روپے مل گئے لیکن اب میں کرائم برانچ کے انسپٹر کے روپ میں جاؤں گا۔ مالکان کو سر کے بل چل کر وہاں آنا ہوگا۔“

”بڑے لکھے لوگ عموماً نام اور عہدوں کے رعب میں نہیں آتے۔ اگر وہاں کسی نے تم سے تمہاری شناخت طلب کر لی تو کیا کر دے؟“ سلطان شاہ ہر منی پلو کو ٹھوک بجا کر دیکھنے پر تھلا ہوا تھا۔

ارشاد کے لیوں پر خفیف سی بزرگانہ مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ دریافت کیا۔

کے چائلڈ کیرئیر سینٹر بھیجا گیا تھا۔

ہماری واپسی کے بعد اسٹیشن فور پر بیک وقت متعدد سرگرمیاں شروع ہو گئی تھیں اور ہر شخص ضرورت سے زیادہ مصروف نظر آنے لگا تھا۔ ان سرگرمیوں میں ظفر سب سے پیش پیش تھا کیونکہ کلیدی کردار اسی کا تھا اور اسے فورس سے باہر کے لوگوں سے بھی رابطہ کرنا تھا اس لئے کسی نے بھی اس دورانی جماعت سے اس کی کارکردگی کی رپورٹ لینے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

میں ان لوگوں کی تلاش میں آرام گاہ سے نکلا تو ایک راہداری میں ظفر سے ٹکرائے ہوئے۔

”معاف کرنا میں ذرا مصروف ہوں۔“ اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر بگلت آہستہ میں کہا۔ ”کچھ دیر میں اعلیٰ سرکاری عہدے دار یہاں آنے والے ہیں۔ اس لئے میں شاید صبح سے پہلے فارغ نہ ہو سکوں۔ ارشد اور اکبر بچے کے بارے میں تحقیقات کر کے واپس لوٹ آئے ہیں۔ اگر تم مناسب سمجھو تو ان سے رپورٹ لے لو۔ فارغ ہونے کے بعد ہم آپس میں تبادلہ خیال کر لیں گے۔“

”تم بگلت میں ہو۔ تھوڑی دیر بعد شاید تم سے بات بھی نہ ہو سکے اس لئے یہ بتاتے جاؤ کہ اگر میں کسی فوری کارروائی کی ضرورت محسوس کروں تو ان کو میرے کام آسکے گا۔“

”ارشاد میرا بہت سینئر آدمی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”وہ تمہارے ساتھ ہر طرح سے تعاون کرے گا۔“

وہ ایک دفعہ پھر معذرت کر کے آگے نکل گیا اور میں ارشد کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔

ارشاد اپنے خدوخال سے واقعی ایک خزانہ آدمی نظر آ رہا تھا۔ اس نے نہایت خوش دلی کے ساتھ میرا خیر مقدم کیا اور میری فرمائش پر بے چون و چرا میرے ساتھ چلا آیا۔

اس نے چند گھنٹوں کی قلیل سی مدت میں شہر کے میں سے زائد ادارے کھال ڈالے تھے اپنی تفتیش کے لئے اس نے ان اداروں کے مالکان یا منتظمین کے بجائے نچلے درجے کے ملازمین پر انحصار کیا تھا اور اس کی بھاگ دوڑ کا پتہ یہ تھا کہ ویرا پچھلے روز ایک سرخ و سفید بچے کے ساتھ وہاں دیکھی گئی تھی۔

ہر طرف پھیلے ہوئے ناکامیوں کے گھور اندھیرے میں وہ امید کی پہلی کرن تھی۔

”اس سینئر کام کیا ہے اور وہ کہاں واقع ہے؟“ مجھ سے پہلے سلطان نے سوال داغ دیا۔

”ٹیل اسٹیل کے نام سے سوسائٹی کے علاقے میں چلایا جا رہا ہے۔“ ارشد نے کہا۔

”تم اس بچے کو دیکھ چکے ہو؟“ میں نے پرتشیں لہجے میں دریافت کیا۔

وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری اجازت کے بغیر اپنی زبان بھی نہیں ہلاؤں گا۔ خلاف ورزی کروں تو مجھے جوتے مار کر وہیں دفن کر دیتا۔“

”مگر تمہارے حواس واقعی بحال ہیں تو مجھے پچاس تک گنتی سناؤ۔ اس کے بعد تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کے معاملے پر غور کر سکوں گا۔“ میں نے درشت لہجے میں کہا۔

جناگیر نے بے چوں و چرا فون پر گنتی سنانی شروع کر دی۔ اس جیسے منہ پھٹ اور سرکش دوست کی اس بے بسی نے میرا دل گداز کر دیا۔ وہ چندہ تک پہنچا تھا کہ مجھے اپنی آنکھوں کے گوشوں میں نمی اترتی ہوئی محسوس ہوئی اور میں نے اسے روک دیا۔

”بس کرو اور منہ دھو کر تیار رہو، میں تمہیں لینے آ رہا ہوں۔“ مجھے اپنی آواز بھاری محسوس ہوئی اور میں نے فوراً ہی فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

”کیا بات ہے؟ آج اس نے تمہیں دل گرفتہ کیسے کر دیا؟“ سلطان شاہ نے پوچھا۔

”وقت رفت کی بات ہوتی ہے۔ آج وہ خود بہت دل گرفتہ اور اداس ہے۔ زندگی میں بعض مقامات ایسے بھی آتے ہیں جہاں انسان خود کو بہت حقیر اور بے بس محسوس کرنے لگتا ہے۔ جناگیر آج یہی کیفیت طاری ہے۔ میری ہدایت پر اس نے کئی کندہاں اور مٹی بنے کی طرح رک رک کر گنتی سنانی شروع کر دی تھی۔“

فون سے فارغ ہوتے ہی ہم دونوں اٹھ گئے۔ باہر رونق اور چل پھل تھی۔ ہم دونوں اس بھاگ دوڑ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے باہر پہنچے تو ارشد اپنے ساتھی سمیت اسی جیب کے پاس موجود تھا جس میں ہم اپنے ہوش گئے تھے۔

ہم نے راستے میں جناگیر کے مکان کے بھاگ پر رک کر بارن بجایا تو وہ فوراً ہی ذیلی کھڑی کھول کر باہر آ گیا۔ میری متوقع ناراضی کے خوف سے وہ شاید تیار ہو کر چوکیدار کے کیمین میں ہی آ بیٹھا تھا۔

ارشد اور اکبر جیب کی اگلی نشستوں پر براجمان تھے۔ میں سلطان شاہ کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ جناگیر روانہ کھول کر میرے برابر میں بیٹھا تو اس کے بدن سے پھوٹنے والی سینٹ کی تیز بو نے میرا دماغ بھگ سے اڑا دیا۔ شاید وہ صبح کی تیز بودبانے کے لئے ضرورت سے زیادہ سینٹ لگا آیا تھا۔

”یہ فوجی جیب کہاں سے تمہارے ہاتھ لگ گئی؟“ اس نے میرے کان کے نیچے ہتھیرانہ سرگوشی کی۔

”یہ فوجی جیب نہیں ہے۔ اس وقت ہم انپکڑ ارشد اور سب انپکڑ اکبر کے ساتھ سفر کر رہے ہیں۔“ میں نے اونچی آواز میں اسے آگاہ کیا اور وہ اُدھر کے رہ گیا۔

”میرا پچر خیریت سے تو ہے؟“ کچھ دیر کے سکوت کے بعد اس نے پھلوں پر ہونے والے غصے کو لہجے میں پوچھا۔

”ہم لوگ کچے کام کرتے ہیں۔ میرے پاس شناختی کارڈ کے علاوہ انپکڑ کی پوری وردی بھی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ ہمیں وردی کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ اور جہاں تک پڑھے لکھے لوگوں کی بات ہے تو اسے رہنے ہی دو۔ وہ جاہلوں سے زیادہ بزدل اور ڈرپوک ہوتے ہیں اور ہر وقت اپنی خود ساختہ عزت بچانے کی فکر میں جلتا رہتے ہیں۔“

”پھر تم تیار کیو۔ میں ایک فون کر کے آتا ہوں۔“ میں نے اس ناخوشگوار بحث کو وہیں ختم کرتے ہوئے جلدی سے کہا۔ ”تم چاہو تو ایک آدھ آدمی کو اپنے ساتھ لے لیتا۔“

”اکبر میرے ساتھ ہو گا۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا ”انپکڑ کے ساتھ جب تک کوئی جھاڑ کھانے والا ماتحت نہ ہو“ انپکڑ کی چل نہیں سکتی۔ پہلے بھی وہ میرے ساتھ گیا تھا۔ ہم پانچ منٹ بعد باہر چار ملیں گے۔“

اس کے چل جانے کے بعد میں نے جناگیر کا نمبر لایا تو فون پر فوراً ہی اس کی غمور نگر دل گرفتہ آواز سنائی دی۔

”تمہارا پچر اغوا ہو گیا اور تم گھر میں گھسے شراب پی رہے ہو؟“ میں نے طامت آمیز حیرت کے ساتھ کہا۔

”پھر کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟“ اس کی گردنمندی ہوئی آواز ابھری۔ ”وہ رو کر تھک گیا تو پینے بیٹھ گیا۔ سالی سلی بھی اسپتال میں پڑی ہوئی ہے۔ گھر کے دروازے پر مجھے کھانے کو آرہے ہیں۔ تم بھی بیٹھ آ جاؤ۔ میں نے ابھی ابھی شیوا کی نئی بوتل کھلی ہے۔ یہ پہلے ہی گھونٹ میں دل و دماغ کو روشن کر دیتی ہے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ اس وقت شراب کے سامنے تمہیں اپنے بچے کی کوئی فکر نہیں ہے؟“ میں نے غصے سے پوچھا۔

”وہ تو بہت ہے لیکن میں کیا کروں؟ آدمی کی مشین ٹھیک ہو تو دوسرا پچر پیدا کرنے کی کوشش تو کی جا سکتی ہے لیکن کھوئے ہوئے بچے کو ڈھونڈنا بہت مشکل کام ہے۔“

”مگر تمہارے ہوش و حواس ذرا بھی بحال ہیں تو کان کھول کر سن لو کہ ہم تمہارے بچے کی بازیابی کے لئے جارہے ہیں۔“ میں نے دانت چبے ہوئے ”اس کی بات کانٹ کر کہا۔“ تم حلق تک شراب پی کر کسی گھر میں غرق ہو جاؤ؟“

”اوہ! میں جس تمہارے ساتھ چلوں گا۔“ بچے کی بازیابی کا ذکر آتے ہی اس کا نشہ ہرن ہو گیا۔ ”مجھے نشہ نہیں ہوا۔ بس ذرا سا سورا آ رہا تھا۔ تم یقین کرو کہ میں بالکل سو رہا ہوں۔ میرا پچر کہاں ہے؟“

”میں دسک نہیں لے سکتا۔“ میں نے سختی سے کہا ”تم نے ذرا سی بھی بدستی کا مظاہرہ کیا تو سارا معاملہ بگڑ جائے گا۔ اب میں خود ہی دیکھوں گا کہ کیا کر سکتا ہوں۔“

”خدا کے لئے ڈی! اس کی کڑکڑاتی ہوئی آواز ابھری۔ ”مجھ پر رحم کرو۔ میری آنکھیں اسے دیکھنے کے لئے ترس رہی ہیں۔ میں

”بچے کہاں ہیں؟ ہم انہیں دیکھنا چاہتے ہیں۔ بچے کا باپ ہمارے ساتھ ہے، اپنے بچے کو پہچان لے گا۔“ ارشد نے عورت کو گھورتے ہوئے حتیٰ سے کہا ”اس کے بعد ہمیں مالکان کو بلانا ہو گا۔“

گھراں عورت کے چہرے پر تذبذب کے آثار نظر آئے لیکن وہ انکار کرنے کی جرات نہ کر سکی۔

ٹل اسٹیل کی عمارت اندر سے بہت صاف ستھری اور آراستہ تھی۔ اگلے حصے میں بچوں کے لئے تدریسی اور کھیل کود کے کمرے تھے۔ ان کے پیچھے دو کمرے بچوں کی خوابگاہ کے طور پر زیر استعمال تھے جہاں چند ماہ سے تین سال تک کی عمر کے متعدد بچے دمھی بیز روشنی میں اپنے صاف ستھرے بستروں میں سو رہے تھے۔ ان کمروں میں دیواریں پر رنگ برنگ تصاویر آویزاں تھیں۔ چت میں لگے ہوئے کھوں سے متعدد مشینی کھلونے جمول رہے تھے۔ فرش پر دیچر قالین تھا اور انٹرکسٹریکریٹ کے کمروں کی فضا میں خوشگوار خشکی رچی ہوئی تھی۔

دونوں کمروں میں ایک ایک بستر گھراں کی معاون عورتوں کے لئے مخصوص تھا تاکہ وہ نیند سے بے آرام ہونے والے بچوں کی ضروریات پر فوری توجہ دے سکیں۔

پہلے کمرے میں جمائیکر کو باپوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ وہاں معصومانہ انداز میں سوئے ہوئے انھوں بچوں میں کوئی اس کالٹی جگر نہیں تھا لیکن دوسرے کمرے کے چوتھے بستر پر نگاہ پڑے ہی وہ تڑپ کر والمانہ انداز میں اُدھر بڑھ گیا۔ اگر سلطان شاہ مضبوطی سے اس کا بازو نہ تھام لیتا تو وہ فرط محبت سے سوئے ہوئے بچے سے لپٹ کر اس کی نیند خراب کر دیتا۔

”وہ کیس نہیں جاہا۔ تھوڑی دیر کے لئے صبر سے کام لو۔ اس کی نیند خراب کی گئی تو وہ مدد کر آسمان سر پر اٹھالے گا اور سارے بچے جاگ جائیں گے۔“ میں نے اسے سمجھایا اور وہ اپنے بچے کے بستر کے قریب فرش کی قالین پر بیٹھ کر دبی آواز میں رونے لگا۔

اس کا شیر خوار بچہ اپنے باپ کی حالت سے بے خبر اپنا بالیاں اگٹھانے میں لئے بے خبر سو رہا تھا۔ جمائیکر کے ساتھ ایک آیا کو وہیں چھوڑ کر بغیر لوگ دفتر میں آ گئے۔

ارشد نے وہیں سے ادارے کے مالک کو فون کیا۔ شاید وہ اتنی رات گئے نیند سے اٹھائے جانے پر برہم ہو تا لیکن ارشد نے فوری طور پر اپنا تعارف کرا کے وہ امکان ختم کر دیا۔

”میں اسپیڈ ارشد بول رہا ہوں۔ تمہارے یہاں ایک ایسا بچہ موجود ہے جسے اغوا کیا گیا ہے۔ ضابطے کی کارروائی کے لئے تمہاری فوری موجودگی ضروری ہے۔“

پھر شاید اس نے دوسری طرف کی پوری بات سنے بغیر ریسیور

”وہ ٹل اسٹیل نامی چائلڈ کیئر سینٹر میں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ وہ تمہارے گھر کے بجائے مستقل طور پر وہیں مقیم رہے تو اس کی بہتر تربیت ہو سکے گی۔“

”اسے وہاں کس نے پہنچایا؟“ اس نے حیرت کے ساتھ پوچھا۔

”دیر انجمن کی پرورش کے فن سے نالید ہے۔ یہ کار خیر اسی نے سرانجام دیا ہے۔ اب تم زیادہ نہ بولو۔ زیادہ بولنے سے کوآرکر حلق میں پھنس جاتا ہے۔“ میں نے اس کا بازو دبا کر کہا اور وہ خاموش ہو گیا۔ اس کے لئے یہی خوش خبری کافی تھی کہ اس کے بچے کا سراغ لگایا گیا تھا اور وہ نیریت سے تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہمارے سفر کا اختتام ٹل اسٹیل کے سیاہ پھاٹک کے سامنے ہوا۔ جیپ اکبر ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس نے پولیس والوں کی شان سے کام لیتے ہوئے نیچے اترے بغیر جیپ کا ہارن بجایا۔ پھاٹک کی جھڑیوں سے ہیڈ لیمپس کی تیز روشنی پہلے ہی اندر تک پہنچ رہی تھی۔ اس لئے چند ثانیوں بعد ہی پھاٹک سے اُدھر عمر چوکیدار نمودار ہوا۔ اپنے سامنے ایک چمچاتی ہوئی بارعب گاڑی دیکھ کر وہ فوراً ہی اتنی پھاٹک کی ذیلی کمری میں غائب ہو گیا۔ اس کے فوراً بعد پھاٹک کھول دیا گیا۔

اس وقت عمارت میں شیر خوار بچوں کے علاوہ صرف چوکیدار اور تین خواتین موجود تھیں۔ ان میں سے اُدھر عمر عورت رات کی شفٹ کی گھراں تھی البتہ دو عورتیں اس کی معاون تھیں۔ دریافت کرنے پر پتا چلا کہ ارشد اور اکبر سے ملنے والا کلرک اپنی شفٹ ختم کر کے گیا وہ بچے چمچاتی کر رہا تھا۔

پولیس کا ذکر سننے ہی وہ تینوں عورتیں بری طرح بدحواس ہو گئیں۔ ارشد نے بارعب لیجے میں انہیں بتایا کہ وہ ایک مغوی بچے کی تلاش میں وہاں پہنچا تھا۔ اس پر گھراں کے اوسان مزید خطا ہو گئے۔ ایک عورت دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر دبی آواز میں رونے لگی تھی۔

”یہ کس بچے کا قصہ ہے؟“ گھراں نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”اسے یہاں فرضی نام سے لایا گیا ہو گا۔ لانے والی یہ عورت تھی۔“ ارشد نے ذرا مائی انداز میں دیر کی ایک تصویر اپنی جیب سے نکال کر اُس کی طرف بڑھا دی۔

تینوں عورتیں جتھانہ انداز میں اس تصویر پر جھکی تھیں۔ لیجے بھر کے لئے انہوں نے اس تصویر کو غور سے دیکھا پھر ان کے چہروں پر باپوسی نے ڈیرے ڈال دیئے۔

”ہم نے اسے نہیں دیکھا۔“ گھراں نے سب کی نمائندگی کا فرض اپنے ذمے لیتے ہوئے کہا ”ہم سب کی ڈیوٹی رات کے دس بجے سے صبح دس بجے تک ہوتی ہے۔ یہ عورت ہمارے سامنے یہاں نہیں آئی تھی۔“

جہاں متمول گھرانوں کے چھوٹے بچوں کو اغوا کر کے تاوان وصول کرنے کے ارادے سے برنگال کے طور پر رکھا جاتا تھا۔ اس نجی الزام تراشی پر اس شخص کا چہرہ پسینوں میں ڈوب گیا اور جب اس نے اپنی صفائی پیش کرنی چاہی تو اس کی زبان بری طرح لکڑھاری تھی۔

اس نے بتایا کہ مسز تمیلاننگ ایک دردناک کمائی لے کر ٹل اسٹریٹ آئی تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کا شوہر 'راڈنی ٹنگ اپنی ملازمت کے سلسلے میں عراق میں مقیم تھا جہاں وہ بیٹے کا شکار ہو کر قریب المرگ پہنچ چکا تھا۔ وہ اپنے شوہر کی تیار داری کے لئے فوری

طور پر بغداد روانہ ہونا چاہتی تھی لیکن شیر خوار بچے کا ساتھ ہونے کی وجہ سے شوہر کی دیکھ بھال نہیں کر سکتی تھی۔ اسے دوسرا ذریعہ تھا کہ کسی بے احتیاطی کی وجہ سے اس کے شوہر کا مرض اس کے

بچے کو لگ گیا تو وہ زندگی بھر خود کو معاف نہیں کر سکے گی۔ اس وجہ سے وہ بغداد جانے سے پہلے اپنے بچے کو ٹل اسٹریٹ میں داخل کراتا چاہتی تھی۔

اس ادارے کے ضوابط کے مطابق کسی بھی بچے کو برتھ سرٹیفکیٹ اور ماں باپ کے شناختی کاغذات کے بغیر داخل نہیں کیا جاتا تھا لیکن تمیلاننگ کی کمائی اس قدر اثر انگیز اور اس کی

حالت اتنی قابل رحم تھی کہ تمیلان سے صرف فارم بھردانے کے بعد جارج ٹنگ کو داخل کر دیا گیا۔ ان لوگوں کو اطمینان کے لئے یہ کافی تھا کہ وہ دو ماہ کے اخراجات پیشگی ادا کرنے پر آمادہ تھی۔

اس شخص کے دہم دنگان میں بھی نہیں تھا کہ تمیلان اغوا کئے ہوئے کسی بچے کو ٹل اسٹریٹ میں داخل کرانے کے لئے لائی ہوگی۔

اس نے بہت ادب اور خوشامد کے ساتھ ارشد سے التجائی کہ وہ پوری طرح تصدیق کے بغیر اس کے نیک نام ادارے پر کوئی الزام تراشی نہ کرے لیکن ارشد بالکل ہی سستے سے اٹھڑا ہوا تھا۔

”ہر مجرم اسی طرح معصوم اور پارسا بنتا ہے۔“ وہ آنکھیں نکال کر غرایا ”تم لوگوں کی بکواس پر کان دھرتے رہیں تو ہم لوگ

میں سے دو کیس بھی نہیں نسا سکتے۔“ ”میرا خیال ہے کہ اس معاملے میں کیس کوئی عقین غلط فہمی

ہوئی.....“ اس نے کہنا چاہا مگر ارشد نے ٹیٹ کر اس کی بات کاٹ دی۔

”غلط فہمی کے بچے اتیرا مطلب ہے کہ اندر جو آدمی اپنے بچے کے پاس بیٹھا رہتا ہے وہ پاگل یا دیوانہ ہے۔ بس گوری پزری اور

رکھ دیا۔“ لحد بھر بعد ہی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ ارشد نے ریسپورڈ اغویا اور اس کی توجہیاں چڑھ گئیں۔ ”انسپکٹر ارشد۔ میں نے کہا تھا کہ فوراً آؤ اور تم ابھی تک فون پر میرا وقت برباد کر رہے ہو۔“ وہ غصیلی آواز میں دہرایا۔ ”میں اغوا کے جرم میں شرکت کے الزام میں اسی وقت تمہیں بند کرادوں گا۔“

”پتا نہیں پولیس کو اپنے باپ کا نوکر سمجھتے ہیں، سالے۔“ اس نے بڑبڑاتے ہوئے ریسپورڈ کرڈیل پر بیٹھ دیا۔ ”فون کر کے چیک کر رہا تھا کہ کسی نے مذاق تو نہیں کیا۔ ابھی تھانے میں رات کالی کراؤں گا تو پتہ چلے گا کہ مذاق کیا ہوا ہے۔...الو کا پش۔“

بچے کی شناخت ہونے کے بعد عمران خاتون نے متعلقہ ریکارڈ ارشد کے سامنے رکھ دیا۔ اس کی بددیہانی کے مظاہرے نے اس عورت کو غیر مشروط اور بحال طور پر رجور کر دیا تھا۔

ریکارڈ میں بچے کا نام جارج ٹنگ درج کرایا گیا تھا۔ اسے لانے والی خاتون کا نام تمیلاننگ تھا جس نے خود کو راڈنی ٹنگ کی بیوی ظاہر کیا تھا۔ تمیلاننگ کا نام پڑھتے ہی میں چونک پڑا۔ ویرا نے ہوٹل میں کمرہ حاصل کرنے کے لئے بھی وہی نام استعمال کیا تھا۔ نام کے اس تسلسل نے مجھے چکر کر رکھ دیا مگر میں اس کا کوئی سبب نہیں جان سکا۔ وہ ویرا کی حرکت تھی اور وہی اس کا جواب دے سکتی تھی۔

شیر خوار بچوں کی شب و روز محمد اشت اور تربیت کے لئے ٹل اسٹریٹ کی ماہانہ فیس پانچ ہزار روپے تھی جب کہ جارج ٹنگ کے داخلے کے وقت ویرا نے تمیلاننگ کے نام سے دس ہزار روپے پیشگی جمع کرا لیے تھے۔ داخلے کے لئے تین ہزار روپے الگ سے ادا کئے گئے تھے۔

اس کا مطلب تھا کہ ویرا نے جانتی گھر کو دو ماہ تک پریشان کرنے کا مقصد بندوبست کیا ہوا تھا۔ جب تک پیشگی فیس چلتی رہتی، ٹل اسٹریٹ کی انتظامیہ بے فکر رہتی۔ دو ماہ کی مدت گزرنے کے بعد بچے کا کوئی دلی وارث سامنے نہ آتا تو وہ اس بچے پر رجوع کرتے جو ویرا نے درج کرایا تھا۔

وہ پتا ڈیفنس کے علاقے کا تھا۔ اس کے ساتھ کوئی فون نمبر نہیں تھا لیکن مجھے پورا یقین تھا کہ تمیلاننگ کی طرح ویرا کا وہ پتا بھی فرضی رہا ہوگا۔

ٹل اسٹریٹ کا مالک وہیں کیس قرب و جوار میں رہتا ہوگا کیونکہ وہ دس مہینے کے اندر اندر رہا پتا کا پتا ہوا اپنے دفتر سے

اس وقت ارشد اس کی کرسی پر قابض تھا اس لئے اسے مجبوراً ہمارے ساتھ بیٹھ کر ارشد کی بہرہ گیری تقریر سننی پڑی۔

ارشد نے اس سے کچھ بھی پوچھے کچھ بغیر اس پر اپنی بے رحمانہ فز جرم عائد کر دی۔ اس کا کہنا تھا کہ بچوں کی پیشہ ورانہ دیکھ بھال اور تربیت کے نام پر وہ لوگ ایک ایسا اڈا چلا رہے تھے

”یہ ہزارے توت دیتے تو اس کو اپنی اماں بتایا اور اب بھی اسی کا بھاؤ کئے جا رہا ہے۔“

”آپ ایک بار میری التجا سن لیں۔“ وہ رو دینے والی آواز میں بولا ”میں مانتا ہوں کہ مجھ سے بچے درپے کئی غلطیاں ہوئیں

لیکن ہمارے رجسٹر میں مسٹر ڈاڈی کنگ کے گھر کا پتا موجود ہے۔ اگر وہ عراق میں بیمار ہے اور تمہیلا اس کی دیکھ بھال کے لئے گئی ہوئی ہے تو بھی گھر پر کوئی نہ کوئی تو موجود ہوگا۔ اس سے مل کر ہمیں بہت کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔“

”اور اگر یہ پتا ہی غلط ثابت ہوا تو؟“ ارشد نے اونچی آواز میں پوچھا۔

”پھر میں آپ سے کوئی شکوہ کئے بغیر اپنی قسمت کا لکھا پورا کروں گا یا آپ کے ہیر پکڑوں گا۔“

میری اور ارشد کی نگاہیں چار ہوئیں اور میں نے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کی بات مان لینے کا اشارہ کیا۔ ارشد فوراً ہی سیزر مکارا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

”چلو یہ بھی دیکھ لیتے ہیں۔ اس میں گزربو نکلی تو پھر تمہاری خیر نہیں!“ وہ دھاڑا۔

جناگیر اندر اپنے بچے کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ باہر کیا ہو رہا ہے اس لئے ہم اسے چھپے بغیر تمہیلا کنگ کے دئے ہوئے پتے پر روانہ ہو گئے۔ ٹل اسٹینل کے مالک کی کار دوہیں چھوڑ دی گئی تھی اور وہ خود جیب میں جناگیر کی جگہ سوار ہو چکا تھا کیونکہ اس پتے پر چھان بین کرنے کے بعد ہمیں آخر کار وہیں واپس آنا تھا۔

دس منٹ کی مسافت کے بعد ہم ڈیفنس کے فیئر فائیو میں پہنچ گئے۔ اس دور میں ارشد بار بار بڑبڑانا اور گالیاں بکنا رہا تھا۔ شاید اس کی دانست میں رعب قائم رکھنے کے لئے وہ سب کرتا ضروری تھا اور حقیقت بھی یہی تھی کہ اس کے جارحانہ بلکہ بے رحمان رویے کی وجہ سے کسی کو بھی اُس سے اس کی شناخت طلب کرنے کا خیال نہیں آیا تھا اور وہ اپنے سادہ لباس کے باوجود انکسپز تسلیم کر لیا گیا تھا۔

کچھ دیر تک قرب و جوار کی گلیوں میں بھٹکنے کے بعد ایک لڑکے کے ایمار اکبر نے مطلوب مکان کے سامنے جیب روکی تو تیم پلیٹ پر نظر پڑے ہی میں تانے میں رہ گیا۔ گیٹ لیپ کے نیچے اسکیل کی تختی پر پتھر کی ڈی میلو کا نام کندہ تھا اور ویرا کی تلاش میں جانے والی، ایس بی ایف کی دو نفری جماعت کے بیان کے مطابق دیرا آخری بار ڈیفنس ہی کے علاقے میں کسی مسٹریڈ میلو کے ساتھ اُن کے لان پر دیکھی گئی تھی۔

۵۵ صورت حال بہت پیچیدہ اور پکڑا دینے والی تھی۔ ایک طرف دیرا ہمیں مل دینے پر تکی ہوئی تھی اور اپنا کوئی بھی مراغہ چھوڑے بغیر نہ صرف تیمز سے اپنے ٹھکانے بدلتی جا رہی تھی بلکہ اسی کے ساتھ مجھ پر ہاتھ ڈالنے کی فکر میں بھی لگی ہوئی تھی اور دوسری طرف یہ حال تھا کہ اس نے ہوٹل میں کرا حاصل کرنے کے لئے اپنا جو عارضی پتا درج کرایا، وہ ڈیفنس میں رہنے والے اسی ڈی میلو کا تھا جس کے گھر کے سامنے ہم اس وقت موجود تھے۔ دیرا کی تلاش میں ٹھکنے والے اسٹینل ٹانک فورس کے دو اراکین چند گھنٹے قبل دیرا کو اسی مکان کے لان پر ڈی میلو کے ساتھ لکھائی برعکاسی میں مصروف دیکھ چکے تھے۔ دیرا نے ہوٹل میں تمہیلا کنگ کے نام سے قیام کیا تھا اور اس نے وہی نام استعمال کرتے ہوئے جناگیر کے شیرخوار بیٹے کو ٹل اسٹینل میں داخل کرایا تھا۔ ہوٹل کے ساتھ ٹل اسٹینل والے محلے میں تمہیلا کنگ کے ایک ہی نام اور پتے کے استعمال سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ دیرا ہم لوگوں سے ذرا بھی خائف نہیں تھی، اسی لئے اُس نے اپنا نام بدل کر تمہیلا کنگ کا مستقل روپ دھار لیا تھا۔

فرق صرف اتنا تھا کہ ہوٹل کے رجسٹر میں اس نے کسی آزمودے کے بغیر مسٹریڈ میلو کے نام سے ان ہی کا پتا درج کرایا تھا جب کہ ٹل اسٹینل کے ریکارڈ کے مطابق وہ پتا مسٹر ڈاڈی کنگ کا تھا۔ ان تمام باتوں کے باوجود میرے لئے یہ امر پریشان کن تھا کہ دیرا اس مکان میں دیکھی جا چکی تھی۔

دیرا کوئی مرمر سیدہ عورت نہیں تھی لیکن اس کے ہاپ نے ڈان مریٹانو کا روپ دھار کر اسے کم سنی ہی سے جس انداز میں زندگی کے خشب و فراز سکھائے تھے اس کے نتیجے میں وہ ہلاکی چالاک اور مکار ہو چکی تھی۔ اُس سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ دشمن حالات میں ساری احتیاطی تدابیر کو بلائے طاق رکھ کر ہر جگہ اپنا سراغ چھوڑتی چلی جائے گی۔

حالات و واقعات سے ثابت ہو رہا تھا کہ دیرا، تمہیلا کنگ کے نام سے مسٹریڈ میلو کے مکان میں چھپی ہوئی تھی لیکن اس قدر واضح شواہد کے باوجود مجھے دال میں کچھ کالا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ شرفا بلکہ صحیح الفاظ میں بالدار اور باہشیت لوگوں کی آبادی تھی اس لئے ڈی میلو کے مکان کے چھانک پر ارشد وہ جارحانہ رویہ اختیار کرنے کی ہمت نہیں کر سکا جس کے سارے اس نے ٹل اسٹینل کی عمارت میں موجود ملازمین کو حراس باختہ کر دیا تھا۔

اس کے ایمار اکبر نے جب چھانک پر لگانے کے بجائے احاطے کی دیوار کے ساتھ کچے میں انار کر روک دی اور بیٹھ گھس کے ساتھ ہی انجن بھی بند کر دیا۔

”یہ کیا ہے؟“ ارشد، ٹل اسٹینل کے مسکین سے مالک کی طرف مڑ کر غرایا۔

”ہلکے کیا؟“ اندھیرے میں اس کی پوچھ

طرف مڑ کر غرایا۔

”ہلکے کیا؟“ اندھیرے میں اس کی پوچھ

طرف مڑ کر غرایا۔

”ٹل! اسٹیل کی ماہانہ آمدنی کتنی تھی ہے؟“ میں نے دل ہی دل میں حساب جوڑتے ہوئے پوچھا۔
”مساوہ دلاک کے قریب نہیں آتی ہیں مگر ان کا بواحدہ بچوں کی دیکھ بھال، خوراک، کپڑاؤں اور کرائے وغیرہ میں خرچ ہو جاتا ہے۔ بس یوں سمجھو کہ مجھے تیس چالیس ہزار بچتے ہیں“ وہ کسی ہوئی آواز میں ہمارے اپنا پورا حساب بتاتا چلا گیا۔
”ٹل! اسٹیل باقی رہا تو تم ساری عمر اس سے کاتے رہو گے ہمارے پھندے میں آگئے ہو تو اب ہمارا پورا حصہ دے بغیر گھو غلامی نہیں ہوگی، ہر چیز خاک میں مل جائے گی۔“
”تم تباہ میرے بس میں ہو تو میں پیچھے نہیں ہٹوں گا۔“ خوف سے مرا جا رہا تھا۔

”صرف ایک مینیج کی لمبوں کا خرچہ ہے۔ اگلے مہینے سے پھر تمہاری کمائی شروع ہو جائے گی۔ ہم رپورٹ سے تمہارا اور تمہارے ادارے کا نام ہی قاتل کر دیں گے۔“
”ٹل!۔۔۔ لیکن بچے کی برآمدگی کہاں سے دکھاؤ گے؟“ چہرے ٹانگوں کے بعد اس کی غماخت زہ آواز ابھری۔ اس نے رقم پر کئی اعتراض نہیں کیا تھا
”وہ ہمارا کام ہے۔ بچہ کسی پارک میں لاوارث پڑا ہوا بھی مل سکتا ہے۔“

”لیکن اس کا باپ اپنی زبان بند نہیں رکھے گا۔“ وہ کسی ہوئی آواز میں بولا۔

”تم اس کی فکر نہ کرو۔ ہم اسے ڈرا دیں گے کہ اس نے فاضل واقعات کے بارے میں زبان کھولی تو خطرناک مجرم بننے کے ساتھ ہی اس کی بیوی کو بھی اٹھالے جائیں گے اور ان کی لاشیں تک نہیں مل سکیں گی۔ ہم لوگ جب سودا کرتے ہیں تو ادھیچ بچے بھی سنبھالتے ہیں۔ بچے کے باپ کی زبان بندی کا بندوبست نہ ہوا تو تمہارے ساتھ ہم سب بھی مصیبت میں گرفتار ہو جائیں گے۔“
”مرزا جی! تم میرے محسن ہو!“ اس نے ایک مرتبہ ہر برا بازو دہاتے ہوئے جذباتی لہجے میں کہا ”میں تمہیں پورے دلاک دے دوں گا۔ بس اس سے آگے مجھے نہ دہانا۔“

میں نے اس کا بیخبرستہ ہاتھ اپنے بازو سے ہٹا دیا۔
”ہم دونوں دھیمی آوازوں میں باتیں کر رہے تھے۔ انجن کے شور اور جیپ کی کھلی ہوئی کھڑکیوں میں سے آنے والی تیز ہواؤں کی وجہ سے ارشد اور اکبر غالباً ہماری گفتگو نہیں سن سکے تھے۔ سلطان شاہ کو بھی پورے قہقہے کاظم نہیں ہو سکا تھا۔ اس لئے میں نے اپنی آواز میں ان تینوں کو اپنی کارروائی سے آگاہ کرتے ہوئے کہا ”وہ لاکھ میں سودا ہو گیا ہے۔ اب رپورٹ میں فرحت خان کا نام نہیں آئے گا۔“

ہم لوگ پولیس والوں کے دوپ میں ٹل! اسٹیل پہنچے تھے اور اگر فرحت خان سے سوئے بازی نہ ہوتی تو وہ معاملہ پولیس کے

کالوں کو ہاتھ لگاتے تھے۔ اگر فرحت خان لامٹی میں اس کا آڑ کار بن گیا تھا تو اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا لیکن ہمارے لئے ضروری تھا کہ اسے اس قدر خوف زدہ کر دیا جائے کہ بچے کو اس کی تحویل سے نکال لئے جانے کے بعد وہ سزا اور بدنامی کے خوف سے بیٹ اپنی زبان بند رکھتا۔

اس خاموشی کو فرحت خان کی منشاٹ نے ہی توڑا ”وہ کہہ رہا تھا“ مرزا جی! تم مجھے بھلے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ تم ہی میری کچھ مدد کرو۔ میں بے موت مارا جاؤں گا۔“
”مظلہ مددوں کا انجام بھی یہی ہوتا ہے“ میں نے بے رخی سے کہا۔

”مرزا جی! تم یقین کر کہ میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا“ وہ اضطراری طور پر خوشداند انداز میں میرا بازو دہاتے ہوئے سرگوشیاں لہجے میں بولا۔
”غلط کام نہیں کیا ہے تو عدالت سے باعزت بری ہو جاؤ گے!“
”عدالت کا فیصلہ آنے تک میں بری طرح تباہ و برباد ہو جاؤں گا۔“
”یہ تمہیں اس وقت سوچنا چاہئے تھا جب تم قہیلا سے چٹکیں بھڑا رہے تھے۔“

”میری عزت خاک میں مل جائے گی“ کا دوبارہ تباہ ہو جانے کا وہ میری بات سن کر اپنی ہی دھن میں کستا رہا ”مجھے اس شیطانی پکڑ سے بچالو“ مرزا جی! ورنہ میں کہیں کا نہیں رہوں گا۔“
”میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ تم مجھ سے ایسی امیدیں کیوں باندھ رہے ہو؟“

”تمہاری نرمی اور شرافت نے مجھے زبان کھولنے کا حوصلہ دیا ہے۔“
”نرمی اور شرافت کی خاطر میں اپنی نوکری کو داؤ پر نہیں لگا سکتا۔“

”نہیں، نہیں! ایسا تم کو... خدا نہ کرے کہ تمہاری نوکری پر کوئی آنچ آئے۔ تم مجھے بچانے کا وعدہ کرو تو میں تمہیں نہال کر دوں گا۔“

”کیا نہال کر دے؟“ میں نے استہزائیہ لہجے میں جواب دیا۔
”میں تمہیں میں ہزار روپے دوں گا“ اس نے میرے کان سے منہ لگا کر سرگوشی کی۔

”جتنے تو معمولی چوراہے دے جاتے ہیں۔ تم بھول رہے ہو کہ یہ حدود آڑی نفس کا کیس ہے اور بچہ تمہاری تحویل سے برآمد ہوا ہے۔ اسی کے ساتھ تیرے ہزار کی رقم تم قہیلا سے وصول کر چکے ہو۔ اب اپنے پلے سے صرف سات ہزار ڈال کر ہمیں نرغہ خانے کی کوشش نہ کرو۔“

میری حوصلہ افزا گفتگو سے اسے اپنی بات آگے بڑھانے کا موقع مل گیا اور وہ بولا ”میری عقل ماؤف ہو کر رہ گئی ہے۔ تم ہی کچھ تباہ کرنا کہ معاملہ کہاں تک پہنچے گا؟“

بھی اسے اسامی بنانے کے مؤامس نہیں تھا، ہم جو کچھ کر رہے تھے، اس کا مقصد صرف اتنا تھا کہ اسے ہماری اصلیت پر شبہ نہ ہو سکے ورنہ اس سے وصول ہونے والی ساری رقم بالآخر غرقری کی تحویل میں جاتی تھی۔

اس مہم کا ایک فکر انگیز پہلو یہ تھا کہ فرحت خان کا "کامدادار" بہت منفعت بخش تھا جیسی اس نے اپنے داماد کو منہ مانگے داموں پر خرید لیا تھا ورنہ عام گھرانوں میں تو لاکھ پچاس ہزار کے اٹانے جوڑنے میں بھی اتنی مددیں لگ جاتی ہیں کہ اپنے باپل کے آگن میں نہیں لیں اور شہنائیوں کی راہ نکلنے والی کنواریوں کی نامک میں چاندی کے تار جھلکانے لگتے ہیں۔

وہ شل اسٹیل کا مالک تھا۔ بظاہر وہ ایک تعلیمی اور ترقیاتی ادارہ تھا لیکن اس دکان کے خریدار وہ سب پند امراء تھے جو اپنے ہی بچوں کی پرورش کو اپنی جان کا جناح سمجھتے ہیں۔ انہیں نوکروں اور آیاؤں کے سپرد کر دیتے ہیں یا شل اسٹیل جیسے اداروں میں "ڈال" دیتے ہیں۔ مائیں اپنا حسن و شباب بچانے کے لئے اپنے جگر گوشوں کو اپنی مست بھری چھاتی سے دوردھیل دیتی ہیں اور باپ اپنی پرفیکٹ فیڈوں کو بچوں کے بالڈنم شب سے محفوظ رکھنے کے لئے ان پناہ گاہوں کا رخ کرتے ہیں۔ ان کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہوتا ہے۔ وہ ماں اور باپ کھلانے کے حق سے دست بردار ہونا چاہتے ہیں نہ بچوں کی پرورش کی صورتیں سمجھنے کا یا رار رکھنے ہیں اس لئے شل اسٹیل جیسے ادارے ان کی مجبوری بن جاتے ہیں۔ فرحت خان ان کی مجبوریوں کے دام وصول کر رہا تھا اور اس کے لئے اپنے نرخلوں میں اضافہ کرنا زیادہ دشوار نہیں تھا۔

وہ اپنی بیٹی اور داماد کو جو کچھ دے چکا تھا یا ہمیں دینے والا تھا، اسے وہ سب ان ہی مجبوروں سے وصول کرنا تھا جو اس کی خدمات کے محتاج تھے۔

کچھ دیر بعد فرحت خان کا زور گریہ ختم ہوا تو میں نے باتوں ہی باتوں میں اس سے اپنے قیاس کی تصدیق کرائی۔ اس نے اعتراف کیا کہ وہ فوری طور پر قیاس میں دو چار سو روپے ماہانہ کا اضافہ کر کے اپنا ہماری خراب پورا کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

ہوش بیا کرانی کے حوالے سے کیا جانے والا وہ اضافہ بچوں کے والدین کو بہر صورت قبول کرنا پڑتا کیونکہ ان کے بیچ شل اسٹیل میں خاصی مدت گزار لینے کی وجہ سے وہاں کے ماحول اور آیاؤں کے بدن کی مخصوص بو کے عادی ہو چکے تھے۔ پیسے بچانے کے لئے انہیں شل اسٹیل سے نکال کر کسی دوسرے ادارے میں ڈالا جاتا تو انہیں ماحول، نئے چہروں اور جسموں کی ٹانوس مک کی وجہ سے بیچے اضطراب اور بے آرامی کا شکار ہو کر آسمان سر پر اٹھالیتے۔ فرحت خان کے لئے بچوں کی مصعمانہ نفیات کی وہ کمزوری ایک کامداری کرے کم نہیں تھی اور وہ اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

میں لانا مانگ رہا ہوتا۔ ہم خاموشی کے ساتھ بیچنے کو لے کر نکل جاتے تو فرحت خان بعد میں اپنے طور پر غلاتے کے تھانے سے رجوع کر سکتا تھا۔ جب اسے پتا چلے کہ بیچنے کو لے جانے والوں کا پولیس سے کوئی تعلق نہیں تھا تو وہ شیر ہو جاتا اور اخبار والوں کو ایک ملٹی فیز کمائی مل جاتی۔ وہ سب ہمارے مفاد میں نہیں تھا، اس لئے وہ لاکھ پربات بننے ہی میرے سر سے ایک بڑا بوجھ ٹپ گیا تھا۔

مگر ارشد اس وقت واقعی ایک حریف پولیس انسپکٹر بنا ہوا تھا۔ میری بات سننے ہی وہ جھگڑ گیا "مرزا جی، یہ کیا کیا تم نے؟ ایسے کس دوزخ میں لگے۔ اسے تھانے پہنچے دیتے؟ اس کے بعد یہ خوشی خوشی دس لاکھ بھی دینے پر تیار ہو جاتا۔ تھانے کی تفتیش بڑے پھل کے چکے چھڑا دیتی ہے۔"

"میں نے تو قصہ ختم کر دیا۔ تم چاہو تو اسے تھانے لے جا سکتے ہو۔ مجھے اس کی جیسی پر ترس آگیا۔ تمہیں کھانا ہے کہ یہ بالکل بے قصور ہے۔"

"مار پڑنے سے پہلے ہر ماں کا غصہ ایسی ہی قسمیں کھاتا ہے۔ سوچنا چاہئے تو ایسے لوگوں کو ساری بھولی بری باتیں یاد آنے لگتی ہیں۔ غضب خدا کا ہے تو سوچا ہو تاکہ اوپر والوں کا حصہ نکالنے کے بعد ہم چاول کے پلے کیا پڑے گا؟ تم تو اس کی ہمدردی میں اپنے بیٹے پر لات مار رہے ہو۔"

"میں اپنا سب کچھ سمیٹ کر، تمہیں تین لاکھ دے سکتا ہوں۔" فرحت خان یوں ہانپ رہا تھا جیسے کوئی کھڑی ڈھلان چڑھ کر آیا ہو۔ "میں نے بچھلے مینے اپنی ایک بیٹی کی شادی کی تھی۔ میری جمع پونجی اس کی بذر ہو گئی۔ آج کل کے پڑے کھلے لڑکے کھلے بازار میں اپنی بیٹی لگواتے ہیں۔ تم چاہو تو تصدیق کر سکتے ہو کہ میں نے اپنی بیٹی کو چار لاکھ کا قلیق اور داماد کو سلاوی میں ساڑھے تین لاکھ کی کاروباری ٹی۔ ایک بیٹی کے بیاہ پر اتنا کچھ نکال دینے کے بعد مجھ جیسے سفید پوش کے پاس کیا بچ سکتا ہے؟"

اپنی بات پوری کرتے ہی فرحت خان کسی بارے ہوئے جواری کی طرح ہلک کر رو پڑا۔

میرے دل میں اس کے لئے ہمدردی کے جذبات اٹھ اٹے۔ اسی کے ساتھ میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ فرحت خان نے اپنی بیٹی کی شادی پر قلیق اور کار کے ساتھ دس بیس تو لے سونا بھی دیا ہوگا۔ اس اعتبار سے اس شادی کا تخمینہ باہر چندہ لاکھ کے لگ بھگ بنتا تھا اور وہ اس پر بھی خود کو سفید پوش قرار دے رہا تھا۔ اس نے ارشد کی ایک ہی دھمکی پر رشوت کی رقم میں یک بیک ایک لاکھ کا اضافہ کر دیا تھا۔

میں ہزار سے شروع ہو کر وہ بیٹی جس طرح تین لاکھ تک پہنچی تھی، اس کی بنا پر مجھے پورا یقین تھا کہ اس کے ساتھ تھوڑا بہت نقد کیا جاتا تو وہ رقم بڑھانے پر آمادہ ہو جاتا لیکن ہم میں سے کوئی

دلچسپ کہانی سنتا رہا جو اس کے لئے شاید سنی خیر بھی ثابت ہوئی تھی کیونکہ وہ مختلف سمات بالکل ایک ہی سمت کی نشاندہی کر رہی تھیں۔

”اس کا مطلب ہے کہ ڈی ملو بھی دیر اسے ملا ہوا ہے۔“ میری کہانی مکمل ہونے پر ارشد نے اضطرابی انداز میں پہلو دے لے ہوئے کہا ”میں سب سے پہلے اسی پر ہاتھ ڈالنا چاہتا تھا۔“

”اس معاملے میں فرحت خان کو ملوث کرنا مناسب نہیں تھا اس لئے میں نے اس کی موجودگی میں بات کرنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔“ میں نے کہا ”ورنہ میں تو اسی وقت ڈی ملو کے گھر میں گھسنے کے لئے بے چین تھا۔“

”مستطوب ہوتا ہے کہ اب دیر کی اصل پر پہنچ چکا ہے جیسا کہ اس قدر خود اعتمادی کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ آج اس کی کئی خوش قسمتی اسے لے ڈوبے گی۔“ سلطان شاہ بولا۔

”پھر ہم یہاں وقت کیوں ضائع کر رہے ہیں؟“ ارشد کی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

میں اس کے سیما بی بی پر زرب مسکرانے کا ”بیب اکبر“ لے جا رہا ہے۔ ہمیں اس کی واپسی کا انتظار کرنا ہو گا۔ پھر فرحت خان بھی رٹ لینے لگا ہے۔ یہاں سے منت کر رہی ہوں ڈی ملو کی طرف جائیں گے اگر دیر اس کے گھر میں پناہ گزین ہے تو یقین رکھو کہ صبح کا اجالا پھیلنے تک وہ وہیں رہے گی۔ جگت میں ہم نے یہاں کے کام ادھورے چھوڑے تو دوشواہاں کھڑی ہو جائیں گی۔“

”یہ سب تو ہوا ہے لیکن میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ہم فرحت خان سے تین لاکھ کی رقم کس مد میں ایڈوانس رہے ہیں؟“ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا ”اس معاملے میں اس کے ہاتھ بالکل صاف نظر آتے ہیں۔ ہم یہ رقم کہاں لے جائیں گے؟“ ”یہ ایس ٹی ایف کے لئے غیر سرکاری گرانٹ ہوگی“ میں نے بانیں آنکھ جا کر کہا ”یہ رقم غفلت کو سوپ دینے کے بعد ہم اس بوجھ سے ہی التزم ہو جائیں گے۔“

”یا پھر ہرام ڈاکو کی صفات دکھا ڈالو!“ سلطان شاہ نے ملنے ہوئے کہا ”چلتے وقت تم نے اسے پوری رقم لوٹا دی تو وہ جو بچکا ہوا جائے گا۔ میں نے سنا ہے کہ ہرام ڈاکو مظلوموں کے ساتھ ایسا ہی اختیار استعمال دیتے ہو۔“ ایس ٹی ایف والے تو سامنے سے مالا مال نظر آتے ہیں۔“

”یہ بھی ایک صورت ہو سکتی تھی“ میں نے اس کی مذاق میں کسی ہوئی بات پر سرگرمی خمیگی کے ساتھ کہا ”لیکن ہمارے پولیس والے آیا ہوا مال لوٹانے کے عادی نہیں ہیں۔ ہماری ٹیلی فون گالے پڑ جائے گی۔ فرحت خان سمجھ جائے گا کہ ہمارا ستائی پولیس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

اسی وقت کسی قریبی راہداری سے کسی شیر خوار بچے کے رونے کی آواز آئی اور میں نے سمجھ لیا کہ جاکیر اپنے بچے کے ساتھ

ٹٹل اسٹیل میں ملے کے سامنے فرحت خان کی ساتھ کی بحالی ضروری تھی اس لئے ارشد نے دوبارہ وہاں پہنچنے ہی فرحت کے ساتھ مذہب دیتے اختیار کر لیا اور ایسی کھنگو شروع کر دی جس سے یہ ظاہر ہوا تھا کہ اس معاملے میں وہ بالکل بے قصور تھا۔ ساری شرارت اور بد معاشی سز حیدر کنگ کی تھی جو بچے کو دھوکے سے اس کے سر ڈال گئی تھی۔

”حیدر کنگ کی گرفتاری کے لئے تم لوگوں کی خاموشی ضروری ہے۔“ ارشد ”فرحت سے غائب ہو کر اس کے ملازمین کو سنا ہوا تھا۔“ اسے شہ بھی ہو گیا کہ ہم لوگ بچے کو یہاں سے نکال لے گئے ہیں تو وہ اپنی گرفتاری کے خوف سے ادھر کا رخ بھی نہیں کرے گی۔ وہ بے خبری میں یہاں آجائے تو تم بچے کی علالت کا بہانہ کر کے اسے یہاں روک لیتا۔ تم اس سے کہہ سکتے ہو کہ بچے کو علاج کے لئے شہر کے کسی اسپتال میں داخل کر دیا گیا ہے۔ اس اثنا میں تم مجھے اطلاع دو گے اور ہم اسے پکڑیں گے۔“

فرحت خان منونیت سے لبریز ٹٹا ہوں سے ارشد کو دیکھتا رہا۔ اپنی عمومی تقریر کے ”ارشد نے ملے کے تمام اراکین کو دفتر سے رخصت کر دیا۔“

”رقم کا کیا بندوبست ہے؟“ میدان صاف ہوتے ہی ارشد نے اس سے پوچھا۔ ”مجھے کمر جانا ہو گا“ فرحت نے بچی آواز میں کہا ”رقم میرے گھر پر ہی رہتی ہے۔“

”پھر تم یہاں وقت کیوں بہاؤ کر رہے ہو؟“ ارشد نے قدرے تیزی سے کہا ”اپنی گاڑی میں جاؤ اور رقم لے کر جلد از جلد لوٹ آؤ۔“

فرحت فوراً ہی چلا گیا اور ارشد میری طرف متوجہ ہو گیا۔ ”جہاں تک گھر کہاں سے زیادہ دور نہیں ہے“ میں نے سنی خیر لہجے میں کہا ”جتنی دیر میں فرحت خان واپس آئے گا“ اکبر اسے چھوڑ کر واپس آ سکتا ہے۔“

”پتہ بھی اسی کے ساتھ جائے گا؟“ ارشد نے سوال کیا۔ ”یہ ضروری ہے۔ ہم دوبارہ یہاں واپس نہیں آئیں گے“ میں نے کہا۔

ارشد نے میرے مشورے کے مطابق اکبر کو فوراً ہی جہاں تک اور اس کے شیر خوار بچے کو اس کے گھر پہنچانے کا کام سوپ دیا۔ اس طرح دفتر میں مجھ سمیت کل تین نفوس رہ گئے۔

”اب بتاؤ کہ تم ڈی ملو سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟“ ارشد نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے میز کے سامنے پڑی ہوئی ایک کرسی سنبھالے ہوئے وہ کہانی چھیڑ دی جو دیر کی تلاش میں جانے والے اسپیشل ٹاسک فورس کے دو جوائنٹ کے ذریعے مجھ تک پہنچی تھی۔ ارشد حیرت اور بے چینی کے ساتھ منہ کھولے میری وہ

واپس روانہ ہو رہا تھا۔

○☆☆○

ستون پر کال تیل کا ٹین نصب تھا لیکن ارشد نے وہ ٹین دہانے کے بجائے آگنی چھاگ پر ہولے سے دھک دی۔

چوکیدار غالباً اپنے کیمین میں یا بھاگ کے نزدیک ہی سہا ہوا تھا لیکن اپنے فرض سے غافل نہیں تھا۔ دھک کے جواب میں اندر سے فوراً ہی ایک ہماری اور خواجہ بک آواز ابھری، بولنے والے کالب دلیر اس کے پھان ہونے کا غماز تھا کیونکہ کراچی میں چوکیداری کے فرائض کے لئے بالعموم پھانوں کی دلیری، جنگلی مہارت اور تنگ حلائی کو مثالی تصور کیا جاتا ہے۔

ارشد نے فوراً ہی پشوش کچھ کما اور لمحہ بھر بعد ہی آگنی چھاگ کی ذیلی کمز کی کل گئی۔

اس چھاگ پر چلے ہوئے گیٹ لیمپس کی روشنی میں، میں نے ارشد کو کھلی ہوئی کمز کی طرف جھکتے ہوئے دیکھا۔ اس نے ساتھ فضا میں ادغ کی ایک کھٹی کھٹی سی آواز ابھری اور ارشد فوراً ہی کھلی ہوئی کمز کے خلاص معدوم ہو گیا۔

اس آواز کا معاملہ بالکل واضح تھا۔ ارشد نے نیند سے اٹھے ہوئے چوکیدار کو کوئی ملت دے بغیر اس کا زرخرا دوچ لیا تھا کہ وہ کوئی ادغی آواز نکال کر اپنے مکان کو ہوشیار نہ کر سکے۔

لحہ بھر بعد ہی ہلکی سی سٹی کی آواز سنائی دی اور ہم دونوں اپنی جگہ چھوڑ کر، تیزی کے ساتھ کھلی ہوئی ذیلی کمز سے ڈی ملو کے مکان کے احاطے میں داخل ہو گئے۔

وہ پوری مدت چند ٹائمن سے زیادہ نہیں تھی لیکن ہم اندر پہنچے تو میں نے دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ارشد اس گھیل سی مدت میں اپنی پہلی ڈسے واری سے، بخوبی سکدوش ہو چکا تھا۔ چوکیدار کا غمناک اور دراز قامت جسم اس کے قدموں میں بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔

چھاگ کے قریب دیوار سے ملحق پختہ کیمین میں بستر خالی پڑا ہوا تھا اور علامہ میدان صاف تھا۔ سلطان شاہ نے آگنی کے ساتھ ذیلی کمز کی بند کر کے بولٹ لگا دیا۔

چھاگ سے تاریک عمارت تک پختہ روشنی ہوئی تھی جس کے دونوں جانب وسیع و عریض اور سرسبز لان پھیلا ہوا تھا۔ لان کو روشن رکھنے کے لئے کیمینوں پر جا بجا آرائشی روشنیوں لگی ہوئی تھیں جو اس وقت گل تھیں۔ پورے مکان میں گیٹ لیمپس کے علاوہ صرف برآمدے میں روشنی نظر آ رہی تھی جس کا مطلب تھا کہ رات کے ان لحات میں اس مکان کے کیمین بے خبری کی نیند سو رہے تھے۔

ہم تینوں نے لمحہ بھر کے لئے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر ایک وقت، انہوں نے بل برآمدے کی طرف دوڑ لگا دی۔ وہاں بید کی بجلی ہوئی خوب صورت اور ہلکی میز کے ساتھ ہی شہد کریاں بھی پڑی ہوئی تھیں۔ جس کا مطلب تھا کہ ڈی ملو اور اس کے اہل خانہ، اگر ان کا وجود تھا، بند کمروں سے باہر نکل کر کھلی فضا سے بھی

اس وقت رات کے تقریباً دو بجے کا مغل تھا اور اس علاقے میں ہر طرف ستائے کی کھرائی تھی۔ وہ شہر کی مصروف شاہراہوں سے دور، ایک خالص رہائشی علاقہ تھا اس لئے اتنی رات گئے وہاں انجنوں و فیمو کی گونج بھی نہیں سنائی دے رہی تھی۔

علاقے کے کیمین یعنی نیند میں ڈوبے ہوئے تھے، مکانوں کی کھڑکیاں تاریک تھیں۔ جن مکانوں میں شب بیدار ریموں کا بھرا تھا، ان کی کھڑکیوں پر بھی رازداری کے خیال سے شاید دھن پر دے کیچھ دئے گئے تھے۔ بجلی کے کیمینوں پر ٹٹھکتے ہوئے اکا و کا نقوش کی روشنی اندھیرے سے لڑنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ وسیع و عریض مکانات کے چھاگوں پر اکثر دھڑلایا جاتا کیونکہ تقریباً ہر گیٹ پر لپ روشنی تھی البتہ چوکیدار اپنے اپنے احاطوں میں محصور تھے کیونکہ ڈی ملو کے مکان والی سڑک پر دور دور تک کوئی ڈی ملو نظر نہیں آتا تھا۔ وہ ماحول ہمارے مقاصد کے لئے بہت موزوں اور سازگار نظر آ رہا تھا۔

ہماری غری چار افراد پر مشتمل تھی۔ ہم میں میری اور سلطان کی شرکت اہم اور ضروری تھی کیونکہ ہم دونوں دیر کو بہت قریب سے جانتے تھے اور اسے ہر سوپ میں پہچان سکتے تھے۔ ارشد سینئر تھا اس لئے اس کی شرکت بھی ضروری تھی اس لئے جب جیب ایک نیم تاریک مقام پر روکی گئی تو ہم تینوں اکبر کو اسٹینرنگ و ہیل پر چھوڑ کر خاموشی سے نیچے اتر گئے۔

فرحت خان سے وصول کئے ہوئے تین لاکھ روپے جو نقد رقم اور پانچ ہزار روپے پر مشتمل تھے، جیب میں ہی چھوڑ دئے گئے البتہ ہم تینوں نے جیب سے اترنے سے پہلے خود کو مسلح کر لیا تھا۔ ہم تینوں کے پاس بھرے ہوئے پستول اور فاضل میگزین موجود تھے۔ میرے پاس نیم کن بھی موجود تھی۔ اس کے علاوہ ارشد نے جیب کے چھوٹے کپارٹمنٹ میں سے ایک عدد طاوور جیپی ٹاسج بھی لے لی تھی۔

نیچے اترتے ہی ارشد ہم دونوں سے کئی قدم آگے ہو گیا۔ وہ تیزی کے ساتھ ڈی ملو کے مکان کے چھاگ پر پہنچا تو ہم اس سے محفوظ فاصلے پر، احاطے کی دیوار سے لگ کر کھڑے ہو گئے۔ ہمارا دماغ صرف اتنا تھا کہ گیٹ کھولنے والے کو فوری طور پر یہ اندازہ نہ ہو سکے کہ اس کے سامنے تین افراد ہیں۔

ایک اور تین کا تائب دیکھتے ہی گیٹ یا اس کی ذیلی کمز کی فوری طور پر بند کی جاسکتی تھی اور یوں ہماری مہم ابتداء ہی سے نفع دہ کا شمار ہو جاتی جب کہ ہم پُر سکون انداز میں احاطہ عبور کر کے، خاموشی کے ساتھ اصل عمارت تک پہنچنے کا منصوبہ لے کر آئے تھے۔

پہلے پھر میں، میں نے دیکھ لیا تھا کہ اس چھاگ کے سنگین

ڈی ملے ہوا خوری کا عادی تھا اس لئے مجھے قوی امید تھی کہ اس کی خواب گاہ کا دوا نہ بند بھی ہوا تو اس خوشگوار موسم میں ہمیں اندر پہنچنے کے لئے کوئی نہ کوئی کھلی ہوئی کھڑکی مل جائے گی۔ ارشد نے برآمدے کے اختتام پر واقع چوبی دوا نہ پر بے آواز زور آزمائی کی اور پلٹ آیا۔

”تم یہیں چھپ جاؤ!“ میں نے سلطان شاہ کے قریب جا کر سرگوشی کی ”ہم پچھلی سمت سے اندر گھسنے کا کوئی راستہ تلاش کرتے ہیں۔“

میری ہدایت پر سلطان شاہ کے چہرے پر ایسی پھل جھلک گئی۔ شاید اس کی دانست میں اسے ایک مرتبہ پھر محاذ آرائی سے دور رکھنے کی کوشش کی جارہی تھی لیکن میں مجبور تھا۔ ہم تین میں سے ایک نہ ایک کو فرار کے اس راستے پر جے رہتا تھا ورنہ ہمارا اشکار اُدھر سے غائب ہو سکتا تھا۔

سلطان شاہ کو وہاں چھوڑ کر ہم دونوں تیزی کے ساتھ برآمدے سے بچے اترے۔ میرا خیال تھا کہ ہم دونوں مختلف سمتوں سے مکان کا طرف کریں تاکہ وقت کی بچت ہو سکے لیکن ارشد میرا ہاتھ تمام کر مجھے اپنے ساتھ لیتا چلا گیا جس پر میں نے کوئی تفرص نہیں کیا۔

میرے اندازے کے عین مطابق، پچھلی سمت میں ایک کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور اندر گھورانہ میرا چھایا ہوا تھا۔ ہم نے پوری احتیاط کے ساتھ جائزہ لیا تو باہر سے اندر کا منظر نظر نہیں آیا کیونکہ کھلی ہوئی کھڑکی پر بالکی سی آہنی گرل کے ساتھ ہی لٹائی ہر طرف جالی کے پٹ بند تھے۔

ہم نے چند ماٹوں تک اندر کی سن گن لینے کی کوشش کی لیکن وہاں پہلے ہوئے گھپ اندھیرے میں زندگی کی کوئی رت و دیافت کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے وہاں اگر کوئی سوہا تھا تو وہ نہایت سکون اور آرام سے سویا ہوا تھا اور خزانے وغیرہ لینے کی عادت سے عاری تھا۔

اندر سے فی الفور کسی مداخلت کا امکان نہ پا کر ارشد نے اپنی جیب سے کوئی تیز دھار چیز برآمد کی اور پلک جھپکتے میں، ہلکی سی

سرسراہٹ کے ساتھ تانکوں کی ٹھکانی ہروف جالی کاٹ ڈالی۔ کئی ہوئی جالی میں ہاتھ ڈال کر اس نے وہ ٹھکے الگ کئے اور آہنی گرل پر زور آزمائی شروع کر دی۔

ہادی انکس میں گرل خاصی کمزور نظر آئی تھی لیکن پھر بھی وہ
 محسوس ہوا تھا۔ شدید زور آزمائی کی وجہ سے چند ہی لمحوں میں ارشد
 کے غصے کی رفتار تیز ہو گئی۔ اس کی ٹھکان کا اندازہ کر کے میں نے
 اس کی جگہ کی تو مجھے خوشی ہوئی کہ اس فریم کے انجینئر بل پکے
 تھے۔

تھوڑی دیر کی محنت کے بعد، خیف ہی آوازوں کے ساتھ فریم میرے ہاتھ میں آگیا۔ ارشد وقت ضائع کئے بغیر اس غلامی سے گزر کر اندر پہنچ گیا۔ اس کے ایماء پر میں بھی لمبی مہر میں اندر پہنچ گیا۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ بند کمرے کے مقابلے میں تالوں میرے کپلے آسمان کے نیچے قدرے روشنی تھی جس کی وجہ سے اندر سے باہر کا بہت دھندلا سا منظر دیکھا جاسکتا تھا۔

کمرے میں جھت پر لگا ہوا پنکھا دھیمی رفتار سے بے آواز چل رہا تھا اور ڈبل بیڈ پر صرف ایک شخص قرینے سے سویا ہوا تھا۔ ارشد نے پھرتی کے ساتھ اس کے سر پرانے پوزیشن سنبھالی اور میں نے باہر نکلنے والی کھڑکی پر تیزی سے پردہ کھینچ دیا۔

اتفاق سے ان پردوں کی رنگ بگلا رنگ کی بنی ہوئی نہیں تھی۔
 شاید آہنی باپ میں وحاشی جھلون کے سیرارے پردے لٹکائے گئے
 تھے اس لئے پردے سرکاتے ہوئے جھلون سے خاصی آواز پیدا
 ہوئی جس کے نتیجے میں کمرے میں سوئے ہوئے شخص کی آنکھ کھل
 گئی۔ اس نے فوراً ہی گھبراہٹ ہوئی آواز میں کچھ استفسار کرنا چاہتا
 لیکن ارشد پوری تیار کی کے ساتھ اس کے سر پر تھا اس لئے
 اس شخص کے حلق سے بسلا قطع بھی پوری طرح ادا نہیں ہو پتے پتا
 اور ارشد نے شاید پوری قوت سے اس کا منہ دبوچ لیا۔

”خاموشی کے ساتھ تعاون کرو گے تو ہم تمہارے دوست ثابت ہوں گے“ اندھیرے کمرے میں ارشد کی دھمکی آئیز سرگوشی ابھری ”دور نہ تمہارا گھلا کاٹ ڈالا جائے گا۔“

ایسے معاملات میرے لئے نئے تھے نہ ارشد کے لئے۔ میں نے اس سے کسی مشورے کی ضرورت محسوس کئے بغیر مخالف سمت کی دیوار پر بند دوازے کے قریب سوچ بوجھ ٹٹول کر کمراداشن کر دیا۔

فریبی ماکس جسم والا پتہ قامت اور اکر جیڑ عمر مختص اپنے
بستر و بہشت کے عالم میں بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ خوف کے
باعث اس کی غماز آلود آنکھیں اپنے حلقوں کے باہر اُلٹی پڑی
تھیں اور اس کے دہانے پر ارشد کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے پکڑے
ہوئے تھے۔

میں نے پھرتی کے ساتھ اپنا بھرا ہوا پستول نکال کر اُس کا دایہ فریبی ماسک غصص کی کھوپڑی کی طرف کھینچا اور اسے کہہ دیا کہ راستہ کی

کے جنگ کمرک نے اس کے پُر ثبات وجود کی رعایت سے دوائی
انگریزی انداز اختیار کرتے ہوئے خود بخود اس کے نام کے ساتھ
مس لگا دیا تھا۔ نطل اسٹیل میں وہ مس تھیلنگک بن گئی جو راضی
کنگ کی بیوی تھی لیکن ڈی ملے کے پاس پہنچے تک وہ ایک بار پھر
مس تھیلنگک نہ گئی تھی۔

اس پر شدید فحش کے ساتھ ساتھ مجھے اس امر پر حیرت تھی کہ
دیوانے بابا ہر نام بدلنے کی احتیاط ترک کر کے ہر جگہ تھیلنگک
کے نام کا تسلسل برقرار رکھا تھا جس کی بظاہر کوئی وجہ مجھ میں نہیں
آتی تھی اور یہی معلوم ہوتا تھا جیسے دیرامی طرف سے لاحق
خطرات کو بیکر نظر انداز کر چکی ہو۔

”کہاں ہے وہ؟“ میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے
ہوئے اس کے چہرے پر اپنی خوار نظریں گاڑیں ”ستم ہے ہمیں
دھوکا دینے کی کوشش کی تو اس کے ساتھ تم بھی عذاب میں
آ جاؤ گے۔“

”مجھے نہیں معلوم کہ وہ اب کہاں ہوگی“ اس کے چہرے پر
خوف کے سائے گرے ہوتے جا رہے تھے ”وہ شام کو میرے پاس
ضرور آئی تھی لیکن نو بجے واپس چلی گئی تھی۔“
”کہاں چلی گئی تھی؟“ میں نے پھاڑ کھانے والے انداز میں
پوچھا۔

”مجھے نہیں معلوم“ اس نے بے بسی سے کہا ”وہ میرا انٹرویو
لینے آئی تھی۔“

”وہ کس خوشی میں؟“ انٹرویو کے ذکر نے مجھے چوڑا دیا۔
”بد قسمی سے میں ایک جیالو جٹ ہوں اور ستائیس سال
تک بلوچستان کے مختلف علاقوں میں شیل کھپنے کے لئے تیل کی
حلاش کے منصوبوں پر کام کرتا رہا ہوں۔ وہ آسٹریلیا کے ایک
ٹیکنیکل جریدے کے لئے میرا انٹرویو ریکارڈ کرنے آئی تھی۔“
”تھماری اس سے قسمی پرانی شناسائی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

اس کی کھٹک میرے لئے لمحہ بہ لمحہ حیران کن ثابت ہو رہی تھی۔
”آج سے پہلے میں نے اسے خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔“
اس نے کہا۔

”تو وہ آسمان سے اچانک ہی یہاں اتر آئی تھی؟“ مجھے اس پر
خصہ آنے لگا۔

”بچے بیان کے مطابق وہ کل ہی کیمبرا سے کراچی پہنچی تھی۔
آج صبح اس نے مجھے فون کیا تھا۔ میرے لئے یہ ایک اعزاز ہوتا کہ
کسی معیاری اور غیر ملکی جریدے میں میرا انٹرویو شائع ہو۔ اس
لئے مس تھیلنگ نے جب آج ہی مل بیٹھنے کی خواہش کا اظہار کیا تو
میں انکار نہیں کر سکا۔ فحش میری بات پر یقین نہ آئے تو میرے
ملازمین سے پوچھ لو۔ وہ پہلے بھی یہاں نہیں آئی۔ اس نے لان پر
بیٹھ کر تین گھنٹے تک میرا انٹرویو ریکارڈ کیا۔ وہ مجھ سے ان افواہوں
کی تصدیق کرنا چاہا رہی تھی کہ ستر کے محضرے میں بلوچستان کے

میں سے منہ پرے ہاتھ بٹاؤ۔ اس نے کوئی اور بھی آواز نکالی تو اس
کی کمرہ میں ہی دو شخص ان کھل دیا۔“

ارشاد کے آہنی ہاتھوں کی گرفت سے آزادی ملنے ہی اس نے
پہرے کی بار اس طرح منہ چلایا جیسے اپنے حلق میں پھنسی ہوئی
گئی تھی غصے کی کوشش کر رہا ہو پھر بائیں ہاتھ میں دونوں کی طرف
دیکھتے ہوئے خوف زدہ آواز میں بولا ”تم لوگ کون ہو اور مجھ سے کیا
چاہتے ہو؟“ اس کی آواز کسی قریب الگ الگ مریض کی سرگوشی سے
نہایت نہیں تھی۔

”تم چہرہ ڈاکو نہیں ہیں بلکہ ایک عورت کی تلاش میں یہاں
آئے ہیں۔“ میں نے اسے پُر غار نظروں سے گھورتے ہوئے کہا ”مگر
تم نے جی نہ بولا تو تم ہمیں مادیوں گے۔ ہمیں معلوم ہے کہ وہ اسی
مکرم ہے اور تم اس کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہو۔ نام
کیا ہے تمہارا؟“

”ہینرک۔“ ہینرک ڈی ملے ”وہ اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے
ہوئے بھلا بھرا کنبیوں کے سارے بستر سے اٹھتے ہوئے بولا ”مجھے
نہیں معلوم کہ تم کس عورت کی بات کر رہے ہو؟“

”میں بھی اس کے قریب پہنچ گیا تاکہ
اس تک اپنی بات پہنچانے میں کوئی دشواری نہ ہو۔“ پہلے یہ بتاؤ کہ
اس وقت اس مگر میں کل کتنے نفوس ہیں اور وہ مکان کے کس حصے
میں سو رہے ہیں؟ اس کے بعد آگے بات ہو سکے گی۔“

”میرے بھائی بھیجے اور ان کے بال بچے اور بوالی حیل پر
رہتے ہیں۔ ان سے میری بول چال بند ہے۔ تم مجھے ذرا بھی
کھدو کہ تو ان میں سے کوئی نیچے نہیں آئے گا۔“ وہ بڑبڑائی ہوئی
دھمی آواز میں بولا ”میری حیل پر میرے ساتھ دو ملازم رہتے ہیں۔
وہ اب دالے کمرے میں سو رہے ہوں گے۔“

”اور وہ عورت کہاں ہے جس سے تم شام کو اپنے لان پر گپ
شپ کر رہے تھے؟“

اس کی آنکھوں میں خوف کے ساتھ حیرت بھی تھینے لگی تھی
میں مس تھیلنگک کی تلاش ہے؟“

اس کی زبان سے مس تھیلنگک کا نام سننے ہی ایک بے
مناخ کالی میرے لیوں تک اُکڑ گئی۔ ”بچھلے افادہ گفتگوں میں وہ
دراچھ تھا تو اب تھا جو سامنے آیا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں نہ
جانے کتنے جاسوس کو اپنی عداوتوں سے سیراب کیا تھا لیکن پھر بھی
اس نے ڈی ملے کے لئے تاکہ اپنے رہتا پسند کیا تھا۔ شاید اس لئے
کہ وطن ہوئی عمر کے نزدیک ہے مرد ہر حسین اور عمر مڑھڑی پر مڑھڑے
کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ لڑکی اگر کتواری ہو تو اس کی عمر
موت کی صورت کی جاتی ہے۔“

”پلے دیوے سوزی بن کر اول خان کے جاشین پر ڈورے
ڈالنے کی کوشش کیس۔“ پھر وہ مل بیٹھو پل میں وہ تھیلنگک وہ
کے اپنے مس یا مسز ہونے کا ذکر نہیں کیا تھا لیکن وہ مل

جا کے اس لئے فوری نتائج کے حصول کے لئے غی کو مہیا
 انا سہا گیا تھا۔

ان لوگوں کو بلو کر اس ڈیل کی خبر مل چکی تھی۔ جو سو فیصد
 حقائق اسٹیٹس اور سائنڈ سامان پر مشتمل کمپنی امریکی
 برادر محاس سے پاکستان کے لئے روانہ ہو چکی تھی۔ وہ اپنے
 والی تھی۔ پاکستان جس نے کسی بھی ہتھیاری امداد کے بغیر
 اسٹیٹس اسٹور حاصل کر لی تھی۔ امریکی اسٹیٹس سامان مل جائے
 بعد تکلیف ہی مدت میں پوری دنیا کو چھٹا دینے کی صلاحیت
 تھا اس لئے وہ براہ کوس کمپنی کی تباہی پر مامور کیا گیا تھا۔

بلوچ کر اس ذلیل دالے معاملے کی روشنی میں دیکھ کر اس سے ملاقات بہت اہم اور معنی خیز نظر آتی تھی۔ سویرے اس اجڑا ہوا کرتے ہوئے، جس طرح کڑے موٹے اکھیرنے کی طرح تھی اس سے یہ ظاہر ہوا تھا کہ شی کو ایسا مواد جس کی کڑی داری بھی سوچ دی گئی تھی جس کی تشہیر کے ذریعے اس کی اصلاح اور انہیں کے خلاف بھڑکایا جاسکے۔ وہ ایک مرموز اور کھلم سازش تھی لیکن شی دالے اعلیٰ اخلاقی اقدار کے حامل تھے۔ کے لو میں بال حلال کی کوئی توبہ نہ تھی۔ ان کا کام یہ تھا اخلاقی اور معاشرتی اقدار کی دھجیاں اڑانا تھا۔ وہ پہلی ہی کے ساتھ اپنے ان فرائض منصبی کی انجام دہی میں مصروف! ہم ان کی ایک راہ روکتے تھے تو وہ دوسرے راستے پر چل پڑے۔

انہوں نے پاکستان کے عمر گمراہ اور کوچہ کوچے میں بیوا
وہا پھیلا دی تھی۔ اپنے بے راہ دونوںوں کو اس سوزی
بچانے کے لئے انہوں نے معصوم پاکستانی بچوں تک کو اس
مجموعہ کا حصہ وہ کام انہوں نے ضمیر فروش پاکستانیوں سے
تھا جین منصوبہ ساز وہ خود تھے جن دنوں طلب کے مقابلے
بیرون بیرون کی تمام اور رسد بہت تھی اُن دنوں اس جملے کے
آسمان کو چھو رہے تھے فی والدین نے جس جیسے سے لئے
سارے، تقسیم کنندگان کا ایک منظم جال بچہ کر چاکا ہٹا
جس کا بحران پیدا کیا اور اس خلا سے بھر دیا قاعدہ افغانیہ
میں دوپے بابت والی بیرون کی ہڑا وہ دوپے میں ہر نشہ
پہنچا دی۔ نئے نشے میں تیزی کے ساتھ سرور بھی زیادہ قاعدہ
دونوں میں ٹیکڈوں، بھڑامزدوں بلکہ لاکھوں کے انہماک اس
مستوف کے غلام ہوتے چلے گئے مقصد حاصل ہوتے ہی
خزانے کی سواہی کاری، بھڑو راج ختم کردی۔ بیرون کی
گلی لیکن جو لوگ اس کے غلام تھے وہ اپنے ہی بچوں کا
کر اور جی رہی کہ کبھی اسے خریدنے پر مجبور تھے۔

رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ خیروں کے بازو اس طرح راہوں سے لے کر مائتوں کے نمدی ٹائلوں تک میں زمین پر نظر آئے گئیں۔

تھوڑے آناٹکئی سکول سے قتل کے ہماری ذمہ داریوں کا سراغ ملا
 عاصم شاہ ایران کے اہل پاکستانی عکروں نے مزید پیش رفت
 کے بغیر ان سکول کو پل کر ملا۔ شاہ کا خیال تھا کہ شہر کے سرحد
 کے قریب پاکستان میں کے نہیں کھوئے کی داغ بیل ڈال دی تو
 ایرانی قتل کے ذخائر ہی طرح حادثہ ہوں گے میں نے اس کی
 باتوں سے اندازہ لگا لیا کہ وہ اسی بارے میں کئی سراغ حاصل کرنے
 آئی تھی۔“

اس کی آنکھوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا لیکن اس کی جچی باتوں نے صورتِ حال کو بری طرح الجھا کر رکھ دیا تھا۔

بلو کر اس ذیل کے حوالے سے مجھے پہلے ہی سمجھ چکا تھا کہ شی
ان دنوں یک بیک ایران پر مہمان ہو گئی تھی۔ شی بظاہر منظم
گھرموں کی ایک بین الاقوامی تنظیم تھی جو بیرون کے کامدار پرانی
اجاہ و ادبی کے لئے کوشش تھی لیکن دنیا کے ہر بڑے جرائم پیشہ
گروہ کی طرح اسے بھی ایک طاقتور ملک کی پشت پناہی حاصل تھی
بلکہ میں تو یہاں تک سن چکا تھا کہ شی امریکا ہی کی ہوندہ تھی اور
اس کا سربراہ جمی ٹاگلبر براہ راست صدر امریکا کو جواب دہ ہونے
کی دج سے بے پناہ طاقت اور اثر و رسوخ کا مالک تھا۔ یہ ایک طے
شدہ اتفاقی حقیقت ہے کہ مقتدر ملتوں کی سرپرستی کے بغیر دنیا کے
کسی خطے میں جرائم چل چول نہیں سکتے۔ چھوٹے گھرموں کو بااثر
افراد کی سرپرستی حاصل ہوتی ہے اور بڑے گروہوں کو حکومتیں
اپنے مفادات کے لئے پناہی ہیں تاکہ جو کام قانون کی کندھار سے
سراجام نہ دیا جاسکے وہ ان خود پیشوں کے حوالے کر دیا جائے
جو ہر قیمت پر اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے سے واقف ہوتے
ہیں۔

ہمارے فلسفے میں امریکا کے طویل المدت مفادات کسی سے ڈھکے چھپے نہیں تھے۔ جب تک ایران میں شاہ کا اقتدار مضبوط تھا تو امریکا والوں کو بے فکر تھی کہ علاقے میں ان کا سب سے بڑا حریف موجود تھا لیکن شاہ کے عہدِ ناک زوال کے بعد نئے میں تہذیبیاتی دہلاؤ ہوئیں اور ان لوگوں نے ایران سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ ان کا خیال تھا کہ آزادی اور مغربی راہ رہدہی کے دلدادہ شمری محاشرے اس مذہبی دکان کو قبضل میں کر سگے جس کا لغو کرے اگر ان کی انتھانی قیادت میدان میں اتڑی مگی۔

لیکن اب اندازہ ہو رہا تھا کہ امریکی قیادت نے ایران کا
مشاہدہ کرنے کی پالیسی ترک کر کے، کچھ کرکڑیے کا فیصلہ کر لیا تھا۔
یہ وہ بدداشت نہیں کر سکتے تھے کہ ایران کو پاکستان جیسے ملک کے
ساتھ ٹھیکس پیمانے کا موقع ملے جسے اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کے میدان میں
سنسٹی خیز پیش رفت حاصل ہو چکی تھی۔

سیاسی محاذ پر ایسے متناظر منصوبوں کی کامیابی کا امکان کم تھا جن کی وجہ سے دونوں حکومتوں کو ایک دوسرے سے بدعین کیا

مٹے ہوئے برقان زندہ چہرے، زندگی کی ہر رت سے محروم ہے
 نور آنکھیں، اٹکے ہوئے کندے ہال، بوسے ہوئے کراہت انگیز
 ناخن اور میل کی تلوں میں لپٹے ہوئے جسم پینے پرانے کپڑوں میں
 ہر طرف رینگتے ہوئے نظر آنے لگے۔ ان کی ظاہری حالت جبرت
 ناک نظر آتی ہے ان کے اپنے ان سے غرت کرنے پر مجبور
 ہو جاتے ہیں لیکن وہ اپنے گرد و پیش سے بے خبر اپنے تصورات کی
 رنگین دنیا میں کھوئے رہتے ہیں۔ ہیروئن کے چند کشن ان لڑکیاں
 قلاموں کو ایسے جہانوں میں لے جاتے ہیں جہاں وہ حسینوں کے
 جبروت میں گھرے، ہر ایک کی نگاہوں کا مرکز ہوتے ہیں ان کے
 ہر انداز سے امارت چمکتی ہے، وہ دولت کے انبار لٹاتے ہیں، لمبی لمبی
 گاڑیوں میں سر کرتے ہیں اور جب ان کا نشہ ٹوٹتا ہے تو ان کے
 منہ سے خواب بھر جاتے ہیں۔ وہ اپنے غلیظ سراپے کو پہچاننے سے
 منکر ہو جاتے ہیں، ان کے پیٹ میں درد کے گولے چکرانے لگتے
 ہیں، ہاتھ پر ٹوٹنے لگتے ہیں، اعصاب جھنجھ کی حد تک کشیدہ
 ہو جاتے ہیں، بصارت دھندلانے لگتی ہے اور دماغ ماؤف ہو جاتا
 ہے۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب وہ نیم وا آنکھوں کے ساتھ کرب کے
 عالم میں تر پڑتے اور چلاتے ہیں۔ وہ موت کے طلب گار ہوتے ہیں
 لیکن قزاقی اہل ہیروئن کے چھوٹ کو پہچانتا ہے۔ وہ ان سے دور
 بھاگتا ہے اور پھر ان کے بھروسے سے کوئی بیک کر بازار سے خود
 زہر کی پڑیا خرید کر لاتا ہے اور سر موڑ کر، فنکار آنکھوں کے
 ساتھ پڑیا انہیں تمہارا اپنے بستر میں جاگرتا ہے۔ بے بسی کے ساتھ
 تکیوں میں اپنا سر پک پک کر دوتا اور ہلکا ہے لیکن سب کچھ
 جانتے بوجھتے ہوئے بھی وہ اگلے روز اپنے اسی ہیروئن زندہ لخت جگر
 کے لئے زہر کی پڑیا خریدنے پر مجبور ہوتا ہے۔

شی کا دہی ایک جرم ناقابل معافی تھا لیکن وہ ان کا آخری جرم
 نہیں تھا۔ انہوں نے ملا سرکار کی سرپرستی میں سندھ میں بغاوت اور
 خون ریزی کی ایک بھیاں سازش کو پروان چڑھا۔ کانڈر کے
 دستوں کو شب خون مارنے کے لئے سرحد پر لا کھڑا کیا، الجھید میں
 جدید ترین اسلحے کی بہت بڑی کیمپ ملک میں اسلحہ کے ذخائر
 کے ہاتھ مضبوط کرنے کی کوشش کی اور اب وہ بلوچ کراس ڈیل کو تیار
 کرنے کے درپے تھے۔

مجھے غلط یہ تھی کہ وہ اب جو کچھ کر رہی تھی، مکمل کر کر رہی
 تھی۔ ایرانی سرزمین پر اپنی آلات اور سامان کی تباہی کے اس
 مشن کے بارے میں مجھے شی کے ایک پرانے آنی میں، اکبر سے
 معلوم ہوا تھا لیکن ڈی ملو کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔
 اگر وہ اب ہوسٹل میں پھنس چکا تھا اور پھر ٹیل انجیل میں ڈی ملو کے گھر
 کا پتہ دہج نہ کرائی تو ہمارے فرشتے بھی اس تک نہیں پہنچ سکتے تھے
 لیکن ایسا معلوم ہوا تھا کہ وہ اب مجھے چرانے اور شکست کے
 احساس سے دوچار کرانے کے لئے دانستہ ہر جگہ اپنا کوئی نہ کوئی
 سراغ چھوڑتی جا رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ جب تک وہ اس خطے

میں مظلانی رہے گی، میں ہر قیمت پر اس کا پیچھا کر دوں گا اور
 باوجود ان دونوں مقامات تک پہنچ جاؤں گا جہاں وہ قید ہو گئی ہے
 نام سے پہنچی تھی اور اس کے صاف کھل جانے پر میں جھٹکا ہوں گا۔
 جھٹکا ہو جاؤں گا۔

وہ خیالات کا ایک بہت طویل سلسلہ تھا لیکن عمل اور
 خیالات میں سب سے بڑا فرق یہی ہوتا ہے کہ عمل ہر قیمت پر
 وقت لیتا ہے۔ اس وقت کو ایک حد تک مختصر کر دیا جاسکتا ہے
 آگے رکاوٹ آ جاتی ہے جب کہ تصورات اور خیالات بروقت
 کوئی پابندی نہیں ہوتی انسان کوئی عی کوئی بلکہ پلک جھپکے
 صدیوں کے فاصلے طے کرنے کی استطاعت رکھتا ہے۔

”تو تم نے اسے کیا بتایا؟ ان افواہوں میں کتنا وزن ہے؟
 نے چند ٹانگوں کی ٹھکر آئیز خاموشی کے بعد اس سے چپکے سے
 سوال کیا۔

”میں جموٹ سے نفرت کرتا ہوں“ اس نے گہرے سنجیدگی
 کا ”ان افواہوں میں کوئی صداقت نہیں ہے۔ ان کی بنیاد خود
 فیوں یا غلط فہمیوں سے پڑی تھی۔“

”میں اب بھی سننا چاہوں گا“ میں نے کہا ”یہ وضاحت نہ
 قیلا کو بھی دی ہوگی؟“

”وضاحت ناگزیر تھی۔ ایک پیشہ ور فنی ماہر اور عام آدمی
 میں تو ذرا سا فرق ہوتا ہے“ وہ خوف اور دہشت کے ابتدائی
 سے خاصی حد تک سنبھل چکا تھا ”تعلیم کی تلاش میں کئی
 تحقیق اور محنت ریزی کے بعد کھوے جاتے ہیں کیونکہ ان پر
 وقت اور سرمایہ صرف ہوتا ہے۔ اس لئے ہر کوشش کی یہ میں
 تعلیم کا سراغ مل جاتا ہے لیکن اصل بات منافع بخش ہے اور
 ہوتی ہے۔ بلوچستان کے کنوئوں میں تعلیم ضرور دریافت ہوا تھا
 اس کی مقدار اتنی ناگانی تھی کہ اس سے میخوں کی لاگت بھی
 نکل سکتی تھی۔ اس لئے وہ کوشش بند کر دی گئی۔ اُن بڑے لوگوں
 نے ڈرنک کے آلات پر تعلیم کی چٹائی دیکھ کر یہ فرض کر لیا کہ
 کی زمین..... تعلیم سے مالا مال ہے مگر حکومت نے اپنی
 وجہ سے کام روک دیا۔“

”اور اسے تمہاری وضاحتوں پر یقین آ گیا؟“ میں نے پوچھا
 ہوئے لمحے میں پوچھا۔

”وہ خاصی ذہین تھی۔ فنی باریکیوں کو بھی کسی حد تک
 رہی تھی اس لئے اس نے مجھ سے بحث نہیں کی۔ میرا خیال ہے
 وہ یہاں سے مطمئن ہو کر گئی ہے۔“

”اس نے یہ نہیں پوچھا کہ بے درپے ناکیوں کے باوجود
 کچھ سال تک وہاں کیا کرتے رہے؟“

”اس شکار آئل فیلڈ میں ڈرنک آسان کام نہیں تھا
 رسل ورسائل کی دشواریوں کی وجہ سے ہماری آلات اور
 لے جانے میں بہت وقت صرف ہوا۔ اس علاقے کی قدرتی سائنس

”دوا لگی ہے پہلے وہ ڈائریٹر واپس لے لے گی۔ اگر تم یہ شبہ کر رہے ہو کہ اس کا اور میرا اپنا ساتھ ہے تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے جسے تم اس سے بات کر کے دور کر سکتے ہو۔“

”میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اس کے لئے تم سے مسلسل رابطہ رکھنا اس قدر ضروری کیوں ہے؟ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ خصوصی اجازت نامے کے بغیر ایسے حالات کا رکھنا سنگین جرم ہے۔“

”اس کے مقابلے میں کسی بے ضرر فہمی پر بھرا ہوا ہسپتال تان کر اسے گمراہ نیند سے بیدار کر دینا زیادہ بڑا جرم ہے۔“ وہ رفتہ رفتہ اپنے اور قابو پاتا جانا تھا۔

”یہ فیصلہ ہونا پانی ہے کہ تم بے ضرر فہمی ہو یا کسی مجاہدانہ سازش کے شریک ہو۔“

”تم کون ہو اور تمہیلا کو کیوں تلاش کر رہے ہو؟“ اس نے چونک کر پوچھا۔

”وہ ایک ہندی مجرم ہے۔ وہ قانون کے باقصول سے کسی بچھی مچھلی کی طرح پھسل کر گھل جاتی ہے۔ اس لئے ہم اسے دوسرے طریقوں سے گھیرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“ اس سے بات کرتے ہوئے ”میں نے اپریش کا سونچا آج کر دیا جس کے ساتھ ہی اس کے ایک حصے میں ختماسا سرخ بلب روشن ہو گیا۔

”ہیلو، تمہیلا! میں پنیرک ڈی ملو کے گھر سے بول رہا ہوں۔“ چند ٹائمن بعد میں نے کہا۔

”کون بول رہا ہے؟“ چند ٹائمن کے بعد اپریش پر ویرا کی فونوہ آواز ابھری۔ وہ شاید آواز سن کر نیند سے بیدار ہوئی تھی اور انگریزی بول رہی تھی۔

”میں تمہارے شوہر رائی تلک کی تلاش میں ہوں۔“ میں نے اردو میں کہا۔

”وہ!“ اس کی حقیرانہ آواز ابھری ”جو بالآخر تم وہاں بھی پہنچ ہی گئے؟“

اس بار وہ اردو میں مخاطب ہوئی تھی جس پر ڈی ملو کا منہ حیرت سے کھل گیا اور وہ بے ساختہ بولا ”یہ تو اردو بھی بول لیتی ہے!“

”ہاں، پنیرک!“ ڈی ملو کے تہربے پر ویرا کی آواز ابھری۔ ”اردو ہی نہیں، میں پشتو بھی خاصی روانی سے بول سکتی ہوں۔ تم نے انگریزی میں کئے گئے سوالات کے جوابات انگریزی ہی میں دئے اس لئے مجھے اپنی اردو دانیا کا اعتراف کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔“

”اب اسے یہ بھی بتادو کہ تم نے آسٹریلیا میں اردو کس سے سیکھی تھی؟“ میں نے کہا۔

”سوری پنیرک!“ ویرا کی آواز ابھری ”مجھے افسوس ہے کہ تم نادان فحش میں میرے آواز کار بن گئے تم بہت شریف اور رنگ

کی باری ہے۔“

”مجھے حیرت ہے کہ آسٹریلیا جیسے دور دراز ریاستوں سے آنی ہوئی ہمارے گھر نے اس کی قیام گاہ کے بارے میں پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی!“

”چچا تھا۔ وہ کسی دوست کے ساتھ ٹھہری ہوئی ہے۔ میں نے واپس کے لئے اسے اپنی کارڈرائیور سمیت دی تھی لیکن وہ گزری سے ٹھیکسی میں چلی گئی۔ میرا ڈرائیور اسے وہاں اتار کر لوٹ گیا تھا۔“

”اب اگر تم اس سے رابطہ کرنا چاہو تو کیا صورت ہوگی؟“ میں نے پوچھا۔

”میرا خیال ہے کہ تم مجھ پر شبہ کر رہے ہو۔“ اس نے کسی باگاری کی بغیر کہا ”میرے بابت بار کے اصرار پر بھی اس نے مجھے اپنا کوئی فون نمبر نہیں دیا البتہ چلتے چلتے وہ مجھے ایک ڈیل فری کو سنسی ڈرائیو میٹر دے گئی تھی جس پر اس سے وقت ضرورت رابطہ کیا جاسکتا ہے۔ تم چاہو تو خود اس سے بات کر سکتے ہو۔“

”اتنی اہم بات اس نے اس قدر تاخیر کے ساتھ اور اتنے برسرِ انداز میں بتائی تھی کہ میری کھوپڑی جیج اٹھی تو میرا منہ کیا دیکھ رہا ہے وہ ڈرائیو میٹر کہاں ہے؟“

”اس بارے میں تم نے پوچھا ہی نہیں تھا۔“ اس نے سادگی سے کہا اور اپنی بیڈ ساؤنڈ ٹیکل کی دروازے چو کور اور مختصر سا پریش ٹال کر میرے حوالے کر دیا۔

میرے لئے وہ اپریش نیا تھا کہ میں اس کی کارکردگی کے بارے میں سن چکا تھا۔ اس آلے میں دونوں فریقوں کے لئے الگ الگ لڑی کو سننے والے دو ڈائریٹر لٹکا کر دئے جاتے تھے۔ جس کے نتیجے میں اسے فون کی طرح استعمال کیا جاسکتا تھا۔ دونوں طرف سے ایک وقت گفتگو شروع کئے جانے کی صورت میں آلے کے صوتی ظام پر ریڈیائی سکوت طاری نہیں ہوتا تھا بلکہ دونوں ہی ایک وقت ایک دوسرے کی بات سن سکتے تھے۔ اسی کے ساتھ گفتگو نشر کرنے کے لئے کسی ٹیپن وغیرہ کو دہانے کی ضرورت بھی پیش نہیں آتی تھی کیونکہ سونچا آج کر دئے ہی دونوں سرکٹ ایک ساتھ آن ہو جاتے تھے۔

”یہ خاصا قیمتی آلہ ہے جو وہ تمہارے حوالے کر گئی ہے۔“ میں نے طنز لے کر کہا اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”اس کی ریج کیا ہے؟“

”مجھے نہیں معلوم نہ مجھے یہ اندازہ تھا کہ یہ کتنی باایت کا ہے۔“

”سو کو میٹر!“ میں نے اپریش کی نیم پلیٹ پر سے پڑھتے ہوئے کہا ”اس کا مطلب ہوا کہ تمہیلا کے آسٹریلیا روانہ ہونے کے بعد یہ بیکار ہو جائے گا۔“

دونوں مل کر دو چار سال ہی میں بچوں کے ڈیر لگا سکے ہو۔ اپنے بچوں کو پالنے کی بات اور ہی ہوتی۔“

”شٹ اپ!“ وہ میری بات کاٹ کر اونچی آواز میں دہانک مسموم ہوتا ہے کہ بے درپے چمکے کھانے کے بعد تمہارا دل چل گیا ہے۔ میں تمہارا۔“

”تمہارا ضمیر ہونے کی ضرورت نہیں، دیر اپنے لی بائیں میاں سے نسنے کے بعد تم سے بات کموں کا“ میں نے اُس کی بات کاٹ کر جیڑی سے کما اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

”تم نے سن لیا کہ میں بالکل بے قصور ہوں“ ڈی جی بھڑک کر ہوتی آواز میں بولا ”تجائیں مجھے میرے کس گناہ کی سزا مل رہی ہے۔ میں اسے نامہ نگاری سمجھا تھا۔“

”تم نے سن لی یا یہ کہ اس کا نام تھیلا گنگ نہیں، بلکہ دیر ہے۔ یہ خود مروت بدحاشوں کی بدحاش ہے۔“ میں نے کہہ ”اب اگر تم نے اس سے واسطہ رکھا یا اس باسے میں اپنی زبان بند نہ رکھی تو تم بے موت مارے جاؤ گے۔ دیرا کے تمام دشمن ہماری طرح نیک نفس اور شریف نہیں ہیں۔“

پتیل کی چال پر سترے اٹھائے جانے پر بھڑک ڈی جی بھڑکی طرح خوف زدہ ہو گیا تھا، لیکن اس کا خیر صاف تھا اس نے اُس نے جلد ہی اپنے اوسان پر قابو پایا تھا لیکن اپریش پر دیرا سے ہونے والی گفتگو کے بعد وہ واضح طور پر تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا اور اُسے میری اس بات میں کہ ہمارا قطعی علاج دشمن عناصر کی سرکوبی کرنے والوں سے تھا بوجہ نظر آنے لگا تھا۔

اس صورت حال کا ادراک ہوتے ہی وہ ہماری خوشامطاب اتر آیا اور ہم اسے ابھی طرح خوف زدہ کرنے کے بعد اُسی راستے سے اُس کی خواب گاہ سے نکل گئے، جدھر سے اندر داخل ہوئے تھے۔ جانے سے پہلے میں نے اسے یہ بتا دیا تھا کہ اسے اپنے چوکیدار کو بھی زبان بند رکھنے پر آمادہ کرنا ہوگا۔ اگر وہ مسموم مسلمانوں کے ہاتھوں اپنی درگت بنائی جانے کی کافی عام کردہ ترقی ملو بھی مشکلات سے دوچار ہو سکتا تھا۔

”یہ تو کچھ بھی نہ ہوا“ بیپ روانہ ہونے کے بعد ارشد نے باپو سانہ لہجے میں کہا۔

”اور کچھ ہوا یا نہ ہوا لیکن اس سے رابطے کا ایک ذریعہ ہمارے ہاتھ آ گیا ہے۔“

سلطان شاہ کے استفسار پر میں نے اسے ڈی جی کی خواب گاہ میں پیش آنے والے واقعات سے آگاہ کر دیا۔ انجیل ایک فورس میں ہونے کی وجہ سے ارشد اور اکبر کو یہ اندازہ تو ہو گیا تھا دیرا کو یونین الاقوامی مجرمہ تھی جو پاکستان میں چوری چھپے مل دھن کاروائیوں میں مصروف تھی لیکن انہیں دیرا کی ذات سے لاحق ظہین خطرات کا پورا ادراک نہیں تھا اسی وجہ سے وہ ڈی جی کے مکان پر چھاپے کی قسم کو چھپسٹا اور رو قرار دے رہے تھے۔

”فلس آدمی ہو۔ تمہارا قصور صرف اتنا ہے کہ تمہارے گیت پر تمہاری غیر ملیت بہت نمایاں ہے۔ مجھے اپنا جال بچانے کے لئے ایک حقیقی بچے کی ضرورت تھی اس لئے میں نے اتفاقاً تمہاری طرف سے گزرتے ہوئے تمہارا پتا نوٹ کر لیا۔ جو شخص تمہارے دوست موجود ہے، میں اسی کو گھیرنا چاہتی تھی۔ مجھے پورا یقین تھا کہ یہ میرا بچھا کرنا ہوا، برائے جگہ پر بچنے کا جہاں سے اسے میرا سراغ ملنے کی امید ہوگی یہ اور بات ہے کہ یہ میری توقع سے کہیں پہلے تم تک پہنچ گیا۔“

”جہاں ہوا کہ تم نے خودی اس کی ملا جی دور کوئی ورنہ یہ اپنا اعتراف شائع ہونے کی حسرت اپنے دل میں لئے بیٹھا رہتا۔“ میں نے کہا۔

”میرا تم تک پہنچنا ضروری تھا، پیٹرک!“ دیرا کی آواز آئی۔ ”میکو گنگ میں تمہارے پاس اپنا اپریش چھوڑنا چاہتی تھی تاکہ یہ تمہارے ذریعے ڈی جی کے ہاتھوں میں پہنچ جائے اور میں اس سے بات کر سکوں۔ تم تک غیر متوجہ انداز میں رسائی کے لئے میں نے تمہارے ہاتھ میں معلومات جمع کیں اور پھر تمہارے پیچھے کے حوالے سے تم تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی۔ میں کسی ہانے کے بغیر آئی تو شاید تم مجھ سے ملنے سے ہی انکار کر دیتے۔ مجھے امید ہے کہ تم میری اس حرکت کو معاف کر دو گے۔“

”جیسی مردوں کو پھانسنے میں تمہیں ہمیشہ لطف آتا ہے“ دیرا ڈارنگ!“ میں نے زہر پلے لہجے میں کہا۔ اس نے میرا نام لے کر مجھے بھی ہر بحریم ختم کرنے کا موقع فراہم کر دیا تھا۔

”تمہیں اس بات سے خاصی مایوسی ہوئی ہوگی کہ ڈی جی ملنے کے بعد اس کے اختتام پر تمہیں اپنی خواب گاہ میں شب بے بسی کی دعوت نہیں دی“ میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”تمہاری موت آگئی ہے“ ایک بیک دیرا کی آواز میں برہمی چوڑ کر آئی ”تم اپریش لے کر میاں سے کھڑا تاکہ میں تم سے کچھ کھلی کھلی باتیں کر سکوں۔“

اس دوران میں ارشد کسی ہوش کی طرح منہ پھاڑے سب کچھ سن رہا تھا۔

”زیادہ کھلی کھلی باتوں سے مجھے شرم آنے لگتی ہے“ میں نے اس کا مسکراتا اڑا ہونے کہا ”بہتر یہی ہوگا کہ مجھ سے باتیں کرنے کے بجائے تم اپنے کام سے کام رکھو اور میں اپنا کام کرتا رہوں۔“ ”تم کسی حتمی چیز کی طرح چپ کر رکھ دے جاؤ گے میری یہ پیش گوئی یاد رکھنا کیونکہ اب میں نے تمہاری حمایت سے ہاتھ ہٹا لیا ہے۔“

”تمہارا ضمیر ہونے کی ضرورت نہیں، ڈارنگ!“ میں نے پر غلوں لہجے میں کہا ”میں جانتا ہوں کہ میری حمایت سے دستبردار ہو کر تم نے دوسروں کے شیر خوار بچوں کی سرپرستی شروع کر دی ہے۔ تم چاہو تو اب بھی سلطان شاہ سے بات کی جا سکتی ہے۔ تم

ان سنی خیز اور لرنہ خیز واقعات کے تسلسل نے غلام رسول کی کمائی کو بہت بڑا سراں بنا دیا تھا اور لوگ اس کے ہاں سے بہت کچھ قیاسات لے بیٹھے تھے مگر میری اور ظفر کی مشترکہ کاوشوں کے نتیجے میں اپنی زمین کے اس غدار کو میری ناک انجام کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

وہ اپنی ظفری موت مرا تھا لیکن اس کی لاش جن حالات میں ہمارے ہاتھ لگی تھی وہ بہت گرا انگیز تھی اور غلام کو سرخوڑ کر یہ سوچنے پر مجبور ہونا پڑا تھا کہ اس ملک دشمن سازشی کے بارے میں عوام کو کن تفصیلات سے آگاہ کیا جائے؟ اس کے حامیوں کے کسی بھی پُر تشدد دعوے کا توڑ کرنے کے لئے اس بارے میں مجھے خود خوش کی ضرورت تھی جس کے لئے سب متعلقہ فریق اسٹیشن فور پر جمع تھے۔

ان حالات میں ظفر سے فوری طور پر ملاقات ہونے کی کوئی امید نہیں تھی۔ ویسے ہی غلام رسول کے معاملے میں اپنا کلییدی کردار بخوبی ادا کر چکا تھا جس کے بعد میری وہاں موجودگی کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ جاگیر کا بیٹا سلطان اسٹیل سے برآمد کیا جا چکا تھا۔ ویرا کے بارے میں کم از کم اتنا سراغ مل چکا تھا کہ وہ کم از کم اس رات شہر میں ہی مقیم تھی۔ ان حالات میں میں نے اسٹیشن فور پر رک کر اپنی اور سلطان شاہ کی رات کالی کرنے کا ارادہ ترک کر دیا اور ہم دونوں اپنا مختصر سامان لے کر ایک ڈرائیو کے ساتھ اپنے اس قیث کی طرف روانہ ہو گئے جو چند دلوں سے حروک تھا۔

جاگیر کے شوپ کا دلوں کی قیث سے ہمارے فرار کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ویرا کے لئے وہ قیث ابھی نہیں تھا۔ وہاں رہنے اور کام کرنے والے جن لوگوں نے اسے دیکھا تھا وہ بھی اسے ہماری دوست کی حیثیت سے جانتے تھے اس لئے وہ انتقام لینے کیلئے ہماری بے خبری میں وہاں کوئی بھی ملک دار کر سکتی تھی۔ فوری طور پر اس قیث کو خیرباد کہہ کر میں نے یہ بندوبست کر لیا تھا کہ ویرا ہماری تلاش میں ادھر کا رخ کرے تو قیث کو غیر آباد دیکھ کر پوچھ ہو جائے وہاں ایک ہارٹ کی کھانے کے بعد وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ہم وہ قدرے کھوٹا ہونے والے آہٹیں گے اس اعتبار سے وہ قیث اس وقت ہمارے لئے خیر دوش نہیں رہا تھا۔

ہوئی اور اسٹیشن فور کے معاملے میں قیث ہمیں ایک نعمت محسوس ہوا۔ آزادی کا ایک عجیب سا احساس تھا جسے کوئی نام دینا ممکن نہیں تھا۔ البتہ میں نے یہ احتیاط ضروری کر کے کہوں کے بلب روشن کئے تھے باہر کی طرف کھلنے والی کھڑکیوں اور گیلری کے دو دروازوں پر دھڑکے ہوئے کھینچ دئے تاکہ اگلی سڑک پر سے قیث میں روشنی یا کسی کی موجودگی کا اندازہ نہ لگائے کا امکان باقی نہ رہے۔

اس کام سے منت کر میں ڈرائیو کے اندر میں آیا اور اپریش سنبھال لیا۔

ان کی دانت میں مادہ حار اور پکڑ چھو کے بغیر ہونے والی کوئی بھی کارروائی پوری طرح کامیاب نہیں کی جاسکتی تھی۔

غلام رسول کے سلسلے میں ظفر کی حد سے بڑھی ہوئی مصروفیات کی وجہ سے مجھے براہ راست ان دونوں سے کام لینا پڑا تھا ورنہ اصلی طور پر ایسی ہی ایف کے ماتحت ملنے سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا اس لئے میں نے اس صبح کے بارے میں ان دونوں سے کوئی اختلاف رائے نہیں کیا۔

سلطان شاہ کا مشورہ تھا کہ میں راستے ہی میں دوبارہ اپریش آن کر کے یہ دیکھوں کہ ویرا مجھ سے کیا بات کر رہی تھی لیکن میں نے اپنی غیر حاضر مافی اور پرائیڈ کی کاباہر کے اسے خوب سواری کے ساتھ ٹال دیا۔ دراصل میں ارشد اور اکبر کے سامنے دیر سے بات کرنے سے کتراتا تھا۔ وہ ضرورت سے زیادہ منت بہت اور بے شرم تھی۔ تنگدستی کے دوران میں اس کی زبان سے کوئی بلی بھائی بات نکل جاتی تو میرے اور اس کے مراسم کے بارے میں ایسی ہی ایف میں کمائیاں جنم لے سکتی تھیں۔

ہماری جیب اسٹیشن فور پہنچی تو وہاں گاڑیوں کا خاصا جھوم تھا۔ سرکاری نمبر لپٹ والی تنگدستی گاڑیوں میں ایک سیاہ ہینڈ کار ڈالسی بھی تھی جس کے اگلے پیر اور لیڈر کے ساتھ لگے ہوئے فلک پہل پر چڑی غلاف چڑھا ہوا تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ مرکزی یا صوبائی وزیر کی سطح کا بھی کوئی اہل کار اس اجلاس میں شریک تھا جس کی تپاریوں نے ظفر کو مصروف رکھا ہوا تھا۔

حقیقت یہ تھی کہ غلام رسول کو ملک کے ٹیک نام سیاست دانوں میں خاصی اہمیت حاصل تھی۔ اپنے سرورٹی علاقے ملک صوبے سے باہر بھی اس کی بات کو فور سے سنا جاتا تھا کیونکہ اس کا نامی صاف ستھرا اور کنڈرا بالکل بے داغ تھا۔ مگر سرکار کے معاملے میں وہ جس طرح ٹوٹ تھا وہ ناقابلِ یقین تھا۔ دوسری طرف غلام کی مجبوری یہ تھی کہ اس پر سے قیثے میں مگر سرکار کا نام نہ لکھ کر نہیں لایا گیا تھا اس لئے غلام رسول مجھے متنبی لینے کی گولڈی کا مناسب جواب دینا پڑا تھا لیکن پھر اس کا نام مختل ڈاکو سوار رجب علی کی بے رحمانہ کارروائیوں سے غمگن کیا گیا تو لگ بھگ انہی گئے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اقتدار کی ہوس میں روشن چہلوں والے رہنما ایسی سیاہ کاریوں میں بھی جھلا ہو سکتے ہیں۔

وہ ایک بہت اہم واقعہ تھا جس نے ملک کے طویل و عرض میں تنگدستی کا پلاٹین پھر سیاست اور جرائم کے ایک نئے جوڑ توڑ نے ہم لیا اور ان تھری کی سخت ہدایات پر پولیس کے گھمے میں پلنے والی کال میٹروں کی مدد سے مافیا نے غلام رسول کو پولیس کی تحویل سے انکار کر لیا۔ ملک بھر میں کسی کو کالوں کا ان بھی خبر نہ ہو سکی کہ غلام رسول کو اغوا کرنے والے کون تھے اور ان کے کیا مقاصد تھے۔

نظر انداز کر کے بے احتیادی کی ایسی فضا پیدا کر دی کہ میں شدید جھلالت کے عالم میں غزالہ کو لے گئی۔ دو چار روز میں میرا حال ٹھنڈا ہوا تو میں خودی اسے چھوڑ دیتی۔

”یہ تمہارا سفید جھوٹ ہے۔ تم اسے شری مان سگھو گے حوالے کر کے ایران جانے کا منصوبہ بنا چکی تھیں۔ تمہاری دایلی تک غزالہ اُسی کی قید میں پھنسی رہتی۔“

”ایران میں میرا کام بہت مختصر سا ہے۔“ اس نے کہا چاہا لیکن میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

”مجھے سوشن آلات اور مٹھنوں کی تہا سی اتنی آسان ثابت نہیں ہو سکتی۔“

”یہ تمام خام خیالی ہے۔ آج کل کے زمانے میں بڑے بڑے کام پلک جھپکتے ہیں ہو جاتے ہیں۔“

”میرا حال میں تمہاری بدترین ناکامی کے لئے دعا نہیں کرنا رہوں گا۔“

پہلی بار اس کی ہنسی کی آواز ابھری اور وہ بولی۔ ”لوگوں کے کونے سے زحور نہیں مرا کرتے۔ میں جانتی ہوں کہ تم پر آج کل اپنے وطن سے محبت کا دھند پڑا ہوا ہے۔“

”میں اس طعنے پر شرمندہ نہیں ہوں۔ میں اپنے کسی کام سے ماضی کے گناہوں کی سیاحی و محو کا تو مجھے اپنے ضمیر کی عقل سے نجات مل جائے گی۔“

میری قطع کلائی کرتے ہوئے وہ ایک بار پھر ہنس پڑی۔ ”تو سوچ ہے پورے کر لینے کے بعد ہر ملی اسی طرح ج پر نکلنے کا قصد کرتی ہے۔ تم کوئی نئی بات نہیں کہہ رہے۔“

”تم ہزاروں کی تعداد پوری کر لینے کے باوجود نائب ہونے پر آمادہ نہیں ہو۔“

”میری بات مانو اور سلور آئیز میرے حوالے کر دو تو قائمہ میں رہو گے۔ یہ قائمہ ایسا ہی ہو گا کہ تم اپنی بقیہ زندگی سرافا کر گزار سکو گے۔ یہ سودا تمہارے ملک کے مفاد میں ہو گا۔“

”تم پر سے میرا اعتبار اٹھ چکا ہے لیکن پھر بھی میں یہ جانا ہند کھوں گا کہ تمہاری شیطانی کھوپڑی میں اب کون سا منصوبہ پروان چڑھ رہا ہے؟“

”جب تک تم نیکی نیتی سے سوچنے کا وعدہ نہیں کرو گے میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔“

”ہاں میں یہ سمجھوں کہ تم مجھے سودے بازی کی پیشکش کر رہی ہو؟“

”جو چاہے سمجھ لو مگر اصل بات وہی رہتی ہے کہ تم مجھے سلور آئیز دے دو تو میں تمہارے ملک کو ایک بہت بڑے خزانے سے بچا سکتی ہوں۔“

”تم بولتی رہو، میں سمجھوں گی سے سن رہا ہوں۔ میں نے ان

لقمہ ملا۔

مجھے پہلی بار دوا سے بات کئے کافی دیر ہو چکی تھی لیکن اس نے جس پھرتی سے میری کل کا جواب دیا اُس سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہی ملکہ تک میری رسائی نے اسے ابھرن میں جھلا کھڑا تھا جس کی وجہ سے وہ دوا سو نہیں سکی تھی۔

”تمہارے دماغ اور بدن میں واقعی کوئی غیث مدح ہی ہوئی ہے۔“ اس نے چھوٹی سی کہا۔ ”مجھے یہ اندازہ تو تھا کہ تم وہی ملکہ تک پہنچے ہیں کا سبب ہو جاؤ گے لیکن یہ وہم و گمان میں بھی نہیں قائم اتنی عقل مدت میں اُس کے سر پر سوار ہو جاؤ گے۔“

”مگر میرے قیدے پہنچنے کا ارادہ ہے تو مجھے سوچنا چاہئے۔“ میں نے تنگ لہجے میں کہا۔ ”میں حفاظت اور خاصیت کی ان راہوں پر چل پڑے ہیں جہاں حریف کی خیالوں بھی خرابیاں بن کر نظر آنے لگتی ہیں۔ ایسے میں تمہاری زبان سے نکلنے والے تفریحی کلمات عجیب مظلوم ہو رہے ہیں۔“

”دشمن کی خبیثوں کا اعتراف نہ کرنا کم عرفی سمجھتی ہوں۔ یہ نہ سمجھنا کہ میں تمہاری کامیابی سے خوف زدہ ہو گئی ہوں۔ میں تو صرف اپنی حیرت کا اعتراف کر رہی تھی۔“

”پھر میں بھی اعلیٰ عرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے حیرت ظاہر کرنے پر تمہارا شکریہ ادا کئے دیتا ہوں۔ اب اس سے آگے کی بات کر۔“ میں نے اپنے لہجے میں کوئی تبدیلی لائے بغیر کہا۔

”تمہیں یاد ہو گا کہ یورپ میں سلور آئیز کی تقسیم کے معاملے پر ہمارے درمیان ایک شرط نامہ سمجھوتا ہوا تھا۔ جس کی رو سے دو سلور آئیز میری ہیں۔“

”جب سے تم بد معاشری پر اتر آئی ہو، شرط نامہ معاہدوں کے بارے میں میری یادداشت نے میرا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ اب تو جو چیز جس کے قبضے میں ہے، وہی اس کا مالک ہے۔“

”تمہارے لئے وہ تینوں کے بیکار ہیں جب کہ مجھے دو کی ضرورت ہے۔“

”مجھے خوشی ہے کہ تم ان سے محروم ہو۔ اس سے پہلے تم خود کہہ چکی ہو کہ اب ٹی ٹی ہر آئی میں کی شناخت کا طریقہ بدل دیا گیا ہے اور سلور آئیز بیکار ہو چکی ہیں۔“

”وہ میرا بلف تھا۔“ اس نے شاید بے بسی کے ساتھ اعتراف کیا۔

”لیکن میں بلف نہیں چلاؤں۔ وہ تینوں سگے میری محفوظ تحویل میں ہیں۔ تم نے غزالہ کے ساتھ جو گھنٹیا ترین حرکت دہرائی ہے اس کے بعد تمہیں مجھ سے تعاون کی توقع کرتے ہوئے شرم آنی چاہئے۔ اس وقت میری اور تمہاری مکمل جنگ چل رہی ہے جس میں دوا معاشرتی امید بے سود ہے۔“

”میری سبزی کو میرے خلاف بھڑکا کر تم نے خودی غزالہ کی بہ حفاظت دایلی کی راہ میں دوڑے اٹکائے ہیں۔ ورنہ میں ضرور

اترے پر خودی اسے تم تک دایلی پہنچا دیتی۔ تم نے مجھے مسلسل

ختم کر دیں گی۔

”لیکن کس طرح؟“ میں نے پوچھا۔ ”کوئی معاہدہ کرنے سے پہلے مجھے اس سوال کا جواب جانے کا پورا پورا حق حاصل ہے جسے تم مسترد نہیں کر سکتیں۔“

”ڈائنامائٹ کا حلقہ اثر صرف ایک میل تک محدود ہے۔“ چند ثانیوں کی خاموشی کے بعد اس کی آواز ابھری۔ ”میں کسی طرح ہیٹ ایکس پیجر لے جانے والے ٹرک میں خرابی پیدا کر دوں گی تاکہ وہ کسی دیرانے میں کھڑا ہو جائے۔ ٹرک میں بڑی خرابی ہوگی تو بقیہ کارواں اسے وہیں چھوڑ کر آگے بڑھ جائے گا۔ اس نئی ودق ویرانے میں باہر ٹن ورنی آلے کو اتار کر دو سرے ٹرک پر منتقل کرنا ناممکن ہو گا اس لئے ٹرک کی حرکت کی کو شش کی جائے گی۔ اس دوران میں میرا کام مکمل ہو چکا ہو گا۔ میرا اشارہ ملتے ہی خلائی اشارے کے ذریعے اس ٹرک پر موجود ڈائنامائٹ اڑا دیا جائے گا۔ اس طرح صرف ایک آلے کی قربانی دے کر باقی پلانٹ اور آلات کو بچا لیا جائے گا۔“

اس کی باتیں سن کر میری پیشانی پر پسینے کے قطرے ابھر آئے۔ ”اس طرح تو ٹرک کا حملہ بے موت مارا جائے گا۔“ میں نے مضطرب لہجے میں کہا۔

”انہیں کوئی نہیں بچا سکے گا۔ بڑے مقاصد کے حصول کے لئے ایسی چھوٹی موتی قربانیاں دینی ہی پڑتی ہیں۔ ویسے میں تمہیں یہ بھی بتائے دیتی ہوں کہ مکمل معلومات حاصل کئے بغیر کوئی اجنبی اس خفیہ لیور تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔ میرا منصوبہ مکمل اور بے داغ ہے۔ دھماکے کے بعد مجھے سرخروئی حاصل ہو جائے گی۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکے گا کہ ٹرک کی خرابی میری سازش کا نتیجہ ہوگی۔ اسے ایک اتفاق قرار دے کر تمہارے ملک کے دشمن اپنے مقدر کی خرابی کا ماتم کرتے رہ جائیں گے۔“

”اس ناکا کی پر جھٹاکر تمہارے آقا اس کارواں پر دو سرا حملہ بھی کر سکتے ہیں۔“

”آج کل کے حالات میں وہ اس علاقے میں کسی کھلی ہوئی بریت کا ارتکاب نہیں کر سکیں گے اور چھپ چھپا کر اتنی بڑی کھپ کو نقصان پہنچانا ناممکن ہے۔ ڈائنامائٹ تو برسوں سے اس ہیٹ ایکس پیجر میں لگا ہوا ہے۔ وہ چولی کریت شاہ کے زمانے سے بندر عباس پر پڑے ہوئے تھے۔ دھماکے کو اتفاق قرار دیا جاتا۔ اسی لئے انہوں نے ڈائنامائٹ کو کام میں لانے کا فیصلہ کیا ہے۔ وہ کوئی ایسی حرکت کرنے کی حماقت نہیں کریں گے جس کے نتیجے میں ان کے عزائم اور حربے بے نقاب ہو جائیں۔“

”لیکن اس کھپ کی پاکستان منتقلی آج کا واقعہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی داغ بیل آٹھ دس ماہ پہلے ڈالی گئی ہو۔۔۔ یہ ایٹمی آلات اور مٹینیس دراصل شاہ ایران کو دی گئی تھیں جو امریکا کا سب سے بڑا اور قریبی حلیف تھا۔ پھر اس کھپ میں ایسا ڈائنامائٹ

میں چھ سو ٹن کی پوری کھپ کے بجائے باہر ٹن ورنی ایک سے کی تھی؟“ اسکا کون کی۔ بقیہ سامان بحفاظت تمہاری سرزمین پہنچ جائے گا۔“

اس کی دلچسپ واقعی اہم اور قابل غور تھی مگر میں نے فوری طور پر کما حقہ حصہ یقینہ کلیدی اہمیت رکھتا ہو گا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ تم اپنے مشن کی تکمیل کا ارادہ ترک کر دو؟“

”میں سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ میں نہیں چاہوں گی کہ وہ لوگ اس مشن پر کسی اور کو بھیج دیں گے جو اپنا کام کر گزرے گا۔ تم کو اپنی بات سمجھانے کے لئے مجھے ذرا تفصیل میں جانا ہو گا۔ اس کے بعد تمہیں میری دلچسپ کھش کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ ہو سکے گا۔“

”گھر نہ کرو رات اپنی ہی ہے۔ میں جگت میں کوئی فیصلہ نہیں کروں گا۔“

”چھ سو ٹن ورنی اس کھپ میں باہر ٹن کا ایک ایٹمی ہیٹ ایکس پیجر بھی ہے جس کے بیرونی آہنی خول کے ایک حصے میں لوہے کی دہری دیوار میں خوفناک طاقت والا ایک ڈائنامائٹ موجود ہے۔ عام حالات میں یہ ڈائنامائٹ بالکل بے ضرر ہے۔ ایران میں ان آلات کی تحصیب ہو جاتی تو ڈائنامائٹ کی موجودگی سے پلانٹ کی کارکردگی پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس ڈائنامائٹ کو اڑانے والے بقی سرٹک کے لئے ایک کیڈ میٹم کی۔ بیٹری لگی ہوئی ہے۔ بیٹری کو تاروں سے منسلک کرنے کے لئے آہنی خول سے باہر نکلے ہوئے ایک خاص لیور کو اندر دبا کر اوپر اٹھاتا ضروری ہے۔ اس کے بعد بیٹری سے سوئچ تک برقی رو دوڑ جائے گی اور وہ کام کرنے کی پوزیشن میں آجائے گا۔ وہ حساس سوئچ خلا میں موجود اسٹیشن سے ایک کھٹل کے ذریعے حرکت میں لایا جاسکتا ہے۔ لیور کو صحیح پوزیشن میں لائے جانے کے بعد ڈائنامائٹ کو کسی بھی لمحے ایک خلائی اشارے سے اڑایا جاسکتا ہے۔ مجھے اس لیور کے بارے میں مکمل یقین ہے دے دی گئی ہے۔ میرا کام صرف اتنا ہو گا کہ اس لیور کو دبا کر اوپر اٹھا دوں اور واپس لوٹ آؤں۔ میری بحفاظت واپسی کے بعد اس ڈائنامائٹ کو کسی بھی وقت اڑایا جاسکتا ہے۔ اس کا دھماکا اس قدر ہولناک اور شدید ہو گا کہ وہ ایک میل کے دائرے میں موجود ہر چیز کو فنا کر دے گا اور چھ سو ٹن مٹینیس لے جانے والا پورا کارواں بھسم ہو کر رہ جائے گا۔“

”یہ تو واقعی بہت خطرناک اور فیل پروف منصوبہ ہے۔ میری کھچ نہیں آتا کہ تم ہماری کیا مدد کر سکو گی۔ اگر تم نے یہ کام نہیں کیا تو پاکستان پہنچنے کے بعد بھی وہ سارا ساز و سامان جنم کے دبانے پر کھار ہے گا۔ کوئی دوسرا ایٹم لیور بدلنے کے کام پر مامور کر دیا جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ اس چھ سو ٹن کے ساتھ پاکستان کی دوسری اہم تنصیبات بھی تباہی سے دو چار ہو جائیں۔“

”مجھے سلور آئیز مل جائیں تو میں ایسے امکانات کو سرے سے

کیوں نصب کیا گیا جو ذرا سے اشارے پر پورے پلانٹ کو تباہ کرنے کی طاقت رکھتا ہے؟

”موقع کھیل میں کوئی کسی کا حلیف یا دوست نہیں ہوتا۔ ہر ایک موقع گئے پر دوسروں کا گھاکاٹ دینے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ڈائنامائٹ حفظاً مقدم کے طور پر نصب کیا گیا ہو۔ شاہ ایک بوڑھا انسان ہی تھا۔ وہ مسلسل اقتدار میں رہتا، جب بھی اسے ایک نہ ایک دن مرنا تھا۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ اس کے جانشین اسی کی طرح معاملہ فہم ثابت ہوتے۔ ان کی لگائی پٹاویں رکھنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ ان کے سر پر چلے ہوئے ایسی پلانٹ کی پراسرار تباہی کا خلعو مسلط کر دیا جاتا۔ یہ نہ بھولو کہ چلتے ہوئے پلانٹ کی تباہی میں صرف مشینوں ہی کا نقصان نہیں ہوتا بلکہ پورے ایران میں انسانی اور نباتاتی زندگی کی مکمل تباہی کا خلعو پیدا ہو جاتا۔ اس دھمکی کے سارے بڑے سے بڑے سرکش حکمران کو بھی اپنی مرضی کے مطابق قدموں پر جکایا جاسکتا تھا۔“

”یعنی بدترین سیاسی بلیک میلنگ کا امکان شروع ہی سے موجود تھا؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

”سیاسی بلیک میلنگ!“ اس کی ہلکی سی استہزائیہ ہنسی کی آواز سنائی دی۔ ”یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ہمارے بہت سے لوگ جناح کیپ ٹوپی کے الفاظ استعمال کرتے ہیں جب کہ کیپ کے معنی ہی ٹوپی کے ہیں۔ میکا دل کی کتاب لکھی جانے سے پہلے سے ہی سیاست اور بلیک میلنگ کے ایک ہی معنی ہیں۔ اپنے ساتھیوں اور مخالفوں کو بیک وقت بلیک میل کے بغیر کوئی شخص کامیاب سیاست دان نہیں بن سکتا۔ عالمی سیاست میں بھی اسی اصول سے دل کھول کر استفادہ کیا جاتا ہے۔“

”آج تم مجھے مسلسل حیران کئے جا رہی ہو۔“ میں نے پوری نیک نیتی کے ساتھ اعتراف کیا۔ ”میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایران میں ’ایک مشین میں نصب کئے ہوئے ڈائنامائٹ کو اڑانے کے لئے کسی خلائی اسٹیشن سے کام لیا جاسکتا ہے۔ یہ سب خلا کے پُر امن استعمال کے وعدوں اور معاہدوں کے خلاف ہے۔ خلا کے پُر امن استعمال پر ہر ایک کا حق تسلیم کیا جا چکا ہے۔ پھر وہاں سے ایسی غنڈا گردی کیونکر اور کیسے کی جاسکتی ہے؟ یہ کھلی دہشت گردی اور بدعاشی ہے۔“

”تم غیر ضروری طور پر مجھے ایسی بحث میں الجھا رہے ہو جس پر کئی دن تک تقریر کر سکتی ہوں۔ خلائی دوڑ کا اصل مقصد ہی ایک دوسرے پر فوجی اور جنگی برتری حاصل کرنا ہے۔ خلائی اسٹیشن زمین کے اہم حصوں میں ہونے والی سرگرمیوں پر دن رات نظر رکھتے ہیں۔ ڈی ڈی سے چونکڑی کے مقبول کے قریب متبادلہ کرتے ہوئے ہمیں خود تجربہ ہو چکا ہے کہ شی کو بھی سیٹلائٹ اسٹیشنوں کی مدد حاصل رہتی ہے۔ بیشتر خلائی سمات کا مقصد صرف اور صرف جاسوسی کرنا اور خفیہ تصاویر لینا ہوتا ہے اور تم یقین رکھو

کہ کسی بھی وقت تیسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو اس میں سامانی فیصلہ کن کارروائیاں خلا سے ہی کی جائیں گی۔ خلا کے پُر امن استعمال کے دل فریب نعرے اور معاہدے دنیا کی جھوٹی قبول کر کے بے وقوف بنانے کے لئے اپنائے گئے ہیں اور ان ضابطوں پر عمل درآمد کے ذمے دار وہی لوگ ہیں جو یکساں خلاؤں پر قابض اور حکمران ہیں۔ ان کے خلاف کوئی آواز بلند نہیں کر سکتا۔ اس لئے تمہاری یہ تمام بحث بے سود ہے۔ تمہارے اعتراضات اور احتجاج سے صورت حال میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اٹل حقیقت یہ ہے کہ خلائی تکنالوجی اور زمینی سازشوں کی وجہ سے تمہاری بلج کر اس ذیل تباہی کے خطرے سے دو چار ہے۔ اس خطرے کو ٹالنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ تم فزکی آئنگھ والے دو خلائی ٹکے میرے حوالے کر دو تو وہ تباہی چھ سون کی پوری کمیپ کے بجائے صرف باہر کی کے ایک حصے تک محدود نہ جائے گی۔ بصورت دیگر کوئی اسے نہیں بچا سکے گا۔“

”تمہارے نظریات اور اعمال بہت ڈراؤنے ہیں۔“ میں نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔ ”طاقت‘ اختیار اور بلیک میلنگ پر انحصار اعتقاد رکھنے کی وجہ سے تم بھی قابل اعتماد نہیں ہو۔ تمہاری باتیں سنا کر کرنے والی ہیں۔ تمہاری تجویز بھی قابل قبول نظر آتی ہے لیکن تم پر بھروسہ کیا کیسے۔“

”ایک اور بات سن لو!“ اس کے بولنے کی وجہ سے میری بات ادھوری رہ گئی۔ ”دوستیاں، معاہدے اور سمجھوتے دی پانڈا ہوتے ہیں جو برابری کی حقیقی سطح پر کئے جاتے ہیں۔ خرگوش اور ہاتھی میں کبھی بھی پانڈا دوستی نہیں ہوتی۔ ہاتھی کی اپنی مسئلوں کی وجہ سے خرگوش کو وقتی طور پر کوئی بلا دستی حاصل ہو جائے تو اور بات ہے ورنہ ہمیشہ موجود رہنے والی اٹل حقیقت یہ ہوتی ہے کہ خرگوش کی سلامتی کا تمام تر امداد ہاتھی کے موڈ پر ہوتا ہے اس کی جبین پر آنے والی ہلکی سی ایک جھکن بھی خرگوش کو تنہا کر سکتی ہے جب کہ خرگوش بری طرح برہم اور مشتعل ہونے کے باوجود ہاتھی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ہم دونوں میں ایسا کوئی نمایاں تضاد نہیں ہے۔ آج میں تمہیں دھوکا دوں گی تو کل تم مجھے کوئی بڑا نقصان پہنچانے کی پوزیشن میں آسکتے ہو۔ آج کل دنیا بہت سست گئی ہے۔ کچھ پتا نہیں کہ کل زندگی کے کس موڑ پر تم میری راہ روکنے میں کامیاب ہو جاؤ۔ اس لئے تمہیں میری باتوں پر یقین کر لینا چاہئے کہ میں جو کہہ رہی ہوں اس پر نیک نیتی سے عمل کرنے کا ارادہ بھی رکھتی ہوں۔“

”میں اس موضوع پر تھوڑی دیر بعد تم سے بات کر سکوں گا۔“ میں نے کہا۔

”میں انتظار کروں گی۔۔۔ لیکن یہ ضرور بتائے دیتی ہوں کہ تم نے اس سہلت کا فائدہ اٹھا کر اول خان کو میرے پیچھے لگانے کی کوشش کی تو تم بدترین خسارے سے دو چار ہو جاؤ گے۔ اگر میں

اسی وقت سرانجام دیں گے جب انہیں دیر کی طرف سے کھینچ لیا جائے گی۔ ہم نے اسے پکڑ لیا تو کھینچنے کا معاملہ معلق رہ جائے گا۔

”ہولناک صورت حال ہے۔“ میں نے انکارائی لیتے ہوئے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔ ”تم ٹرانسپورٹ کمپنی میں رزروں کی مرستہ کا کام سیکھ رہے تھے اور میں کراچی کی فٹ پاتھوں پر فائدہ مستی کے دن گزار رہا تھا۔ ہمیں ذرا سی بھی فکر نہیں تھی۔ جب مجھے چرس کی تقسیم کے کام کی پیشکش ہوئی تو مجھے اور میرے دوستوں کو شبہ تک نہیں ہو سکا تھا کہ ہم ایسے حقیر سے مجازت نام میں شریک ہو کر کسی بین الاقوامی گروہ کے چنگل میں پھنس رہے ہیں۔ چرس کے بعد جب سے ہم نے ہیروئن میں ہاتھ ڈالا ہے، سب کچھ ہی بدل کر رہ گیا ہے۔ ہیروئن کے کام میں اس قدر پیسہ ہے کہ نہ چاہئے ہوئے بھی اس سے برائیاں جنم لینے لگتی ہیں۔ کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے امریکی صدر کی آؤٹسٹی کا سربراہ، جمی کارٹیئر کی طاقت کے عالمی توازن پر قابض دھکراں ہیں۔“

”شریفوں پر ہمیشہ سے بدعاش عکرائی کرتے آئے ہیں۔ جو خود بدعاش نہیں ہوتے، وہ ان کے سارے طاقت حاصل کرتے ہیں۔ ہمیشہ ہمیشہ اسی کی رہی ہے جس کے ہاتھ میں لاشی ہوئی ہے۔ ان باتوں پر سرکھانا فضول ہے۔ میری مانو تو دیر اسے رابطہ کر کے اس کی پیشکش قبول کر لے۔“

”میں ابھی تک یہ سمجھنے میں کامیاب نہیں ہو سکا کہ دیر کو سلور آئی کی ایسی کیا ضرورت پیش آئی ہے کہ وہ مجھ سے ایک محدود سمجھوتہ کرنا چاہ رہی ہے۔ تم غور کرو تو لیبر کراس ڈیل کے مقابلے میں یہ بہت حقیر سودے بازی ہے۔ دیر اکے لئے اس کی کیا اہمیت ہو سکتی ہے؟“

”وہ تم سے خود اعتراف کر چکی ہے کہ سلور آئیز کی اہمیت گھٹانے کے لئے اس نے جو کچھ کیا وہ بلف تھا۔ اب وہ شی میں واپس جانے کا فیصلہ کر چکی ہے تو اس کے لئے سلور آئیز بھی یک بیک اہم ہو گئی ہیں کیوں کہ وہ ان کی مدد سے اپنی حیثیت منوا سکتی ہے۔“

”ہمارے پاس آئی ہوئی سلور آئیز شی کے بیوں کو قتل کر کے چھینی گئی ہیں۔ ان کے ذریعے کسی کو قہری طور پر دھوکا تو دیا جاسکتا ہے۔ شی میں کوئی مستقل مقام حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ دیر اکے لئے ان طلائی سکوں کی اہمیت اور افادیت اسی وقت ہو سکتی ہے جب وہ شی کے لئے تھکن نہ ہو اور شی کی پالیسی سے ہٹ کر اپنے ذاتی مفادات حاصل کرنا چاہتی ہو۔“

”سراسر یہ بھی ہے کہ وہ دھوکے جی لائیڈ کو لوٹا کر سرخرو ہونا چاہتی ہو۔“ سلطان شاہ نے صوفے پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔ ”جب تک شی میں بیوں کی عالمی شناخت کا وہ طریقہ رائج ہے، ان لوگوں کے لئے ہر سلور آئی بے اندازہ قدر قیمت رکھتی ہے۔“

اس کی کسی سازش یا رخنہ اندازی کی وجہ سے باہر نکلنے والی ایک جگہ کو چھوڑ کر انے میں ناکام ہو گئی تو میری جگہ کسی اور کو بھیج دیا جائے گا۔ اس کے ذریعے آنے والی تباہی کا اندازہ صرف اسی وقت ہو سکے گا جب سب کچھ راکھ اور لمبے کے ڈھیر میں بدل چکا ہوگا۔“

”مجھے اندازہ ہے تم بلیک میلنگ کے مواد سے بہترن استفادہ کرنے کی اہلیت رکھتی ہو۔ تم سے کوئی معاہدہ ہوا تو پوری نیک نیتی سے ہوگا۔ لیکن خزانہ کے بارے میں تم نے کچھ نہیں کہا۔“

”میں پہلے ہی بتا چکی ہوں کہ اب وہ میری دسترس سے باہر ہے۔ تم نے میری سبزو کے کان اس طرح بھرے ہیں کہ وہ میری جان کا دشمن بن گیا ہے۔ اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے شری مان عجمی مجھ سے بھڑک گیا ہے۔ میں دھوکا کھانے کے اپنی صلاحیتی کا غلطہ مول نہیں لے سکتی۔ جوائنر کے بیٹے کو تم پر آم کر ہی چکے ہو اس لئے میرا اور تمہارا حساب صاف ہے۔“

”اُس سے ہونے والی وہ تنگنہایت اہم اور معنی خیز تھی۔ اس کے نتیجے میں مجھے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ شی اور اس کے آقاؤں سے ہمیں فوری طور پر کس قسم کے خطرات لاحق تھے۔“

دیر اکے یہ علم نہیں ہو سکا تھا کہ اول خان اپنی جگہ پر موجود نہیں تھا اور میں اس کے بجائے غفر سے مدد لے رہا تھا لیکن اُس نے اس حد تک میرا ذہن بالکل صاف بڑھ لیا تھا کہ میں اس سے وقت حاصل کر کے ایسی ساز و سامان کی فہم کے بارے میں غفر سے مشورہ کرنا چاہ رہا تھا کیونکہ وہ میرا ذاتی نہیں بلکہ اہم ترین ذمیت کا ایک قوی معاملہ تھا جس میں اندازہ یا فیصلے کی ذرا سی لغزش ناقابل طمانی نقصان کا سبب بن سکتی تھی۔

سلطان شاہ جو آپریشن پر ہونے والی دو طرفہ تنگنہایت نظر سے غافل رہا تھا، سلسلہ متقطع ہونے پر خاموش نہ رہ سکا اور بولا ”وہ ہمیشہ اپنے حرف کو چاروں طرف سے باندھ کر چلتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمہارے پاس اس کی پیشکش قبول کرنے کے علاوہ کوئی راہ نہیں ہے۔“

”میں غفر سے مشورہ کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کر دوں گا۔“ میں نے سرگرمی سے ہاتھ دھوئے کہا۔

”اور غفر ظلام رسول کے معاملے میں ہونے والی میٹنگوں میں لہجا ہوا ہے۔ اسے شاید صبح سے پہلے فرصت ہی نہ مل سکے۔ میری رائے میں تم کو اس سے کوئی مدد نہیں مل سکے گی۔“

”حق بات میں بھی سمجھ رہا ہوں کہ ہمیں دیر اکے آزادی کے ساتھ اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا موقع ملنا پڑے گا۔ اس کے بعد ہم اس پر ہاتھ ڈال سکتے ہیں۔“

”اس کے بعد بھی ایسی حرکت خطرناک ثابت ہوگی۔“ اس نے نظر آئیز میں کہا۔ ”تم یہ بات بھول رہے ہو کہ دیر اڈا نا ایڈا اڑانے نہیں بلکہ اسے اڑانے جانے کی پوزیشن میں لانے کے لئے کام کر رہی ہے۔ اس کے آقا خلائی اشارے سے اپنا کام

آئیز کے تحفظ میں غفلت برتنے کا عظیم الزام عائد ہو سکتا تھا جس کی سزا صرف اور صرف موت تھی۔

شی کے ضوابط میں سلور آئی کو تقدس کا درجہ حاصل تھا۔ ہر آئی میں کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ سلور آئی کی اپنی جان سے زیادہ حفاظت کرے۔ میں نے جن لوگوں سے سلور آئیز چھینی تھیں ان اس معیار پر پورے اترے تھے اور سلور آئی کو ہودینے کے بعد میرے ہی ہاتھوں جنم واصل ہو گئے تھے اس لئے شی والے ان پر اپنی سزا کا اطلاق نہیں کر سکے تھے۔

سلور آئی کے تحفظ میں ناکام رہنے والوں کے لئے موت کی سزا کی روایت اتنی محکم تھی کہ پچھلے ایک غشرے میں تین دیگر افراد کے علاوہ، جی لائیڈ کے بل، سیکرڈنای ایک دست راست کو بھی گولیوں سے چھتی کر دیا گیا تھا۔ ان چاروں کا جرم یکساں تھا کہ وہ سلور آئی کی حفاظت کرنے میں ناکام رہے تھے۔

اس میں منظر میں جی لائیڈ بھی دیرا کو سزائے موت سے نہیں بچا سکتا تھا۔ بل، سیکرڈ اور دوسرے تین متعلقین کے وراثتی میں خاصے اثر و نفوذ اور طاقت کے مالک تھے جی لائیڈ کے لئے، ان لوگوں کے جذبات کو نظر انداز کر کے اپنی ناجائز جی کو سزائے موت سے بچانا ناممکن ہو جاتا۔ وہ کوئی ایسا کمزور فیصلہ کرنے کی حماقت نہیں کر سکتا تھا جس کے نتیجے میں شی کا سخت ڈسپلن تباہ ہو جاتا۔ ان حالات میں دیرا کے لئے ضروری ہو گیا تھا کہ وہ پہلی فرصت میں دو سلور آئیز جی لائیڈ کو لوٹا دے۔

اس کے مقابلے کی بنیاد وہی تھی کیونکہ اس نے اپنی کمائی کی ابتدا اسی ایک پہلو سے کی تھی لیکن دوران مفکوری اس کو اندازہ ہو گیا کہ اس کی کمائی میں میری دلچسپی کا کوئی عنصر نہیں تھا بلکہ اس سے خود ویرا کی کمزور پوزیشن کا اعلیٰ کاروبار تھا۔ اس لئے آخر میں اس نے ایک اور قصہ چھیڑ دیا۔

”ان سب باتوں کا تعلق میری ذات سے ہے۔ مجھے دو سلور آئیز واپس نہ ملیں تو مجھے شی میں واپسی کا خیال اپنے دل سے نکال دینا ہو گا لیکن تمہارے نقطہ نظر سے جو بات اہم ہو سکتی ہے وہ یہ ہے کہ سلور آئی کے بغیر میں اس ٹرک تک رسائی حاصل نہیں کر سکتی جس پر ڈاننا اینٹ والا ہیٹ ایکس پیئر لدا ہوا ہو گا۔ میری اس ناکامی کے نتائج بہت تباہ کن ہو سکتے ہیں۔“ وہ بولی۔

”یہ شاید تمہاری ذہنی اختراع ہے لیکن پھر بھی تمہاری کمائی سن لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ تمہارے بچ اور بھوت میں تیرے کرنا میرے لئے زیادہ مشکل نہیں ہو گا۔“ میں نے کیچلے لہجے میں کہا۔

”میری نیت میں تیرے ہوتا تو میں اصل قصہ گول کر کے نہیں صرف وہی کمائی بھی سنا سکتی تھی جس کا تعلق میرے کام اور سلور آئی سے ہے۔“

”پہلے تم خالی الدن تھیں۔ اب تم نے ایک پلاٹ سوچا۔“

”پھر اسے دو کے بجائے تینوں سکوں کی واپسی کا مطالبہ کرنا چاہئے تھا۔ اسے ابھی طرح معلوم ہے کہ ہمارے پاس تین سلور آئیز موجود ہیں۔“

دو اور تین کے مسئلے پر سلطان شاہ بھی سوچ میں پڑ گیا۔ دیرا کا وہ مطالبہ اس کے کسی خاص مقصد کی نشان دہی کر رہا تھا اور اس قسمی کو سیدھے سادے قیاسات کی بنا پر چل نہیں کیا جاسکتا تھا۔ دن بھر کی بھاگ دوڑ کی وجہ سے میں ٹکان اور نیند کے شدید غلبے کے اثرات محسوس کر رہا تھا اس لئے میں نے دیرا سے آخری بات کر کے بستر پر جانے کا فیصلہ کر لیا۔

”مجھے صرف ایک سوال کا جواب درکار ہے۔“ اس سے رابطہ ہوتے ہی، میں نے تکبیر لہجے میں کہا۔ ”تمہارے لئے ان دو سکوں کی کیا اہمیت ہے جو تم ان کے حصول کے لئے اتنی بڑی پیشکش کر رہی ہو۔“

”وہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہئے۔ تم تو یہ دیکھو کہ تمہیں ان بے کار سکوں کے عوض کیا مل رہا ہے۔“

”کچھ بھی نہیں۔“ میں نے اُس کی بات کاٹ کر فوراً ہی ذہنی قلابازی کھائی۔ ”اس سوچے میں میرا کوئی ذاتی فائدہ نہیں ہے۔ سارا فائدہ قوی سلخ کا ہے۔ میں نے پوری قوم کے مفادات کا تحفظ نہیں لیا ہوا۔ یہاں مجھ سے بڑے محب وطن بڑے ہوئے ہیں۔“

”یہ شاید تمہارا کوئی نیا پیتزا ہے۔ اب سے پہلے تو تم پورے ملک کے ٹھیکیدار بنے ہوئے تھے۔“

دیرا نے میرے اس سوال کا جواب ٹالنے کی لاکھ کوششیں کر ڈالیں مگر میں اپنی جگہ اڑا رہا اور آخر کار اس نے اپنے مطالبے کا پورا پس منظر بیان کر ڈالا۔

میرے ساتھ مل کر شی کے مفادات کے خلاف کام کرتے ہوئے بھی دیرا نے کبھی شی سے کھل کر بغاوت نہیں کی تھی۔ وہ ہمیشہ سے ان میں شامل رہی تھی۔ اسے شی میں سب سے بڑا تحفظ یہ حاصل تھا کہ وہ جی لائیڈ کی غیر قانونی اولاد ہونے کی دعوے دار تھی۔ شاید اس کے دعوے میں صداقت تھی کیونکہ جی لائیڈ نے اس کا اعتراف نہ کرنے کے باوجود دیرا کے خلاف کبھی کوئی تاویسی کارروائی نہیں کی تھی۔ اس وجہ سے شی کے دیگر بڑے ویرا کی بہت سی کوتاہیوں سے صرف نظر کرتے رہتے تھے۔

ابتدا میں میرے ساتھ دیرا کے حرام بہت خراب تھے اسی دوران میں، میں نے تین سلور آئیز حاصل کر لی تھیں لیکن دیرا نے مجھ سے مصالحت کرنے کے بعد اوپر والوں کو یہ بتا دیا تھا کہ ان تین میں دو سلور آئیز اس کی تحویل میں آگئی تھیں۔ اس طرح شی میں دوبارہ مؤثر شمولیت کے وقت یہ ضروری تھا کہ دیرا دو سلور آئیز جی لائیڈ کو واپس لوٹائی۔ اگر وہ اس امر میں ناکام رہتی تو اس پر سلور

میں الجھارہا۔

برحال بعد کی گفتگو سے مجھے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ غزالہ کے ساتھ فرار ہونے کے بعد ویرا، بلکہ اس ذلیل تباہ کرنے کے مشن پر روانہ ہونے کے بجائے کراچی میں ہی کیوں رکی ہوئی تھی؟ اس پر جنون طاری ہوا تھا نہ وہ مجھے کے عالم میں بے سکی

حرکتیں کرتی پھر رہی تھی۔ بلکہ اُس نے ہر قدم سوچ سمجھ کر اور نپے تلے انداز میں اٹھایا تھا۔ جہانگیر کے شیر خوار بچے کے اغوا سے لے کر تھیلانگ کا نام اختیار کرنے تک اس کی ہر حرکت میں ایک تسلسل تھا۔ اس کی پوری کوشش تھی کہ وہ کسی طرح میری ذات تک رسائی حاصل کر لے تاکہ مجھ سے سلور آئیز کی واپسی کے بارے میں بات کر سکے۔ غزالہ کے اغوا کے بعد اس نے اسی چکر میں اسٹیشن فور فون کر کے مجھ سے بات کی تھی اور اپنی نیک نیتی کا یقین دلاتے ہوئے مصالحت کی پیشکش کی تھی جسے میں نے حقارت سے ٹھکرا دیا تھا۔ دراصل اس وقت تک ویرا نے سلور آئی کا ذکر نہیں کیا تھا اس لئے میں اس کی چال کو نہیں سمجھ سکا تھا۔ بس مجھے اور اشتعال کے عالم میں اُس کے ہر دعوے کو رد کرتا چلا گیا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میرے ذہن کے درپے بھی کھلنے لگے تھے۔ اس وقت میری سمجھ میں آتا کہ سلور آئی کا ذکر کرنے سے پہلے ویرا نے مصالحت کی کوشش کیوں کی تھی۔ یعنی طور پر اُس کا مقصد یہ رہا ہو گا کہ اپنے کئے پر پشیمانی ظاہر کر کے کسی نہ کسی طرح قلیت میں اپنی واپسی کی راہ ہموار کر لے اور پھر پہلی فرصت میں تینوں سلور آئیز پر ہاتھ صاف کر کے اپنے نئے مشن پر ایران روانہ ہو جائے۔

ویرا ایک فتنے سے کم نہیں تھی۔ اس نے کم عمری ہی میں زندگی کے بارے میں ایسے ایسے تجربات حاصل کر لئے تھے جن سے عمر رسیدہ مرد اور عورتیں بھی محروم رہتی ہیں اسی وجہ سے اسے اپنے دل و دماغ پر قابو رکھنے کا سلیقہ آ گیا تھا۔ بدترین حالات میں بھی اس کا ذہن کسی کمپیوٹر کی طرح پوری صورت حال کا گہرا تجزیہ کر کے اپنے فیصلے صادر کرتا رہتا تھا۔ یہ اس کی مکاری اور چالاکی کی انتہا تھی کہ میں اس کے ساتھ ایک طویل مدت گزارنے کے باوجود اس کی سوچی سمجھی چالوں کو اس کی جھلکات اور بوکھلاہٹ کا اضطرابی رد عمل سمجھ کر نظر انداز کرتا رہا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ جی لائٹ ہر طرف پھیلے ہوئے موت کے سودا گردوں کا سفر تھا تو ویرا موت کے اس بڑے سودا گر کی بیٹی تھی جس سے کسی بھی صورت میں بے لوثی اور ہمدردی کی امید نہیں کی جاسکتی تھی۔ وہ ہر لمحے اپنا مفاد پیش نظر رکھتی تھی۔ وہ سوچ اس کی عادت تھی بن چکی تھی۔ اپنے مفادات سے متصادم قوتوں کو وہ ایک ٹانے کے لئے بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ یہ ایک عجیب بات تھی کہ مجھ سے کئی بار اس کا ٹکراؤ ہو چکا تھا لیکن ہر مرتبہ حالات نے ہمیں پھر یکجا ہو جانے پر مجبور کر دیا تھا اور اس بار پھر نائن خدود کو دہرائی نظر

آج ہر حال میں تمہاری نئی کمائی بھی سننے پر آمادہ ہوں۔ اس سے پہلے کچھ نہیں سمجھ سکے گا۔ میں نے کہا۔

ایسا ویرا نے جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ ایران میں افرادی قوت اور بے روزگاری کی کثرت کی وجہ سے لمبے سفر پر جانے والے نیم فوجی قاتلوں میں ہرگز پر چار اور ٹریلر پر چھ نہیں کا ملے مامور ہوتا ہے جو دو دہائی تین تین کی ٹولی میں باری آمدنی لپٹی ڈیوٹی سرانجام دیتا ہے تاکہ سفر کے تسلسل میں کوئی فرق نہ پڑ سکے۔ ویرا کا کہنا تھا کہ ایران میں شی کے اراکین کسی ایسے شخص کو خریدنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے جو چھ سو تین دن کی کیمپ چل کر جانے والے کا دواں میں شامل ہو۔ ویرا اس کا دواں کے راستے میں ان لوگوں تک پہنچنے کی کوشش کرتی۔ سلور آئی نمایاں طور پر اس کے گلے میں جھول رہی ہوتی تاکہ شی کا زرخیز ایجنٹ سلور آئی کچھ کرا سے دوری سے پہچان لے۔

ویرا کو شناخت کر لینے کے بعد وہی شخص ویرا کے لئے موقع فراہم کر کہ وہ کا دواں میں شریک ہو جائے یا اسے چند محنتوں کے لئے ان کے ساتھ رہنے کا موقع مل جائے تاکہ وہ اپنا کام کر سکے۔ ویرا کے کہنے کے مطابق زرخیز ایجنٹ کو یہ معلوم نہیں ہونے لگا تھا کہ ویرا پورے کا دواں کی تپائی کا بندوبست کرنے کے لئے وہاں پہنچ رہی تھی۔ اسے ویرا کو حسب ضرورت لفٹ فراہم کرنے کے لئے ہماری معاونہ دیا جاتا تھا۔ اگر ویرا کے پاس سلور آئی کی شناخت نہ ہوتی تو اس کا پہچانا جانا ممکن نہ رہتا جس کے نتیجے میں اس کا پورا مشن بدترین ناکامی سے دوچار ہو جاتا۔

”تمہاری یہ کمائی خاصی کمزور ہے۔“ اس کی بات ختم ہونے کے بعد میں نے کہا۔ ”تم وہاں کسی کو قتل کرنے نہیں جاتی ہو۔ ایک لیور کی پوزیشن تبدیل کرنا بادی النظر میں بہت مشکل اور بے ضرر سا کام ہے۔ یہ کام تو اس شخص سے بھی لیا جاسکتا تھا جو کا دواں میں تمہارے لئے جگہ پیدا کرے گا۔“

مجھے معلوم تھا کہ تم یہ سوال ضرور کرو گے۔ دنیا کے تمام بڑے بڑے معظم گروہوں کی طرح شی کا بھی طریقہ کار یہی ہے کہ ملدا کام محکم کے اراکین سے لیا جائے۔ کرائے کے آدمیوں سے صرف اسی وقت کام لیا جاتا ہے جب ایسا کرنا ناگزیر ہو جائے۔ اس صورت میں بھی باہر کے آدمیوں پر مکمل بھروسہ نہیں کیا جاتا۔ کوشش کی جاتی ہے کہ اہم کام ہمارے آدمی ہی سرانجام دیں۔ پورا کام اس کے حوالے کر دیا جاتا تو ہمارا وہ رابطہ بھی اس کی قیادت میں آتا جیسے وہ کام کی تکمیل کی رپورٹ دیتا۔“

اس کی وہ وضاحت قابل فہم ہونے کے باوجود بہت مضبوط میں کسی کن میں نے بات آگے بڑھائے بغیر اسے اگلی شام تک سلور آئیز کی وصولی کے لئے تیار رہنے کی ہدایت کر کے سلسلہ مطلق کر دیا۔

نہرے دروازے ہونے کے بعد بھی میرا ذہن اسی پُر ہول صورتحال

آہی تھی۔ ان ہی خیالات میں اچھے ہوئے میری آنکھ لگ گئی۔
دوبارہ ہوش آیا تو خاسدان چڑھ چکا تھا۔

سلطان شاہ مجھ سے پہلے بیدار ہو چکا تھا اور باہر سے اخبارات لے آیا تھا۔

میں نے نہ ہاتھ دھوئے سے پہلے اس کے لائے ہوئے تینوں اردو اور انگریزی اخبارات کی سرخیاں دیکھ ڈالیں جن میں حکیم رسول کی پراسرار بازیابی کی سنسنی خیز کہانی نمایاں تھی۔

”اس بار قسمت ہم پر مہمان رہی ہے“ سلطان شاہ نے مجھے آگاہ کیا۔ شاید وہ میرے بیدار ہونے سے پہلے ہی ناشتے سے فارغ ہو کر اردو اخبارات چاٹ چکا تھا۔ ”سپرہائی دے والے واقعے میں شری مان سنگھ کے سارے ہی آدمی کام آگئے لیکن ان میں وہ خود نہیں تھا۔“

”سارے آدمی؟“ میں نے چونک کر حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ”لیکن پانچواں تو کمانڈوز کے ہاتھوں زخمی ہونے کے بعد اندھیرے کا قاعدہ اٹھا کر بڑے پائپوں میں غائب ہو گیا تھا۔“
”پولیس والوں کو ایک گڑھے سے اُس کی لاش ملی تھی۔ وہ اندھیرے میں بھاگتے ہوئے پائپوں سے ٹکرتے ہی ایک گہری خندق میں گرا ہو گیا کیونکہ اس کی گردن ٹوٹی ہوئی تھی۔ اب ایسا کوئی آدمی زندہ نہیں رہا تھا جو شری مان سنگھ کو وہاں پیش آنے والے اصل واقعات سے آگاہ کر سکے۔“

میرے لیے اصل اور سب سے اہم خبر وہی تھی اس لیے میں اخبار میز پر ڈال کر غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔ میرے لیے منہ ہاتھ دھوئے بغیر اخبار پڑھنا جیسے دلچسپ مشغلے سے بھی لطف اندوز ہونا ممکن نہیں تھا۔

میں واپس آیا تو سلطان شاہ میرے لیے ناشتے کی تیاری میں مصروف تھا۔ میں تفصیلی خبر کے مطالعے میں مصروف ہو گیا۔

بچھلی رات جو کچھ ہوا اس کے بارے میں وہی رپورٹ شائع ہوئی تھی جس کا بندوبست ظفر نے پہلے سے کیا ہوا تھا۔ خبر میں سپرہائی دے سے نیچے کلکشن معمار والے موڑ کے قریب اندھیرے میں کچھ مشتبہ افراد کی پراسرار اجتماع کی خبر تھی۔ ان لوگوں کی رازدارانہ سرگرمیوں کی وجہ سے پولیس کو ان پر اسلحہ ہونے کا شبہ ہوا۔ پولیس پارٹی نے انہیں لٹاکا تو انہوں نے اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ پولیس کی طرف سے بھی جوابی کارروائی کی گئی۔ اسی اثنا میں وہاں موجود ہائی روف ایئر لنس میں دھماکے کے ساتھ آگ لگ گئی اور مزاحمت کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ پولیس والوں کو وہاں سے کلچہ لاشیں ملی تھیں جن میں سے ایک گردن ٹوٹنے سے ہلاک ہوا، دو کی موت پستولوں کی گولیوں سے واقع ہوئی تھی جبکہ دو افراد ایئر لنس میں جل کر ہلاک ہوئے تھے۔ البتہ غلام رسول کے بارے میں ڈاکٹروں نے تصدیق کی تھی کہ اس کی موت کسی خارجی زخم کی وجہ سے نہیں بلکہ کمزوری اور پھر حرکت قلب بند ہونے سے فطری

انداز میں واقع ہوئی تھی۔

ان اطلاعات کی بنا پر یہ نظریہ قائم کیا گیا تھا کہ اس غلام رسول کی منتقلی کے لیے مجرموں کے دو گروہ جمع ہوئے تھے دوران میں پولیس آگئی تو دونوں گروپ پولیس کی مداخلت کا دوسرے کی غفلت کا شکار نہ سمجھ کر آپس میں لڑ پڑے۔ نظریہ کو اس امر سے بھی تقویت ملی تھی کہ مرنے والوں کے جسم کے ہتھیاروں کے زخم آئے تھے وہ جانے وادرت سے نہیں ہو سکے تھے۔ قیاس کیا گیا تھا کہ اندھیرے اور ہڑونگ کا اٹھا کر کچھ لوگ فرار ہونے میں بھی کامیاب ہو گئے تھے۔ ان لاشوں میں سے ایک شخص کو شہر کے بدنام بد معاش طور پر شناخت کر لیا گیا جبکہ دیگر لاشوں کی شناخت کا معاملہ پانچویں پولیس کی طرح اخباری نامہ نگار یہ اندازہ لگانے سے قہر رہے تھے کہ غلام رسول مردہ حالت میں وہاں لایا گیا تھا یا وہاں ہونے والی فائرنگ سے دہشت زدہ ہو کر چل بسا تھا۔ اس بارے میں پوسٹ مارٹم کی تفصیلی رپورٹ کا انتظار کیا جا رہا تھا کیونکہ اس کے وقت کا تین اسی رپورٹ میں کیا جاتا تھا۔

اس معاملے میں ہم لوگوں سے اندازے کی غلطی یہ ہوتی تھی کہ کشت و خون کو اخبارات میں نمایاں جگہ نہیں مل سکتی۔ اخبار کا زور غلام رسول کی بازیابی پر رہا تھا جب کہ ہم اسے درجے کی بات قرار دوانے کے لیے کوشاں رہے تھے۔ ”سب کچھ اسی طرح شائع ہوا ہے جیسے رونما ہوا تھا۔“

فارغ ہونے پر سلطان شاہ بولا ”جس اتنا فرق پڑا ہے کہ تم لوگوں بجائے کسی مظلوم پاپائی کا ذکر کیا گیا ہے۔“
”اب اندازہ ہوا کہ اخبار والے لکیر کے فقیر نہیں ہو خبریں بنانے میں اپنا بھی سرسرکھاتے ہیں۔“ میں نے کہا۔
”یہ ہے کہ ایئر لنس پر بم مارے جانے کے بارے میں کوئی نہیں ہے ورنہ شری مان سنگھ کو سنبھالنا دشوار ہو جاتا۔ وہ مشکل ہی سے قابو میں آئے گا۔“

”کارایا ایئر لنس میں آسانی سے آگ لگ سکتی ہے۔“
”فکری پر لگنے والی ایک گولی بھی یہ کام دکھا سکتی ہے۔ تم کو یہ ہو گا کہ دوسرے فریق تم نہیں تھے۔“

میں نے اپنی رست وای میں وقت دیکھا اور فون پر ڈیٹا نمبر لٹانے لگا۔

آپریٹر کے ذریعے میں نے شیر شاہ سے سلسلہ طویا ڈا آواز سے اضمحلال مخرج تھا۔

”کیا بات ہے؟ تم بہت دیر اس مظلوم ہو رہے ہو۔“
اس کی ہیلو کے جواب میں کہا۔

”اوہ، ہاں! اس کی آواز میں ایک دم جان بچ گئی۔“
”بات کرلو۔ اخبار دیکھنے کے بعد اس کا موڈ بہت خراب اس کا خیال ہے کہ ہم اچھا بند غلط پاپائی کے حوالے کرتے

”کوئی ضروری کام ہو تو ابھی آسکتا ہوں۔ بس شیڈز ایدھا ہوا ہے۔“

”دفتر آؤ تو مجھے اطلاع کدینا۔ میں بھی دو تین روز گھر پر رہوں گا۔“ دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہونے کی آواز سن کر میں نے ریسپور کر ٹیل پر رکھ دیا۔

”اور شاید اب شری مان سنگھ کی باری ہے۔“ سلطان شاہ نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم ایک مشکل سے نکلنے ہی دوسری دشواری میں کیوں گھڑ جاتے ہیں؟“

”مذاافانہ حکمت عملی میں یوں ہی ہوتا ہے۔ دلدل سے نکلنے کے لئے جتنے ہاتھ پیراؤ گے، اسی قدر دھنستے چلے جاؤ گے۔ آج اگر شری مان سنگھ نے گڑبڑ کی تو میں کل کر میدان میں آجاؤں گا اور ان کی کمزوریاں ڈھونڈ کر ان کا جینا محال کر دوں گا۔“

”اس کی سب سے بڑی کمزوری رجمنی کی صورت میں تمہارے پاس ہے۔“

”پہلی بات یہ ہے کہ رجمنی ایک عورت ہے اور دوسری بات یہ ہے شری مان سنگھ کو اب رجمنی سے محبت نہیں رہی۔ وہ خود رجمنی سے چھٹکارا پانے کی فکر میں لگا ہوا ہے۔“

”چھٹکارا پانے کی بات اپنی جگہ پر ہے۔ تم یہ دیکھو کہ وہ اس کی لاش تک اپنی تحویل میں لینا چاہتا ہے۔“

”میں دیکھوں گا کہ اس معاملے میں کیا کر سکتا ہوں۔“ میں یہ کہہ کر دوبارہ فون کی طرف متوجہ ہو گیا۔

دوسری کھنچی پر آپریشن کی مترنم نسوانی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ اس نے میرا نام دریافت کیا اور چند خاموشی کے وقفے کے بعد لائن شری مان سنگھ سے ملادی۔

ریسیور پر دوران انتظار گونجنے والی موسیقی ختم ہوتے ہی میرے کانوں میں شری مان سنگھ کی خست اور سرد آواز آئی۔ ”میں فون پر بالکل بات نہیں کروں گا۔ میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔“ اس نے بلا تندی کہا۔

”میں تمہاری مجبوریوں کو سمجھتا ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ میں نے تمہاری شرط پوری کر دی ہے۔“

”میں کہہ چکا ہوں کہ فون پر بالکل بات نہیں ہوگی۔ تم سے اسی وقت ملاقات ضروری ہے۔“

”تو پھر ہائیڈسے ان کی کافی شاپ میں آجاؤ۔ وہ تمہارے دفتر سے قریب ہے میں بھی وہاں پہنچتا ہوں۔“

”یہ بھی ناممکن ہے۔ ہمیں میرے دفتر میں آنا ہوگا۔ تم پر میرا اعتماد ختم ہو چکا ہے۔“

اس کا دفتر میرے لئے چھوہے دان بھی ثابت ہو سکتا تھا کیونکہ وہ ایک غیر ملک کی سفارتی عمارت میں واقع تھا لیکن میں اس پر اپنا کوئی خوف ظاہر کر کے اپنی پوزیشن خراب نہیں کرنا چاہتا تھا اس لئے میں نے بلا توقف جواب دیا۔ ”میں وہاں بھی آسکتا ہوں لیکن یہ

”سب کچھ ٹھیک ہوا ہے۔ ایسے مواقع پر اصل پارٹیاں مانتے نہیں آئیں۔“ میں نے سختی سے کہا پھر پوچھا ”اس وقت چیف کمال ہے؟“

”وہ اپنے گھر پر ہی آرام کر رہا ہے۔ یہاں سب ٹھیک ٹھاک ہے۔“

میں کر ٹیل دبانے کے بعد حبیب جیوانی کے گھر کا نمبر ملانے میں مصروف ہو گیا۔

”کل رات سے تم کہاں تھے؟“ میری آواز سننے ہی وہ مجھ پر بڑبڑا۔ ”میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم بھی وہیں کسی گڑھے میں پڑے ہوئے دھولے دالوں کا انتظار کر رہے ہو گے۔“

”میں جھنڈ گیا تھا۔ کل اس علاقے میں پولیس کا گشت بہت بڑھا ہوا تھا۔“ میں نے سنی ہوئی آواز میں کہا ”جانتے ہوئے تو میں کئی کئی بار کے پولیس پارٹی کے سامنے سے نکل گیا لیکن وہاں ہی میں گرفت نہیں کر سکا اور وہیں آصف اسکوٹز میں پناہ لینے پر مجبور ہو گیا۔“

”بب اسے شیر شاہ چھوڑ کر آیا تو ہمیں وہاں جانے کی کیا ضرورت پیش آئی تھی؟“

”وقت اور مقام میں نے طے کیا تھا۔ دوسری پارٹی کو وہاں لے جانا میرے ذمے تھا۔“

”لیکن وہاں تو خاصی گڑبڑ ہوئی تھی۔ تم بچ نکلنے میں کیسے کامیاب ہو گئے؟“

”قسمت یاد رہتی یا شاید تمہاری دعائیں کام کر رہی تھیں۔“

”بے زرب مسکراتے ہوئے کہا ”جانتے ہوئے میں ان کی گاڑی کا قندار داکسی پیدل ہوئی کیونکہ پورا علاقہ بہت تیزی سے گھیر لیا گیا۔ اگر میں اندھے سے سے نکل کر کسی سواری کی تلاش میں سڑک لے کر لڑائی کو شش کرنا تو مشکلات سے دوچار ہو سکتا تھا۔ اسی لئے اگلے رات ہی اس اطراف میں گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔“

”لیکن تم مجھے فون پر اطلاع تو دے سکتے تھے؟“ وہ بدستور اہل میں جھلا تھا۔

”اصل تو ایسا کوئی پروگرام نہیں تھا پھر وہاں فون بھی نہیں تھا۔ ہم مطمئن رہو۔ تمہارے سر سے بوجھ ہٹ گیا ہے۔ پولیس آئے تک اس کا سانس باقی تھا۔“

”میں برصغیر سمجھتا ہوں اور یہ بتاؤ کہ وہ وہی لوگ تھے یا تمہارے کوئی چال چلانی تھی۔“

”بالکل دی تھی۔ تم فکر نہ کرو۔ ایسے مواقع پر اصل چہرے سامنے نہیں آتے۔ وہ آتے ہوئے تو ان کا جو حشر ہوتا وہ سامنے ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔“ اس نے اضطرابی انداز میں ثبات کاٹ دیا۔ ”پھر میں ڈان کو فون کئے رہتا ہوں۔ دیے تم رجب آہے ہو؟“

سلاخوں سے باہر بھڑکریوں کی طرح نکل رہے تھے جیسے وہ منہ
کوئی رعایت لینے کی کھات میں لگے ہوں۔

میں جیسی سے اتر کر براہ راست پھاٹک کی طرف بڑھتا ہوں
سپاہی میری اس جسارت پر چونکے۔ اندر والوں کی نگاہیں بھی
میں سے مجھ پر مرکوز ہو گئیں لیکن سب میں نے پھاٹک پر پہنچ کر
باڑھ کے پیچھے سے اپنا نام بتایا تو فوراً ہی پھاٹک سے ملے

کھول کر مجھے اندر بلا لیا گیا۔
اندر گھستے ہی ماحول کی تبدیلی یک بیک واضح ہو گئی۔ گور

ہوئی داڑھیوں اور پتھریوں والے رستوں کے علاوہ ملک
سڑیوں کے آچل ہر طرف سرسرا رہے تھے جس شخص کو
بھارت کے بارے میں ذرا سی شدید ہو وہ ان لوگوں کو دیکھ
اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ ملک کی سفارتی عمارت میں موجود
وہ دفتر ایک وسیع و عریض رہائشی عمارت میں قائم تھا۔
دنیو کو معمولی تبدیلیوں کے ساتھ باضابطہ دفتر کا روپ دے
تھا۔ میں ایک اردلی کی رہنمائی میں متعدد جج درجی راہداریوں
بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ مجھے کسی پیشگی بندوبست
تحت عمارت کے عقبی اور نسبتاً غیر مصروف حصے میں لے جایا
تھا۔ میرے لئے وہ کوئی اچھا آغاز نہیں تھا۔ اس وقت مجھے
افسار اپنی نیم گن یاد آئی جو میں دانت اپنے ساتھ نہیں لایا
میرا خیال تھا کہ عمارت میں داخل ہونے سے پہلے میری ہاتھ
طاشی لی جائے گی لیکن خلاف توقع کسی نے میرے بدن کو ہاتھ
نہیں لگایا۔

آخر کار اردلی نے مجھے ایک وسیع نشست گاہ میں پہنچا
بیک وقت تیس چالیس افراد کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ کمر
مصنوعی ریٹھ سے بنے ہوئے نئے قالین پر بونی چلی صوفے
ہوئے تھے اور اونچی پھت سے لٹکے ہوئے کئی پگھے دھبی رانا
گردش کر رہے تھے۔

میں نے محسوس کیا کہ اردلی مجھے وہاں چھوڑ کر واپس
تھا بلکہ برآمدے میں رک گیا تھا۔

میں نے ایک صوفے پر دراز ہو کر وقت گزاری کے
سرگٹ سلگالی۔

چند منٹ بعد اردلی نے کمرے میں آکر ایس ایس مادی
آمد کا اعلان کیا۔ اس کا انداز اس قدر چمکانے والا تھا
فورا ہی غیر ارادی طور پر اپنی جگہ سے اٹھ گیا لیکن اپنی مادی
احساس ہوئے ہی جھٹکا کر دو بارہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس وقت
اندازہ ہوا کہ بڑے لوگوں کے اردلی کی طرح طریقوں سے
مساجیوں کی شان میں چار چاند لگا کر انہیں اس نشے کا عادی
ہیں۔

شری مان سنگھ آدمی آستین کی سفید بٹن شرت اور
پتلون میں ملبوس کمرے میں داخل ہوا تو اس کے منحنی سے

یاد رکھنا کہ میرے آدمی ہزار آنکھیں رکھتے ہیں۔ تم نے ذرا سی بھی
بدنہی کا مظاہرہ کیا تو تمہارے لئے بے اندازہ مشکلات کھڑی
ہو جائیں گی۔

”مجھے اپنی مجبوریوں کا بخوبی علم ہے۔ میں گیت پر کے دتا
ہوں۔ تم جلد از جلد پہنچو!“

اس سے متنگو وہیں فٹم ہو گئی جب سلطان شاہ کو علم ہوا کہ
شری مان سنگھ نے مجھے اپنے کو نلیٹ میں بلایا ہے جس پر میں اپنی
آبادی ظاہر کر چکا ہوں تو وہ مجھ پر خاصا برہم ہوا کہ میں دیدہ و دانستہ
ایک اندھے کنوئیں میں چلا گیا لگانے جا رہا تھا۔

”مجھے جانا پڑے گا۔ سہرائی دے کے واقعات کے بعد شری
مان سنگھ مجھ سے باہر لے گا۔ وہ اپنے ملک کا
ایک اہم سفارتی افسر ہے۔ اس کے ساتھ ذرا سی بھی اونچ نیچ ہوئی
تو وہ بے موت مارا جائے گا۔ باہمی تعلقات تازہ کر رہے ہیں تو سفارتی
افسر دیکھ بھال کر قدم اٹھاتا ہے۔ اس میں اس کا قصور نہیں ہے۔“
میں نے سلطان شاہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔

”جرائم پیشہ لوگوں سے لڑ بھڑ کر اپنا راستہ بنانا آسان ہوتا
ہے۔ اس نے ہمارے سے تمہیں وہاں بلا کر قید کر لیا تو میں تمہارے
لئے کچھ بھی نہیں کر سکتا گا۔“ میرے رویے پر اس کا منہ بنا ہوا
تھا۔

”مجھے یقین ہے کہ ایسی نوبت نہیں آئے گی۔ پھر بھی مجھے دیر
ہو جائے تو تم دو گھنٹے بعد شری مان سنگھ کو فون کر کے مجھ سے بات
کرنے کی خواہش ظاہر کرنا۔ اس کے دماغ میں کوئی فتور ہوا تو وہ
تمہارے فون سے رفع ہو جائے۔ بدترین حالات میں تم ظفر سے مدد
لے سکو گے۔“

”ظفر تمہارا منتظر ہو گا۔“ وہ چونک کر بولا ”وہ سہرائی دے سے
واپس کے بعد کے واقعات جاننے کے لئے بے چین ہو گا۔ وہ سب
سے پہلے ہی اعتراض کرے گا کہ تمہیں اس سے مشورہ کئے بغیر
کو نلیٹ کا رخ کرنے کی کیا ضرورت پیش آگئی۔ وہ طرار آدمی
ہے۔ اسے سمجھانا میرے بس سے باہر ہو گا۔“

مجھے اندازہ تھا کہ وہ سب سلطان شاہ کے چلے ہمارے تھے جن
کے سارے وہ مجھے اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے سے روکنا
چاہ رہا تھا لیکن میں خوش اسلوبی کے ساتھ اسے اس کا کردار سمجھا
کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ سلطان شاہ نے پھر بھی دل گرفتہ
انداز میں مجھے رخصت کیا تھا۔

کو نلیٹ کی عمارت اچھے خاصے جیل خانے سے مشابہ تھی۔
احاطے کی دیوار پر کم از کم آٹھ فٹ اونچی مضبوط آئنی باڑھ نصب
تھی جس کی سلاخوں کے درمیان سے اندر احاطے میں ہونے والی
نقل و حرکت نظر آ رہی تھی۔ دیوینک آئنی پھاٹک کے پیچھے ان
لوگوں کے اپنے باوردی مسلح محافظ موجود تھے۔ پھاٹک سے باہر
مقامی پولیس کا مسلح دستہ موجود تھا اور دیرانے کے لئے آنے والے

سے گھورتے ہوئے نسبتاً دھیمی آواز میں کہا۔ ”ان پر یقین کرنا یا نہ کرنا تمہارا فعل ہے۔ میرا ضمیر بالکل مطمئن اور صاف ہے۔“
 ”تم بھول رہے ہو کہ تمہاری کمائی پر یقین نہ کرنے کی صورت میں، میں تمہیں قید میں ڈال کر سزا بھی سکتا ہوں۔ میرے سفیر سے پیشگی اجازت لئے بغیر تمہارے ملک کا بڑے سے بڑا افسر بھی اس عمارت میں قدم رکھنے کی جرات نہیں کر سکتا۔ تم اپنی مرضی سے آئے ہو لیکن میری اجازت کے بغیر یہاں سے واپس نہیں جاسکو گے۔ میں اپنے حریفوں سے حقائق اگلوانے کے بہت سے گُر جانتا ہوں۔“

میں تحفیک امیز انداز میں آہستگی سے ہنس دیا اور بولا۔
 ”افسروں کی بات افسروں تک رہنے دو۔ تم اپنی حکومت کے ملازم ہو اس لئے اس سے آگے نہیں سوچ سکتے۔ مجھے اپنی مرضی سے واپس کا یقین نہ ہوتا تو تمہاری دعوت پر یوں بے چون و چرا یہاں نہ چلا آتا۔ تم نے میرے ساتھ زبردستی کی تو اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔ میرے جاں نثار اس عمارت کے دودو بار کو خون میں نہلا دیں گے۔“

”تم شی سے ٹوٹ چکے ہو، ویرا تمہارے خون کی پیاسی ہو کر غزالہ تک کو اغوا کر چکی ہے۔ اب تمہارے جاں نثار کون ہیں اور کہاں رہتے ہیں؟“ اس نے ابتدا سے اس وقت تک اپنی نگاہیں میرے چہرے پر جمائی ہوئی تھیں۔

”اگر تم کچھ جانتے ہو تو تمہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ شی سے ٹوٹ کر زندہ رہنا ایک بڑی بات ہے اور میں زندہ ہوں۔ میری زندگی اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ میرے دوست اور ہمدرد یہاں شی سے زیادہ طاقتور ہیں۔ تم دیکھ چکے ہو کہ تمہاری کھوپڑی کو تانک کر ٹھیل کا نشانہ بنایا گیا لیکن تمہارے مسلح آدمی کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ میں نہ روکتا تو اس پتھر کی جگہ تمہاری کھوپڑی میں پھینکا ہوا سیسہ بھی اتر سکتا تھا۔“

”تنت..... تو وہ تمہارے کسی آدمی کی حرکت تھی؟“ میرے انکشاف پر وہ بری طرح چٹپٹا گیا۔

میں اعتراف میں سر ہلا کر رہ گیا۔ میں اُس کے مقابلے میں پوری ہمت اور جواں مردی کا مظاہرہ کر رہا تھا لیکن میری چھٹی حس مجھے کسی ناویدہ خطرے سے آگاہ کر رہی تھی۔ میری پوری کوشش تھی کہ غزالہ کی واپسی کی بات بنے یا نہ بنے، مجھے وہ طاقت ختم کر کے جلد از جلد وہاں سے نکل جانا چاہئے۔

”جب ہم وہاں دوستانہ ماحول میں بائیں کر رہے تھے تو اس کیننگ کی کیا ضرورت تھی؟“ اس نے بھٹا کر پوچھا۔

”وہ کیننگ کی نہ گئی ہوتی تو آج میرے پاس تمہیں بتانے کے لئے کچھ نہ ہوتا۔“

”میں تمہیں یہ خانے میں بند کر کے اپنے اردلی سے تمہارے سر پر جوتے لگواؤں گا۔“ اپنی بے عزتی یاد آتے ہی وہ غصے میں

جھپ سی توانائی اٹھائیاں لے رہی تھی۔ وہ آیا اور مجھ سے کوئی سلام دعا کئے بغیر خشک انداز میں میرے قریب بیٹھ گیا۔ جیسے کے سفید عدسوں کے پیچھے سے اس کی چمکتی ہوئی نگاہیں میرے چہرے پر مرکوز ہو گئی تھیں، جن سے مجھے قدرے بے آرمی محسوس ہونے لگی۔

”مجھے اخبار سے پتا چلا ہے کہ رات کو وہاں گڑبڑ ہو گئی۔“ میں نے صوفے پر پلو بید لئے ہوئے خود ہی جھوٹو ذرا۔

”اخبار سے؟“ اس کی تیاریوں پر کئی بل آگئے۔ ”تو کیا رات کو تم وہاں نہیں تھے؟“

”تم نے مجھے کیا ہ بجے اے وہاں پہنچانے کے لئے کہا تھا۔ اس کے بعد مجھے لوٹ آنا تھا۔ میرے آنے کے بعد وہاں کیا ہوا؟ اس کا میرے فرشتوں کو بھی علم نہیں.....“

”میرے سب آدمی مارے گئے۔“ اس کی آواز سے گہرا مددہ ظاہر ہو رہا تھا۔ ”میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ کس کی سازش کی بنا پر پولیس وہاں پہنچنے میں کامیاب ہوئی؟ میرے لیے وہ ایک اہم ہائی تھی جو میں ہار گیا۔ مجھے شبہ ہے کہ اس میں تمہاری بدعتی کار فرما تھی۔ ایک طرف تم نے مجھ سے پروگرام طے کیا اور دوسری طرف پولیس والوں سے خبری کر دی۔ تم سے مجھے ایسی امید نہیں تھی۔“

”اگر میں تمہاری چھت کے نیچے موجود ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم مجھ پر الزام تراشی کر کے میری توہین کرنی شروع کر دو؟“ میں نے فیصلے کیے میں کہا۔ ”تم نے میرا نام سنا تھا تو یہ بھی سنا ہوگا کہ میرا ماضی کیا رہا ہے۔ میں اپنے معاملات کو خود سلجھانے کی طاقت رکھتا ہوں۔ جو لوگ پولیس کی چھتری میں پناہ ڈھونڈتے ہیں، وہ بد معاش نہیں بیڑے ہوتے ہیں۔ اگر خبری ہوئی ہے تو وہ تمہارے ہی کسی نمک حرام نے کی ہوگی۔“

اس دوران میں وہ پلکیں جھپکائے بغیر، مسلسل مجھے گھورتے جا رہا تھا۔ میری بات پوری ہونے پر وہ بولا۔ ”اور شاید تم کو یہ بھی معلوم تھا کہ جب تم نے اے وہاں ڈالا تو وہ زندہ نہیں تھا۔“

”یہ سراسر کبوتر اس ہے۔“ میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ”میں نے تمہیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ وہ بیمار اور زخمی ہے مگر میں نے اے زندہ چھوڑا تھا۔ وہ بعد میں دہشت سے مر گیا ہو تو اور بات ہے۔ دیکھ بھی میرے اور تمہارے معاہدے میں اس کے زندہ ہونے کی کوئی شرط نہیں تھی۔ تمہیں وہ آدمی چاہئے تھا، میں نے اے سے پوچھا دیا۔ اب تم اپنے وعدے سے مکرانے کے بہانے تلاش کر رہے ہو تو یہ لڑائی بات ہے۔“

”دھیمی آواز میں، تہذیب سے بات کرنا، ڈیڑی!“ وہ اچانک ہی ٹپٹا ہو گیا۔ ”تمہاری پوزیشن مشتبہ ہے۔ اپنی صفائی پیش کرنے کی زندگی بھر کی تمہاری تمہاری کو قبول کرنی ہوگی۔“

”میں نے حقائق بتا دیے ہیں۔“ میں نے اے پر خار نظروں

بہت زیادہ نروس اور خوف زدہ نظر آ رہے تھے۔

میں نے ان پر سے نظریں ہٹائے بغیر دو اڑے کے پٹ بند کر کے تمام بولٹ چڑھا دیے۔

وقتی طور پر میں ان تینوں کو چمک دے کر ان پر حاوی ہو چکا تھا لیکن میرے لئے وہ صورت حال نہایت دھماکا خیز تھی۔ میرا ذہن

بہت تیزی کے ساتھ کام کرنے میں مصروف تھا۔ اس وقت میرے فیصلے کی ذرا سی غلطی بھی مجھ پر زندہ رہنے کے راستے مسدود کر سکتی تھی۔

اس سنسنی خیز ماحول میں، میں اپنی سلامتی کے بارے میں فکر مند تھا اور وہ تینوں، میری ذہنی کیفیت سے بے خبر اپنی دردناک موت کی دہشت میں جلا ہو چکے تھے کیونکہ میری تحویل میں موجود دونوں سب مشین گنوں کے بھرے ہوئے میگزین چڑھے ہوئے تھے اور میری انگلیوں کی ذرا سی جنبش ان تینوں پر بارودی جہنم کے دہانے کھول سکتی تھی۔

شری مان سنگھ نے ناخوشگوار تصادم کی وہ صورت حال میری مرضی یا ارادے کے بغیر میرے اوپر مسلط کی تھی۔ اس کے آدمیوں سے ہتھیار چھین لینے کے بعد میں نے ان پر بلا دستی حاصل کر لی تھی اور اس کمرے میں داخلے کے واحد راستے کو اندر سے بولٹ کر کے میں نے اپنی اس برتری کو فیصلہ کن بنالیا تھا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ ایک غیر ملکی کو نیلیٹ کی وسیع و عریض عمارت تھی جہاں مسلح محافظوں کے علاوہ، حملے کی بھاری نفری بھی موجود رہی ہوگی۔ پھر اس حساس عمارت کی حفاظت کے لیے باہر مقامی پولیس کا مسلح دستہ موجود تھا جسے وہ لوگ وقت ضرورت اندر طلب کر سکتے تھے لیکن اس بھاری نفری کے باوجود وہ اس وقت تک بے بس تھے جب تک میں نے ہتھیاروں کے نکل پر شری مان سنگھ اور اس کے دو آدمیوں کو اس وسیع و عریض کمرے میں یرغمال بنالیا ہوا تھا۔

اس وقت میرا ذہن بہت تیزی کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ ان تینوں کو ہلاک کرنے کی دھمکی دے کر میں باہر والوں کو مداخلت کرنے سے باز رکھ سکتا تھا۔ دونوں محافظوں کی جانوں کی کوئی اہمیت رہی ہو یا نہ رہی ہو مگر میں اتنا ضرور جانتا تھا کہ شری مان سنگھ ان لوگوں کے لیے حد سے زیادہ اہم تھا۔ وہ اس کی زندگی کو ایک محصور دشمن کے کسی اضطرابی رد عمل کا ایندھن بنانے کا مہم جو ترین خطروہ بھی مول نہیں لے سکتے تھے۔

ان حالات میں شری مان سنگھ بھی میرے اشاروں پر ناپنے پر مجبور ہو جاتا۔ میرے اشارے پر غزالہ کو اس کمرے میں بلانے سے وہ انکار نہیں کر سکتا تھا۔ ایک بار غزالہ وہاں آجاتی تو میں ایک سب مشین گن کی مال شری مان سنگھ کی کھوپڑی سے لگا کر اس کے اور غزالہ کے ساتھ وہاں سے نکل سکتا تھا۔ کو نیلیٹ سے غزالہ ہونے کے لیے میں ان ہی لوگوں کی گاڑی لے جاسکتا تھا۔ جب تک

اپنے آپ سے سنبھال رہے ہوں گے۔

میں ایک جھٹکے سے صوفے سے اٹھ کر کھڑا ہوا اور اسے گھورتے ہوئے جیسے مگر خوفناک لمبے میں بولا "میں اپنے قریب آنے والوں کے جھجھکے اڑاؤ والوں کا۔ بہت ہے تو یہ بھی کر کے دیکھ لو۔"

معاں اس عمارت کے دیواروں کی حفاظت اس کمرے میں گھس آئے اور آتے ہی انہوں نے اپنی سب مشین گنیں میری طرف تان لیں۔ "ہاتھ بلند کر لو!" ان میں سے ایک نے کہا۔

میرے لئے وہ ایک فیصلہ کن لمحہ تھا اگر میں بڑبڑی کے ساتھ خود کو ان کے حوالے کر دیتا تب بھی قیدی میرا مقدر بنتی جبکہ ویسے بھی شری مان سنگھ کے تئو راجھے نظر نہیں آ رہے تھے۔

وہ دونوں مسلح محافظ جس انداز میں کمرے میں داخل ہوئے، اس سے پتا چل رہا تھا کہ وہ چھپ کر کمرے کی صورت حال پر نظر رکھے ہوئے تھے اور میرے جارحانہ تیروں کا اندازہ لگاتے ہی اپنے صاحب کی مدد کے لئے اندر گھس آئے تھے حالانکہ اس وقت میرا ردو ہار کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

میں نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے ہوئے لمبے بھر کے لئے سوچا۔ وہ تینوں پورے انشاک سے میری طرف متوجہ تھے۔ حفاظت ایک ساتھ کھڑے تھے، شری مان سنگھ ان سے چند قدم کے فاصلے پر تھا۔

میں نے اچانک آنکھیں پھاڑ کر ان کے عقب میں دیکھتے ہوئے، تیز اضطرابی لمبے میں کہا "نعمو! انہیں ابھی نہ مارنا!"

وہ تینوں ہی بجلی کی سی سرعت سے اپنے پیچھے پلٹے۔ وہ ان کا بے ساختہ رد عمل تھا جس پر قابو پانا ان کے بس سے باہر تھا۔ میرے لیے پل بھر کی دسی مصلحت کا کافی تھی۔ میں فضا میں اڑتا ہوا ان دونوں محافظوں پر ٹوٹ پڑا اور ان کی مشین گنیں چھینتا ہوا "ان سے آگے نکل گیا۔ وہ دونوں بوکھلائی ہوئی آوازیں نکالتے ہوئے قالین پر ڈھیر ہو گئے۔

میں اپنی جھونک پر قابو پانے کے بعد دونوں مشین گنیں سنبھالتے ہوئے پلٹا تو شری مان سنگھ کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور وہ بدحواسی کے عالم میں کسی ایسے انوکھی طرح آنکھیں جھپکائے جا رہا تھا جیسے گھور تاریکی سے اٹھا کر اچانک ہی چمکتی ہوئی دھوپ میں پھینک دیا گیا ہو۔

اس وقت تک باہر سے کوئی مداخلت نہیں ہوئی تھی۔ میں نے تیزی سے اس کمرے کا جائزہ لیا تو وہاں سے نکاسی کا وہی ایک دروازہ تھا جس سے سب لوگ اندر داخل ہوئے تھے۔ میں نے صورت حال میں کوئی خرابی یا چھید کی روٹھنا ہونے سے پہلے ہی اس دروازے کو اندر سے بولٹ کر لینے کا فیصلہ کر لیا۔

دونوں سپاہی نرم قالین پر ٹوٹ لگنے کے بعد اپنے قدموں پر اٹھ کھڑے ہوئے تھے لیکن اس آسانی کے ساتھ مار لئے جانے پر

شری مان سنگھ میرے نٹانے کی زد میں میری تحویل میں رہتا اس کے آدمی میرے ساتھ کوئی شرارت کرنے کی ہمت نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ اس پوری کارروائی کی تکمیل میں باہر والوں کو اتنا وقت مل جاتا کہ وہ میرے متوقع فرار کے پیش نظر مقامی پولیس اور انتظامیہ سے بھرپور مدد حاصل کر لیتے اور اس عمارت سے باہر نکلتے ہی خونخوار بھڑیلے میرے پیچھے لگ جاتے۔ اس اعتبار سے اس عمارت کا محل وقوع بہت خراب تھا۔ عمارت کے تین اطراف میں سڑکیں تھیں۔ اس کی بھٹی اور عقبی سڑک عمادیران ہی رہتی تھی مگر سامنے والی قاطعہ جناح روڈ کالی معصوم سڑک تھی۔ میں چھانک سے نکل کر جاتا تو وہاں طرف پولیس سے مدد بھیجنے اور ٹریفک کے جھوم میں پھنسنے کے قوی امکانات تھے کیونکہ اوہر کینٹ اسٹیشن سے آنے والا ہماری اور پُر جھوم ٹریفک بائیں طرف گھوم کر کلفٹن برج سے پہلے والے ٹریفک بچل کی طرف جاتا تھا۔ اسی راستے پر ٹریفک پولیس کے علاوہ پولیس کی محنتی گاڑیوں کی بھی کثرت رہتی تھی جو میرے حق میں مضر ثابت ہو سکتی تھی۔

چھانک سے نکلنے کے بعد بائیں طرف فرار ہونا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا کیونکہ فریئر ہال کی پشت سے گزرتے ہی شارع فیصل والا معصوم ترین چوراہا آ جاتا تھا جہاں کسی زمانے میں پبلک سنیما واقع ہوا کرتا تھا۔ شارع فیصل اور اداریہ نادر کی طرف سے آنے والے تیز رفتار ٹریفک میں شامل ہونا آسان کام نہیں تھا۔ بائیں طرف جانے کے لیے چوراہے پر رکتا تاگزیر ہو جاتا اور وہی میری شامت کا سبب بن جاتا کیونکہ وہاں پبلک ٹریفک چیک پوسٹ کا جدید ترین مواعلاتی سولہوں سے لیس تھی۔ وہاں طاقتور انجنوں والی متحدہ موٹر سائیکلوں کے ساتھ ہی برقی رفتار گاڑیوں کا بیڑہ بھی موجود رہتا تھا۔ پھر موبائل فونز کی اکاڈ گاڑیاں بھی وہاں سستائی رہتی تھیں۔ میرا تعاقب کرنے والوں کے ذرا سے اشارے پر وہ مشینی جھلکے آنا ٹانغا میں میرے فرار کی ہر راہ مسدود کر کے مجھے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر سکتا تھا کیونکہ اس معرکے میں ہسپانی کی کوئی راہ ہی باقی نہیں رہتی تھی۔

غزالہ کو بزور بازو وہاں سے نکال لے جانے کا تصور بہت حسین اور رومان انگیز تھا لیکن کو نیٹ کے احاطے سے باہر جو سنگین خطرات پیش آ سکتے تھے وہ اس منصوبے کے سن اور رومان پر مبنی طرح حادی تھے۔ خرابی یہ تھی کہ میں اس وقت غزالہ کو بھول کر اکیلا بھی وہاں سے فرار ہو جانا اور اپنے تحفظ کے لیے شری

سلسلہ اب کتابی شکل میں

سینس ڈائجسٹ



مضبوط جلد

توفیق صدیق

(10 صفحہ پر مشتمل 25 روپے)

(نیم نئی 150 روپے)

- 23 انبیاء کرام کی زندگی کے بصیرت افروز چوکھٹے والے پراثر حقائق واقعات جن کا عالم لوگوں کو علم نہیں۔
- ان پیغمبران دین کے واقعات جن کی زندگی ہمارے لئے مشعل راہ ہے۔
- جذبہ ایمانی تازہ کرنے کیلئے ان کی سوانحات کا مطالعہ ہے حضور در ہے۔

تاریخین کے یہ زوردار رپہ و حصول میں شائع کی جا رہی ہے

کتابیات پبلی کیشنز

پوسٹ بکس 23 رمضان چیمبر زملو ریا اسٹریٹ آئی آئی پتھر منگرو ڈاکرامچی 74200

فون: 5802552-5895313
فیکس: 5802551
kitabiat1970@yahoo.com

کتاب کی قیمت میں ڈاک خرچ ہوتا ہے

نہیں لی گئی لیکن مجھے معلوم ہے کہ رہنمائی کے بہانے مجھے کم از کم دو مقامات پر حساس میل ڈی ٹیکٹر سے گزارا گیا ہے۔ میری جیب میں کوئی ہتھیار ہوتا تو وہاں الارم بج اٹھتے ہوتے۔

”بیٹھ جاؤ!“ مجھے اشارہ کرنے کے بعد وہ اپنے آدمیوں کی طرف متوجہ ہو کر خشک لمبے میں بولا ”دروازہ کھول کر باہر جاؤ اور سکون سے بیٹھو، میرے طلب کیے بغیر کسی کو اندر آنے کی ضرورت نہیں۔ دوبارہ ایسی غیر ضروری متعدی دکھانے کی کوشش کی تو میں تمہاری گردنیں توڑ دوں گا۔“

وہ بیک وقت اپنی خالی سب مشین گمنوں کی طرف بڑھے تھے لیکن شری مان سنگھ نے خشک آواز میں انہیں روک دیا ”باہر جاؤ۔ تمہارے ہاتھوں میں ان کی وقعت آہنی ڈھنوں سے زیادہ نہیں ہوگی۔ ایسے ہتھیار صرف بہادروں کا زیور ہوتے ہیں، بزدلوں کے لیے گالی بن جاتے ہیں۔“

وہ دونوں ندامت کے ساتھ سر جھکائے دروازے کی طرف گئے اور کچھ کے بغیر پلٹ کر اگر باہر نکل گئے۔ شری مان سنگھ باجوا پر پران سے بہت زیادہ پر گشت نظر آ رہا تھا۔

”میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ہتھیار قبضے میں آجانے کے باوجود تم نے یہاں سے بھاگنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟“ چند ثانیوں کے بعد شری مان سنگھ بولا۔

”میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ مجھے اپنی واپسی کے بارے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ میری مرضی کے خلاف تم مجھے ایک منٹ بھی یہاں نہیں روک سکتے۔“

”تمہارے اس زعم کا کوئی نہ کوئی معقول سبب بھی ضرور ہوگا!“ اس نے کہا۔

”میرا ہر ساقی میرے اس اعتماد کا سبب ہے اور ان کی تعداد خاصی زیادہ ہے“ میں نے تلخی کم کرنے کی کوشش میں خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”تمہارے ساتھی!“ اس نے اضطرابی لمبے میں دہرایا، پھر کہا ”تم نے مجھے پہلے نہیں بتایا کہ تمہارے کچھ جاب ٹار ساتھی بھی ہیں؟“

”اس کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ میں تمہیں بتا بھی دیتا تو کیا فرق پڑ سکتا تھا؟“

”خیر!“ وہ بولا تو میں نے محسوس کیا کہ اس کے دل میں کسی بات کی کوئی غلط موجود تھی ”یہ قصہ تو منٹ گیا۔ تمہارا دعویٰ ہے کہ تم نے اپنا کام پورا کر دیا جب کہ غلام رسول میرے قبضے میں نہیں آیا۔ زندہ یا مردہ، میرے لیے وہ ہر حالت میں بہت زیادہ اہم تھا۔“

”اس بارے میں تم اپنی ناکامی کی ذمہ داری میرے سر نہیں ڈال سکتے“ میں نے سختی سے کہا ”میں اسے یہاں لانے پر آمادہ تھا لیکن تم نے اپنی مصلحتوں کی وجہ سے مجھے روک دیا۔ سراب

مان سنگھ کو بھی ساتھ لیتا جاتا تب بھی صورت حال میں کوئی تبدیلی رونما نہ ہوتی اور میرے سوچے ہوئے تمام خطرات میرے استقبال کے خطر ہوتے۔

وہاں سے فرار کا ارادہ ترک کر دینے کے بعد ایک ہی صورت باقی رہ جاتی تھی کہ میں اپنے اضطرابی رد عمل کا ازالہ کرتے ہوئے ہتھیار ڈال کر خود کو شری مان سنگھ کے حوالے کر دوں۔

لیکن وہ راست ہنک آمیز تھا۔ شری مان سنگھ کے سامنے اپنی کمزوری کا اعتراف کر لینے کے بعد میں اس سازشی سفارت کار سے کبھی بھی جیت سکتا تھا۔

میں اس وقت زندگی اور موت کے دورا ہے پر ایک ہولناک صورت حال سے دوچار تھا اس لیے میرے ذہن نے چند ہی لمحوں میں وہ سارا تجزیہ مکمل کر کے اپنا آخری فیصلہ صادر کر دیا۔

میں نے ان تینوں پر نگاہ رکھتے ہوئے، یکے بعد دیگرے دونوں سب مشین گمنوں کے میگزین نکالے اور ان کا نگاہ ہتھیاروں کو ایک دور افتادہ صوفے پر پھینک دیا۔

میری اس غیر متوقع حرکت پر شری مان سنگھ بھونچکا رہ گیا۔ میرا خیال تھا مجھے نہتا پاتے ہی، غیر مسلح محاذ اپنی توہین کا بدلہ لینے کے لیے مجھے پھر پھونٹ پڑیں گے لیکن وہ بھی اپنی جگہوں پر جم کر رہ گئے تھے اور ان کے دہانے احمقوں کی طرح کھل گئے تھے۔

دونوں بھرے ہوئے آہنی میگزین میرے ہاتھوں میں تھے۔ بظاہر میں بے پروایانہ انداز میں ان سے کھیل رہا تھا لیکن میں ان سے بھرپور کام لینے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ ان میں سے کوئی بھی مجھ پر حملہ آور ہونے کی حماقت کرنا تو میں کسی بھی تکلف کے بغیر آہنی ضرب سے اس کا سر کھول دیتا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ میری ایسی کوئی دفاعی کارروائی شری مان سنگھ کے لیے قابلِ فہم ثابت ہوگی۔

غیبت یہ ہوا کہ ان میں سے کسی نے کچھ غیر معمولی رد عمل کا مظاہرہ نہیں کیا۔

”اب تم کیا کرنا چاہ رہے ہو؟“ آخر کار شری مان سنگھ نے ہی تجریدہ آواز میں سکوت توڑا۔

”کچھ بھی نہیں“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑ کر شاطرانہ لمبے میں کہا ”تم نے دیکھ لیا کہ اوجھی حرکتوں سے مجھے مرعوب نہیں کیا جاسکتا۔ میں تمہارا بن بلایا سمان نہیں ہوں، تمہاری دعوت پر یہاں آیا ہوں۔ ہتھیار پھینک کر میں نے اپنی نیک نیتی اور خیر سگالی کا ثبوت دے دیا ہے۔ اس سے آگے جو کچھ ہوگا، اس کا انحصار تمہاری نیت اور ارادوں پر ہوگا۔“

”تو کیا تمہاری جیبیں خالی ہیں؟“ اس کی حیرت دو چند ہو چکی تھی۔

”اتنے بھولے نہ بنو، شری مان سنگھ!“ میں نے استہزائیہ انداز میں کہا ”یہ درست ہے کہ چھانک سے یہاں تک میری جامہ تلاش

مکھونا رسید کر دیا ہو۔ میں مٹھیاں بھیج کر اضطرابی طور پر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے سامنے پہنچ گیا۔

”سنو دوست!“ میں نے مضبوطی کے ساتھ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنی جگہ چھوڑنے سے روک دیا۔ اس وقت میں تمہاری چہمت کے نیچے موجود ہوں، تمہارے آدمیوں کی کھلی اشتعال انگیزی کے باوجود، میں نے قہر اور بردباری سے کام لے کر کسی خون ریز تصادم سے گریز کیا ہے لیکن تم اس کے باوجود مجھے چوٹا لگنے پر آمادہ نظر آ رہے ہو۔ شاید اس وقت تم اپنی مکاری سے کام لے کر مجھے بے نیل و مرام لوٹانے میں کامیاب ہو جاؤ لیکن یہ یاد رکھنا کہ دنیا بہت چھوٹی سی جگہ ہے۔ تم دوبارہ میری کسی غلیل کی زمیں آسکتے ہو اور میں اتنا بتا دوں کہ اگلی بار غلیل کے پتھر کی جگہ پگھلا ہوا سیسہ ہوگا۔“

”میری مجبوری سے فائدہ اٹھا کر مجھے دھمکیاں نہ دو!“ وہ بُرا سا منہ بنا کر بولا ”غلام رسول والی بازی الٹ جانے سے کوئی قیامت نہیں آئی ہے۔ تم ملا سرکار کے بارے میں کھوج نکال کر غزالہ کو حاصل کر سکتے ہو۔ وہ بھی تمہارے لیے بہت اہم آدمی ہے۔“

میں تلخ انداز میں ہنس پڑا اور بولا ”تم نے ایک محسوس انسانی وجود کی وصولی سے انکار کیا ہے حالانکہ وہ میرے قبضے سے نکل کر تمہارے آدمیوں کی ذمے داری بن چکا تھا۔ ملا سرکار کے بارے میں تو باتیں ہی باتیں ہوں گی۔ اگر میرے ذرائع نے یہ اطلاع دی کہ تمہارا ملا سرکار، ٹوکی چوٹی پر، ایک نیچے میں رام نام کی مالا بچ رہا ہے تو تم اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دو گے۔ میں اپنے دعوے کے ثبوت کہاں سے اور کیسے فراہم کر سکوں گا؟ اصل بات یہ ہے کہ تم میری کمزوری سے فائدہ اٹھا کر مجھے رگیدے پر قتل گئے ہو۔“

”رگیدے والی بات ہوتی تو غزالہ کو بیس رکھا جاتا۔ درمیان میں کوئی سنگین رکاوٹ حائل کر کے تمہاری اور اس کی ملاقات کرائی جاتی تاکہ تمہارے ماند پڑتے ہوئے جذبات کو کمزور کر دیا جاسکے لیکن اس جذباتی استحصال سے فائدہ حاصل کرنے کے بجائے غزالہ کو سرحد پار بھیج دیا جاتا ہے۔ اگر غزالہ تمہاری محبت ہے تو رجنی میری محبوب بیوی ہے اور وہ تمہاری تحویل میں ہے۔“

”ان دونوں کا موازنہ مت کرو۔“ میں نے پلٹ کر اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ”غزالہ وفا کی دھیمی آج میں مُلگ مُلگ کر پھیل رہی ہے اور رجنی سدا بہار رہنے کے لیے اپنے وجود کو ہر اس جھٹکے سے جو اس کی دسترس میں ہو، سیراب کرتی پھر رہی ہے۔ میں غزالہ کی زندگی کے لیے دعا گو ہوں جب کہ تمہارے وجود کا دُواؤں دُواؤں رجنی کی موت کا آرزو مند ہے۔“

”وہ کل کی بات تھی۔“ اس کی آواز پر افسردگی کا پُر توغماں تھا ”آج رجنی کے بارے میں میرے خیالات بدل چکے ہیں، میں آدھا سفارت کار اور آدھا کیرٹ ایجنٹ ہوں۔ میری زندگی کے ان دو پانوں میں پس کر ہر عورت وی بن جائے گی جو رجنی بن چکی

مکھو، جو کچھ ہوا، اس کی منصوبہ بندی تم نے کی تھی۔ گمیاہ بجے غلام رسول کو وہاں پہنچانے کے بعد میرا کام ختم ہو گیا تھا۔ اس سے آگے کچھ ہوا، اس کی پوری پوری ذمے داری تمہاری اور تمہارے آدمیوں کی ہے۔“

”مجھ سے بہت بڑی چوک ہوئی جو اس وقت تمہیں زبان کھولنے کا موقع مل رہا ہے۔“ اس نے قدرے ترش مگر متعادل لہجے میں کہا ”وہ میرے ملازمین نہیں بلکہ کرائے کے آدمی تھے۔ باہر کے آدمیوں کو ملوث کیے بغیر، مجھے پورا کام تم ہی کو سونپ دینا چاہیے تھا۔“

”کوئی بات نہیں۔“ میں نے مکارانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا ”اب آئندہ احتیاط کرنا، عقل مند لوگ ٹھوکر کھا کر ہی سبق سیکھتے ہیں۔ میں نے اپنی رضا کارانہ خدمات پیش کرنے پر دانستہ زور نہیں دیا تھا۔ مجھے ذرا تھا کہ کیس تم کو میری نیت پتہ نہ ہونے لگے۔“

”میرے پاس اس صورت حال کو تسلیم کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔“ اس کے چہرے پر غصے کا ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ ”لیکن سچی بات یہ ہے کہ میرا دل تمہاری طرف سے صاف نہیں ہے۔“

”تمہارے دل کی اس خرابی کو دور کرنا میرے بس سے باہر ہے۔“ میں نے خشک لہجے میں کہا ”میں نے تمہاری شرط پوری کر دی، اب تمہیں بلا تردد اپنا وعدہ پورا کر دینا چاہیے۔“

اس کے چہرے پر ہر بھیجے کے آثار نمودار ہوئے لیکن اس نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا اور پُرسکون انداز میں بولا ”میں تمہاری طرح مطلق العنان یا خود مختار نہیں ہوں۔ تو قوی دیر پہلے تم خود مجھ کو ملازم ہونے کا طعنہ دے چکے ہو۔ میں اپنے ہر فعل کے لیے ان لوگوں کو جواب دہ ہوں جو مجھ سے اوپر بیٹھے ہوئے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ میں غلام رسول کو سامنے لا کر غزالہ کی واپسی کا بندوبست؟“

”غزالہ کی واپسی!“ میں نے اس کی بات کاٹ کر حیرت سے دہرایا ”وہ گئی کہاں تھی جو اب تم اس کی واپسی کا افسانہ تراش رہے ہو؟“

”سرحدیں بند اور سیل کرنے کی ساری باتیں سادہ لوح عوام کو جذباتی قریب دینے کی کوششیں ہوتی ہیں۔“ وہ دھیمبا اور نامحمانہ انداز اختیار کرتے ہوئے بولا ”تہذیب، ثقافت اور جنس فحش کے اعتبار سے یہ پورا علاقہ ایک ہی ہے۔ کانڈی نقوش پر لکیریں کھینچ دینے سے ملک نہیں بنا کرتے۔ سندھ کے علاقے میں تو ہر سرحدی غزالی کسی چند چوکیوں تک محدود ہوتی ہے۔ باقی سرحدیں کھلی رہتی ہیں۔ یہ صورت حال دونوں طرف پائی جاتی ہے۔ اس سے فائدہ اٹھا کر لوہ اور مم جو افراد آزادی کے ساتھ اپنی نفس درکت جاری رکھتے ہیں۔ ان میں ہمارے ایجنٹ اور کارندے بھی ہوتے ہیں۔ وہ لوگ غزالہ کو راجستان پہنچا چکے ہیں۔“

مجھے نکلے محسوس ہوا کہ جیسے شری مان سنگھ نے میرے دل پر

ہے۔ عمر کے اس مرحلے پر سنے دھان کوٹنے سے بہتر ہے کہ جو کچھ کوٹا اور پیسا جا چکا ہے، اسی پر محنت کی جائے شاید آخری عمر میں وہ صرف میری ہو کر رہ سکے۔ میں اسے اپنے گھر میں شاد اور آباد دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”اگر یہ تمہاری کوئی قلابازی نہیں ہے تو پھر ملامت سرکار کو بچے سے نکال دو۔ غزالہ اور رجنی کا تبادلہ کر کے ہم چار زندگیوں کو سہل بنا سکتے ہیں۔“

”کاش! یہ میرے بس میں ہوتا!“ اس کی اداسی یک بیک کچھ اور بڑھ گئی ”تم خود مختار ہو اور رجنی تمہاری قیدی ہے مگر میں کچھ لوگوں کا تابع ہوں اور غزالہ ان ہی کی ہدایت پر اپنا پس لائی جاسکتی ہے۔ وہ اس تبادلے پر راضی نہیں ہوں گے۔“

”پھر میں تمہاری کسی بات پر اعتماد نہیں کر سکتا۔ ان لوگوں کی توثیق کے بغیر تمہاری ہر بات بے وزن اور بے توقیر ہے۔ بہتر یہ ہو گا کہ تم ان ہی سے میری ملاقات کا بندوبست کروادو۔“

اس کے ہونٹوں پر تسلی تھکی سی مسکراہٹ پھیل گئی ”تمہارا مطالبہ بجا ہے لیکن ایسی کسی ملاقات کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔ فیصلہ کرنے والے یہاں نہیں، نئی دہلی میں رہتے ہیں میں اس بار وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے ساتھ کوئی چال بازی نہیں ہوگی۔“

”بات وہی آجاتی ہے کہ تمہارے وعدوں میں کتنا وزن ہے۔ کل کو تم پھر اپنی مجبوریوں کا دکھڑا لے کر بیٹھ جاؤ گے اور میں تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکوں گا۔“

”تم بھول رہے ہو کہ اب رجنی میرے لیے اہمیت اختیار کر چکی ہے۔ میں خوب سوچ سمجھ کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اسے کھودینے کے بعد میں ادھر وادھر جاؤں گا۔ اگر وہ آوارگی اور رنگینیوں کی طرف ہٹتی ہے تو اس میں اُس کے میلان طبع کے ساتھ ہی میری چشم پوشیوں، بلکہ ناموا حوصلہ افزائیوں کا بھی بڑا دخل ہے۔“

”میں کچھ بھی نہیں بھولا شری مان جی!“ میں نے کاٹ دار لہجے میں کہا ”ایک سیکرٹ ایجنٹ صرف اپنی پیشہ ورانہ کامیابیوں کے لیے جیتا ہے۔ اس کے لیے مشن کی کامیابی اور اپنی سلامتی کے علاوہ کسی چیز، کسی رشتے کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ تم نے اپنے گھرے دوست، موتن لال کو اپنی بیوی کے حسن کے جال میں پھنسا کر اپنا الو سیدھا کیا۔ تم سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بنے رہے۔ تمہیں ہلکا سا ذہنی جھٹکا اس وقت محسوس ہوا جب میں نے آئینہ تمہارے سامنے رکھ دیا۔ ایسا نہ ہوا ہوتا شاید موتن لال....

جلتھک کی دھنوں میں تپا دیواری کے نغے لاپ کر، زندگی بھر رجنی کی کوئلوں سے عرق نشاۃ کشید کرتا رہتا اور تم ان رنگ رلیوں سے صرف نظر کر کے ان تخریب کاروں اور دہشت گردوں پر فخر کرتے رہے جو موتن لال کے جل ترنگی بیٹیاں کی کوکھ سے جنم لیا کرتیں۔“

”بس، ڈینی!“ شری مان سکھ نے بے تابانہ انداز میں طپے ہوئے مجھے خاموش کرا دیا ”تم بہت بے درد اور سفاک ہو۔ شاید اس لیے کہ تم ابھی تک شادی کے بندھن سے آزاد ہو اور یہ نہیں جانتے کہ بیوی کی بے وفائی کے زخم ایک انسان کو کس طرح کچلے لگاتے ہیں۔ عورت غدار اور بے وفا ہو جائے تو اسے نہ اپنی باتوں میں لے کر سکون ملتا ہے نہ اسے چھوڑنے کو دل چاہتا ہے۔ بیانی عورت کو چھوڑنے کا مطلب ہے کہ اسے کھل کھیلنے کی آزادی دے دی جائے جو کچھ وہ چھپتی رہے اسے وہ سب کرنے کی آزادی دے دی جائے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک مرد اپنی چھوٹی ہوئی عورت کو ہر روز ایک نئی سچ پر اپنے من پسند دوستوں کے ساتھ دل عیش دیتے ہوئے دیکھ کر بھی زنگ کی بھینک آگ سے بچا رہے؟ تم عورت کی شناخت ہوتے ہو اور عورت تمہاری پہچان بن جاتی ہے پھر بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ بھل میں ایک کیکر کھینچ کر اس شناخت اور پہچان کو مٹا دیا جائے؟ کوئی سب سے پہلے آدمی ہوتا ہے اس کے بعد سیکرٹ ایجنٹ، چور، اچکا، اٹھائی گیرا یا سیاست داں ہوا ہے۔ مجھے اس کیواس کی کوئی ضرورت نہیں تھی لیکن ایک طرف میرے دل میں اپنی محرومی کا گہرا اور غلیظ غبار بھرا ہوا ہے تو دوسری طرف تم کو یہ یقین دلانا بھی ضروری ہو گیا ہے کہ رجنی سے میری نفرت کی وجوہ سطحی، عارضی اور خود غرضانہ جذباتیت پر مبنی تھی۔ وہ لاکھ حراموں اور بے وفاسیوں میں اسے چاہتا ہوں۔ وہ میری لاکھوں خلوتوں کی شریک رہی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس پر کمال بھروسہ کیا جاسکتا ہے اور کمال وہ وفادار ہے۔ شاید تم کو غزالہ سے بہت محبت ہو لیکن میرا خیال ہے کہ وہ آج تک تمہارے لیے شجر ممنوعہ بنی ہوئی ہے۔ جس پھل کو تم نے چکھاسی نہ ہو اس کی لذت کا کوئی پتہ نہ یا معیار مقرر نہیں کیا جاسکتا ہے جب کہ میرے لیے رجنی ایک نشہ بن چکی ہے۔ تمہیں اندازہ ہو جانا چاہیے کہ میرے لیے رجنی کتنی اہم ہے۔ اس کی بازیابی کے لیے میں ہر ذرا کھیل سکتا ہوں۔ غزالہ تمہاری کمزوری ہے اور رجنی میری۔ جب دونوں طرف یکساں مجبوریوں اور پیشیوں ہوں تو عام طور پر معاہدے کامیاب رہتے ہیں۔“

”رجنی تو کل بھی میری تحویل میں تھی جب میں نے رات کے گیارہ بجے غلام رسول کو تمہارے بتائے ہوئے مقام پر پہنچایا تھا۔ آج بھی وہی صورت حال برقرار ہے تو پھر.....“

”یہ انسان کی کھوپڑی کا کمال ہے“ اس نے میری بات کاٹ کر پلٹتے ہوئے کہا ”تھوڑی دیر پہلے تک وہ ایک ہریانائی عورت تھی جو میرے اعتماد کو سربازار یتلام کر کے موتن لال کی گود میں جا بیٹھی تھی لیکن جب تم نے میرے دو مسلح محافظوں کو بلیکٹ زیر کرنے ان کی تنہیں سنبھالیں تو کیا پلٹ ہو گئی۔ میرا اندازہ تھا کہ تم نے رجنی اور سفاکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہم جیوں کو برست مار کر لایا کرو گے۔ اس لمحے میں نے سوچا اور اندازہ لگایا کہ رجنی کی سندنہ

پریشان کر دیا تھا اور وہ مجھے مطمئن کرنے کی سرزد کو شش کر رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا "اس معاملے میں سب سے بڑی غلطی یہ ہوئی کہ ان لوگوں نے غزالہ کو سرحد پار طلبہ کر لیا۔ اس وقت مجھے اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ اس طرح کھیل پر میری گرفت بالکل ختم ہو کر رہ جائے گی لیکن اب میں اس کا کوئی نہ کوئی تود کر لوں گا۔ ہو سکتا ہے کہ میں دو چار روز میں غزالہ کو میاں واپس بلوانے میں کامیاب ہو جاؤں۔ یہ نہ سمجھ لینا کہ میں تم سے کوئی وعدہ کر رہا ہوں۔ یہ میری کوشش ہوگی۔ اس میں مجھے کامیابی بھی ہو سکتی ہے اور ناکامی بھی۔ لیکن میں تم کو اتنی یقین دہانی کرا سکتا ہوں کہ ماسرکار کے بارے میں اپنے کام کی تکمیل ہو جانے کے بعد تمہارے ساتھ کوئی زیادتی یا وعدہ خلافی نہیں ہوگی۔ غزالہ تمہیں واپس مل جائے گی۔"

میں تلخ انداز میں ہنس پڑا "شاید ہم دونوں ہی اپنی اپنی مجبوریوں کا شکار ہو گئے ہیں۔ تم مجھے رام کرنے کے لیے ایسے بلند بانگ دعوے کر رہے ہو، جن کے تم شاید مجاز بھی نہیں ہو اور میں تمہاری باتوں کے کھوکھلے پن کو سمجھنے کے باوجود تم پر بھروسہ کرنے پر مجبور ہوں کیونکہ میرے سامنے کوئی متبادل راہ نہیں ہے۔ میں سرکاری اتاج پر پروان چڑھنے والے حرام خوروں کے کھیل کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ وہ مجھے زچ کرنے پر تڑپنے کو کسی بھی نازک موڑ پر تمہارا تبادلہ کر کے تمہیں کسی دور دراز مقام پر بھیج دیا جائے گا۔ تمہارے جاتے ہی میرا اور تمہارا معاہدہ کا حدم ہو جائے گا اور مجھے

نصیب اور اس کا حیات آفرین گداز سراپا میرے پیادوں میں سب سے نمایاں تھا۔ تم کوئی مارنے سے پہلے مجھ سے میری آخری خواہش دریافت کرتے تو میں رجنی سے مل بیٹھنے کے سوا کسی بات کا کوئی ذکر نہ کرتا۔ اس لیے میں کہہ سکتا ہوں کہ اب وہ صورت حال باقی نہیں رہی جو اب سے زار دیر پہلے تھی۔ میں نے تم سے کوئی وعدہ یا معاہدہ کیا تو میری پوری کوشش ہوگی کہ اس پر نیک نتیجے سے عمل کیا جائے اگر میری رجنی میرے گھر میں واپس لوٹ سکے۔"

"تم اپنے دور کے مکار اعظم معلوم ہوتے ہو، شری مان جی!"

میں نے ایک گھبراہٹ سے لے کر کہا "میں کیسے مان لوں کہ بیشک کی طرح تم اب بھی جھوٹ نہیں بول رہے ہو؟"

"تمہاری زبان سے مکار اعظم کا خطاب، خوب صورت اور قابل فخر معلوم ہوتا ہے کیونکہ تم بھی مانے ہوئے شاطر چال باز اور دھوکے باز ہو۔" اس نے کسی اندامت کے بغیر کہا "میری دست بستہ اچھا ہے کہ اس بار یقین کر لو۔ رجنی میری دیکھی بھالی ہے۔ میں اس کی چھانچوں اور کرداریوں سے بخوبی واقف ہوں۔ کوئی نئی عورت میرے لیے بالکل نئی اور بے اعتبار ہوگی۔ عورتوں کے بارے میں شاید تم بہت کھاگ ہو لیکن بیوی کے معاملے میں صفر ہو، اس لیے میں تمہیں ایک عام سی بات سمجھاتا ہوں کہ بڑے وقت میں آدمی دیکھے بھالے راستوں سے فرار ہوتا ہے، انجان کھائیوں میں علاج نہیں لگاتا۔ میں موجودہ حالات میں رجنی کے بغیر گزارہ نہیں کر سکتا اس لیے تمہیں میری اس مجبوری کو تسلیم کر کے میری زبان پر اعتبار کر لینا چاہیے۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ اس بار میں تمہیں باؤس نہیں کروں گا۔"

"تم بڑے وقت کی بات کر رہے ہو، میں کیسے مان لوں کہ تم پر واقعی کوئی اتاج بڑا وقت آیا ہوا ہے؟"

"اس کا پتلا ثبوت یہ ہے کہ میں اس وقت تم سے معاملہ نہ منگھو کر رہا ہوں۔" اس نے ہلکا تو کھنکھناتے جواب دیا "تم نے صرف نیتے ہو بلکہ اکیلے بھی ہو۔ اپنی برتری کو کو تم نے جو حماقت کی ہے وہ تمہیں معاف بھی کر سکتی ہے۔ میرے دو چار آدمی آسانی کے ساتھ تمہیں تیرا زنا کر سکتے ہیں لیکن میں اس راستے سے گریز کر رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ یہی ایک بات میرے دعوے کی تائید کے لیے کافی ہو گی۔"

"ظلام رسول کے معاملے میں مجھے ایک ٹھوس وجود تمہارے خالے کہا تھا، جو میں نے کھینچ لیا لیکن اس کے باوجود میری نیت پر کھینچا جا رہا ہے۔ جب کہ ماسرکار کے بارے میں، میں کوئی بری یا بھلی جبری دے سکوں گا۔ اس تک رسائی میرے بس سے باہر ہوگئی ہے۔ مجھے سے قاصر ہوں کہ تم ٹھوس ثبوت کے بغیر میری کھالی پر کیسے یقین کر لو گے۔ ایسے کاموں میں ثبوت فراہم کرنا بالکل ہوتا ہے۔"

"میں ان باتوں کو سمجھتا ہوں" میری متواتر جرح نے اُسے

ایک مقبول ترین سلسلہ

شالو

نہایت ہی دلچسپ 2 حصے میں 123 پارٹس

کتابی شکل میں شائع ہو گیا ہے

• شاطر پوشیدہ راہنامہ یافتہ مصنف تھیلین نے اپنے خاص انداز میں تحریر کیا ہے۔

• ایک ایسی دلچسپ ہنگامہ آرا اور شہر خیز داستان جس میں قدم قدم پر سانس اور خطرہ قیامت آ رہی ہے۔

• کتاب قیمت بذریعہ پستی ذراقت

• مفتی آزاد یار لائسنسڈ پبلشر اسلام آباد

کتابیات پبلی کیشنز

مفتی محمد رفیع الرحمن صاحب

فون: 5802551 5802552-5895313 فیکس: 5802551

کتابیات1970@yahoo.com

پوسٹ بکس 23

کراچی 74200

چاہیے۔ اچھا کام جب بھی کیا جائے، اچھا ہی کہلاتا ہے لیکن ایک اٹک کہانی ہے۔ اس کا غزالہ یا رجنی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

ہیروئن بلکہ موت کے مین الاقوامی سوداگروں سے ملنے والی ہولناک بارودی ٹھک کے حوالے سے اس نے جو کہانی چھپائی تھی وہ میرے لیے اس اعتبار سے شرمناک تھی کہ الہیہ سے آئے والے ہتھیاروں کی محفوظ ذخیرہ اندوزی اور تقسیم کے کام میں کامیابی جیسا مقامی تاجر کلیدی کردار ادا کر رہا تھا۔ جب کہ اس واقعے کا دوسرا پہلو میرے لیے باعث فخر تھا کیونکہ میں نے اپنی کوششوں سے اس خطرناک مشن کو بدترین ناکامی سے دوچار کر دیا تھا اور باہر سے ابوموسیٰ المبارک نامی چنگیزی جزیرے کے راستے آنے والے

ہتھیاروں اور گولا بارود کا سایہ بھی ان تخریب کار غداروں تک نہیں پہنچ سکا تھا جو اس ہمدی آس لگائے آگ اور خون کی ہول کھیلنے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔

میں اس حساس اور نازک موضوع پر شری مان سنگھ سے کئی نئی بحث میں الجھنے کے لیے آمادہ نہیں تھا۔ اس لیے میں نے الہیہ والے مشن سے مکمل بے خبری کا مظاہرہ کرتے ہوئے صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا کہ تاریخ ہوا جغرافیہ "اس کا انحصار ان لوگوں کے

عزم اور حوصلے پر ہوتا ہے جو تاریخی یا جغرافیائی منصوبوں پر کام کرتے ہیں۔ اس فلسفے کی روشن ترین مثال یہ تھی کہ مسلمانوں کا اقلیتی طبقہ صدیوں تک ایک ایسے علاقے پر حکمرانی کرتا رہا جہاں ہندوؤں کی بھاری اکثریت ہستی تھی۔ اگر شری مان سنگھ کو قرار دے سکتے ہیں تو میری بات اس کے لیے زہر سے کم نہیں تھی لیکن وہ ہندو یا رکھ ہونے کے ساتھ ہی ایک تجربے کا سفارت کار بھی تھا اس لیے وہ میرے تبصرے کو خاموشی سے ہی لیا۔

"ہم پیشہ ور لوگ ہیں" وہ اپنا گلا صاف کرتے ہوئے دہمی آواز میں بولا "ہمیں ان سطحی باتوں میں نہیں الجھنا چاہیے۔ آئیے

یا جغرافیہ کے ساتھ کوئی آمرانہ زبردستی کی جائے تو حالات کدھا بار کر خود بخود ساری انسانی غلطیوں کا ازالہ کر لیتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں کچھ ملک فنا ہو جاتے ہیں یا چند نئے ملک جنم لے لیتے ہیں یہ میرا اور تمہارا شعبہ نہیں ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو" میں نے اس کے زہریلے تبصرے کو نظر انداز کرتے ہوئے مفاہانہ انداز میں کہا "یہ بتاؤ کہ اب میںا واپسی کی کیا صورت ہوگی؟"

"کچھ بھی نہیں" اس نے بے ساختگی سے کہا "تم اپنی مرضی سے یہاں آئے ہو اور جب چاہو کسی کی اجازت کے بغیر واپس جا سکتے ہو" میں تم سے غلام رسول کے بارے میں بات کرنا چاہتا

تمہارے بعد آنے والے سے نئی شرائط پر کوئی سمجھوتا کرنا ہوگا کیونکہ اس وقت میرے ہاتھ میں کوئی کارڈ بائی نہیں رہے گا۔ تمہارا سرکار کے بارے میں میری رپورٹ لینے کے بعد کہیں کوچ کر چکے ہو گے۔"

"میں مانتا ہوں کہ بیوروکریسی کے روایتی حریفوں کے بارے میں تمہاری معلومات قابل رشک ہیں" اس نے میری دلیل کا وزن تسلیم کرتے ہوئے، مبالغہ نہ کیجے میں کہا "میں چھپیں صرف اتنا یقین دلانا چاہتا ہوں کہ تمہارے مفاہ کے خلاف ہونے والی سازشوں میں، میں فریق نہیں بنوں گا۔"

"چلو" میں یہ سب مانے لیتا ہوں مگر مجھے ایمانداری کے ساتھ یہ بتاؤ کہ غزالہ اسی شرمیں ہے یا تم اسے واقعی سرحد پار بھیج چکے ہو؟"

شری مان سنگھ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر قدام لیا اور تقریباً کراچے ہوئے بولا "تم مجھ پر مسلسل چوٹیں کیے جا رہے ہو۔ تم یقین کر دو کہ غزالہ سرحد پار جا چکا ہے۔"

"بشرطیکہ اسے راستے میں ریجنز یا فوجیوں نے دوسروں کے ساتھ گولی نہ مار دی۔" میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی اپنا اندیشہ ظاہر کر دیا۔

"ریجنز اور فوجی اپنی چوکیوں اور ان کے گرد و پیش کی حفاظت میں مصروف رہتے ہیں۔ شہروں بلکہ صوبے کی انتظامیہ نے ابھی تک امن و امان کے قیام کے لیے ان سے کوئی مدد نہیں لی ہے اس لیے کھلے راستوں پر ان لوگوں کی حکمرانی ہے جو ہمارے دوست اور ہمدرد ہیں، ان کے لیے غزالہ کو سرحد پر پہنچانا کوئی بڑا کام نہیں تھا۔ یہ ہماری بد قسمتی ہے کہ الہیہ نامی بحری جہاز پھنسا گیا۔ تم نے انڈیوں میں پڑھا ہوگا کہ اس پر کس قدر خطرناک ہتھیار موجود تھے۔ الہیہ کا مشن ناکام نہ ہوا ہوتا تو آج سرحدی زنجیریں حیدر آباد، نواب شاہ اور سکھر تک منتقل ہو گئی ہوتیں۔ ہمارے دوستوں کو زراہی ٹھک مل جائے تو تاریخ کے صفحات میں ایک نیا جغرافیہ جنم لے سکتا ہے۔"

"تم حیدر آباد، نواب شاہ اور سکھر کی بات کیوں کر رہے ہو؟

کیا اس لیے کہ وہاں۔۔۔۔۔"

اس نے مجھے اپنی بات مکمل کرنے کا موقع دیے بغیر پُر زور لہجے میں کہنا شروع کیا "میری بات کو نسلی اور لسانی چکر میں نہ الجھاؤ۔ میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ کانڈی تقنوں پر تکیہ کر لگانے سے ملک اور قومیں وجود میں نہیں آسکتیں۔ یہ ایک تاریخی عمل

ہوتا ہے۔ تقسیم ہونی ہی تھی تو دریائے سندھ کو سرحد بنانا چاہیے تھا۔ روہڑی ہند میں ہوتی اور سکھر تمہارے سندھ کا حصہ ہوتا۔ دریا کے ایک کنارے ہمارا بھارت ہوتا اور دریا پار تمہاری مسلم عمری ہوتی۔ یہ کام ہمارے پُر کھے نہ کر سکے تو اسے اب درست کر لینا

میری توقع سے زیادہ چالاک ہو گیا تھا اور اس خیال سے ایسی باتیں کر رہا تھا کہ اگر آپریٹر کو کوئی چال چھٹ کر ہماری گفتگو سن رہا ہو تو اپنے آقاؤں کو بتا دے کہ میری پشت پر کیسے بڑا ساتھی صف آرا تھے۔
”کچھ نہیں ہو گا۔“ میں نے سختی کے ساتھ کہا ”تم لوگوں کے

سرول پر خون سوار ہو رہا ہے۔“ اسی لمحے میرے ذہن میں ایک اچھوتا خیال آیا اور میں نے پینتھر بدل کر کہا ”کوئی گولی نہیں چلے گی کوئی تصادم نہیں ہو گا۔ میں یہاں سے اپنے میزبان کے ساتھ باہر نکلوں گا اور میرا بال بھی بیک نہیں ہو گا۔“

میں ریسیور کریڈل پر رکھ کر شری مان سنگھ کی طرف گھوما تو وہ ابھٹن آمیز انداز میں میری طرف گھرا تھا ”یہ کیا پتھر ہے؟ میں تو تمہارے ساتھ باہر نہیں جاسکتا۔“

”میرے ساتھی میری سلامتی کی طرف سے فکر مند ہو رہے ہیں۔“ میں نے ملاطفت سے کہا ”وہ سب وحشی اور خونخوار لیکن وفادار آدمی ہیں۔ اس وقت یہ عمارت کم از کم تین راکٹ لانچرز کی زد میں ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ مجھے تمہاری نیت پر اعتماد نہیں تھا اس لیے میں اپنی جبری آزادی کا بندوبست کرنے کے بعد یہاں آیا تھا۔ طویل انتظار کے بعد اب ان کے اعصاب جھٹنے شروع ہو گئے ہیں۔ تم کو ذرا سی زحمت کرنی ہوگی ورنہ وہ بدستور بڑھ کے رہیں گے۔ مجھے زسری پر چھوڑ کر تم لوٹ آنا۔ میں وہاں سے ٹیکسی لے لوں گا۔“

”میں تمہیں یہیں ٹیکسی منگائے دیتا ہوں، میرا جانا کیا ضروری ہے؟“

”تمہاری مرضی!“ میں نے بے پروائی سے شانے اچکا کر کہا۔
”مجھے بس اس عمارت کی سلامتی عزیز ہے۔ میں اکیلا باہر نکلا تو ایسا نہ ہو کہ وہ اس عمارت پر چاند ماری کر کے فرار ہو جائیں۔ میں اپنے آدمی سے کہہ چکا ہوں کہ میں تمہارے ساتھ باہر نکلوں گا۔ اب ایسا نہ ہوا تو ان کی کھوپڑیاں پھر جائیں گی۔“

”تم بلا وجہ مجھے خوف زدہ کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ تمہیں اُس سے ایسی بات کہنے کی کیا ضرورت تھی؟“ شری مان سنگھ نے چیخ کر کہا مگر میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ میری پوشیدہ دھمکیوں سے خاصا خائف ہو گیا تھا اُس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”اب انہیں بتاؤ کہ تم اکیلے ہی یہاں سے جاؤ گے۔“

”کیسے بتاؤں؟“ میں نے معصومیت سے پوچھا ”اب تو جو ہوتا تھا وہ ہو گیا۔“

”پہلے کسی ساتھی کو فون کرنا!“ شری مان سنگھ نے جھٹکا کر کہا۔
”اُس نے کسی پبلک کال آفس سے فون کیا ہو گا۔ میں اس سے کہاں رابطہ کروں؟ وہیے تو ان سب کے پاس ٹرانسمیٹر ڈیمگی ہیں

وہ میں کچکا ہوں۔“
”یہ ایک اہم خوش خبری ہے۔“ میں نے فوراً ہی اپنی جگہ چھوڑ دیا۔
”جانے سے پہلے ایک بات اور بتاتے جاؤ!“ اس نے بھی اپنی جگہ چھوڑتے ہوئے کہا۔

میں رک کر اُس کی چمکدار اور جنس آمیز نگاہوں میں جھانکنے لگا۔
”یہ اسپیشل ٹاسک فورس کیا بلا ہے؟“ اس نے الجھے ہوئے انداز میں پوچھا ”بچھلے کچھ عرصے سے اس کا نام خاصے قاتل کے ساتھ سامنے آ رہا ہے۔“
”خباہرات تو اس بارے میں خاموش ہیں، میری نگاہ سے ایسی کوئی خبر نہیں گزری۔“

”خباہرات نہیں، میں زیر زمین دنیا کی بات کر رہا ہوں۔ بہری کیسے بنو اور اس کے افسران بھی ایس نی ایف کے بارے میں فکر مند نظر آتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ کمونڈ کی ایسی تخصیبات کے علاوہ دوسرے اہم اور حساس مقامات کی دیکھ بھال کی ذمہ داری بھی اس نی فورس کو سونپ دی گئی ہے۔۔۔۔“
”مفتگو کا سلسلہ وہیں منقطع ہو گیا کیونکہ وہاں موجود فون کی گھنٹی بجنا چلی تھی۔

دوسری طرف شاید کوئٹہ کا ٹیلی فون آپریٹر تھا کیونکہ چند ثانیوں تک اس کی بات سننے کے بعد، شری مان سنگھ اسے لائن ہولڈ کرنے کی ہدایت کر کے میری طرف متوجہ ہو گیا۔

”تمہارے لیے کوئی شخص بار بار فون کر رہا ہے۔“ اس نے کہا۔
”آپریٹر نے اسے ٹالنے کی کوشش کرتے ہوئے فون بند کر دیا تھا لیکن وہ بار بار اسے تنگ کر رہا ہے، تم بات کر دو گے؟“
”ضرور!“ میں لپک کر اُس کی طرف بڑھا اور اپنی پوسٹ واپج پر نگاہ ڈالتے ہوئے بولا ”اگر میں نے بات کر کے اسے مطمئن نہ کیا تو صرف سات منٹ بعد اس عمارت میں قیامت آجائے گی۔“

”لائن دے دو!“ شری مان سنگھ نے ماؤتھ پیس پر آپریٹر کو ہدایت دے کر فون کا ریسیور میرے حوالے کر دیا۔
”حالات سازگار ہیں“ میں نے کن انجیوں سے شری مان سنگھ کا جائزہ لیتے ہوئے سلطان شاہ کی آواز پہچان کر کہا۔
”آپریٹرز ڈیٹھ اسکو آؤ کو معطل سمجھو۔ میں چند منٹ بعد یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔“

”تم بے فکری سے باہر آؤ“ سلطان شاہ کی آواز ابھری۔
”پوری عمارت ہماری محاصرے میں ہے۔ تمہارے ساتھ ذرا سی بھی گزری گئی تو یہ عمارت آگ اور خون میں منسا دی جائے گی“ وہ

اور جوانوں پر مشتمل ہے۔ اس کی کمان تمہارے صدر کے ہونے کے لئے ایک افسر کے ذمے ہے۔ اس کی شخصیت بہت پرانہ اور پوشیدہ ہے۔

میں دھم سے ہنس پڑا "میرا خیال ہے کہ تمہارے ساتھ بہتری کیسے سبھی پاکستان کے بارے میں ضرورت سے زیادہ سوچنے لگا ہے، جس کی تم دونوں کو ایسے ڈرائے خواب آنے لگے ہیں۔ پاکستان جیسے مسکین ملک میں ایسی کسی رازدارانہ سرگرمی کا امکان ہی نہیں ہے۔ میں نے تو سنا ہے کہ غلام میں گردش کرنے والے جاسوس امریکی سیارے، دن میں اٹھارہ مرتبہ پاکستان پر سے گزرتے ہیں اور یہاں دونا ہونے والی زیر زمین تبدیلیوں تک کو دیکھا کر لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے ایسی ٹی ایف کا وجود زیادہ دیر نہیں چھپایا جاسکتا۔"

"لیکن فی الحال یہ ایک راز بلکہ معافی بنا ہوا ہے، ہونے کے اس بارے میں بھی سن گئی لینے کی کوشش کرنا۔ اس نے بولنے لگے کہ بھر کے لیے میری طرف دیکھا اور میرے چہرے پر ناگواری کے اثرات محسوس کر کے فوراً ہی بات آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "مگر اس کا ہماری باہمی شرط سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔"

میں دل ہی دل میں اسے گالی دے کر رہ گیا۔ فون پر سلطان شاہ سے بات کرتے ہوئے میرے ذہن میں یہ اچھوتا خیال آیا تھا کہ کچیلے شری مان سنگھ کو کوئٹہ کی عمارت سے باہر نکال کر اغوا کر لیا جائے تو غزالہ کی واپسی کا معاملہ کسی پس و پیش کے بغیر طے پا جائے گا۔ محض اسی وجہ سے میں نے اسے کوئی ہتھیار مانہ لینے پر اصرار کیا تھا۔

میرا ارادہ تھا کہ دوران سفر میں اس کا ہسپتال کسی جگہ سے باہر نکلا کر اس پر قابض ہو جاؤں گا اور اسی کے زور پر اسے اغوا کر کے ایس ٹی ایف والوں کی تحویل میں پہنچا دوں گا جہاں رہتی ہے۔ یہی سے موجود تھی۔ اسے شری مان سنگھ کو اپنے دو بدمذکر کر لیا خوشی ہوئی۔

شری مان سنگھ نے سلطان شاہ کا فون آنے سے پہلے ایس ٹی ایف کا ذکر چھیڑا تھا۔ اس نے بعد میں اس ذکر کی ابتداء کی ہوئی تھی۔ مجھے شبہ ہوتا کہ کہیں اس نے میرا دماغ نہ پڑھ لیا ہو۔ وہ میرے ساتھ باتوں میں مگن ہو گیا تھا لیکن میں اپنی بددیہی کی وجہ سے اپنا ہی سے محتاط اور چوکتا تھا۔ میں نے یہ بات بطور خاص نوٹ کی کہ وہ گاڑی چلاتے ہوئے بابا رعب نما آئینے پر نظریں دوڑاتا تھا۔

ابتدا میں مجھے خیال ہوا کہ وہ عادی ایسا کر رہا تھا۔ سلطان شاہ کی آڑ میں وہ درحقیقت ایک خطرناک پیشے سے منسلک تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ چلنے سے پہلے، میں نے اسے سلطان شاہ کے ساتھ دے کر اس کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجادی تھی جس پر وہ اپنے گرد و پیش اور عقب سے پوری طرح باخبر رہتا تھا۔

لیکن میں اپنا اسٹروٹ اس وجہ سے نہیں لایا کہ تم اس کی وجہ سے مشکوک اور شبہات میں مبتلا ہو جاؤ گے۔"

"تم نے مجھے بلاوجہ مصیبت میں ڈال دیا" وہ بے زاری کے عالم میں بڑبڑایا "اب مجھے تم کو لادکر گھر بھی پہنچانا ہوگا۔ پتا نہیں تمہیں ایسی امتحان بات کہنے کی کیا ضرورت پیش آگئی تھی؟"

"ہاں، غلطی ہوئی تھی۔ مگر کے بجائے تم مجھے زسری پر چھوڑ دینا۔ وہاں سے میں خود چلا جاؤں گا۔"

میری وہ حرکت شری مان سنگھ کے مزاج پر واقعی گراں گزری تھی۔ میری بھیاں گھٹنے کی وجہ سے وہ میری خود ساختہ شرط سے انحراف کرنے کا خطرہ بھی مول نہیں لے سکتا تھا اس لیے وہ بکنا جھٹکا ہوا میرے ساتھ ہوا۔ اس کے محافظ دور دور سے ہمیں دیکھتے رہے۔

"مناسب سمجھو تو کوئی ہتھیار ساتھ لے لینا" عمارت کے دسویں طابق سے گزرتے ہوئے، میں نے اس کے کان کے نیچے سرگوشی کی۔

"کیوں؟" اس نے آنکھیں نکال کر سوال کیا اور بھڑک کر وہیں رک گیا۔

"احتیاطاً مشورہ دے رہا ہوں کیونکہ میں بھی نشتا ہوں" میں نے مکارانہ زبانی سے کہا "ایک اچھا سیکرٹ ایجنٹ کبھی بھی ہتھیاروں سے خالی نہیں ہوتا۔ مشورہ ماننا یا نہ ماننا تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔"

وہ مجھے گھور کر رہ گیا۔ اس کی نگاہوں سے ایسی بے بسی ہوئی تھی جیسے اس کا بس پلے تو وہ مجھے کاپی چبا جائے گا لیکن مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ راستے میں اس نے مجھے چلنے رہنے کی ہدایت کر کے اپنا رخ تبدیل کر لیا۔ بعد میں جب وہ رآمدے میں مجھ سے ملا تو اس کی ایک جیب خاصی وزن کی ہو چکی تھی۔

شری مان سنگھ نے ایک عام شری نمبوں والی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی تو مجھے اس کی جیب سے ہسپتال نکالنے کی فکر لاحق ہو گئی۔ اس کی جیب میں رچے ہوئے وہ ہتھیار میرے لیے بالکل بے مصرف تھا۔

"پیش ٹانک فورس والی بات ادھوری رہ گئی تھی" گاڑی سوک پر لانے کے بعد اس نے معتدل لب و لہجہ میں مجھے یاد دلواتے ہوئے کہا "اس بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟"

"میں فوج، پولیس اور ایسے ہی دوسرے سرکاری اداروں سے دور رہ کر کام کرنے کا عادی ہوں" اسی لیے مجھے اس بارے میں کچھ علم نہیں "میں نے بے پروائی نہ کیجیے میں کہا۔

"اس کے بارے میں میری کیسے بھی پریشان ہے" وہ بولا۔ "پاکستانی حکام ایس ٹی ایف کا وجود ہی تسلیم نہیں کرتے لیکن ہمارے ذرائع بتاتے ہیں کہ یہ بہت منظم، مؤثر اور طاقتور فورس ہے۔ اس کی ہارڈ کور "پیشل سروسز گروپ کے رٹائرڈ فوجی افسران

نہیں ہو کہ ایسی باتوں پر اپنے ذاتی مفادات قربان کرتے پھرو۔ آج کل تو بڑے بڑے لوگ بھی سب کچھ بچ بچ کر اپنا گھر بھرنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ یہ بتاؤ کہ غزالہ کے بارے میں کیا پیش رفت ہوئی؟ اسے کس جرم کی سزا مل رہی ہے؟

”انسان بس کو شش ہی کر سکتا ہے“ میں نے ایک گھرا سانس لے کر کہا ”تقدیر کو بدلنا اس کے بس ہے باہر کی بات ہے۔ وہاں جا کر میں نے شری مان سنگھ کو یہ بتایا ہے کہ میں بدترین حالات سے بھی لڑتا جانتا ہوں۔ جب میں نے ششیں گنوں کے میٹرکین نکال کر وہ دونوں ہتھیار ایک طرف پھینکے تو تم تصور نہیں کر سکتے کہ حیرت سے اس کا کیا حال ہوا تھا۔ میرے اس ولیرا نہ دوسرے کی وجہ سے وہ یہ بھی بھول بیٹھا کہ غلام رسول والے معاملے میں میری پوزیشن مشکوک ہے۔ اس کے ذہن سے شبہات زائل ہو جانے کے بعد مجھے کامیابی کی امید نظر آنے لگی ہے۔ وہ یقیناً غزالہ کو واپس بلوائے گا۔“

”خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔ اکثر اوقات تمہاری بے بنیاد قیاس آرائیاں بھی درست ثابت ہوتی ہیں“ اس نے مضطرب ہنسی کے ساتھ کہا ”لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہمارے پاس اس امر کی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ شری مان سنگھ اگلی بار بھی ایسی ہی وعدہ خلافی نہیں کرے گا۔“

”موجودہ حالات میں ہم رجنی کو اس کی نیک نیتی کی ضمانت سمجھنے پر مجبور ہیں، کل تک وہ اس کی موت کا خواہاں تھا اور آج اس کے فراق میں مبرا جا رہا ہے۔“

”ایسی ناقابل فہم باتیں اور ان کا جواز تم ہی سمجھ سکتے ہو۔ یہ رام لپلا نہیں میری سمجھ سے باہر ہوتی ہیں۔ پتا نہیں لوگوں کو عورت کا اتنا گمراہ کیا کیوں چڑھ جاتا ہے؟“

”وقت آئے گا تو کسی کے بتائے بغیر یہ سارے فلسفے سمجھ لو گے“ میں ہنس کر رہ گیا۔

میرے لیے وہ الجھن آمیز مرحلہ تھا۔ ملا سرکار کے بارے میں سب کچھ میرے علم میں تھا۔ میں پوری تفصیل میں جائے بغیر شری مان سنگھ کو صرف اتنا بتا سکتا تھا کہ وہ ایک مقابلے میں دھونک مارنے کا شکار ہو کر مارا گیا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ غزالہ کو فوری طور پر سرحد پار سے نہیں نکال سکتا تھا۔ اس کے عرائم کا ٹھیک ٹھیک اندازہ لگانے کے لیے میں اسے اتنا وقت دینا چاہتا تھا کہ وہ میرے کچھ بتانے سے پہلے ”حسب وعدہ غزالہ کو واپس لانے کی کو ششیں کر سکے۔“

اس کے لیے ضروری تھا کہ میں چند روز کے لیے اپنے دل پر صبر کی مثل رکھ کر حالات سے سمجھو تا کر لوں اور غزالہ کو میسر بھولا رہوں۔ اس دوران میں ویرا کا معاملہ ٹھنایا جاسکتا تھا۔

”اور اب تم دیر کے بارے میں کیا سوچ رہے ہو گے؟“ مجھے خیالات میں کھوٹا ہوا دیکھ کر سلطان شاہ نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

کو شش کر رہا تھا۔ لیکن اس کے اضطرابی رویے میں کوئی ایسی بات مضر تھی کہ میری چینی جس نے مجھے انگوٹھی کا ردوائی پر عمل پیرا ہونے سے روک دیا۔ میری دانست میں وہ الجھن دور ہونے سے پہلے کوئی اور چینی رفت خطرناک نتائج کا پیش خیمہ بن سکتی تھی۔ آخر کار میری بے چینی اتنی بڑھ گئی کہ میں شری مان سنگھ سے سوال کیے بغیر نہ رہا۔

”کیا بات ہے؟ کیا کوئی تمہارا چچا کر رہا ہے جو تم بار بار غب نما آئینے میں دیکھ رہے ہو؟“ تاج محل ہوٹل والے چوراہے سے گزرنے کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔

”اپنے محافظوں کی گاڑی کا دھیمان رکھنا پڑ رہا ہے“ اس نے میرے سوال پر کسی تجسس کا مظاہرہ کئے بغیر بے پروائی سے کہا۔ ”شک کی بے جگہ۔ مجھے بھڑکھاؤ میں وہ اوہراؤں پر نکل گئے تو مجھے واپس لوٹنا پڑ جائے گا۔“

”کیوں؟“ میں نے اس کے آخری فقرے پر چونک کر سوال کیا۔

”آج کل کے مخدوش حالات میں“ میں محافظوں کے بغیر شری مان کوں پر نہیں نکلا۔ آپس کی دشمنیاں تو چلتی ہی رہتی ہیں لیکن دونوں ملکوں کے سفارتی تعلقات میں جب بھی کوئی خرابی ختم ہوتی ہے تو سب سے پہلے ایک دوسرے کا سفارتی عملہ مخالف ملک کے قارب کا نشانہ بنتا ہے۔ محافظ موجود ہوں تو کم از کم میرے سفارت خانے کو بوقت یہ تو مطمئن ہو جائے گا کہ مجھے چلتی سرک سے کسی سرکاری انجینی نے اٹھایا ہے۔ واردات ہوتے ہی شور مچا دیا جائے تو بدترین تشدد کی نوبت نہیں آتی۔“

اس کی وہ تقریر سن کر میرا سارا جوش و خروش ٹھنڈا پڑ گیا۔ وہ ایک گرگ باران دیدہ تھا اور اسے عام حروں سے زیر کرنا کسی بھی صورت میں ممکن نہیں تھا۔

میں فلیٹ پر واپس پہنچا تو سلطان شاہ بے چینی کے ساتھ میرا منتظر تھا۔

اس نے میری کھانسن کر بڑا سانس دیا اور ہنسنے ہوئے لہجے میں کہا ”اس کا مطلب ہوا کہ وہاں جانے کا خطوط مل لے کر بھی لگنا قائم نہیں ہو سکا۔ بات وہیں ہے جہاں پہلے تھی۔“

”تمہارا بوجہ بہت سلی ہے“ میں نے کہا ”اگر اس کے پیچھے محافظوں کا لشکر نہ ہوتا تو میں تمہیں متاثر نہ کرتا۔ شری مان سنگھ کو یہ ہوٹل کے اسٹیشن فور پر پہنچا دیا جاتا اور اس کی گاڑی میری گاڑی کے کونسلٹ کے باہر پارک کرادی جاتی۔ اس طرح ان محافظوں کی ششیں میں جس سوجنک کا آغاز ہوتا“ اس کا سارا فائدہ ہم کو پہنچا۔ ان کا ٹھکانہ جوڑ ہمارے لیے بہت بڑا خطوبہ بنا ہوا ہے۔“

”یہ سب کل ہی اور قوی مسلح کی باتیں ہیں۔ تم اتنے بڑے آدمی

لیکن پھر بلو کر اس ذیل کا کیا بنے گا؟

”بہت نازک معاملہ ہے“ وہ جلدی سے بولا ”اس بار دروازہ

البتہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ ایران سے آنے والی چوہ

وزنی کیپ کو وہی بچا سکتی ہے۔ بارہ فن وزنی ٹیٹ ایکس پیر

قربانی دے کر اگر بقیہ سامان خیریت سے یہاں پہنچ گیا تو یہ بہت

کارنامہ ہوگا۔ اس کی جگہ کسی دوسرے کو اس مشن پر مامور کیا جائے

سب کچھ تباہ ہو جائے گا۔“

”تمہارے لئے بغیر بھی میں یہ باتیں جانتا ہوں۔ اس خطے

حالات اس قدر نازک اور دھماکا خیز ہیں کہ ایران بھی ایسی طاقت

بننے کی خواہش رکھ سکتا ہے لیکن اس کیپ میں یقیناً ایسا سامان

سامان موجود نہیں ہوگا جسے جوڑ کر ایک ایسی پلانٹ کھڑا کیا جائے

ایران والے خفیہ منڈیوں کے دلالوں کے ذریعے یہ کیپ بھاری

داموں کے عوض کسی بھی ملک کو بیچ سکتے تھے لیکن انہوں نے

پاکستان کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا ہے تو اس مشن کو مکمل ہونا چاہیے

”ہو سکتا ہے کہ بلو کر اس ذیل کے ذریعے ان دونوں ملک

میں طویل مدت پر پھیلا ہوا تعاون کا کوئی خاص منصوبہ پروان

چڑھانے کی کوششیں کی جارہی ہوں۔“ اس نے میری بات کا

کہا ”ایسی میدان میں پاکستان کی طلسماتی کامیابیوں کا ہر طرف

ہے۔ ایران کی طرف سے ملنے والی مدد کے سارے پاکستان کے

پروگرام میں سرعت پیدا ہو سکتی ہے۔ کل وہ اس پوزیشن میں

آسکتا ہے کہ ایران سمیت اپنے دوسرے دوستوں کو مدد دینی شروع

کر دے۔“

”یہ سب دور دراز امکانات اور قیاسات ہیں“ میں نے

سوچنے والی بات یہ ہے کہ شی کے آقاؤں کی پیش بینی کا کیا

ہے! انہوں نے ایران کو ایسی سازو سامان کی وہ کیپ اس زمانہ

میں دی تھی جب وہاں ان کا بہترین اور روایتی دوست بھرانہ

وہ خلائی نئی کے عروج کا زمانہ نہیں تھا لیکن انہوں نے اس

بھی اس کیپ میں ایسے خفیہ آلات نصب کرنے سے گریز نہیں

جن کی مدد سے وہ کسی بھی وقت پوری کیپ کو جلع اور پھٹے

لے میں تبدیل کر سکتے ہیں۔“

”اپنے مفادات کے حصول کے لیے اپنے بہترین دوستوں

کی خواہشوں کو قربانی کا بکرا بنائے بغیر کوئی بھی ملک پوری

عمرانی کرنے کے خواب نہیں دیکھ سکتا۔ میں تمہیں ایک اور

بھی بتاتا چلوں۔ مجھے تو یوں محسوس ہو رہا ہے کہ وہ لوگ اپنے

عزائم کی تکمیل کے لیے پاکستان کی ایسی کامیابیوں کو بڑھا

پیش کر رہے ہیں۔۔۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ کوہر کی کہانیاں افسانوی ہیں

نے حیرت سے پوچھا۔

”تم میری بات نہیں سمجھتے۔ میں پاکستان کی کامیابی

غزالہ سے بھگ کر تمہارا ذہن لامحالہ اسی کی طرف جاتا ہے۔“

”تم گدھے ہو“ میں نے تخت آمیز لہجے میں کہا ”بات غزالہ

اور ویرا کی نہیں بلکہ ترجیحات کی ہوتی ہے۔ کیا تم بلو کر اس ذیل

کی اہمیت سے انکار کر سکتے ہو؟“

”ہرگز نہیں!“ اس نے اپنا سر ہلاتے ہوئے جڑور انداز میں

کہا ”میں تو یہ دیکھتا چلا آ رہا ہوں کہ جب بھی تمہاری اور اس کی

ٹھن جاتی ہے تو وہ کسی نہ کسی ایسے معاملے میں ہاتھ ڈال دیتی ہے

کہ ہم اپنی خورید دشمنی کو بھول کر اس کے ساتھ مصالحت پر مجبور

ہو جاتے ہیں۔“

”غیبت ہے کہ اس بار تم نے ویرا سے مصالحت کا الزام مجھ

پر نہیں ڈالا۔“

”اسے تم الزام نہیں کہہ سکتے۔ ظفر نے تمہاری اور ویرا کی

منگٹو سننے کے بعد تمہارے منہ پر کہہ دیا تھا کہ تم دونوں کبھی ایک

دوسرے پر ہتھیار نہیں اٹھا سکو گے۔ میرا اندازہ بھی کچھ ایسا ہی

تھا۔ فرق اتنا ہے کہ میں اپنے قیاسات کو الفاظ میں نہیں ڈھال سکا

اور ظفر نے فوراً ہی تبصرہ کر ڈالا۔ میں اس کے خیالات سے سو فیصد

متفق ہوں۔“

”وقت آیا تو تم دیکھو گے کہ وہ میرے ہی ہاتھوں ماری جائے

گی۔“

”وہ بھی یہی دعویٰ کرتی ہے لیکن اس کا عمل کچھ اور ہوتا

ہے۔ ابھی تم شری مان ٹکھ اور رجنی کا ذکر کر رہے تھے۔ وہاں بھی

محبت اور نفرت کا کچھ ایسا ہی کھیل کارفرما نظر آتا ہے۔ فرق صرف

اتنا ہے کہ وہ دونوں میاں بوی کے رشتے میں بندھے ہوئے ہیں

لیکن تمہارا اور ویرا کا معاملہ تو کسی بھی خانے میں فٹ نہیں بیٹھتا۔

وہ اچھی طرح جانتی ہے کہ جب تک غزالہ زندہ ہے وہ تمہاری توجہ

حاصل نہیں کر سکتی لیکن پھر بھی وہ تمہارے پیچھے بھاگتی پھر رہی

ہے۔“

”تم مبالغہ آرائی کر رہے ہو۔ اس کے لیے آسان راستہ یہ

ہوتا کہ وہ غزالہ کو ٹھکانے لگا دیتی لیکن اس نے آج تک غزالہ کو

کوئی بڑا نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی۔“

”اس میں تمہارا تصور نہیں لیکن تم کو یہ ماننا پڑے گا کہ وہ

تمہیں چاہتی ہے۔ اس کی حالت مجنوں جیسی ہے جسے لپل کے

ساتھ ہی اس کا کتا بھی عزیز تھا۔ حالانکہ وہ اس پر لپکا اور بھونکتا

بھی تھا۔ وہ غزالہ کو نقصان نہیں پہنچاتی کیونکہ اسے معلوم ہے کہ

ایسے کسی واقعے سے تمہیں دکھ ہوگا اور تم اس سے بیشک کے لیے

خطرہ ہو جاؤ گے۔“

”وقت ہی تمہاری ان کہانیوں کا جواب دے سکے گا“ میں نے

ایک گہرا سانس لے کر کہا ”اب میں اسے سلور آئیز دینے کے

بہانے بٹا کر ہلاک کر سکتا ہوں۔ وہ نفرتی ٹکے اس کی مجبوری بنے

ہوئے ہیں۔ وہ میرے ایک اشارے پر کہیں بھی دوڑی چلی آئے گی

”اب میں تھیکا لنگ نہیں رہی ہوں“ دوسری طرف سے فوراً میری آواز سنائی دی ”اب تم مجھ سے شرافت سے بات کرو گے تمہیں معلوم ہے کہ میں مسز نہیں رہی ہوں۔“

”تم نے مسز نہ ہونے کے باوجود جوانی کی راتوں اور مرادوں کے دنوں کے مزے کھائے ہیں۔ تمہیں اس خطاب سے اتنا الرجک تو نہیں ہونا چاہیے“ میں نے استہزا کے ساتھ کہا۔

”شام کے بجائے تم نے اس وقت کیوں رابطہ کیا ہے؟“ اس نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

”میرا خیال ہے کہ تمہارا مشن مکمل ہونے تک ہماری دشمنی کا سلسلہ موقوف ہو چکا ہے“ میں نے بھی اس سے الجھنے کے بجائے معنی خیز لہجے میں کہا ”اور اب ہمیں.....“

”اس کا مطلب ہے کہ تم سطور آئیز سے دستبردار ہونے کے لیے آمادہ ہو چکے ہو؟“ اس نے میری بات مکمل ہونے سے پہلے مسرت آمیز انداز میں کہا ”پھر کب اور کہاں آرہے ہو؟“

”جب اور جہاں تم چاہو“ ایک بنیادی فیصلہ کر لینے کے بعد میں نے غیر ضروری بحث سے گریز کرتے ہوئے کہا۔

”شہر کے کسی ہوٹل میں مل لیتے ہیں؟“ قدرے توقف کے بعد اس کی تھکر آمیز آواز ابھری۔

”پنا گھر نہیں دکھانا چاہتیں توادر آجاؤ۔ یہ غریب اور اس کا غریب خانہ تمہارا دیکھا بھلا ہے۔“

”کیا تم واقعی سنجیدہ ہو اور ہوٹل کے دل سے بات کر رہے ہو؟“ اس کی آواز خیر آئیز تھی۔

”تم مجھ پر پوری طرح اعتماد کر سکتی ہو۔ میں جب بھی ماروں گا“ تمہیں لگا کر ماروں گا۔ تم جیسی نرم دناؤ کو دھوکے سے پکڑتا میرے جمالیاتی ذوق کے خلاف ہوگا۔“

”مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تم نے میرے، غزالہ کے دوسرے انخوا کے جرم کو اتنی جلدی معاف کر دیا ہے۔“

”اس بھول میں نہ رہنا“ میں نے فوراً ہی اس کی جھجکی ”جنی“ الحال میں نے کھاتے بند کر کے دشمنی کا حساب معطل کر دیا ہے۔ جس دن ایران سے تمہاری کامیابی کی خبر آئی، یہ کتابیں دوبارہ کھل جائیں گی۔ تم نے بلو کر اس ذیل کے بارے میں جو کچھ سوچا ہے وہ قابل قدر ہے۔“

”جنی“ الحال یہ بھی غنیمت ہے..... لیکن میں ایک فوری مشکل سے دوچار ہو گئی ہوں۔“

”میں مل بیٹھنے کی بات کر رہا ہوں اور تم مشکل لے بیٹھیں!“ میں نے جھٹکا کر کہا۔

”مشکل یہی ہے کہ میں اپنے ٹھکانے سے باہر نکل سکتی ہوں نہ تمہیں بلا سکتی ہوں۔“

”یعنی گلے کی ہڈی کی طرح، کیس بچ میں پھنس کر رہ گئی ہو؟“ میں نے پوچھا۔

اہمیت نہیں گھٹا رہا۔ جو کچھ ہوا ہے وہ واقعی قابل فخر اور قابل ذکر ہے لیکن عالمی پیمانے پر اسے بہت زیادہ بڑھا چڑھا کر کچھ اس انداز میں پیش کیا جا رہا ہے جیسے پاکستان اس علاقے میں ایک بے لگام ایٹمی غریب بننے والا ہے۔ وہ عالمی رائے عامہ کو یہ باور کرانے کی مسلسل کوششیں کر رہے ہیں کہ پاکستان کے ایٹمی بلیک میل کی وجہ سے پوری دنیا ہولناک تباہی کے کنارے پہنچ جائے گی۔“

”کیا اس طرح وہ پاکستانی عوام اور سائنس دانوں کی غیر ضروری حوصلہ افزائی نہیں کر رہے؟“

”یہ ہماری احمقانہ بھول ہوئی کہ ہم ایسی مبالغہ آمیز خبروں پر فخر سے اپنی گردنیں اکرانے لگیں۔ عالمی غنڈے ہمارے خلاف مضبوط فرد جرم کی تیاری میں لگے ہوئے ہیں تاکہ کل کو وہ ہمارے خلاف کسی لشکر کشی کا فیصلہ کریں تو دنیا ان کا ساتھ دے اور ہم بھری چوہال میں اکیلے کھڑے رہ جائیں۔ ایک چھوٹے سے ملک کے خلاف کسی عالمی طاقت کی جارحیت کی مذمت کرنے کے بجائے ہر ملک اس کی تعریف کرے گا کہ اس نے عالمی امن کے لیے خطرہ بننے والے عناصر کی سرکوبی کا دلیرانہ فیصلہ کیا۔ حالات بہت سنگین رہنا پڑ رہے ہیں۔“

”تمہاری ان باتوں سے تو ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے ویرا ہماری محسن بننے والی ہے۔“

”اس کے مفادات کچھ اور ہیں اس لیے اس کی سوچ بھی ہم سے مختلف ہوگی۔ البتہ اسے یہ اندازہ ہے کہ وہ ہمارے ساتھ اہم تعاون کی پیشکش کر رہی ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ تم اس سے ابھی بات کرو“ سلطان شاہ اس گفتگو سے بہت زیادہ متاثر نظر آ رہا تھا ”وہ بہت زیادہ سیما صفت ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کسی رومیں آکر اپنا ارادہ ہی بدل دے۔“

سلطان شاہ کا وہ حدش بے بنیاد تھا۔ ویرا کھل کر اعتراف کر چکی تھی کہ سطور آئی کے بغیر وہ مشینیں لانے والے کارواں تک رسائی حاصل کر سکتی تھی نہ شی کے بیروں میں لوٹ سکتی تھی۔ اس کے نزدیک وہ باہمی مفادات کا ایک اہم سودا تھا اسی وجہ سے وہ کوچ کرنے کے بجائے ”شہر میں ڈیرے ڈالے“ مجھ سے رابطے کے لیے کوشاں تھی۔

سطور آئیز پر قابض ہونے کے بعد وہ اپنے وعدوں سے منحرف ہو جاتی توادر بات تھی لیکن میں اس کا مزاج شناس تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ مجھے متاثر اور مرعوب کرنے کے لیے وہ آخر تک اپنے الفاظ پر ڈٹی رہے گی۔

میں نے سگریٹ سلکا کر اپریٹس سنبھالا اور صوفے پر دراز ہو کر اس کا سوچ آن کر دیا۔ اس اپریٹس کے ایک حصے میں فوراً تنہا سمنٹا بوش ہو گیا۔

”ہیلو“ مسز تھیکا لنگ! اپنی کانٹک ”قدرے توقف کے بعد میں نے ارفیس پر پیغام دیا۔“

دونوں بوڑھی عورتوں کی طرح اٹھ لے کر ہرات کے پیچھے پڑ جاتے ہو۔“

”نجام بخیر ہونے کی وجہ سے ہم فرض کئے لیتے ہیں کہ سب کچھ ٹھیک رہا ہوگا۔“

اس نے تیز زور انداز میں میری بات کاٹ دی ”خاہ! آج تو تم انگریزی محاورے کا اردو ترجمہ کر رہے ہو۔ قیمت ہے کہ تم اس مقبول محاورے سے واقف ہو درنہ۔۔۔“

”ورنہ کی بات چھوڑو! اس بار سلطان شاہ نے مجھے ہونے لے میں دخل اندازی کی تھی ”ورنہ کچھ بھی نہ ہوتا۔ چھری خروڑے پر گرے یا خروڑہ چھری پر نتیجہ خروڑے کی تباہی کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔ تمہارا کچھ بھی نہیں بگڑتا۔“

”میں کہہ چکی ہوں کہ تم اپنی زبان بند رکھو، میں ڈیٹی سے بات کر رہی ہوں“ اپریش پر دیر کی غصیلی آواز ابھری ”وہی میری باتوں کا جواب دے سکتا ہے۔“

”میں تمہاری مرضی کا پابند نہیں ہوں۔ ڈیٹی نے منع کیا تو تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ دوں گا۔ ورنہ میں عام طور پر بے سرو پا تیس سنی پسند نہیں کرتا۔“

”میں وہاں آکر تمہارا دماغ درست کر دوں گی۔ تم نے خود کو کیا سمجھ رکھا ہے؟“

میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں سلطان شاہ کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور آپریش میں کہا ”تم بلاوجہ گرمی دکھا رہی ہو۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ سلطان شاہ تم سے ہمارے بغیر کن دن تک بے معنی بحث میں مصروف رہ سکتا ہے۔“

”پھر تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟“ قدرے توقف کے بعد ویرانے سوال کیا۔

”میں ابھی لکھ ہوں۔ تمہیں یقین ہے کہ وہ اکیلا ہی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”میں فلیٹ میں محصور ہوں اس لیے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ میں نے صرف اسی کو دیکھا ہے مگر میری چھٹی حس بتا رہی ہے کہ وہ اکیلا نہیں ہوگا۔ تمہیں دیکھ بھال کر اس پر ہاتھ ڈالنا ہوگا۔“

میں نے اس مشتبہ آدمی کا طعنے دیافت کیا اور دیرانچے تفصیل بتانے لگی۔



ایک مرتبہ پھر دیران کا قہقہہ درپیش تھا اور وہ مافیا کے باپنڈیا افراد کی فہرست میں شامل تھی اس لیے میں ڈسکے کی چوٹ پر شیر شاہ سے کام لے سکتا تھا۔

اسی صبح میری حبیب جوانی سے بات ہو چکی تھی۔ وہ ذاتی وجوہ کی بنا پر چند روز کے لیے اپنے گھر میں مقیم تھا۔ اس لیے عملاً مجھے ٹریفک لائن کے معاملات اور عملے پر پوری بلا دستی حاصل تھی۔ میں چاہتا تو وہاں سے ہماری لاؤ لکٹر بھی طلب کر سکتا تھا لیکن میں

”میں بابر اسکوار کے فلیٹ نمبر بارہ میں مقیم ہوں، پچھلے کئی مہینوں سے ایک مشتبہ آدمی اس عمارت کے آس پاس منڈلا رہا ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ وہ میری کیسنگز کا کوئی ٹاؤٹ ہے اور اس نے میری کسی بے پروائی کی وجہ سے میری جھلک دیکھی ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ وہ تمہارے فلیٹ کی گھرائی کر رہا ہے جس کی وجہ سے تم وہاں محصور ہو کر رہ گئی ہو؟“

”غالباً میں یہی کہہ رہی ہوں“ اس کی جلی جھنی آواز ابھری۔ ”برقع اوڑھ کر نیچے اترو اور اس کے سر پہنچ کر کرائے کا ایک ہاتھ مار کر اس کا منکا توڑ دو۔ اس میں اتنی پریشانی کی کیا بات ہے؟“ مجھ سے پہلے سلطان شاہ بول پڑا۔

”اس سے کہو کہ اپنی شخصی سی عقل پر زیادہ زور نہ ڈالے“

دیران کی غصیلی آواز سنائی دی ”میں کسی بھی صورت میں اس کے سامنے آنے کا خطہ مول نہیں لیتا چاہتی۔ وہ کافی دیر سے یہاں منڈلا رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے اپنے کچھ ساتھیوں کو بھی یہاں بلایا ہو۔“

”میں پوری صورت حال سمجھ چکا ہوں۔ یہ بتاؤ کہ تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟“

”تم چیز چھاؤ کر کے ان کا دھیان بٹاؤ۔ میں اس افرا تفری کا فائدہ اٹھا کر یہاں سے نکل جاؤں گی۔ بعد میں تم بھی اپنی راہ لیتا۔“

”وہ فلیٹ ان کی نظروں میں آگیا ہے تو تم دوبارہ اوھر کا رخ نہیں کر سکو گی۔“

”ضرورت ہی کیا ہے؟ میں یہاں کرائے پر رہ رہی ہوں۔ کہیں اور چلی جاؤں گی۔۔۔۔۔ بلکہ اب تو میں تمہارے ساتھ بھی رہ سکتی ہوں۔ تمہارے ملک میں انکی عورت لوگوں کی غیر ضروری توجہ کا مرکز بن جاتی ہے۔ ساتھ رہنے میں مجھے خاصی سولت رہے گی۔“

”تم بلاوجہ ہمارے گلے پڑنے کی کوشش کر رہی ہو“ اس بار بھی سلطان شاہ خاموش نہ رہ سکا۔ ”دشمنی مغل ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ تم چاروں ہاتھ پیروں سے ہمارے سر پر سوار ہو جاؤ۔ یہ فلیٹ ہمارا نہیں بلکہ جانتیہ کا ہے۔ اسے چا چل گیا کہ ہم نے اس کے بیٹے کو اغوا کرنے والی کو یہاں رکھا ہوا ہے تو وہ ہمیں بھی نکال باہر کرے گا۔“

”وہ ڈیٹی کے سامنے سر نہیں اٹھا سکتا۔ بچے کی تلاش میں ڈیٹی نے دلچسپی نہ لی ہوتی تو پورے شرکی پولیس میزوں اس کا سراغ نہیں لگا سکتی تھی اور پھر میں نے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ اسے شرکے بہترین کیئر سٹیشن میں داخل کرایا تھا۔“

”بچے کا کچھ بگڑا نہیں بگڑا لیکن اس کی ماں تباہی کے دہانے پر پہنچ گئی“ میں نے متاسفانہ لہجے میں کہا ”وہ تمہیں بھی معاف نہیں کرے گی۔“

”میں اس سے ملی تو اسے ضرور منالوں گی لیکن تم دونوں کو سمجھانا میرے بس ہے باہر ہے“ اس کی چڑچڑی آواز سنائی دی ”تم

ترجیح دی تھی۔ میں جیسی چھوڑ کر آگے بڑھا تو مخالف فٹ پاتھ پر وہ بد معاش نظر آیا۔ میں رک رک کر سرکٹ سلگانے میں مصروف ہو گیا۔ میں دیا سلائی بجائے بھی نہ پایا تھا کہ یک یک ابھرنے والے شور نے مجھے چونکا دیا۔

لحد بھر بعد ہی پوری صورت حال واضح ہو گئی اور میں ایک گمراہ سانس لے کر رہ گیا۔

شاید شیر شاہ کہیں چھپ کر اپنے شکار کی عمرانی کر رہا تھا اسی وجہ سے اس نے مجھے دیکھ لیا مگر میں اسے دیکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ مجھے دیکھ لینے کے بعد اس کے لیے خود پر قابو پائے رکھنا دشوار ہو گیا اور باہر نکل کر کسی جگہ سے اپنے شکار سے الجھ پڑا۔

شیر شاہ کا حریف بہت مضبوط اور توانا تھا لیکن وہ اپنی بے خبری کی وجہ سے جیسی طرح شیر شاہ کے عتاب میں آیا۔ میرے متوجہ ہونے سے پہلے انہوں نے ایک دوسرے کے ساتھ کیا سلوک کیا، وہ میرے علم میں نہیں تھا لیکن جب میں تماشا نویس کے تحیر زدہ شور پر اس طرف متوجہ ہوا تو شیر شاہ اپنے حریف کو پختہ فٹ پاتھ پر گرا کر اس کے سینے پر سوار ہو چکا تھا اور مشتبی انداز میں اس کے جڑوں پر گئے پر سارہا تھا۔

میرے لیے وہ صورت حال خاصی اطمینان بخش تھی۔ شیر شاہ نے ضرورت سے زیادہ جھگڑا دکھائی تھی لیکن اس نے اپنے حریف کو زمین بوس کر کے اپنا مقصد حاصل کر لیا تھا۔

میں نے اس طرف پیش قدمی کرتے ہوئے عقابان نظروں سے گزر دو پیش کا جائزہ لیا لیکن دروازہ قامت کی حرمت پر کہیں بھی کوئی تشویش انگیز رد عمل دیکھنے میں نہیں آیا۔

دراز قامت جسمانی اعتبار سے شیر شاہ پر برتری رکھتا تھا۔ اچانک گھیر لیے جانے کے مدد سے نجات ملتے ہی اس نے پیٹیرے بدلنے شروع کر دیے۔ وہاں پہنچنے سے پہلے ہی شیر شاہ کو وہ اپنے سینے پر سے اچھال بھینچنے میں کامیاب ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ اب شیر شاہ کو بھی خاصی بے رحمانہ مار سنی ہوگی لیکن دروازہ قامت نے اپنے قدموں پر کھڑے ہوئے ہی ایک حیرت ناک حرکت کی اور شیر شاہ پر جوالی حملہ کرنے کے بجائے پلٹ کر بھاگ لیا۔

میرے دیکھنے ہی دیکھتے، وہ فٹ پاتھ کے کنارے کھڑی ہوئی ایک سیاہ کاری اگلی نشست پر گھسٹا۔ شاید اس کا راجا انجن پہلے سے بیدار تھا کیونکہ اس کا دروازہ بند ہونے سے پہلے ہی کار تیزی کے ساتھ حرکت میں آئی اور آٹا فائبریں وہاں سے بہت دور نکل گئی۔

”سلا جیب کھڑا تھا۔“ میں قریب پہنچا تو شیر شاہ تماشا نویس کے سامنے اپنے جھگڑے کی وضاحت کر رہا تھا۔ ”مقابلے پر ٹھہرا تو مار مار کر اس کا چہرہ گرا ڈرتا۔“

شوقین اور پیشہ ور تماشا نویس کے لیے وہ انکشاف سنسنی خیز ثابت ہوا۔ مجمع میں بیک وقت کئی تحیر زدہ اضطرابی آوازیں ابھریں۔ ہر ایک کو یہی حلق تھا کہ شیر شاہ نے بھگڑے جیب کھڑے

نے صرف شیر شاہ کو پوری رازداری کے ساتھ باہر اسکو اڑھنچنے کی ہدایت کی تھی۔ اسے متوجہ شکار کا ٹیلہ بھی بتا دیا گیا تھا تاکہ وہ بتا دینا اس کے سامنے آنے کی حماقت نہ کرے۔

اس کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ میں فلیٹ کو دیر کے لیے خالی نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ وہ متوجہ پاتے ہی باہر اسکو اڑھنے فرار ہو کر سیدھی ادھر سی آتی اور میدان صاف پاکر سطور آئیز کی تلاش میں پورے فلیٹ کو تہہ بالا کر سکتی تھی۔ اپنی دیگر بھرانہ فویوں کے ساتھ ہی اسے یہ مہارت بھی حاصل تھی کہ مضبوط اور محفوظ ترین قفل بھی اس کے ہاتھوں کالس محسوس کر کے پگھل جایا کرتے تھے۔ جب کہ سطور آئیز اسی فلیٹ کی ایک مستقل دیوار گیر الماری کے چور خانے میں پوشیدہ تھیں۔ سلطان شاہ کی موجودگی میں وہ فلیٹ میں زیادہ چھپڑ چھاڑ کی جرات نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے سلطان شاہ کا وہاں موجود رہنا ضروری تھا۔ دوسری طرف دشمن کی تعداد کا مجھے کوئی اندازہ نہیں ہو سکا تھا۔ اگر وہ ایک سے زیادہ ہوتے تو ان سے نمٹنے یا انہیں الجھانے کے لیے ضروری تھا کہ میرے ساتھ کوئی مددگار یا سہل الفاظ میں، قربانی کا بکرا ہو تاجو مشہق آدمی سے براہ راست جا کھڑا اور میں دور رہ کر اس کے متوجہ حامیوں پر نگاہ رکھنے کی کوشش کرتا۔

ان مقاصد کے حصول کے لیے میں نے شیر شاہ کی دوڑ تو گواہی تھی لیکن تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ اسے اصل واقعات سے آگاہ کر دیا تھا کہ وہ بے خبری میں نہ مارا جائے۔

مجھے معلوم تھا کہ باہر اسکو اڑھنے فرار ہونے کے بعد دیر کو دوبارہ ادھر کارخ نہیں کرنا تھا اس لیے میں نے شیر شاہ کو بتا دیا تھا کہ مجھے باہر اسکو اڑھنے دیر کی روپوشی کا شبہ تھا۔ وہ ایک ایسا کتہ تھا جس کی تصدیق بعد میں بھی کی جاسکتی تھی۔ دیر کی تصویر دیکھ کر، اس عمارت کے بہترے مکیں یہ بتا سکتے تھے کہ وہ ایک دو روز سے اسی عمارت میں مقیم تھی۔

میں نے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے اصل کمائی میں صرف اتنی ترمیم کی تھی کہ دیر کے فلیٹ کی عمرانی کرنے والے کو اس کا مخالف بتا دیا تھا اور شیر شاہ کو یہ پتی پڑھائی تھی کہ اسے اور اس کے ساتھیوں کو ذبح کرنے کے بعد ہم دیر کو آسانی کے ساتھ اپنا قیدی بنا سکیں گے۔

باہر اسکو اڑھنے کے منجانب آباد اور باوقوع علاقے کے عقبی حصے میں واقع تھا۔ میں نے وہاں پہنچنے ہی اس دروازہ قامت کو دیکھ لیا جس کی طرف سے دیر اکر مند تھی۔ وہ اپنے ٹیلے اور وضع قلع سے سی انباشت فطرت معلوم ہو رہا تھا۔ اس کا لباس تیسرے درجے کے عالمیادہ بد معاشوں کی طرح شوخ اور بہت زیادہ بے ڈھنگا تھا جس کی بنا پر اسے دور سے بھی پہچانا جاسکتا تھا۔

ان دنوں مجھے شرم میں کئی دشمنوں کی طرف سے خطرات درپیش تھے اس لیے میں نے کار کے بجائے جیسی ہی سفر کرنے کو

”مگر ہمیں تو بتایا گیا تھا کہ یہاں سبز تھیلانگ رہتی ہے، ہم اسی سے ملنے آئے ہیں۔“

”ہو سکتا ہے کہ اس کا نام یہی ہو لیکن میں نے اس سفید قام عورت کو چند منٹ پہلے باہر جاتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس کے لیے کوئی پیغام ہو تو مجھے بتادو لیکن اس بے ہودہ گھنٹی پر محنت نہ کرو۔ اس کی گرفت آواز سے مجھے غلبان ہونے لگتا ہے۔“

میں نے بے بسی سے شیر شاہ کی طرف دیکھا اور کہا ”ہم دوبارہ آئیں گے۔ ہمارا اس سے ملنا ضروری ہے۔ آپ کو جو زحمت ہوئی، اس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔“

چڑچڑی بڑھانے اس وقت تک اپنے فلیٹ کا دروازہ بند نہیں کیا جب تک ہم نے زیستہ اترنے شروع نہ کر دیے۔ شیر شاہ اس مڑھوہیا کی مداخلت پر بری طرح بھٹایا ہوا تھا مگر میرے لحاظ میں خاموش تھا۔

شیر شاہ کے لیے وہ ایک اہم مشن تھا۔ جس کی کامیابی اس کا مستقبل بنا سکتی تھی اس لیے وہ کیے بعد دیگرے متعدد متبادل تجاویز پیش کرتا رہا اور میں اس کے ہر منصوبے میں کوئی نہ کوئی غائی نکال کر اسے مسترد کرتا رہا۔ آخر کار میں نے اسے ویرا کے فلیٹ کی عمرانی پر مامور کرتے ہوئے اپنا فون نمبر دیا اور اسے ہدایت کی کہ وہ رات کے دس بجے تک فلیٹ پر گہری نگاہ رکھے اور ویرا کے نظر آتے ہی مجھے فون پر مطلع کر دے۔

”اور اگر وہ دس بجے تک واپس نہ آئی؟“ اس نے بھگتے ہوئے پوچھا۔

”میں اس معاملے میں تمہارے علاوہ کسی اور کو اعتماد میں نہیں لینا چاہتا۔ میرا بس چلے تو میں ویرا کی واپسی تک تمہیں یہیں روکے رکھوں لیکن تم بھی انسان ہو۔ تمہاری قوت برداشت کی ایک حد ہے۔ اس کے بعد تمہیں آرام کی ضرورت محسوس ہونے لگے گی۔ اسی وجہ سے میں نے دس بجے کی حد مقرر کی ہے۔“

”تم اپنے ماتحتوں کا بہت خیال رکھتے ہو، باس!“ وہ نمونیت سے لبریز آواز میں بولا ”جب تک میرے اعصاب میں دم نہیں“

میں یہیں ڈنار ہوں گا۔ آخر کار وہ یہیں واپس آئے گی۔“

”گڈ! یہ بہت اچھی بات ہے۔ اس دوران میں تم اس کے بارے میں معلومات بھی جمع کر سکتے ہو۔ جب بھی تم واپس لوٹنا چاہو، چلے جانا مگر مجھے فون کرنا نہ بھولنا تاکہ میں کوئی متبادل بندوبست کر سکوں“ میرے ان فقرات پر اس کا سینہ پھول گیا۔ اس کے لیے یہ احساس باعث فخر تھا کہ میں نے اسے ایک اہم مشن پر مامور کیا ہے۔

اسے بیگار سے لگا کر میں نے ایک تیرے دو شکار کرنے کی کوشش کی تھی۔ اول تو مانیہ والوں کو اس امر کا ٹھوس ثبوت فراہم کر دیا تھا کہ میں پورے طومر سے ویرا کی گھات میں لگا ہوا تھا تاکہ بیرون کی مقامی منڈی پر سے شی کا رہا سہا صیغہ ختم کر کے باقی

کی اصلیت کا اظہار کرنے میں تاخیر سے کام لیا ورنہ وہ بھی اسے دو چار تھپڑ گھونے اور لاشیں رسید کر لیتا۔

مجھے دیکھ کر شیر شاہ اس بھیسے نکل آیا۔ کچھ دور تک ہم ایک دوسرے سے لاشعلی اختیار کیے، آگے پیچھے چلے رہے پھر ایک موڑ پر وہ میرے برابر میں آیا۔

”شاباش“ تم نے خاصی دلبری کا مظاہرہ کیا۔ اب میدان صاف ہے۔“ میں نے اس کی تعریف کی۔

”میرا خیال ہے کہ کاروالے کے علاوہ اس کا کوئی اور ساتھی نہیں تھا۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اسے ساتھ لے کر سڑک عبور کر لی کیونکہ باہر اسکوائر کی عمارت اسی طرف واقع تھی اور میں اس بار شیر شاہ کو ویرا کے مسکن تک لے جانے کے موذ میں تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ ویرا فساد سے فائدہ اٹھا کر فرار ہو چکی ہوگی اور جب ہم اس کے فلیٹ پر پہنچیں گے تو وہاں کچھ بھی باقی نہ رہا ہوگا۔ اس طریقہ کار کا واحد فائدہ یہ تھا کہ شیر شاہ میری طرف سے سینہ حبیب جیہائی کو یہ یقین دلایا تھا کہ میں واقعی ویرا کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا۔

”تمہاری جیب میں کوئی ہتھیار موجود ہے؟“ میں نے اس ذرا سے میں جان ڈالنے کے لیے سرگوشیاں لیجے میں اس سے پوچھا۔

”میں بور کا بھرا ہوا آلوینک ہے“ اس نے اپنی داہنی جیب ہتھپتاتے ہوئے کہا ”کو تو اس کا سیفٹی کچھ بتاؤں؟“

”میں پہلی منزل کے فلیٹ نمبر یاہ پر دھاوا بولنا ہے۔ ویرا بہت چالاک اور مکار عورت ہے۔ اسے ذرا سماجی موقع مل گیا تو وہ کسی چھلاوے کی طرح غائب ہو جائے گی۔ اس کے فرار ہونے کا خطرہ نظر آئے تو بے دریغ فائر کر دیتا۔ اب ہم اسے ڈھیل نہیں دے سکتے۔“

”تم فکر نہ کرو“ وہ فخریہ لیجے میں بولا ”آج میرے سر پر بھی خون سوار ہے۔ وہ بچ کر نہیں جاسکے گی۔“

میں اس ذرا سے کو زیادہ طول نہیں دینا چاہتا تھا اس لیے میں نے وقفہ وقفہ سے بارہ نمبر فلیٹ پر کئی بار ڈور تیل بجائی مگر اندر سناٹا چھایا رہا۔ شیر شاہ نے دھیمی اور بچان آمیز آواز میں دروازہ توڑ کر اندر گھسنے کا مشورہ دیا مگر میں اسے گھور کر رہ گیا۔

چوتھی طویل گھنٹی پر دی ہوئی جوب میں چاہ رہا تھا۔ پڑوس کے فلیٹ کا دروازہ کھلا اور ایک ادویہ عمر مگر صحت مند عورت ہمارے سامنے آئی۔

”خالی فلیٹ میں مسلسل گھینٹاں بجا کر تم کیا کرنا چاہ رہے ہو؟“ اس نے ہم دونوں کو سر سے چہر تک گھورتے ہوئے چڑچڑے لیجے میں پوچھا ”کیا درود پوار سے جواب لینا چاہتے ہو؟“

”خالی فلیٹ؟“ میں نے بوکھلاہٹ کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

بھی کھل گئی ہے۔" ویرانے اپنی رداقتی خوش دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا "پر کالہ اور خالہ کا قافیہ ملائے ہوئے تم یہ بھیل گئے کہ سلطان اور شیطان ایک دوسرے سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ اس حوالے سے تم مجھے اپنی خالہ مان لو تو ہمارے سارے جھگڑے طے ہو سکتے ہیں۔"

اس سے بات ختم کرتے ہی ویرامیری طرف متوجہ ہو گئی۔ "تم شی سے ہمیشہ کے لیے اپنا تعلق ختم کر چکے ہو، سلور آئی تمہارے کسی کام نہیں آئے گی کیونکہ اب شی نے تمہارا بیچا ہوا چھوڑ دیا ہے۔ اس ایک سلور آئی سے تم کے اور کس لیے دھوکا دو گے؟" "بڑے وقت میں کھونا تاکہ بھی کام آجاتا ہے۔ پھر یہ تو شی کا بیش قیمت طلائی مسک ہے۔ نجلے کب اور کہاں کام آجائے۔ اس بارے میں ضد کر کے بد مزگی پیدا نہ کرو۔" "میں نے سنجیدگی سے کہا۔" "ٹھیک ہے۔" وہ اپنے لیے سگریٹ سلاگتے ہوئے بولی۔ "پھر مجھے لکھنا چاہئے تمہارے چکر کی وجہ سے میں نے ابھی تک ایران جانے کا کوئی بندوبست نہیں کیا ہے۔"

"تم اپنی مرضی کی مالک ہو۔" "میں نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "تم میرے اصرار پر انکار کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ ویسے بھی تمہارا کام میری نگاہ میں بہت اہم ہے۔"

"پریش پر بات کرتے ہوئے تو تم نے ہمارے ساتھ رہنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا؟" سلطان شاہ بولا۔

"تم جیسے بے مصرف اور ناکارہ آدمی کے ساتھ رہ کر میں کیا کروں گی؟" ویرا کو اس پر فقرہ کہنے کا موقع مل گیا۔ "یہی بات ذہنی نے کہی ہوئی تو اس پر غور بھی کیا جاسکتا تھا۔۔۔ آج تو تمہارے چکر کی وجہ سے ذہنی نے بھی پینے پلانے کی بات نہیں کی۔ اتنے دنوں بعد ملاقات ہوئی ہے اور یہ مجھے سوکھا خراپا ہے۔"

"فکر نہ کرو، ہم لوگ سمان نوازی کے آداب سے واقف ہیں۔ تم آرام سے بیٹھو، میں ابھی تم کو گیلا کرنے کا بندوبست کرتا ہوں۔" میں نے اسے رکنے پر آمادہ پا کر جلدی سے کہا۔

"خدا کی پناہ!" سلطان شاہ حیرت سے آنکھیں نکال کر بولا "تو تم لوگ دن دھاڑے شراب نوشی کو گے۔ میں نے تو سنا ہے کہ باقاعدہ شرابی بھی سورج دھلنے کے بعد ہی اپنی مغل جاتے ہیں۔"

"شرم کی بات ہے کہ ذہنی جیسے آدمی کے ساتھ رہ کر بھی تم کچھ نہیں سکھ سکتے۔" ویرا ہاتھ آیا ہوا کوئی موقع ضائع کرنے پر آمادہ نہیں تھی۔ "دن کو سفید شراب پی جاتی ہے، دُھند لگا پھیلنے پر سمرے رنگ کی شراب چلے لگتی ہے۔ تمہیں آج تک یہ بھی پتا نہیں چل سکا کہ جن اور دھسکی میں کیا فرق ہے؟ میں نے تو تمہارے کسی بڑے شاعر کے بارے میں سنا تھا کہ کسی نے اسے وقت کے بارے میں ٹوک دیا تھا تو اس نے فوراً ہی منہ توڑ جواب دیا تھا کہ شراب کھڑی نہیں بلکہ گھڑے سے پی جانے والی شے ہے۔"

بلادی قائم کی جاسکے۔ دوم یہ کہ میں مفرد ویرا کی صلاحی کے بارے میں غیر متعینیت کے لیے ٹریڈ لائن سے غائب رہ سکتا تھا۔ میں واپس قلیٹ پہنچا تو ویرا وہاں موجود تھی۔ وہ مجھ سے بڑی مرحوبی سے ملی۔ اور دوسرے آدمی کی باتیں کر کے وہ مطلب پر آگئی۔ "معاذ کے مطابق سلور آئیز میرے حوالے کرو تاکہ قطعہ ختم ہو اور میں اپنے مشن پر روانہ ہو جاؤں۔"

"اب ایسی بھی کیا جلت ہے؟" میں نے اس کا ہاتھ تھامے ہوئے ملاحت سے کہا۔ "اپنے قلیٹ سے فرار ہو کر آئی ہو تو اب تھوڑی دیر کے لیے اطمینان سے ہمارے پاس بھی بیٹھو!" "میں جوں کی نہیں" اصرار کرو گے تو لیٹ بھی جاؤں گی۔" اس نے استغناء سے لہجے میں کہا "لیکن پہلے سلور آئیز میرے حوالے کر دو۔" اپنی باتیں بعد میں ہوں گی۔"

میں اسے سلطان شاہ کے ساتھ وہیں چھوڑ کر، کمرے سے باہر نکل گیا۔ میرے خفیہ اور مشعل ٹھکانے پر سلور آئیز جوں کی توں موجود تھیں۔ میں نے وہاں سے دو طلائی مسکے نکالے جن پر چاندی میں سین اور خوابناک آنکھ اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ ڈھلی ہوئی تھی۔

میں نے واپس آتے ہی وہ دونوں مسکے ویرا کے سامنے پھینک دیے۔

"یہ کیا؟" اس نے حیرت سے کہا "یہ تو صرف دو سلور آئیز ہیں۔"

"تمہاری گنتی واقعی قابلِ رشک ہے۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "یہ وہی ہیں۔"

"تمہاری کہاں ہے؟" ویرا نے اضطرابی انداز میں سوال کیا۔ دونوں نے اس نے اٹھا لیے تھے۔

"شاید میرے ہاتھ پر آگ آئی ہو۔" میں نے تسخیر آمیز انداز میں کہا۔

"تم اس کا کیا کرو گے؟ وہ بھی مجھے دے دو!" اس نے حرصانہ لہجے میں کہا۔

"جو کچھ ملے ہو چکا ہے" اس سے تجاوز کرنے کی کوشش نہ کرو۔" میں نے کہا۔ "کل کیا صورت حال ہوگی" اس کے بارے میں تم کچھ جانتی ہو؟" مجھے کوئی علم ہے۔ اس لیے فی الحال دو پر ہی گزارہ کرو۔ ان کی مدد سے تم نہ صرف لمبے کراس ذیل والا کام سر انجام دے سکتی ہو بلکہ جی لانڈ کو بھی خوش کر سکتی ہو۔"

"میں عورت آفت کی پر کالہ بلکہ شیطان کی خالہ ہے۔" سلطان شاہ نے کسی بھی قسم کی نفرت یا برہمی کا اظہار کیے بغیر مجھ سے کہا۔ اس کی ذات سے ہمیں فائدہ ضرور پہنچتا ہے لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ وہ فائدہ کس وقت خسارے میں تبدیل ہو جائے گا۔" "معلوم ہوتا ہے کہ تھوڑی سی درزش کے بعد تمہاری مشعل

”بس! بس!“ میں نے ہاتھ اٹھا کر رو کر خاموش کر دیا۔ ”تم بلاوجہ بات نہ بڑھاؤ۔ مظلوم ہوتا ہے کہ تمہیں بھی سلطان شاہ سے اچھے میں لطف آتا ہے۔“ پھر میں فوراً ہی سلطان شاہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”ہم لوگ ایک دو گتے تھے۔ بیٹھیں گے۔ اگر تم چاہو تو اس دوران میں اپنا بازار کام نمٹا سکتے ہو۔“

سلطان شاہ میرا اشارہ سمجھ کر فوراً ہی اٹھ گیا۔ ”بازار نہ گیا تو رات کو بھولوں کے پاس کھانے پر گزارا کرنا پڑے گا۔ میری واپسی چار بجے تک ہوگی۔“ میں نے تعجبی انداز میں سر ہلایا اور وہاں سے لٹکا چلا گیا۔

تھکے ہوئے ہی دیر کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ ابھر آئی اور وہ خطرناک نگاہوں سے مجھے گھورتے لگی۔

”یہ نہ بھولو کہ سلطان شاہ راستے میں سے بھی واپس آسکتا ہے۔“ میں نے اپنی جگہ چھوڑتے ہوئے کہا۔

”اتنا میں بھی جانتی ہوں۔ شرمیں زلزلہ بھی آیا تو وہ چار بجے سے پہلے اس عمارت میں قدم نہیں رکھے گا۔ تم دونوں کے ساتھ رہ کر میں بھی اتنی بات سمجھنے لگی ہوں۔“

فلٹ کے کینٹن میں میرا پرانا ذخیرہ موجود تھا۔ گلاس، آئس پائٹ، ٹانک واٹر اور لندن ڈرائی بن کی بوتل لے کر میں ڈرائنگ روم میں آیا تو دیر اپنے ویشی بیگ میں سے آئینہ نکال کر اپنا میک اپ درست کر رہی تھی۔ اس کے کھلے ہوئے ویشی بیگ میں اس کا خود کار پستول چمک رہا تھا۔

دونوں گلاس دیر نے اپنے حرم میں ہاتھوں سے بنائے پھر اپنا گلاس میری طرف لہراتے ہوئے کہا ”چیئرز۔ تمہاری غزالہ کی خیریت اور سلامتی کے نام۔“

میں نے چیئرز کہہ کر اپنا گلاس بولے سے اس کے گلاس سے ٹکرایا۔ کمرے کی فضا میں شیشے کا ہلکا سا ترن کو بجنا اور میں نے ایک بڑا گھونٹ اپنے معدے میں اتار لیا۔ اس لمحے میں نے محسوس کیا کہ دیر کے شخص کی رفتار قدرے بڑھی ہوئی تھی اور کمرے کی پرسکوت فضا میں اس کے گرم گرم سانپوں کی ہلکی سی آواز گونج رہی تھی۔

”میں دو چار دن رہنے کے ارادے سے یہاں آئی تھی۔“ اس نے سگریٹ کے چند کمرے کمرے کش لینے کے بعد دھیمی آواز میں کہا ”مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہو یا نہ ہو لیکن ہم ایک طویل عرصے تک ایک دوسرے سے نہیں مل سکیں گے۔ شاید مجھے ایران سے ہی آگے جانا پڑ جائے۔“

”میرے اور تمہارے راتے مختلف ہیں۔“ میں نے اس کے موڑ کا اندازہ لگاتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ”تم اب بھی شی سے وابستہ ہو کیونکہ وہ تمہارے باپ کی تعظیم ہے۔ اسے بڑا بھلا کئے کے باوجود تم لا شعوری طور پر اس کی ناپید ہونے میں اپنی زندگی گزارنی چاہتی ہو مگر میں جی لائینڈ اور شی کا بدترین دشمن ہوں۔ اس کے

باوجود میں تمہاری ترقی اور کامیابی کے لیے دعا گو ہوں کہ شرط صرف اتنی ہوگی کہ آئندہ میرا راستہ کانٹے کی کڑی اور نہ ہی میرے ملک کے خلاف کسی سازش میں شریک ہو دو باتوں سے بچتی رہو گی تو ہم اچھے دوستوں کی طرح کبھی نہیں رہیں گے ورنہ غزالہ آرائی چلتی رہے گی۔“

”دوست!“ اس نے گلاس سے ایک اور گھونٹ حسرت بھری آواز میں کہا۔ ”اسی ایک رشتے کے لیے تو ہم ہوں۔ کاش تم نے کبھی مجھے دوست سمجھا ہوتا۔“

”یہ دوستی نہیں تو اور کیا ہے کہ ہم دونوں اس وقت تک بیٹھے ہوئے ہیں۔“ میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

”یہ دوستی نہیں، بس ایک آتشلیک سی ہے۔ آتشلیک ایک کی بھی ہوتی ہے اور برسوں کی بھی۔ دوستی اس سے بہت اونچے پر ہوتا ہے۔ تم جانتے ہو کہ میں نے عمر بھر مردوں کی قدموں میں جھکیا ہے۔ میں اپنی پسند کے کھلونوں سے کھلتی ہوں انہیں توڑتی رہی ہوں لیکن تمہیں میں نے اپنے دل میں جگہ ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ تم غزالہ کو ٹوٹ کر چاہتے ہو اور وہ وہ زندہ رہے گی، تم میرے بارے میں سنجیدگی سے نہیں سوچ رہے۔ میں نے اپنا سب کچھ تمہیں سونپ دیا۔ تمہیں حاصل کرنے کے لیے میں نے کبھی غزالہ پر کوئی ملک واد نہیں کیا۔ میری ساری محبت ہے۔ میں تمہیں چاہتی ہوں تو کسی ایسی شخصیت کو جو بہت عزیز ہو، دکھ پہنچانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ میں جانتی کہ میں تمہیں تنگ کرنے کے لیے ایک مرتبہ پھر غزالہ کو مشکلات سے دوچار کر چکی ہوں لیکن میں نے اسے کوئی جسمانی نقصان نہیں پہنچایا۔“

”تو تم یہ سمجھ رہی ہو کہ بھارتی کو سلیٹ والے اسے ہمارے طرح رکھ رہے ہوں گے؟“ میں نے اس کی غیر معمولی جذباتی نظر انداز کرتے ہوئے ”وہ جیسا ہوا سوال کر ڈالا۔“

”میں غزالہ سے کوئی پر غاش نہیں ہے۔ وہ لوگ ذات میں رکھ کر مجھے گھبراتا چاہ رہے ہیں تاکہ مجھے پکڑ کر بیڑی بن کر حوالے کر سکیں۔ جب وہ میری طرف سے ناامید ہو جائیں۔ غزالہ کو بے ہوش کر کے شہر کے کسی دیر نے میں ڈال دیں گے۔“ کاش ایسا ہوتا!“ میں نے گھرا سانس لے کر کہا۔

بد قسمتی سے ایسا نہیں ہے۔ شری مان سنگھ غزالہ کے ساتھ میرے بارے میں بھی بہت کچھ جانتا ہے اور اب وہ غزالہ ذریعے مجھے بھانسنے کے چکر میں ہے۔ واقعات پر گرفت کر جانے تو انسانی باتیں ہونے لگتی ہیں۔“

”تمہارے بارے میں میں نے اس سے بہت سراسی کیا تھا جو صرف تمہارے نام تک محدود تھا۔ اسے اس کے بھی کچھ معلوم ہے تو اس کا ذریعہ بھی کچھ اور ہوگا۔“

”ذرائع کچھ بھی رہے ہوں۔ غور طلب بات یہ ہے کہ غزالہ

رفار ذہنی تجربے کے بعد میں نے ایک گمراہ سانس لے کر کتنا شروع کیا۔ ”اپنے اشتعال اور فحش کی وجہ سے تم نے غزالہ کو شری مان سنگھ کے چنگل میں دے دیا اور خود میرے خلاف ایک حمزہ کھیل کر بیٹھ گئیں۔ میرے لیے وہ مجیدہ صورت حال ناقابل قبول تھی۔ ایک طرف میں تمہارا کھنچ نکالنے کی کوشش کر رہا تھا اور دوسری طرف شری مان سنگھ کے بارے میں بھی سوچتا رہا۔ میرا خیال تھا کہ میں اسے ذرا دھمکا کر غزالہ کی واپسی پر مجبور کر سکتا یہ میری بہت بڑی کامیابی ہوگی۔“

”ایک منٹ!“ ویرا نے میری بات کاٹنے ہوئے کہا۔ ”شری مان سنگھ جیسے گھاگ آدمی کو ڈرانے دھمکانے کے لیے کسی ٹھوس بنیاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ تمہارے اس فیصلے کی کیا بنیاد تھی؟“ اس کے سوال سے ظاہر ہوا تھا کہ وہ پوری توجہ اور ذہنی ارتکاز کے ساتھ میری کمائی سن رہی تھی۔

”تمہیں معلوم ہے کہ تمہاری نقل و حرکت میری نگاہ میں ختم جس گاڑی میں انجین کو نلیٹ سے فرار ہوئیں اس کا ایک ماڈل اور رنگ بھی میرے علم میں تھا۔ بعد میں وہ کار ایک پراسرار دھماکے میں تباہ ہو گئی تھی۔ میں نے ان حوالوں کی بنا پر شری مان سنگھ کو فون کیا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں ایک فری لانسر ہوں۔ اگر اس نے میرا منہ بند رکھنے کے لیے میری شرائط تسلیم نہ کیں تو میں معقول انعام کے بدلے میں وہ ساری معلومات کسی اہم سرکاری ادارے کو فراہم کر دوں گا۔ فوری طور پر وہ میرے انکشافات سے خوف زدہ ہو گیا تھا۔ فون پر اس کی آواز سے ظاہر ہوا تھا کہ وہ پریشان اور مضطرب ہو گیا ہے۔ میں نے اسے یہ بھی بتا دیا تھا کہ مشتبہ کار میں کو نلیٹ سے فرار ہونے والی ویرا لائیڈ تھی جو ایک بین الاقوامی مجرمہ ہے اور نہایت شدت کے ساتھ مقامی پولیس کو مطلوب ہے۔ اس نے بظاہر ہتھیار ڈالتے ہوئے مجھ سے میری شرائط کے بارے میں دریافت کیا۔ یہاں مجھ سے ایک گچھ ہو گئی کہ میں نے غزالہ کی رہائی کا معاملہ براہ راست چھیڑ دیا۔ اگر وہ کئی شرائط میں سے ایک مطالبہ نہ تو شری مان سنگھ کو کسی قسم کا شبہ نہ ہوتا لیکن غزالہ کی بات سننے ہی وہ شاید چمکنا ہو گیا۔ اس نے مجھ سے مزید چند سوالات کیے اور آخر میں مکمل کر سامنے آ گیا۔ اس نے صاف کہہ دیا کہ اسے میری کمائی پر یقین نہیں ہے۔ میں ڈینی کے لیے کام کر رہا ہوں کیونکہ روئے زمین پر ایک وی شخص غزالہ کے بارے میں گھرمند ہو سکتا ہے۔ اس نے مجھ سے مزید ہتھکڑی کرنے سے گریز کرتے ہوئے، سختی کے ساتھ اصرار کیا کہ وہ صرف اور صرف ڈینی ہی سے بات کر سکتا ہے اور ڈینی کو غزالہ کے حصول کے لیے گلاس کی چند شرائط قبول کرنی ہوں گی۔ میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔“

”بھر کیا ہوا؟“ مجھے خاموش پا کر ویرا نے سوال کیا۔ ”تم نے بعد میں اسے اپنی اصل حیثیت میں فون کر لیا ہو گا؟ وہ تم سے کیا چاہ

رہا؟“ ”میں نے سگریٹ سلگا کر اپنے گلاس سے ایک گھلٹ لیتے ہوئے کہا۔ ”غزالہ شری مان سنگھ کی تحویل میں ہے اور اس کی بازیابی کا معاملہ آجیٹا ہوا نظر آ رہا ہے کیوں کہ شری مان سنگھ نے کسی کام میں الجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔“

”جیسا اس نے تم سے رابطہ کیا ہے؟“ ویرا نے چونک کر سوال کیا۔ ”رابطہ کیا ہوا نہ کیا ہو، مجھے میرے ذرائع ہر وقت صورت حال سے باخبر رکھتے ہیں۔ تمہارے قیاسات جو کچھ بھی رہے ہوں لیکن ہر بات پر ہے جو میں کہہ رہا ہوں کیونکہ میرے آدمی شری مان سنگھ کے ذہن تک رسائی رکھتے ہیں۔“

”اوہ! اس کے دہانے سے غیر ارادی طور پر آواز برآمد ہوئی پھر اس نے پوچھا۔ ”وہ غلام رسول کا کیا قصہ تھا؟ تمہیں ایسا تو نہیں کہ شری مان سنگھ اس میں بھی ملوث رہا ہو؟“

”وہ میری بابت سے زیادہ اونچا معاملہ ہے۔“ میں نے سادگی سے کہا۔ ”میں اس میں کون ملوث ہے اور کون نہیں؟ میں اس بارے میں کوئی رائے دینی نہیں کر سکتا۔ میرے لیے اہم ترین بات یہ ہے کہ تم غزالہ کو درخلا کے ماں سے لے گئیں اور اب وہ شری مان سنگھ کی قبضہ میں ہے۔“

”تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو۔“ وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ”ہمارے درمیان دشمنی منقطع ہو جانے کے بعد دوستی کا ذکر شروع ہو چکا ہے۔ اب اگر تم واقعی مجھ سے کسی قسم کی مدد چاہتے ہو تو کوئی گئی لپٹی رکھے بغیر مجھے ہر وہ بات بتاؤ جو تمہارے ذہن میں ہے۔ شاید میں کچھ کر سکوں!“

اس کی بات معقول و معنی خیز تھی۔ وہ اس قدر حلقوں طبیعت کی مالک تھی کہ میں آنکھیں بند کر کے اس پر اعتماد نہیں کر سکتا تھا۔ وہ کبھی بھی ”ذرا سی بات پر مشتعل ہو کر“ ایک بار پھر میرے خلاف صف آرا ہو سکتی تھی۔ جب کہ میرے لیے بلو کر اس ذیل کو ہولناک تھاپی سے پچاننا سب سے اہم تھا۔ وہ کام مکمل ہونے سے پہلے میں ویرا کو برہم یا ناراض کرنے کا خطہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

اس سے تھوڑی مدت ہتھکڑی کرنے کے بعد میں یہ نتیجہ اخذ کر چکا تھا کہ شری مان سنگھ کے بارے میں ویرا کی معلومات ان ہی شکات تک محدود تھیں، جن سے اس کا براہ راست تعلق تھا۔ مجھے اور شری مان سنگھ کے درمیان پیش آنے والے ”بعد کے واقعات سے وہ سیکرٹ عالم تھی۔“

اس تجربے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے ویرا کی معلومات میں کوئی قابل قدر اضافہ بھی بغیر ”اسے ایک فرضی کمائی سٹوری بنائے گا کہ وہ کچھ کرنے کا ارادہ رکھتی ہو تو اسے پیش رفت کا سہارا لے سکے۔“

”تمہیں تم سے کچھ بھی نہیں چھپا رہا۔“ مجھ بھر کے توقف اور تیز

رہا تھا؟

”میں نے اسے فون نہیں کیا۔ میں ابھی تک تذبذب میں مبتلا ہوں۔“ میں نے فکرت آمیز سنجیدگی کے ساتھ جھوٹ بولا۔ ”اس کے بجائے میں نے تمہاری تلاش میں زیادہ دلچسپی لی کیونکہ میرا خیال تھا کہ تمہارے ذریعے کامیابی کا امکان زیادہ ہو سکتا ہے اور آج تم میرے ساتھ بیٹھی ہوئی ہو۔“

”تم نے غلطی کی۔“ وہ متاثرانہ انداز میں بولی۔ ”تمہیں اس کو فون ضرور کرنا چاہیے تھا تاکہ تمہیں اس کا ذہن پرہنے میں مدد ملتی۔ اس کی بات کو ماننا یا نہ ماننا پھر بھی تمہاری مرضی پر منحصر ہوتا۔“

”میں تم اندازے کی غلطی کر رہی ہو۔ اگر میں اس کے مطالبے تسلیم کر لیتا تو وہ مجھ پر حاوی ہو جاتا اور کسی نہ کسی شرط کی تکمیل کو غزالہ کی واپسی سے منسلک کر دیتا۔ میرے انکار کی صورت میں وہ غزالہ پر تشدد یا پھر اس کے قتل کی دھمکی بھی دے سکتا تھا۔ اس خوف نے مجھے اس سے رابطے سے روک رکھا۔“

”میرا خیال ہے کہ تم ابھی میری موجودگی میں اس سے بات کرو۔ وہ تمہارے قابو میں نہیں آیا تو پھر میں کوئی راہ نکالوں گی۔ میں پورے غلوں سے تمہاری مدد کرنی چاہتی ہوں۔“

”میں ہمیشہ سے تمہارے غلوں کا قدردان رہا ہوں۔“ میں نے اس کے قریب برکتے ہوئے سختی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا ”مجھے معلوم ہے کہ میرے ساتھ شری مان سنگھ کی مصالحت نہیں ہو سکے گی۔ میرے ناکام ہونے کے بعد تم نے اس سے بات کی تو معاملہ اُلجھ جائے گا۔ وہ سمجھ لے گا کہ غزالہ میرے ساتھ ہی تمہارے لیے بھی بہت اہم ہے۔ اس چکر میں وہ تم پر بھی ہاتھ ڈالنے کی کوشش کر سکتا ہے۔“

”پھر میں ہی اس سے پوچھتی ہوں کہ وہ تم سے کیا چاہتا ہے؟“ دیرانے اپنا گلاس خالی کرنے کے بعد نئی سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ اس معاملے میں اس کا ذہن شاید بہت زیادہ صاف اور واضح نہیں تھا۔

”میں نے اپنی کمائی اس لیے ستانی کہ تمہیں صورت حال کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ تم میرا نام لیے بغیر اپنے طور پر اس سے بات کرو۔ تمہارے ذہن میں جو تجویز ہے اس پر عمل کرو۔ بلکہ شری مان سنگھ میرا کوئی ذکر کرے تو تم میری طرف سے برہمی کا اظہار کر کے اس قصے کو وچیں ختم کر دیتا۔ کسی بھی کامیابی کے لیے اسے یہ تاثر دینا ضروری ہے کہ میری اور تمہاری ملی بھگت نہیں ہے۔“

میرے لیے دیرا کو اس راہ پر ڈالنا بہت ضروری اور اہم تھا تاکہ شری مان سنگھ اسے میرے اور اپنے سمجھوتے کے بارے میں کوئی بات نہ بتا سکے۔ غیبت یہ تھا کہ دیرا میری چال کو سمجھے بغیر میری تجاویز پر دھیان دے رہی تھی کیونکہ میں نے کسی یوگھٹا ہٹ کا چٹا ہرہ کیے بغیر معقولیت کا راستہ اختیار کیا تھا۔

دیرانے دونوں کے لیے نئے گلاس تیار کیے پھر بولی۔ ”ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ غزالہ کی ذات میں بیک وقت ”ذہنی“ دلچسپی بھانپ کر، شری مان سنگھ سخت رویہ اختیار کر لے گا۔ میں نے ہی اس کی تحویل میں چھوڑا تھا۔ اس کے بعد میں نے محسوس حالات کی بنا پر خود ہی اس سے رابطہ نہیں کیا۔ زیادہ بہتر اور منطقی بات یہی ہوگی کہ میں اس سے اپنی واپسی کا مطالبہ کروں۔“

”اہم بات یہ ہے کہ وہ میرا ذکر لے بھی بیٹھے تو تم مجھ سے بدترین اختلافات کا ذکر کر کے اسے یہ بھی بتا سکتی ہو کہ تم انتقام لینے کے لیے ہی تم نے غزالہ کو اغوا کر کے برقرار رکھا ہے۔ اس طرح اسے یقین ہو جائے گا کہ اس نے غزالہ کو لوٹا دیا تو وہ میرے قبضے میں نہیں آسکے گی۔“

”اور ظاہر ہے کہ تم خود بھی یہ ساری تفتیشی چاہو گے۔ اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ اس نے مجھ سے اپنا گلاس خالی کیا تھا ”اس کی بنا پر اس کی آنکھوں میں غرا لے رہے تیرے لگے تھے۔“

”سنادو گی تو تمہاری مہربانی ہوگی۔“ میں نے صوفی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”کیا بات ہے؟ آج مجھ پر مہمان کیوں ہو رہے ہو؟“ میرے جسم سے چپکے ہوئے بولی۔

”تم ابھی طرح جاتی ہو کہ میں ہمیشہ تمہیں اپنا بہترین سمجھتا رہا ہوں۔“ میں نے اس پر اپنی گرفت مضبوط کر کے کہا۔ ”لیکن تمہیں سلطان شاہ کی طرف جھکتا ہوا دیکھ کر پسپائی کی راہ اختیار کر لی۔ میں دل و جان سے تمہیں ایک عورت کے روپ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”تمہارا اندازہ درست ہے۔“ وہ تسلی ہوئی آواز میں ”مشرق میں عورت کو بہت سی زیادتیوں کے باوجود سرکناڑ رکھا جاتا ہے جب کہ مغرب میں عورت کو بازار کی ایک جنس بنا دیا گیا ہے۔ وہاں عورت ہر روپ میں ہر سو پہلے مجبور ہوتی ہے۔ اس کے بغیر وہ ہر جگہ نظر انداز کر دی جاتی ہے۔ مجھے سلطان شاہ کی ذات میں ایک تندہ خوار غیور صوفی نظر آیا۔ اپنی عورت کی حفاظت کے لیے ہر وقت خونخوار بجھتا رہتا ہے۔ لیکن اس کے قریب جا کر مجھے شدید مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس میں جہاں بہت سی خوبیاں ہیں وہاں ایک بہت بڑی بات ہے کہ وہ عورت کو غلطی میں پھنسانے کا حق نہیں دیتا۔ شاید اس کے قبائلی معاشرے نے بچپن میں اسے سکھایا ہو۔ یہ بات اس کے ذہن میں اس بُری طرح حکم چلا رہی ہے کہ وہ اس اصول سے انحراف کو براہ راست اپنی مراد سمجھتا ہے۔ اس نے مجھے بری طرح مایوس کیا ہے اور اب بھی اس کے خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک رہا ہے۔“

اس دوران میں اس نے اپنا سر میرے بائیں شانے سے ٹکا لیا تھا۔

”مجھے اپنی زندگی میں ہزاروں مرد ملے ہیں۔ وہ اپنے گھاس سے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے ہوئے، مجروح لمبے میں کہہ رہی تھی، لیکن کسی میں ایسی انفرادیت نہیں مل سکی جو مجھے متاثر کر سکے۔ میں نے بہت سے وجہ اور بائیں گھروں کو اپنے سامنے مہیا کیے اور ہٹلاتے ہوئے دیکھا۔ مجھ جیسی عورت کو اپنی دسترس میں پا کر وہ ایک بیک یوں پھٹکتے ہیں کہ ان سے ٹھن آنے لگتی ہے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوتا ہے اسے رسمی کارروائی تو کہا جاسکتا ہے لیکن محبت کا نام ہرگز نہیں دیا جاسکتا۔ اس کے برعکس سلطان شاہ ایک بادشاہ کے دربار میں اس کا مردانہ احساس برتری حد سے بڑھا ہوا ہونے کی وجہ سے مجھے ناگوار کر دیا لیکن میں اس کی عزت کرتی ہوں۔ اور پھر تم ہو اس نے رک کر ایک گہرا سانس لیا اور اپنا رخسار میرے شانے سے رگڑتے ہوئے بولی ”میرا ماضی تمہارے سامنے کسی کھلی ہوئی کتاب کی طرح ہے۔ تم جانتے ہو کہ میری زندگی میں بہت سے مرد کھلونوں کی طرح آئے اور ایک سامنے کی طرح گزرتے چلے گئے۔ اس کے ساتھ ہی دوسری ستم گرہنی یہ ہوئی کہ جب تم سے میری راہ دور ہو تو مجھے غزالہ کے ساتھ تمہارے تعلق کا صحیح اندازہ نہیں تھا۔ میں نے تم سے توقعات باندھ لیں اور تم مجھ سے ایک دوست یا شاید کھلونا سمجھ کر اپنا وقت من مانے انداز میں گزارتے رہے۔ وہ میرا پہلا تجربہ تھا کہ میں من مانی کرنے کے بجائے کسی کی تابع ہوتی تھی۔ آخر کار میرا یہ خواب بھی بکھر گیا لیکن اس کی یادیں حسین ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آج کی اس ملاقات میں تم پر اپنی یادوں کو ضرور تازہ کرنا چاہو گے۔ یہ میری امید ہی نہیں البتہ مجھی ہے۔“

میں نے اس کے نرم بال اپنی مٹھی میں جکڑ کر آہستگی سے اس کا چھوٹا اور اٹھایا کہ اس کی محسوس نکلیں میری چپتی ہوئی نظروں کے سامنے آئیں۔ ”تم بائیں گھروں میں ہو رہی ہو۔“ میں نے کہا۔

”کبھی کبھی عقل اور ہوش مندی کا ساتھ چھوڑ کر ہی سرور ملتا ہے۔“ وہ بولی۔

”اور چار بجے وہ واپس آ رہا ہے جو میری عقل کا پاسبان بنا رہا ہے۔“

”آئے دو“ اب مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ ”اس نے میری نصیحت اپنی دونوں مٹھیوں میں جکڑ لی۔ ”آج کی رات تو میں ویسے بھی اکیلی گھٹ میں گزارنے کا فیصلہ کر چکی ہوں۔“

”دور بلو کر اس ذیل کا کیا بنے گا؟“ میں نے پوچھا۔

”ایک دن کی تاخیر سے کوئی قیامت نہیں آجائے گی۔“ وہ اٹھاتے ہوئے بولی۔ ”اگر میں آج نہ آتی تو کیا ہوتا؟ سمجھ لینا کہ ہم آج طے ہی نہیں تھے۔“

”نہیں، ویرا“ میں نے قدرے سختی کے ساتھ کہا۔ ”تمہیں آج ہی ایران کے لیے روانہ ہو جانا چاہیے۔ ہماری کئی بھی لغزش سے کام ہو گیا تو میرا ضمیر زندگی بھر مجھے ملالت کرتا رہے گا۔“

”کچھ نہیں ہوتا۔“ وہ ضدی لمبے میں بولی۔ ”میں ان ایرانیوں کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ شور زیادہ مچاتے ہیں اور کام کم کرتے ہیں۔ ان کا کاواں رک رک کر سڑ کرے گا۔ ہمارے پاس ابھی بہت وقت ہے۔“

اس کا موڈ دیکھتے ہوئے مجھے اس بارے میں ہتھیار ڈالنے پر مجھے لیکن اس کے ساتھ ہی غزالہ کا معاملہ بھی الجھا ہوا تھا اس لیے میں نے بے بسی سے کہا۔ ”ایرانی کاٹل الوجود ہیں لیکن شری مان سنگھ کسی شادکام کی طرح تیز اور پھر بڑا ہے۔ اس سے ابھی چیمپئر جھڑک رہی تو صبح تمہاری روائی تک کوئی نہ کوئی بات واضح ہو جائے گی۔ خدا کے لیے“ اس بارے میں کوئی بہانہ نہ تراش لیتا۔

وہ عجیب سے انداز میں ہنس پڑی۔ ”تو پھر اسپیکر فون لاؤ، میں اس سے بات کرتی ہوں۔“

ویرا نے غالباً شری مان سنگھ کا ذاتی نمبر لپٹا لیا تھا کیونکہ پہلی مٹھی پر ہی ”اسپیکر فون پر اس کی آواز سنائی دی تھی“ ”ہیلو، سنگھ اسپیکنگ“ ”میں ویرا بول رہی ہوں، اپنی امانت کی واپسی کے سلسلے میں۔“ ویرا نے کہا۔ غصہ تھا کہ اس وقت اس کے لب و لہجے پر سے روانی اثرات ختم ہو چکے تھے۔

”وہ“ تم کہاں ہو؟“ شری مان سنگھ کی تھوڑے آواز ابھری۔ ”میں تو اس دن سے تمہاری واپسی کا انتظار کر رہا ہوں۔ تمہاری امانت پوری احتیاط اور حفاظت کے ساتھ میری تحویل میں ہے۔“ شری مان سنگھ کا وہ جواب سننے ہی میری کھوپڑی چکر اکر رہ گئی۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ غزالہ اس کی تحویل سے نکال کر سرحد پار پہنچا دی گئی تھی اور ویرا کو وہ کچھ اور ہی کمائی بنا رہا تھا۔

”تمہیں معلوم ہو چکا ہو گا کہ کچھ لوگ اچانک ہی میرے خلاف ہو گئے ہیں اور مجھے پہلی فرصت میں بے دست و پا کر دینا چاہتے ہیں۔ اس بارے میں تم پر بھی ان کا خاصا دباؤ ہے۔ میں تمہاری مجبوریوں سے واقف ہوں اور یہ جانتی ہوں کہ ان کے آہرانہ دباؤ کے سامنے تمہیں اپنی مرضی کے خلاف مجھ سے ہیر پھیر کرنا پڑے گا۔“

”تم خاصا باخبر ہو۔ میں تمہاری کسی بات کی تردید نہیں کروں گا۔ اوپر سے آئے ہوئے خفیہ احکام کے تحت ہم بری طرح بندھے ہوئے ہیں۔ ہمیں کبھی سے بگاڑ پیدا کر کے ہم خسارے میں رہیں گے۔ مجھے خوشی ہے کہ تم نے خودی صورت حال کا اندازہ کر کے ہمیں ہر امتحان سے بچا رکھا ہے۔ تم سامنے آجائیں تو ہمارے تعلقات میں بیشک کے لیے ایک ناگوار سی سختی پیدا ہو سکتی تھی۔ ہم لوگ شی کے بہت بڑے دوران ہیں مگر مجبوراً۔“

”بار بار اپنی مجبوریوں کا ذکر کر کے مجھے شرمندہ نہ کرو!“ ویرا

125

تھی۔

”تمہاری بات درست ہے لیکن میرے پاس اڑتی اڑتی نہیں موجود ہیں کہ ڈینی اب پاکستانی حکام کے ساتھ تعاون کرنے لگا ہے اگر اس کے بعد رو دن رات عمرانی شروع کرادیتے تو ہمارے لیے لڑکی کو یہاں سے ہٹانا نامکن ہو جاتا۔ ہم نے جو کچھ کیا، اس میں ضرورت کے ساتھ ہی ہماری مجبوری کا بھی دخل ہے۔ ہم لڑکی کو تمہارے مطالبے پر فی الفور تمہارے حوالے کرنے کے پابند ہیں۔“

”فی الفور والی بات مت کرو!“ ویرا نے تیزی کے ساتھ اس کی بات کاٹ دی۔ ”تم اسے فوری طور پر پاکستان کیسے لاسکتے ہو؟ میں اس کی واپسی کراچی میں چاہتی ہوں۔“

میں نے آنکھوں اور ہاتھوں کے اشاروں سے ویرا کو سکھایا کہ وہ کراچی سی میں واپسی کی بات پر اصرار نہ کرے۔ مجھے شہر تھا کہ اس طرح شری مان عکھ کو بات ٹالنے کا بہانہ مل جائے گا اور ویرا وہ قصہ سننے سے پہلے ہی بلیو کر اس ڈیل کے تعاقب میں ایران چلی جائے گی۔

”تم جس طرح چاہو، ہم عمل کرنے کو تیار ہیں۔“ شری مان عکھ کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔

”ہڑکی کو کراچی لانے میں کتنا وقت شرف ہوگا؟“ ویرا نے مجھے آنکھ سے تھپی اشاہہ کرتے ہوئے سوال کیا۔

”تم از کم تین دن۔۔۔ اس مدت میں ایک آدھ دن کا اضافہ بھی ہو سکتا ہے کیونکہ ہماری مشترکہ سرحدوں پر غیر معینی صورت حال رہی ہے جو کسی بھی وقت بگڑ سکتی ہے۔“

”فضائی بلکہ خلائی سفر کے اس دور میں تم تین دن کی بات کر رہے ہو؟“ ویرا نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”کیا اسے ملکہ گاڑی پر لا کر کراچی لاؤ گے؟“

”فضائی سفر کے لیے دستاویزات تیار کی جاسکتی ہیں لیکن لڑکی بہت بد معاش ہے۔ اسے علم ہو گیا کہ اسے پاکستان لایا جا رہا ہے تو وہ یہاں پہنچنے ہی بجگمہ کھڑا کرے گی اور ہمارے لیے صوبہ پر پانی پھر جائے گا۔ اسے زخمی راستے سے ہی یہاں لانا ہوگا۔ اس میں وقت لگ جائے گا۔“

”میرے لیے وقت مت اٹم ہے۔“ ویرا نے لمحہ بھر کے توقف کے بعد سخت اور فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”میں آج رات سے چا اس لڑکی کی واپسی چاہتی ہوں۔ تم دنیا کے کس حصے میں اسے ہوا میں کے حوالے کر سکتے ہو؟“ ویرا کے لب و لہجے میں پیشہ ورانہ احمقہ جھلک رہا تھا۔ میں حیرت سے اس کا منہ دیکھتا گیا۔ چہرہ ہلکا ہوا میرے بدن سے چٹنی، اپنے کھولتے ہوئے جذبات کے جہ میں بھی سر دی کھائے ہوئے کسی بچے کی طرح کاپ رہی تھی اور اس وقت بلیک کوئن بن کر اس طرح جھول رہی تھی جیسے دنیا کے سے غلطوں میں اس کے ہلکے گزار رہے ہوں۔

نے اس کی بات کاٹ کر نرمی سے کہا۔ ”ہا اثر لوگوں کی زبان سے بے بسی اور مجبوری کا ذکر سننے ہی مجھے وہ اونٹنی یاد آ جاتی ہے جو چلتی ہوئی ریت پر ایک بچے کو جنم دینے کے بعد اپنے پیٹ میں اڑے ہوئے دوسرے بچے کی ولادت کے انتظار میں تڑپ رہی تھی۔“

”واہ! ایسا مثال دی ہے تم نے!“ شری مان عکھ کی آواز تھیر زوہ اور خوشامدہ تھی۔ ”ایسا اچھوتا اور نادر منظر تم نے کہاں دیکھ لیا تھا؟“

مجھے خوشی ہوئی کہ ویرا کی خوشنودی اس کے لیے اس قدر اہمیت رکھتی تھی۔

”قمر کے علاقے کا قصہ ہے۔ اب یہ بتاؤ کہ وہ لڑکی مجھ تک کیسے پہنچی؟“ ویرا مطلب کی بات پر آگئی۔

”ہڑکی کے بارے میں تمہیں شاید علم نہ ہو کہ ڈینی نامی ایک بد معاش اس میں دلچسپی لے رہا ہے۔“ شری مان عکھ نے غالباً جھجکتے ہوئے وہ ذکر چھیڑا تھا کیونکہ اس کی آواز سے تردد جھلک رہا تھا۔

”ڈینی!“ ویرا نے برہمی کے انداز میں ڈوہرایا۔ ”اسے لڑکی کی ہوا بھی نہیں لگ سکے گی۔ میں نے اسی کو ڈک پہنچانے کے لیے اس لڑکی کو اغوا کیا ہے۔ لیکن تم کو یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟“

”میری اس سے بات چیت چل رہی ہے۔“ شری مان عکھ کے اس جواب کے ساتھ ہی میرا دل اچھل کر قلع میں گیا۔ اس کی وہ

کمانی ویرا کو میری طرف سے ایک بار پھر یہ گمان کر سکتی تھی۔

”وہ ہر قیمت پر اس لڑکی کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اب میری شری مان عکھ نے اپنی کمانی جاری رکھنی چاہی لیکن ویرا نے میری آنکھ کا اشاہہ سمجھ کر فوراً ہی اس کی بات کاٹ دی۔

”اس سے تمہاری کیا بات چیت چل رہی ہے؟“ اس سے مجھے کوئی غرض نہیں ہے۔ وہ لڑکی میری مرضی کے بغیر ڈینی کی تحویل میں نہیں جاسکتی۔ میں اسے فوری طور پر اپنے قبضے میں دیکھنا چاہتی ہوں۔“

”فوری طور پر؟“ شری مان عکھ کی حیرت آواز ابھری۔ ”اس میں ذرا سی وقت ہوگی۔“

”وہ کیا؟“ ویرا نے چار ڈکھانے والے لہجے میں سوال کیا۔ وہ شری مان عکھ پر حاوی ہو چکی تھی۔

”ڈینی کے خطرے کے سرباب کے لیے اس لڑکی کو کوئی دہلی کے حکام کی ہدایت پر سرحد پار منتقل کیا جا چکا ہے۔ تم چاہو تو اسے دوبارہ پاکستان لایا جاسکتا ہے لیکن میری رائے میں اسے پاکستان سے باہر رکھنا ہی بہتر ہوگا۔ وہاں ڈینی اور اس کے ساتھی کوئی گڑبڑ نہیں کر سکیں گے۔“

”تم لوگ یہاں اتنے بے بس نہیں ہو کہ ایک نازک اندام سی لڑکی کو چند روز کے لیے قید نہ رکھ سکو۔ اسے یہاں سے بھیج کر تم امانت میں خیانت کے مرتکب ہوئے ہو۔“ ویرا اسے خندہ دکھادی

کے بعد تمہارا آدمی اپنی مرضی سے کہیں بھی جانے کے لیے آزاد ہو گا۔" دیرارک رک کر سوچتی اور پوچھتی رہی۔ یوں معلوم ہوا تھا جیسے وہ پورا انتظار اس کی نظروں میں محوم رہا ہو۔
 "میرے آدمی کو مکاؤ جانے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ شکر طاعی میں لڑکی کو کو ایک فوکے حوالے کر دے گا۔"

"یہ بہت ضروری ہے۔" دیرانے سختی سے کہا۔ "ہانگ کانگ اور مکاؤ میں رہنے والے جرائم پیشہ چینیوں سے ہانگ کانگ کی برطانوی انتظامیہ بہت خائف رہتی ہے۔ سمندر میں پولیس کی پٹرولنگ بھی بہت سخت ہوتی ہے۔ اکثر وہ لاناہوں کو سمندر میں گھیر لیتے ہیں تاکہ منشیات اور انسانوں کی اسمگلنگ کا سبب باب کیا جاسکے۔ ایسے ہی کسی برے وقت کے لیے تمہارے آدمی کی موجودگی ضروری ہے تاکہ وہ اپنے کاغذات وغیرہ کی مدد سے ہانگ کانگ پولیس کو مطمئن کر سکے۔ مکاؤ ان لوگوں کی دسترس سے باہر ہے۔ وہاں کو ایک فوکہ خود حالات سنبھال لے گا۔"

"تم مجھے اپنا نمبر دے دو تاکہ میں اپنا بندوبست کرنے کے بعد تمہیں اطلاع دے سکوں۔"
 "فکر نہ کرو۔ ایک گھنٹے بعد میں خود معلوم کر لوں گی۔" دیرا نے یہ کہہ کر فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

"تم نے اسے فی البدیہہ ایسا پروگرام بتا دیا جیسے تم نے سب کچھ پہلے سے طے کیا ہوا تھا۔" فون بند ہونے کے بعد میں نے حیرت سے کہا۔ "ان باتوں میں ردوبدل ہو سکتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کو ایک فوکہ ہانگ کانگ یا کولون میں نہ ہو بلکہ مین لینڈ چائنا گیا ہو۔" جین ایک وسیع و عریض ملک ہے۔ تم اسے کہاں تلاش کرو گی؟"

"آخاہ!" وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ "تم بھی ہانگ کانگ کے رہنے والوں کی طرح چین کو مین لینڈ کہتے ہو۔ تم وہاں کب گئے تھے؟ مجھے تو یاد نہیں کہ تم نے بھی ادھر کارخ کیا ہو۔"

"میں تمہاری طرح پیدا انکی مجرم نہیں ہوں۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "شی میں آنے سے پہلے میں کاروبار میں اپنے باپ کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ اسی زمانے میں ہانگ کانگ کے پھیرے لگائے تھے۔ اب تو وہ سب ایک بھلا ہوا خواب محسوس ہوتا ہے۔ نکلرٹ، اسٹین لیس اسٹیل اور شیشوں سے سجے ہوئے اس ننھے سے ملک کی بھی اپنی ایک پراسرار کائنات ہوا کرتی تھی۔ اونٹے ہانڈوں کے دامن میں اونٹنی اونٹنی عمارتیں بھی کھلونوں کی طرح نظر آتی تھیں۔ پھر وہاں کے تند خاوار غصیلے چینی دکاندار، جن کی آنکھ میں سور کا بال ہوتا ہے۔ اپنی مرضی سے دس بیس فیصد ڈسکاؤنٹ دے دیں گے، گاہک دامنوں میں کمی کی بات کرے تو برہم ہو کر اسے دکان سے اتار دیتے ہیں۔"

"ان چینیوں نے ہانگ کانگ میں بڑے مصائب جھیلنے کے بعد اپنی حیثیت بٹائی ہے۔ دوسروں کے ساتھ برا سلوک کر کے وہ اپنے

"دہلی میں یہ کارروائی میرے ایک فون پر عمل میں آسکتی ہے۔" تھوڑی سی دیر پہلے مجھے خبر ملی تھی کہ لڑکی کو راجستان سے نئی دہلی پہنچا یا چکا ہے۔ "شری مان سنگھ نے چند لمحوں کے سکوت کے بعد کہا۔

"پاکستان تمہارے لیے مشکل ہے اور بھارت میں میرے رابطے نہیں ہیں۔ کسی اور ملک کی بات کرو!"
 "پھر مشرق وسطیٰ یا مشرق بعید کا کوئی شرٹے کرلو۔ میں پہلی پرواز سے اسے روانہ کرنے کا بندوبست کرتا ہوں۔"
 "وہاں کے لیے ہوائی سفر مشکل نہیں ہو گا؟" دیرانے مجھے آنکھ مار کر پوچھا۔

"پاکستان میں آنے والے ہر بھارتی شری، خصوصاً غیر مسلم کو شے کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے جب کہ دوسرے ملکوں میں یہ صورت حال نہیں ہے۔ ہمارا کوئی بھی آدمی اسے ایک مریض کے طور پر ساتھ لے جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ پورے سفر اور منتقلی کی کارروائی کے دوران میں وہ ہوش ہی میں نہ آنے پائے۔"

"تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ مشرق وسطیٰ کے بیشتر ممالک میں افوا کے جرم کی سزا موت ہے اس لیے میں ادھر کا خطرہ مول نہیں لوں گی۔ تم اس لڑکی کو ہانگ کانگ پہنچانے کا بندوبست کرو۔"
 "فیک ہے۔" شری مان سنگھ نے ہلکا سا نال کہا۔ "مجھے وہاں کا رابطہ دو۔ ہانگ کانگ حالانکہ یہاں سے چار گھنٹے آگے ہے لیکن میرے آدمی اسے بارہ بجے سے پہلے وہاں پہنچا دیں گے۔"
 "ہانگ کانگ کے بارہ بجے؟" دیرانے قدرے حیرت کے ساتھ سوال کیا۔

"نہیں، میں کراچی کے وقت کی بات کر رہا ہوں۔" اس نے جلدی سے کہا۔ "اس وقت ہانگ کانگ میں صبح کے چار بجے ہوں گے نئی دہلی سے وہاں تک کی پرواز خاصی طویل ہے۔ اسے بھی فکریں رکھنا ہو گا۔"

"فیک ہے۔ یہ بندوبست مجھے منظور ہے۔ اب کان کھول کر سونے لے لو کہ تمہارے آدمیوں کو ایئر پورٹ پہنچنے کے بعد شکر طاعی کے کمرانمبر آٹھ سو بیس میں گھبراہٹ ہے۔ یہ ہوٹل کولون کے علاقے شمساجی کی ایسٹ میں واقع اور بہت مشہور ہے۔ ان کی بگس مس تریا جی کے نام پر کرائی جائے گی۔ ان کے پہنچنے پر کو ایک فوکہ ایک چینی رابطہ کرے گا۔ یہ خیال رہے کہ کو ایک فوکے نام سے آنے والا، مکاؤ کا بہت خوفناک گروہ بند ہو گا۔ وہ ذرا سا شبہ ہونے پر اپنے ننھے سے چاقو کی نوک سے اپنے حریف کی شر رگ کاٹ دینے میں ملکہ رکھتا ہے۔ تمہارا آدمی لڑکی کو ساتھ لے کر کو ایک فوکے ہمراہ کولون کی سمت پر واقع ایک گھاٹ پر جائے گا۔ وہاں سے وہ تینوں ایک تیز رفتار ہوور کرافٹ پر دوسری جانب ہانگ کانگ کے علاقے وان چائی پہنچیں گے وہاں سے ایک اسپینڈ لٹ ان تینوں کو لے کر مکاؤ کے لیے روانہ ہو جائے گی۔ مکاؤ پہنچنے

اور جمی لایڈ کے سارے خواب ادھورے رہ جاتے۔
 ”اب یہ ہرزہ سرا کی ختم کرو اور کو ایک فوکو تلاش کرنے کی
 کوشش کرو!“ میں نے اسے پکارتے ہوئے کہا اور وہ بے ہوش
 عورت اس بار کسی جوک کی طرح میرے وجود سے چٹ گئی۔
 ”تمہاری ان ہی اداؤں پر پیار آتا ہے۔“ وہ چند ٹائٹل بھر
 اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولی۔ ”اب جلدی سے بنا
 ٹیک تیار کرو اور اچھے بچے کی طرح بیٹھ کر تماشا دیکھو کہ میں کسی
 طرح بندوبست کرتی ہوں۔“

اس وقت دیر کو خوش رکھنا میرے لیے ایک ناگزیر ضرورت
 کا درجہ حاصل کر چکا تھا۔ اس کی دلچسپی کے فضیل، غزالہ کی بازاریابی
 کا ناک ترین مرحلہ یک بیک آسان ہوتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ مجھے پورا
 یقین تھا کہ اگر میں اپنے طور پر شری مان سنگھ کے ساتھ مغربی دنیا
 رہتا تو وہ مجھے ایک کے بعد دوسرے کام میں الجھا کر مختلف نئے
 بہانوں سے غزالہ کی واپسی کے معاملے کو ٹالتا رہتا اور آخر کار ایک
 ایسا مرحلہ آجاتا جب میں اپنی کسی نفرتش کی بنا پر بیٹھ کے لیے اس
 کے ملک دشمن چنگل میں پھنس کر رہ جاتا جس سے شاید مرکز کی
 نجات نہ ملتی کیوں کہ میرے ساتھ ساتھ وہ دیر کے ذریعے بھی
 ہوتی غزالہ کو بھی اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کرنا شروع
 کر سکتا تھا۔

میں نے غلام رسول والے معاملے میں اس پر اعتماد کر کے رک
 لیا تھا کہ بظاہر ایمان دار اور ساہوکار نظر آنے کے باوجود وہ بیچارہ
 طور پر ایک بد نیت آدمی تھا جس سے جیتنا آسان کام نہیں تھا۔
 مجھے یہ مذاکرات سے دوران میں اس پر دلائل حرام نہ رہے۔
 ساتھ اپنی محبت کا ڈراما رچا کر، پورے غلوں کے ساتھ مجھے
 یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ وہ نئی دہلی میں بیٹھے ہوئے ایک
 اعلیٰ افسران کی مداخلت کی وجہ سے غزالہ کے معاملے پر اپنی گرفت
 کھو بیٹھا تھا اور اس کی واپسی کے لیے ان لوگوں کی منظوری یا
 مندی کا محتاج ہو کر رہ گیا تھا۔ جب کہ دیر کے ساتھ اسی موضوع
 پر بات کرتے ہوئے، اس غیبت نے کہیں بھی اپنی بے بسی یا بیچارگی
 کا کوئی اشارہ نہیں دیا تھا بلکہ دیر کی ہر بات کو بلا کسی پس منظر
 قبول کرنا چلا گیا تھا۔

اب اگر دیر خانم کی مداخلت کی وجہ سے غزالہ کی بارگاہی
 مرحلہ اس قدر آسان ہوتا نظر آ رہا تھا تو میں اپنی انا پسندی یا
 غلطی کی وجہ سے اس موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔
 دیر کسی آدھ مزاج شہزادی کی طرح، ٹانگ پر ٹانگ
 مجھے دیکھتی رہی۔ میں نے توجہ اور التزام کے ساتھ نئے گھاس
 کیے جب میں نے ایک گھاس اس کے سامنے رکھا تو اس نے
 ایک بے ہودہ سا مطالبہ کر دیا۔

عام حالات میں کسی حسین و جمیل دوشیزہ کے ایسے مطالبے
 پر اگر ناکہ ایک مرد کی تشنہ آرزوؤں کی قبرست میں شامل ہوتا

خراب ماضی کا لاشعوری انتقام لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا یہ
 سلوک چھوٹی اور درمیانی دکانوں میں انجینی چروں کے ساتھ ہوتا
 ہے ورنہ وہ بھی اتنے برے نہیں ہیں۔“
 ”صحت سمجھو ہانگ کا ٹیک پر!“ میں نے اس کی بات کاٹ کر
 کہا۔ ”میں نے کچھ اور سوال کیا تھا اور تم نے جواب دینے کے
 بجائے مجھے کہیں اور الجھا لیا۔ میں تمہاری حد سے بڑھی ہوئی خود
 اعتمادی کا سبب جاننا چاہتا ہوں۔“

”ہانگ کا ٹیک میں“ میں نے طویل عرصہ گزارا ہے۔ ایک
 زمانے میں انیم اور جس کی تجارت کے لیے وہ علاقہ بھی بہت زرخیز
 تھا۔ ارد گرد کی ساری پیداواری منڈیوں کا مال وہیں آتا تھا اور وہاں
 کو ایک فیرا سرپرست ہوا کرتا تھا۔ وہ دن رات اپنے محل نما
 مکان میں حسین لڑکیوں اور اپنے پالتو غنڈوں میں گھرا رہتا ہے۔ دنیا
 بھر کی قیمتی شراہیں اس مکان میں دن رات پانی کی طرح بہانی جاتی
 ہیں۔ وہ کسی اہم ترین ضرورت کے بغیر اپنی اس سلطنت سے باہر
 نہیں نکلتا۔ وہیں پڑا، اپنے کارندوں کو ہدایات دیتا رہتا ہے۔ مجھے
 یقین ہے کہ وہ نکلاؤں ہی ہوگا۔“

”وہ اتنا ہی بڑا آدمی ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ تمہارے ایک
 فون پر کونوں کی طرف دو ڈکاوے اور اپنی ساری رات برباد کرے؟
 پھر اسے بھی آگے کچھ نہ کچھ بندوبست کرنا ہوگا۔“ وہ کمالی میرے
 حلق سے نہیں اتر رہی تھی۔

”تم اپنی جو بچ بند رکھو اور دیکھتے رہو کہ سارا کام کس طرح
 ہوتا ہے۔ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ وہ ہانگ کا ٹیک میں میرا
 سرپرست بنا ہوا تھا۔ وہ مجھے اپنی اولاد کی طرح چاہتا ہے۔“
 ”چاہے نہیں اپنی ضرورتوں کے تحت تم نے کس کس کو اپنا باپ
 بنایا ہوا ہے۔“ میں نے ایک گھرا سانس لے کر کہا۔ ”جو تمہارا
 اصل باپ ہے وہ تمہیں اپنی بیٹی نہیں مانتا اور ایرے غیرے آسانی
 کے ساتھ تمہارے باپ بن بیٹھتے ہیں۔ ویسے یہ کو ایک فوکس چکر
 میں تم سے گھرایا تھا؟“
 ”چکر؟“ دیر نے مجھ پر آنکھیں نکالیں۔ ”خدا کا خوف کرو“
 ڈینی! وہ شے کا بہت پرانا آئی مین ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ وہ تو دہائی طور پر اپنا علاقہ دہا ہے جہاں
 زمین، سمندر اور فضا میں صرف مقامی ڈان کی مرضی چلتی ہے۔
 وہاں شے کب سے اتنی فعال اور طاقت ور ہو گئی؟“
 ”اپنا کا اثر و رسوخ اٹلی سے نکل کر دوسرے علاقوں میں پہنچنے
 تک مد میں گزر گئی تھیں لیکن شے وجود میں آتے ہی ہزار پابلا کی
 طرح ہر طرف پھیل گئی تھی۔ اچانک نمودار ہونے کی وجہ سے
 مقامی گروہ بند بہت جلد اس سے خائف ہو کر کترانے لگے تھے۔
 ان کامیابیوں کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ شے نے ہر علاقے کے
 بہترین اور بے خوف لوگوں کو اپنے دامن میں سمیٹا تھا۔ ایسا نہ ہوا
 ہوتا تو پانا ملے، شے کے ابھرنے سے پہلے ہی اسے کچل ڈالتے۔“

لے اپنی ہنسی روکنی مشکل ہو رہی تھی۔ میں فون بند نہ کرتی تو میری ہنسی کی آواز ابھرتے ہی دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہو جاتا۔ خدا کے لیے اب اپنے تاثرات پر قابو رکھنا ورنہ میں کواٹک فوسے بات نہیں کر سکوں گی۔“

”ٹھک ہے!“ میں نے غرا۔ تے ہوئے کہا۔ ”اگر کواٹک فونے اتنا احتیاط نہ کرتا تو اسے تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ بظاہر تو وہ کوئی مردانہ آواز ہی محسوس ہوتا ہے۔“

”بس اب بحث نہ کرو!“ ویرا نے کہا۔ ”بارہ اپنا مطلوبہ نمبر ملانے میں مصروف رہو۔“

سلسلہ ملنے پر اسپیکر فون پر یہ بار پھر وہی معجزہ خیز آواز ابھرنے لگی۔ تقریباً تیس سیکنڈ بعد وہ آواز موقوف ہو گئی اور اس بار ایک نرم نسوانی آواز ابھری لیکن تلفظ اور لب و لہجے میں حیرت انگیز فرق پر کوئی نمایاں فرق نہیں تھا شاید میرے متعصب کان کوئی فرق محسوس نہیں کر سکتے تھے۔

”میرا نام ویرا ہے۔ میں فادر کواٹک فوسے بات کر رہی چاہتی ہوں۔“ ویرا نے اس کے خاموش ہو جانے پر انگریزی میں اپنا مدعا بیان کر دیا۔

”ہولڈ آن فور آئی نیت!“ اس بار وہ آواز بہت نرم اور شیریں محسوس ہوئی۔

چند ثانیوں کے توقف کے بعد ہی اسپیکر فون پر خاصی گھن گرج کے ساتھ ایک پرجوش مردانہ آواز ابھری۔ ”نی ہاؤ، مائی بے بی!“ شاید اس نے اپنے روایتی انداز میں اسے خوش آمدید کہا تھا۔ اس سے آگے اس نے انگریزی زبان استعمال کی تھی جس کا لب و لہجہ بہر حال چینی ہی تھا۔

”تم کہاں ہو اور آج اتنی مدت کے بعد مجھے کیسے یاد کیا ہے؟ میں اکثر تمہیں یاد کرتا رہتا ہوں، میری بیٹی، اکو، تمہارا غافل باپ تمہارے کس کام آسکتا ہے؟“ بولنے والے کی آواز بلاشبہ شراب کے نشے سے بوجھل تھی لیکن اس کے لہجے سے ویرا کے لیے بے پناہ پیار جھلک رہا تھا۔

اس کے بارے میں سنائی ہوئی ویرا کی کمائی اگر درست تھی تو میں حیران تھا کہ کواٹک فوجیسا جاہ و جلال والا آدمی ویرا پر اس قدر مہربان کیسے ہو سکتا ہے۔

”میں بھی اکثر تمہیں یاد کر کے روتی ہوں، فادر!“ ویرا نے بھڑائی ہوئی مکارانہ آواز میں کہا۔ ”دل چاہتا ہے کہ اڈر کر تمہارے پاس پہنچ جاؤں لیکن تم جانتے ہی ہو کہ میرا اصل باپ کتنا ظالم ہے۔ وہ مجھے میری پسند کے ہر کام سے روک دیتا ہے۔ میں برسوں سے ادھر نہیں آسکی ہوں۔“

”بڑی بات، میری بیٹی!“ کواٹک فو کی آواز ہرزگانہ ہو گئی۔ ”وہ بہت عظیم آدمی ہے۔ ہر آئی میں کے قدموں کی خاک سے ہم سب کی آنکھوں کو نور اور معدوں کو خوراک ملتی ہے۔ اس کے بارے

میں اسی کام کو کسی نادر شاہی حکم کے ذریعے ایک فرض بنا دیا جائے تو وہ خاصا ناخوشوار بلکہ کسی حد تک مشینی عمل بن جاتا ہے۔ میرے لیے وہ اس وقت حکم حاکم مرگ، مفاہات بن گیا تھا۔ میں نے اپنی دانست میں پوری نزاکت، لطافت اور گرجوٹی سے کام لے لیا ہوں اس بدایت کی تعیل کی اور ویرا کو ہلکھلائی ہوئی اسپیکر فون کی طرف متوجہ ہوئی۔

جسٹیکر کو قدرت نے جہاں ہر قسم کے مالی دسائل سے نوازا تھا وہیں اسے ان دسائل سے مستفید ہونے کے ذوق سلیم سے بھی نوازا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے گھر کے دونوں نمبروں کے ماتھ ہی اس کے اس عشرت کدے کا فون بھی براہ راست بین الاقوامی رابطوں کی سہولت سے مزن تھا۔

پہلی سی کوشش میں ویرا کو اپنا مطلوبہ نمبر مل گیا اور اسپیکر فون پر ایک ہماری مردانہ آواز میں عجیب سی چوں چاں لگتی دینے لگی جو میرے لیے بالکل ہی ناقابل فہم تھی۔

ان آوازوں سے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے کسی شہنشاہ کے دربار کی دُور گھٹا چلنے کی مشین سے دھبے دھبے گزارا جا رہا ہو اور چونا اپنی دُور پر پڑنے والے دباؤ سے بلبل کر اوجھل اور پتختی آواز میں چلا رہا ہو۔

میرے چہرے کے تاثرات دیکھ کر ویرا کے لیے اپنی ناقابل فہم بات مشکل ہو گیا اور اس نے فوراً ہی فون بند کر دیا۔

”یہ کیا کیا کرتے؟“ میں نے غصیلے لہجے میں اس سے پوچھا۔ فون بند کرنے کے بعد وہ گھٹا کر ہنسی تھی۔

”اور کیا کرتی؟“ اس نے ہنسی کے دوران میں یہ وقت تمام کر دیا۔ ”تمہارے چہرے کے تاثرات سے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے تمہیں زبردستی کیسٹر آئل چلا دیا گیا ہو۔ ان آوازوں میں کیا خرابی تھی؟“

”کچھ بھی نہیں۔ مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے کسی چوہے کی دُور موڑی جاری ہو اور وہ درد و اذیت سے بلبل کر بری طرح چلا رہا ہو۔ وہ میرا اپنا رد عمل تھا جسے تم نظر انداز کر سکتی تھیں۔“

اس کی ہنسی ایک بیک تیز ہو گئی۔ میں حیرانی اور خاموشی کے ساتھ اسے دیکھتا رہا۔ اس کا دورہ قدرے کم ہوا تو وہ بولی۔ ”تمہارا اندازہ حیرت انگیز حد تک درست تھا۔ وہ چوہے کی ہی آواز تھی۔ یہ کواٹک فو کا کیسٹرنی سسٹم ہے۔ اس سے بے خبر لوگ اسے کسی قسم کا اشتداد سمجھ کر اگلے سیدھے جواب دینے شروع کر دیتے ہیں اور ان کے بولنے سے وہ کال خود بخود منقطع ہو جاتی ہے۔ ان بے مقصد آوازوں کے جواب میں خاموش رہا جائے تو کال خود بخود کواٹک فو کی سیکرٹری کو منتقل ہو جاتی ہے۔“

”لیکن تمہنے فون کیوں بند کر دیا جب کہ تم بالکل خاموش تھیں؟“ میں نے پوچھا۔ ”میں خاموش ضرور تھی لیکن تمہارا اگلا ہوا چہرہ دیکھ کر میرے

خودی شکر طاعتا جانا ہوگا۔

ان دونوں کی لمحہ پر لمحہ رنگ بدلتی ہوئی، وہ منتظر کن کر رہے تھے۔
آنکھیں غریب حیرت سے پیشانی پر چڑھی جاری تھیں۔ دیرانہ
کو انکھ پوچھے کرگ باران دیدہ کو حیرت انگیز طور پر شیشے میں اناکارا
تھا۔

”نہیں فادر!“ دیرانے ٹھٹھک کر اصرار کیا۔ ”بچھلے چند رپوں
میں تم اور بھی موٹے ہو گئے ہو گے۔ تمہارے لیے چنانچہ چھوٹا
ہے۔ یہ کام تو تمہارا کوئی پالتو کتا بھی کر سکتا ہے۔“

”تو ٹھیک کہتی ہے، میری بچی! آج کل میرا وزن پونے تین
پونڈ ہو رہا ہے۔ جب کرنے کے لیے کوئی کام ہی نہ ہو تو کوئی
شراب پی پی کر موٹا ہوتا رہتا ہے۔“

”ایسا نہ کہو، فادر!“ دیرانے کسی حلقہ خیر خواہ کی طرح زپ
کر اس کی بات کاٹ دی۔ ”میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ اس
علاقے میں سارا کام تم ہی چلا رہے ہو۔“

”ایک زمانہ تھا کہ کو انک فوجوان تھا۔“ اس کی آواز میں
حسرتیں سن آئیں۔ ”اس زمانے میں میں کینٹن کے گرد فوج
میں پھیلے ہوئے دیران گھانٹوں سے اپنی انگوٹھی موڑ لوٹ میں کیڑوں
چینیوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح بھر کر ہانگ کاٹک پھانتا تھا۔ ان

ہزاروں مفلس بھگنوؤں میں سے آج بہت سے لوگ کوڑھ
ہو چکے ہیں مگر وہ میرا احسان سنے ہیں کہ سخت ترین حفاظتی
انتظامات کے باوجود میں نے انہیں چین کی ٹھٹھک سے نکال کر ہانگ

کاٹک کی فضاؤں میں پھانتا تھا۔ میرا اصل دور وہی تھا۔ اب تو
میرا ذہن کام کرتا ہے جسم پڑے پڑے فرہ ہو رہا ہے۔ اچھے کارکن
مل جانے سے یہی ایک نقصان ہوتا ہے کہ آدمی بٹکا ہونے لگتا

ہے۔ اچھی ٹیم نہ ہو تو آدمی بھاگ بھاگ کر کاٹنا ہو جاتا ہے لیکن
اس کے دماغ کو ذمہ لگ جاتا ہے۔“

”تم ہمک رہے ہو، فادر!“ دیرا اس خوشخوار آئی مین سے
گستاخی کی حد تک بے تکلف تھی۔ ”میں کہہ رہی تھی کہ تمہیں
شکر طاعتا جانے کی ضرورت نہیں۔ مکاؤ سے کو لون تک خاصی کمی

مافیت ہے۔ اس ایک گھنٹے میں تم شراب کی آدمی بوتل پی سکتے
ہو۔ یہ کام تمہارا کوئی آدمی بھی کر سکتا ہے۔“

”نہیں!“ اس بار کو انک فوج کالج بوزھ بڑاگ کی غراہٹ
سے مشابہ تھا۔ ”میں نے تیری باتوں سے اندازہ کیا۔“ کہ تو نے
والوں کو میرا نام دے بیٹھی ہے۔ میں اپنے کسی آدمی کو اپنا نام

استعمال کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ اس عمر میں نام ہی
چلتا ہے۔ انہوں نے میرے نام کو بھی بٹکا دیا تو میں کہاں جاؤں گا؟
تیری مس تریا بھی کو میں خود مکاؤ لاؤں گا۔ تو نے یہ نہیں بتایا کہ

کہاں جیجی جانے کی؟“
”اسے سمجھنے کی بات تو بعد میں آئے گی، پہلا مسئلہ تمہارا
ہے۔“ دیرانے مکارانہ انداز میں مجھے آنکھ مار کر اچھیرنا

میں بڑا نہ سوچو۔ وہ ہم سب کا باپ ہے۔ وہ تمہیں اپنے سے دور رکھ
کر پال رہا ہے تو اس میں تمہاری بہتری ہے۔ تم میں بہت اور خود
اعتمادی پیدا ہو رہی ہے۔ اس کے سامنے میں وہ کر شاہی تم اتنا آگے
نہیں بڑھ سکتی تھیں۔“

دیرا انکی منت تک اس سے غفلتی اور ابھرتی رہی۔ کو انک فوج کا
رویہ کسی مشفق اور خیر خواہ بزرگ کا تھا۔ وہ مسلسل اسے سمجھاتا
رہا اور دلا سادتا رہا۔ جب وہ مشق غن خاصا طویل ہوئی تو آخر کار
کو انک فوج کو ہی پوچھنا پڑ گیا کہ دیرانے اسے کیوں یاد کیا تھا۔

”فادر! میری ایک سسلی کا معاملہ ہے۔“ دیرا اس وقت لاڈ
پیار میں بگڑی ہوئی کسی بچی کا انداز اختیار کر چکی تھی۔ ”وہ کچھ غلط
لوٹوں کے قبضے میں چلی گئی ہے۔ آج کسی بھی وقت ایک ہندی اسے
اپنے ساتھ لے کر ہانگ کاٹک پہنچنے والا ہے۔ میں چاہتی ہوں۔۔۔۔۔“

”میں سمجھ گیا۔“ کو انک فوج نے سرد اور سفاکانہ لہجے میں اس
کی بات کاٹ دی۔ ”مجھے بس لڑکی کا نام اور ٹیلیہ بتا دو۔ اگلے ایک
مہینے تک اس نام اور ٹیلیہ کی لڑکی کو لون انرپورٹ سے نہیں نکل
سکے گی۔ میرے آدمی اسے وہیں اپنی تحویل میں لے لیں گے اور
اسے لانے والے کی لاش کا قیمہ بنا کر سمندر میں پھینک دیں
گے۔“

”نہیں فادر! یہ اتنا لمبا کام نہیں ہے۔“ دیرانے فخر آمیز
نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ ”وہ
آدمی دوستوں میں سے ہے۔ وہ دونوں آج رات کسی بھی وقت

آئیں گے۔ تم کو لون کے شکر طاعتا کا آٹھ سوئیں نمبر کمر اس تریا بھی
کے نام تک کرادو۔ وہ دونوں انرپورٹ سے وہیں آئیں گے۔ تمہارا
کوئی بھی آدمی تمہارے نام سے ان سے ملے گا تو وہ تمہارے ساتھ

ہو لیں گے۔ شرم سا جوئی کے گھاٹ سے تم انہیں دوسری طرف وان
چائی کے گھاٹ پر لے جانا جہاں تمہاری اسپڈ بولس ہر وقت موجود
رہتی ہیں۔ ہانگ کاٹک کی بحری پولیس کے خطرے کی وجہ سے وہ

آدمی مکاؤ تک تمہارے ساتھ آئے گا۔ اپنی سلطنت میں پہنچنے کے
بعد تم لڑکی کو روک کر مرد کو آزاد کر دینا۔ وہ اپنی راہ خود تلاش
کر لے گا۔“

اسپیکر فون پر کو انک فوج کی بلند آہنگ ہنسی گونجنے لگی۔ اسی بے
ہتیم ہنسی کے دوران وہ بولا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ تو ابھی تک
ہانگ کاٹک کو نہیں بھولی۔ تجھے یہاں کا ہر گھر گھاٹ اچھی طرح یاد

ہے۔ دان چائی میں میرا گھاٹ اب بھی برقرار ہے۔ لنگرا ہاؤ اسے
چلاتا ہے۔ نظارہ سیاخوں کو سمندری تفریح کے لیے کرائے پر
بولس فراہم کرتا ہے لیکن اندر خانے اصل کام بھی چلا رہا ہے۔

لوک ہارٹ روڈ پر دونوں ٹائٹ کلب بھی پرانی جگہ سے چل رہے
ہیں۔ وہاں امرک موک دیکھ بھال کرتا ہے کیونکہ مس چوائے کو دو
سال پہلے فوج نے معذور کر دیا تھا۔ لیکن تیرے کام کے لیے مجھے

کی سی ہے جو پوری دنیا کو اپنے باپ کی جاگیر سمجھتا ہے۔ اسے اپنی اصلیت اور حقیقت کا اندازہ اسی وقت ہوتا ہے جب کوئی برکا ہوا راہ گیر اس کی پسیلوں میں پوری قوت سے ٹھوکر رسید کرتا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ آج یہ کام تم نے کیا ہے۔ تمہاری لگائی ہوئی ٹھوکر مجھے مدتوں تک اپنی اصلیت کی یاد دلاتی رہے گی۔ میں اپنی ذات میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ جو کچھ ہوں وہ اپنے باپ کے فضیل ہوں۔

”اپنی اصل کو کبھی نہیں بھولنا چاہئے۔ اس بار کو ایک فو کا رد عمل جذباتی نہیں تھا۔ تم حراسی ہو یا حلالیہ۔ یہ میرا اور تمہارا معاملہ نہیں کیونکہ اس پر ہم دونوں کا کوئی بس نہیں تھا۔ یہ معاملہ تمہارے ماں باپ کے درمیان تھا۔ میرے لئے ساری اہمیت اس بات کی ہے کہ تم پُراگنی مین کی بیٹی ہونے کی دعوے دار ہو اور وہ تمہارے اس دعوے کی تائید کرتا ہے نہ تصدیق۔ اس کا مطلب ہے کہ بظاہر تم ہی ہو۔ اسی اعتبار کی بنا پر میں نے تم کو اپنی بیٹی بنایا اور سمجھا ہے۔ یہ میرا کوئی احسان نہیں ہے۔ اس میں میری اپنی غرض مندی بھی شامل ہے۔ پُراگنی مین ہمیشہ زندہ نہیں رہے گا۔ اسے بھی اپنے عقیدے کے مطابق دفن ہونا ہے یا اس کی لاش پر مردار خوروں کی ضیافت ہوگی۔ پھر اس کی جگہ تم سنبھالو گی۔ اگر تم سے میری اچھی ریم وراہ رہی تو میں اپنے آخری وقت تک عزت اور وقار کے ساتھ زندہ رہوں گا۔ تم سے نہ بن سکی تو آخری عمر میں مجھے ہزاروں حسرتوں اور محرومیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔“

”یہاں نہیں ہو گا فادرا!“ ویرا نے اس بار جذبات سے عاری اور سخت لہجے میں کہا۔ ”تم نے مجھے مشروط طور پر بیٹی بنایا ہے لیکن میں نے اپنی کسی غرض کے بغیر تمہیں اپنا فادرا تسلیم کیا تھا۔ تمہیں اپنے الفاظ پر قائم رہنے یا نہ رہنے کی پوری آزادی ہے لیکن مجھے تم ہمیشہ اپنی بیٹی ہی بننا پڑے گا۔“

”تم عقل سے بیکر عاری ہو۔“ اسپیکر فون پر کو ایک فو کی غصیلی آواز ابھری۔ ”تم بات کا جتنگر رہا ہو۔ سیدھی سادی رشتوں کی بات بھی جسے تم الجھاری ہو۔ ہر حال اب کچھ بھی ہو تمہاری مس ترپاشی کل تک کراچی پہنچا دی جائے گی۔“

”فادرا!“ ویرا نے بجموج اور مضعل لہجے میں کہا۔ ”یہ بھی میری کوئی بدایت نہیں، ایک التجا ہے۔ تم چاہو تو میری اس فرمائش کو اب بھی ٹھکرا سکتے ہو۔“

”تم شاید پاگل ہو گئی ہو۔ میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ اس لڑکی کو مکاؤ لانے کے لئے، میں خود کو لون جاؤں گا۔ تمہاری یہ خواہش میرے لئے ایک امانت بن چکی ہے۔“

”میں اس تعاون پر یہ دل سے تمہاری شکر گزار ہوں۔“ ویرا نے گھاس سے ایک لمبا ٹھونٹ لینے کے بعد بھڑائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”اگر میری کسی بات سے تمہاری دل آزاری ہوئی ہو تو میں پورے خلوص کے ساتھ معافی چاہتی ہوں۔ راصل قصور میرا ہی تھا کہ میں اپنی خوبیوں اور صلاحیتوں پر ناز کرتی رہی۔ میں بھول گئی

کہ میں انیس فون کر کے نام تبدیل کیے دیتی ہوں تاکہ تمہیں مکاؤ نہ لگانا پڑے۔“

”مجھے غصہ مت دلا میری بیٹی!“ کو ایک فو کی غصیلی آواز بھی مت آمیز تھی۔ ”تو جو کچھ کہہ چکی ہے، وہ اٹل ہے۔ تجھے میری بڑھی ہوئی ہوئی پڑیوں پر بھروسہ نہ ہو تو اور بات ہے ورنہ میں یہ کام خود کروں گا۔ باپ اپنی بیٹیوں کے کام نہ آئیں تو لکھدھ بھی ان کی لاشوں کو نوچنے سے شرماتے ہیں۔“

”فادرا!“ اس بار ویرا کی زبان سے اضطرابی نغوا ابھرا تھا۔ ”کاش تم اپنی یہ بات میرے اصل باپ کو بھی سنانے کی ہمت کر سکتی۔ میری پوری عمر ایسے ہی کسی سانسے اور سانسبان کی تلاش میں گزری ہے۔ میرے لئے تمہاری ذات ایک مقدس سانسے اور سانسے کی طرح ہے۔“

”میری باتوں میں پُراگنی مین کا عکس دیکھنے کی کوشش نہ کرو۔“ کو ایک فو کی آواز یک بیک سخت اور بے رحمانہ ہو گئی۔ ”برفانی چٹانوں پر سورج کی کرنوں کا پُرجلال رقص دیکھنے والی آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں۔ مجھے اس برتر ذات سے نہ مکاؤ۔ میں تمہاری عزت صرف اس لئے کرتا ہوں کہ تم نے اسی کے نطفے سے جنم لیا ہے۔ ورنہ تم سے بھی کم عمر کی لڑکیاں دن رات میری خدمت کرتی ہیں۔“

کو ایک فو کا وہ تبصرہ بہت خوفناک اور زہرہ گداز تھا۔ ویرا سے کئی ماہوں تک اس کا کوئی جواب نہیں بن پڑا اور وہ حیرت سے دیے ہماڑے مجھے دیکھتی رہ گئی۔

”ٹھیک ہے فادرا!“ طویل سکوت کے بعد ویرا نے کہا۔ ”جو تم چاہے ہو، اب دبی ہو گا۔ مکاؤ سے مس ترپاشی کو جلد از جلد پاکستان پہنچانا ہے۔“

”پاکستان؟“ کو ایک فو کی آواز تھیر آمیز تھی۔ ”یہ وہی ملک تو نہیں جو ہجرت کی جڑیں سے ذرا مشرق وسطیٰ کی طرف نکلا ہوا ہے؟“

”تم ٹھیک سمجھے ہو۔“ ویرا نے سیاہ لہجے میں کہا۔ ”لڑکی کو اس ملک کے ساحلی شہر کراچی میں پہنچانا ہے۔“

”اسے وہاں کس کے حوالے کیا جائے گا؟ وہاں میرا کبر خان تیار آوی ہے۔“

”میرا کبر کو بھول جاؤ۔ وہ مارا جا چکا ہے۔“ ویرا نے مجھ پر طالت آمیز نگاہیں ڈالتے ہوئے کہا۔ ”وہ لڑکی ایک بار کراچی پہنچ جائے تو اپنی راہ خود تلاش کر لے گی۔“

”شاید میری کوئی بات تمہیں بری لگ گئی ہے۔“ ویرا کے لہجے کی سہمہری کو محسوس کرتے ہوئے خرافت کو ایک فونے فوراً ہی سوال مانا گیا۔

”نہیں فادرا! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ ویرا کا لہجہ بدستور محکم تھا۔ ”میری حالت تو راہ میں پڑے ہوئے ایک ایسے شرابی

”تمہیں اس سے اتنی زیادہ بات کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔۔۔“ میں نے کہنا چاہا لیکن ویرانے مجھے اپنی بات مکمل کر سکا موقع دے بغیر لوٹنا شروع کر دیا۔

”میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں۔ طویل تھقل کے بعد مزید کام کی بات نامناسب ہوتی۔ تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ میں نے اسے بہت چالاکی کے ساتھ گھیرا ہے۔ غزالہ کا معاملہ وہ اپنے کام کے حوالے کر دیتا تو وہ سب ہی ہانگ کا ٹنگ کی جڑی پولیس کے ہتھے چڑھ سکتے تھے۔ کوئی غزالہ اور بارہ سوخ کوئی ہے اسے ہر ایک افسر اچھی طرح جانتا ہے اور اس کا لحاظ بھی کیا جاتا ہے۔ بعض بزدل افسران تو اپنی جان کے خوف سے اس کی راہ میں حائل ہونے سے بھی کتراتے ہیں۔“

”تمہاری یہ منطق میری سمجھ میں نہیں آئی کہ تم نے اسے کیسے گھیرا ہے؟“ میں نے سوال کیا۔ ”اس نے تو خود ہی کھول جانے کی پیشکش کی تھی۔ اس میں تمہاری کون سی چالاکی پنہاں تھی؟“

”میں نے شری مان سنگھ کو دانت کوئی فو کا نام دیا تھا۔ اس وقت بھی جانتی تھی کہ کوئی فو اپنے نام سے کسی اور کو تیر جانے دے گا۔ وہ اپنی ساکھ کا بہت خیال رکھتا ہے۔ اس کے آواز بلیک ڈرنگین کے نام سے آپرٹ کرتے ہیں اور ان کا ایک مخصوص شناختی نشان ہوتا ہے۔ میں نے ابتدا ہی سے یہ خیال رکھا تھا کہ خود غزالہ کا معاملہ سنبھالے۔ تمہارے لئے میں اس سے زیادہ کام نہیں کر سکتی تھی۔“

”میں اس تعاون پر تمہارا احسان مند رہوں گا لیکن یہ بات بھی یاد رہنی چاہئے کہ غزالہ کا مسئلہ تمہارا ہی پیدا کیا ہوا ہے تم خود ہی سلجھا رہی ہو۔ سب سے زیادہ اطمینان اور خوشی کی بات ہے کہ شری مان سنگھ نے تمہارے ساتھ کوئی چال بازی کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ شرافت کے ساتھ تمہاری ہر بات کو ماننا چاہا۔ اس نے یہ بھی تسلیم کر لیا کہ تمہارے بارے میں اس پر غلط دیا تھا۔“

”سفارتی جرائم میں صورت حال اور ترجیحات بہت تیزی سے ساتھ بدلتی ہیں۔“ ویرا بولی۔ ”اس کے مقابلہ میں روئے سے مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے انہیں ایک بار پھر شی سے مدد لینے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ شری مان سنگھ نے اسی وجہ سے شرافت کا مظاہرہ کیا ہو۔“

”ایک بار غزالہ کراچی آجائے تو پھر میں ایک ایک کر کے سب کو دیکھ لوں گا۔“ میں نے اپنے گھاس سے آخری ٹھونٹ اپنے معدے میں خٹل کرتے ہوئے تلخ ہنسنے میں کہا۔

”وہ بعد کی بات ہے۔“ اس نے میری کمرے کے گرد ہاتھ ڈالنے ہوئے نرمی سے کہا۔ ”انگلے چوبیس گھنٹوں میں غزالہ واپس آنے والی ہے۔ پھر اس کے استقبال کی مشق بھی کر لو۔ ایسا نہ ہو کہ کچھ

کچھ کی میرے اوپر تمہاری تمام مہربانیاں میرے باپ کی وجہ سے تھیں۔ تمہارے مکمل میں اپنے سے کم خوبصورت لڑکیوں کو تمہارے پلوں میں دیکھ کر ہی مجھے سمجھ لیتا چاہئے تھا کہ تم مجھے اس فوج میں شامل کرنے کے بجائے جینی بارے ہو تو اس کا کوئی گہرا اور خفیہ سبب ہو گا۔ وہ سبب مبالغہ نہ ہو تا تو تمہارا ذوق مجھے جینی کے بجائے جینی محبوبی ہی قرار دیتا۔“

”ہیں! اب خاموش ہو جاؤ۔“ کوئی فو کی آواز میں قدرے درشتی سے گونج کر آئی۔ ”تم جو ان لڑکیوں میں سب سے بڑی خرابی مانی جاتی ہے کہ تم اپنے خوابوں کے جزیروں میں رہنا چاہتی ہو اور اگر کوئی ہمدرد تمہیں حقیقت کا آئینہ دکھائے تو اس سے ناراض ہو جاتی ہو۔ میں اگر ہمدرد اور قیاس آرائیوں پر یقین نہیں رکھتا، اٹل حقیقتیں پر چلتا ہوں۔ مجھے تم ہمیشہ ایک باپ کی طرح نرم اور مہربان پاؤں کی یاد ہے۔ کوئی فو اپنے قول سے کبھی نہیں پھرتا۔“

”ٹھیک ہے فادر! پھر میں کراچی میں لڑکی کا انتظار کر دوں گی۔“ ویرانے کہا۔ میں نے اسے گھور کر اس خفیہ کو مزید طول دینے سے روک دیا تھا۔

”میں ابھی کولون کے لئے نکلتا ہوں۔ یہ نہ سمجھنا کہ اس وقت کوئی نرم گرم بات تمہارے کام پر اثر انداز ہوگی۔ میں نے مکمل دل سے تم سے بات کی ہے اور میرے دل میں کوئی رجحان نہیں ہے؟“ ”شکریہ فادر۔“ ویرانے آہستہ سے کہا۔ ”وہی جھٹکے سے سنبھلنے کے بعد میں بھی سب کچھ بھول بھال کر نارمل ہو جاؤں گی۔ تم میرے مزاج سے بہت اچھی طرح واقف ہو۔“

”مکھنکو کا سلسلہ منقطع ہونے پر ویرا میری طرف متوجہ ہو گئی۔“ ”تم نے دیکھ لیا کہ جی لائیو کیسے جانناؤں کے ذریعے دنیا پر حکمرانی کر رہا ہے۔ یہ لوگ سوتے ہوئے بھی اس کی برتری اور عظمت کے خواب دیکھتے ہوں گے۔“

”اس کی ہر بات درست اور سچ تھی۔ وہ جس کا کھانا ہے، اسی کے گھر میں گاتا ہے۔ تمہیں اس کی کسی بات کا برا نہیں ماننا چاہئے تھا۔ اس جیسا جیسا اور نیا بد معاش اگر تم جیسی حسین و جمیل دوشیزہ کو چھانسنے سے گریز کرتا ہے تو اس کے بہت قوی محرکات ہونے ضروری ہیں۔۔۔“

ویرا زور سے ہنس پڑی۔ ”اب تم مجھے بیکچر دو گے۔ میں پہلے دن سے ہر بات جانتی ہوں۔ میں تو اس سے یوں ہی کھیل رہی تھی۔ بس اس کی ایک بات ہی میرے دل کو لگی تھی جس پر میں لمحہ بھر کے لئے جذباتی ہو گئی تھی ورنہ یہ سب میری ہی تلی اداکاری تھی۔۔۔“ ”اس کی کس بات کا ذکر کر رہی ہو؟“ میں نے اس کا فقرہ درمیان سے ایک کر سوال کیا۔

”وہی جو بیٹیوں کے کام نہ آنے والے باپوں کے بارے میں تھی۔ کوئی فو کے الفاظ نے مجھے اندر تک سے بھینچ ڈرے کا تو ہو کر دیا تھا۔ اب تم سمجھ لو کہ میں نے کس طرح خود کو سنبھالا ہو گا۔“

وقت پر ہمیں بھولا ہوا کوئی بھی سبق یاد نہ آئے اور وہ ہمیں کوس کر رہے تھے۔

”تم نہیں ایجز جیسی بے تابی اور بے قراری کا مظاہرہ کر رہی ہو۔“ میں نے خاصی قوت سے مزاحمت کرتے ہوئے کہا۔ ”جب تم رات کو یہاں ٹھہرنے کا فیصلہ ہی کر چکی ہو تو صبر سے کام لو۔ ابھی شری مان سنگھ کو فون کرنا ہے تھوڑی دیر بعد سلطان شاہ بھی لوٹ آئے گا۔ ہمیں اس کے سامنے مذہب رہنا ہو گا ورنہ اسے مذاق اڑانے کا موقع مل جائے گا۔“

”کیا یہ ممکن نہیں کہ تم کسی بہانے سے آج رات کے لئے اسے باہر ٹال دو۔ ایک ہی پھت کے نیچے اس کی موجودگی کا احساس میرے موذ کو غارت کر کے رکھ دے گا۔ میرا خیال ہے کہ ایسے معاملات میں تم بھی اس سے دبے ہو۔“

”مشرق میں اسے باہمی لحاظ اور مروت کما جاتا ہے ورنہ کوئی کسی کو ہاتھ تمام کر نہیں روک سکتا۔“

”لحاظ اور مروت کی باتیں مجھے نہ سناؤ۔ میں نے زندگی کو بہت قریب سے اور اس کے گھناؤنے روپ میں دیکھا ہے۔ شاید تم یقین نہ کرو لیکن میں نے تمہارے ہی ملک کے ایک باپ اور اس کے بیٹے کو دہش کے ایک ہوٹل میں عجیب حال میں دیکھا تھا۔ پیسے بچانے کے لئے وہ دونوں ایک ہی کمرے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ باپ کمرے میں ایک عورت کے ساتھ واڈو عیش دے رہا تھا اور بیٹا نیچے بار میں دھکی لپی کر بے تابی سے اپنے باپ کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔“

”تو اس میں کون سی خرابی ہے؟ وہ کمرے میں کھٹ لے کر تو نہیں سو سکتا تھا۔ اسے لا محالہ اپنے باپ کے واپس لوٹنے کا انتظار کرنا تھا۔ تم بعض اوقات بے سرو پا باتوں کے انسانی بتا لیتی ہو۔“

”تم دانستہ میری بات کو سمجھنے سے گریز کر رہے ہو۔“ وہ مجھے گھورتے ہوئے تیزی سے بولی۔ ”بات عورت کی واپسی کی نہیں بلکہ باپ کی واپسی کی تھی کیونکہ باپ کے بعد بیٹے کو اس خاتون سے ملاقات کرنی تھی۔ کمرے کی طرح عورت میں بھی مصروف داری کر کے وہ بچت کر رہے تھے تاکہ زیادہ دنوں تک عیش کر سکیں۔“

”اور انہوں نے خود ہی ہمیں یہ سب بتا دیا؟“ میں نے اس کا مضحکہ اڑاتے ہوئے پوچھا۔

”انہوں نے نہیں بلکہ صرف لڑکے نے۔“ اس نے غصے میں کہا۔ ”میں ہمیں بتا چکی ہوں کہ لڑکا انتظار اور اضطراب کے عالم میں بارش مینڈا دھکی لپی رہا تھا۔ اکل میں ہزاروں خرابیاں ہوں تو ہوں مگر ایک اچھائی یہ ہے کہ یہ انسان کوچ بولنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ وہ لڑکا اپنے اعتراف پر ذرا بھی شرمسار نہیں تھا۔ اسے فخر تھا کہ اس کے اپنے باپ سے دوستانہ مراسم ہیں۔ اب بتاؤ کہ اسے مشرق میں کیا کہتے ہیں؟“

”یہ مکمل ہوئی بے شری اور بے حیائی ہے۔ ایسے مستحیات

ہر علاقے میں ہوتے ہیں۔ ان کو معیار نہیں بنایا جاسکتا۔ یہ سب ہے کہ تم نے اس لڑکے کی کٹھانے یا سمجھنے میں کوئی غلطی ہوئی ہوگی۔“

”بات سننے اور سمجھنے سے آگے تک مٹی تھی۔ مجھے اس میں دلچسپی اور سنسنی محسوس ہوئی اور میں وہاں بیٹھی رہی۔ وہ اپنی رست رست واپس اور بار کے دروازے پر نظریں دوڑاتا رہا جوں ہی اسے بار کے دروازے پر اپنے باپ کی شکل نظر آئی تقریباً دوڑا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ بار میں ہر جگہ بنگے ہوئے براجمان تھے لہذا وہ شخص اپنے بیٹے کے خالی کیے ہوئے اسٹول میرے قریب آ بیٹھا۔ اس کے چہرے پر سکون اور آسودگی کا تھا۔ تم چاہو تو میں ہمیں ان دونوں کے نام بھی بتا سکتی ہوں۔ چہرے یا چہرے کے لمبوسات کی صنعت میں ایک نمایاں مقام ہے۔ وہ کوئی کرے پڑے اور مظلوم احوال سیاح نہیں تھے۔“

اس کے باتوں میں مصروف ہو جانے کی وجہ سے میں اس جارحانہ حرکتوں سے بچا ہوا تھا جب کہ شری مان سنگھ کو فون کر میں تھوڑی سی دیر تھی اس لیے میں نے بے یقینی سے کہا ”میرے لیے تمہاری باتیں ناقابل فہم ہیں“ ویسے تم خود جانتی ہو کہ مشرق مغرب کی سماجی اور معاشرتی اقدار میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔“

”میں فرق کو تسلیم کرتی ہوں لیکن ہمیں ماننا پڑے کہ مغرب کے مقابلے میں مشرق میں دوغلا پن زیادہ پایا جاتا ہے۔ کو چھپا کر کیا جاتا ہے ورنہ ہر ایک پار سائیا پھرنا ہے۔“

”ہو سکتا ہے کہ تمہارا تجزیہ درست ہو، میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“

”اب آگے سنو!“ اس نے نئی سگریٹ سلاکتے ہوئے کہا۔ ”باپ نے اسٹول منہلاتے ہی ٹائمر کا جوس طلب کیا تو میں حیرت سے اسے دیکھا اور پوچھا کہ وہ جوس پر اکتفا کیوں کر رہا؟ اس نے بتایا کہ اکل اس کے گھر میں حرام ہے اور میں صحت دیکھتی رہ گئی۔“

”تم نے دنیا جہان کے سارے تضادات ان ہی دونوں منسوب کر دیے ہیں۔ پتا نہیں اپنی ان بے سرو پا باتوں سے ثابت کرنا چاہ رہی ہو؟“ میں نے قدرے چڑچڑے پن کی آواز کرتے ہوئے کہا۔

خاصی طویل بحث اور تکرار چھڑ گئی۔ جب ویرانے ان کے نام لیے تو مجھے شدید ذہنی جھٹکا لگا کیونکہ صنعت اور تجارت وابستہ نہ ہونے کے باوجود میں ان ناموں سے آشنا تھا۔ اسی دوران میں ایک گھنٹے کا مقررہ وقت پورا ہو گیا۔ شری مان سنگھ کا نمبر ملانے لگی۔

”سارا بندوبست ہو گیا ہے۔“ ویرا کی آواز پہنچنے لگی۔ ”مان سنگھ نے حوصلہ افزا لہجے میں کہا ”وہ دونوں مشرور

تھا۔ جیسا یوں وغیرہ کی بھاری کھپ لانے والی لالچ رنگے ہاتھوں پکڑی گئی تھی جب کہ وہ لوگ سندھ میں مکمل تباہی پھیلانے کی تیاریاں مکمل کر چکے تھے ان کی دانست میں چتا تیار تھی اور اس پر تل چمک کر دیا سلائی دکھانے کی دیر تھی۔ اس لیے وہ لوگ کسی قبائل منصوبے پر اپنے کام کا آغاز کر سکتے تھے تاکہ ملا سرکار کے حاسیوں کے بکھرنے سے پہلے ہی ان کی موثر قوت سے بھرپور فائدہ اٹھا کر سندھ میں آگ اور خون کی ہولی شروع کرائی جاسکے۔

وہ معاملات کا ایک ایسا رخ تھا جس پر بعد میں بھی غور کیا جاسکتا تھا۔ فوری اہمیت غزالہ کی آزادی کی تھی۔ بظاہر ہمارے پاس کافی وقت تھا اور مجھے پوری امید تھی کہ ویرا کے روانہ ہونے سے پہلے ہی غزالہ ہانگ ہانگ میں کوٹنگ میں کوئی تحویل میں آجکی ہوگی جب کہ کوٹنگ کو اپنے قول کا دھنی معلوم ہوتا تھا۔ مجھے اس امر میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ غزالہ ایک بار اس کے قبضے میں آگئی تو وہ اسے پاکستان بھیجنے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کرے گا۔

وہ سارے معاملات ویرا نے طے کیے تھے شری مان سنگھ اس سے دبا ہوا تھا۔ کوٹنگ کو اس سے بھرپور تعاون پر آمادہ تھا اس لیے میری دلی خواہش تھی کہ غزالہ سے متعلق مسائل ویرا کی موجودگی ہی میں حل ہو جائیں تاکہ کسی دیر سویر کی صورت میں وہ ان دونوں سے رابطہ کر سکے۔ اس کے چلے جانے کے بعد وہ سولت ختم ہو جاتی۔ میری طرف سے کی جانے والی کوئی بھی پیش قدمی حالات کو خطرناک حد تک بگاڑ سکتی تھی اس لیے میرے پاس انتظار کرنے کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ ہوتا۔ جب کہ دوسری طرف بلو کر اس ذیل کا معاملہ ایک تیز دھار تلوار کی طرح ہمارے سروں پر مسلط تھا۔ میری خواہش تھی کہ ویرا وقت ضائع کیے بغیر ایران کی طرف روانہ ہو جائے لیکن اس نے اپنی ضد کی وجہ سے میرے پاس شب بھری کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ابتدا میں مجھے اس کا وہ فیصلہ گراں گزرا تھا لیکن بعد میں جس طرح ویرا کی مداخلت سے غزالہ کی بازیابی کے آثار پیدا ہوئے اس کی بنا پر مجھے اس کا رکارڈ جانا بہتر نظر آنے لگا تھا۔

”سلطان شاہ کو بھگانے کے بارے میں کیا سوچا ہے تم نے؟“ مجھے اپنے خیالات کی روش میں متفق پاکر ویرا نے مجھے شوق دیتے ہوئے سوال کیا۔

”اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔“ میں نے فوری ہمانہ بنایا۔ ”میں اسے سمجھا بھاکر کسی نہ کسی طرح ٹال سکتا ہوں لیکن تمہاری موجودگی میں اس کا رویہ خاصا جارحانہ ہو جاتا ہے۔ اس کے ذہن میں پہلا خیال یہی آئے گا کہ تمہارے آجانے کی وجہ سے میں اس سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کر رہا ہوں۔“

”پھر تم کیا چاہتے ہو؟“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک بیک شکوک و شبہات کے سائے لہانے لگے تھے۔

نفاذی کے ہاتھوں سے سڑ کر کس گمے نئی دہلی سے وہ بنگال اور دہلی سے ایک کانگ جائیں گے۔ میرا اندازہ ہے کہ انہیں کچھ زیادہ وقت مل جائے گا۔“

”تبدیلی مجھے پسند نہیں آئی۔“ ویرا نے خشک لہجے میں کہا۔ ”میں نے جنہیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ میرے لیے وقت کا معاملہ بہت اہم ہے۔ اب مجھے آگے تک تبدیلیاں کرنی پڑیں گی۔ ان دونوں کی منتظر کے لیے شیڈول پروازوں پر انحصار کرنے کے بجائے تم کوئی چارہ چار چار بھی کر سکتے تھے۔“

”ہمارے یہاں جہاز چارٹر کرنے کی سہولتیں موجود نہیں ہیں۔“ اس کی معذرت خواہانہ آواز ابھری ”کسی سرکاری ادارے سے جہاز مستعار لینے میں بھی خاصا وقت صرف ہوتا اس لیے میں مجبور تھا۔ میرے لیے وقت کو مزید کم کرنا ممکن نہیں تھا۔ وقت بچانے کے لیے ان دونوں کو بنگال کے راستے بھیجا جا رہا ہے کیونکہ ایک کانگ کے لیے براہ راست پرواز علی الصبح سے پہلے دستیاب نہیں ہے۔ میں زحمت کے لیے معذرت خواہ ہوں۔“

”ٹھیک ہے ہمارے آئندہ کے تعلقات کا انحصار اس ذیل کی کامیابی پر ہوگا۔“

”تم مجھے اپنا نمبر دے سکو تو میں تمہیں ذیل مکمل ہوتے ہی اطلاع دے دوں گا۔“

”میں چند مجریوں کی وجہ سے اپنا فون نمبر نہیں دے سکتی۔ تمہارے آؤ کی کارکردگی کی اطلاع مجھے براہ راست ہانگ کانگ سے مل جائے گی۔ وہاں میرے بہت مضبوط روابط ہیں۔“

”دراصل اس کے علاوہ بھی کچھ ضروریات ہیں۔ یہاں ہمارا ایک سیکرٹ ایجنٹ کافی دنوں سے لاپتا ہے۔ نئی دہلی سے بھی کچھ گفتاوت آ رہے ہیں۔ ان معاملات میں میں تم سے مدد لینا چاہتا ہوں۔“

ویرا کے ہونٹوں پر معنی خیز تبسم پھیل گیا ”لڑکی واپس آجائے تو ہم دو چار روز میں خود تم کو فون کر لوں گی لیکن تم میرے بارے میں پوچھنے والے باؤ کا سامنا کیسے کر سکو گے؟“

”تمہاری ہر ذیل اب فغیر رہے گی۔ تفصیل میں بعد میں بتاؤں گا۔“ اس نے کہا۔

”ٹھیک ہے پھر اب چند دنوں بعد بات ہوگی۔“ ویرا نے کہا اور میں باکر فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

آخر کار کالی تھیلے سے باہر آئی گئی تھی۔ ان لوگوں کو ملا سرکار کے لپٹا ہونے سے بدترین تشویش اور پریشانی لاحق ہو چکی تھی اور اس کی تلاش کے سلسلے میں ہر ممکن ذریعے سے مدد لینے پر تل گئے تھے اس فہرست میں ویرا کا نام بھی تھا۔ اس نے نئی دہلی سے جن گفتاوت کی آمد کا ذکر کیا تھا ان کی نوعیت کے بارے میں بھی میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ ان میں کیا ہوگا۔

نصوہ میں ملا سرکار کا مشن بدترین ناکامی سے دوچار ہو چکا

مبارک ہو۔ بخوبی مجرموں سے کوئی بات بعید نہیں ہوئی۔ مجھے کہ کہیں بچے کو ہلاک نہ کر دیا گیا ہو۔

”بچہ اپنی ماں کے پاس ہے اور حیرت ناک سرعت سے اس کا ذہنی توازن سنبھل رہا ہے۔“ میں نے اس کی دلجوئی سے اندھیرے میں تیر پھینکا حال کا مجھے جفاگیر یا سلفی سے نہ فرصت ہی نہیں مل سکتی تھی۔

”اور اس قہقہہ کنگ کا کیا پتا؟“ اس وقت ظفر بہت اچھے میں معلوم ہو رہا تھا۔

”اسی کے سلسلے میں بھاگ دوڑ جاری ہے۔ شاید جلد ہی نرہا ہوا آجائے۔“ میں نے اس قہقہہ کی مدد میں اس سے جواب دیا۔

”اب تم فوری طور پر یہاں آ جاؤ۔ میرے پاس تمہارے ایک بہت بڑی خبر ہے۔“

”کس بارے میں؟“ میں نے تجسس لیے میں دریافت کیا۔

”غلام رسول کے سلسلے میں سرکاری طور پر تمہیں دس روپے کا نقد انعام دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اسی سلسلے میں مجھے کاغذات تیار کرنے ہیں جو تمہارے آئے بغیر مکمل نہیں ہو سکتے۔“

”تم میری پوزیشن اور مجبوریوں سے اچھی طرح واقف ہو۔ میں نے معذرت آئیز لیے میں کما“ میں کسی بھی صورت میں انعام نہیں لے سکوں گا۔ میں نے جو کچھ کیا، انعام کے لیے کم بلکہ اپنا فرض سمجھ کر کیا ہے۔“

”تم فکر نہ کرو۔ تمہارا سبھی کر دیا جائے گا۔ نہ تمہاری خبر ہوگی۔ یہ بہت بڑا کام ہوا ہے۔ ہر طرف اس کارنامے کی دعوت ہوئی ہے مگر تمہارا نام ابھی تک سینٹر راز میں ہے۔ اخبارات وہی کچھ چھپا ہے جو ہم نے انہیں فراہم کیا ہے، اس سے آگے قیاسات چل رہے ہیں۔“

”ان کاغذات میں میری جگہ اپنے کسی اچھے ماتحت کا نام دو!“ میں نے لجاجت کے ساتھ کہا۔ ”تمہیں اندازہ نہیں کہ میں لوگوں میں گھرا ہوا ہوں۔ کسی کو اس بات کی جھک بھی ملے گی۔“

غلام رسول کی تباہی میں میرا ہاتھ تھا تو ہر طرف میرے دشمن ہو جائیں گے۔“

”انہیں ہم دیکھ لیں گے۔“ اس نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔

”تمہارے آدمی شب و روز میری حفاظت نہیں کرتے۔ لوگ ناویدہ سایوں کی طرح اپنے شکار کا پیچھا کرتے ہیں۔ ساتھ کسی مناسب موقع کا انتظار کرتے ہیں اور پھر اچانک ملک واد کر کے روپوش ہو جاتے ہیں۔“

”اچھا، تم یہاں آ جاؤ، پھر ہم دیکھیں گے کہ کیا کرنا چاہیے۔“ اس کی آواز نظر آئیز ہو گئی۔

”شاید میں آج نہ آ سکوں۔ اس کے لیے میں معذرت

”اس وقت ساڑھے تین بجے ہیں۔“ میں نے اپنی رست و اوج پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ ”تم سلطان شاہ کی واپسی سے پہلے بازار وغیرہ کی طرف نکل جاؤ۔ میں سلطان شاہ کو یہ پتاؤں گا کہ تم واپس جا چکی ہو لیکن کوئی بندوبست نہ ہونے کی صورت میں تمہاری واپسی کا امکان بھی ہے۔ میں اسے سمجھا دوں گا کہ تمہاری واپسی کی صورت میں تم پر ڈورے ڈالنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اس لیے تمہیں دیکھتے ہی وہ فلیٹ سے نکل جائے۔ صبح وہ واپس آئے گا تو میں اسے تمہارے ذریعے غزالہ کی واپسی کی خوش خبری سنا دوں گا اور وہ خوش ہو جائے گا۔“

”خدا کی پناہ، ڈینی!“ وہ آنکھیں پھیلا کر حیرت سے بولی ”تم کس قدر چالاک اور مکار ہو کہ اپنے بھری دوست کے لیے ایک ایسی کمائی سوچ بیٹھے ہو کہ وہ بھول کر بھی تمہاری نیت پر شبہ نہیں کر سکے گا۔“

”اس وقت میری لگام تمہارے ہاتھ میں ہے۔“ میں نے نفعت آئیز نہی کے ساتھ کہا ”تمہارے سائے میں اگر ہر شخص شیطان کا چیلان بن سکتا ہے۔“

”اچھا، تو میں چلی!“ وہ دہنٹی بیک سنبھال کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

ساتھ ہی اس نے اپنا گھاس بھی خالی کر لیا۔

اسے رخصت کرتے ہی میں بے تابانہ انداز میں فون کی طرف متوجہ ہو گیا۔

دیر لگے آجائے کی وجہ سے میرا ہر ایک سے رابطہ منقطع ہو کر رہ گیا تھا۔ غلام رسول والا معاملہ شروع ہونے کے بعد ہم دونوں ظفر سے ملے بغیر واپس آ گئے تھے اور اس کے پاس ہمارا پتا ٹھکانا تک نہیں تھا۔ اس کے علاوہ مجھے سینہ حبیب جیوالی یا پھر شیر شاہ سے ضروریات کرنی تھی تاکہ مافیا والوں کو اپنی کارگزاری سے باخبر کر سکوں، مجھے امید تھی کہ شیر شاہ ویرا کے فلیٹ پر وقت برباد کرنے کے بجائے معلومات حاصل کر کے لوٹ آیا ہو گا۔

ظفر میری آواز پہچانتے ہی خوش ہو گیا ”خدا کا شکر ہے کہ تمہاری آواز سننے کی نوبت آئی۔ میں پریشان تھا کہ تم نہ جانے کہاں روپوش ہو گئے ہو۔“

”کھیں نہیں، بس ایک دوست کے گھر پر ڈیرا ڈالا ہوا ہے۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا ”تمہارے مصروف ہو جانے کے بعد ہمارے لیے وہاں رکے رہنا دشوار ہو گیا تھا۔“

”کیا کسی نے کوئی بد تمیزی یا حکم عدلی کی تھی؟“ اس کی چونکی ہوئی آواز ابھری۔

”نہیں“ میں نے جلدی سے کہا ”تمہارے آدمیوں نے بھرپور طریقے سے ہمارا ساتھ نہ دیا ہوتا تو ہمیں ذرا سی بھی کامیابی نہ ہوتی۔ بچے کی بازیابی کے ساتھ ہی ہم مسٹر کنگ تک بھی پہنچ گئے تھے۔“

”مجھے وہ سب خبریں مل چکی ہیں۔ تمہیں بچے کی بازیابی

اچھی طرح واقف تھا اور یہ جانتا تھا کہ وقت کے معاملے میں وہ میرے ساتھ انگریز بننے کی کوشش کرتا تھا، اگر اس نے واپسی کے لیے چار بجے کا وقت دیا تھا تو اسے نارمل حالات میں اس وقت تک فلیٹ میں ہونا چاہیے تھا۔

وقت دھیمے دھیمے آگے سرکتا رہا اور اسی کے ساتھ میرے اعصاب پر تازہ طاری ہونے لگا۔ سلطان شاہ کا دور دور تک پانچ نہیں تھا۔ اگر وہ غیر متوقع طور پر کہیں پھنسی گیا تھا تو اسے فون کر کے مجھے آگاہ کرنا چاہیے تھا۔ میرے ذہن میں اس کی سلامتی کے بارے میں دوسرے سزا بھارنے لگے۔

شہر میں جن لوگوں سے میرا واسطہ تھا، ان سب ہی سے ہمارے تعلقات خوشگوار ہو چکے تھے۔ ایک دیرا مقابلے پر رہ گئی تھی تو آخر کار اس سے بھی مصالحت ہو گئی تھی۔ ان حالات میں، میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ سلطان شاہ کی سلامتی کو کن لوگوں کی طرف سے خطرات لاحق ہو سکتے تھے۔

تھائی اور انتظار کے ان کھنکھاتے لمحات میں جب میرے لیے اعصابی تازہ قابل برداشت ہونے لگا تو میں نے وقت گزارنے یا خود کو بھلانے کے لیے جاکیر کے گھر کا نمبر لایا۔

”تم کہاں غائب ہو؟“ میری آواز سنتے ہی جاکیر اپنی روایتی خوش دلی کے ساتھ چکا ”میں تو بچے کو دیکھتے ہی جذبات سے ایسا مغلوب ہوا کہ تمہارا شکر یہ بھی ادا کرنا بھول گیا۔ اس بار تم نے واقعی مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ بچہ ایک دو دن اور نہ ملتا تو سلسلی بیٹھ کے لیے پاگل ہو جاتی۔“

”پاگل بیویوں کے عقل مند شوہروں کو بیٹھ کے لیے من مانی کرنے کی چھوٹ مل جاتی ہے۔“ میں نے اس کے موز کا ساتھ دینے کے لیے مضحل مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”یار! ایسا نہ کہو!“ اس کی سہمی ہوئی آواز ابھری ”ذہنی طور کے عالم میں وہ سپاٹ چرسے کے ساتھ یوں پھاڑ کھانے کو دوڑتی تھی کہ میرا سیروں خون خشک ہو جاتا تھا۔ وہ مجھ سے اس طرح بچے کی واپسی کا مطالبہ کرتی تھی جیسے میں نے ہی اسے کہیں غائب کر لیا ہو۔“

”اب سلسلی کا کیا حال ہے؟“ میں نے ششے ہوئے سوال کیا۔ ”اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ بچے کی کم شدگی کی خبر سنتے ہی لاہور سے اس کا بڑا بھائی آ گیا تھا۔ وہ ماں بیٹے کو آج صبح کی پرواز سے لاہور لے گیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ وہاں رہ کر سلسلی تیزی سے نارمل ہو سکے گی۔ ویسے بچہ واپس لٹنے کے بعد اس کی حالت میں نمایاں تبدیلی رونما ہوئی تھی اور وہ ہر ایک کو پچھاننے لگی تھی۔“

”اس کا مطلب ہے کہ آج سے تم بھر اندر روے رہ گئے ہو؟“ میں نے پوچھا۔ ”تم بھی میس آجاؤ مل بیٹھ کر اپنے دلوں کا بوجھ ہلکا کرین گے۔“ اس نے پیشگی۔

”یہ ڈان کا پیغام تھا؟“ میں نے حیرت کے ساتھ پوچھا۔ ”ڈان تھری کا پیغام تھا۔“ اس کی آواز میں سنجیدگی عود کر آئی ”لیکن یہ وہ ڈان نہیں ہے جو تم سے ملا تھا۔ اسے باغیوں کے خلاف ایک موثر کارروائی کے نتیجے میں ترقی مل گئی ہے۔ اس کی جگہ کوئی نیا آدمی آیا ہے جو اپنی آواز سے بہت ذہین اور سخت معلوم ہوتا ہے۔“

”پھر میرے لیے کیا حکم ہے؟“ میں نے دھڑکنے والے دل کے ساتھ وہ سوال کیا۔

”فی الحال عیش کرو!“ اس کے جواب سے میرے سر پر سے ایک بہت بڑا بوجھ نکل گیا۔ وہ کہہ رہا تھا ”لیکن آج سے تیسرے دن مقررہ وقت پر دفتر میں موجود رہنا نہ بھولنا۔ نہ جانے مجھے کب تمہاری ضرورت پیش آجائے۔“

”تم فکر نہ کرو۔ میں صبح ہی سے دفتر میں جم کر بیٹھ جاؤں گا“ لیکن یہ یاد دلاؤں کہ میں عیش نہیں کر رہا۔ میں نے دیرا کو نیست و نابود کرنے کے لیے اپنی زندگی عذاب بنالی ہے۔“

”میری دعا میں تمہارے ساتھ ہیں۔ کوشش کرو کہ میں مقررہ وقت پر ڈان تھری کو اس بارے میں کوئی بڑی خوش خبری سنا سکوں۔“

”لیکن ابھی تو تم التوا میں پڑے ہوئے اجلاس کا ذکر کر رہے تھے۔ میرا خیال ہے کہ اس اجلاس میں مانی اور شی میں کسی قابل عمل سمجھوتے پر غور کیا جاتا تھا۔ میری کامیابی اس مقصد پر برا اثر نہیں ڈالے گی؟“

”ہرگز نہیں!“ اس نے پُر زور لہجے میں کہا ”جنگ بندی ہونے سے پہلے ہر فریق کے حلوں میں تیزی اور شدت پیدا ہو جاتی ہے تاکہ آخری لمحات پر حاصل کی جانے والی کامیابیوں کے سارے جنگ بندی کے معاہدے میں مراعات حاصل کی جاسکیں۔ ہم کو ہر وقت اپنے بروں کے ہاتھ مضبوط کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔“

”تم فکر نہ کرو۔ میں تمہیں باؤس نہیں کروں گا۔“ میں نے دل ہی دل میں اس پر ہنسنے کہا۔

”کوئی کام کی بات ہو تو مجھے گھر پر فون کر لیتا۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

ان دونوں فون کالز کے بعد میرا ذہن بہت ہلکا ہو چکا تھا۔ ظفر نے میری جیلہ جوتی پر تھوڑی سی ناراضگی کا مظاہرہ کیا تھا مگر میں اس سے بھی اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میرا مذا صرف اتنا تھا کہ غزالہ کی جفاکشی واپسی تک میں پوری ذہنی یکسوئی کے ساتھ اپنی منصوبہ بندی کر سکوں۔

معاذ میری نگاہ اپنی رست و اوج پر پڑی تو میں چونک پڑا کیونکہ وہاں چار بج کر گیارہ منٹ ہو رہے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ سلطان شاہ نے فلیٹ سے جانے سے پہلے چار بجے تک اپنی واپسی کا عندیہ دیا تھا۔ میں اس کی خوشخبری سے

گی۔

سلطان شاہ کے ساتھ اگر کوئی ناگمانی مصیبت پیش ہی آگئی تھی تو میں اس کے لیے فوری طور پر کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ شہر بہت وسیع تھا اس میں کسی ایک شخص کا کوچ نکالنا ناممکنات میں سے تھا۔ شہر کے اپنیٹاؤں اور قہانوں سے رجوع کرنا خود اپنے لیے مشکلات کو دعوت دینے کے مترادف تھا کیونکہ کھل کر سامنے آنے کی صورت میں میں خود شہر میں گھر سکتا تھا۔

بہر حال اتنا ضرور ہوا کہ میری پریشانی کی وجہ سے دیرا کے سر سے رومان کا وہ بھوت اتر گیا جو شام کو اس کے سر پر چڑھ کر ناچ رہا تھا۔

”کو تو شری مان ہی کو چھڑا جائے کہ نئی دہلی میں کیا ہو رہا ہے“ دیرا نے کہا۔

”بے سود ہے“ فوری طور پر شاید وہ کچھ بھی نہیں بتا سکے گا۔ اس طرح اسے معاملے کو غیر ضروری اہمیت دینے کا موقع بھی مل جائے گا۔ اب تو اس سے میری بات کرنا۔“

”میں اس سے نکل کر میں اپنی رواجی کا بندوبست بھی کر آئی ہوں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا ”کل دوپہر کی پرواز سے میں کوئٹہ جا رہی ہوں۔ وہاں سے سرحد پار کر کے ایران میں داخل ہو جاؤں گی۔“

”اس طرح تو ہمارے پاس کافی وقت ہے۔ جانے سے پہلے تم

”آج نہیں آسکتا“ میں تمہارے قلیٹ ہی میں ہوں لیکن اکیلا اور بہت پریشان ہوں۔ آج سلطان شاہ کبیں عتاب ہو گیا ہے۔ میں اس کی طرف سے فکر مند ہوں۔“

”اوہ! پھر تو میں خود ہی تمہارے پاس آتا ہوں۔ وہ کب سے لاپتا ہے؟“

”وہ صبح سے نکلا ہوا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کہیں پھنس گیا ہو اور تھوڑی دیر میں لوٹ آئے۔ لیکن عام طور پر وہ ایسا نہیں کرتا اس لیے میں پریشان ہوں۔ تم ادھر نہ آنا۔ میرے پاس کچھ ایسے لوگ آنے والے ہیں جن سے تمہارا سامنا ہونا مناسب نہیں ہو گا۔ وہ چھپے ہی آئے گا تو میں فون کر کے تمہیں مطلع کر دوں گا۔“

پانچ ساڑھے پانچ اور پھر چھ بج چکے تھے، باہر اندھیرا پھیلنے لگا لیکن سلطان شاہ کی دایہی کے کوئی آثار نمودار نہ ہوئے البتہ ساڑھے چھ بجے دیرا واپس لوٹ آئی۔

دروازے پر میرے پریشان چہرے پر نگاہ پڑتے ہی وہ حیران رہ گئی۔

”کیا ہوا؟ تمہارا چہرہ اس قدر بے رونق اور اترا ہوا کیوں ہے؟“ اندر داخل ہونے کے بعد اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھا پھر میرے کچھ بولنے سے قہقہے اس نے اٹھا اور اہم ترین سوال بھی کر ڈالا ”سلطان شاہ کہاں ہے؟ کبیں وہ تم سے ناراض ہو کر تو نہیں چلا گیا؟“

”وہ سرے سے واپس ہی نہیں آیا اور یہی میری پریشانی کا اصل سبب ہے۔“

”اوہ!“ وہ ایک گہرا سانس لے کر صوفے پر گر گئی ”تم نے تو مجھے دلا کر رکھ دیا تھا۔ ایسے منہ لٹکانے بیٹھے ہو جیسے تمہارے سر پر آسمان گرا ہو۔ وہ کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں ہے۔ دیر سویر سے واپس لوٹ ہی آئے گا۔ اتنی سی بات پر تمہیں اتنا فکر مند ہونے کی کیا ضرورت ہے؟“

”دس پندرہ منٹ کی تاخیر ہو سکتی ہے لیکن اب ساڑھے چھ بج رہے ہیں۔ وہ میرے ساتھ اتنی غیر ذمے داری کا مظاہرہ نہیں کرنا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے لیے کیا کیا جائے؟“

”کچھ بھی نہ کرو ادھر میرے ساتھ بیٹھ کر ایک آدھ پیگ چڑھا ڈالو۔ تھوڑی دیر میں ذہن بالکل صاف اور ہلکا ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ اتنی دیر میں وہ بھی لوٹ آئے۔“ اس نے میرا ہاتھ تھام کر مجھے بھی اپنے برابر میں صوفے پر کھینچے ہوئے کہا ”اب میں تمہارے لیے جن نہیں دے سکتا تیار کرتی ہوں۔“

دیرا اٹھاس میں دھکا، اندھیلے لگی اور میں نے اپنے لیے سگٹ نکال لی۔

وقت دھیمے دھیمے گزرتا رہا اور دیرا اپنی باتوں سے میرا دھیان ہٹانے کی کامیاب کوشش کرتی رہی۔ ابتدا میں مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی ہنسا پڑا تھا لیکن رفتہ رفتہ میری کھوپڑی پر سے بھی کھرچنے

سینسٹریٹ کا چشمہ و سلسلہ

نئی پتھری لکھنؤ کا فزکس اور کیمسٹری کی جامع اور مشہور
بہترین طبی مرکز ہے۔ قارئین کی خدمت کو پیش کرتے ہیں۔

بلیوٹا

اسلوب نگاہ
دیکھیں

قیمت فی صفحہ 60 روپے
ڈاکٹر نئی صفحہ 23 روپے

کتابت اب تک شائع ہونے والی تمام کتب میں سب سے زیادہ مقبول کتاب

اور وہ لوگوں کی عظمتوں کی ساری ساری

42 صفحہ کی مجموعی قیمت 2200 روپے تک آئے ہیں

▶ کتابت مفت کی آراء ارسال کرنے والے جیسے ▶

42 صفحہ کی کل میں جلدیں

کتابیات بلیوٹا

پوسٹ 220 صفحہ کی مجموعی قیمت 2200 روپے تک آئے ہیں

74200

اس نے یکے بعد دیگرے متعدد فون نمبر ملائے۔ بعض نمبروں پر اس کا مطلب آدمی موجود نہیں تھا البتہ اس نے تین مختلف افراد کو سلطان شاہ کا حلیہ بتا کر اس کا سراغ لگانے کی ہدایت کی۔ ان تینوں رپورٹ دینے کے لیے ویرانے اسی فلیٹ کا فون نمبر دیا تھا۔ دو بجے تک فون پر مصروفیات کا سلسلہ جاری رہا۔ باہر سے رپورٹیں بھی آرہی تھیں لیکن کہیں سے کوئی حوصلہ افزا بات سامنے نہیں آرہی تھی۔

”میرا خیال ہے کہ آج میں نے اسے یہاں سے بھگانے کی بات کر کے اس کے ساتھ زیادتی کی ہے۔“ آخر کار ویرانے کی تھوڑی سی بات سن کر اس نے کہا ”قدرت نے میری بات سن لی اور خود ہی اسے یہاں سے غائب کرنے کا بندوبست کر دیا۔ بعض خیالات حیرت ناک طور پر حقیقت کا روپ دھار لیتے ہیں۔“

”میں تمہاری زبان سے آج پہلی بار قدرت کا ذکر سن رہا ہوں۔“ میں نے حیرت سے کہا۔

”بے بسی اور مجبوری کے لمحات میں ہی آدمی کو کسی ایسی قوت کا خیال آتا ہے جو اس کے خواب و خیال اور ارادوں سے بھی زیادہ قوی ہے۔ آج میرے اور تمہارے ساتھ کچھ ایسی ہی صورت درپیش ہے۔“

اسی لمحے فلیٹ کی دھڑکن بجی اور ساتھ ہی کسی نے بے تابانہ انداز میں دروازے پر دستک دی اور میں غیر ارادی طور پر دروازے کی طرف دوڑ پڑا۔

میرے وہاں پہنچنے تک دروازہ خاصی شدت سے پیٹ رہا تھا۔

میرا ہاتھ اضطراری طور پر پونٹ کی طرف بڑھا لیکن میں یہ سوچ کر ٹھٹک کر رہ گیا کہ سلطان شاہ کے پاس فلیٹ کی چابی ہوتی ہے۔ اگر وہ آیا ہے تو اسے سبک دینے یا دھڑکن بجانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ یقینی طور پر کوئی اور ہی تھا۔ مجھے محتاط ہو کر دروازہ کھولنا چاہیے تھا۔

”کھول چکونا!“ چوٹی دروازے کے اس پار سے درہم میں دہلی ہوئی آواز ابھری اس کے ساتھ ہی باہر والے نے شاید باپوی کے عالم میں اپنا سر دروازے پر مارا تھا۔

اس بار میں نے وہ جگہ جگہ ہوئی آواز وضع طور پر پہچان لی۔ وہ یقینی طور پر سلطان شاہ ہی تھا۔ میں نے جونہی دروازہ کھولا وہاں ایک جھونک میں لوکڑا آہوا میری آنکھوں میں آ رہا۔

اس کی حالت بہت اتر تھی۔ سارا چہرہ خون اور زخموں سے ڈھکا ہوا تھا لباس آوار تھا اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے پیچھے بیٹھ گیا کہ اذیت مزید ارحیت اور خوف کے عالم میں کھڑا ہوا تھا۔ وہ شاید سلطان شاہ کو سارا دے کر اوپر تک لایا تھا۔ میں نے شکر یہ ادا کر کے چوکیدار کو رخصت کیا۔ اس وقت تک ویرا بھی میری مدد کو پہنچ چکی تھی۔ اس نے دروازہ بند کیا اور ہم دونوں سلطان شاہ کو خواب گاہ میں لے گئے۔

کو ایک فون سے ہی براہ راست معلومات حاصل کر سکی۔“ مجھے اس کا پروگرام امید افزا نظر آ رہا تھا۔

دس بجے کے قریب فون کی گھنٹی بجی تو میرے بیڈ ہیڈ اٹھانے سے پہلے ہی ویرانے کی آواز فون آن کر دیا اور اس پر جانیہ کی آواز سن کر زبردست مسکرانے لگی۔

اس کی آواز پر گہرا اندیشہ غائب تھا مگر پھر بھی اسے سلطان شاہ کی فکر تھی۔ جب میں نے اسے بتایا کہ سلطان شاہ ابھی تک واپس نہیں آیا تھا تو اس کی آواز میں اداسی سج گئی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر میری پریشانی بٹانے کے لیے فلیٹ کی طرف آنے کا ارادہ کیا مگر میں نے پوچھا کہ اسے منع کر دیا۔

”اے سلطان شاہ کے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟“ فون بند ہونے کے بعد ویرانے نے پوچھا۔

”میں نے ہی فون پر اسے بتایا تھا۔ میں یہ چیک کرنا چاہ رہا تھا کہ کہیں سلطان شاہ اسی کی طرف نہ نکل گیا ہو۔“ میں نے محتاط لہجے میں کہا۔

”اس کی بیوی کا اب کیا حال ہے؟“ ویرانے نے اشتیاق لہجے میں پوچھا۔

”اس کی حالت ابھی بھی خراب ہے۔“ میں نے اسے شرمندہ کرنے کی نیت سے کہا ”اس کا بھائی بستر علان اور ماحول کی تبدیلی کے لیے اسے بچے سمیت لاہور لے گیا ہے۔“

”اشتعال کے عالم میں مجھ سے بعض اوقات خاصی عجیب حماقتیں سرزد ہو جاتی ہیں۔“ اس نے متانتانہ لہجے میں کہا ”بعد میں مجھے خود بھی اپنے ایسے اقدامات پانسوں ہوتا ہے۔“

”کم از کم مجھ سے بلاوجہ کی باتیں نہ کیا کرو۔ تمہارے صبر یا ذہن پر ذرا سامی بوجھ ہوتا تو تم بچے کو کہیں بھی ڈال سکتی تھیں۔ کوئی نہ کوئی بچے کو اس کے درمیان تک پہنچا دیتا۔“

”بعد میں سے میری یہ مراد نہیں کہ اغوا کے فوراً بعد ہی مجھ پر شرمندگی کا دورہ پڑ گیا تھا۔ وہ تو ایک مسلسل ذہنی کیفیت تھی جو مجھے تمہارے ساتھ ہی تمہارے متعلقین کے خلاف بھی اکسارہی تھی۔ اس کا خاتمہ اس وقت ہوا ہے جب میری تم سے مصالحت ہو گئی۔ وہ اشتعالی ذہن ختم ہونے کے بعد میں اب سوچتی ہوں تو اس معصوم بچے کا اغوا ایک ظلم محسوس ہوتا ہے۔“

”یہ بھی غصہ مند ہے کہ میرے ہی اسم اپنا احتساب تو کرتی ہے۔“

”تمہارے ساتھ اب مجھے بھی سلطان شاہ کے بارے میں تشویش ہونے لگی ہے۔“ چند ثانیوں کے بوجھل سکوت کے بعد اس نے کہا ”میرا خیال ہے کہ اب مجھے بھی کچھ کرنا چاہیے۔“

”اس فلیٹ میں بیٹھ کر تم کیا کر سکتی؟“ میں نے بے یقینی کے ساتھ کہا۔

”بس، کیچھ رہو۔“ ویرانے نے کہا اور پھر وہ فون کی طرف متوجہ ہو گیا۔

کی لیکن وہ تینوں بہت جسیم اور قد آور تھے۔ ان میں سے کسی نے میری کپٹی پر ایک زوردار ضرب لگائی اور میں بے ہوش ہو گیا۔ وہ سانس لینے کے لیے رکا۔ دیر اس کے زخموں کی دیکھ بھال کے ساتھ ہی اس کی کمائی بھی سن رہی تھی جب کہ میں نے آہستہ سے برے وقت کا مقابلہ کرنے کے لیے اسی کمرے میں چھپے ہوئے ہتھیار یکجا کرنے شروع کر دیے تھے۔

”بعد میں ہوش آیا تو میں کسی غارت کے ایک کمرے میں بند تھا اور وہی تینوں، خوشخوار تیوروں کے ساتھ میرے سامنے موجود تھے۔“ سلطان شاہ نے دوبارہ بون شروع کر دیا تھا ”میرے لیے ان کے چہرے اچھے تھے لیکن وہ میرے ساتھ تھمارے نام سے بھی واقف تھے۔ مجھ سے وہ یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ تم کو کہاں گھبرا جاسکتا ہے۔ میرے انکار پر وہ میرے ساتھ تشدد پر اتر آئے۔ وقتوں وقتوں سے یہ سلسلہ بہت دیر تک جاری رہا۔ ان کا خیال تھا کہ بے تحاشا مار کھانے کے بعد میری قوت برداشت جواب دے جائے گی اور میں سب کچھ اگلا چلا جاؤں گا لیکن ایسا نہیں ہو سکا اور آخر کار وہ تینوں ہی بری طرح مجھ پر پل پڑے۔ کون لاتوں اور ٹھوکروں سے انہوں نے میرے جسم کے ہر حصے کو نشانہ بنایا اور آخر کار میرے حواس جواب دیتے چلے گئے۔“

”اس پوری کارروائی میں ان تینوں کے علاوہ اور کوئی تمہارے سامنے نہیں آیا؟“

”شروع سے آخر تک وہی تینوں رہے۔ ان میں سے ایک آدمی وقفے وقفے سے باہر جاتا آتا رہا، وہ شاید فون پر کسی پارت دے کر نئی ہدایات لے رہا تھا۔ اگر انہوں نے مجھے ایب کر سی سے نہ باندھا ہوتا تو میں موقع پا کر دو آدمیوں کو زیر کرنے کی کوشش کر سکتا تھا۔“

”یہ سب فضول باتیں ہیں، پہلے تم اپنی اصل کمائی محل کرنا۔“ دیرانے اسے ٹوکا۔

”اس کے بعد تھوڑی دیر پہلے مجھے ہوش آیا تو میں کھلے آسمان کے نیچے ٹھنڈی اور نرم گھاس پر پڑا ہوا تھا اور میرا پورا بدن کسی پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ میرے قرب وجوار میں بالکل سناٹا تھا۔ اس وقت میرا ذہن ماؤف تھا لیکن آزادی کے احساس نے مجھے حوصلہ دیا اور میں گرتا پڑتا ہوا، وہاں سے چل پڑا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے پچان لیا کہ مجھے کشمیر روڈ کے قرب وجواری میں ڈالامیا تھا۔ رات خاصی گزر چکی تھی اور میری حالت بہت خراب تھی مگر میں آکاؤ کا راہ گیروں سے بچتا بچتا کسی نہ کسی طرح یہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔“

سلطان شاہ نے پانی مانگا۔ دیرانے لاکھ کوشش کی کہ وہ تقویت کے لیے تھوڑی سی برانڈی پی لے لیکن سلطان شاہ نے اس حالت میں بھی برانڈی قبول کرنے سے سختی سے انکار کر دیا۔ چند منٹ کے قتل کے بعد دیرانے اس سے پوچھا ”تمہیں یہ

سلطان شاہ غصاں ہو کر بستر گر گیا۔ اس نے آنکھیں موند لی جس اور بند پونوں کے نیچے اس کی آنکھوں کی پتلیاں تیزی کے ساتھ ہلکوم رہی تھیں جیسے وہ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہو۔ دیرانے کسی ماہر نرس کی طرح اس کے زخموں کا جائزہ لینے میں مصروف ہو گئی۔

”سلطان، سلطان شاہ!“ میں نے اس کے اچھے ہوئے بالوں میں زلی سے ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے پکارا ”یہ سب کیا ہے اور کیسے ہو گیا؟“

اس نے دابنا ہاتھ قدرے بلند کر کے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا جس کا مطلب تھا کہ وہ اپنی کمائی سنانے سے پہلے اپنی تمام زخموں کو جمع کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”ابھی اس نے نہ چھینڑا!“ دیرانے، دھیمی آواز میں مجھے مشورہ دیا۔ ”اس کی حالت بہت اتر ہے۔ ہونٹ بھی کٹے پٹے ہوئے ہیں۔ ہر کھانے کے اس کی زبان بھی زخمی ہو، بہت ہوگی تو یہ خود ہی بولے گا۔“

سلطان شاہ نے پھولی ہوئی آنکھیں کھول کر، غصہ کی سے ہالہ میں باری باری ہم دونوں کو دیکھا ”اس کے سوچے ہوئے ہونٹوں پر خف سا کھچا پیدا ہوا۔ شاید اس نے مسکرانے کی کوشش کی تھی لیکن اس میں ناکام رہا پھر اس نے تھکے ہوئے انداز میں دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔

مجھے جانتی تھی کہ فلیٹ میں موجود سولتوں کا سرے سے کوئی علم ہی نہیں تھا لیکن دیرانے ادھر ادھر ہاتھ پیر مار کر سلطان شاہ کی طبی امداد کے لوازم فراہم کر لیے اور ڈیٹول لے ہوئے گرم پانی کی مدد سے ہولے ہوئے زخموں کو صاف کرنے میں مصروف ہو گئی۔

”ہوشیار رہو!“ چند منٹ بعد سلطان شاہ نے سنبھالا لے کر گئی ہوئی آواز میں پہلی بار زبان کھولی تو مجھے دیرانے کے قیاس کی داد مل گئی کیونکہ سلطان شاہ کی زبان متورم محسوس ہو رہی تھی۔

”وہ لوگ کسی بھی وقت یہاں دھاوا بول سکتے ہیں۔“ وہ رک رک کر کہہ رہا تھا ”وہ بہت سفاک اور خوشخوار درندے معلوم ہوتے ہیں۔ انہیں تمہاری تلاش ہے۔“

اس کا وہ انکشاف سن کر میری ریزہ کی ہڈی میں سنسنی سی کیفیت گئی۔

”کہہ تو تاؤ کہ وہ کون ہیں اور تم سے کہاں ٹکرائے؟“ دیرانے اس کے چہرے کے زخموں کی صفائی کرتے ہوئے نرمی سے پوچھا ”میں فیصلات کا علم نہیں ہوا تو ہم بے خبری میں مار لے جائیں گے۔“

”کشمیر روڈ کے ایک لان سے نکل رہا تھا۔“ اس نے رک رک کر پوچھا ”شروع کیا؟“ اچانک ہی ایک کار میرے قریب آکر ٹکرائی تھی آدمی نکل کر مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ میں نے بہت مزاحمت

خیال کیسے آیا کہ وہ یہاں دھوا بول دیں گے؟

”ان کا اصل مقصد ہی ذہنی تک پہنچنا ہے۔ انہوں نے مجھے اُدھ مٹا کر کے اسی لے آزاد کیا کہ میں ہوش میں آتے ہی اپنے ٹھکانے کا رخ کروں گا۔ یہ بات اسی وقت میرے ذہن میں آجاتی تو میں ہرگز بھی ادھر کا رخ نہ کرتا بلکہ کہیں اور نکل جاتا لیکن اس وقت میرا ذہن دھندلایا ہوا تھا اور میرے حواس باختہ تھے اس لیے میں سیدھ باندھ کر اسی طرف چل دیا۔ بظاہر دور دور تک کوئی نہیں تھا لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ انہوں نے یہاں تک میرا پیچھا کیا ہو گا۔ فلیٹ میں پہلا قدم رکھتے ہی مجھے اس بات کا دھیان آیا تھا۔ انہوں نے یہ گمراہ کیا ہے اور اب بھڑپور تیری کے ساتھ کسی بھی وقت یہاں آجائیں گے۔“

”تمہیں ان کی کسی بات سے یہ اندازہ نہیں ہو سکا کہ وہ کون لوگ تھے یا کس کے لیے کام کر رہے تھے؟“ ویرا نے ظفر آہستہ لہجے میں سوال کیا۔

”نہیں!“ سلطان شاہ نے باپسی سے کہا ”جب تک میرے ہوش و حواس ساتھ دیتے رہے میں ان کی باتوں پر پوری طرح دھیان دیتا رہا لیکن وہ بہت محتاط تھے۔ مجھے کوئی سرا نہیں مل سکا۔“

”یہاں رہ کر تو ہم بری طرح گھیر لیے جائیں گے۔“ ویرا نے چند ٹانہوں کے بوجھل سکوت کے بعد پُر تشویش لہجے میں کہا ”میں کوئی نہ کوئی راہ تلاش کرنی ہوگی۔“

اس دوران میں وہ ایک سیکنڈ کے لیے بھی سلطان شاہ کی مزیم پٹی سے غافل نہیں ہوئی تھی۔ وہ اتنی احتیاط اور نرمی سے کام لے رہی تھی کہ سلطان شاہ کو ایک مرتبہ بھی احتجاج کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ وہ بے چون و چرا دیر کی ہدایات پر عمل کر رہا تھا۔

”میرا خیال قدرے مختلف ہے۔“ میں نے کہا ”یہ رہائشی عمارت ایک عجیب آبادی میں واقع ہے۔ وہ یہاں کسی بھی کارروائی کا خطرہ مول نہیں لیں گے۔ وہ گولیاں برساتے ہوئے ہڈیوں میں گھس بھی آئے تو ان کے لیے یہاں سے ٹھکانا دھوا ہو جانے کا ایسی کسی کامیاب کارروائی کے لیے انہیں بھاری نفی کی ضرورت ہوگی جو یک وقت اندر اور باہر کے محاذ نبھال سکے۔“

”تم بھول رہے ہو کہ میں ایک بار یہاں دھوا بول چکی ہوں۔“ اس نے مجھے یاد دلایا۔

”لیکن تمہیں اس کا انجام بھی معلوم ہے۔“ میں نے ترکی بہ ترکی کہا ”تمہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔“

”اس وقت تمہارے مسلح آدمی باہر بھی پھیلے ہوئے تھے لیکن آج صورت حال مختلف ہے۔“

”پھر کیا کیا جائے؟“ اس نئی صورت حال نے مجھے خاصا پریشان کر دیا تھا۔

”تم اول خان سے بات کیوں نہیں کرتے؟“ اس نے مجھ پر کمر کیا ”اس کے مسلح آدمی باہر رہ کر اس عمارت کی کھڑائی کھڑائی رہیں تو نہ صرف خطہ ٹل جائے گا بلکہ ہم دن کے اجلاس پر بحفاظت یہاں سے نکل سکیں گے۔ میری رائے میں اس وقت یہ حل سب سے مناسب رہے گا۔“

”یہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔“ سلطان شاہ نے لقمہ دیا ”یہ کام اب وقت ہو جانا چاہیے۔“

ان دونوں کی بات معقول تھی لیکن میرے سامنے یہ الجھن درپیش تھی کہ میں نے ویرا کے معاملے میں ظفر کو اندر جسے مل رکھا ہوا تھا کیونکہ اس میں میرا اپنا مفاد تھا۔ دوسری طرف ویرا یہ معلوم نہیں تھا کہ اول خان کا تبادلہ ہو جانے کے بعد ”اس کی جگہ ظفر آچکا تھا۔ اگر میری فون کال کے نتیجے میں ظفر جوش میں آکر خود ہی فلیٹ پر آجائے تو میرے لیے صورت حال کو سنبھالنا دشوار ہو سکتا تھا۔

لیکن یہ بات طے تھی کہ اس وقت ہمارے سامنے اس سے بہتر کوئی راہ موجود نہیں تھی ”اس لیے میں نے تمہید باندھنے کی نین سے ویرا سے کہا ”مشکل یہ ہے کہ اول خان آج کل بھٹی پر چلا گیا ہے۔ اس کی جگہ جو شخص کام کر رہا ہے اس سے میری زیادہ بات چینی نہیں ہے۔“

”پھر بھی کوشش کر لینے میں کیا ہرج ہے؟“ ویرا نے کہا ”نہاں سے زیادہ وہ افکار کر دے گا۔ ہمیں حسرت تو نہیں رہے گی کہ ہم کوشش نہیں کی تھی۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے سوچنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا ”میں اسے تمہارے بارے میں بھی ایک کہانی سناؤں گا اور تم اس کا خیال رکھنا ہو گا۔ تمہارا نام شامل ہونے سے میری بات زور پیدا ہو جائے گا اور اول خان کا جانشین فوری کارروائی پر آمادہ ہو جائے گا۔“

”ٹھیک ہے، میں ہمیشہ تمہارے سیاہ و سفید میں گلے گلے ساتھ دیتی رہی ہوں۔“

ڈرامٹک ہو جانے اور تھوڑی دیر آرام کرنے کی وجہ سے سلطان شاہ کی حالت خاصی بہتر ہو گئی تھی، غنیمت یہ تھا کہ اس کے سارے زخم سطحی نوعیت کے تھے۔ اس کے جسم کی کسی ہڈی و فیوڈ کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ اس لیے وہ بہتر سے اتر آیا تاکہ باہر روم میں جا کر لباس وغیرہ تبدیل کر سکے۔

میں ویرا کے ساتھ ڈرامٹک روم میں آگیا تاکہ ظفر سے بات کی جاسکے۔

”اول خان کے جانشین کا نام تم نے ابھی تک نہیں بتایا۔“ ویرا نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

”ظفر!“ میں اس کے شکایتی انداز پر بے ساختہ ہنس پڑا ”میں برائے کی کیا بات تھی؟“

”میں ڈیڑی بول رہا ہوں، مجھے ظفر صاحب سے بات کرنی ہے۔“ میں نے کہا۔

”صاحب سو رہے ہیں، ضروری کام ہو تو میں جگا دوں؟“ آپریٹر نے ادب کے ساتھ کہا۔

”ہیلو، ڈینی، کیا بات ہے؟ اتنی صبح فون کرنے کی کیا ضرورت پیش آگئی؟“

”کیوں؟“ ان میں وہ ”اس کی آواز سے نیند کا شہنشاہ ہو گیا۔ وہ میرے ساتھ ویرا کی موجودگی کے بارے میں برا اٹھا رہا۔ مجھے یہ بتانا تھا اس لیے اس نے خلاف عادت ویرا کے بارے میں کسی بھی جنس کا مظاہرہ کیے بغیر، براہ راست مطلب کی بات شروع کر دی۔“

”تم فلیٹ متقل کر کے اندر ہی بیٹھے رہو۔ میں اپنے آدمیوں کے ساتھ فوراً آ رہا ہوں۔“ اس نے مزید چھان بین میں ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر کہا۔

میں نے اسے فلیٹ کا پتا اور محل وقوع بتایا۔ میری بات سمجھتے ہی اس نے ریسورسز شاپ کمرڈل پر رکھ دیا۔

”تم بلاوجہ ہی پریشان تھے، وہ تو بہت شریف آدمی معلوم ہوتا ہے۔“ ویرا بولی۔

”وقت و قوت کی بات ہوتی ہے۔ شاید یہ تمہارے نام کا اثر تھا کہ وہ فوراً حرکت میں آنے پر آمادہ ہو گیا۔“ میں نے اس کی پشت پر ہاتھ مارتے ہوئے بے تکلفی کے ساتھ کہا۔

بے یقینی کی ہند صاف ہونے کے بعد، جوں جوں صورتِ حال

واضح ہوتی جا رہی تھی میرا سوڈا ٹارل ہوتا جا رہا تھا کیونکہ سسٹم میں
سورج طلوع ہونے سے پہلے ہی حالات سنسنی خیز رخ اختیار کر رہے
تھے۔

”وہ میرے بارے میں کیا جانتا ہے؟“ ویرا نے پُراستیا پر
میں سوال کیا۔

”وہ جوان اور مرد خوش افسر ہے۔ اس کے لیے یہ بات فخر و حیرت ناک ثابت ہوئی کہ تم جیسی خوب صورت، جوان عامل عورت جراثیم کی دنیا میں کیوں بھگ رہی ہے۔“

”مرد بلکہ بچے جراثیم کہہ سکتے ہیں تو ایک عورت کے لیے ایسا میں کیا رکاوٹ ہو سکتی ہے؟“

”کچھ بھی نہیں“ بس ہمارے یہاں یہ ذرا نئی اور اچھوتی باز لگتی ہے۔ ورنہ مجرم عورتیں تو اپنے پیشے میں زیادہ کامیاب ہو گئیں۔ جدید تھیٹروں سے بڑھ کر ان کے روایتی تھیٹر فنکار ہوتے ہیں۔“

”ہر طرف سے مطمئن ہوتے ہی تم نے اب پھر چمکنا شروع کر دیا؟“ وہ منہ بنا کر بولی۔

”انسان چمکنے والا پرندہ ہے۔ اگلے پچھلے غموں کو روگ بٹاتا رہے تو ہمیں ہر طرف آہوں اور سسکیوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں سنا دے گا۔“

”اس وقت ہانگ کانگ میں صبح کے سو اسات بجے ہوں تھے
کیا ارادہ ہے۔“ اس نے میری کٹائی تمام کر رست والی پرچہ
ڈالتے ہوئے معنی خیز لہجے میں سوال کیا۔

”ادہ ضرور!“ میں نے چونک کر کہا ”اب تک تو کوئی ایسا
مکاؤ لوٹ آیا ہوگا۔“

”دیکھ لو کہ میں تمہاری غزالہ کا کتنا خیال رکھتی ہوں۔“

سلسلہ ملنے پر کواٹک فو کے نمبر سے وہی چوہے کی مٹھکائی
چوہے جاں سناٹی دینے لگی اور ٹھیک تیس سیکنڈ بعد آپریٹرائیڈ
بجھ گئی۔

”مجھے فادر کو اٹک فوسے بات کرنی ہے، میرا نام ویرا ہے۔“
ویرا نے اس کی چھٹی زبان کے جواب میں کھنکھائی ہوئی آنکھیں ملاتا
اپنا تعابیان کیا۔

”دون تو کل رات سے کولون گئے ہوئے ہیں۔“ آپہنر
 شکستہ انگریزی میں رک رک کر کہا ”مظاہرے رات کے“
 ان کا فون آیا تھا روضہ وہاں کاؤ آرے ہیں۔ انہیں اب سے
 پینے میاں آجاتا ہے یہ تھا لیکن ابھی تک سنا ہے۔ ہم لوگ
 ڈون کی طرف سے غمر مند ہیں۔“

”میں فادر کی منہ بولی بنی ہوں۔۔۔“ ویرا نے آپریٹر سے تفصیلی تعارف کراتا چاہا لیکن اس لڑکی نے فوراً ہی اس کی بات کاٹ دی۔

”ذون ہمارا باپ اور استاد ہے۔ وہی ہم کو سب کچھ سکھا ہے۔“ بلکی سی ترم ریزہ بی کے ساتھ آپریٹر کی آواز ابھری ”وینے میں بے بی نہیں ہوں۔ میری عمر سینتالیس سال ہے۔“ اس کے آخری فقرے پر ویرانے ایسا برا سائنہ بنایا تھا جیسے اس نے شد کے دھوکے میں کوئین مسیجر لی لیا ہو۔ چند رک کی فکروں کے بعد ویرانے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

”یہ ایک نئی اور غیر متوقع صورت حال ہے۔“ اس نے تشویش آمیز لہجے میں کہا۔

”خدا کرے کہ خبر ہی ہو۔ میرا دل کتا ہے کہ کو انک فون آسانی سے زیر ہونے والوں میں سے نہیں ہے۔“ ”اب تو تم انتظار کے علاوہ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔“ وہ بے بی سے بولی۔

”کیوں نہ شری مان سنگھ سے کھوج نکالنے کی کوشش کی جائے؟“ میں نے تجویز پیش کی۔

”بے سود ہے۔“ وہ بولی ”اے دہلی سے آگے کی کوئی خبر نہیں ہوگی۔ آپریٹر بتا چکی ہے کہ کو انک فون نے آخری فون منظر طے کیا تھا اس کا مطلب ہے کہ وہ غزالہ تک پہنچ چکا تھا۔“

”یہ شی میں ذون کب سے ہونے لگے؟“ میں نے چونک کر سوال کیا۔

”مجھے معلوم تھا کہ تم یہ سوال ضرور کرو گے۔“ وہ مضحل مسکراہٹ کے ساتھ بولی ”یہ لفظ ڈھنگ ہے اور چینی زبان میں بڑوں کے لیے احتراماً استعمال ہوتا ہے اور اس سے مخاطب کی انتہائی بڑائی کا اظہار ہوتا ہے۔ تلفظ کی وجہ سے تمہیں یہ لفظ ذون سنائی دے رہا تھا۔“

”اور وہ تمہاری خود کشی والا ڈراما کیا تھا؟“ میں نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

”دوسروں کو متاثر کرنے کے لیے مجبوراً ایسے ڈرامے کرنے ہی پڑتے ہیں۔“

اسی وقت سلطان شاہ لباس وغیرہ تبدیل کر کے ڈرائنگ روم میں آیا یہ تھا کہ اچانک ڈور بتل پیچ اٹھی۔

میں نے لپک کر دروازہ کھولا تو ظفر کا گھیر چہرہ میرے سامنے تھا۔

وہ میرے ہمراہ فلیٹ میں پوری طرح داخل بھی نہ ہونے پایا تھا کہ اچانک کہیں قریب ہی سے کسی بے آواز رائفل کے فائر کی مخصوص آواز ابھری اور فضا میں ایک دم توڑتی ہوئی انسانی پنج گو ٹنچی چلی گئی۔

میں نے اضطرابی طور پر ظفر کو ایک طرف دھکیل کر فلیٹ سے باہر نکلتا چلا لیکن اس نے میرے بازو تھام کر مجھے خنکی کے ساتھ اندر ہی روک کر دروازہ بند کر دیا۔

”سکون سے اندر بیٹھو!“ اس نے سخت اور سرد لہجے میں کہا۔

”میرے کپیوٹر کے سائڈ اسکینر نے تمہاری آواز پہچان لی ہے۔“ وہ پُر اعتماد لہجے میں کہہ رہی تھی ”اسی لیے میں نے تمہیں یہ سب بتایا ہے۔ ذون نے ہدایت کی تھی کہ اس کی غیر حاضری میں تمہارا فون آجائے تو تمہیں ہر بات بلا کم و کاست بتادی جائے شاید وہ تمہاری کسی دوست کو لینے ہی گئے ہیں۔“ میرے لیے وہ خبر بہت وحشت انگیز تھی۔ کو انک فو کا یوں غائب ہونا کسی گزربز کی بنیاد پر رہا تھا۔

”پھر تم لوگ فادر کی تلاش کے لیے کیا کر رہے ہو؟“ ویرانے پر تشویش آمیز لہجے میں پوچھا۔

”ہمارے دو نیکی کا پڑ مسلسل سمندر پر پہنچی پرواز کر رہے ہیں لیکن ذون کی اسپینڈ بوٹ کا ابھی تک کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ مگر حال سب اپنی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔“

”ایسا تو نہیں کہ بیلی کا پڑ در سے فضا میں بلند ہوئے ہوں اور اس سے پہلے ہی فادر کے ساتھ کوئی ناخوشگوار واقعہ رونما ہو چکا ہو؟“ ویرانے لکھ بھر کے توقف کے بعد سوال کیا۔

”میاں بھی یہی خیال ظاہر کیا جا رہا ہے۔“ آپریٹر نے اعتراف کیا ”ذون کی واپسی کے لیے ہمیں ان کی کال کے بعد مقررہ وقت تک تو انتظار کرنا ہی تھا۔ اس میں کسی کا قصور نہیں ہے۔ ذون کی تلاش کی مہم کا آغاز صبح پانچ بجے ہوا ہے۔ ہمیں سمندر میں کئی مقامات پر ہماری فائرنگ کی آوازوں کے تارے کی خبریں بھی ملی ہیں لیکن ان سے کوئی نتیجہ اخذ نہیں کیا جاسکتا۔ ان اطراف کے گہرے پانیوں میں ایسے واقعات روزمرہ کا معمول ہیں۔“

”ٹھیک ہے بے بی!“ ویرانے ایک گہرا افسانے لے کر کہا۔

”اگر میرے کام کی وجہ سے فادر کو انک فو کوئی نقص پہنچا تو میں زندگی بھر خود کو معاف نہیں کر سکو گی۔ ہو سکتا ہے کہ میں خود کشی ہی کروں مگر فی الحال میں تمہاری کامیابی اور فادر کی واپسی کے لیے دعا کرتے ہوئے کسی اچھی خبر کی منتظر رہوں گی۔“

”میرے پاس تمہارا فون نمبر نہیں ہے۔ وہ لکھو اور تو اچھی خبر آتے ہی میں تمہیں فون کروں گی۔“

”اگلے آٹھ دس گھنٹوں تک میں اسی نمبر پر رہوں گی۔“ ویرا نے فلیٹ کا فون نمبر بتانے کے بعد کہا ”میری خواہش ہوگی کہ میری فادر ہی سے براہ راست بات ہو سکے۔“

”تم ذون کی بیٹی ہو۔ حوصلہ رکھو۔ تمہاری باتیں سن کر مجھے مایوسی ہوئی ہے۔“ آپریٹر کا لہجہ نامحسانہ ہو گیا ”دیر لوگ برے سے برے حالات کا بھی مقابلہ کرتے ہوئے زندہ رہتے ہیں۔ جو بزدل ہوتے ہیں وہ زندگی کے تقاضوں سے گھبرا کر موت کی آغوش میں پناہ ڈھونڈنے لگتے ہیں۔“

”میں تمہاری باتیں یاد کرنے کی کوشش کروں گی“ مائی بے بی! ویرا نے بڑے خلوص سے کہا ”اتنی کم سی سی تم نے ایسی باتیں کہاں سے سیکھ لیں؟“

مسلحہ حیرت اور بے یقینی کے ساتھ ظفر کو گھورے جاری تھی اور بھڑکی ہوئی نظر آری تھی۔ پھر جب ظفر دو آنڈہ بولٹ کر کے دیر کی طرف گھوما تو اس کی آنکھیں بھی حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔ ان دونوں کی آنکھوں میں ایک دوسرے کے لیے واضح طور پر

میں باہر کا رنگ دیکھ آیا ہوں۔ وہاں مکمل شروع ہو چکا ہے اور ان میں سے ایک بھی زندہ نہیں لوٹ سکے گا۔“
دراپورے پیچھے کھڑی حیرت اور بے یقینی سے ظفر کو گھورے جاری تھی۔

شاسائی کی علامات نظر آری تھیں۔
”تم۔۔۔ تم یہاں!“ ویرانے تھیز زدہ لمبے لمبے میں پہل کی تھی ”تم تو کرل جیسی جوتے کے آدمی ہو۔ تمہیں اس وقت بوگوتا کو لیبیا کے کسی اور شہر میں ہونا چاہیے تھا۔“
ظفر کے ہونٹوں پر سرد اور سفاکانہ مسکراہٹ رنگ آئی اور وہ اپنے سر کو قدرے خم دیتے ہوئے زیریلے لمبے میں بولا ”اگر میری یادداشت مجھے دھوکا نہیں دے رہی تو تم سب دیر دیکھا ہو۔ مجھے یاد ہے کہ بوگوتا کی سماجی تقریبات میں تم کرل جیسی جوتے کے دست راست کی منظر پر نظر ہوا کرتی تھیں۔“

ویرا کے سننے ہوئے اعصاب یک بیک ڈھیلے بڑھنے اور اس کے چہرے پر مصعوانہ مسکراہٹ ٹھیلنے لگی۔ محسوس ہی نہیں ہو رہا تھا کہ چند ثانیوں قبل وہ ایک چالاک، عیار اور زمانہ شناس عورت کی طرح مستعد اور چونکنا نظر آری تھی، اور کسی بھی غیر متوقع صورت حال سے شاطرانہ انداز میں سننے کے لیے تیار تھی۔
”تمہاری یادداشت قابلِ رشک ہے“ ویرا نے ہلکتی ہوئی ہنسی کے ساتھ کہا ”تم سے صرف ایک باری میری سرسری سی ملاقات ہوئی تھی، مجھے امید نہیں تھی کہ تم مجھے اتنی آسانی کے ساتھ پہچان لو گے۔“

”تم انجان بنی رہیں تو شاید مجھے بھی وہ سرسری ملاقات یاد نہ آتی لیکن تمہارے چونک دینے والے رد عمل نے یک بیک میرے ذہن کے سارے درپٹے کھول دیے ہیں۔ شاید تم نے یہاں ویرا کا نام اختیار کیا ہوا ہے۔ مجھے تمہارے ویرا کا بہت اشتیاق تھا مگر مجھے یہ جان کر شدید ذہنی جھٹکا لگا ہے کہ ویرا لائیڈ کے نام سے جانی جانے والی عورت کرل جیسی جوتے کے ایک ماتحت کی داشتہ رہ چکی ہے۔“

میں حیرت سے گلگ ہو کر رہ گیا تھا اور بند دو آوازے کے قریب کھڑا ان دونوں کی ناقابلِ فہم گفتگو سن رہا تھا۔ وہ دونوں باہر رسنے والی بارودی آگ اور خونی برسات سے بے پروا، اتنے اطمینان کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ مذاکرات کر رہے تھے جیسے ان کی نگاہوں میں اس خونریزی کی کوئی اہمیت نہ ہو۔

”ویرا اور ویریکا میں کوئی فرق نہیں“ ظفر کے تعجب آمیز تبصرے پر ویرا سنجیدہ ہو گئی ”تم ڈینی کو دھوکا دے سکتے ہو لیکن میں تمہاری اصلیت سے واقف ہوں۔“ بات کرتے کرتے اس نے اچانک ہی اپنے بلاؤز سے ننھا سا خود کار پستول نکال کر اتنی بھرتی کے ساتھ ظفر پر تان لیا کہ اسے کسی جوانی کا رد والی کا موقع ہی نہیں مل سکا اور وہ ہکا بکا ہو کر اس کی طرف دیکھتا گیا۔

را نقل کے پہلے نماز اور دم توڑتی ہوئی انسانی جج کے ساتھ ہی باہر کی پرسکون فضا میں ایک قیامت خیز ہنگامہ برپا ہو گیا۔ قریب اور قدرے دور سے، بھانت بھانت کے آفتیں ہتھیاروں کے ملک نفع منوجے شروع ہو گئے تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے رات کے پہلے اندھیرے میں دو طاغوتی حریف، ایک دوسرے کی گھات لگائے، اپنی کین گاؤں میں چھپے بیٹھے ہوں اور پہلی گولی چلتے ہی ذخیرہ خوروں کے ساتھ ایک دوسرے کو جہنم رسید کرنے کے لیے میدان میں کود پڑے ہوں۔

چند ماہ کی قلیل سی مدت میں، اس مہجانب آباد اور صاف شہرے رہائشی علاقے میں، وحشیانہ تصادم کی وہ تیسری واردات تھی اس لیے علاقے کے کین بیدار ہونے کے باوجود اپنے مکانوں سے باہر آ کر اپنی زندگیاں داؤ پر لگانے کا خطرہ ہرگز مول نہ لیتے اور دونوں حریفوں کو دل کھول کر اپنی بھڑاس نکالنے کا موقع مل جاتا۔ اپنے تجزیہ مقابلوں میں پولیس فورس کے تجربے کار افسران بھی اندھا دھند مداخلت سے گریز کرتے ہیں کیونکہ اس طرح انہیں ہمارا جانی نقصان سے دوچار ہونے کا خطرہ رہتا ہے۔ صورت حال کی بھرپور تحقیق کا اندازہ لگانے کے باوجود وہ اپنے جوانوں کے ساتھ اس وقت تک محاذ سے دور ہی رہتے ہیں جب تک دو میں سے ایک فریق کسی وجہ سے کمزور نہ پڑنے لگے۔ محاذ آرائی کی شدت میں کمی آتی ہی وہ سازن اور سیٹیاں بجاتے اور ہوائی فائرنگ کرتے ہوئے مقابلے میں شریک ہو جاتے ہیں۔ ایسے مواقع پر دو چار بد نصیب یا ذہنی مجرم ہی ان کے ہاتھ لگتے ہیں ورنہ ہر مجرم پولیس کی آدکی بوس گھٹنے ہی کسی محفوظ راستے سے فرار ہو لیتا ہے اور آخر میں صرف پولیس فورس میدان میں رہ جاتی ہے۔

وہ اس معاملے کا ایک پہلو تھا لیکن دوسرا پہلو جو میرے لیے نازا اطمینان بخش تھا، وہ یہ تھا کہ اس وقت صبح کے چار بجے کا ٹل تھا۔ اس وقت سڑکیں اور گلیاں سنسان پڑی ہوئی ہوئی تھیں۔ اس طرح فائرنگ کی زد میں آکر بے گناہ راہ گیروں کے ہلاک یا زخمی ہونے کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہی تصادم نہیں چار گھنٹے پہلے ہوا ہوتا تو نہ جانے کتنے بے گناہ اس خونریزی کا شکار ہو جاتے۔

ہولناک فائرنگ کی گونج میں لاکوٹا، دردناک انسانی چیخیں بھی گونج رہی تھیں۔ مجھے پورا یقین تھا کہ گولیوں کا نشانہ بننے والے مقابلے میں شریک تھے۔
ظفر کی آدکے ساتھ ہی مجھ پر تصادم کا آغاز میرے لیے حیرت ناک تھا لیکن اس سے بھی زیادہ حیرت ناک بات یہ تھی کہ ویرا

تھا۔ میں جانتا تھا کہ عالمی سیاست کی بھلا پر پاکستان کے لوہے پاسوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ شری مان سنگھ اپنی ملک کی بحریہ پریشانی سے سندھ میں خونریزی اور شورش پر بھڑا رہا تھا۔ اس کے اہم ترین سیکرٹریجٹ، ملا سرکار کو جنم حاصل کیا جا چکا تھا لیکن اس کی جگہ دوسرے مرے میدان میں آتا رہا کی تیاریاں جاری تھیں، جی لائیڈ کسی بھی مضبوط ضمانت کے بغیر پاکستان کے دشمنوں کو ملک ترقی، ہتھیاروں سے لیس کر کے افغانستان کے سامنے کھڑا کرنے پر مہم ہوا تھا۔ ہیری کیننگہم اپنے تمام تر وسائل بروئے کار لا کر ان مچھری ہوئی کڑیوں کو یکجا کرنے میں مصروف تھا، پاکستان کی ایٹمی استعداد پر کاری ضرب لگانے کی سازشیں دروں خانہ پروان چڑھ رہی تھیں۔ برادرانہ تعاون کے نام پر بلوچ اس ڈیل کے تحت ایران سے حساس ایٹمی آلات اور سازوسامان کی چھ سوئٹھ ڈولٹی جو کھپ پاکستان کو دی گئی تھی، اسے راستے ہی میں تباہ کرنے کی تیاریاں کر لی گئی تھیں۔ اگر وہ کھپ کی طرح پاکستان پہنچ بھی جاتی تو خلا میں گردش کرتے ہوئے کسی جاسوس سیارے سے مخصوص ریڈیائی اشارے نشر کر کے اس کھپ کے ساتھ دوسری ایٹمی تنصیبات کو بھی ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا جاسکتا تھا۔ ایران پاکستان کے ساتھ بحریہ اور قریبی تعاون کر رہا تھا اس لیے بحریہ پر پریکٹس کے ذریعے اس کے خلاف بھی ایک مہم اور مضبوط فرد جرم تیار کی جا رہی تھی تاکہ مناسب وقت آنے پر اسے بھی سرکشی اور نافرمانی کی عبرت ناک سزا دی جاسکے بظاہر ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے پاکستان اور اس کے ہمدردوں کے لیے پینے اور زندہ رہنے کی ساری راہیں مسدود کرنے کا فیصلہ کر کے آخری انتظامات کیے جا رہے ہوں۔

دیر پاؤت خود بارسا نہیں تھی اس کا داغ داغ باضی میرے سامنے بے نقاب تھا لیکن اس وقت وہ اپنے دل و جان کی گمراہیوں سے میرے ساتھ تھی۔ میں اس کے ظاہر و باطن سے بخوبی واقف تھا جبکہ ظفر کی ذات سے میری شناسائی بہت محدود اور صرف ظاہری تھی۔

اس شخص موڑ پر میں نے پوری طرح غیر جانب دارانہ کردار حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا تاکہ دیر اور ظفر خود ہی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر سکیں۔

”تنت... تو کیا تم بھی... تم بھی اس کے ساتھ مل گئے؟“ میرے بدتموں میں کوئی جنبش نہ پا کر ظفر پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ حیرت سے پکارتے ہوئے بولا۔

”میں کسی سے نہیں ملا“ میں نے کسی غیر متوقع اور ڈرامائی موڑ کے لیے اپنی پوزیشن بچاتے ہوئے، دھیمی آواز میں کہا، ”اپر جنم کے دہانے کھلے ہوئے ہیں، یہاں دیرا کے ہاتھ میں بھرا ہوا پستول ہے۔ میں نے اپنی جگہ چھوٹی تو وہ کسی جھجکا یا مال کے بغیر تمہیں گولی مار دے گی۔ میں اس کی سرور مری اور سفاکی سے واقف

”کر عمل جیسی جوت کے آدمی صرف اور صرف پیسے کے غلام ہوتے ہیں“ دیرا سرد لہجے میں کہہ رہی تھی ”پیسے کے کل پر انہیں کوئی بھی خرید سکتا ہے۔ اب تم مجھے یہ بتاؤ گے کہ تم اول خان جیسے محب وطن آدمی کو قریب دے کر کس طرح اسٹیشن ٹاک فورس میں داخل ہوئے اور تمہارا مقصد کیا ہے؟“

دیرا کا وہ انداز بہت جارحانہ اور اس کے سوالات جان دار تھے چند لمحوں کے لیے ظفر کی ذات پر سے میرا اعتماد متزلزل ہو گیا۔

”اس کے ہاتھ سے پستول چھین کر دوڑ پھینک دو!“ ظفر نے پورے اعتماد کے ساتھ مجھ سے کہا لیکن میں تذبذب اور بے یقینی کے انداز میں اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔

”خبردار!“ اسی لمحے دیرا نے اپنے پستول والے ہاتھ کو ہلکی سی جنبش دے کر کہا ”کسی نے بھی اپنی جگہ چھوڑنے کی ممانعت کی تو میں بلا تامل ظفر کی کھوپڑی میں پھینکا ہوا سیسہ اتار دوں گی۔“

غیر ارادی طور پر زمین پر میرے قدموں کی گرفت اور مضبوط ہو گئی۔

میرے ذہن میں ان حالات و واقعات نے سراجا ہمارا شروع کر دیا، جبکہ تحت ظفر نے اول خان کی جگہ سنبھالی تھی۔ المہدی نامی لاچ کی گرفتاری، اول خان کا بہت بڑا کارنامہ تھا لیکن اسے اتنی جگہ میں شہر سے روانہ کیا گیا کہ وہ کارروائی صریحاً تذلیل اور سزا کے زمرے میں نظر آتی تھی۔ پھر ان ہی پُر اسرار حالات میں ظفر نے اول خان کی جگہ سنبھال لی۔ اس دوران میں میرا اول خان سے کوئی رابطہ نہیں ہو سکا تھا لیکن میرے استفسار پر ظفر نے مجھے بتایا کہ اول خان کو المہدی والے کارنامے پر اتنے انعام اور اعزاز سے نوازا گیا تھا کہ وہ اپنے تبادلے پر بہت خوش تھا۔ دیرا کے انکشافات پر مجھے شبہ ہونے لگا کہ ظفر نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ شاید اسٹیشن ٹاک فورس میں بھی کرائے کے کچھ آدمی گھس آئے تھے اور ان ہی کی سازش کے نتیجے میں اول خان کو معزول یا مقبوت کر کے ظفر کو سامنے لایا گیا تھا تاکہ اس کے ذریعے محبت وطن عناصر کی جمع ہوتی کر کے دشمنوں کے مذہم مقاصد کی تکمیل کے مشن کو آگے بڑھایا جاسکے۔

اگر میں کر عمل جیسی جوت کے کردار سے پوری طرح باخبر نہیں تھا تو بالکل ہی خبر گہری نہیں تھا۔ سیاسی جرائم اور عالمی دہشت گردی کے معاملات میں کارلوں کے ساتھ ہی اس کا نام بھی بار بار دنیا بھر کے اخبارات کی شہ سرخیوں میں آتا رہا تھا۔ دیرا نے ظفر کو واضح طور پر کر عمل جیسی جوت کے آدمی کی حیثیت سے پہچانا تھا اور ظفر نے بوکوٹا کی سماجی تقریبات کا ذکر کر کے اس الزام کو تسلیم کر لیا تھا۔

میری نظروں میں وہ بہت خوف ناک اور دھماکا خیز صورت حال تھی جس کے نتیجے میں میرا پورا مشن تباہی سے دوچار ہو سکتا

مکھو رہا بھرپاٹ لےجے میں بولا ”یہ تین برس پرانی بات ہے۔ اب میرا جیسی جوز سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“
”یہ تمہارا بیان ہے۔ اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ تم بچ بول رہے ہو۔“

”اکی جرن پر ظفر کی کھوپڑی جتنی اور وہ تیز لےجے میں بولا۔“
”تمہارے بارے میں بھی سب کچھ تمہارا یا ذہنی کا بیان ہے۔ میں کیسے مان لوں کہ جیسی جوز کے دست راست ’ایشن‘ سے اب تمہارا کوئی جائز یا ناجائز تعلق نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تم دونوں اسی کے لیے کام کر رہے ہو۔“

”مجھے اپنی تنظیم کے لیے جیسی جوز سے ایک اہم کام لینا تھا اس لیے میں نے دانستہ ایشن سے رسم وراہ بڑھائی تھی ورنہ سب جانتے ہیں کہ ویرا لائیڈ صرف اور صرف شی کے لیے کام کرتی ہے۔“

”شی کی لغت میں پاکستان سے ہمدردی کا خانہ کب سے پیدا ہو گیا؟“ ظفر بدستور بھنایا ہوا تھا۔

”اس کا شی سے کوئی تعلق نہیں۔ میں جو کچھ کر رہی ہوں، ذہنی سے دوستی کی خاطر کر رہی ہوں۔“

”اچانک ظفر، ویرا کے عقب میں دیکھتے ہوئے پُر اعتماد انداز میں مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ سے مجھے شبہ ہوا کہ شاید سلطان شاہ اس کی مدد کے لیے ویرا کو بس کرنے والا تھا۔ میں نے آدھر سر سمھایا اور یہی غلطی ویرا سے بھی سرزد ہوئی اور اسی لمحے اس کا بھرا ہوا ہسپتال اس کی گرفت سے نکل کر ظفر کے قبضے میں پہنچ گیا۔“

ہوں اسی لیے اپنی جگہ سے ہلنے سے مجبور ہوں۔ میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ یہ ہمارے ساتھ مل چکی ہے۔ تم اسے مطمئن کر دو گے تو یہ خود تم سے معافی مانگ لے گی۔“

”یہ میرا وعدہ ہے؟“ ویرا استراہیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولی
”جیسے اسے پورا یقین ہو کہ ظفر اس کے سوالات کا کوئی معقول جواب نہیں دے سکے گا۔“

”ظفر کے چہرے پر اشتعال، غصے اور بے بسی کے ملے جلے اثرات پھیل گئے اور وہ طاقت آمیز لہجے میں مجھ سے مخاطب ہو کر بولا ”تم نے مجھے اپنے گھربلا کر ذلیل کیا ہے، میرے آدمیوں نے تمہارے دفاع میں اپنے سر دھڑکی بازی لگائی ہوئی ہے، وہ اپنے خون میں نہا رہے ہیں اور تم نے مجھے ایک آوارہ عورت کا پرغمالی بنوا دیا ہے۔“ آوارہ عورت!“ ویرا سلگانے والے انداز میں ہنسی ”مجھے یہ

خطاب پسند آیا۔ آوارہ مرد، عورتوں کی زندگیاں خراب کرتے ہیں اور آوارہ عورت، مردوں کی زندگیاں عذاب بنا دیتی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ تم مجھے ایسا سمجھتے ہو کیونکہ میں ایسا ہی بننا چاہتی تھی۔“

”ظلالعت کے کیزے گندی ٹالیوں میں ہی خوش رہتے ہیں۔“
ظفر اس کی بات کاٹ کر رخ لےجے میں بولا ”اس لیے اپنی خوشی لے اسباب بیان کرنے کے بجائے یہ بتاؤ کہ تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟“

”میں صرف یہ جانتا چاہتی ہوں کہ کرل جیسی جوز جیتے ضمیر فروش مجرم کا آدمی، ایجنٹل ٹاسک فورس میں کیا کر رہا ہے؟“ ویرا نے سخت لہجے میں اپنا سوال، بھرا یا۔

ظفر اپنا نپلا، بونٹ، دانتوں میں سمیٹنے، چند ثانیوں تک ویرا کو

مقبول ترین مصنف محی الدین

⑧ بہترین کہانیوں کا مجموعہ

خوبصورت
گیٹ اپ

سحر اگھر

کمپیوٹرائزڈ
کتابت

ڈاک خرچ 25 روپے

قیمت 100 روپے

محی الدین نواب کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ ”ایمان کا سفر“ بھی دستیاب ہے
کتاب کی قیمت: بمعہ ڈاک خرچ بذریعہ منی آرڈر پیشگی روانہ کریں

پوسٹ بکس 23

کراچی 74200

کتابیات پبلی کیشنز

5802551-5802552-5895313 فون
kitabiat1970@yahoo.com

حمیس کرنا چاہیے تھا۔ لیکن اب ہمیں ساتھ کام کرنا ہے۔ باہمی اتحاد کی فضا پیدا کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہمارے ذہن سے شبہات و شکوک مٹ جائیں ورنہ یہی سب بے اعتمادی کی نازک موڑ پر ناقابلِ حلانی نقصان پہنچا سکتی ہے۔

”ہماری سوچ قابلِ قدر ہے“ ویرا نے مصالحتانہ انداز میں کہا۔ ”مگر میں یہ سوچ رہی ہوں کہ دنیا اس قدر وسیع ہونے کے باوجود کتنی مختصر سی ہے کہ یوگوتا جیسے دور دراز شہر میں پھرنے کے بعد ہم آج پھر کراچی میں اتفاقاً ایک دوسرے کے سامنے آ گئے؟“

”اس پر بھٹ کر بھی غور کیا جاسکتا ہے“ میں نے کہا اور ہم چاروں ہنستے ہوئے ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئے۔ چند ثانیوں قبل پیدا ہونے والی تخیلی اور کشیدگی حیرت ناک سرعت کے ساتھ تحلیل ہو چکی تھی۔ بظاہر اس کا صرف ایک ہی سبب تھا کہ ہم سب ایک اہم اور بڑے مشن کے لیے کام کر رہے تھے اور ہر ایک نے پوری بے لوثی کے ساتھ اپنی اپنی نظر انداز کرنے کا تہیہ کیا ہوا تھا۔

باہر پوری گھن گرج کے ساتھ فائزنگ کا تاولہ جاری تھا اور اندر ظفر نہایت اطمینان کے ساتھ سلطان شاہ کی مزاح پر ہنسی کر رہا تھا۔ اس نے اپنے مخصوص تفتیشی انداز میں سلطان شاہ سے متعدد سوالات کیے لیکن حملہ آوروں کی شناخت سامنے نہیں آ سکی۔

اسی دوران میں ویرا ہاتھ روم کی جانب گئی تو میں نے باہر ہونے والی محاذ آرائی میں پولیس کی متوقع مداخلت کے بارے میں اپنے اندیشے کا اظہار کیا لیکن ظفر نے مجھے یہ بتا کر مطمئن کر دیا کہ پولیس کے عملے کو صبح کا سورج طلوع ہونے تک اس علاقے سے دور رکھنے کا بندوبست کیا جا چکا تھا۔

”ابتدائی نقصانات اٹھانے کے بعد دونوں فریق ہوشیار ہو گئے ہیں“ سلطان شاہ نے کہا ”بظاہر یہ مقابلہ بے مقصد نشانے بازی میں تبدیل ہوتا جا رہا ہے۔“

”فائز کی گونج سے اس کی سمت اور قاصطے کا اندازہ ہو جاتا ہے“ ظفر مسکراتے ہوئے بولا ”میرے کان اپنے آدمیوں کے فائز بخوبی پہچان رہے ہیں۔ وہ لوگ چاروں طرف پھیل کر حملہ آوروں کو گھیرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں نے ان کو ہدایت کی تھی کہ زیادہ سے زیادہ حملہ آوروں کو زندہ پکڑنے کی کوشش کی جائے تاکہ ان کی زبانیں کھلو کر ان کی اصلیت کا سراغ لگایا جاسکے۔“

”لاشیں ہاتھ لگ جائیں تو ہمیں بہت کچھ معلوم کیا جاسکتا ہے۔“ ویرا گفتگو میں شریک ہوتے ہوئے بولی ”میری اور ذہنی کی شہر کے بیشتر شورشہ پشٹوں سے واقفیت رہ چکی ہے۔ ہاتھ آنے والوں میں سے کوئی نہ کوئی یقیناً پہچان لیا جائے گا۔“

”ان لوگوں کے بارے میں ہمارا قیاس کیا کرتا ہے؟“ ظفر نے مجھ سے سوال کیا۔

”مصلح کام نہیں کرتی“ میرا ذہن اس بارے میں بڑی طبع

سلطان شاہ جہاں تھا بدستور وہیں کھڑا ہوا تھا۔

”اور اب“ ظفر ہسٹول کے دستے پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے فیصلے لیجے میں بولا ”جی چاہتا ہے کہ میں تم تینوں کے پیچھے پاش پاش کر دوں۔“

”کرتل جیسی جوز کے آدمی سے اس کے علاوہ کوئی اور توقع کی بھی نہیں جاسکتی“ ویرا اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ ”موت بابرار نہیں صرف ایک بار آتی ہے اور اگر میری موت تمہارے ہاتھوں آتی ہے تو اسے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔“

باہر ہونے والی فائزنگ میں تو اتار کے ساتھ ہی شدت بھی آگئی تھی۔ ابتدا میں بے درپے متعدد انسانی جینیں سٹائی دی تھیں لیکن بعد میں کسی مرے یا زخمی ہونے والے کی چیخ نہیں ابھری تھی جس کا مطلب تھا کہ ابتدائی افراطی قہری یا بے خبری میں مار کھانے کے بعد دونوں حریفوں نے محفوظ مورچے سمجھال لیے تھے اور نہایت دل جمعی کے ساتھ ایک دوسرے کو میدان سے مار بھگانے کے لیے چاند ماری میں مصروف تھے۔

”میں اب بھی خیر جانب دار رہوں گا“ میں نے کہا ”پہلے ویرا مسلح تھی اور اب تم ہتھیار بند ہو۔ اصل فیصلہ تم دونوں ہی کے درمیان ہوتا ہے۔ مجھے دونوں پر پورا پورا اعتماد ہے۔“

ظفر ایک جھٹکے سے ویرا کی طرف متوجہ ہو گیا اور اچانک ہی ہسٹول اپنی جب میں ڈالتے ہوئے بولا ”تین برس پہلے میں نے کرتل کو چھوڑ دیا تھا۔ اس کے ساتھ میں نے جو کچھ سیکھا وہ اب میرے کام آ رہا ہے۔ میں تمہیں اتنا ضرور بتا دوں کہ میں نے کرتل کے ساتھ رہتے ہوئے بھی اپنے وطن کے خلاف کوئی کام نہیں کیا۔ مجھے ڈھونڈ کر آفر دی گئی تھی اور میں فوراً ہی جیسی جوز کو چھوڑ کر پاکستان آ گیا۔ شدید مشقت، ذہنی جھناٹا اور مہم جوئی سے بھرپور زندگی کے بعد رٹائرمنٹ کے بحیال ایک اور لاتناہی سانے سے تنگ آ کر میں ملک سے باہر نکلا تھا۔ وہاں میں ان لوگوں سے ٹکرایا بظاہر وہ کرائے کے فوجیوں کی تنظیم تھی۔ میں یہی سمجھ کر ان کے ساتھ شامل ہوا لیکن بعد میں پتا چلا کہ جیسی جوز بڑا آدمی جرائم میں بھی ملوث ہے۔ اس کے آدمی ڈرگ بافیا کو مسلح تحفظ فراہم کرتے تھے۔ ان کاموں میں میری مہم جوئی نہایت طبیعت کو تسکین ملتی تھی اس لیے میں ان کے ساتھ لگا رہا پھر جوں ہی مجھے ایس بی ایف کی آفر ملی، میں اس بے نام و نشان زندگی کو خیر باد کہہ کر یہاں آ گیا۔“

”لیکن تم یہ سب کیوں بتا رہے ہو؟“ ویرا نے قدرے حیرت کے ساتھ سوال کیا ”اب تو تم مجھے غیر مسلح کہتے تھے اور ہم تینوں پر حاوی تھے۔“

”ہم لوگ اپنی اپنی فضا کے لیے مشن کے لیے زندہ رہے ہیں“ ظفر سنجیدگی سے بولا ”مجھے پہچاننے کے بعد تم نے وہی کیا جو

الہما ہوا تھا "بظاہر یہ حرکت ہمیری کیسبخر کے آدمیوں کی ہو سکتی ہے
کہ جب تک اس وقت وہ ہمارا ایسا حریف ہے جس سے ہمارا کوئی رابطہ
نہیں ہے لیکن وہ ہم تک پہنچنے کی کوشش ضرور کر رہا ہوگا۔ وہ لوگ
یعنی طور پر سلطان شاہ کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہیں اور
انہوں نے ہی سلطان شاہ پر تشدد کیا ہوگا۔"

اچانک ہی باہر گونجتا ہوا بارودی شور ماند پڑنے لگا۔ پھر چند ہی
لمحوں میں فائرنگ کا تبادلہ لکھتے موقوف ہو گیا اور ظفر اضطراری
طور پر اپنی جگہ جمود کر کھڑا ہو گیا۔
ہم تینوں نے بھی اس کی تھلید کی "تم ایک بیک کچھ پریشان
ہو گئے ہو؟" ویرانے اس سے پوچھا۔

ظفر مسکراتے ہوئے بولا "مجھے پریشانی اس بات کی ہے کہ یہ
مقابلہ میری توقع کے برعکس صرف پچیس منٹ میں ختم ہو گیا۔ میرا
اندازہ تھا کہ میرے آدمی ایک ڈیڑھ گھنٹے سے پہلے انہیں زیر نہیں
کر سکیں گے۔"

"پھر اب کیا ہوگا؟" سلطان شاہ نے اضطراری لہجے میں سوال
کیا۔

"کچھ بھی نہیں" ظفر اس کی طرف گھوم کر بولا "میرے آدمی
قیدیوں اور لاشوں سمیت اسٹیشن فور پنچیس گئے اور پھر میرا کام
شروع ہو جائے گا۔"

"شاید تمہیں علم نہ ہو کہ اسٹیشن فور میں پہلے میری رہائش
تھی" ویرانے بولی۔
"مجھے سب کچھ معلوم ہے اور شاید تمہیں یہ جان کر حیرت
ہو کہ ہمارے طویل قبضے کے باوجود ابھی تک اس مکان کا کوئی
دوسرا سامنے نہیں آیا ہے۔"

"وہ بھی کوئی خاص چیز ہی رہا ہوگا" ویرانے نے مار کر بولی "تم
لوگوں کے نکلنے کے بعد اپنے مکان کا رخ کرے گا۔ موجودہ حالات
میں تو اسے اپنا مکان ہاتھ سے نکالنا ہی نظر آ رہا ہوگا۔"

"ہم بالکل عام سے شہری ہیں، وردی تک استعمال نہیں
کرتے۔ پھر کسی کو ہم سے اس قدر خوف زدہ ہونے کی کیا ضرورت
ہے؟" ظفر نے ویرانے سے کہا اور میں نے اس کی آنکھوں کی چمک
سے محسوس کیا کہ ابتدائی تھکنے کی باوجود وہ ویرانے کے حسن و جمال
سے بہت زیادہ مرعوب ہو چکا تھا۔

ویرانے بھی ظفر کی اس کمزوری کو بھانپ لیا تھا اس لیے وہ
ٹٹنی کے ساتھ بولی "تم لوگوں کی بھاری گاڑیوں اور لڑاکا جھوس
کی وجہ سے یہ معلوم ہوتا ہے جیسے تم لوگوں نے ابھی ابھی محاذ سے
لوٹ کر وریاں اتاری ہیں۔ بعض باتیں چھپانے کے باوجود
ضرورت سے زیادہ نمایاں ہو جاتی ہیں اور شاید اسی وجہ سے شر کے
فٹنے تم لوگوں سے دور بھاگتے ہیں ورنہ اسٹیشن فور پر کئی بار
دھاوا بولا جا چکا ہوتا۔"

"میں چل رہا ہوں" ظفر نے ہم تینوں میں سے کسی سے بھی
خصوصی طور پر مخاطب ہوئے بغیر کہا لیکن اس کے اگلے فقرے سے
واضح ہو گیا کہ اس کا بیٹا ویرانے کے لیے تھا۔
وہ کہہ رہا تھا "مجھے دیکھنا ہے کہ یہ لوگ کون ہیں اور کس کے
لے کام کر رہے ہیں۔ تم میں سے کوئی میرے ساتھ چلنا چاہے تو وہ
میرا مسلمان ہوگا۔"

ویرانے اپنی بے نیازی ظاہر کرنے کے لیے، ظفر اس وقت
کسی اور طرف متوجہ تھا اس لیے ویرانے سب سے بچانے والے
انداز میں اپنے ہونٹ سیڑھ کر بیٹھے آنکھ ماری اور تیزی سے ظفر کی
طرف جھپٹتے ہوئے بولی "آج میں تمہاری میزبانی سے لفٹ اندوز
ہونے کے موڈ میں ہوں۔"

"پھر میرے پیچھے چلی آؤ" اس نے نکاسی کے راستے کی طرف
بڑھتے ہوئے بے پروائی سے کہا۔
"اجازت ہو تو ہم بھی آجائیں؟" میں نے ظفر کو اس کی
حقارت کا احساس دلانے کی نیت سے پوچھا۔
"بالکل آزاد" ظفر خوش دلی کے ساتھ بولا "میری تھوڑی گری
دیکھ کر تمہارے دل ہلنا بھول جائیں گے۔ میں پہلے ہی دار میں
ان لوگوں کے اوسان خطا کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔"

"پھر میں نہیں جاؤں گی۔ میرا دل تشدد کے معاملے میں خاصا
کمزور ہے۔ انسان کے دل میں گولی اتارنے کے مقابلے میں اسے
معذور کرنا میرے لیے بہت مشکل کام ہے" ویرانے موقع پاتے ہی
اپنا ارادہ بدل دیا۔

بظاہر اس نے اپنی کمزوری کا اعتراف کیا تھا لیکن میں سمجھ گیا
تھا کہ اسے کوئی فوایا اس کی سیکریٹری کی طرف سے آنے والی فون
کال کا دھیان آیا تھا۔ وہ اس اہم ترین فون کال کے انتظار میں
بڑا تھ خود فلیٹ میں موجود رہتا جانتی تھی۔ اس کی جگہ کوئی اور فون
دصول کرتا تو کوئی فو کا ساؤنڈ اس کیسٹر اس ابھی آواز کو پہچاننے
سے انکار کر دیتا اور کال خود بخود منقطع ہو جاتی۔

ویرانے کے ارادے میں رد ہونے والی وہ غیر متوقع تبدیلی ظفر
کے لیے انتہائی مایوس کن ثابت ہوئی۔ اس نے ویرانے کو اپنے ساتھ
لے جانے کے لیے بہت زور لگایا لیکن وہ خوش خلقی کا مظاہرہ کرتے
ہوئے معذرت کرتی رہی۔ سلطان شاہ زخمی تھا اور اسے آرام کی
ضرورت بھی تھی اس لیے میں اکیلا ہی ظفر کے ساتھ فلیٹ سے نکل
آیا۔ میری مداخلت کی وجہ سے ظفر کا خوشگوار موڈ اچانک ہی چوٹ
ہو گیا تھا۔

فلیٹ کا دروازہ کھول کر باہر نکلے ہی میرے نتھنوں میں جٹے
ہوئے بارود کی تیز بو گھس آئی جس کا مطلب تھا کہ ہماری عمارت
کے سامنے فائرنگ کا خاصا زور رہا تھا۔

زیوں میں گہری تاریکی کا راج تھا اور میرے دل میں یہ خوف
سرا بھار رہا تھا کہ کہیں ہم اندھیرے میں جھپے ہوئے کسی دشمن کی
گوئیوں کا نشانہ نہ بن جائیں لیکن ظفر اس معاملے میں پوری طرح

مقام تھا۔

کے برابر والی نشست پر سوار ہو چکا تھا۔ جیپ تیزی سے اچھل کر پختہ سڑک پر آئی پھر اس کے ہیڈ لیمپس کی تیز روشنی ایک وسیع چادری کی طرح تیرہ و آرا حول میں پھیل گئی۔

”تمہارے چلے جانے کے بعد تمہارے آدمیوں کی نمائندگی کرسے گا؟“ چند ٹائٹوں کی خاموشی کے بعد میں نے پوچھا۔

”میرے ہر آدمی کو معلوم ہے کہ اسے کیا کرنا ہے۔ یہاں تو میرے بہت سے آدمی نظر آ رہے تھے۔ اگر کسی جاں غسل معرکے میں صرف دو آدمی بھی رہ جائیں تو انہیں معلوم ہوتا ہے کہ ان میں کس کو کمان کرنی ہے اور کون صرف حکم کی تعمیل کرنے کا پابند ہوگا۔“

”اور پھر بھی تم کہتے ہو کہ تمہارا فوج سے کوئی تعلق نہیں ہے؟“ میں نے اس پر لطیف سا طنز کیا۔

”ہرگز نہیں“ اس کا لہجہ دو ٹوک تھا ”میں نے فوج سے اپنے تعلق سے کبھی انکار نہیں کیا۔“

”ہائیں!“ میں اس کے جواب پر ہونچکا رہ گیا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ ایس ٹی ایف فوج ہی کی ایک ذیلی اور شاید خفیہ تنظیم ہے۔“ ”یہ دعویٰ بالکل غلط اور بے بنیاد ہے“ اس نے سختی کے ساتھ میری بات کی تردید کی۔

”پہیلیاں بھجوا رہے ہو“ میں نے قدرے چڑکر کہا ”فوج سے تعلق سے انکار بھی نہیں کرتے اور پھر بھی ایس ٹی ایف کا فوج سے کوئی تعلق تسلیم نہیں کرتے۔ یہ تو بہت عجیب سی بات ہے۔ اس کے دونوں پہلو خودی ایک دوسرے کی تردید کر رہے ہیں۔“

”تم غلط سمجھ رہے ہو“ اس نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔ ”میں ایک فرد ہوں“ میں نے اپنی ذاتی حیثیت میں تیس برس فوج میں ملازمت کی ہے۔ آرٹری کے کٹرل کے عہدے سے ریٹائر ہونے کے بعد میں کو لمبیا چلا گیا جہاں کٹرل جیسی جواز نکر گیا۔ اب میں جو کچھ کر رہا ہوں، اس کا فوج سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مجھے ابتدا ہی میں بتا دیا گیا تھا کہ میری ملازمت سرکاری یا نیم سرکاری نہیں بلکہ نجی ہوگی اور خراب کارکردگی پر مجھے کسی بھی دقت ملازمت سے برطرف کر دیا جائے گا۔“

”اگر یہ واقعی نجی ملازمت ہے تو تمہیں یہ تو معلوم ہو گا کہ تمہارا آجر کون ہے اور تم اپنے فرائض کے سلسلے میں کس کو جواب دہ ہو؟“ مجھے ایس ٹی ایف کے بارے میں گریڈ نے کا موقبل گیا۔ ”واجبات بروقت ملتے رہیں تو کسی کو فکر نہیں ہوتی کہ اس کا آجر کون ہے۔ جہاں تک جواب دہی کا تعلق ہے تو میں اپنے اوپر والے کے بعد کسی کو نہیں جانتا۔ اسٹیشن ٹانک فورس میں ہر شخص اپنے کام سے کام رکھتا ہے، دوسروں کے بارے میں غیر ضروری تجسس میں مبتلا نہیں ہوتا۔“

”پھر اہم سرکاری اہل کاروں اور پولیس کے محکمے میں تم لوگوں

اس نے پہلی لینڈنگ ختم کرتے ہی اپنے دہانے سے ایک مخصوص حیوانی آواز نکالی۔ وہ شاید کوئی اٹامہ تھا کیونکہ جواب میں زینوں کے اختتام سے اسی قسم کی ایک اور آواز سنائی دی اور ظفر میرے شانے پر ٹھیک دیتا ہوا، بے فکری سے آگے بڑھ گیا۔

آخری زینوں پر سے باہر کا منظر بہت ڈراؤنا نظر آ رہا تھا۔ سڑک پر ہر طرف گہری تاریکی اور سنانے کا راج تھا اور فضا پر موت کا سا سکوت چھایا ہوا تھا۔

عمارت سے نکاسی کے راستے پر پہنچتے ہی تاریکی میں سے اچانک دوسارے رنگ کر ہمارے دائیں بائیں آگئے، وہ داخلی راستے سے باہر اندھیرے میں چھپے ہوئے تھے اور پوری طرح مسلح تھے۔

”کیا پوزیشن ہے؟“ ظفر نے ان سے نرم لیکن تھمکانے لہجے میں سوال کیا۔

”دشمن پسپا ہو گیا۔ ایک لاش ہمارے قبضے میں بھی ہے“ ان دونوں میں سے ایک نے کہا۔

”تو کیا وہ لوگ یہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے؟“ ظفر نے حیرت سے پوچھا۔

”سب نہیں“ بس آپ کے پیچھے ایک آدمی نے عمارت میں مچھنے کی کوشش کی تھی۔ پہلا فائر اسی پر کیا گیا تھا، وہ گویاں لگتے ہی راستے میں ڈھیر ہو گیا تھا۔ ہم نے اس کی لاش راستے سے گھٹیت کر باہر دیوار کے ساتھ ڈال دی ہے؟“ اسی شخص نے کہا۔

اس کے اشارے پر ہم دونوں دیوار کے ساتھ بڑی ہوئی لاش کی طرف متوجہ ہوئے پھر ظفر بولا ”تین آدمی یہاں رگ کر عمارت کی حفاظت کریں گے۔ بقیہ لوگ لاشوں اور قیدیوں کو لے کر کیپ آفس روانہ ہو جائیں۔ میں اسی طرف جا رہا ہوں۔“

ظفر ان دونوں کو ہدایت دے کر سڑک کی طرف بڑھ گیا۔ اس دقت میں نے دیکھا کہ اس طرف دور دور تک روشنی کی کوئی کرن نہیں دکھائی دے رہی تھی۔ لڑنے والوں نے شاید سب سے پہلے اسٹریٹ لیمپس کو بجھنی لیا تھا تاکہ اندھیرے کی آڑ لے کر وہ اپنی نقل و حرکت کو اپنے حریف کی نظروں سے محفوظ رکھ سکیں۔“

اسی کے ساتھ تمام عمارتیں بھی اندھیرے میں نہائی ہوئی تھیں۔ کانوں کے پردے پھاڑ دینے والی فائرنگ کے شور سے علاقے کے جو کچھ بیدار ہو گئے تھے وہ بھی اپنی جانوں کے خوف سے روٹھناں گل کیے، اندھیرے میں ڈبکے ہوئے تھے اور وہ پورا علاقہ ایسی گھور تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں بھائی دے رہا تھا۔

ایک اوٹ میں ظفر کی جیپ موجود تھی۔ اس نے ڈرائیونگ سیٹ پر سوار ہو کر خودی انجن اشارت کیا۔ اس اٹام میں اس

ہے "اس نے کہا "ہر تھانے دار لازمی طور پر سول سروس کے ذریعے آیا ہوا افسر ہو اور اس کا ماتحت عملہ مقامی تھانے کی حدود سے تعلق رکھتا ہو تاکہ ان لوگوں پر ڈسپلن کے ساتھ ہی اخلاقی اور معاشی و قانونی تعلیم پیدا ہو۔ ایک شریا صوبے میں دوسرے شریا صوبے کی پولیس لگانے کی پالیسی گورنوں نے اپنائی تھی تاکہ ہر سپاہی اخلاقی و معاشرتی قیود سے آزاد رہ کر صرف ان کا وفادار رہے۔ ہم بد قسمتی سے آج تک اسی لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں۔" "اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ پولیس کے موجودہ عملے میں سے بیشتر کو گھر بٹھانا پڑ جائے گا۔"

"قطعی نہیں۔ عریا سروس کی حد پوری کر کے انہیں ایک نہ ایک دن رٹائر ہونا ہے۔ صرف نئی بھرتیوں کے لیے اصول بنالے جائیں تو پانچ سات برس میں ہی پورا ڈھانچا بدل جائے گا۔ مجھے اس نکتے پر اختیار مل جائے تو میں اس سے بھی کم مدت میں نقشہ بدل سکتا ہوں۔"

"مشکل یہ ہے کہ اچھی باتیں لوگ رٹائر ہونے کے بعد سوچتے ہیں۔ جب تک سروس میں رہتے ہیں دل دجان سے اسی ناکارہ اور فرسودہ نظام سے جو تک کی طرح چنے رہتے ہیں۔" "کیا مجھ پر طنز کر رہے ہو؟" اس نے مین بات کاٹ کر تیزی سے پوچھا۔

میں بے اختیار ہنس پڑا "پانی اتنا قاتل خلیب کی طرف چلا گیا ورنہ

کے اردو سوخ کا کیا سبب ہے؟" "ہماری نیک نامی" ظفر کے پاس جواب تیار تھا "سارے خلیب اور سرکاری ادارے جانتے ہیں کہ ہم لوگ ملک اور قوم سے غدا، کام کرتے ہیں اس لیے ہمارے ساتھ تعاون کیا جاتا ہے۔" "پولیس والے نیک ناموں کو رگیدنے کے بارے میں خاصی شرت مچتے ہیں" میں نے اسے یاد دلایا۔

"یہ سب نکلے درجے کے غیر تعلیم یافتہ لوگوں کی حرکتیں ہوتی ہیں اور پولیس کے ساتھ ساتھ دوسرے محکموں میں شاید اس سے زیادہ ہوتی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پولیس کا دن رات عوام سے واسطہ پڑتا ہے اس لیے ان کی جبری حرکتیں بہت تیزی کے ساتھ شرت پاتی ہیں اور وہ زیادہ بدنام ہیں۔ یہ نہ سمجھ لیتا کہ ماسی ان پڑھ اور نیم خواندہ پولیس والے برے ہوتے ہیں۔ ان میں بھی بہت سے لوگ مثالی کردار رکھتے ہیں لیکن اوپری سطح پر ہونے کے ذریعے جو سلجھے ہوئے لوگ آتے ہیں ان میں برائیوں کا چاب بہت کم ہے پڑھے لکھے افسر بھی جائیں تو ہر کس و ناکس لوگ نہیں کرتے۔ دیکھ بھال کر کاڈ کا لبا ہاتھ مارتے ہیں جس کی نفی تشریح نہیں ہوتی۔"

"پولیس کے بارے میں بڑھتی ہوئی شکایتوں کا کوئی حل بھی ہے؟" ظفر کا رخ غیر ارادی طور پر بدل گیا۔

"میری دانست میں تو اس کا حل بہت سیدھا اور آسان سا

سب بک کتب محض کے مشورے کتابی شکل میں دستیاب ہیں

انکا

دو حصے مکمل قیمت: 50/- روپے فی حصہ
ڈاک خرچ: 23/- روپے

اقبال

دو حصے مکمل قیمت: 50/- روپے فی حصہ
ڈاک خرچ: 23/- روپے

غلام احمد

قیمت: 40/- روپے
ڈاک خرچ: 23/- روپے

کتابیات پبلی کیشنز، پوسٹ بکس ۲۳-۱، کراچی

میں ان میں سے ایک قیدی کو پہچان چکا تھا۔ وہ شر کا ایک بھاری
بد معاش تھا جو اپنے شکار کو ثبوت چھوڑے بغیر قتل کرنے میں غار
شہرت رکھتا تھا، کہا جاتا تھا کہ وہ اٹھارہ بیس افراد کو ہلاک کرنے
بادو بھی قانون کی گرفت میں نہیں آسکا تھا۔

پتا نہیں وہ محض اتفاق تھا یا ظفر نے استاد صدو کو پہچان
تھا کہ اس نے اچانک ہی صدو کے داہنے گھٹنے پر ٹھوکے سے ٹھہرا
ضرب لگائی اور صدو ہوا میں اچھل کر پختہ فرش پر گر گیا۔

”اس کی ایک ٹانگ اس درخت کے تنے سے اور دوسری
میری جیب کے بھرہک سے باندھ دو“ ظفر نے بالکل سپاٹ اور
وجہ سے لہجے میں اپنے آدمیوں کو ہدایت کی۔

دو آدمی بھوکے عقابوں کی طرح استاد صدو پر ٹوٹ پڑے
جس کے ہاتھ بدستور پست بندھے ہوئے تھے پھر آٹا ٹائٹل میں صدو
کی ٹانگیں ایک لمبی رسی کے دونوں سروں کی مدد سے ظفر کی ہدایت
کے مطابق باندھ دی گئیں بقیہ تینوں قیدی دہشت زدہ نظروں سے
وہ منظر دیکھ رہے تھے۔

ظفر ان میں سے کسی پر بھی نگاہ ڈالے بغیر اپنی جیب کی طرف
بڑھ گیا۔

انجن اشارت کر کے اس نے اس قدر بے رحمی کے ساتھ
جیب کو پورس کیا کہ رسی میں بندھے ہوئے قیدی کا دلخراش انہماک
دیکھ کر میرے دونٹے کھڑے ہو گئے ایس ٹی ایف کے کئی افراد بھی
اپنی دلی دلی اضطرابی چیخوں پر قابو پانے میں کامیاب نہیں
ہو سکے دو قیدی اپنے اسامی کا جسم چرنے اور اس سے خون کے
تیز فوارے ایلنے کا منظر دیکھتے ہی گر کر بے ہوش ہو گئے تیسرا
جگہ کھڑا بیدار مجنوں کی طرح لرز رہا تھا۔ دہشت سے اس کا چوہا
پڑ گیا تھا اور آنکھیں اپنے حلقوں سے باہر ابلتی ہوئی نظر آتی
تھیں۔

چاروں قیدیوں کے دہانوں میں حلق تک کپڑا ٹھسا ہوا تھا اور
ہونٹوں پر ٹیپ چپکا ہوا تھا اس لیے ان میں سے کسی کی کوئی آواز
نہیں نکل سکی۔ انہیں آزادی حاصل ہوتی تو شاید ان کی دہشت
زدہ چھین زین و آسمان تک کو لڑا کر رکھ دیتیں۔

ظفر کے شکار کا جسم بہت بڑی طرح دو حصوں میں تقسیم
تھا۔ اوپر سے ہونے ریشوں اور ٹوٹی ہوئی ہڈیوں سے زندہ خون
فوارے ابل رہے تھے ایک ٹانگ چند ہڈیوں سمیت درخت کے
تنے سے بندھی ہوئی تڑپ رہی تھی۔ بقیہ جسم اور چہرہ دوسری ٹانگ
کے ساتھ فرش پر درد رنگ گھسٹا چلا گیا تھا اور پانی سے باہر آتی ہوئی
کسی بڑی مچھلی طرح فرش پر تڑپ کر میب آوازیں پیدا کر رہا تھا۔
اس کا بھی دہانہ منقل تھا لیکن اس سفاکانہ عمل میں شاید اس کے
نر خروے کو بھی کھچاؤ کے سبب نقصان پہنچا تھا کیونکہ اس کے
ہونے سینے کے کسی حصے سے ذبح کیے ہوئے سائڈ جیسی خون
خراہٹ پیدا ہو رہی تھی۔

میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ تم تو ویسے بھی پولیس سے نہیں بلکہ
فوج سے رہناڑ ہوئے ہو۔“

اسی لمحے ایک لمبی سی گاڑی برق رفتاری کے ساتھ ظفر کی
جیب کو پیچھے چھوڑتی ہوئی آگے نکل گئی اس کی رفتاری تیزی تھی
کہ میں چونک کر تبصرہ کیے بغیر نہیں رہ سکا۔

”یہ میرے عملے کی گاڑی تھی“ ظفر نے میری بڑبڑاہٹ سن کر
کہا ”اس صبح میں میری جیب کے علاوہ دو گاڑیاں گئی تھیں۔
دوسری بھی واپس آتی ہی ہوگی۔“

”مجھے امید نہیں تھی کہ تمہارے آدمی اتنی جلدی واپس لوٹ
سکیں گے۔۔۔۔۔“

”میں نہیں کرتا ہی کیا تھا؟ لاشوں اور قیدیوں کو سمیٹ کر روانہ
ہونے میں کتنی دیر لگتی ہے۔“

”وہاں رکنے والے آدمیوں کا کیا بنے گا؟“ میں نے اگلا سوال
کیا۔

”جب تک مطلع صاف نہیں ہو جاتا، وہاں کی نگرانی برقرار
رہے گی۔ دن میں کسی وقت دوسری ٹیم ان کی جگہ سنبھال کر انہیں
آرام کرنے کے لیے بھیج دیے گی۔“

باتیں کرتے ہوئے ہم جلد ہی اسٹیشن فور پہنچ گئے۔ جہاں
ایس ٹی ایف کے عملے کی دونوں گاڑیاں ہم سے پہلے ہی پہنچ چکی
تھیں اور سب لوگ باہر جمع تھے۔

ظفر کے جیب سے اترتے ہی اس بھیڑ میں سے ایک تجربے
کار اور سنبھلے جسم والا شخص تیزی سے اس کی طرف آیا اور نیم فوجی
انداز میں انہیں بجاتے ہی مشینی انداز میں بولنے لگا ”دس
پررٹ، دو انچوز، رٹ آئل کریٹ۔ دشمن کے چار قیدی اور تین
لاشیں قبضے میں ہیں۔“

مخصوص لب و لہجے میں دی جانے والی اس رپورٹ کا مفہوم
بہت واضح تھا۔ دشمن میں ایس ٹی ایف کے دس افراد نے شرکت کی
تھی۔ ان میں سے صرف دو زخمی ہوئے اور بقیہ افراد خیریت سے
تھے اس کے مقابلے میں فریق ثانی کا نقصان بہت عبرتناک تھا۔

”قیدیوں کو یہاں فال ان کراؤ“ ظفر نے لان کی طرف نظریں
اٹھا کر سرد اور سفاکانہ لہجے میں کہا۔

قیدی لان پر موجود تھے۔ ان کے ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے تھے
اور دہانوں میں کپڑا ٹھونسنے کے بعد ان کے ہونٹوں پر ٹیپ چپکا دیے
گئے تھے جس کی وجہ سے ان کے چہرے سرخ اور متورم نظر آ رہے
تھے ظفر کے آدمی ان کو دھکیلے ہوئے پختہ ڈرائیو کے طرف
لا رہے تھے۔

میں نے دیکھا کہ ان میں سے ایک بڑی طرح زخمی تھا اور چلتے
ہوئے لٹک رہا تھا۔ اگر اس کے منہ میں کپڑا نہ ٹھسا ہوا ہوتا تو ہر
قدم پر اس کی چیخیں نکل رہی ہوتیں۔

ظفر نے صرف ایک نظر ان چاروں کو دیکھا۔ اس اثنا میں

معلوم نہیں ہوتا لیکن اوٹی اڈتی خبریں سنی ہیں کہ صدو آج کل کسی غیر ملکی کے لئے کام کر رہا تھا۔ پچھلے کئی ہفتوں سے اس کے پاس پیسے کی ریل بیل نظر آنے لگی ہے۔ وہ قیمتی کپڑے پہننے لگا تھا۔ شرابیں بھی دلاتی ہوتی تھیں۔

”یہ کیسے پتا چلا کہ وہ کسی غیر ملکی کے لئے کام کر رہا تھا؟“ ظفر نے تڑپتی کے ساتھ پوچھا۔

”صدو کے شہر میں کسی ٹھکانے ہیں۔ اس کی غیر حاضری میں کئی مرتبہ کوئی غیر ملکی فون پر اس کے بارے میں دریافت کرتا رہا تھا۔ وہیں سے خبریں پھیلنے شروع ہو گئیں لیکن صدو نے اپنے موجودہ پاس کے بارے میں سختی کے ساتھ اپنی زبان بند رکھی ہوئی تھی۔ تم نے اسے زندہ رکھا ہوتا تو بہت کچھ بتا سکتا تھا۔“

”صدو کا اڈہ کہاں ہے؟“ ظفر نے پند ٹانیوں کی خاموشی کی بعد سوال کیا۔

”دیسے تو وہ شہر کے شراب‘ جوئے اور قہر گری کے آڈوں میں ہی منڈلا رہا تھا لیکن آج کل وہ ڈینس کے ایک بنگلے میں رہ رہا تھا۔ ہم لوگوں کو اس نے وہیں جمع کیا تھا۔“

”شام یا دوپہر کو لائے جانے والے آدمی کو کہاں رکھا گیا تھا؟“

ظفر نے سلطان شاہ کا مسئلہ چھیڑ دیا۔

”صدو نے خودی اسے پہچانا تھا اور اٹھا کر اپنے بنگلے پر لے آیا تھا۔ ہم لوگ وہاں پہنچے تو قیدی کو خاصی مار پڑ چکی تھی لیکن اس نے زبان نہیں کھولی تھی۔ پھر صدو نے اسے بے ہوش کر کے کہیں پھنکوا دیا اور اپنے دو آدمیوں کو قیدی کے تعاقب پر لگا دیا۔ ان دونوں کی طرف سے اطلاع ملنے کے بعد ہی محلے کی تیاری کی گئی تھی۔ میں بچ کہہ رہا ہوں کہ اس قیدی پر تشدد میں میرا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔“

ظفر نے اس سے تفصیل کے ساتھ صدو کے ڈینس والے بنگلے کا پتا معلوم کیا اور وہاں سے ہٹ گیا۔ قیدی نے اسے بتا دیا تھا کہ ان دنوں شہر کی ایک مشہور اور جوان سال طوائف کے علاوہ ایک شوقیہ ماڈل گرل بھی صدو کے ساتھ رہ رہی تھی۔ پراسرار ذرائع سے حاصل ہونے والی خطیرہ دولت کے سارے‘ صدو ان دنوں اپنی ساری ہی حسرتیں پوری کر رہا تھا۔

اپنے ہفتوں پہنچ کر ظفر نے فوری طور پر ایک دو نفری جماعت صدو کے مکان کی طرف روانہ کر دی تاکہ وہاں کی تلاشی لے کر اس کے روابط کا سراغ لگایا جاسکے۔ اس کا خیال تھا کہ صدو کے ساتھ رہنے والی پیشہ ور لڑکیاں بھی اس معاملے میں مددگار ثابت ہو سکتی تھیں۔

”اور ان تینوں قیدیوں کا کیا بنے گا؟“ تجلیہ ہونے پر میں نے ظفر سے سوال کیا۔

”یہ لوگ قیمتی طور پر میری کسب خیر کے لئے کام کر رہے تھے اور وہ لمبہ کراس ذیل کا بہت بڑا دشمن ہے۔ ایسے لوگوں کا بہترین انجام

ظفر اپنی جیب کا انجن وہیں بند کر کے‘ اپنے شکار کے قریب پہنچ کر دھت کیے بغیر تہ کی طرح اس قیدی کی طرف آیا جو اپنے اٹھ کالہ دوڑ انجام دیکھ لینے کے باوجود ہوش میں تھا۔

میں وقت برباد کرنے کا قائل نہیں“ ظفر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سرد لہجے میں بولا ”اگر مجھے اپنے تمام سوالات کا جواب نہ ملے تو مجھے بعد دیگرے تم تینوں کا بھی یہی حشر ہوگا۔ یہ تمنا کہیں اپنا سوال دہرانے کا عادی نہیں ہوں۔“

”میں زور زور سے اثبات میں سرہلانے لگا۔ فضا میں خاصی گرمی ہونے کے باوجود اس کا چہرہ سینے میں نما گیا تھا اور آنکھیں پلٹ پلٹا کر پتلا ہوا تھا۔

”فکر کے لیا پر ایک آدمی اس قیدی کا وہاں آزاد کرنے میں

موفق ہو گیا۔

اس وقت ظفر کی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی‘ آنکھوں میں قاتلوں جیسا ٹھہراؤ پیدا ہو رہا تھا۔ اس کا سامنا کرنا آسان نہیں تھا۔ وہ بہت زیادہ سنجیدہ تھا لیکن یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہلکی سی استہزاء سے مسکراہٹ اس کے دماغ پر جم کر رہ گئی ہو۔ اس کی حالت دیکھتے ہوئے مجھے پورا یقین آتا تھا کہ قیدیوں نے اس کے سوالات کے جواب دینے میں ذرا سی تاخیر کی ہے۔ وہاں بھی اسی وحشیانہ موت سے ہم کنار کرنے والی نالی نہیں کرے گا۔

”دانا آزاد ہوتے ہی قیدی“ آسیب سے ڈرے ہوئے کسی بچے کی طرح ہلک کر دوڑا۔

اس وقت تک درخت سے بندھی ہوئی خون آلود ٹانگ بے ہوش ہو چکی تھی۔ پلٹے پرش پر خون کی پچکائیاں دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ کچھ گھبراہٹ اور گڑبڑاؤں کے ساتھ وہاں سے ہٹ گیا۔

ظفر نے پتلا ہونے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

”ظفر نے پتلا ہونے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

”ظفر نے پتلا ہونے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

”ظفر نے پتلا ہونے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

”ظفر نے پتلا ہونے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

”ظفر نے پتلا ہونے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

”ظفر نے پتلا ہونے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

”ظفر نے پتلا ہونے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

میں معلومات حاصل کرنے کے لئے گھروں سے باہر نکل آئے۔ ان حالات میں گاڑی کو جہیز میں سے گزرا تا مناسب نہیں تھی جس میں جہیز لوگوں کی ساری توجہ ہماری گاڑی کی طرف رہ جاتی اور کوئی سرکش کردہ گاڑی کا راستہ روک کر یہ بات کو شش کر سکتا تھا کہ میں اتنے منہ اندھیرے کہاں سے آ رہا ہوں اس علاقے میں میرا کیا کام تھا۔

بات کو اتنی دور تک بڑھانے کے بجائے میں نے گاڑی ہی رکوائی اور اس کے روانہ ہو جانے کے بعد بے پروا یا نہ انداز فلیٹ کی طرف چل دیا۔

وہاں ہونے والی فائرنگ بہت شدید تھی۔ اس کے نتیجے میں متعدد لرزہ خیز انسانی چیخیں بھی ابھری تھیں، مگر جہیز خون کے بڑے بڑے دھبے بھی پائے گئے تھے لیکن کوئی صورت میں بے ہوئے لوگوں کو اس امر پر حیرت تھی کہ ان سے نکلنے پر ہر طرف میدان صاف پڑا ہوا تھا۔ ان کی حیرت کا دورا سبب یہ تھا کہ قیامت کی فائرنگ ہونے کے باوجود پولیس کے نے ادھر کارخ کرنے کی زحمت نہیں کی تھی جب کہ وہاں تھوڑے فاصلے پر بہادر آباد کا مشہور چوراہا واقع تھا جہاں دن رات پولیس کے سختی دستہ امور رہتے تھے۔ لطف کی بات یہ تھی کہ لوگوں نے علاقے کے تھانے سے فون پر رابطہ کرنا چاہا تو گاڑی کی کیونکہ تھانے کا ٹیلی فون مسلسل ایجنسی فون سارا تھا۔

میں راستے میں جگہ جگہ رکتا اور لوگوں کے بھجان آمیز تہہ سنتا ہوا اپنے فلیٹ کی عمارت میں داخل ہوا تو مجھے یہ دیکھ کر ڈھکی ہوئی کہ ایس ٹی ایف کے سادہ پوش اہل کار اپنی جگہوں پر اُٹ کر لوگوں کی توجہ کا نشانہ بننے کے بجائے قرب و جوار میں جمع ہونا والی بھیڑ میں شامل ہو گئے تھے۔

فلیٹ میں پہنچا تو وہاں سب کے چہروں پر مایوسی نے ڈوب ڈالے ہوئے تھے۔

”سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔ ان کے تین آدمی مارے گئے، پکڑے گئے۔ وہ بیری کیسنگر کے لئے کام کر رہے تھے۔ ان کا رنڈ پکڑے جانے کے بعد ظفر کے ہاتھوں مارا گیا، لیکن تم لوگوں کے کیوں لگے ہوئے ہیں؟“ ان کے یک زبان استفسار پر میں نے فغروں میں اپنی کھٹا مٹل کرتے ہوئے پوچھا۔

”مکاؤ سے کوانگ فو کی سیکریٹری کا فون آیا تھا۔ وہاں کی صورت حال حوصلہ افزا نہیں ہے“ دیرانے مجھ سے لگا ہوا ہارے بغیر مردہ آواز میں کہا ”ہمارے ساتھ کوانگ فو کے ستارے گردش میں آگئے ہیں۔“

”کیا؟ وہاں کی کیا خبریں ہیں؟“ میں نے صوفے پر گرتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

”بہسی کہانی ہے۔ یوں سمجھو کہ دھونس اور بیت کی وجہ سے ہانگ کانگ پولیس نے ڈان کو چھوڑ دیا ہے لیکن اس کی اپنی

تو دی ہونا چاہئے جو صدر کا ہوا۔ میرا بس چلے تو ایسے غداروں کو زمین میں دھڑ تک زندہ دفن کرا کے ان پر بھوکے بھڑے چھڑا دوں۔“

”تمہارا غصہ اپنی جگہ بالکل بجا ہے لیکن کیا وہ سلوک بہت زیادہ ہے رحمانہ نہیں تھا؟“ میں نے اس کے رد عمل پر نگاہ رکھتے ہوئے دھیرے دھیرے اپنی بات مکمل کی۔

”غیر جذباتی تماشائی بن کر سوچو گے تو وہ سزا و دھشت ہی نہیں، غیر انسانی بھی نظر آئے گی لیکن ایک محبت وطن کی طرح اس کے سنگین جرائم کو پیش نظر رکھو گے تو وہ سزا نا کافی محسوس ہوگی۔ ان لوگوں کو دیکھتے ہی میری آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ میری نظروں میں اپنی زمین سے غداروں سے برا جرم کوئی اور نہیں ہے۔“

میں نے اس سے بحث کرنے کا ارادہ ترک کر دیا کیونکہ عام تحریری قوانین کے تحت بھی قتل عمد میں اشتعال کے عالم میں کئے ہوئے اضطرابی قتل میں نمایاں امتیاز برتا جاتا ہے۔ جبکہ وہاں قانون کا معاملہ درپیش نہیں تھا۔ اگر میں ظفر کی جگہ ہوتا تو شاید میرا رد عمل اس سے کہیں زیادہ شدید اور لرزہ خیز ہوتا۔

میری دانست میں ملی پٹیل سے باہر آپکی تھی اور یہ ثابت ہو چکا تھا کہ بیری کیسنگر ہی ہمارے پیچھے لگا ہوا تھا۔ حقیقت میں استاد صدر کے مکان کی تلاشی اور اس کی داشتاؤں سے باز پرس محض رسمی کارروائی تھی اس لئے وہاں رکے رہ کر مجھے کچھ حاصل نہ ہوا جب کہ میرے فلیٹ میں کسی بھی لئے کوانگ فو اور غزالہ کے بارے میں کوئی اہم خبر آ سکتی تھی اس لئے میں نے ظفر سے اجازت طلب کی اور اس نے اپنے ایک ڈرائیور کو مجھے فلیٹ تک لے جانے پر مامور کر دیا۔ اس وقت تک صدر کے بے ہوش ساتھی بھی ہوش میں آچکے تھے اور دھشت اور بے یقینی کے عالم میں کھلے آسمان تلے اپنی قسمت کے فیصلے کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کے مردہ ساتھیوں کی لاشیں غالباً گاڑیوں سے ٹکائی ہی نہیں گئی تھیں جب کہ استاد صدر کی چری ہوئی لاش کے دونوں حصے سینے کے بعد اس کے گندے خون کی صفائی کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ ان لوگوں کے زندہ اور مردہ افراد کو اپنی تحویل میں لے کر ایس ٹی ایف والوں نے میرے رہائشی فلیٹ کے قرب و جوار میں متصادم فریقوں کی اصلیت کے بارے میں کوئی ثبوت باقی نہیں رہنے دیا تھا۔ ان میں سے جو بیچ رہے تھے وہ یقینی طور پر فرار کی راہ اختیار کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

میں ایس ٹی ایف کی گاڑی میں شرف آباد کے علاقے میں پہنچا تو وہاں کارنگ خاصا بلا ہوا تھا۔

ہماری عمارت کے عقبی حصے میں تمام اسٹریٹ لمپس بدستور تارک بڑے ہوئے تھے لیکن تمام رہائشی فلیٹ کسی استغنی کے بغیر روشن نظر آ رہے تھے۔ اس وقت تک فائرنگ کو ختم ہوئے کافی دیر گزر چکی تھی اس لئے بے شمار افراد اصل صورت حال کے بارے

میں نے کہا ”تم خود بتا چکی ہو کہ ڈان کو انک کو انک فو اپنے علاقے میں بے پناہ اثر و رسوخ کا مالک ہے اور مدتوں سے کسی روگ نوک کے بغیر اپنا کاروبار چلا رہا ہے۔“

”تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“ ویرا آنکھیں نکال کر بولی ”کو انک فو کتنا ہی طاقت ور کیوں نہ ہو، قانون کی نظروں میں اول و آخر ایک مجرم ہے اور اسے کبھی نہ کبھی پکڑے جانا تھا۔“

”اب تم کچھ جتنی کر رہی ہو!“ اس کی تاویل پر میرا منہ بن گیا ”اگر اس کے آدمیوں کی آئے دن پکڑو حکم ہو رہی، اس کے ٹھکانوں پر چھاپے پڑتے رہتے یا وہ خود کئی بار حوالات کی ہوا کھانچا ہوتا تو اس چھاپے کو کسی کی کسی بے اعتدالی کا نتیجہ سمجھ لیتا۔ اس جیسا شاندار ماضی رکھنے والا شخص اچانک ہی محدود عتاب کا نشانہ بنتا ہے تو یہ سوچنا پڑتا ہے کہ کارروائی کے لئے ایسے وقت کا انتخاب کیوں کیا گیا جب وہ غزالہ کو ہانگ ہانگ سے نکال کر مکاؤ کی طرف لا رہا تھا۔“

”میں تمہیں یہ بھی بتا چکی ہوں کہ کو انک فو دن رات مکاؤ میں اپنے نکل نما مکان میں پڑا بیش قیمت شرابوں میں نہاتا رہتا ہے۔ وہ بیش و عشرت کا دلدادہ ہے، اس لئے باہر نہیں نکلتا۔“ ویرا جملے سمجھنے لہجے میں کہنے لگی ”ہو سکتا ہے کہ ہانگ ہانگ کی پولیس کافی دنوں سے اس کی گھات میں لگی ہوئی ہو، آج وہ ہمارے کام سے اپنا حصار چھوڑ کر باہر نکلا اور پولیس کو۔۔۔“

بولتے بولتے وہ اچانک ہی خاموش ہو گئی اور میں بے اختیار ہنس پڑا ”ہاں، ہاں، کو انک فو پولیس کو اسے پکڑنے کا موقع مل گیا۔ بریٹانی کی بات یہی ہے کہ تمہارے کو انک فو پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اسے بھی بند کر دیا گیا ہو تا تو مجھے اتنی پریشانی نہ ہوتی۔“

”تم لوگوں کے دماغ میں ہر طرف منطق اور جت تھسی رہتی ہے۔“ وہ چڑچڑے لہجے میں بولی ”تم سے بات کر کے کبھی کبھی ذہن بہت بوجھل ہو جاتا ہے۔“

”نی الحال ہمیں مقامی پولیس کے لئے بھی کوئی کمائی سوچنے کی ضرورت ہے، سلطان شاہ نے چند ٹائیوں کے توقف کے بعد کہا ”وہ لوگ کسی بھی وقت نازل ہو سکتے ہیں۔“

”ان کے بارے میں ہمیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں، اس علاقے کے ہزاروں کینوں کی طرح ہم بھی اپنے فلیٹ میں تھے اور فائبرنگ کی آوازیں سننے کے باوجود باہر نکلنے کی ہمت نہیں کر سکے تھے کسی کے فرشتے بھی یہ بات نہیں سمجھ سکتے کہ یہ سارا ہنگامہ ہمارے لئے ہی ہوا تھا“ میں نے کہا۔

”ہمیں ان واقعات میں الجھنا اتنا مشکل نہیں ہے“ سلطان شاہ پر خیال انداز میں بولا ”کچھ عرصے پہلے ہی ہمارے دوست کا دروازہ اکھاڑ کر ایک عورت کو قتل کر دیا گیا تھا“ اس کے اوپر ویرا کے آدمیوں نے یہاں دل کھول کر اپنا میگزین بکریا دیا تھا۔۔۔“

”موجود ہر شخص کو گرفتار کر لیا ہے۔ ان میں غزالہ کے ساتھ ہی وہ بھائی انڈر بھی شامل ہے جو مسٹر تپا نگی کے نام سے اس کے ساتھ کولن پہنچا تھا۔“

”لیکن کیوں؟“ ویرا کے انکشاف نے میرے ذہن کو الجھا کر رکھ دیا ”پولیس والے کسی کو بلاوجہ گرفتار نہیں کر سکتے۔ ان لوگوں کا کوئی نہ کوئی جرم بھی بتایا گیا ہو گا؟“

”ابھی کسی کو کچھ بتا نہیں چل رہا۔“ ویرا خود بھی اس نئی صورت حال پر پریشان نظر آ رہی تھی ”کو انک فو کو گرفتار نہیں کیا گیا لیکن وہ سخت مشتعل ہے اور ہانگ ہانگ میں ڈیرہ ڈالے بیٹھا ہوا ہے۔ وہی نہیں بلکہ بلیک ڈریگن کے ارکان بھی اس واقعے کو ڈان کی توہین و تذلیل قرار دے رہے ہیں۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ہانگ ہانگ پولیس نے ایک ایسی اسپڈ بوٹ پر چھاپا مارنے کی جرات کیسے کی جس میں ڈان سفر کر رہا تھا۔ جیسے ہی صورت حال واضح ہوگی، مکاؤ سے دوبارہ فون آئے گا۔“

”اس کا مطلب ہے کہ غزالہ کے بارے میں ہانگ ہانگ میں کسی نے تجزیہ کی ہے“ میں نے بے چینی کے ساتھ صوفے میں پہلو بدلے ہوئے کہا۔

”جب تک مکاؤ والوں کو کوئی صورت حال واضح نہ ہو، یہ تمام قیاس آرائیاں قبل از وقت بلکہ بے سود ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس چھاپے کا غزالہ کی ذات سے کوئی تعلق ہی نہ ہو اور وہ ناگمانی سمیت میں جلا ہو گئی ہو۔“ ویرا نے سختی کے ساتھ جواب دیا۔

”تمہارا مطلب ہے کہ ہم سب کچھ مکاؤ والوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں؟“ میں نے جیسے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

”اس کے علاوہ تمہارے پاس اور کون سا چارہ کار ہے؟“ ویرا نے فوراً ہی ایک جوانی سوال داغ دیا ”یہاں رہ کر تم ہانگ ہانگ میں کسی کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے۔ ایسی صورت میں تم غزالہ یا ڈان کو انک فو کے دوسرے آدمیوں کے لئے کیا کر سکتے؟“

”ہم نے اس سے رجوع کر کے بنیادی غلطی کی ہے۔“ سلطان شاہ نے رائے ظاہر کی ”اتنے وقت میں تو ڈینی ہانگ کا ہانگ جا کر غزالہ کو واپس لا سکتا تھا۔“

”تم نے میرے دل کی بات کہ دی“ میں نے اسے شاباش دی۔ ”میں اس وقت یکی سوچ رہا تھا کہ ہم نے کو انک فو سے رجوع کر کے خودی معاملہ الجھا لیا ہے۔“

”الٹھٹا یا بھٹھا، جو کچھ ہوتا تھا، وہ ہو چکا“ ویرا انک کر بولی۔ ”مے واپس نہیں لوٹا یا جاسکتا، اس لئے اب اس ٹیکر کو پھینکا ہے۔“

”ابھی تم نے ایک مفروضے کی بات کی تھی کہ شاید چھاپے کا نشانہ غزالہ کی ذات سے نہ ہو، مجھے اس سے شدید اختلاف ہے۔“

ان سے مدد حاصل کی ہوگی؟

”اب تم نے پھر اونچی پرواز شروع کر دی“ میں نے براہملاو
بولا ہوا تھا۔ سلطان شاہ کے خدشات سے آگاہ ہونے کے بعد
نے ہی مجھے اول خان کا نام یاد دلایا تھا۔
وہ بے ساختہ ہنس پڑی اور بولی ”تم میں خوبی کی ہے کہ خیر
وقت حاضر داغ رہتے ہو۔“

میرا ذہن پولیس والوں کی آمد میں الجھا ہوا تھا۔ میں نے
جھوٹ بچ بول کر دروازہ کو تو خاموش کر دیا تھا لیکن میں ابھی مل
جانتا تھا کہ پولیس والوں کے لئے ایس نی ایف کی اہم ہدایات سے
انحراف کرنا ممکن نہیں تھا۔ اور ظفر نے انہیں صبح طلوع ہونے
تک اس علاقے سے دور رہنے کے لئے کہا ہوا تھا۔

پھر مجھے وہ منظر یاد آیا جو میں نے فلیٹ واپسی پر دیکھا تھا۔
علاقے کے لوگ دہشت، سنسنی اور تشویش میں مبتلا تھے پھر وہاں
مقابلہ ختم ہوئے کافی دور گزر چکی تھی اس لئے علاقے کے لوگوں
کے رابطے اور دواؤں سے مجبور ہو کر پولیس والوں کو وہاں آنا پڑا تھا۔
یہ امکان بھی موجود تھا کہ جائے واردات کی طرف پولیس پانچواں
دوا لگی ایس نی ایف کے کسی ذمے دار سے کلیر کر لینے کے بعد
عمل میں لائی گئی ہو۔

پولیس والوں کے بارے میں ہم تینوں ہی شدید تجسس میں
تھے اور یہ جاننے کے آرزو مند تھے کہ وہ لوگ آنے کے بعد کسی
ریخ پر کام کر رہے تھے لیکن اسی کے ساتھ ہم فلیٹ سے باہر نکل کر
کوئی خطرہ مول لینے کے لئے تیار نہیں تھے۔ فلیٹ میں خود اوش
کے لوازم سمیت ضرورت کی ہر شے موجود تھی۔ سلطان شاہ جانے
کا آخری کپ پینے کے بعد آرام کرنے کی نیت سے خواب گاہ میں
چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی وہ ایک بار پھر ڈرائی جن کی بول ڈیو
نکال لائی اور دو گھاس بنانے کی تیاری میں مصروف ہو گئی۔

”خدا کا خوف کرو“ ویرا! میں نے اسے چلانے کی نیت سے
کہا ”سلطان شاہ کے جاتے ہی تم تو اس طرح اٹھی ہو جیسے کسی
خراثت و اعدا سے نجات ملی ہو۔“

”وہ ہمیں شراب پیتے دیکھ کر ایسے بڑے برے منہ بناتا ہے کہ
پینے کا سارا الحظ غارت ہو جاتا ہے۔ مجھے نئے کے لئے نہیں کہ
اپنے اعصاب کو سکون پہنچانے کے لئے، اس وقت تھوڑی سا
الکحل کی ضرورت ہے۔“

”اتنی صبح، سورج طلوع ہونے سے پہلے تم بوقت لے بیٹھا
پھر کچھ بھی نہیں کر سکی۔“

”اب تو ویسے بھی کچھ نہیں کیا جاسکتا“ وہ ایک مضطرب
لے کر حسرت آمیز لہجے میں بولی ”تمہیں معلوم ہے کہ میں
رات کا ہر لمحہ اپنی مرضی کے مطابق گزارتا جا رہا ہوں
موجودہ حال نے ایسا پلانا کھایا کہ سارا موڈ ہی تباہ ہو کر رہا

”بلادج کی باتیں مت بناؤ! میں نے اس کی بات کاٹ کر
تیزی سے کہا ”ان میں سے کسی بھی واقعے کو ہم لوگوں سے وابستہ
نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اگر ہم اعتماد اور سختی کے ساتھ اپنی کمائی پر
اڑتے رہے تو دنیا کی کوئی طاقت ہمیں نہیں الجھا سکے گی۔“
”ظاہر ہے!“ ویرا نے تبصرہ کیا ”اس بار تو ظفر بھی پوری طرح
تسماری پشت پٹائی کر رہا ہے۔“

”ہمارے ساتھ ہی وہ تم پر بھی مہربان نظر آ رہا تھا“ میں نے
مجھتے ہوئے لہجے میں کہا ”اگر تم اس کے ساتھ چلی جاتیں تو شاید تم
دونوں کے حرام دوستی کی حد سے آگے بھی بڑھ جاتے۔“

”ایس نی ایف کے ایک فرض شناس افسر کے بارے میں ایسی
رائے رکھتے ہوئے تمہیں شرم آتی چاہئے“ ویرا نے غلامت آمیز
لہجے میں کہا۔

”میں پرستی سے فرض شناسی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یہ
ضروری نہیں ہوتا کہ ہر فرض شناس آدمی جمالیاتی حس سے سرے
سے محروم ہو۔ میں تم دونوں کی نگاہیں بھانپ رہا تھا۔ اب ایسی
بھولی نہ بنو جیسے تمہیں ظفر کے دلی احساسات کے بارے میں کچھ علم
ہی نہ رہا ہو۔“

”اوہ!“ سلطان شاہ کی تیز زدہ آواز ابھری ”جب ہی تم ظفر
کے ساتھ جانے پر تیار ہو گئی تھیں۔“

”شاید پولیس کی گاڑیاں آ رہی ہیں“ میں نے دور سے آنے
والی موہوم سی آوازوں پر کان بٹاتے ہوئے چونک کر کہا۔

”ہاں“ یہ تو پولیس کی گاڑیوں کے سائرن ہی معلوم ہوتے ہیں۔
سلطان شاہ بھی ان آوازوں پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے بڑبڑایا۔

”لیکن یہ لوگ سورج طلوع ہونے سے پہلے کیوں آ رہے ہیں؟“
”تو کیا انہیں صبح تک دور رہنے کی ہدایت کی گئی تھی؟“ ویرا

نے چونک کر سوال کیا۔ اس بارے میں ظفر نے ہماری گفتگو اس
وقت ہوئی تھی جب وہ ہاتھ دھو رہی تھی۔ لیکن اس وقت
سلطان شاہ کی ممانعت کی وجہ سے وہ بات ویرا کے علم میں بھی آ گئی۔

”حکم یا ہدایت کا علم نہیں“ میں نے بات سنبھالنے کی نیت
سے کہا ”لیکن ایسا بددست ضرور کر گیا تھا کہ پولیس بروقت یہاں

نہ پہنچ سکے۔“

”پولیس والوں پر ایس نی ایف کا اتنا زور چلتا ہے اور تم پھر
بھی انہیں غیر سرکاری افراد قرار دیتے ہو۔ یہ بات میری سمجھ سے
بالا ہے۔“

”میں جو کہہ رہا ہوں اس کی بنیاد سنی سنائی باتوں پر ہوتی
ہے“ میں نے مدافعتی لہجے میں کہا ”درحقیقت میرے لئے بھی بہت
سی باتیں تھیں۔“

”میں اس کی قدر رعایت کافی
کرتا ہوں کہ وہ لوگ ہر معاملے میں میرا ساتھ دیتے چلے آ رہے
ہیں۔“

”اس کا مطلب ہے کہ میرا کونج لگانے کے لئے بھی تم نے

”تم میرے اور ڈان کے مراسم سے واقف ہو“ ویرانے حمل سے کام لیتے ہوئے اس سینتالیس سالہ ”لوکی“ کو سمجھانا چاہا۔ اس لیے مجھ سے پہلیاں نہ بھجواؤ۔ میں ڈان کی ہم سری کی دعوے وارہ نہیں ہوں مگر میرے ہاتھ بھی بست لے ہیں۔ لیکن جب تک مجھے پوری صورت حال کا علم نہیں ہوگا میں ڈان کے لیے پتہ بھی نہیں کر سکوں گی۔ ازراہ کرم مجھے پوری کمانی سنا ڈالو۔“

”ساری خرابی یہ ہے کہ ڈان نے خود کو مکاؤ والے پبلس میں محصور کر کے سارا کام اپنے ماتحتوں پر چھوڑ دیا ہے“ دوسری طرف سے ایک ہمری سانس کے بعد کہا گیا ”اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر بعض کم ظرفوں نے اپنے دھندے بھی شروع کر لیے ہیں۔ ڈان کی اسپینڈ بوٹ کے انجن روم سے ایک کھڑکی اور روپوش چینی کو برآمد کیا گیا ہے۔ وہ شخص بھی چھن میں ہیروئن اسمگل کرنے کا مجرم ہے اور چھن میں اس جرم کی سزا موت ہے۔ وہ کسی طرح چینی پولیس کی تحویل سے فرار ہو کر ہانگ کانگ آگیا اور یہاں ڈان کی اسپینڈ بوٹ میں چھپا ہوا تھا۔ اسے یقینی طور پر ایک نے ہماری معاوضہ لے کر پناہ دی ہوگی۔ ڈان کے فرشتوں کو بھی اس واقعے کا علم نہیں ہوگا کیونکہ ڈان، چینی پولیس اور حکام کی دشمنی مول لینے سے ہمیشہ بچتا رہا ہے۔ یہ لوگ پاتال تک اپنے شکاروں کا پیچھا کرتے ہیں اور ان کو کیفر کدوار تک پہنچانے بغیر چین سے نہیں بیٹھتے۔“

”اگر ہم اپنی متشکو اصل معاملے تک محدود رکھیں تو بہتر ہوگا ویرانے اسے ٹوکا۔“

”میں خود ضروری باتوں سے بچ رہی ہوں۔ وہ روپوش چینی ہمارے میں لنگر انداز اسپینڈ بوٹ میں چھپا رہا۔ پھر جب ڈان نے اچانک اسپینڈ بوٹ استعمال کرنے کا فیصلہ کیا تو ایک نے اس موقع کو استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ڈان اپنی مسمان کو لے کر مکاؤ کے لیے روانہ ہوا تو اسپینڈ بوٹ کے انجن روم میں وہ چینی مسمان موجود تھا۔ دوسری طرف حکام کو کسی طرح خبر مل گئی کہ مین لینڈ چائنا کے ایک مفروضہ مجرم کو اسپینڈ بوٹ کے ذریعے لے جایا جا رہا ہے۔ لہذا راستے میں اسپینڈ بوٹ کو روک لیا گیا۔ ہانگ کانگ پولیس ڈان اور اس کے اہل اصولوں سے بہت اچھی طرح واقف ہے اس لیے انہیں یقین ہے کہ مفروضہ چینی کو ہانگ کانگ کے رانے اسمگل کرنے میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں ہے لیکن اسپینڈ بوٹ کا مارا گیا ہے ان ہی کے ساتھ ہماری مسمان اور اسے لانے والا بھی روک لیا گیا ہے اور ہانگ کانگ پولیس تفصیلی تفتیش کے بغیر ان میں سے کسی کو رہا نہیں کرے گی۔“

”پھر اب فادر کو ایک نوکماں ہے؟“ ویرانے پرتشویش لے میں پوچھا۔

”وہ ہانگ کانگ ہی میں بیٹھا ہوا ہے۔ ہماری مسمان کو حامل کیے بغیر وہاں سے نہیں نکلے گا۔“

اتفاق سے یہ سب سلطان شاہ کی وجہ سے ہی ہوا ہے۔“

”تو تمہارا خیال ہے کہ سلطان شاہ ہمیں راہ راست پر رکھنے کے ارادے سے مار کھا کر آیا ہے؟“ میں نے اسے گھورتے ہوئے غصیلے لہجے میں پوچھا۔

وہ ہنس پڑی ”میں غلط تھی۔ میں نے اس کے ارادے کا نہیں، اتفاق کا ذکر کیا تھا۔ پتا نہیں تم اس کے بارے میں اتنے حساس کیوں ہو؟ میری تو اور بات ہے لیکن میں اتنا بتائے دیتی ہوں کہ غزالہ، تمہاری اور سلطان شاہ کی حد سے بڑھی ہوئی محبت سے بہت جلد حد میں جلا ہو جائے گی۔“

”وہ میرا اور غزالہ کا معاملہ ہے۔ ہمیں اس بارے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔“

”مسلم آئین کی منتقلی کا معاہدہ کر کے ہم ایک بار پھر دوستی کا رشتہ قائم کر چکے ہیں“ اس نے میرے قریب بیٹھتے ہوئے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا ”اور دوستی میں ہر فریق کو دوسرے کے مفادات کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ میری جھلی باتوں پر مشورہ دیتا میرا فرض بنتا ہے۔“

”ضرور بنتا ہوگا، لیکن میرے اوپر کیوں چڑھی چلی آ رہی ہو۔ سلطان شاہ کوئی روپوش نہیں ہے کہ بستر پر لیٹتے ہی ہماری نیند سو گیا ہوگا۔ ہمارے پاس بہت وقت ہے۔ ہم آرام سے بھی باتیں کر سکتے ہیں۔“

ہم دونوں نے اپنے اپنے گھاس سے جن کے جھوٹے جھوٹے گھونٹ اپنے معدوں میں منتقل کئے ہی تھے کہ اچانک فون کی گھنٹی بج اٹھی اور ویرانے بن دبا کر اسپیکر فون آن کر دیا۔

دوسری طرف کو ایک فون کی سیکرٹری لائن پر موجود تھی۔ ویرانے کا جواب سنتے ہی اس نے شاید اپنے ساؤنڈ اسکینر پر تجزیاتی رپورٹ دیکھ کر اس کی اصلیت پر یقین کر لیا اور بولی ”اس بار ڈان کے ساتھ بہت بڑا فریب ہوا ہے۔ ہانگ کانگ سے آنے والی خبریں بہت تشویش انگیز ہیں اور ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ڈان کا اٹھا قدم کیا ہوگا؟“

”فریب؟ تو کیا ایسی کسی آدمی کی خبری پر یہ ساری کارروائی کی گئی ہے۔“

”نہیں!“ اس لڑکی کی پُر اعتماد آواز ابھری ”مجنوں کا انجام بہت برا اور عبرت ناک ہوتا ہے۔ ڈان کے نمک خوار اتنی بڑی حماقت کر کے اپنی زندگیاں عذاب نہیں بنا سکتے۔“

”تو پھر کیا ہوا ہے؟“ ویرانے اس کے انداز سے چکر قدرتے تیزی کے ساتھ بولی۔

”بس یہ سمجھو کہ معاملہ بہت بری طرح الجھ گیا ہے۔ یہ بہت بڑی بات ہے کہ انہوں نے ڈان کو اس معاملے میں ملوث نہیں کیا ورنہ وہ چاہتے تو اس واقعے کی آڑ لے کر ڈان کی عزت اور وقار کی وجوہات اڑا سکتے تھے اور ہم سب خون کے آنسو پی کر رہ جاتے۔“

”میرے لیے ہر راستہ بند ہے، پھر میں کیا کروں؟“ ویرا خاصی پریشان ہو گئی تھی۔

”میرا در انتظار کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ تمہارا کام ڈان کے لیے ایک چیلنج بن گیا ہے۔ وہ پہلی فرصت میں اسے پایڈ تکمیل کو پہنچانے کی کوشش کرے گا۔“

”ٹھیک ہے..... لیکن کوئی خبر ہو تو مجھے فون ضرور کر دے“ ویرا نے ایسا نہ لے سکا۔

”تم نے کہا تھا کہ تم آٹھ دس گھنٹوں تک اس نمبر پر رہو گی۔ اس کے بعد کا نمبر بھی دے دو تاکہ میں تم سے فوری رابطہ کر سکوں۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔

”اس نمبر کے علاوہ میرا کوئی اور رابطہ نہیں ہے“ ویرا نے میری طرف دیکھتے ہوئے فون پر کہا ”اس نمبر میں نہ ہوں تو میرے سامھی کو پیغام دے دینا، وہ مجھے باخبر کر دے گا۔“

”اس کی آواز سنو اور تو یہ بھی کر لیا جائے گا۔ ساؤنڈ اسکیٹنگ کے بغیر ہم کسی سے کھل کر بات نہیں کر سکتے کیونکہ نام اور آواز بدلنا زیادہ دشوار نہیں ہوتا۔“

”اس کا نام تو یہ ہے، میں فون اسے دے رہی ہوں“ ویرا نے مجھے آنکھ سے اشارہ کر کے کہا۔

”ہیلو! میرا نام تو یہ ہے“ لکھ بھر کے سکوت کے بعد میں نے اسکیکروف پر کہا۔

”دو جیلے اور ریکارڈ کر دو تاکہ اسکیٹنگ ریج میں اضافہ ہو جائے“ کواک فو کی بیکریٹری کی آواز ابھری۔

”ویرا کی غیر موجودگی میں“ میں شدت کے ساتھ تمہارے پیغام کا انتظار کروں گا۔ دیر ہوئی تو شاید میں خود تم سے رابطہ کر لوں۔“

میں نے مکمل فقرے ریکارڈ کرانے کے بجائے باسٹنی پیغام دیا۔

”گٹ! میں تم سے رابطہ رکھوں گی“ اس فقرے کے ساتھ ہی دوسری طرف سے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا گیا اور میں نے اپنا گلاس اٹھا کر منہ سے لگایا۔

”تم جاہو تو غزالہ کا مسئلہ حل ہونے تک میں یہاں رک سکتی ہوں“ ویرا کہہ رہی تھی ”ورنہ آج مجھے روانہ ہونا ہے۔ یہاں رکنے کی صورت میں بلو کر اس ڈیل کا معاملہ کھٹائی میں پڑ جائے گا۔“

”تم نے عقل مندی کا کام کیا کہ مکاؤ والوں سے میرا رابطہ کرادیا۔ میں خود ہی معلومات حاصل کرتا رہوں گا۔ تم بھی یہاں رہ کر اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکو گی۔ تمہارے لیے ایران والا کام زیادہ ضروری ہے۔“

ویرا کے پاس کراچی سے کونینہ جانے کے لیے ہوائی ٹکٹ موجود تھا جو وہ شام کو لے آئی تھی۔ اس کے مطابق ویرا کو زیادہ سے زیادہ ایک بجے تک انرپورٹ پہنچنا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ جانے سے پہلے کم از کم ایک بار مکاؤ سے رابطہ کر سکتی تھی۔ اس کے چلے جانے کے بعد میں خیر اپنے معاملات کی دیکھ بھال کر سکتا

”جب وہ کچھ کری نہیں سکتا تو پھر وہاں کیوں ٹھہرا ہوا ہے؟“

”ہم جانتی ہو کہ ڈان اپنی مرضی کا مالک ہے۔ اس سے کوئی کچھ نہیں پوچھ سکتا۔ یہ تمام معلومات بھی ان لوگوں نے فراہم کی ہیں جو ڈان کا ٹھکانہ لگانے کے لیے ہر طرف پھیلانے لگے تھے۔“

ابھی تک ڈان سے ہمارا براہ راست رابطہ نہیں ہو سکا۔ اس کے ڈان میں کیا منصوبہ ہے؟ یہ صرف وہی جانتا ہے۔“

”وہ ہانگ کانگ میں کہاں ٹھہرا ہوا ہے؟“ ویرا نے چند ثانیوں تک سوچنے کے بعد پوچھا۔

”وہ ہانگ کانگ ہٹن کے رائل سویٹ میں مقیم ہے لیکن میرا مشورہ ہے کہ اس سے فون پر بات نہ کرنا۔ ڈان ہوٹل کے فون اپنے آدمیوں سے دعا سلام کرنا بھی پسند نہیں کرتا کیونکہ اسے کال ٹیپ کیے جانے کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔ وہ تمہاری آواز پہچانتے ہی فون بند کر دے گا۔“

”لیکن اس سے رابطہ بہت ضروری ہے۔ میں اس سے کس طرح بات کر سکتی ہوں۔“

”فی الحال ناممکن ہے۔ ڈان نے ہوٹل میں ٹھہرنے کا فیصلہ کر کے ہم سب پر یہ واضح کر دیا ہے کہ وہ فی الحال کسی سے ملنے یا بات کرنے کے مؤذ میں نہیں ہے۔ اسے اپنے آدمیوں سے رابطہ برقرار رکھنا ہوتا تو وہ ہوٹل کے بجائے اپنے ہی کسی ٹھکانے کا رخ کرتا۔“

”معلوم ہوتا ہے کہ اسپڈ بوٹ والے سٹین واقفے نے اسے اپنے آدمیوں سے بدگمان کر دیا ہے۔ اسی لیے وہ ان سے دور رہنے کی کوشش کر رہا ہے۔“

”وہ دور ضرور ہے لیکن اپنے کام سے غافل نہیں ہے۔ وان چائی والے گھاٹ سے بوٹس کے آپریشن کی ذمہ داری لکڑے ہاؤ ہے۔ جو گروہ ٹائٹ کبس کے چیف فیجر ایرک موک کو جواب دہ ہے۔ جو کچھ ہوا ہے، وہ ایرک اور ہاؤ کی ملی بھگت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اس سے پہلے کہ ہانگ کانگ پولیس ان دونوں پر پانچ ڈالنی اور دس تیرہ سے مجبور ہو کر زبان کھولے“ ان کی موت واقع ہو چکی ہے۔“

”اوہ!“ ویرا مضطرب لہجے میں بولی ”اس طرح تو ڈان خود ہی اٹلی گروں پھنسلے گا اور یہ پورا معاملہ بھی سٹین رخ اختیار کر لے گا“ اس وقت تو اسے ہر انتقامی کارروائی موقوف رہنی چاہیے تھی۔“

”تم فکر نہ کرو“ اس کا لہجہ بے پردا یا نہ تھا ”میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ ڈان ہم سب کا باپ اور استاد ہے۔ وہ مشکل کے بدترین حالات میں بھی حیا و جدوجہد رہتا ہے۔ دس جزی بوٹیوں اور زہروں کے بارے میں اصل کا علم کمال کو پہنچا ہوا ہے۔ ان دونوں کی لاشوں کی لٹماور پرنس ہارٹ فیلور کی ہی کمائی سنائی گئی اور ان کی انتقامی ہمت پر کسی پر شبہ کرنے کی نوبت نہیں آئے گی۔“

میرے علم میں نہیں ہے۔ میرے حساب سے اب تک اس کی واپسی کا سفر شروع ہو چکا ہو گا..... لیکن تمہارا اپنے آدمیوں سے رابطہ کیوں منقطع ہے؟“

”ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے ٹھکانوں سے نکلے ہوئے ہوں“ دیر بے پروا یا نہ کیجیے میں بولی ”دیر سویر سے رابطہ ہوتا جائے گا۔ اگر وہ دونوں شکر پلا پہنچ گئے تھے تو آگے کا پروگرام بھی ٹھیک رہا ہو گا۔“

”پھر اب کب ملاقات ہوگی؟ میرے پاس نئی دہلی سے اہم کانفرنس آگئے ہیں۔ ہم لوگوں پر روز بروز دباؤ بڑھتا جا رہا ہے۔ پلان پر کام شروع کرنے سے پہلے میں تم سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ آخری مرحلے کے لیے سب کچھ تم ہی کو فراہم کرنا ہو گا۔“ اس نے گول مول بات کی تھی لیکن میں نے سمجھ لیا تھا کہ اس کا اشارہ ہتھیاروں وغیرہ کی کھپ کے بارے میں تھا جس کے بارے میں کوئی بھی خوریزہ شورش کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔

”میں چند روز کے لیے اپنے معاملات میں مصروف رہوں گی۔ ان سے منسلک کے بعد تم سے ملاقات کا کوئی پروگرام بن سکے گا۔ لیکن اس معاملے میں تم سے ملنا ضروری ہے۔“

”ٹھیک ہے، میں تمہاری کال کا منتظر رہوں گا“ شری مان غم کی بات سن کر دیرانے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا اور اپنے لیے سگریٹ سلگانے میں مصروف ہو گئی۔

”تم چند روز کے لیے جا ہی رہی ہو تو رواجی سے پہلے میری کبھی کھڑکائی جاوے۔“

”تم بلاوجہ ہر ایک سے چھیڑ چھاڑ کرنے پر کیوں تلے ہوئے ہو؟“ اس نے مجھے گھورتے ہوئے پوچھا۔

”تم سے چھیڑ چھاڑ ہونے کے بعد کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا“ میں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا ”کم از کم بیع معلوم ہو جائے گا کہ وہ مارے پیچھے لگا ہوا ہے یا ہمارے ذریعے تم پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے؟“

چند منٹ کے بحث مباحثے کے بعد دیرا، بہیری کیمبر کو فون کرنے پر آمادہ ہو گئی۔

دیرا کی کال کسی غیر ملکی عورت نے وصول کی اور دیرانے اپنا نام ڈیڑی بتاتے ہوئے بہیری کیمبر سے بات کرنے کی خواہش کا اظہار کیا جس پر فوراً ہی بہیری لائن پر آگیا۔

”بڑے طوطے! آج کل کیا کر رہے ہو؟“ بہیری کیمبر کی آواز سننے ہی دیرانے استہزائے لہجے میں کہا۔

”اوہ!“ ایک گہرے سانس کے ساتھ بہیری کیمبر کی آواز ابھری ”تو تم کو ابھی تک ہرزہ سرائی کرنے کی جھوٹ ملی ہوئی ہے؟ لیکن کان کھول کر سن لو کہ اب تمہارے دن گننے جا چکے ہیں۔“

”بوڑھے گدھ بھی ایک خاص مدت سے زیادہ زندہ نہیں رہتے۔ اس اعتبار سے تمہاری باری جلد ہی آنے والی ہے۔ مگر تمہاری وطن واپسی کے لیے صندوق کے ایک خوب صورت

حصہ۔ باہر پولیس والوں کی کارروائی جاری تھی۔ میں فلیٹ سے نیچے نہیں گیا لیکن مجھے اندازہ تھا کہ وہ شخص رسی کارروائی تھی۔ چنانچہ دوسرے فلیٹوں کے کینوں سے باز پرس کی گئی تھی یا نہیں لیکن کسی نے ہمارے فلیٹ کا رخ نہیں کیا تھا۔ دوسری طرف سلطان شاہ بھی کھڑکیوں کے دیواروں سے کھینچ کر، تھوڑی دیر بعد گہری نیند سو گیا تھا اس لیے دیرا کو کھلی جھوٹ مل گئی تھی۔ میری رفتار سست تھی مگر وہ تیزی کے ساتھ لی رہی تھی اور اسی کے ساتھ اس کے دماغ پر رنگین ہوا رہتی جا رہی تھی۔ میں نے اس کی ابتدائی چھیڑ چھاڑ، پھینک دینے کی کوشش کی لیکن مجھے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ اس کے لاشعور میں دہلی ہوئی، کچھ نا آسودہ خواہشات، شے کے ساتھ اس کے خواہش پر مسلط ہوتی جا رہی تھیں اس لیے مجبور ہو کر میں نے بھی اسے دھکیل دے دی۔

اس وقت وہ ٹی ٹی، بھپانک آنی دومن کے بجائے ایک حسین و شوخ لڑکی بن کر رہ گئی تھی جو آزادی ملنے کے بعد دنیا بھر کی خوشیوں کو بیک وقت اپنے دامن میں سمیٹ لینے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس کی آنکھیں شراب کے غمار سے بو جھل ہو رہی تھیں اب درخشاں اپنی ہی آنچ میں پھیل چلا جا رہا تھا اور وہ لمحہ بہ لمحہ بے تحاشی کی طرف بڑھتی جا رہی تھی میں خاموشی اور سکون سے اپنی جگہ بیٹھا اس کی چیز و ستیوں سے لطف اندوز ہونا تھا کیونکہ اس وقت میرے پاس وقت گزاری کے لیے کوئی معقول شغل نہیں تھا۔

○☆☆○

میرے ایما پر دیرانے کو بچے شری مان غم کو فون کیا۔ بظاہر اس کا کام بہت سیدھا تھا۔ غزالہ کی واپسی کے بارے میں ”اس نے مجھ سے سوئے بازی کر کے اپنے کام میں الجھا نا چاہا تھا لیکن دیرا کے پہلے ہی مطالبے پر اس نے غزالہ کو واپس کرنے پر رضامندی ظاہر کر دی تھی۔

مکاؤ سے آنے والی خبروں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ شری مان غم نے دیرا سے ملے کیے ہوئے پروگرام کے مطابق ”غزالہ کو اپنے ایک آدمی کے ساتھ ہانگ کانگ بھیج دیا تھا اور وہ دونوں شکر پلا سے کوئٹہ فو کے ساتھ بھی ہو چکے تھے اس سے آگے جو کچھ ہوا“ اس کا شری مان غم سے کوئی تعلق نہیں تھا پھر بھی میں ذہنی طور پر اس بد معاش کی طرف سے ایک بے نام سی غلطی میں مبتلا تھا۔

سلسلہ ملنے ہی شری مان غم نے دیرا کی آواز پہچان لی اور خوشگوار حیرت کے ساتھ بولا ”اوہ! ابھی صبح تم نے مجھے کیسے یاد کر لیا؟ مجھے امید ہے کہ دوسری طرف سب خیریت ہوگی۔“

”میرا اپنے آدمیوں سے رابطہ نہیں ہو پا رہا“ دیرا مکارانہ انداز میں بولی ”اس لیے میں نے سوچا کہ تم سے معلوم کروں“ تمہارے آدمی نے بھی ہانگ کانگ پہنچنے کے بعد کسی نہ کسی کو رپورٹ دی ہوگی۔“

”ہاں“ اس نے شکر پلا سے نئی دہلی فون کر کے اپنی خیریت کی اطلاع دی تھی۔ اس کے بعد اس نے کسی سے کوئی بات کی ہو تو وہ

تاوت کا آؤر دے دیا ہے۔

”میرے پاس تمہارے خلاف اتنا مواد اکٹھا ہو چکا ہے کہ اب جی لائیو بھی تمہیں معاف نہیں کر سکے گا۔ تم نے اس علاقے میں ہمارے مفادات کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے۔“

”تم بھول رہے ہو کہ خفیہ سرکاری پالیسیوں کے بارے میں تمہاری غیر ذمے دارانہ گفتگو کا کیسٹ میرے قبضے میں ہے۔ اس کی چند نقول تمہیں جہنمِ داصل کرنے کے لیے کافی ثابت ہوں گی۔“

ہیری کیسبجور کی تلخ ہنسی کی آواز ابھری پھر وہ بولا ”مجھے تمہاری اس گیدڑ جھبکی کی اصلیت معلوم ہو چکی ہے۔ تم میرا بال بھی بیکا نہیں کر سکو گے۔“

ہیری کے ان الفاظ پر میں پریشان ہو گیا کیونکہ فرضی کیسٹ کے بارے میں میں نے ہی اس کی تشویش رفع کی تھی۔ ان دنوں میری دیر اسے ٹھنی ہوئی تھی اور میں ہر طرف سے اسے پریشان کرنا چاہ رہا تھا۔ اسی وجہ سے میں نے ہیری کیسبجور کے ذہن سے خیالی کیسٹ کا خوف دور کر دیا تھا تاکہ وہ پوری یکسوئی کے ساتھ ویرا کی نگاہات میں لگا رہے اور ویرا کی زندگی اجیرن بناتا رہے۔ لیکن غیبت یہ ہوا کہ ہیری کیسبجور نے اس بارے میں تفصیل سے بات نہیں کی بلکہ حوالہ دینے پر ہی اکتفا کیا۔

”اور اب ایک نئی شرمناک بات سامنے آئی ہے“ ویرا اس سے کہہ رہی تھی ”تم اپنی سینئر سفارت کاری حیثیت کو فراموش کر کے شہر کے تیسرے درجے کے قاتلوں اور بد معاشوں سے دوستیاں گانختہ پھر رہے ہو اور وہ شراب کے نشے میں دھت ہو کر تمہارے ساتھ اپنی دانت کافی دوستی کی کمائیاں بناتے پھر رہے ہیں۔ یہ بے اعتدالیاں بہت جلد تمہیں غرق کر دیں گی۔“

”میں تمہاری ان من گھڑت کمائیوں سے ڈرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔۔۔“

”پھر شاید استاد صدو تمہاری ماں کا خصم رہا ہو گا جو تمہیں اچھی طرح جانتا ہے۔“

ویرا کا وہ وارنٹاں پر بیٹھا اور ہیری کیسبجور کو کھلایا ”تت۔۔۔ تم کس استاد صدو کی بات کر رہی ہو؟ میں اس نام کے کسی آدمی سے واقف نہیں ہوں۔“

”یہ وہی صدو ہے جسے پی سی ٹی این کے خفیہ فنڈز کے سارے نم نے راتوں رات، لکھ بچی بنا دیا تھا اور وہ شہر کے سارے نامی گرامی بد معاشوں کو خریدنے کے خواب دیکھنے لگا تھا۔“

”تم غلط بیانی سے کام لے رہی ہو۔ وہ میرے لیے کام ضرور کرتا ہے لیکن میرے نام سے ناواقف ہے۔ حد تو یہ ہے کہ اس نے مجھے دیکھا بھی نہیں ہے۔ پھر وہ میرے بارے میں کمائیاں کیسے بنا سکتا ہے؟“ ویرا کے پے در پے حملوں سے بوکھلا کر ہیری کیسبجور ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گیا۔

”اس سے ملاقات ہو تو اس بارے میں پوچھ لیتا“ ویرا نے بے پروائی سے کہا ”میں تو چند روز کے لیے باہر جا رہی ہوں۔“

”مجھے معلوم ہے کہ تم کہاں جا رہی ہو“ اس کی آواز میں حسرت اور بے بسی سمٹ آئی ”تم ہمارے ساتھ ٹھنی نہیں ہو اور اس کام میں کوئی نہ کوئی گزیر ضرور کرو گی لیکن یہ یاد رکھو کہ تمہارا آخری مشن ثابت ہو گا۔ ایران سے۔۔۔ کے بعد تمہیں ایک سنگین فرد جرم کا سامنا کرنا ہو گا۔“

”میں ایسی دھکیوں کو ٹھوکر پر رکھتی ہوں“ ویرا نے خفیہ انداز لہجے میں کہا ”اور اپنے بل بوتے پر زندہ رہتی ہوں۔ تم میرے ہزار دشمن مل کر بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔“

”صدو کے بارے میں تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“ ہیری اپنے اس تجسس آمیز سوال پر قابو نہ پاسکا۔

”مجھے کسی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے“ ویرا نے غصے کے ساتھ کہا ”چاہو تو جہنم جا کر اس سے ملاقات کر سکتے ہو۔ وہ تم سے مل کر بہت خوش ہو گا۔“

اپنی بات مکمل کر کے، ہیری کا جواب سنے بغیر ویرا نے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

”تم نے اسے صدو کا حوالہ دے کر اچھا نہیں کیا“ فون بند ہو جانے کے بعد میں نے کہا۔

”کیوں؟ اس میں کیا خرابی تھی؟“ اس نے آنکھیں نکال کر غصے سے سوال کیا۔

”ابھی تک وہ مجھے اور تمہیں الگ الگ گن رہا ہے۔ اگر اسے پتا چلا کہ صدو، سلطان شاہ کا نائب کرتے ہوئے مارا گیا ہے تو وہ سوچنے پر مجبور ہو جائے گا کہ صدو کی ہلاکت کی خبر میرے با سلطان شاہ کے ذریعے تم تک پہنچی ہے اور ہم آپس میں ملے ہوئے ہیں۔ اس طرح اسے ایک طرف توجہ مرکوز کرنے کا موقع مل جائے گا۔“

”یہ بے کار بات ہے“ اس نے لاابالی انداز میں کہا ”اسے کون بتائے گا کہ صدو کس کے پیچھے تھا؟“

”تم بھول رہی ہو کہ صدو کے کئی ساتھی اپنی جائیں بچا کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے“ میں نے طنز لہجے میں اسے یاد دلاتے ہوئے کہا ”وہ بالکل ہی خبر نہیں رہے ہوں گے۔“

”لیکن ان کا ہیری کیسبجور سے رابطہ ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے“ ویرا چٹکی بجا کر بولی ”اس سے صدو کا براہِ راست رابطہ رہتا تھا۔ اس کے آدمیوں کو تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کس کے لیے کام کر رہے ہیں۔ ان غیر ضروری باتوں پر اپنا دماغ لڑانے کی کوشش نہ کرو۔“

سائز دس بجے کے قریب ظفر فلیٹ پر پہنچا۔ اسے بلج کر اس ڈبل کو بچانے کے لیے ویرا کی روانگی کے براگرم کاظم خاں اس لیے مجھے امید تھی کہ وہ اپنی نگاہیں سینکے کے لیے ویرا کے پاس ضرور آئے گا۔

اس نے آتے ہی اطلاع دی کہ صدو کے مکان کی ٹھانی نتیجہ خیز ثابت ہوئی۔ وہاں ٹیلی فون سے ایک ٹیپ ریکارڈ منسلک تھا

ڈرانگ روم میں وہ دونوں اپنی باتوں میں اتنے منہمک تھے کہ کچن سے اٹھنے والی چائے کی اشتها انگیز خوشبو بھی ان کے اعصاب پر اثر انداز نہیں ہو سکی اور میں انہیں چمیزے بغیر اپنی چائے کی پیالی لے کر سلطان شاہ کے ساتھ اس کی خواب گاہ میں گھس گیا۔

”کیا بات ہے؟ تم نے ظفر کو دیرا کے ساتھ اکیلا کیوں چھوڑا ہوا ہے؟“ میرے بیٹھے ہی سلطان شاہ نے مجھے اشیاء آمیز نظروں سے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

”ان دونوں میں سے کوئی بھی نابالغ یا بے وقوف نہیں ہے اس لیے میں نے کباب میں ہڈی بننے کے بجائے وہاں سے اٹھ جانا ہی مناسب سمجھا۔ جب باتوں سے دل بھرجائے گا تو ان میں سے کوئی خود ہی ہمیں آواز دے لے گا“ میں نے اس کے بستر پر پاؤں پھاڑ کر دراز ہوئے ہوئے کہا۔

”عمر کے اعتبار سے شاید ظفر دیرا سے بڑا ہو لیکن وہ بہت شاطر اور مکار عورت ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ ظفر کو کوئی الٹی پٹی پڑھا دے۔ تمہیں وہاں سے نہیں اٹھنا چاہیے تھا“ سلطان شاہ کا لہجہ طاقت آمیز تھا۔

”اگر کوئی خود ہی الٹی پٹی پڑھنا چاہے تو اسے کون روک سکتا ہے؟“ میں نے کہا۔

”وہ ایسٹن ایف کا ایک اہم افسر ہے۔ اسے کسی جال سے بچائے رکھنا ہمارا فرض بنتا ہے۔“

”صرف اسی وقت جب وہ بے خبر ہو۔ دیرا کے بارے میں وہ ہر بات سے باخبر ہے۔“

”وہ کم بخت مردوں کو درجہ اعلیٰ کے فن میں یکساں ہے۔ ہونٹوں، آنکھوں اور اشتهاوں تک سے کام لیتا جانتی ہے“ سلطان شاہ بڑبڑاتے ہوئے بولا ”ایسا نہ ہو کہ وہ ظفر سے کوئی اہم راز اگلوالے۔“

میں دھیمے سے ہنس دیا ”بہت دیر کی ہے تم نے دیرا پر ویسے تم فکر نہ کرو۔ وہ آج واپس جاری ہے اس لیے ظفر کو کوئی شدید نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔ باتوں سے اس کا اخلاق زیادہ نہیں گہڑے گا۔“

تھوڑی دیر بعد دیرا نے ہی مجھے آواز دینے میں پہل کی اور میں ہنستا ہوا وہاں پہنچ گیا۔

”ابتدا میں پیدا ہونے والی بدترین غلط فہمیوں اور تہذیبوں کے بعد یہ دوستی بڑی مبارک ہے“ میں نے ان دونوں کے درمیان پائی جانے والی دوستانہ گرم جوشی پر کہا ”امید ہے کہ اب کرل جیسی جوڑا اور اس کے دست راست سے آشنائی کے مسائل طے ہو چکے ہوں گے۔“

”ہم اس سچی کو بھول چکے ہیں“ ظفر نے خوش دلی کے ساتھ کہا ”ابھی تمہارے کہہ کر توجھے یاد بھی نہ آتا کہ دیرا سے میری کوئی جھڑپ ہوئی تھی۔ اپنی چشہ درانہ مجبور یوں سے قطع نظریہ اندر سے

کاٹ پٹا تھا۔ آدھا بھرا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ ایک تجوری میں سے نکلنے والی خوشبو بھی آ رہی تھی۔ ان سب میں میں صبر و ضبط اور ایک غیر ملکی کے درمیان ہونے والی گفتگو موجود نہ تھی۔ میں نے اس کی بات پر ظفر کو پورا یقین تھا کہ یہ سچی کی سچی بات تھی۔

ظفر نے میری بات کو اپنے گھر آنے والی میری کی ہر کال کو کسی خاص مقصد کے لیے ریکارڈ کرتا رہا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی بڑے وقت کی سبکدوشی کو بیک میل کرنے کا ارادہ بھی رکھتا ہو لیکن حقیقت یہ تھی کہ صبر و ضبط اس چالاکی نے میری کی مذموم سرگرمیوں کے لیے میں ناقابل تردید ثبوت فراہم کر دیے تھے جن پر کارروائی کی گئی تھی۔ ظفر نے اس قانون کے تحت اس اہم سفارت کار کو بھی نہیں بگاڑا جاسکتا تھا۔

ان کی باتوں میں موجود آوازوں پر ہماری رائے لینے کے لیے ہر ایک کیسٹ بھی اپنے ساتھ لیتا آیا تھا۔ میری داستان میں وہ سچی کی سچی باتوں کو سرعہ پیمانی سے پکڑ کر لے جاتا تھا۔

میں صبر و ضبط کے لیے اس اعتبار سے اکتفا کرتا تھا کہ ہم میں سے کسی نے اس کی آواز نہیں سنی تھی لیکن دوسری آواز بلا سبالت میں سنی جاتی تھی۔ ظفر نے گفتگو کا جو حصہ ہمیں سنایا وہ میرے بارے میں تھا۔ میری کی ہدایت تھی کہ ڈینی کو ہر تہمت پر جلد مدد فراہم کیا جائے۔

”بچے کی کیا صورت حال ہے؟“ کیسٹ سے فارغ ہونے کے بعد دیرا نے بے تحاشانہ انداز میں ظفر سے پوچھا۔

”یہ واقعات کے بعد کشیدگی اور خوف و ہراس کی لہر پھیل جاتی ہے“ ظفر نے سکراتے ہوئے کہا ”پورا بازار بھی بند پڑا ہے۔ لوگوں کو نوٹیوں کی صورت میں جابجا جمع ہیں۔“

”اور پولیس کیا کر رہی ہے؟“ دیرا نے تجسس لہجے میں سوال کیا۔

”میں کچھ کہہ کر ہی نہیں تھا“ ظفر سے پہلے میں بول پڑا ”وہ لوگ غارتگری کے پلے گئے ہوں گے۔“

”تم فکر نہ رہو“ ظفر نے میری تائید کی ”البتہ میرے نوٹیوں کی بات بھی غلط نہیں ہے۔ ان کے ساتھ لباسوں میں منسلک اور دھار دھار تھیں۔“

دیرا خوب صورت اور متناسب الاعضا ہونے کے ساتھ ہی اپنے نوانی تھیں۔ ان کے بھرپور استعمال پر ملکہ رکھتی تھی اس لیے ان کا حال عار فانی سے کام لے کر اپنی ادائیں دکھائی دیں۔ اس کی گرم اور نرم ہنسی ظفر کو بھی خوش مزاجی کا مظاہرہ کرنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ جب ان دونوں کے درمیان بے تکلفی کی فضا قائم ہوئی تو میں خاموشی کے ساتھ وہاں سے اٹھ گیا۔

سلطان شاہ بیدار ہو چکا تھا اور کسی کو بھی اپنی طرف متوجہ کیے بغیر کمرے میں گھس کر اپنے لیے ناشتہ تیار کر رہا تھا۔ میں بھی اس کی مدد کے لیے تیار ہو کر بیٹھ گیا۔

خراشیں پڑی ہوئی ہیں۔“

”کچھ دیر خاموش رہو گی تو خراشیں دور ہو جائیں گی“

اسے گھورتے ہوئے کہا۔

”اب تو ویسے بھی میری روانگی کا وقت ہو رہا ہے“

رست و رواج پر نگاہ ڈالتے ہوئے شرارت آمیز لہجے میں بولی ”راستہ“

میں کوئی ڈراپس لے لوں گی۔“

”پھر تیار کرلو۔ میں ہی تمہیں ایئر پورٹ پر پہنچا دوں گا“

نے پیش کش کی ”سلطان شاہ زخمی ہے۔ ڈینی کے لیے بھی آگاہ“

نہ لگنا مناسب ہوگا۔“

سلطان شاہ نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا اور میرے

نے اپنا سر جھکا لیا۔

”مجھے کیا تیاری کرنی ہے؟ پرس اٹھاؤں گی اور چل دوں گی۔“

دیرا، ظفر سے نظریں ہٹا کر مجھے آنکھ مارتے ہوئے بولی ”ہاں کوئی“

سے آگے کے سفر کے لیے تیاریوں کی ضرورت پیش آئے گی۔“

”یہ خیال رکھنا کہ تم اپنا پتہ بتول جواز پر نہیں لے جا سکو گی۔“

ظفر نے اسے یاد دلایا۔

دیرا نے اپنا ننھا سا پستول اپنے پرس سے نکال کر میری طرف

اچھال دیا۔

ظفر اپنی جگہ سے اٹھا تو سب ہی سنجیدہ ہو گئے۔ دیرا ہم

سے رخصت ہو کر ایک بہت بڑے مشن پر جاری تھی۔ وہ

سرکاری مشن نہیں تھا، بس ہم سب کی مخلصانہ کوششوں کا ثمر تھا

ہمیں اپنے ملک کی بڑھتی ہوئی ایٹمی استعداد کے خلاف ایک

بھیاںک مین الاقوامی سازش کا سراغ مل گیا تھا۔ جس کے نتیجے

ایران سے سڑک کے راستے آنے والے ایٹمی سازو سامان اور

حساس ترین آلات کی چھ سوئٹ وڈنی کھپ کو ایک خلائی اٹار

کے ذریعے تیار کیا جاتا تھا۔ دیرا کا مشن اتنا تھا کہ خلائی اٹار

حرکت میں آنے والے ہولناک بارودی ذخیرے پر مشتمل بیٹ

ایکس مشین کو پوری کھپ سے الگ کر کے تیار کرادے تاکہ بھیاںک

جہاز کا سرچشمہ ختم ہونے کے ساتھ ہی بقیہ سازو سامان کی خلاف

کے بغیر پاکستان پہنچ جائے۔

دیرا نے نہایت گرم جوشی کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملانے

ہوئے اس امید کا اظہار کیا کہ اسے ایران سے پاکستان واپس

لوٹنے کا موقع ملتا تو وہ ایک بار پھر ہم سے ملے گی۔ غزالہ کے باب

میں وہ اداس اور شرمندہ تھی لیکن جو کچھ ہو رہا تھا، وہ اس کے

اختیار سے باہر تھا مگر میں دل ہی دل میں جانتا تھا کہ اگر وہ اپنے

غزالہ کی واپسی کے معاملے میں گہری دلچسپی نہ لی ہوئی تو اسے کافی

میں، شری مان سنگھ کے آقاؤں کے چنگل سے نکالنا دشواری تھی

ناممکن تھا۔ اور اب بھی کو ایک فو کی دلچسپی کی وجہ سے امید کی

روشنی برقرار تھی۔

وہ سلطان شاہ کی طرف بڑھی تو وہ پوچھا کہ ارے“ ارے“

یہ رہ گیا اور دیرا پوری قوت سے اس کے ساتھ بھٹ بھٹ کر ہوئی۔“

بہت سیدھی، سادی اور معصوم لڑکی ہے جسے آج تک کوئی سچا بھرو

نہیں مل سکا۔“

ظفر کی سنجیدگی پر میرا دل چاہا کہ میں دونوں ہاتھوں سے اپنا

سر پیٹ لوں۔ آخر کار وہی ہوا تھا جس کا سلطان شاہ کو اندیشہ تھا۔

دیرا مجھ سے نگاہیں چرائے زیر لب مسکرا رہی تھی۔

”مجھے خوشی ہے کہ اس سنگین دورا ہے پر دیرا سے تمہاری

ملاقات ہو گئی“ میں نے جلتے جلتے لہجے میں کہا ”اب اپنا سوبر کب

رہا رہے ہو؟“

”دیرا کا یہی خیال تھا کہ تم اس بدلی ہوئی صورت حال کو

آسانی کے ساتھ قبول نہیں کر سکو گے“ ظفر نے گہری سنجیدگی کے

ساتھ کہا ”ہو سکتا ہے کہ آگے چل کر ہماری دوستی کوئی اور رخ

اختیار کر لے لیکن ہماری پہلی ملاقات پر ایسی جلی کئی باتیں تمہیں

ذہن میں دیتیں۔ تم ویسے بھی غزالہ سے محبت کا دم بھرتے ہو۔

تمہیں کسی اور عورت کو اپنا دست بھرنے کے لئے کوئی حق نہیں

ہے۔“

وہ صورت حال اس قدر مضحکہ خیز تھی کہ خود دیرا ہر بری طرح

بھی کا دردہ پڑ گیا۔ جسے وہ مسلسل کھانسی میں چھپانے کی کوشش کرتی

ہوئی غسل خانے کی طرف بھاگ گئی۔

”تمہیں کیا ہو گیا ہے؟“ دیرا کے دفع ہو جانے پر میں نے

سرگوشیانہ لہجے میں ظفر کو زانا ”تمہیں معلوم ہے کہ وہ ایک آوارہ

اور بد چلن عورت ہے۔ تم تو اس کی بوگوتا کی کمانیوں سے بھی

واقف ہو۔ پھر اس کے دام میں آگئے؟ مجھے تم سے ایسی امید نہیں

تھی۔“

”ہاں نہیں تم کیا سمجھ رہے ہو“ ظفر بدستور سنجیدہ تھا۔ ”میری

اور دیرا کی ذرا سی دوستی کو تم افسانہ کیوں بنا رہے ہو؟ میں کوئی دردہ

پیتا بچہ نہیں ہوں جسے تمہاری رہنمائی کی ضرورت ہو۔“

”ٹھیک ہے!“ سلطان شاہ گڑ گڑ بھ سے بولا ”ملاو دجہ بد مزگی

پیدا نہ کرو۔ ظفر کو بھی اپنے برے بھلے کا اندازہ ہے۔ ہم کو اپنی حد

سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے۔“

”سب بھڑ میں جائیں“ میں نے دل ہی دل میں کہا پھر ظفر

سے بولا ”معاف کرنا“ میں ضرورت سے زیادہ حساس ہو گیا تھا۔

جس میں شاید میری تنگ نظری کا دخل تھا۔“

”کوئی بات نہیں“ ظفر نے میرا ہاتھ تھام کر مجھے صوفے پر

اپنے قریب ہی بٹھایا اور نرمی سے بولا ”میں نے کبھی دیرا سے

چٹکیں بڑھانے کا فیصلہ کیا تو تم سے ضرور مشورہ کروں گا۔ فی الحال

مجھے کسی مشورے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اپنے ذاتی معاملات

کو ویسے بھی خود ہی طے کرنے کا عادی ہوں۔“

اسی وقت دیرا غسل خانے سے واپس آگئی۔ بھئی روکنے کی

کوششوں کی وجہ سے اس کا چہرہ گنار ہو رہا تھا اور آنکھوں میں

آنسو تیر رہے تھے مگر وہ بدستور کھانسنے کی اداکاری کرتے ہوئے بولی

”کھانسی کی وجہ سے بہت برا پھندا لگا تھا۔ ابھی تک گلے میں

ہی فون ملایا اور آپرینر نے فوری طور پر میری کال شری مان سنگھ کی سیکریٹری کو منتقل کردی۔ اس نے مجھے بتایا کہ شری مان اس وقت مصروفیت کی وجہ سے فون پر بات کرنے سے قاصر تھا۔

”یہ ایک اہم کال ہے۔ میرا نام ڈی بی ہے، ہو سکتا ہے کہ مجھے دوسری کال کرنے کا موقع ہی نہ مل سکے۔ اس وقت میری بات ہونی بہت ضروری ہے“ میں نے اپنی بات پر اصرار کرتے ہوئے کہا۔ وہ مجھے لائن ہولڈ کر کے غائب ہو گئی اور میں نے وقت گزاری کے لیے سگریٹ سلائی۔

خاصے طویل قتل کے بعد شری مان سنگھ کی آواز سنائی دی تو وہ خاصی خشنک تھی ”کو! ایسی کیا مصیبت آپنی ہے کہ اس وقت بات کرنی ضروری تھی۔“

”لجہ سنبھال کر بات کرو، شری مان سنگھ جی!“ میں نے خنک لہجے میں کہا ”میں تمہارا کوئی ادنیٰ یا تخت یا ذاتی ملازم نہیں ہوں جو تم اس قدر تحقیر آئیز لہجے میں بات کر رہے ہو۔“

”اوہ! معاف کیجئے مہاراج! مجھے شکایتیں اور یہ فرمائیے کہ اس وقت کیسے زحمت کی ہے؟“ اس کی بھنائی ہوئی آواز ابھری ”تم سمجھ ہی نہیں سکتے کہ ایک ڈے دار افسر کی مصروفیات کتنی پیچیدہ اور الجھی ہوئی ہوتی ہیں۔ تمہارے دماغ پر بس اپنی اہمیت منوانے کا بھوت سوار ہے۔ اب جلدی بتاؤ کہ کیا کتنا چاہتے ہو؟“

”میں نے اپنا نام پورا کر لیا ہے“ اسے ذہنی جھکا دینے کے لیے میں نے اپنے پروگرام سے انحراف کرتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا ”وقت ہو تو بات کرلو ورنہ اگلے ہفتے کا کوئی وقت دے دو۔“ ”اوہو“ اس کی بھونڈی سی ہنسی گونجی ”تو یوں کہنا کہ اصل معاملے کی بات ہے۔ اس کے لیے تو میں اپنے ہزار کام بھی پیچھے چھوڑ سکتا ہوں، کموں، کیا خبریں ہیں۔“

”تم نے یہ کیسے سمجھ لیا تھا کہ میں نے اپنا اور تمہارا وقت برباد کرنے کے لیے فون کیا ہو گا؟“ میں نے اس کے سوال کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے چٹکی کے ساتھ سوال کیا ”آری جن لوگوں کے ساتھ کام کرتا ہے ان کے تھوڑے بہت نخرے بھی اٹھاتا ہے لیکن تم تو افلاطون سے بھی کئی قدم آگے بڑھ گئے ہو۔“

”چلو میں مانے لیتا ہوں کہ مجھ سے غلطی ہو گئی۔ میرا خیال تھا کہ تم نے غزالہ کی واپسی کا پروگرام جاننے کے لیے فون کیا ہو گا“ اس نے اپنی صفائی کی کوشش میں مجھے خودی ایک سنہرا موقع فراہم کر دیا۔

”غزالہ کی واپسی تمہارے لیے غیر اہم ہو سکتی ہے لیکن میرے لیے وہ زندگی اور موت کا معاملہ ہے۔ بہتر ہو گا کہ ہم پہلے اسی کے بارے میں بات کر لیں۔ وہ اس وقت کہاں اور کس حال میں ہے؟“ ”وہ ابھی تک واپس نہیں آسکی۔ تم مجھے اپنے کام کے بارے میں بتاؤ، غزالہ کے بارے میں ہم شام کو بات کر سکتے ہیں۔“

”اب یہ نہیں ہو سکے گا، شری مان جی!“ میں نے جھپٹے ہوئے لہجے میں کہا ”پچھلے معاملے میں تمہاری زبان پر بھروسہ کر کے میں

کابھی مذاق تھا نہیں لیکن انکھیں سے دیکھا کہ دیر سے کھلی غفر کو ابھی نہیں گئی تھی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا سلطان شاہ کے تازہ زخموں کے حوالے سے دیر کو فوراً ہی اس کے ایک کمریہ۔ سلطان شاہ ہانپا ہوا صوفے پر گر گیا اور دیر کے کرنس پڑی۔

چند منٹ کی جذباتی گفتگو کے بعد دیر، ظفر کے ساتھ فلیٹ سے چلتی ہوئی۔ اس کے پیچھے دروازہ بند کرتے ہوئے مجھے اپنا وجود مٹانے والی غالی سامحوس ہو رہا تھا۔

دیر الگ آوارہ، بد معاش، عیار، مکار اور چال باز سی لیکن یہ اس کے اخلاق کا ایک بھروسہ پلو تھا کہ وہ جس سے بھی خلوص سے ملے گی اسے اپنا گردیدہ بنا لیتی تھی۔ وہ میری کچھ بھی نہیں لگتی تھی بلکہ کیا رہا یہ بھی ہو چکا تھا کہ وہ میرے خون کی پیاسی ہو گئی تھی اور مٹا دینا اس کی گھات میں رہتے لگا تھا لیکن ہر بار جب بھی اس نے دوستی کا ہاتھ بڑھایا تو سچے دل کے ساتھ پرانی رنجشوں کو یاد کروٹی کا حق ادا کر دیا۔

دیر کے بارے میں ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ جب بھی مجھ سے ملنے بیٹھے میں کامیاب ہوتی، اس نے مجھ پر پوری طرح اعتماد لے کر اپنے تفصیلی حالات سے باخبر رکھا جب کہ میں نے کبھی اسے ضرورت سے زیادہ اعتماد میں نہیں لیا۔ اس میں بھی ہاؤنڈا کہ میں نے اپنی مصالحتوں کی بنا پر اصل واقعات کو توڑ کر پیش کیا اور دیر اپنے قیاسات کے باوجود میری ہر بات پر یقین کرتی رہی۔

آخری مرحلے پر شری مان سنگھ کے بارے میں بھی ایسی ہی بہت حال درپیش تھی۔ غزالہ کی واپسی کے بارے میں اس سے پانی میرے مذاکرات چل رہے تھے۔ میں غلام رسول کی واپسی کا ٹھکانہ بھی پوری کر چکا تھا مگر وہ مجھے پوری طرح چپانے پر تلا ہوا تھا لہٰذا اس نے ملا سکر کار کے بارے میں سراغ لگانے کا کام بھی نہ ہو پڑا تھا اور مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اس کے بعد وہ غزالہ کو مجھ والے کو دے گا۔ میں نے اس بارے میں کچھ بتائے بغیر دیر کو شری مان سنگھ کے پیچھے لگایا تو اس کے نتیجے میں غزالہ ان گھٹا کے جنگل سے تو رہا ہو گئی مگر ہانگ کانگ میں جا پھنسی تھی۔ دیر کو ایک فاس کی رہائی کے لیے کوشاں تھا۔

دیر نے شری مان سنگھ پر یہ تاثر برقرار رکھا تھا کہ وہ میری فائز دیکھ رہے ہیں اور مجھے زک پہنچانے کے لیے ہی غزالہ کو اپنے شہنشاہ بنا چاہتی ہے۔ اس لیے میں نے سوچا کہ اب میں اپنی شرط منالے سے شری مان سنگھ کو کرید کر دیکھوں کہ وہ کیا کہتا ہے۔

”یہ واقعی بہت دلچسپ صورت حال ہے“ سلطان شاہ نے جلی جلی زبان پر کہا ”دیکھنا چاہیے کہ شری مان سنگھ اب غزالہ سے ملنے میں کیا قیاد بازی کیا کرتا ہے؟“

میرا دیر اسے شری مان سنگھ کا ڈائریکٹ نمبر لے چکا تھا لیکن اس کے کٹھن کا موقع نہ دینے کے خیال سے میں نے پرانے نمبر پر

مارکھا چکا ہوں۔ اب میں ہوشیار ہو گیا ہوں۔ یہ بتاؤ کہ وہ اب تک واپس کیوں نہیں آسکی؟

”اس کی واپسی سے تمہارا ہی نہیں، میرا مستقبل بھی وابستہ ہے۔ اس کا لہجہ قدرے تیز ہو گیا۔ ”اگر غزالہ ہمارے پاس ہے تو رجنی تمہاری تحویل میں ہے۔ ان دونوں کا تاول ایک ساتھ ہی ہو گا۔ دیکھا جائے تو اب تمہارے کام کا غزالہ کی واپسی سے اتنا مگر اقل نہیں ہوتا چاہیے۔ تم نے اپنی رپورٹ مجھے دے دی تب بھی میں جلد از جلد غزالہ کو تمہارے حوالے کرنے کی کوشش کروں گا تاکہ رجنی میرے گھر واپس آسکے۔“

”رجنی سے تمہاری محبت باسی کڑھی کا ابال ہے“ میں نے ساٹ لیجے میں کہا۔ ”پہلے تمہیں اس سے اتنی نفرت تھی کہ تم اسے قتل کرنا چاہتے تھے اور اب اس کی محبت کا دم بھر رہے ہو۔ تمہارے ان متضاد جذبات میں سے کچھ کو وضوح نکالنا آسان کام

نہیں ہے جبکہ میرے لیے غزالہ پیش سے سب کچھ ہے۔ تم اپنے پیش ورائہ مفادات کے لیے رجنی کی بیعت دے سکتے ہو مگر میں ایک لمحے کے لیے بھی غزالہ کو نہیں بھول سکتا اس لیے تمہارے کام کی بات اسی وقت ہو سکے گی جب مجھے غزالہ کی واپسی کا سو فیصد یقین ہو۔“

”میں تمہیں اپنی مجبوریوں سے پہلے ہی آگاہ کر چکا ہوں۔“ میرے لمبے کی تختی پر وہ ایک بیک نرم پڑ گیا۔ ”اب وہ دہلی والوں کے رحم و کرم پر ہے۔ وہ لوگ ہماری مجبوریاں نہیں سمجھتے۔ ہر وقت سرخ فیتے کے چکر میں پڑے رہتے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ غزالہ کو ایک آدھ دوڑ میں بیکانیر پہنچا دیا جائے گا۔ میدان صاف ملتے ہی اسے کسی بھی وقت سرحد پار کر کے یہاں لے آیا جائے گا۔ اس بارے میں تم کو میری یقین دہانی پر اعتماد کرنا چاہیے۔“

وہ خبیث نہایت ڈھٹائی کے ساتھ جھوٹ بولے جا رہا تھا۔ میرے سامنے کی بات تھی کہ اس نے ورا کے مطالعے پر غزالہ کو ہانک کاٹک بھجوا دیا تھا لیکن وہ مجھے یہی یقین دلانے کی کوششیں کر رہا تھا کہ غزالہ بدستور نئی دہلی میں قید تھی۔ میرا دل چاہا کہ اسی وقت اس کے جھوٹ کا بھانڈا چھوڑ دوں لیکن میں نے ضبط سے کام لینے کا فیصلہ کر لیا۔ اسے پوری طرح گھبرنے سے پہلے میں بات کھول دیتا تو وہ مکار کوئی فدا بازی کھا سکتا تھا۔

”تو کیا تمہیں پورا یقین ہے کہ غزالہ ابھی تک نئی دہلی میں پھنسی ہوئی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”میں اس وقت کی بات تو نہیں کرتا لیکن پچھلی رات میری فون پر بات ہوئی تھی۔ ایک بجے رات کو وہ نئی دہلی ہی میں تھی۔ بعد کی خبر آج کسی وقت فون کر کے لوں گا۔“ اس نے سفید جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

وہ اس کے گرد پھیلائے جانے والے جال کا پہلا مضبوط پھندا تھا۔ وہ رات کے ایک بجے غزالہ کی نئی دہلی میں موجودگی کی اطلاع

دے رہا تھا جب کہ وہ اس سے بہت پہلے ہانک کاٹک پہنچا چکی تھی۔

”تم غزالہ کے بارے میں خبریں لیتے رہو۔ میں کل کی جہیں فون کروں گا۔“

”آخر تم میری نیت پر بھروسہ کیوں نہیں کرتے؟“ اس نے زنج آکر بے بسی سے کہا۔

”بات تمہاری نیت کی نہیں، میرے اپنے حالات کی ہیں۔ میں چاروں طرف سے دشمنوں میں گھرا ہوا ہوں اور ہر ایک معلوم ہے کہ غزالہ میری بہت بڑی کمزوری ہے۔ اگر وہ ہمارے ہاتھوں سے کھل کر کسی اور کی تحویل میں چلی گئی تو میں کیسے کامیاب رہوں گا۔ تمہیں مستعدی کے ساتھ غزالہ کی واپسی کے کام لگانے رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ میں تمہیں آخر تک تحقیقات کی ہوانہ لگنے دوں۔“

”تم مجھ پر مسلسل ریکک حملے کیے جا رہے ہو؟“ اس نے احتجاج کیا۔ ”پہلے رجنی کے ساتھ میری دلی محبت پر شہ ظاہر کیا اب تمہیں بالکل ہی بزدل اور بڑا کمزور کہہ رہے ہو۔“

”میں نے تمہیں کب بزدل یا بڑا کمزور کہا؟“ میں نے انہماک حیرت سے سوال کیا۔

”تمہارا مقصد یہی تھا۔“ اس نے اصرار کیا۔ ”تم میرا قابل بھی نہیں سمجھتے کہ ہم اپنے ایک قیدی کو حفاظت کے اپنی تحویل میں رکھ سکیں۔ ہمارے قبضے سے کسی کو نکال لے بچوں کا مکمل نہیں ہے۔“

”مجھے اپنے ذرائع سے ملنے والی خبروں پر اعتماد کرنا پڑا ہے وہ خبریں تشریحات ہیں۔“

”تمہارے آدمی تمہیں گمراہ کرتے ہیں۔ تمہاری نظروں اپنی وقت بڑھانے کے لیے وہ پہلے ایسی حوصلہ شکن خبریں دیتا پھر تمہیں بتائیں گے کہ انہوں نے ساری رکاوٹوں کو دور کر غزالہ کی طرف پیش قدمی کرنے والوں کو مار بھگا ہے۔ یہ درحقیقت کچھ بھی نہیں ہو گا۔ ایسی کمائیاں ہمارا محنت کے کی پیداوار ہوتی ہیں۔ ایسے بھیاک آسیب ان ہی کی ٹھوکریوں پیدا اور دفن ہوتے رہتے ہیں۔ تم یقین کرو کہ غزالہ کو کون نہیں ہے اور وہ بہت زیادہ محفوظ ہاتھوں میں ہے۔ ہم دنیا کی اس خفے کی سپر پاور ضرور ہیں اور اپنے مفادات کی حفاظت جانتے ہیں۔ تمہیں اس بارے میں ذرا بھی شک نہیں چاہیے۔“

”تمہارا دل رکھنے کے لیے میں ان باتوں کو مان لیتا ہوں اپنی رپورٹ اسی وقت دے سکوں گا جب میں اپنی نظروں غزالہ کو تمہارے ساتھ دیکھ لوں گا۔“ میں نے دھیمے سے کہا۔

”تم پرلے درجے کے ضدی اور بہت دھرم معلوم ہو۔“ شری مان گھگ کی آواز سے بے بسی عیاں تھی۔

اس لیے وہ دھوکا کھا جائیں گے۔ اصل غزالہ بدستور نئی دہلی میں آرام کر رہی ہے۔“

میں نے اپنی دانست میں اس پر کاری وار کیا تھا لیکن اس کے جوابی انکشاف نے میرے اوسان خطا کر دیے۔ میرے معدے کے دہانے میں یک بیک اینفین شروع ہو گئی۔ پیٹ میں درد آنکیز کر میں پڑنے لگیں اور پشت میں پسلیوں سے سرایت کرتا ہوا اعصابی درد پھینک پھانڈنے لگا۔

میرے لیے وہ ایک مہیب صورت حال تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کھڑی دھلان پر پوری رفتار سے کسی نشیمن دریا کی طرف دوڑتے دوڑتے اچانک ہی آگ کا دریا سامنے آگیا ہو جہاں رکنا آسان تھا نہ آگ میں کود پڑنا ممکن تھا۔ میرا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ شری مان سنگھ فون پر مسلسل بولے جا رہا تھا لیکن اس کی کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ آخر میں نے اضطراری طور پر فون بند ہی کر دیا۔

پتا نہیں وہ شری مان سنگھ کی کوئی حال تھی یا وہ واقعی سچ بول رہا تھا لیکن اس نے مجھے ذہنی انتشار کے ہولناک جنم میں ضرور جھونک دیا تھا۔ حقیقت اور فریب ایک دوسرے میں گمڈ ہو کر اس قدر دھندلا گئے تھے کہ کسی ایک پر یقین کرنا ناممکن ہو کر رہ گیا تھا۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ ویرا سے لے کر کوٹنگ فونک سب ہی ایک سراب کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ ویرا کا منہ بولا باپ جس لڑکی کی آزادی کو اپنی انا کا مسئلہ بنائے ہانگ کانگ کے ایک ہوٹل میں ڈیرے ڈالے بیٹھا تھا وہ لڑکی دھوکے کی ٹٹی کی سوا کچھ بھی نہیں تھی۔

ہانگ کانگ میں کوٹنگ فونک مار رہا تھا، ویرا ایک اہم ترین مشن پر روانہ ہو چکی تھی اور میں ویرا کی سودے بازی پر حد سے بڑھے ہوئے اعتماد کی وجہ سے شری مان سنگھ سے خاصا بگاڑ پیدا کر چکا تھا۔ جب کہ غزالہ اسی مردود کے ساتھیوں کی قید میں تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ پر بیچ تھی کیسے سلجھ سکے گی۔

سلطان شاہ کچھ دیر تک دور بیٹھا میری حرکات و سکنات کا جائزہ لیتا رہا۔ اس کی آنکھیں کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ پھر جب میں نے اپنے جسم کے مختلف حصوں میں اٹھنے والی درد کی نیسوں سے ہولناک صوفے پر نیم دراز ہوا تو وہ نرمی سے میرے قریب آ بیٹھا۔

”تم اپنے دل پر اثر نہ لو! اس نے میرا ہاتھ ہاتھ ہاتے ہوئے کہا۔“ شری مان سنگھ ایک سیکرٹ ایجنٹ ہی نہیں، منجھا ہوا سفارت کار بھی ہے۔ تمہاری زبان سے ہانگ کانگ کا حوالہ سن کر اسے چپ لگ گئی تھی۔ تپا تھی کے نام پر اسے ایک راہ سوچ گئی اور اس نے پینز بدل دیا۔ تم خود غور کرو کہ اگر اس کی کمائی میں ذرا سی بھی حقیقت ہوئی تو تپا تھیوں سے پہلے ہانگ کانگ کا کرتوت

تو مجھے صرف اتنا ہی بتا دو کہ وہ زندہ ہے یا سوگ لباس ہو چکا ہے؟“
”یہی تو اصل نکتہ ہے۔“ میں نے زور دے کر کہا۔ ”اب تم مجھے زیادہ مجبور نہ کرو ورنہ میں اپنے شبہات کھول کر بیان کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ اس مرحلے پر میں کسی حتمی کو ہوا نہیں دینا چاہتا۔“

”بار بار ڈھکے چھپے اشارے کرنے سے تو بہتر ہے کہ تم ایک بار کھل کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لو۔“ اس بار شری مان سنگھ نے غالباً تنک کر کہا تھا۔ ”تاکہ میں بھی ایک بار یہی جواب دے سکوں۔“

”تم مجھ سے مسلسل جھوٹ بول رہے ہو!“ میں نے تیز اور غصے لیے میں کہا۔ ”تم کسی اور سے سودا کر کے غزالہ کو ہانگ کانگ بھیج چکے ہو۔ میں تمہارا سرتوڑ دوں گا۔“

میرے الفاظ پر دوسری جانب کئی سیکنڈ تنک سنا چھایا رہا۔ ریسیور میں بس شری مان سنگھ کے تیز تیز سانسوں کی آوازیں آتی رہیں۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے میرے بے لاگ الفاظ نے اس کے سینے پر کسی مضبوط کے جیسی ضرب لگا کر اسے بالکل بے حال کر دیا ہو۔

”یہ بالکل بے بنیاد اور شرمناک الزام ہے۔“ آخر کار لائن پر اس کی تھکی ہوئی احتجاجی آواز ابھری۔

”تم اب مجھے مزید دھوکا نہیں دے سکتے۔“ غصے میں اضطراری طور پر میری آواز خاصی بلند ہو گئی۔ ”کو تو میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ مس تپا تھی اور مس تپا تھی نے ہانگ کانگ کے کس ہوٹل میں قیام کیا تھا۔“

فون پر گونجنے والے اس کے نیم ہنیانی تھپتھے نے مجھے اپنی بات ادھوری چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ میں حیران تھا کہ میں نے ایسی کون سی بات کہہ دی کہ وہ اپنی شرمناک شکست کو بھول کر تھپتھے لگانے پر مجبور ہو گیا ہے۔

آخر اس کی ہنسی کچھ کم ہوئی تو اس نے اسی دوران میں رک رک کر کہا۔ ”ہانگ کانگ کا ذکر کر کے تم نے تو میرا دم ہی نکال دیا تھا۔ اب میں سمجھا کہ تم مس تپا تھی اور مس تپا تھی والے مذاق کا نشانہ بن گئے ہو۔“

”مذاق؟ تم ہوش میں تو ہو؟ یہ مذاق نہیں، مصدقہ اطلاعات ہیں۔“ میں نے غراتے ہوئے کہا۔

”ہاں ہاں، مجھے معلوم ہے!“ شری مان سنگھ کالب و لہجہ ایک بار پھر پر اعتماد اور بے پروایا نہ ہو گیا۔ ”اب تم ذکر چیڑی بیٹھے ہو تو سنو کہ تمہارے بعض دشمن واقعی منہ مانگے دامنوں پر غزالہ کو خریدنا چاہتے ہیں۔ ہم نے ایک ایسی ہی پائی کے بڑھتے ہوئے بباؤ سے تنک آ کر ایک ہندوستانی لڑکی کو غزالہ کی جگہ ہانگ کانگ بھیج دیا ہے۔ مس تپا تھی کے نام سے سفر کرنے والی لڑکی غزالہ نہیں، لکھنؤ کی شگفتہ دیوی ہے۔ ان لوگوں نے غزالہ کو کبھی دیکھا نہیں

بھی اپنی مرضی سے زندہ نہیں رہ سکیں گے۔
 ”اس کے الفاظ سننے ہی میرے جسم کے مختلف حصوں میں خود بخود ایڈرنلین اور رورڈ کی لہریں پیدا ہونے لگی تھیں۔“
 میں نے بے چارگی کے ساتھ کہا۔ ”اس میں میری سوچ یا ارادے کا کوئی دخل نہیں تھا۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”ہمت سے کام لو اور انھیں کی کوشش کرو۔ تم نے جس طرح فون بند کیا ہے اس پر شری مان سمجھ کو دلی مسرت ہوئی گی۔“
 ”میرے لیے ایک کپ کافی تیار کرو پھر دیکھتے ہیں کہ کیا کرنا چاہیے۔“ میں نے لینے لینے سگریٹ سلگانے کے بعد کہا اور وہ نہایت سعادت مندانہ انداز میں سر تھکا کر کچن کی طرف چلا گیا۔
 آہستہ آہستہ میرا ذہن سوچنے کے قابل ہوا تو میں نے اس معاملے پر از سر نو غور شروع کیا۔

شری مان سمجھ کو جو ذہر افشانی کرنی تھی، وہ کر چکا تھا۔ اس کے بارے میں اس سے کسی بھی بھلائی کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی البتہ ہانگ کانگ یا مکاؤ والے اس معاملے میں مددگار ثابت ہو سکتے تھے۔

میں نے اس بارے میں سلطان شاہ سے بھی مشورہ کیا اور پھر مکاؤ کے نمبر لانے میں مصروف ہو گیا۔
 کوئی گفٹ نمبر ابتدا میں وہی چوں چوں کی آواز سنائی دی اور ہم دونوں سانس روکے اس سنگین ٹون کے خاتمے کا انتظار کرتے رہے۔ اس کے خاتمے پر فوراً وہی مانوس چینی آواز سنائی دی جو ہم اس سے پہلے بھی اس نمبر سے سن چکے تھے۔
 ”میں تحریر بول رہا ہوں اور انگریزی میں کچھ اہم بات کرنا چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”ضروریات کرو!“ عورت نے انگریزی میں کہا۔ ”لیکن میں اتنا ضرور بتا دوں کہ ہانگ کانگ میں صورت حال ابھی تک جوں کی توں ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔“
 ”تم نے تو کہا تھا کہ دوسروں کے ساتھ وہ لڑکی بھی پولیس کی تحویل میں ہے؟“

”وہ پولیس کی تحویل میں نہ ہوتی تو کتب کی مکاؤ لائی جا چکی ہوتی۔“

”ہمارے لیے ایک بڑی الجھن پیدا ہو گئی ہے جسے تمہاری ذرا سی توجہ سے دور کیا جاسکتا ہے۔“ اصل بات کرنے سے پہلے میں نے تمہید کا سارا لیتا ضروری سمجھتے ہوئے کہا۔

”ہم ہر طرح تعاون کے لیے تیار ہیں۔ تم کیا چاہتے ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”ہمیں فوری طور پر مس تپاخی کی ایک تازہ تصویر کی ضرورت ہے۔ اگر تم کسی طرح اس کی بلیک اینڈ وائٹ تصویر حاصل

ہی اسے کھل جانا چاہیے تھا۔ اس نے ہاری ہوئی بازی چیتنے کی ایک چال چلی اور تم اس کے داڑ میں پھنس گئے۔ اگر تم اضطرابی رد عمل کا شکار نہ ہو گئے ہوتے تو وہ تمہاری جرح کے جواب میں زیادہ دیر تک نہیں ٹھہر سکتا تھا۔“

”لیکن اس کی باتیں بہت اہم تھیں۔ اس نے کھل کر کہا تھا کہ ان لوگوں نے غزالہ کو نہیں دیکھا اس لیے وہ دھوکا کھا جائیں گے۔ وزیر کراچی میں بھیجی ہوئی تھی۔ ہانگ کانگ میں جو لوگ غزالہ کی دیکھ بھال کے ذمے دار تھے انہیں تو بس شکر ملا کہ کرا نمبر آٹھ سو بیس میں ٹھہری ہوئی مس تپاخی تک پہنچا تھا۔ اس نے آگے وہ کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ انہوں نے بھی غزالہ کو دیکھا ہی نہیں تھا۔ یہ بات شری مان سمجھ اچھی طرح جانتا تھا۔“

”یہ ایک اتفاق بھی ہو سکتا ہے کہ شری مان سمجھ کا کنگا لگ گیا ہو۔ تم نے سنا نہیں تھا کہ ویرا اسے بات کرتے ہوئے اس کے لب و لہجے سے کس قدر خوشامد اور غرض مند ہی جھلک رہی تھی۔ وہ ویرا کے ساتھ اتنا بڑا دھوکا کرنے کی جرات ہی نہیں کر سکتا تھا۔ ویرا نے اسے بتا دیا تھا کہ اس کے آدمی غزالہ کو بلا تاخیر کراچی لائیں گے۔ اگر وہ کوئی اور لڑکی نکلتی تو چند ہی گھنٹوں میں شری مان سمجھ کے قریب کا پردہ چاک ہو جاتا اور ویرا ہمیشہ کے لیے اس کی دشمن ہو جاتی۔“

”اس کی باتوں سے میرا اعتماد پاش پاش ہو گیا ہے اب میں اس وقت جھوٹ اور جھج میں تمیز کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکا ہوں۔ وہ غزالہ بھی ہو سکتی ہے اور شکنتلا بھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ اگر وہ شکنتلا ہی ہے تو کوئی گفٹ فو کو اسے اس کے حال پر چھوڑ کر مکاؤ لوٹ جانا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ لڑکی برا ہوئے ہی کوئی گفٹ فو کے خلاف کوئی ہنگامہ کھڑا کر دے۔“ میں نے کہا۔

”تم چاہو تو میں ابھی ایئر پورٹ جا کر ویرا کو واپس لاسکتا ہوں۔“ سلطان شاہ نے اپنی رست و راج پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔
 ”ظفر کے چکر میں وہ جلد ہی پہلی گئی ہے ورنہ اس کی پرواز میں ابھی کافی وقت باقی ہے۔ یہ ہفتی سمجھانے کے بعد وہ کل صبح بھی کوئٹہ کے لیے روانہ ہو سکتی ہے۔“

”نہیں!“ میں نے سختی سے اسے منع کر دیا۔ ”بلکہ اس ذیل اس وقت سب سے اہم ہے۔ ویرا نے پہلی بار کسی بڑے کام کا بیڑا اٹھایا ہے، اسے وقت پر ہو جانا چاہیے۔ اگر مال بردار کارواں غلطی سارے کی ریش سے باہر نکل گیا تو دنیا کی کوئی طاقت بعد میں آنے والی بڑی تباہی کو نہیں ٹال سکے گی۔ ویرا کے مشن سے چھ سو ٹن کی کھپ سی نہیں، موجود ایٹمی تنصیبات کا مستقبل بھی وابستہ ہے۔“

”مہم تم ہی کوئی راہ نکالو۔ اُلجھے ہوئے معاملات میں میرا ذہن کام نہیں کرتا۔ اتنے معمولی سے جھگڑے پر تم یوں پڑ گئے تو ہم چند روز

اس سے پہلے لڑکی کی تصویر ملنی مشکل ہے۔

”لڑکی تک رسائی ناممکن ہے تو پولیس ریکارڈ سے اس کا کوئی کلوز اپ ڈھانڈا جاسکتا ہے۔“ میں نے ایک اور امکان کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا۔ ”پولیس والے مجرموں کو گرفتار کرنے کے بعد اپنے ریکارڈ کے لیے ان کے فنگر پرنٹس کے ساتھ متعدد زاویوں سے تصاویر بھی بناتے ہیں۔“

”ہم ان سب باتوں سے واقف ہیں۔“ وہ میرے مسلسل اصرار سے چڑی مٹی اور تنک کر بولی۔ ”میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ ڈان قانون سے لڑ کر نہیں بلکہ بیچ کر چلنے کا عادی ہے۔ تمہاری فرمائش پر میں یا کوئی بھی اپنے کسی آدمی کو خطرے میں نہیں ڈالے گا۔ اس لیے تم لڑکی کی تصویر کا خیال اپنے دل سے نکال دو۔ اگر تم اتنے ہی بے چین ہو تو میں تمہاری خواہش نوٹ کیے لیتی ہوں۔ ڈان سے رابطہ ہو گا تو اسے تمہاری خواہش سے آگاہ کر دیا جائے گا۔ ویسے میں تمہاری اطلاع کے لیے بتا دوں کہ ڈان نے خود مگناؤ سے باہر قدم نکال کر اپنی منہ بولی بیٹی کو بے پناہ عزت دی ہے ورنہ وہ کسی سے زیادہ بات کرنی بھی پسند نہیں کرتا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہاری فرمائش پر کان نہیں دھرے گا۔“

”لیکن میں دیر کی مرضی سے بلکہ اسی کی ہدایت پر تم سے بات کر رہا ہوں۔“

”میری حد تک یہ ٹھیک ہے لیکن ڈان بہت سختی کے ساتھ برادری پر چلتا ہے۔ دیر کا کام چھٹا ہوا ہے تو اسے خود وقت نکال کر بات کرنی ہوگی۔ وہ مصروف ہے تو ڈان اس سے کہیں زیادہ مصروف رہتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اسی ایک بات پر مشتعل ہو کر دیر اسے ناراض ہو جائے۔ اب تم بتاؤ کہ کیا چاہتے ہو؟ جیسا تم کو تمہیں اسی کے مطابق عمل کرنا کی۔“

”پھر بھول جاؤ کہ میں نے تمہیں فون کیا ہے۔“ میں نے بھی ہوئی آواز میں کہا۔ ”دیر آئے گی تو وہ خود ہی اپنے معاملے کو سنبھال لے گی۔ مجھے دلائل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

”یہ نشانہ بھی خطا ہو گیا۔“ فون بند ہونے پر سلطان شاہ نے فکر مندانہ لہجے میں کہا۔

”مجبوری ہے۔“ میں نے مایوسی سے شانے اچکا کر کہا۔ ”اس کی باتوں میں وزن تھا۔“ انگریز جہاں اپنے قدم جمانا ہے وہاں سب سے پہلے رشوت اور بد عنوانی کو ختم کرنا ہے تاکہ اپنے اقتدار کو طول دے سکے، جب وہ جانے لگتا ہے تو ان خرابیوں کو پروان چڑھانے لگتا ہے۔ وہ بلا وجہ ہی ہانگ کانگ پولیس کی شان میں قہقہے نہیں پڑھ رہی تھی۔“

”اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے پاس صبر آزما انتظار کے علاوہ کوئی اور چارہ کار باقی نہیں رہا؟“

”بظاہر ایسا ہی نظر آتا ہے۔ کوئی فوکی سیکرٹری نے بھی زلی کے ساتھ یہ بتا دیا ہے کہ دیر کے حوالے سے ڈان ہمیں زیادہ

کر کے مجھے کراچی فیکس کر سکتا تو یہ مجھ پر بہت بڑا احسان ہو گا۔“

”کیوں؟“ وہ میری اس عجیب و غریب فرمائش پر چونک پڑی۔

”اس مرحلے پر تمہیں اس کی تصویر کی ضرورت کیوں پیش آگئی۔ کیا تمہیں اس کی اصلیت شبہ ہو رہا ہے؟“

وہ فوراً ہی معاملے کی یہ تک پہنچ مٹی تھی اس لیے میں نے اپنی بات میں زور پیدا کرنے کی نیت سے کہا۔ ”وہاں ڈان کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اس نے ہمیں پریشان کر دیا ہے۔ ہم نے اپنے اپنے طور پر چھان بین کی تو یہ امکان بھی سامنے آیا کہ کہیں نئی دہلی والوں نے لڑکی کو بدل نہ دیا ہو۔ یہ اُن کی کھلی بے ایمانی ہوتی ہے چھپانے کے لیے انہوں نے ہانگ کانگ سے لڑکی کی واپسی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کر دیں۔“

”تمہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ دوسری طرف سے میری بات کاٹ کر کہا گیا۔ ”لڑکی کا معاملہ ہوتا تو اسی کو ہر کارروائی کا ہدف بنایا جاتا لیکن ابھی تک ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی ہے۔ اسپڈ بوٹ سے واقعی ایک چینی مجرم برآمد ہوا تھا اور اس کی وجہ سے سارا فوریہ پیدا ہوا ہے۔“

”پھر بھی ہم یہ لیٹنا چاہتے ہیں کہ مس تریبا بھی لڑکی ہے جس کا ہمیں انتظار ہے یا اسے بدل دیا گیا ہے۔ ہمیں فوری طور پر اس کی تصویر درکار ہے۔“ میں نے اپنے مطالبے پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”اس بارے میں اپنا وقت ضائع مت کرو۔“ اس نے نرم لہجے میں مشورہ دیا۔ ”اس مرحلے پر لڑکی کی تصویر بلا وجہ حاصل کرنی مشکل ہے۔ تم صبر اور سکون کے ساتھ ہماری طرف سے کسی اچھی خبر کے منتظر رہو۔ فون پر تم بلا وجہ اپنا وقت اور پیسہ برباد کر رہے ہو۔“

”تمہارے ہمدردانہ مشورے کا بہت بہت شکریہ۔ لیکن ہمارے لیے یہ کام بہت اہم ہے۔“

”ڈان کی منہ بولی بیٹی کہاں ہے؟ تم اس سے مشورہ کرو تو وہ تمہیں سمجھا سکے گی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ دیر کی سہیلی تمہاری مہیتر یا محبوبہ ہو؟“

میں دل ہی دل میں اس کے قیاس کی داد دے بغیر نہ سکا لیکن فون پر خشک لہجے میں بولا۔ ”یہ لیٹی بیٹیوں کی کمائی نہیں بلکہ ایک نازک معاملہ ہے۔ میں اس وقت جو کچھ کر رہا ہوں، دیر اسی کے ایما پر کر رہا ہوں۔ وہ اس وقت کسی کام سے دور مٹی ہوئی ہے ورنہ وہ خود ہی تم کو فون کرتی۔“

”اسے بتا دو کہ ہانگ کانگ کی پولیس کا نظام بہت سخت ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو چین کی جڑیں انگریز دس برس بھی سکون سے نہیں رہ سکتے تھے۔ جب تک وہ لڑکی پولیس کی تحویل میں ہے، پرنڈہ بھی اس کے لاک اپ میں پڑ نہیں سکتا۔ اس کی تصویر حاصل کرنے کے لیے تمہیں اس کی رہائی یا پھر عدالت میں پیشی کا انتظار کرنا ہو گا۔“

بھی ہمک جاتی ہیں لیکن میں تو یہ جانتا ہوں کہ چلتی ہوئی ندی کا پانی بیٹھ پاک ہوتا ہے۔ اس میں دو چار مردار ڈھوسور ڈھنگر گرنے سے پانی کی صفائی میں فرق نہیں پڑتا۔۔۔

”اب اس ذکر کو چھوڑو!“ وہ میری بیٹھی چٹکیوں پر تھلا کر بولا۔ ”اصل بات پر آؤ۔ میں نے تمہیں بتا دیا ہے کہ غزالہ نئی دہلی میں محفوظ ہے اور جلد از جلد کراچی آنے والی ہے لیکن میں اس کے انتظار میں بے کار نہیں بیٹھنا چاہتا۔ تم نے اگر کوئی کام کیا ہے تو مجھے اس کو آگے بڑھانا ہے۔“

”اس بارے میں ضد نہ کرو! میں نے لجا بت سے کہا۔“ غزالہ آنے ہی والی ہے تو ایک دو روز مہر کر لو۔ یہ سمجھ لو کہ میں ابھی تک جھک مار رہا ہوں۔۔۔“

”میرے لیے یہ سمجھنا مشکل ہے۔“ اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔ ”ایسا ہی تھا تو تم مجھے کچھ نہ بتاتے اور میں تم پر بھروسہ کیسے

بیٹھا رہتا۔ جان بوجھ کر انجان بنے رہنا میرے لیے ناممکن ہے۔ ہم لوگ تو انجان ہونے کے باوجود دیندھیرے میں تیر چلاتے ہیں اور کچھ نہ کچھ مار لیتے ہیں۔ تم مجھے الٹی پیڑھا رہے ہو۔“

”تم مجھے حد سے زیادہ مجبور کر رہے ہو۔“ میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

”یہ تمہارا خیال ہے۔ تمہیں اندازہ نہیں کہ وہ آدمی میرے لیے کتنا اہم ہے۔ تم نے کوئی اچھی خبر سنائی تو میں تمہیں مالا مال کر دوں گا۔ تمہارے اور غزالہ کے دن پھر جا میں گئے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔ ”پھر شام کو کہیں مل لو۔“

”میرے دفتر کیوں نہیں آ جاتے؟“ اس نے نہایت معصومانہ انداز میں مجھے جو ہے دان میں داخل ہونے کی دعوت دی۔

”تمہارے دفتر میں میرا پچھلا تجربہ بہت تلخ تھا۔ کسی سفر کی کھوپڑی سنگ گئی تو وہ مجھے ٹھنڈا ہی کر دے گا۔ میں باہر رہ کر ہی سکون سے بات کر سکوں گا۔“

”وہ زندہ تو ہے نا؟“ شری مان سنگھ کی اضطرابی آواز ابھری۔ مجھے تعاون پر آمادہ پا کر، اس کے ذہن میں سویا ہوا تجسس ایک مرتبہ پھر بیدار ہو گیا۔

”غزالہ جب تک گھر نہ لوٹ آئے، میں اسے زندہ نہیں سمجھتا۔ یہ سب باتیں بہت سے اگر اور مگر سے وابستہ ہوتی ہیں۔ آؤ گے تو اس بارے میں مکمل کربات ہوگی۔“ میں نے اسے پکڑ دیتے ہوئے کہا۔

وہ میری حیلہ جوئی کو یقیناً بھانپ گیا تھا لیکن اس نے اپنی بات پر اصرار نہیں کیا۔ اس وقت ہم دونوں کے مابین سرد جنگ چھڑی ہوئی تھی جس میں ہم دونوں ہی بت سی باتیں سمجھ لینے کے باوجود انجان بنے رہنے پر مجبور تھے کیونکہ دونوں ہی بیک وقت ایک دوسرے پر اپنے اپنے دوا آزمائے کی فکر میں لگے ہوئے تھے۔

میں نے دے گا اس لیے اب ہانگ کانگ سے کسی غیر معمولی ٹھکانہ کی امید بے سود ہے۔ ہمیں یہیں کوئی راہ نکالنی ہوگی۔“

”اسی وقت شری مان سنگھ نے ڈرامائی انداز میں ایک دھماکا کر کے تمہیں پریشان کر دیا تھا۔“ چند ثانیوں کے توقف کے بعد سلطان شاہ نے کہا۔ ”اب تم اس ذہنی صدمے سے بڑی حد تک سنبھل چکے ہو۔ کیوں نہ اسے ایک بار پھر فون کر کے کرید آ جائے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کی کمائی میں زیادہ جان نہیں ہے۔ تم اسے فوراً سا بھی بلاؤ جلاؤ گے تو اس کا جھوٹ مکمل کر سائے آ جائے گا۔“

”میں بھی اسے فون کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔“ میں نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”لیکن میری حکمت عملی کچھ اور ہی ہوگی۔ زہر کا تو زہر سے کیا جائے تو مؤثر رہتا ہے ورنہ کوششیں رائیگاں جاتی ہیں۔“

”کیا حکمت عملی سوچی ہے تم نے؟“ سلطان شاہ نے اشتیاق آئیلے میں سوال کیا۔

”میں دیکھتے جاؤ، وہ اپنی باتوں سے خود ہی میری راہ بنائے گا۔“ میں نے پورے اعتماد کے ساتھ کہا اور کافی پیالی آخری گھونٹ میں خالی کرنے کے بعد فون کی طرف متوجہ ہو گیا۔

اس بار ماتحت محلے کے کسی چیلے بھانے کے بغیر شری مان سنگھ فون پر آ گیا۔

”مجھے یقین تھا کہ تم جلد ہی مجھ سے رابطہ کرو گے۔“ اس کے لیے میں دو در دو تک طویا تلخی کا شائبہ نہیں تھا۔ ”اس وقت تم نے میری پوری بات سے بغیر فون کیوں بند کر دیا تھا۔“

”ہانگ کانگ میں موجود شکستہ دہلی کو غزالہ سمجھ کر میں نے ایک بھاری جوا کھیلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں اس مد میں ایک خفیہ رقم جنگی دے بیٹھا ہوں۔ تم نے اس لڑکی کی اصلیت بتا کر مجھے بھونچکا کر دیا تھا۔ اب مجھے پیشگی رقم واپس ملنے کی کوئی امید نہیں ہے لیکن میں مزید نقصان سے ضرور بچ گیا ہوں۔“

”غیر متوقع باتیں سامنے آنے سے صدمہ تو ہوتا ہے۔“ اس ٹھکانے کی آواز میں دوستانہ ہمدردی سٹ آئی۔ ”ساری خرابی یہ ہے کہ تم کو مجھ پر اعتماد نہیں ہے۔ اگر تم تباہیوں والی کمائی کو اپنے دل میں بالنے کے بجائے براہ راست مجھ سے پوچھ لینے تو میں اسی وقت تمہیں اصلیت بتا دیتا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں نے غزالہ کے بارے میں تم سے سودے بازی مکمل کر لی ہو اور اسے کسی اور کے حوالے کر دوں؟ آخر مجھے رجنی کی زندگی بھی عزیز ہے۔ تم میری طرف سے کتنے بدمعاشان ہو جاؤ لیکن یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ مگر رجنی کو واپس اپنی ہانوں میں دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”میں تمہارے جذبات کو سمجھتا ہوں۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”موتن لال جیسے دوست نما بھیڑیلے رشتوں کی پروا کیے بغیر حکومت پروانہ رکھتے ہیں۔ ان کی چابازایوں سے پار ساعورتیں

”تمہاری عقل بالکل ماؤف ہو گئی ہے۔ وہ تو ساحل پر منزل لائے ہوئے ہیں۔ خوبصورت لڑکیوں کا بھی ذکر کر رہا تھا۔ تم یہ کیوں بول رہے ہو کہ ہم یورپ کے کسی ساحلی شہر میں نہیں، بلکہ کراچی میں ہیں جہاں شریف لوگ راتوں کو آواہ گردی کرنے کے بجائے نرم سہولتوں میں آرام کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ غزالہ کو وہ ہانک، کانک، بھیج کا ہے۔ تم سے ملا سرکار کے بارے میں ساری معلومات آگلوٹائے۔ بعد وہ تمہیں بے دردی سے ہلاک کروائے گا۔“

”کھڑا!“ اس کی تقریر ختم ہو جانے پر میں نے بھرپور زخمی اسے ساتھ کہا۔ ”مجھے خوشی ہے کہ جو امکانات میرے سامنے ہیں وہ تمہاری نظموں میں بھی ہیں۔ میری کھوپڑی ہر طرح تروتازہ ہے اور اب میں اسے اسی کے حروں سے زیر کروں گا۔ شری مان عکس کر چلاک بننے کی کوششیں کر رہا ہے تو اسے اپنا تموکا ہوا چانا پڑے گا۔“

”لیکن تمہارے ذہن میں کوئی منصوبہ تو ہو گا؟ ہاں بے چینی کے بعد تم اسے کس طرح زیر کرو گے؟“ میری وضاحت پر سلطان شاہ کے لب و لہجے میں نمایاں نرمی پیدا ہو گئی۔

”اب ظفر کے آدمیوں کو میدان میں لانا پڑے گا۔“ میں نے اسے ہیکر فون آن کرتے ہوئے کہا۔ ”شری مان عکس کے آدمیوں پر آج کی رات ہماری ہڑنے والی ہے۔“

فون کا سلسلہ تلے پر تیسری کھنٹی بجی تو مجھے تشویش ہونے لگی کیونکہ ایس ٹی ایف کا آپریٹر ہمیشہ پہلے کھنٹی پر فون اٹھانے کا عادی تھا۔ چوتھی کھنٹی معدوم ہونے سے پہلے ہی وہ لائن پر آیا۔ ”کیا بات ہے؟ کیا آج بورڈ خالی پڑا ہوا ہے؟“ میں نے حیرت کے ساتھ پوچھا۔

”اوہ نوہرا!“ وہ میری آواز پہچان کر جلدی سے بولا۔ ”تب میرا ذرا امیر جنسی ہو گئی ہے۔ ظفر صاحب ابھی ابھی زخمی حالت میں واپس آئے ہیں۔ ان کے کپڑے خون میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ سب لوگ اسی طرف چلے گئے تھے۔“

وہ خبر سنتے ہی میرا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ دیر اکو اڑ پوٹ چھوڑنے گیا تھا۔ اگر وہ واپس پر زخمی تھا تو معاملہ گزربہ تھا۔ میرے ذہن میں پہلا خیال یہ آیا کہ کس دوریرا کی کوئی حرکت نہ ہو لیکن وہ زیادہ سوچنے بجھنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے پھرتی کے ساتھ

بیروں میں جو تے ڈالے اور دوڑا گئی کے لیے تیار ہو گیا۔ شری مان عکس کا اہم اور نازک ترین معاملہ وقتی طور پر میرے ذہن سے معدوم ہو گیا تھا۔

اس روز شاید ہر طرف سے ہمارے ستارے گردش میں آئے ہوئے تھے۔

”میں ٹھیک سات بجے ماری پور کے لیول کراسنگ کو عبور کر کے تمہارا انتظار کروں گی۔“ چند ثانیوں کی خاموشی کے بعد شری مان عکس نے آواز ابھری۔ ”وہاں سے ہم ہاںس بے کی طرف نکل جائیں گے۔“

”ہاںس بے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”رات کے اندھیرے میں ہاںس بے پر کیا نئے گا؟“

”وہاں ہم سکون اور بے فکری سے بات کر سکیں گے۔“ اس کی آواز میں عجیب سا بوجھل پن سٹ آیا۔ ”آج جمعرات ہے اور چودھویں کی رات بھی۔ سمندر کے جوبن کے نظارے دیکھنے کے لیے بہت سے لوگ وہاں پہنچے ہوئے ہوں گے۔ وہیں ہمارا ہٹ بھی ہے۔ باتوں باتوں میں زیادہ پی گئے تو رات وہیں گزاریں گے۔ دیے بھی دیک اینڈ پر تفریح کی دلداد لڑکیوں کی کئی ٹولیاں کئی ہوئی پتنگوں کی طرح چکراتی رہتی ہیں۔ چاہو تو ان میں سے کسی کو اپنے ساتھ شامل کر لیں گے۔“

”ٹھیک ہے میں سات بجے لیول کراسنگ پر پہنچ جاؤں گا۔“ میں نے اس کے دیے ہوئے پروگرام سے اتفاق کرتے ہوئے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

اس سے میری گفتگو کے دوران میں سلطان شاہ کے چہرے پر زولے کے آثار نظر آرہے تھے اور وہ بہت زیادہ حیران و پریشان نظر آ رہا تھا۔ فون بند ہوتے ہی وہ جھٹکا کچھ پر برس پڑا۔

”مجھ میں نہیں آتا کہ آج تمہاری کھوپڑی پر برف کیوں جم گئی ہے؟ پروگرام یہ طے ہوا تھا کہ اسے ہلا جلا کر اس کے جھوٹ کا پول کھولنے کی بات ہوئی تو اس سے ملنے کا پروگرام بنائیتھ۔“

”میرا ذہن ابھی تک یقین اور بے یقینی کی وضعت باہر نہیں نکل سکا ہے۔ اگر غزالہ واقعی ان لوگوں کے قبضے میں ہے تو شری مان عکس سے محاذ آرائی مول لے کر میں اس کی مشکلات میں اضافہ کروں گا۔ اسی احتیاط کی وجہ سے میں نے مصالحت کی راہ اختیار کی ہے۔“

”وہ رات کے اندھیرے میں تمہیں ہاںس بے لے جا رہا ہے۔“ سلطان شاہ غصے اور بے بسی سے رات پیتے ہوئے بولا۔ ”اس خطرناک راستے پر بعض جگہ دن میں بھی ذرا ٹینک مشکل ہوتی ہے پھر رات کے اندھیرے میں روشنیاں نکل کر کے اس کا پیچھا کرنا بالکل ناممکن ہو گا۔ وہاں ہٹ میں پہلے سے اس کے پالتو غنیمتے موجود ہوں گے جو بے رحمی کے ساتھ مار مار کر تمہاری

ہڈیاں پھیلان توڑ دیں گے اور پھر تمہیں چڑھے ہوئے سمندر میں پھینک کر لوٹ آئیں گے۔ میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتا گا۔ یہ ساری باتیں تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آ رہیں؟“

”ویک اینڈ پر وہ ساحل اتنا ڈیران نہیں ہوتا ہو گا۔“ ”اور آج چاندنی رات بھی ہے؟“ سلطان شاہ غرایا۔

ہمیں یہ یقین کرنا ہے کہ غزالہ ہانگ کاٹک بھیجی جا چکی ہے یا اس کی جگہ کسی اور لڑکی کو بھیج کر اسے نئی دہلی میں رکھا گیا ہے۔ اس سوال کا جواب صرف شری مان سنگھ کے پاس ہے۔ اس سے پتہ چلے گا کہ ہمیں افرادی قوت و درکار ہے جو فوری طور پر غفری سے مل سکتی ہے۔

”لیکن تم سن چکے ہو کہ غفری طرح زخمی ہے“ سلطان شاہ نے ہلٹے ہوئے کہا۔

”اسی لیے میں اس کی عیادت یا خبر گیری کے لیے جانا چاہتا ہوں“ میں نے زور دے کر کہا۔

”تم عیادت کے لیے جاؤ گے اور وہیں مگر جاؤ گے“ سلطان شاہ برا سامنے ہٹا کر بولا ”وہ اپنے پوتہ کا سربراہ ہے۔ اسے خون میں نہایا ہوا دیکھ کر دہاں ہر شخص بوکھا ہٹ کا شکار ہو چکا ہوگا۔ اس ہڑوٹنگ میں تم کو اپنی بات کرنے کا موقع ہی نہیں مل سکے گا۔“

”یہ تمہارے مفروضات ہیں“ میں نے اکتا کر کہا ”غفر ایک ڈسے دار افسر ہے۔ وہ اپنی وجہ سے پورا نظم و ضبط تباہ نہیں ہونے دے گا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی بھابھ لے گا کہ میں کسی ضرورت کے تحت وہاں پہنچا ہوں۔ اگر اس کی حالت خطرے سے باہر رہی تو میں خود ہی اپنے مطلب کی بات چھیڑ دوں گا۔“

”میری دانست میں وہاں جانے کے بجائے کوئی اور بندوبست کرنا زیادہ بہتر ہے گا“ اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پُر خیال انداز میں کہا۔

”مکمل کر کے کہو کہ کیا کتنا چاہ رہے ہو؟“ میں نے حل کر کہا ”میرے گھونگھٹن کیا چاہ رہے ہو؟“

”تم اسٹیشن ٹانگ فورس سے مدد لیے کے بجائے کرائے کے آدمی بھی اٹھ کر سکتے ہو۔“

”زیر زمین دنیا کے لوگوں سے ہمارے رابطے ٹوٹے ہوئے ہیں۔ ہمیں اس وقت بے جگر آدمیوں کی ضرورت ہے جو وقت بڑے پر آنکھیں بند کر کے ہماری لڑائی میں کود سکیں۔ اگر شری مان سنگھ کی نیت میں فوری پیدا ہو گیا ہے تو وہ آج شام پوری چاری کے ساتھ میدان میں اترے گا اور ہماری کسی بھی لغزش کو نظر انداز نہیں کرے گا۔ ناقابل اعتماد اور گھٹے آدمیوں کی وجہ سے ہم ہلی طرح مار کھا جائیں گے۔ اتنے مختصر وقت میں مٹنا مار کا مواضع دینے پر بھی مجھ سے آدمی نہیں مل سکیں گے۔“

”تمہارے رابطے ضرور ٹوٹے ہوئے ہیں لیکن میرے کئی قریبی دوست اور رشتے دار بڑے بھلے لوگوں میں اٹھتے بیٹھتے ہیں۔ میں ان کی معرفت اپنے کام کے دس پانچ آدمی پیدا کر لوں گا۔ وہی معاوضے کی بات تو اس وقت بھی تمہارے پاس پیسے کی کمی نہیں ہے۔ شی والوں کی گمن بوٹ کی فروخت سے تم نے جولا کھول ڈالا۔ کمائے تھے وہ ابھی تک سسلی کی تجوری میں پڑے رنگ کھارے ہیں۔“

وہ مکتھوا میکروفون پر ہوئی تھی اس لیے سلطان شاہ نے بھی وہی کچھ نہ تھا جو دوسری جانب سے میرے علم میں لایا گیا تھا۔ مجھے رواج کی تیاری پکڑتے دیکھ کر وہ بھی مضطرب انداز میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”تم اتنی جگت اور گھبراہٹ میں کہاں جا رہے ہو؟“ اس نے میرے سامنے آکر ہلکی آواز میں سوال کیا۔

”تم نے سنا نہیں؟“ میں نے اسے گھورتے ہوئے ملامت آمیز لہجے میں کہا ”میں اسے وہ دیرا کے ساتھ ازپورٹ گیا تھا اور اب زخمی حالت میں اپنے ٹھکانے پر پہنچا ہے۔“

میرے لہجے پر لمبے بھر کے لیے سلطان شاہ کا چہرہ سرخ ہو گیا لیکن اس نے فوراً ہی اپنے رویے پر قابو پایا اور بے تابانہ انداز میں ہلٹے ہوئے بولا ”وہ جس حالت میں بھی ہے لیکن اس قابل ضرور ہے کہ گاڑی چلا کر اپنے آسٹیشن میں واپس پہنچ گیا ہے۔ یہ پریشانی کی بات ضرور ہے لیکن اتنی بھی نہیں کہ ہم سر پر پیر کھ کر اس کی طرف دوڑ لگادیں۔ وہ ہمیں برس تک فوج میں افسری کر چکا ہے“ اس کے بعد اس نے کرل جیسی جوجڑ جیسے بین الاقوامی مجرم اور دہشت گرد کے ساتھ گولبیا میں خاصی مدت گزارنے کے بعد ایس ٹی ایف میں شمولیت اختیار کی ہے۔ صورت سے وہ کتنا بھی جڑان اور کلنڈر نظر آتا ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ پچاس کے لپٹے میں ہے۔ اس جیسے گھاگ آدمی کے لیے تم اس طرح پریشان ہو رہے ہو جیسے وہ مبلے کی بھیڑ میں اپنے ماں باپ سے چھڑا ہوا کوئی نو عمر لڑکا ہو۔ وہ اپنی حفاظت کے ہرگز سے واقف ہے۔“

”تم کتنا کیا چاہ رہے ہو؟“ اس کی طول پکڑتی ہوئی تمید سے اکتا کر میں نے خشک لہجے میں پوچھا ”کیا تم اس کے بارے میں ہر اخلاقی ذمے داری سے یکسر آزاد ہیں؟“

”میرا یہ مطلب نہیں تھا کہ ہم اسے بھول جائیں لیکن تم اس کے بارے میں ضرورت سے زیادہ اثر لے رہے ہو۔ اس وقت تمہارے سامنے اپنے مسائل بھی ہیں جن کا حل سوچنا ضروری ہو گیا ہے۔“

”ویرا کے چلے جانے کے بعد ہمارے لیے تھوڑی سی دشواریاں پیدا ہو چکی ہیں“ میں نے ملامت کے ساتھ اسے سمجھاتے ہوئے کہا ”وہ کو انک فوسے بہت زیادہ بے تکلف ہے اور اس پر حاوی ہو کر بات کرتی ہے جب کہ ہمیں ہانگ کاٹک میں سرحدی مری کے روپے کا سامنا کرنا پڑے گا۔ کو انک فو کی سیکریٹری بتائی چکی ہے کہ وہ ہم کو مت نہیں لگائے گا“ البتہ وہ غزالہ کو رہائی دلانے میں کامیاب ہو گیا تو اسے براہ راست کراچی ہی روانہ کرے گا۔ ایسی صورت میں ہمیں اس سے چھیڑ چھاڑ کر کے کچھ حاصل نہیں ہوگا“ البتہ وہ ہم سے مشتعل ہو سکتا ہے۔ موجودہ حالات میں ہم صرف انتظار ہی کر سکتے ہیں یا پھر براہ راست ہانگ کاٹک جانا پڑے گا۔ یہاں رہتے ہوئے ہم صرف شری مان سنگھ پر کام کر سکتے ہیں“

کرنے کے پابند تھے۔ ان کی طرف سے یہ خطرہ نہیں تھا کہ وہ مستقل بنیادوں پر کسی شکار کا تعاقب کرتے رہیں اور کمات لگا کر اس پر وار کر گزریں۔

کشمی بھی برے وقت سے غصے کے لیے اس گاڑی میں چند ملک آتشی ہتھیار اور کچھ شعبے ہر وقت پڑے رہتے تھے جن کی مدد سے ہم کسی نامانی خطرے کو بہ آسانی ٹال سکتے تھے لیکن میری توقع کے عین مطابق وہ سفر سکون سے طے ہو گیا۔ ہم دونوں ہی اپنی اپنی جگہ پر جمنا تھے لیکن پورے راستے ہمیں ایسی کوئی گاڑی نظر نہیں آئی جس پر ہمیں تعاقب کرنے والوں کی سواری ہونے کا اندیشہ ہو۔

اسٹیشن فور پر کسی باز پرس کے بغیر ہمیں گاڑی اندر لے جانے کی اجازت مل گئی لیکن میں نے اندر گھستے ہی بھانپ لیا کہ وہاں کسی قسم کی افرا تفری نہ ہونے کے باوجود فضا پر سوگوار سی خاموشی طاری تھی۔ ہمیں بتایا گیا کہ ظفر اپنے دفتر کے بجائے رنارنگ روم میں تھا جہاں ڈاکٹر اس کے مسائے اور مریم پنی کرنے میں مصروف تھا۔ ظفر زخمی ضرور تھا لیکن اس کی حالت خطرے سے باہر بتائی جارہی تھی۔ ہم دونوں ظفر کے دفتر سے ملحق انتظار گاہ میں جا بیٹھے جہاں فور ای چائے بھی پینا چلائی گئی۔

”اب کیا ارادہ ہے؟“ سلطان شاہ نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے معنی خیز لبے میں پوچھا۔

”تم نے بلا وجہ ہی بات کا جھگڑایا ہوا تھا۔ یہاں ذرا سی بھی افرا تفری نہیں ہے۔ ظفر تھوڑی دیر میں مریم پنی سے فارغ ہو کر آئے گا تو اس سے بات کہنی جائے گی۔“

سلطان شاہ نے قدرے بے آراہی کے ساتھ صوفے پر پہلو بدلا پھر کہا ”یہاں بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے کے بجائے رنجی سے ملاقات کیوں نہ کہنی جائے؟ دیکھتے ہیں کہ اب وہ شری مان سنگھ کے بارے میں کیا کہتی ہے۔“

”وقت گزارنے کے لیے اچھا خیال ہے لیکن اس سے کوئی مقصد حاصل نہیں ہوگا۔ وہ دونوں ای بے شرم اور بے غیرت ہیں۔ ان کے لیے شادی جیسے مقدس رشتے کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ دونوں ہی اپنی اپنی خوشیوں اور مقاصد کے حصول کے لیے اپنے من مانے راستوں پر چل رہے ہیں۔ شری مان سنگھ نے اپنا کام نکالنے کے لیے رنجی کو دیدہ و دانستہ موت لعل جیسے بھوکے شکاری کی کچھار میں ہانک دیا اور وہ اس موقع کو غنیمت جان کر موت لعل کی آغوش میں جا بیٹھی۔ ایسی عورت سے مل کر تمہیں کچھ بھی حاصل نہیں ہو سکے گا۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو“ وہ چند ثانیوں بعد پھر خیال انداز میں بولا ”میرا خیال تھا کہ اب تک اسے موت لعل کی موت اور بعد

میں حیرت سے اسے گھورتا رہ گیا۔ یہ حقیقت تھی کہ ہماری ایک خلیہ رقم سہلی کی تحویل میں تھی لیکن میرے روز مرہ افرا بات مانیا اور دوسرے ذرائع سے پورے ہو رہے تھے اس لیے میں نے ایک طویل مدت سے اس محفوظ رقم کو جھیرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی بلکہ ایک اعتبار سے میں عملاً اسے بھولا ہوا تھا لیکن سلطان شاہ نے اس وقت اس رقم کا حوالہ دے کر مجھے چونکا دیا تھا۔

”میرے لیے میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ کہیں وہ اس رقم کا حوالہ دے کر بالواسطہ طور پر اپنے جیسے کا مطالبہ نہ کر رہا ہو لیکن اس کی آنکھوں میں معمولانہ چمک دیکھ کر مجھے اپنا وہ گندہ خیال فوراً ہی ترک کر دینا پڑا۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو محل پیسے کے لیے اپنی اصل کو بھول کر اپنے محسنوں پر بھوکے دندلوں کی طرح غرائے لگتے ہیں یا برا وقت آنے پر آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔“

”تم بلا وجہ اپنے ذہن کو تھکا رہے ہو“ قدرے توقف کے بعد میں نے نرمی سے کہا ”یہ بعد کی باتیں ہیں۔ پہلے مجھے ظفر سے مل لینے دو۔ اگر وہاں کے حالات سازگار نہ ہوں تو میں وقت ضائع کیے بغیر واپس لوٹ آؤں گا۔ اس کے بعد تسمادی تجویز پر عمل کر لیا جائے گا۔“

”پھر جانے آنے کی کیا ضرورت ہے؟“ اس نے بے پروائی کے ساتھ کہا ”میں بھی تمہارے ساتھ ہی چلتا ہوں۔ وہاں کام نہ بناؤ اور سے ہی اندیشہ کی طرف نکل جاؤ گے۔“

سلطان شاہ کی وہ تجویز معقول تھی اس لیے میں خاموش رہا اور پھر ہم دونوں یکے بعد دیگرے فلیٹ سے نکل کر بیڑھیاں طے کرنے لگے۔

باہر یازدہ ستور بند تھا اور ہر طرف خوف و ہراس کے سائے لارہے تھے۔ کئی جگہ متعدد افراد پر مشتمل ٹکڑیاں جمع تھیں اور ٹاپکندہ اندھیرے ہونے والی خون ریزی پر اظہار رائے کا سلسلہ جاری تھا۔ ہم دونوں وہاں رکے بغیر اس علاقے سے نکلنے چلے گئے۔ اس وقت ہم دونوں بجاگیر سے مستعار لی ہوئی کالی تیراؤ میں سڑ کر رہے تھے اس سے پیشتر میں اس گاڑی کے استعمال سے گریز کرتا رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میری کینجر کے لیے کام نہ کرنے والے لوگ اس گاڑی کو پہچانتے تھے اور اس کی وجہ سے کہیں بھی مجھے گھبرنے کی کوشش کر سکتے تھے لیکن اس وقت صورت حال خاصی فرق تھی۔ اگر میں گاڑی چھوڑ کر کینجی وغیرہ سے سڑ کر آتا تو خاصا وقت برباد ہونے کا اندیشہ تھا۔ دوسرا اہم نکتہ یہ تھا کہ استاد صدرو ارا جا رہا تھا۔ ان دنوں وہی میری کینجر کے لیے کام کر رہا تھا اور یقینی طور پر خود ہی میری کینجر سے رابطہ برقرار رکھتا تھا۔ اس کے آدمیوں کو تو علم نہیں تھا کہ استاد صدرو کیس کے لیے کام کر رہا تھا اور اس کے کیا مقاصد تھے۔ وہ تو بس وقت فوقتائے والی ہدایات پر عمل

کے واقعات پر بہت کچھ سوچنے کا موقع مل چکا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ بدلے ہوئے حالات نے اس کی سوچ پر کوئی قابل ذکر اثر ڈالا ہو۔“
”مجھے امید نہیں۔ پھر جسی اس سے مل لینے میں کوئی حرج نہیں ہے“ میں نے کہا۔

چائے ختم کرنے کے بعد ہم نے ظفر کے ان آدمیوں سے رابطہ کرنے کا ارادہ کیا جو جٹنگیر کے شیر خوار بیٹے کی تلاش اور بازیابی کی مہم میں ہمارے ساتھ شریک رہے تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ ظفر کی غیر حاضری میں ہمیں ان دونوں سے خاصی مدد مل سکے گی۔
میرے ایما پر چند ہی منٹ میں ارشد اور اکبر نہایت موڈبانہ انداز میں وہیں آچپتے۔

رجنی سے ملاقات کا ذکر سنتے ہی وہ دونوں پریشان نظر آنے لگے۔ پھر اکبر نے مجھے آگاہ کیا کہ وہ لوگ ہماری حیثیت سے پوری طرح واقف تھے لیکن رجنی ایک اہم ترین قیدی تھی جسے ظفر کی خصوصی ہدایت پر قید تھائی میں رکھا گیا تھا۔ جہاں ایس ٹی ایف کے عملے کے کسی رکن کو بھی قیاب لگائے بغیر اس کے سامنے جانے کی اجازت نہیں تھی اس لیے ظفر سے خصوصی ہدایت لیے بغیر اس سے ہماری ملاقات کا انتظام نہیں کیا جاسکتا تھا۔

وہ اسٹیشن ٹاسک فورس کا خصوصی ڈیپن تھا جس پر ذاتی مراسم کسی بھی صورت میں اثر انداز نہیں ہو سکتے تھے اس لیے ہمارے پاس انتظار گاہ میں وقت گزارنے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا۔ ہم نے شکریہ ادا کر کے ارشد اور اکبر کو رخصت کر دیا۔ جاتے ہوئے ان کا انداز بہت زیادہ معذرت خواہانہ تھا۔

تھوڑی دیر بعد ظفر ڈسٹنگ سے فارغ ہو کر اپنے قدموں پر چلتا ہوا وہیں ٹکیا۔

اس کے جسم پر ڈھیلا ڈھیلا سفید لباس تھا جو سینے پر خاصا پھولا ہوا تھا۔ ظفر کے چہرے وغیرہ کی اچھی طرح صفائی کی گئی تھی لیکن پھر بھی اس کی گردن اور چہرے پر بابجا خون کے دھبے موجود تھے اور ٹھوڑی کے گرد ہماری ڈسٹنگ نظر آ رہی تھی۔

ہمیں دیکھتے ہی ظفر نے دوستانہ انداز میں مسکرانے کی کوشش کی لیکن ڈسٹنگ کی وجہ سے اس کے ہونٹ عجیب انداز میں پھیل کر رہ گئے۔ ہم دونوں اسے دیکھتے ہی اضطرابی طور پر اپنی جگہوں سے اٹھ گئے تھے۔

ہم نے اسے سہارا دے کر احتیاط سے صوفے پر بٹھالیا تو اس نے اشارے سے اپنے ان دو آدمیوں کو واپس لوٹا دیا جو اس کے ساتھ آئے تھے۔

”یہ کیا ہوا؟“ میں نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے حیرت سے پوچھا ”تھوڑی سی دیر پہلے تم دیر کو اتر پورٹ چھوڑنے کے لیے گئے تو اچھے خاصے تھے پھر یہ حادثہ کہاں اور کیسے رونما ہوا؟“

”بس، میری حماقت کہ لو!“ ڈسٹنگ کی وجہ سے وہ منہ کھول کر بولنے سے قاصر تھا اس لیے اس کے لب و لہجے کے ساتھ ہی

تلفظ بھی بدل کر رہ گیا تھا ”اس میں کسی کا کوئی قصور نہیں ہے۔“
”پھر بھی کچھ نہ کچھ تو ہوا ہی ہوگا۔ ویرانے تو تمہارے ساتھ کوئی بد معاشی نہیں؟“

”وہ اول درجے کی مکار اور خرافہ ہے“ اس کے لیے شرمندگی ظاہر ہو رہی تھی ”مجھے افسوس ہے کہ میں نے اس کی وجہ سے تم سے قطع کلامی کی۔ تم دونوں کا اندازہ صحیح تھا کہ وہ اپنا مصروفانہ کمائی سے مجھے بہت زیادہ متاثر کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی اور وہی میری سب سے بڑی غلطی تھی۔“
”تو کیا اسی نے تم کو زخمی کیا ہے؟“ سلطان شاہ نے حیرت کے ساتھ سوال کیا۔

”اس کا جواب اثبات میں بھی دیا جاسکتا ہے اور نفی میں بھی“ وہ ایک گمراہ سانس لے کر بولا ”اصل قصور میرا ہے کہ میں تم لوگوں کی بریفنگ نظر انداز کر کے اس پر بھروسہ کر بیٹھا۔ وہ عمل و صورت سے جتنی حسین اور دلکش نظر آتی ہے، فطرتاً اس سے کہیں زیادہ خبیث ہے۔“

”کچھ سادہ ہے، سادہ!“ سلطان شاہ برا سادہ بنا کر بولا ”اپنے حسن کے جادو سے اب تک نہ جانے کتنے مردوں کی زندگیاں تباہ کر چکی ہوگی۔ جابر غلگی میں ہوئی تو وہاں کے بڑے بوڑھے اس کے کروتوت کی بنا پر اسے زمین میں اڑھا گاڑ کر اس پر خونخوار کتے چھڑوا دیتے۔ وہاں خراب عورتوں کے ساتھ وہی سلوک کیا جاتا ہے جو جادوگر نیوں اور چڑیلوں کے ساتھ کیا جاتا چاہیے۔“

سلطان شاہ کی اس توتیم پر ستانہ وضاحت پر میں دل ہی دل میں مسکرا کر رہ گیا۔ روشن خیال اور جدید ترین دنیا میں ایک طویل مدت گزارنے کے باوجود اس کے ذہن سے پچپن کی سنی ہوئی کمائیاں گھٹ نہیں ہو سکی تھیں۔ جابر غلگی اور اس جیسے دوسرے پوسانہ علاقوں میں ضروریات زندگی کی تکمیل کے لیے عورتوں کو بھی مردوں کے شانہ بشانہ بہت سے کام کرنے پڑتے ہوں گے۔ بڑی حد تک آزادانہ نقل و حرکت کے اس ماحول میں کبھی تو اور پہاڑوں میں منہ زور جذبوں کے سبب لگام ہونے کے خاصے امکانات ہو سکتے تھے کیونکہ تھائی سی ہر بڑے گناہ کا پہلا مرحلہ ہوتی ہے۔ ہزاروں گناہوں کا ارتکاب صرف اس وجہ سے نہیں ہو جاتا کہ شیطانی جذبوں کے بھنور میں پھنسے ہوئے سرکشوں کو کہیں غلط یا تھائی میسر نہیں آتی۔ دیکھی علاقوں کے بڑے بوڑھے گمراہی کے ان امکانات سے پوری طرح باخبر ہوتے ہیں اسی لیے اپنے جوان ہونے ہوئے بچوں کو علمائے مائیں اور روایتی قصوں کے ذریعے چیلن اور جادوگر نیوں کے وجود سے ڈراتے رہتے ہیں۔ ہر کمائی کا خورج ہوتا ہے کہ وہ شیطانی قوتیں، حسین و جمیل لڑکیوں کا روپ دھار کر جوان مردوں کو اپنی اداؤں کا اسیر بناتی ہیں اور ان کے وجود سے جو ہر حیات کشید کر کے انہیں سکنے اور مرنے کے لیے چھوڑ

”وہ کیا تھی؟“ اس بار ظفر کی خاموشی پر میں اپنے تجسس پر قابو نہ رکھ سکا۔

”عورت کو بڑی سے بڑی گالی دے لیتا لیکن آئندہ کسی کو آوارہ نہ کتنا“ ظفر نے تلخ لہجے میں کہا ”وہ بہت بد معاش اور حرامزادی ہے۔ اسے معلوم تھا کہ میرے دفتر پہنچنے سے پہلے وہ پھول اپنا کام دکھائے گا۔ اس نے اپنی داستان میں مجھے ہلکی سی مزاحی ہے کیونکہ میں نے اسے آوارہ قرار دیا تھا۔“

”غیبت ہے کہ اب تم اس کی اصلیت سمجھ گئے“ سلطان شاہ نے گھرا سانس لے کر کہا ”وہ ڈیڑی کے علاوہ دنیا کے کسی بھی مرد کو کھلونے سے زیادہ وقعت نہیں دیتی۔ اب یہی، کچھ کہ زیادہ خون بنے سے تمہاری حالت بگڑ بھی سکتی تھی لیکن اسے کسی بات کی پروا نہیں تھی۔ بس وہ تم پر اپنی بالادستی جتاتا چاہتی تھی۔ وہ پیدا انٹی حرام زادی ہے کیونکہ اس کی پیدائش کے وقت اس کی ماں شادی شدہ نہیں تھی۔ وہ دیر کی پیدائش کا الزام جمی لائیڈ کے کھاتے میں ڈالتی تھی اور وہ اس الزام کو تسلیم کرنے سے انکاری ہے۔“

”لیکن تم رپورٹ واپس کیوں نہیں گئے؟“ میں نے پوچھا۔ ”تم اسے بالوں سے چھیننے ہوئے واپس لاسکتے تھے تاکہ اسے اس گھٹیا حرکت کا مزہ چکھایا جاسکتا۔“

”بات سمجھ میں آتی ہی میرا یکی رد عمل تھا۔ گاڑی گھما کر میں اشاریٹ تک واپس بھی گیا تھا۔ اس وقت تک ویرا کی پرواز کی روانگی میں اتنا وقت تھا کہ میں اسے لاؤنڈری سے واپس بلا سکتا تھا لیکن پھر مجھے بلو کر اس ڈیل کا خیال آگیا۔ یہ ہماری بد قسمتی ہے کہ ہمارے ملک کا ایک وسیع تر مفاد اس عیار لڑکی کے شمن سے وابستہ ہو گیا ہے۔ بس اسی وجہ سے میں اپنا غصہ لی کرواپس لوٹ آیا۔“

”میرا خیال ہے کہ اب تم آرام کرو۔ ہو سکتا ہے کہ اس دوران میں ایران سے کوئی اچھی خبر آجائے“ میں نے کہا ”تم نے آرام نہ کیا تو یہ معمولی سے زخم خراب بھی ہو سکتے ہیں۔“

”آرام کی بس ایک ہی منزل آتی ہے“ اس نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا ”جب دو گز زمین بیش کے لیے انسان کا ممکن بن جاتی ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ غزالہ کے بارے میں کیا ہو رہا ہے۔ سلطان شاہ پہلے ہی صدرو کے آدمیوں سے مار کھا کر زخمی تھا‘ اب میں بھی پڑ گیا تو سارا بوجھ تم پر آجائے گا۔“

بات میرے مطلب کی تھی لیکن پہل اس نے کی تھی اس لیے مجھے اپنے دل کی بھراس نکالنے کا موقع مل گیا ”ویرا کی وجہ سے غزالہ کی بازیابی کے آثار پیدا ہو گئے تھے لیکن اس کے جاتے ہی بات یکایک الجھ گئی ہے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اب کون سی راہ اختیار کی جائے؟“

”مجھے پوری بات بتاؤ۔ شاید میں کوئی حل سوچ سکوں“ اس نے آہستگی سے اپنی پوزیشن بدلتے ہوئے کہا۔

”ہماری اطلاع کے مطابق غزالہ کو ہانگ کانگ پہنچایا جا چکا

ہاں ہو جاتی ہیں۔ متعصم صرف اتنا ہوتا ہے کہ ان کے بیٹے حسین عورتوں اور لڑکیوں سے دور رہیں۔ یہ گڑھ صدیوں سے دنیا کے ہر دیکھنے والے میں کامیابی سے رائج ہے۔ لیکن سلطان شاہ عاقل رہنے والے ہونے کے باوجود بچپن کے اس تصور کو اپنے ذہن سے کھینچ کر صاف کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

”تمہارے فلیٹ سے نکل کر میں ویرا کو ایک بڑے ہوٹل میں لے گیا تھا“ ظفر خفت آمیز لہجے میں اپنی حماقت کی داستان سنانے لگا۔ ”وہاں کھانا کھاتے ہوئے اس نے کولمبیا کا قصہ چھیڑ دیا اور بتایا کہ کرم جیسی جواز کا دست راست‘ اسیشن کس قدر درندہ صفت تھی تھا۔ اس کی کمائی کا خلاصہ یہ تھا کہ وہ اپنی مرضی سے بوکوتا میں اسیشن کے ساتھ نہیں رہ رہی تھی بلکہ جان کے خوف سے اس کی فریاد مانی ہوئی تھی۔ اس کے بدن کے ہر حساس حصے پر اسیشن کی درندگی کے نشانات بھرے ہوئے زخموں کی صورت میں موجود تھے۔ تم سمجھ سکتے ہو کہ میں ایک اکیلا آدمی ہوں لیکن اپنی خوشیوں کے لیے کسی شریف اور خاندان دار عورت کی زندگی داؤ پر نہیں لگا سکتا۔ ہم لوگ محض میں بھڑکتے ہوئے چراغ کی طرح جیتے ہیں۔ جب تک زندہ رہتے ہیں تو پوری دھوم دھام کے ساتھ ہر طرف اثر انداز ہوتے ہیں اور پھر اچانک ہی کوئی حادثہ‘ تصادم یا بنگامہ‘ آدمی کے بے رحم بھیڑے کی طرح ہماری زندگی کا چراغ کل کرتا ہے۔ گھر اور بستر کی موت بہت کم لوگوں کا مقدر بنتی ہے۔ اسی لیے میں نے سوچا کہ شاید میرے لیے ویرا کا ساتھ بہتر رہے گا۔ وہ ہر حال میں اپنی گزر بسر کا بندوبست کر سکتی ہے۔ وہ ہر بات میں میری ہاں میں ہاں ملائی رہی لیکن اب میں سوچتا ہوں کہ وہ مکاری سے کام لے کر میرے ساتھ کھیل رہی تھی۔ اس نے مجھ سے الگ ہونے سے پہلے مجھ سے قسم لے کر ایک بند لفاظ میرے حوالے کیا۔ مجھے وہ لفاظ دفتر پہنچ کر ہی کھلنا تھا۔ اسی کے ساتھ اس نے اپنے بیگ میں سے ریکی کپڑے سے بنا ہوا ایک نازک اور خوشبودار پھول نکال کر مجھے تحفے میں دیا۔ وہ بالکل کسی اصلی پھول کی طرح مک رہا تھا۔ میں نے بعد میں وہ پھول اپنے کالر میں لگا لیا۔ واپسی کے سفر میں میں نے ویرا کا تصور کرتے ہوئے کئی بار اس پھول کو سونگھا لیکن وہ ویرا کا کوئی خطرناک شہدہ تھا۔ زرگ روڈ اسیشن سے آگے نکلتے ہی میرے کالر میں لگا ہوا وہ پھول ایک خفیف سے دھماکے سے پھٹ گیا اور میری جلد جگہ جگہ سے پھٹ گئی۔ میری ٹھوڑی پر ذرا گمراہ زخم آیا ہے ورنہ جڑے گردن اور پیچھے پر صرف خراشیں ہیں جن سے بہہ نکلنے والے خون نے مجھے بوٹھا کر رکھ دیا تھا۔ وہ واقعہ رونا ہوتے ہی مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ جو کچھ ہوا‘ ویرا کے دیے ہوئے پھول کی وجہ سے ہوا تھا اس لیے میں نے راستے ہی میں اس کا دیا ہوا لفاظ چاک کیا تو اس میں سے ایک سادہ کاغذ برآمد ہوا جس پر ایک مختصر سی تحریر لکھی تھی۔“

اوراک ہوتے ہی میں نے اپنی راہ بدل لی اور شی کو ہر جگہ زک پہنچانے پر قتل کیا۔ اس اعتبار سے، میری لڑائی ہیروئن فروشوں کے خلاف تھی۔ اس ہمیشہ غیر ملکی مجرموں کے ساتھ ان کے مقامی کارندے بھی میرے مقابل صف آرا تھے اور میں بہت کامیابی کے ساتھ ان کو زیر کرتا چلا آ رہا تھا۔

بحرشی کے غنڈوں سے تحفظ حاصل کرنے کے لیے، مجھے مخصوص حالات میں مافیا کے ڈان تھری کی پیش کش قبول کرنی پڑی۔ اس میں شبہ نہیں کہ میں نے ان کی صفوں میں رہتے ہوئے بھی ان کو ہماری نقصان پہنچایا تھا لیکن ظاہری طور پر میں ان کا شریک کار تھا۔

لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شی کا کمروہ چومیرے سامنے بے نقاب ہوتا جا رہا تھا۔ ہیروئن کے اسداد کے نام پر اسے صدر امریکا سے خلیفہ رقوم مل رہی تھیں۔ امریکا کے ریاستی ذرائع بھرپور طریقے سے اس کی پشت پناہی کرتے تھے۔ پھر وہ لوگ زیر زمین دنیا سے وابستہ نامور لوگوں میں اپنا بھرم رکھنے کے لیے ہیروئن کی تھوڑی بہت غیر قانونی تجارت بھی کرتے تھے۔ کرائے کے آدمیوں کے ذریعے ہیروئن کی کھپیں پاکستان سے یورپ بھی جاتی تھیں جن سے مزید کالا دھن حاصل ہوتا تھا۔ اس اسٹنگ کے ذریعے بھی فاضل پیداوار کا رخ امریکا کے بجائے یورپ کی زرخیز منڈی کی طرف موڑ دیا گیا تھا۔ مال لے جانے والے نمنا پاکستانی نوجوان یا طالب علم ہوتے تھے اس لیے ان کے پکڑے جانے کی صورت میں شی، امریکا یا صدر امریکا پر کوئی حرف گیری نہیں ہوتی تھی بلکہ پاکستان ہی عالمی ملامت کا نشانہ بننا تھا اور کامیابی کی صورت میں شی کے مالی وسائل میں کدوڑوں ڈالنا اضافہ ہو جاتا تھا۔

ہیروئن کے اس بھیاںک کھیل میں شی نے پاکستان کے جرائم پیشہ لوگوں سے گہرے روابط استوار کر لیے تھے اس وجہ سے اسے سیاسی نقشہ گری میں بھی پیش قدمی کرنے کا موقع مل گیا۔ اس خطے کے بارے میں امریکا کے مخصوص نظریات اور مفادات تھے جن کے حصول کے لیے سازشوں کا سہارا لینا ناگزیر ہو گیا تھا اس لیے شی کے مالی وسائل پاکستان کے باغیوں اور غداروں کی پرورش کے لیے استعمال ہونے لگے۔ اسی ضمن میں ماسٹر کار کا نام سامنے آتا تھا۔ وہ پاکستان کی اینٹ سے اینٹ بنادینے کے عزائم رکھنے والے انتہا پسندوں کا آلہ کار تھا اور اس نے ملک کے محروم دایوس طبقوں میں اپنے پیروکاروں کا ایک مضبوط گروہ بنالیا تھا۔ اس لیے شی کی مریائیاں اس کی نامریاں ذات پر مرکوز ہوتی چلی گئیں۔ شروٹے آخر تک، شی کے کردار میں ایک قابل نفرت تسلسل پایا جاتا تھا۔ ہر جگہ اور ہر اعتبار سے پاکستان اور اس کے مفادات کو تباہ کرنے کی ہوتی تھی۔ الخدیجہ نامی لالچ کی گرفتاری کے بعد ویرا کا تازہ ترین مشن شی کی بددیانتی کا کھلا ثبوت تھا۔

ہے، جہاں سے کوئٹہ فونامی ایک چینی بد معاش اسے پاکستان روانہ کر دیتا لیکن کوئٹہ فونامی کی خود غرضی کی وجہ سے غزالہ ہانگ ہانگ کی پولیس کی تحویل میں چل گئی ہے۔۔۔۔۔

”اوہ! یہ تو بہت برا ہوا“ ظفر نے اضطرابی انداز میں میری بات کا تادی ”وہاں برطانوی راج ہے اور ان کے زیر اثر پولیس کا حکم بہت سخت اور فعال ہے جس سے کسی مورعایت کی امید نہیں کی جاسکتی۔“

”لیکن میرے لیے یہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے“ اس کا فقرہ مکمل ہوتے ہی میں نے بات اچکی ”اصل پریشانی یہ ہے کہ شری مان سنگھ نے مجھے مجھے میں ڈال دیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ہانگ ہانگ جانے والی لڑکی غزالہ نہیں، بلکہ کوئی اور ہے۔ غزالہ بدستور نئی دہلی میں ہے۔“

”یہ کب کا قصہ ہے؟“ میرے انکشاف نے ظفر کو بری طرح چونکا دیا۔

”تمہارے اتر پورٹ جانے کے بعد میں نے شری مان سنگھ کو فون کیا تھا“ یہ کہہ کر میں نے اسے اختصار کے ساتھ اول سے آخر تک پوری کہانی سنائی۔

”مجھ میں نہیں آتا کہ بے چاری غزالہ کیوں پس رہی ہے۔“ میرے خاموش ہونے پر وہ نظر اتر لے کر بولا ”تم نے جی لائیڈیا شی کو ہیروئن فروشوں کی عالمی تنظیم سمجھ کر ان سے مل کر لی تھی لیکن اب رفتہ رفتہ بات ذاتی خاصیت پر آگئی ہے۔ تم ان کے پیچھے لگے ہوئے ہو اور وہ ہر جگہ تمہیں زک پہنچانے کے درپے ہیں۔ جی لائیڈ ہو یا میری گیسٹریز اور شری مان سنگھ، تمہارے خلاف ان کے مفادات مشترک ہیں۔“

غیبت یہ تھا کہ ظفر کو میرے اور مافیا کے خفیہ روابط کا علم نہیں تھا۔ وہ بات اور زیادہ الجھ جاتی۔

بات بہت سیدھی سی تھی کہ میری اصل دشمنی صرف جی لائیڈ سے تھی جو شی کا سربراہ تھا اور اس دشمنی کی بنیاد یہ تھی کہ وہ بظاہر پاکستان سے بیش قیمت ہیروئن کی اسٹنگ میں دلچسپی ظاہر کرتا تھا لیکن اس کا حقیقی مشن یہ تھا کہ ہماری داموں پر سرحدی علاقوں سے خریدی گئی ہیروئن کی ہماری مقدار کو سستے داموں پاکستان کے ہر شہر اور قصبے میں پھیلا دیا جائے تاکہ پاکستان میں ہیروئن کی اس قدر رکھت پیدا ہو جائے کہ پاکستان اور افغانستان میں کاشت ہونے والی ساری انجم اسی طلب میں کھپ جائے اور مغربی دنیا میں بیچنے کے لیے فاضل پیداوار باقی نہ رہے۔ مغرب اور امریکا کو ہیروئن کی ہولناک پیلار سے بچانے کے لیے وہ ایک منفی منصوبہ تھا، جس کے تحت پاکستان کی نئی نسل کو منظم پیلانے پر ہیروئن کا عادی بنایا جا رہا تھا۔

جب تک شی کا وہ مقصد میری نظروں سے اوجھل رہا میں تن، من، دھن سے ان کے لیے کام کرتا رہا لیکن ان کے اصل عزائم کا

کر سکتا ہوں کہ پاس بے پرائیز کو نلیٹ والوں کے ہٹ کا کیا نمبر ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ شری مان سنگھ اسی ہٹ پر جائے کسی بھی غلط کام کے لیے وہ ایسی جگہ کا انتخاب کرے گا کہ بعد میں اس کے دفتر کے لوٹ ہونے کا اندیشہ نہ ہو۔ غزلوں، گانوں اور شراب کی مغفوں کے ذریعے ان لوگوں نے شہر کے متول طبقے میں بھیرے دوست پیدا کر لیے ہیں۔ وہ ان میں سے کسی سے بھی اس کا ہٹ مستعار لے سکتا ہے۔ ایسا ہوا تو میرے آدمی اس کے سرکاری ہٹ پر انتظار میں ساری رات سوکتے رہیں گے اور وہ کہیں اور تمہارا بھروسہ نکال رہا ہوگا۔

”تمہارے آدمیوں کو یہ میدان میں اتارنا ہے تو وہ تعاقب بھی کر سکتے ہیں“ میں نے کہا۔

”وہ جو کتنا ہو جائے گا۔ شام کو اور خاص طور پر اندھرا پھیلنے کے بعد شہرے ادھر جانے والوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔ پیچھے آنے والی کوئی بھی کار اسے ہوشیار کرنے کے لیے کافی ہوگی۔“

”ضروری نہیں کہ تعاقب شہری سے شروع کیا جائے“ میں نے اپنے ذہن میں تشکیل پانے والے خاکے کو الفاظ میں ڈھالتے ہوئے کہا ”آدھی سے نکلنے کے بعد، بس کی ابتدا تک ویرانہ ہی ویرانہ ہے۔ راستے میں پڑنے والے پھیروں کے گٹھ اس کی منزل نہیں ہو سکتے۔ اس مہم میں گاڑیوں یا بچپوں کے بجائے عام بار برداری والا کوئی ٹرک استعمال کرنا ہوگا تاکہ تمہارے مسلح آدمی اس کے پچھلے حصے میں دیکھ سکیں۔ کار میں گزرنے والے کو اندازہ ہی نہیں ہو سکے گا کہ ٹرک میں بوجھ لدا ہوا ہے یا آدمی چھپے ہوئے ہیں۔ وہ ٹرک، بس کے آغاز پر اس طرح کھڑا رہے جیسے اس میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہو۔ میں کالی شیراز میں سڑکوں گا۔ میری کار دیکھتے ہی ٹرک حرکت میں آجائے اور ہماری منزل دیکھتا ہوا آگے نکل جائے۔ تھوڑی دیر بعد وہ لوگ واپس آکر ہمارے ہٹ کو گھیرے میں لے سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس تھوڑے سے وقت میں، میں حالات کو قابو سے باہر نہیں ہونے دوں گا۔“

”اور اگر شری مان سنگھ نے اصرار کیا کہ تم شیراز چھوڑ کر ماری پور سے اسی کی کار میں سڑک دو، تو کیا ہوگا؟“ سلطان شاہ کو ایک نیا نکتہ سوجھ گیا ”ٹرک والے کالی شیراز کا انتظار کرتے رہ جائیں گے۔ انہیں پتا بھی نہیں چل سکے گا کہ تم اندھیرے میں کس کار میں نکل گئے ہو۔“

”ماری پور لیول کراسنگ پر حالات مختلف ہوں گے۔ میں سختی کے ساتھ اس کی ایسی کوئی بھی تجویز رد کر دوں گا اور واپس لوٹ جانے کی دھمکی تک دے سکوں گا۔ اتنی بات تم مجھ پر چھوڑ دو۔“

”اختیاراً دو چار آدمی وہاں بھی بھیج دیے جائیں گے تاکہ وہ زبردستی نہ کر سکے“ ظفر نے کہا ”ویسے میرا اندازہ ہے کہ وہ ایک تجربے کار آدمی ہے۔ شہری حدود میں ایسا کوئی سنگین خطرہ مول

ایران سے بذریعہ سڑک آنے والے چھ سو ٹن وزنی اینٹی ٹانک اور سازو سامان کا بیروئن سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن وہ کیپ پاکستان کے ایٹمی وسائل اور استعداد میں قابل ذکر اضافے کا سبب بن سکتی تھی اس لیے شی اسے تباہ کرنے پر تل گئی تھی۔ دوسری طرف شی کے آقا، پاکستان میں موجود اینٹی سوئٹوں کے خلاف ایک منظم مہم چلا رہے تھے اور مغربی دنیا کو نام نہاد اسلامی اہم کم کا ہوا دکھانا کہ ایک خاص ذہنی ماحول تیار کر رہے تھے تاکہ مفادات کے تصادم کے کسی مرحلے پر انہیں طاقت و بریت کا کوئی عمدہ و تکمیل اختیار کرنا پڑے تو انہیں ہر طرف سے تائید و حمایت مل سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ بیروئن کے نام پر جو بھی حکومتی اور زیر زمین عظیم پروان چڑھ رہی تھیں، مالی وسائل کی بے اندازہ فراوانی کی وجہ سے پچھلے چند برسوں میں ان کے اثر و نفوذ میں ناقابل تصور اضافہ ہوا تھا اور زندگی کے ہر شعبے میں ان کے اثرات خود بخود جنگی جڑوں کی طرح تیزی کے ساتھ پھیلتے جا رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ میری مہم کا رخ بھی ہمہ گیر ہوتا جا رہا تھا حالانکہ میرا اصل مشن صرف شی کی تباہی تک محدود تھا۔

جس طرح میں شی کے ہر مفاد پر وار کر رہا تھا اسی طرح شی اور اس کے ہم نوا مجھے ہر طرح ڈک پہنچانے پر تے ہوئے تھے۔ میری کوئی جائیداد تھی نہ لبا چوڑا خاندان، جس پر وہ کوئی کاری ضرب لگاتے البتہ ویرانے، جنوں اور انتہا پسندی کی وجہ سے یہ بات میرے ہر دشمن کے علم میں آچکی تھی کہ میں غزالہ کو حد سے زیادہ چاہتا تھا اس وجہ سے غزالہ شری مان سنگھ کی نظروں میں بھی آگئی تھی اور اسے اس پکڑ سے بچانا بھی بیروئن کے خلاف، میری مہم کا ایک ناگزیر حصہ بن چکا تھا۔

”مہراب تم نے کیا سوچا ہے؟“ کچھ دیر کے مباحثے کے بعد آفکار ظفر نے پوچھا۔

”میرے سامنے کوئی راستہ نہیں ہے۔ وعدے کے مطابق مجھے مات بے ماری پور کے لیول کراسنگ پر پہنچنا ہوگا۔ اس کے بعد جو ہوگا وہ دیکھا جائے گا“ میں نے بے پروائی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

”مجھے اس کی نیت خراب نظر آتی ہے“ ظفر نے پُر تشویش لہجے میں کہا ”تھوڑی دیر پہلے تم نے بتایا تھا کہ ماری پور سے وہ پاس بے جائے گا جہاں اس کی کوئی ہٹ بھی ہے۔ اگر وہاں اس کے آدمی موجود ہوتے تو تم بہت آسانی کے ساتھ بے بس کر لیتے۔ ہاں گے یہ نہ بھولو کہ شری مان سنگھ کا اصل شکار تم خود ہو۔ تم کو پانے کے لیے اس نے غزالہ کو نبی دہلی منتقل کرایا ہے۔“

”مہر تم ہی بتاؤ کہ کیا کیا جائے؟“ میں نے اپنی طرف سے کوئی تجویز پیش کرنے کے بجائے اسی سے سوال کیا ”میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر انتظار کروں گا کہ کیا نہیں سگتا چاہتا۔“

”میرے آدمی تمہاری حفاظت کر سکتے ہیں۔ میں یہ بھی معلوم

کوفت کا سبب بن جاتی ہے۔“

میرے نزدیک وہ اس کی خود کلائی تھی اس لیے میں نے جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور وہ چند ثانیوں تک اول قول تبصرے کرنے کے بعد خود ہی خاموش ہو گیا۔

فلیٹ پر واپس پہنچنے کے بعد میرے پاس کافی وقت تھا اس لیے میں تازہ دم ہونے کی نیت سے ہاتھ دوب نہال کر غسل خانے میں گھس گیا۔ شاور کے نیچے، اپنے بدن پر نیم گرم پانی کی تیز دھاریں ڈالتے ہوئے بھی میرا ذہن پوری صورت حال میں الجھا ہوا تھا۔

اس وقت میں کئی محاذوں پر الجھا ہوا تھا لیکن غیبت یہ قہار غزالہ والے معاملے کے علاوہ ہر طرف صورت حال پوری طرح قابو میں نظر آ رہی تھی۔

سب سے اہم معاملے کا تعلق لمبو کر اس ڈیل کی سلامتی سے تھا اور اس پیش قیمت ایٹمی کھپ کو مکمل تباہی سے بچانے کے لیے دیہ اکونڈ کے راستے ایران کے لیے روانہ ہو چکی تھی۔ اس کے بعد ہیری کیسنگر کی باری آتی تھی جو ایک مہربانور کا طاقت ور سیاسی اہل کار تھا اور ان دونوں میرے اور میرے ہم درووں کے لمبو کا پیا سوا ہوا تھا لیکن اس کے پالتو غنڈے ایس بی ایف کے ہاتھوں بدترین شکست اور تباہی سے دوچار ہو چکے تھے۔ ان کا سرخشاں استاد صدو دردناک انداز میں جہنم کا اندھن میں چکا تھا۔ اس کے بھاگ نکلنے والے ساتھی شری انجان کیس گاؤں میں کیس دے کے ہوئے اپنے زخم چاٹ رہے تھے۔ انہیں صدو کے انجام کا علم نہیں ہو سکا تھا لیکن صدو کے راہ سے ہٹ جانے کے بعد انہیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کس کے لیے کام کر رہے تھے۔ اس لیے ہیری کیسنگر کے ان خونخوار غنڈوں کا شیرازہ بھی کچھ کر رہ گیا تھا اور مجھے فوری طور پر ان کی طرف سے کسی جوابی کارروائی کا کوئی خدشہ نہیں تھا۔ اگلی کسی مہم کے لیے ہیری کیسنگر کو از سر نو کچھ لوگوں کو منظم اور یکجا کر کے میدان میں آنا پڑتا جس کے لیے وقت درکار ہوتا اور وہی وقت میرا سر ہاں تھا۔ تیسرے معاملے کا تعلق مانی سے تھا۔ گو میں سینٹ حبیب جیوانی اور اس کے منشیات فروشوں کے لیے اپنے دل میں نرمی کا کوئی گوشہ نہیں رکھتا تھا لیکن پھر بھی میں ان لوگوں کی صفوں میں ایک ذمہ دار منصب پر فائز تھا۔ ان دنوں میں وراکی جینجی کے ہمارے ان لوگوں سے اپنی جان چھڑائے ہوئے تھا البتہ وہ میری نجات کا آخری دن تھا کیونکہ حبیب جیوانی کے آخری پتہ نام کے مطابق، مجھے اگلے روز دوپہر کے دو بجے سے پہلے ٹیڈالان کے دفتر پہنچنا تھا۔ وہ حبیب جیوانی کا حکم نہیں تھا بلکہ اسے بھی ڈان ٹھری کی جانب سے وہ ہدایت ملی تھی اور اس کے مطابق اگلے سورج طلوع ہونے تک میں مانی کے بندھنوں سے پوری طرح آزاد اور خود مختار تھا۔

میرا آخری اور اہم معرکہ شری مان سنگھ کے ساتھ چل رہا

نہیں لے گا جس کی بنا پر اس کے پھنس جانے کا امکان پیدا ہو جائے۔“

اس نے اپنے خدشے پر خود ہی رائے دے دی تھی اس لیے میں خاموش رہا۔

شام کے لیے ایک منصوبہ طے ہو چکا تھا اس لیے ہم تینوں تنہی کے ساتھ اس کی بنیاد پر تبادلہ خیال کرنے میں مصروف ہو گئے۔ ظفر نے خود ہی اعتراف کر لیا کہ اس کی حالت اس قابل نہیں تھی کہ وہ خنک رات میں پوری مستعدی کے ساتھ اس مہم کی دیکھ بھال کر سکے۔ دوسری طرف وہ سلطان شاہ کی شرکت کا بھی مخالف تھا کیونکہ وہ بھی زخمی تھا جب کہ کھلے ساحل پر ہونے والے مقابلے میں کسی بھی شخص کی ذرا سی مجبوری یا مجبوری کی وجہ سے پیدا ہونے والی سستی اس کے لیے موت کا پتہ نام بن سکتی تھی۔

سلطان شاہ نے وہ فیصلہ آسانی کے ساتھ قبول نہیں کیا لیکن جب ظفر نے اسے یہ بتایا کہ اس کی دلی تمنا یہی ہے کہ وہ اپنے ازلی حریف کے کسی اہم غارت کار پر رنگے ہاتھوں چھاپا مار سکے لیکن صورت حال کی نزاکت کی بنا پر وہ اپنے دل پر جبر کر کے مہم میں شرکت سے گریز کر رہا ہے تو اسے بھی ہتھیار ڈالنے پڑے اور وہ منہ لٹکا کر بیٹھ گیا۔

اپنی غیر حاضری میں ظفر نے اشرف خان نامی، اپنے ایک ماتحت کو اس مہم کی نگرانی سونپنے کا فیصلہ کیا اس لیے اسے بھی وہیں طلب کر لیا گیا اور پھر ہی مہم کے واضح خدوخال بننے شروع ہو گئے۔ ہم وہاں سے روانہ ہوئے تو سلطان شاہ کا منہ پھولا ہوا تھا۔ میں اسے ذرا بھی چھیڑتا تو وہ مجھ پر برس کر اپنے دل کا سارا غبار نکال لیتا۔ اس لیے میں خاموشی سے کار چلاتا رہا۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میری شرکت سے ظفر کو کیا تکلیف تھی؟“ طول خاموشی سے بے زار ہو کر، آخر کار سلطان شاہ بول ہی پڑا ”مجھے تو یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے تم دونوں نے مل کر مجھے ہر معاملے سے بالکل الگ تھکھل رکھنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ کبھی تم مجھے کچھ بھڑکادیتے ہو اور اب اس نے مجھے دور رہنے کا نادر شاہی مشورہ دیا ہے۔ اگر میں اسی قدر نااہل ہوں تو۔۔۔۔۔“

”بس اب زیادہ نہ بولو۔“ میں نے اس کے منہ پر ہاتھ پٹے ہی اس کی بات کاٹ دی ”مہم میں سے کسی کو تمہاری اہمیت یا افادیت پر شبہ نہیں ہے۔ آج کی مہم میں ہمسائی فتنس بہت ضروری ہے۔ کھلی فضا میں ہونے والے امکانی مقابلے میں چاق و چوبند رہ کر ہی اپنا بچاؤ کیا جاسکے گا۔ وہاں سستی دکھانے والے کو امان نہیں مل سکے گی۔ اسی وجہ سے ظفر خود بھی رکنے پر مجبور ہو گیا ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ میرے بدن میں اتارنے والی گولی مجھے ہی نقصان پہنچائے گی اس لیے میری سلامتی کے بارے میں اسے اتنا زیادہ فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔“ وہ جلتے جھٹے انداز میں بڑبڑایا ”بعض اوقات دوسروں کی حد سے بڑھی ہوئی فکرمندی

ملّا سرکار کا ایجنٹ تھا اور عام آبادی میں اپنی جگہ بنانے کے بعد اپنے ملک کے مفادات کے لیے درپردہ کام کر رہا تھا۔ اسی کی طرح شری مان سنگھ بھی اپنے ملک کی سیکرٹ سروس کا کارندہ تھا اور سفارتی نقاب کی اوٹ میں اپنی تخریبی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھا۔ اس نے مجھے اپنی راہ پر لانے کے لیے پیشہ ورانہ حربوں کا استعمال شروع کیا ہوا تھا اور گھیر گھار کر مجھے اپنی ہی سرزمین کے خلاف میدان میں لانا چاہتا تھا۔ مجھے اپنے جنگل میں بھانسنے کے لیے اس نے ایک ایسا دہلی میدان تیار کیا تھا جہاں قدم رکھتے ہی میں اندر ہی اندر دھتتا چلا جاتا۔ میں ایک بار اس کے لیے کام کرنا شروع کر دیتا تو گھیل سی مدت میں وہ میرے خلاف اتنا مواد اکٹھا کر سکتا تھا کہ میرے لیے اس کی بلیک میلنگ سے جان چھڑانا محال ہو جاتا اور میں بیش کے لیے اس متعفن دہلی میں دھنسن کر رہ جاتا۔

میرے لیے یہ امر خوشی اور اطمینان کا باعث تھا کہ شری مان سنگھ سے فیصلہ کن اور اعصاب شکن ملاقات کے لیے میرے پاس خاصا وقت موجود تھا اور میں اپنی ذہنی توانائیاں دوسرے مسائل میں ضائع کیے بغیر اس مزدور کی سازش کو ناکام بنا سکتا تھا۔

میں مقررہ وقت سے چند منٹ پہلے ہی سیاہ شیز کا کمر ماری پور والے لیول کر اسٹاپ پر پہنچ گیا اور ریلوے لائن عبور کر کے اپنی گاڑی ایک کنارے سے لگا دی۔

اس وقت تک وہاں ٹریفک کا دباؤ نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ مسافروں کے انتظار میں کھڑی ہوئی اکاڈا کاسمی بسوں کے علاوہ وہاں ایسی کوئی گاڑی موجود نہیں تھی جس پر شری مان سنگھ کی کار ہونے کا شبہ کیا جاسکتا۔ میں نے نہایت غور سے قریب و جوار کا جائزہ لیا لیکن ایسے لوگوں کی نشاندہی سے قاصر رہا جن پر ایس ٹی ایف سے تعلق رکھنے کا شبہ کیا جاسکتا۔

مجھے پورا یقین تھا کہ ظفر علی طور پر اس مہم میں شریک نہیں ہو سکا تھا لیکن اس نے پس پردہ رہتے ہوئے اس امر کا پورا پورا بندوبست کر لیا ہو گا کہ حفاظتی تدابیر میں کوئی کمی نہ رہ سکے اس نے میری موجودگی میں اشرف خان کو اپنا پورا پلان سمجھا دیا تھا جس کی رو سے ایس ٹی ایف کے کم از کم تین مسلح افراد کو ایسی جگہوں پر موجود ہونا چاہیے تھا جہاں سے وہ وقت ضرورت میری مدد کے لیے آسکیں۔

ٹھیک سات بجے مجھے اپنی کار کے عقب نما آئینے میں ایک کار کے روشن ہیڈ لیمپس نظر آئے۔ وہ کار ریلوے لائن عبور کر کے میری ہی طرف آ رہی تھی۔ اس کی رفتار بہت ست تھی اور ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کار چلانے والے کو اپنے آس پاس کسی کی تلاش ہو۔ میں اپنی ڈرائیونگ سیٹ پر جوتنا ہو گیا۔

اسے کسی کی تلاش تھی جب کہ وہاں قریب و جوار میں میری گاڑی کے علاوہ کوئی کار موجود نہیں تھی اس لیے وہ کار سیدھی

تھا۔ غزالہ کی ہانگ کانگ روایتی کے بارے میں مجھے اس نے بدترین الجھن میں ڈالا ہوا تھا۔ ایک طرف مکاؤ سے فون پر ملنے والی خبریں تھیں جن کے مطابق غزالہ ہانگ کانگ پولیس کی قید میں تھی اور دوسری طرف شری مان سنگھ نے مجھے یہ خبر سنائی ہوئی تھی کہ غزالہ سرے سے ہانگ کانگ گئی ہی نہیں تھی۔ البتہ اس کے کچھ طلبہ گاروں کو قریب دینے کے لیے اس کی جگہ کھنڈ کی شکستہ دیوی کو بھیج دیا گیا تھا۔ وہ غزالہ تھی یا شکستہ دیوی۔ اس کا انکشاف تو وقت آنے پر ہی ہو سکتا تھا لیکن میرے لیے تسلی کی بات یہ تھی کہ ہم نے کوئی بگاڑ پیدا کیے بغیر معاملے کے دونوں پہلوؤں کو سنبھالا ہوا تھا۔

ہانگ کانگ میں شی کے آئی مین کو امگ فونے غزالہ کی بازیابی کے لیے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے اور کراچی میں شری مان سنگھ کے ساتھ پرنسپل مذاکرات میں مصروف تھا جس کا فیصلہ کن مرحلہ تیزی کے ساتھ قریب آتا جا رہا تھا۔

شری مان سنگھ سے اس وقت تک ہونے والی ملاقاتوں سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آچکی تھی کہ ان لوگوں کی سازشوں کے منظر نامے سے ملّا سرکار کے اچانک غائب ہوجانے کی وجہ سے وہ لوگ شدید بے چینی اور بے یقینی میں مبتلا ہو چکے تھے۔ جب تک ملّا سرکار سرگرم عمل تھا تو ہتھیاروں کی بھاری کھپ کا بندوبست نہیں ہو سکا تھا۔ بعد میں الحید کے ذریعے جدید ترین اور تیار کن ہتھیاروں کی کھپ آئی اور ساحل پر اترنے سے پہلے پکڑی گئی تو ملّا سرکار گھر کے سرے سیٹگوں کی طرح غائب ہو چکا تھا۔ اس کے بعد شاید وہ لوگ دوسرے ذرائع سے ہتھیاروں وغیرہ کی نئی کھپ منگوانے کا بندوبست کر چکے تھے لیکن سندھ کے دیسی علاقوں میں ان کے پاس کوئی ایسا آدمی نہیں تھا جو ان ہتھیاروں کو پوری ذمہ داری کے ساتھ ان لوگوں تک پہنچا سکے جو قانون کی حکمرانی کو لٹا کرتے ہوئے جنگلوں میں روپوش ہو چکے تھے۔

اپنے روابط کی گم شدہ کڑیوں کو یکجا کرنے کے لیے شری مان سنگھ کو ایک قابل اعتماد آدمی کی شدید ضرورت تھی۔ ویرانے اپنی حماقت کے ذریعہ 'غزالہ کو اس کے حوالے کر کے گویا میری ٹیکل اس کے ہاتھ میں دے دی تھی۔ وہ میرے ماضی سے خاصی حد تک واقف تھا اور اچھی طرح جانتا تھا کہ مجھے رام کر کے وہ اپنے مسائل پر ہی بند نہ کر سکا جاتا۔ اس نے غزالہ کی واپسی کے بدلے غلام رسول کو لانے کا مطالبہ کیا۔ میں نے اس بارے میں اپنے ضمیر پر کوئی بوجھ لیے بغیر غلام رسول کی سردلاش اس کے آدمیوں کے حوالے کر کے ان پر حملہ کر دیا۔ میں نے تکنیکی اعتبار سے اپنی ذمہ داری پوری کر دی تھی لیکن شری مان سنگھ اپنے وعدے سے پھر گیا۔ اس نے ملّا سرکار کا کھوج لگانے کی ذمہ داری کے ساتھ ہی مجھ سے ایس ٹی ایف کی سرگرمیوں کا پتا چلانے کا بھی مطالبہ کر دیا۔

روں گا۔

”میری نیت خراب ہو تو آگے چل کر بھی گڑبگڑ سکتا ہوں۔ تم بلاوجہ بات کا بھنگو مار رہے ہو۔ جب تم ہمیں سے میری نیت پر شبہ کر رہے ہو تو ہٹ میں پہنچنے کے بعد کیا ہو گا؟ وہاں تم پوری طرح میرے رحم و کرم پر ہو گے۔“

”وہ بعد کی بات ہے۔“ میں نے جھلکار کہا ”اس وقت تو وہی ہو گا جو میں کہہ رہا ہوں ورنہ آج کی ملاقات کو ختم سمجھو۔ بعد میں ہم کسی اچھے وقت پر دوبارہ مل سکتے ہیں۔“

”تم بہت ضدی ہو۔“ وہ بے بسی کے ساتھ ہنسنے ہوئے بولا۔ ”جس بات پر اڑ جاتے ہو“ اس پر سے تمہیں ہلانا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ ملاقات میری نہیں بلکہ تمہاری مرضی سے ہو رہی ہے۔ میں نے بہت مشکل سے وقت نکال کر تمہارے لیے ایک خوب صورت دعوت کا اہتمام کیا ہے اور تم میرے سارے بندوبست کو خاک میں ملائے پر تلے ہوئے ہو۔ خیر تم جس طرح چاہو میرے پیچھے چلے آؤ۔ باقی باتیں ہٹ پر ہی ہو جائیں گی۔“

اس کا جہیز ڈرائیو رہائی کے ساتھ اپنی نشست سنبھال کر آگے روانہ ہو گیا اور میں بھی شیراز کا انجن اشارت کر کے تیزی کے ساتھ اس کے پیچھے روانہ ہو گیا۔

میرے ذہن میں وہ کہی بات چبھ رہی تھی کہ شری مان عکھ مجھے اپنی ہی گاڑی میں لے جانے پر کیوں مصر تھا حالانکہ ہٹ پر پہنچنے کے بعد میں نظا رہو پوری طرح اس کے رحم و کرم پر ہوا اور اگر وہ میرے ساتھ کوئی چال ہی چلتی چاہ رہا تھا تو اسے اس کے لیے ہٹ پر بہتر مواقع میسر ہوتے۔ بھر کے لیے مجھے خیال آیا کہ شاید اس نے ہٹ کا سرے سے کوئی بندوبست ہی نہیں کیا تھا اور مجھے بسلا چھلا کر راستے ہی سے اغوا کرنے کا منصوبہ بنائے بیٹھا تھا۔ میں ایک بار اس کی کار میں سوار ہو جاتا تو وہ راستے میں موقع پا کر مجھے بے ہوش کر سکتا تھا اور ایسی حالت میں اپنے کسی بھی محفوظ ٹھکانے پر قید کر سکتا تھا لیکن مجھے فوراً ہی وہ خیال اپنے سرے سے جھٹک دینا پڑا کیونکہ وہ خود ہی ہٹ پر کسی بڑے کھف خیانت کا ذکر کر چکا تھا جس کا مطلب تھا کہ اس کے پروگرام میں ہٹ کا انتظام شامل تھا۔

سفید کولا کے پیچھے سفر کرتے ہوئے میں نے یہ بات بھی نوٹ کی کہ اس کار پر سفارتی نمبر لپٹ کے بجائے کراچی کی عام نمبر لپٹ لگی ہوئی تھی۔ عام حالات میں وہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوتی کیونکہ بیشتر سفارتکار اپنی نجی مصروفیات اور خاص طور پر تقریبی سرگرمیوں کے دوران میں لوگوں کی توجہ سے بچنے رہنے کے لیے اپنی ہر سفارتی شناخت کو خیرباد کہنے کو ترجیح دیتے ہیں لیکن وہاں معاملہ شری مان عکھ جیسے چالاک سیکرٹ ایجنٹ کا تھا اس لیے میں خود کو ہر معمولی سے معمولی بات پر توجہ دینے کے لیے مجبور رہا رہا تھا۔

کراچی کے ساحلی تقریبی مقامات پر شری سولیات اور تحفظ کی عدم فراہمی کی وجہ سے رات میں آمدورفت کا رجحان نہیں پایا

ہے رہا میں آ کر۔

دھننے ماڈل کی سفید نوپا کولا تھی۔ اس کی ڈرائیو تک سیٹ ایک غوندہ اور جھڑا لٹیروں والا شخص برائمان تھا جب کہ پلاٹ پر شری مان عکھ دھنسا ہوا تھا۔

کولا کے رکنے سے پہلے شری مان عکھ نے بھی مجھے دیکھ لیا اور کولا کی رکی تو شری مان عکھ اپنے بائیں طرف سرک کر کھڑکی کے قریب آچکا تھا۔

”اپنی گاڑی ہمیں کہیں پارک کر کے لاک کرو۔“ اس نے اپنے اندر گرجھ سے کہا ”ایک ہی کار میں باتیں کرتے ہوئے آرام نہیں ہے۔“

اس کی وہ تجویز ہمارے طے شدہ منصوبے سے متصادم تھی۔ اس کے ہنس کے آغاز پر ”ٹک میں چھپے ہوئے ایس لی ایف کے آدمی میری کالی شیراز کی پہچان کراچی پولیس ڈی کی آغاز کرتے ہیں اپنی کار مجھ کو رکھنے کے لیے سفر کرتا تو میں ان کے قریب سے گزر جاتا اور رات کے اندھیرے میں انہیں پتا بھی نہ چلا کہ اپنی گاڑی عکھ مجھے کب اپنے چوہے دان کی طرف لے گیا ہے۔“

”خدا کا خوف کرو“ شری مان نے اس کی تجویز سننے ہی کہا۔

”جنگ کل شہر کے بھرے پرے بازاروں میں لوگوں سے گاڑیاں چھینی جاتی ہیں اور تم مجھے اس دیرانے میں گاڑی چھوڑنے کا مشورہ دے رہے ہو۔ یہاں تو وہی ہی دیر میں انہوں نے لگیں گے اور پھر گاڑی تو کیا اس کے سائے کا بھی پتا نہیں چلے گا۔“

”بھر گاڑی واپس گھماؤ۔ ٹک اسٹینڈ کے علاقے میں ساری رات دن کا ساں رہتا ہے۔ گاڑی وہیں کسی دکان یا جیولر پاپ پر چھوڑنا وہاں کوئی خطرہ نہیں ہو گا۔“

”بلاوجہ وقت برباد ہو گا۔“ میں نے اس کے اصرار کا توڑ کرنے کے لیے سختی سے کہا ”ہم اپنی اپنی گاڑیوں میں ہی چلیں گے تمہارا موڈ ہو تو رات ساحل پر گزرا لیتا۔ میں فارغ ہو کر واپس ٹھہر لوں گا جہاں ہوں۔ میری گاڑی موجود ہوگی تو تمہیں کوئی زحمت نہیں ہوگی۔“

”مگر تم میرے ساتھ آ جاؤ!“ اس نے آخری حربہ آزما دیا ”تمہاری کار میرا ڈرائیو ر چلا لے گا۔“ اس کی بات پوری ہونے ہی اس کا ڈرائیو اپنی سیٹ چھوڑ کر پیچھے اتر گیا۔

اس کی وہ تجویز میرے لیے غیر متوقع تھی۔ اپنا منصوبہ طے کرتے ہوئے میں نے یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ کسی ڈرائیو کے ساتھ آئے گا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اکیلا ہو گا اور میں آسانی کے ساتھ اپنی گاڑی میں سفر جاری رکھنے میں کامیاب ہو جاؤں گا مگر وہ میری جان کا خیال بننے پر ٹٹا ہوا تھا۔

”مگر مجھے اپنی کار میں انہو کر کے کہیں اور لے جانے کا پکارا ہے تو کل کر بات کرو۔“ میں نے ٹک آ کر جھٹتے ہوئے ”میں نے اسے اپنے گاڑی میں چلو۔ میں تمہارے پیچھے آتا

اس کی تقلید کی اور چند ٹائیں بعد ٹرک غراتا ہوا آگے نکلا۔ ہمارے پہنچنے سے پہلے اس ہٹ پر ایک سیاہ سرخڑی گاڑی موجود تھی اور ہٹ کے بعض حصوں سے جھانکنے والی دو عورتیں چل رہا تھا کہ وہ ہٹ اس وقت بھی آباد تھا۔ میں اپنی کار کا ٹائیر کر کے نیچے اترا تو میرے کانوں میں جزیر کا ہلکا سا شور گونجنے لگا۔ ہٹ میں روشنی کے بارے میں میرا اندازہ درست ثابت ہو گیا۔ ان لوگوں نے اپنی ضروریات کے لیے وہاں کسی طاقت ور رہائشی جزیر کا بندوبست کیا ہوا تھا۔

ہماری گاڑیاں رکستے ہی ہٹ کی دیوار کے سامنے ایک دروازہ قائم سایہ نکل کر ہمارے سامنے آیا۔ آدوں بھرے آنکھ کے نیچے، سیلے کپڑوں میں لبوس اس دروازہ قائم شخص کی آنکھوں میں پراسرار اور معنی خیز چمک کو نہ دیکھ سکتی تھی۔ خشک ہواؤں نے اپنے بچاؤ کے لیے اس نے ایک پرانا اونٹنی کوٹ پہنا ہوا تھا اور وہ بھی اونٹنی کوٹ ہی کا اور وہ رکھی تھی۔ اپنی وضع قطع سے ملازمین کے جان نثار اور وفادار قبیلے کا فرد معلوم ہو رہا تھا۔

اس نے سب سے پہلے شری مان سنگھ کو سلام کیا جس کا مطلب تھا کہ شری مان سنگھ اس ہٹ پر اجنبی نہیں بلکہ اکثر آتا جاتا رہتا تھا۔

”کیا حال ہے، احمد؟“ شری مان سنگھ نے اچانکیت کے ساتھ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

”بس صاحب، کرم ہے، مولا کا۔“ اس نے رمی سا جواب دیا پھر قدرے راؤدارانہ لہجے میں بولا ”مس لوگ اندر ہے۔ دو کدو سودا فروغ میں ہے۔ اوپر پانی کی تنگی فل ہے۔ جزیر میں بھی مٹکے کے لیے پیٹرول کا بندوبست ہے اور کوئی کام ہو تو میں ادھر ہی رہتا گا۔“

”یہاں ٹھنڈ اور اوس میں بیمار پڑ جاؤ گے۔“ شری مان سنگھ نے ہمدردی سے کہا ”ادھر آگے برآمدے میں چلے جاؤ۔ ہم لوگ زیادہ وقت اندر ہی گزاریں گے۔“

وہ عارفانہ انداز میں دھیمے سے ہنسا اور بولا ”صاحب، ہم لوگ

سمندر کے کیڑے ہیں۔ سردی اور گرمی میں اسی پانی سے لڑ کھڑا رہتے ہیں۔ ٹھنڈ اور اوس ہمارا کچھ نہیں بگاڑتی۔ ہاں ریت سے نکلنے والے زیر پلے کیڑوں سے ڈر لگتا ہے۔ تم بھی باہر نکلو تو ذرا خیال رکھنا۔ یہ کیڑے چاندنی راتوں میں زیادہ نظر آتے ہیں۔“ احمد کے تعارف کے لیے وہ گفتگو کا کافی حصہ دیا۔ وہ چیمبروں کے قبیلے کا کوئی مقامی تھا جو اپنی سہل پسندی کی وجہ سے آج بھی زیادہ خیر یاد کہہ کر ان ہٹس کی چوکھڑی پر گزرا کر رہا تھا۔ ہٹس کے سینڈ نیٹ کے علاقے میں ایسا ہر چوکھڑی پر دس بیچ ہٹس کی چھائی کرتا تھا۔ انہیں ہٹس کے مالکان سے ملنے والی قبیلہ چھوڑ دیا۔ فائدہ یہ تھا کہ چھٹی کے دنوں میں تفریح کے لیے ادھر آتے تھے۔ لوگوں کو سوچا جس روپے لے کر، اپنے ہٹس کے سایہ دار دروازے

جاتا۔ سمندری تقریحات کے دلدادہ لوگوں کی دوڑ عموماً کلغٹن تک محدود رہتی ہے۔ رات میں ہٹس کے اور سینڈ نیٹ کے دور افتادہ اور تاریک سواحل کا رخ کرنے والوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔ ان میں وہی غیر ملکی نظر آتے ہیں جو رات کے سناٹے میں، ساحلی ریت پر کچھوں اور کیڑوں کی مست خراش کے نظارے دیکھنے کے شوق میں اپنے مقامی میزبانوں کے ساتھ مسم جوئی پر نکل پڑتے ہیں اور پھر سمندر کے پھیرے ہوئے پانیوں میں بھی پادوں تر کر لیتے ہیں۔ اسی وجہ سے ٹول ٹیکس پوسٹ کے دو نفری عملے نے قدرے حیرت کے ساتھ پیسے وصول کر کے دونوں گاڑیوں کو ٹیکس ٹوکن دیے اور ہمارا دیرانے کا سفر شروع ہو گیا۔

طویل مسافت طے کرنے کے بعد جب رات کے لامتناہی سناٹے میں سمندر کی سرکش موجوں کا دھیمہ دھیمہ شور سنائی دینے لگا تو اندھیرے میں دور تک پھیلی ہوئی، ہیڈ لیمپس کی روشنی میں، کہیں کہیں ہٹس کے آثار بھی نظر آنے لگے۔ پھر اسی انکاس میں سڑک کے کنارے ایک خستہ حال ٹرک کا ہیولا بھی نظر آیا جو ایک ہی جگہ ٹھہرا ہوا تھا۔ ٹرک نظر آتے ہی مجھے اپنے سر پر سے ایک بڑا بوجھ اترتا ہوا محسوس ہوا۔

دونوں گاڑیوں کی رفتار خاصی تیز تھی لیکن اس وقت ہم ٹرک سے خاصی دور تھے کہ اچانک ٹرک کے سامنے سے دھولیں کا ایک مرفول خارج ہوا، اس کی عقبی بتیاں روشن ہوئیں اور ٹرک آگے بڑھنے کے ساتھ حرکت میں آتا ہوا نظر آیا۔ شاید وہ لوگ اپنی ذات کو ہر رنگ و شے سے بالا تر رکھنے کے لیے، ہر گاڑی کی آمد پر اسی طرح ٹرک اشارت کر کے پیش قدمی کر رہے تھے اور شاید کالی شیراؤں نظر نہ آنے پر دوبارہ رک کر انجن بند کر لیتے تھے۔

آٹا ٹائٹ میں، میں کچے سے رنگ کر سڑک پر آتے ہوئے نصف باڈی والے ٹرک سے آگے نکل گیا۔ اندھیرے اور تیز رفتاری کی وجہ سے میں ٹرک کے کیبن کا جائزہ نہیں لے سکا لیکن آگے نکل جانے کے بعد، میں نے عقب نما آئینے میں دیکھا کہ میری کار دیکھتے ہی، ان لوگوں کے ٹرک نے رفتار پکڑ لی تھی۔

چند ہی منٹ بعد ہم ساحل کے متوازی بنی ہوئی سڑک پر آگئے جہاں داہنے ہاتھ پر شورزدہ ویرانہ پھیلا ہوا تھا اور بائیں طرف ہٹس کی قطار سے آگے سمندر کا کنارہ تھا۔

کاروں کے مقابلے میں ٹرک کی رفتار بہت زیادہ سست نہیں تھی۔ خاک دھول میں اٹا ہوا ہونے کی وجہ سے وہ خستہ حال ضرور نظر آیا تھا لیکن میری گاڑی سے اس کا فاصلہ بتا رہا تھا کہ ٹرک کا انجن بہت مضبوط اور جان دار تھا۔ جس کے سارے وہ گھنٹوں ہمارا کامیاب تعاقب کر سکتے تھے۔

لیکن وہ سلسلہ زیادہ دیر تک جاری نہیں رہا۔ اچانک شری مان سنگھ کی کار کی رفتار کم ہوئی اور وہ بائیں طرف ایک پختہ راستے پر مگھوم گئی جو ایک وسیع دو منزلہ ہٹ کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے

دیر سے یاد رکھتی ہے۔ آج کل محکمہ تجارت کا ایک محکمہ افسر ہم پر مہمان ہو رہا ہے۔ ہمیں اس کی صورت اور بیار عادتوں سے چہ ہے ہم اسے دھمکاتے ہیں تو وہ بڑھا سمجھتا ہے کہ ہم خیرے دکھا رہے ہیں۔ ہماری ناز برداری میں اس نے آج کل حاکم کی قبر پر لات ماری ہوئی ہے۔ اسی سے نکالے ہوئے مال سے ہم نے یہ گاڑی خریدی ہے۔

”بہت شاندار ہے، بالکل تمہاری طرح!“ شری مان سمجھنے لگا۔

”بالکل نہیں!“ اس نے اپنے بڑے بڑے دیکھ کر کہا۔

”نئی ہوئی تو ہماری طرح ہوئی۔ یہ دو سال پرانا ماڈل ہے۔“

”دو کیا“ مرشد بڑے دو سال تک چلنے کے بعد بھی نئی رہتی ہے۔“ شری مان سمجھنے لگا اس کا بازو دباتے ہوئے کہا ”لیکن میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اس سرکاری افسر کے پاس اتنا پیسہ کہاں سے آ رہا ہے جو وہ تم پر ایک خزانہ لٹائے جا رہا ہے۔ یہ گاڑی اٹھارہ بیس لاکھ سے کم کیا ہوگی؟“

”ہمارے نصیب سے اسے مل رہا ہے۔ کوئی نہ کوئی دے ہی جاتا ہو گا۔ ہمیں آم کھانے سے مطلب ہے، بیڑمکن کرنا وقت کیوں خراب کریں؟ اپنی فیاضیوں کی وجہ سے اب وہ ہمیں کبھی بھی اچھا لگنے لگا ہے۔“

”مفتگو کا وہ سلسلہ وہیں رک گیا کیونکہ ایک کمرے سے گزر کر ہم تینوں آراستہ ڈرائنگ روم میں داخل ہو چکے تھے جہاں ایک جوڑا پہلے سے موجود تھا۔ فضا میں پرانی اسکاچ کی بو پچی ہوئی تھی اور فضا میں دھوئیں کے مرغولے چکرا رہے تھے۔ ان دونوں کے سامنے میز پر سوڈے کی کھلی ہوئی بوتلیں اور بھرے ہوئے گلاس موجود تھے۔ اسکاچ کی بوتل عورت کے قدموں میں“ قالین پر رکھی ہوئی تھی۔

اس وقت تک میں ان دونوں کے پیچھے چل رہا تھا۔ اندر پہنچنے کے بعد شری مان سمجھ دوسرے مودے لٹنے کے لیے چڑھتا ہوا انداز میں آگے بڑھا تو میں پیش قدمی کر کے سرے بالوں والی کے برابر میں پہنچ گیا۔

”ارے“ معاف کرنا!“ اس نے معذرت خواہانہ انداز میں فوراً ہی اپنا داہنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا ”باتوں میں ہم تمہیں تو بھول ہی گئے تھے۔ ہاؤ ریلی“ اتنی دیر ہو گئی اور ہم نے اپنا تعارف تک نہیں کرایا۔ ہمیں لگتی کہتے ہیں۔ شی از پاور“ اور اس کا ساتھی روئی ہے۔“

”سارے رنگ نیم ہی چل رہے ہیں تو میں ڈینی ہوں۔“ میں نے گرجو شری کے ساتھ اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

”لیکن کھٹکھٹا کر بنس پڑی اور مجھے پون محسوس ہوا جیسے کسی الٹریکٹ کے ہاتھوں سے چاندی کے ٹھنڈے سنگلاخ زمین پر گر کر کرنج اٹھے ہوں۔ اس کی ہنسی بہت مترنم اور دل آویز تھی۔ وہ ہنسی تو اس

دنیاستعمال کرنے کی پھوٹ دے دیتے تھے۔ کوئی پانی مٹی زیادہ گرم کرنے کی توفیق رکھتی ہو تو اسے غیر آباد مٹی کے کمروں اور گرم پانی سے بھی فیضیاب ہونے کا موقع مل جاتا تھا۔

”اچھا“ آنکھوں میں کوندنے والی مخصوص چمک اور لب و لہجے کی مرمری سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ بیگانہ کے عالم میں تھا۔ معلوم تھا کہ سوڈے کے کرسٹ بلاوجہ ٹھنڈے نہیں کرائے جاتے تھے۔ اس کا میل لال پری سے ہی ملتا تھا۔ ویران ساحل پر ٹرپ بنے والوں کے ساتھ مٹی لوگ بھی ہوں تو ان راتوں کا دنیا اچھا تو نہ جانے کتنی راتوں تک سونے نہ دیتا ہو گا اور وہ موسم کی یاد دہانی کے بغیر جولا نی کے ان ہی لمحوں کے انتظار میں وہاں رات گزارنے پر آمادہ تھا۔

”شری مان سمجھ کولانے والا ڈرائیور“ احمد کے پاس ہی رک گیا۔ میں نے شری مان سمجھ کے ساتھ برآمدے کی دوسری سیڑھی پر قدم رکھا تھا کہ ہٹ کا دروازہ کھلا اور میری آنکھوں کے سامنے بات سی کوند گئی۔

”اُس نے بے کے ساحل پر رات گزارنے کا ذکر کرتے ہوئے شری مان سمجھ نے خاصی رنگ آمیزی سے کام لیا تھا اور میں اس طالع نے بے برگ و بار فضا سے واقف ہوتے ہوئے بھی خاموش رہا تھا لیکن اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ شری مان سمجھ نے وہاں اپنا بل سلاتے کا ہر سامان جمع کیا ہوا تھا۔

”کچھ ہوئے دروازے میں سے دھبے اور مدھر سروں میں کسی خفیہ کی ریلی آواز آرہی تھی۔ شاید اندر غزلوں کا کوئی کیسٹ چل رہا تھا اور رنگے ہوئے سرے بالوں والی ایک سراپا غزل دروازے پر کھڑی تھی خوش آمدید کہہ رہی تھی۔ وہ کسی بھی معیار اور انداز سے حسین کے جانے کے قابل نہیں تھی۔ خود خال و اجابی سے نئے فوٹ نڈا کت سے عاری مگر آنکھیں چمک سے بھر پور تھیں۔ لیکن اس نے اپنے بھرے بھرے بدن پر ایسا چست اور خوش رنگ لباس پہنا ہوا تھا کہ نگاہیں اس کے بدن کے ارمان انگیز نشیب و فراز میں الجھ کر حسن کی ہر رو اپنی تعریف کو بھول جاتی تھیں۔ اس نے اپنے شہابی رنگ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بہت جگہ میک اپ کا سارا لیا ہوا تھا۔ اس پر ترشے ہوئے سنہری بالوں نے اسے بے حد جاذب نظر بنا دیا تھا۔

”کویا ر شری!“ اس نے بڑھ کر شری مان سمجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے بے تکلفی سے کہا ”تمہاری بس کی ادا ہمیں مار دیتی ہے کہ تمہیں وقت کا دھیان رکھتے ہو لیکن یہ دیکھ لو کہ آج بھی ہم تم سے پہنچے ہوئے ہیں۔“

”بارک ہو۔۔۔ یہ مرشد بڑے خریدی تم نے؟“ شری مان سمجھنے لگا اس کے ساتھ اندر داخل ہوتے ہوئے پوچھا ”معلوم ہوتا ہے کہ آج کل بہت اونچی اڑ رہی ہو۔“

”یار“ ہماری سوچ تو ہمیشہ ہی اونچی رہی ہے۔ بس قسمت ذرا

کتی تھی۔

اس پوری بھیڑ میں شری مان سنگھ اور اس کے ڈرائیور علاوہ مجھے کوئی ایسا فرد نظر نہیں آیا تھا جس کی وجہ سے مجھے ایسا سلامتی کو کوئی خطرہ محسوس ہوتا۔

بلقی راجسٹری پر ایک رکتین مزاج اور دل پیچیدہ لڑکی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ پیشہ ور کال گرل ہی رہی ہو۔ اسی طرح ہندو مردوں سے آزادانہ دوستی اور میل جول کی عادی نظر آتی تھی اور شاید رومی کی گرل فرینڈ بھی تھی کیونکہ ہماری آمد پر وہ دونوں انداز ہی رازدناز میں مصروف رہے تھے۔ بلقی، شری مان سنگھ کی پٹنہ ہو سکتی تھی۔ ان سب میں ایک قدر مشترک یہ تھی کہ ان کے ہم ہندوانہ تھے۔ لیکن اس موقع پر ان کی یکجائی نے مجھے الجھن میں ڈال دیا تھا۔

اس وقت تک کہیں بھی خطرے کی کوئی علامت نہیں تھی اور بظاہر وہ خوش باش اور بے فکرے لوگوں کی محفل ٹاڈووشی معلوم ہو رہی تھی۔ جہاں میں وہ جوڑوں کے درمیان چمکنے لگا تھا میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ شری مان سنگھ مجھے وہاں کیوں بلایا تھا اور مجھ سے کیا چاہتا تھا۔

اسی اثنا میں شری مان سنگھ کا ڈرائیور ایک وزنی بائک لے آیا جس میں سے اٹھنے والی ملی جلی اشتہا انگیز خوشبوؤں میں مجھے ہوئے گوشت کی خوشبو سب سے زیادہ نمایاں تھی۔

اسکاج کے گلاس تیار کرنے کے بعد بلقی، شری مان سنگھ کے بجائے نہایت بے تکلفانہ انداز میں میرے قریب آکر بیٹھی وہی بو کھلا گیا۔

”ہم کیسے اور بیٹھ جائیں؟“ مجھے اپنے وجود میں مستحکم کرنا بلقی نے معصومانہ انداز میں پلکیں جھپکاتے ہوئے مجھ سے سوال کیا۔ ”تم مجھ سے آرام سے لگ رہے ہو۔“

”نہیں.... تم شوق سے بیٹھ بیٹھو۔ یہ تو میری خوش بختی ہے کہ تم کو پورے کمرے میں یہی جگہ پسند آئی۔ بس مجھے شری کے اکیلے پن کا خیال آگیا تھا۔“ بو کھلا ہٹ کے ابتدائی حملے کے بعد میں نے فوراً ہی خود کو نبھال لیا۔

”ایک تو تم خود اچھے ہو پھر تمہارا نام اتنا اچھا ہے۔ ڈیڑھ گھنٹے ہوئے ایسا لگتا ہے جیسے کوئی گینڈے کا سرو توڑنے والا آگیا ہو۔“ شری نے تو آج میں تم ہی سے ملوانے کے لیے بلایا ہے۔ دیے تم نے کیا ہو؟“

”گینڈوں کے سرو توڑتا ہوں۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا اور ”کمرہ قبضوں سے گونج اٹھا۔“

رادھ اور کرباؤں اور خوش گہوں میں دقت دھمکے دھمکے گزرتا رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ بلقی بے تکلفانہ چمچ چھاڑ کر کے بے اعصاب پر حاوی ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ ساتھ ہی اس کی کوشش بھی تھی کہ میرے معدے میں شراب کی مقدار بڑھ جائے۔

کے بھرے بھرے، شامی رخساروں پر دونوں طرف گمرے کڑے پڑ گئے جنہوں نے اس کی کشش میں اور اضافہ کر دیا۔

”خوش ذوق معلوم ہوتے ہو۔“ وہ میرے ساتھ صوفوں کی طرف بڑھتے ہوئے بولی ”پڑھ لکھے اور شائستہ لوگوں سے مل کر ہمیں بہت خوشی ہوتی ہے۔ تم اسڑانگ لیتے ہو یا لائٹ؟“ میں نے گھور کر اس کی طرف دیکھا پھر اسٹگی سے کہا ”نیٹ!“

”ہاؤ سوٹ!“ وہ خوشی سے اچھل پڑی ”ہم بھی نیٹ ہی پیتے ہیں۔ شراب جب تک بھل ہوئی آگ کی طرح حلق اور چھاتی کو نہ جلائے، مزہ نہیں دیتی لیکن شری کہتا ہے کہ خالص شراب عمر آدمی کو دیتی ہے۔“

”تمہیں قدرت نے اتنا حسین بنایا ہے کہ تمہاری عمر تو بیش آدمی ہی رہے گی۔ سو برس کی ہو کر بھی پچاس کی نظر آو گی۔ پھر اس پر ہیز سے فائدہ؟“ میں نے اسے خوش کرنے اور ماحول میں گھل مل جانے کی نیت سے کہا اور وہ بے تحاشا خوش ہو گئی۔ ایسی بھرپور اور انوکھی تعریف شاید اس نے پہلی بار سنی تھی۔

میں نے کن انکھیوں سے دیکھا کہ دونوں میں سے کسی مرد نے میرے بے تکلفانہ تبصرے پر منہ نہیں بنایا تھا۔ میں پامو اور رومی سے ہاتھ ملا کر صوفے پر بیٹھ گیا اور بلقی ہمارے لیے گلاس بنانے لگی۔

اس ملاقات کے بارے میں شروع ہی سے میرے ذہن میں خدشات موجود تھے اس لیے میں ہر لمحے بہت ہوشیار اور چوکنا رہا تھا۔ باہر گاڑی کے بیڈ کیس بند کرنے سے پہلے میں نے دیکھ لیا تھا کہ وہاں احمد کے علاوہ اور کوئی ذی روح موجود نہیں تھا یا کم از کم نظر نہیں آتا تھا۔ اس کے بعد بلقی سامنے آئی تو اس کی شخصیت بہت بے ضرر بلکہ ریلی نظر آئی۔ اس کی گفتگو کا انداز منفرد تھا، وہ تعلیم یافتہ بھی نظر آتی تھی اور اگر اس نے مرشد بڑے حوالے سے اپنے کسی کھوسٹ عاشق کا ذکر نہ کیا ہوتا تو میں یہی سمجھتا کہ وہ کسی مال دار گھرانے کی بگڑی ہوئی لڑکی ہے کیونکہ اُن دونوں شر کے متحمل خاندانوں کی لڑکیوں اور عورتوں میں بے پائکانہ انداز میں گفتگو کرنے کا رواج روز بروز ترقی پزیر تھا بلکہ بعض فیشن زدہ لڑکیاں تو خود کو ترقی پسند ظاہر کرنے کے لیے گفتگو میں چھوٹی موٹی کالیوں کا استعمال بھی ضروری سمجھنے لگی تھیں۔

پامو نازک اندام اور قدرے سنجیدہ لڑکی تھی۔ وہ جینز اور جیکٹ میں لمبوس تھی اور یوں سوچ سوچ کر اسکاج کے گھونٹ لے رہی تھی جیسے اس کا ذہن کسی فلسفیانہ مسئلے میں الجھا ہوا تھا۔ اس سے کسی مار دھاڑ یا ہنگامہ آرائی کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی اور یہی حال رومی کا تھا۔ وہ کسرتی بدن کا مالک ضرور تھا لیکن اس کے شرے سے ایسی پیدائش بے پروائی اور خوش حالی کا اظہار ہو رہا تھا جو تیسرے درجے کے غنڈوں جیسی لڑائی بھڑائی کی متحمل ہو ہی نہیں

خواہش پوری شدت سے بیدار ہوئی تھی کہ اس کے نرم و گداز سراپا سے ہم نشینی کا کچھ نہ کچھ خراج وصول کیا جائے لیکن اس وقت تک میں نیٹ و سکی پینے کے باوجود فرزا کی کا مظاہرہ کر رہا تھا اس لیے کسی بھی عامیانہ حرکت سے گریز کرتا رہا لیکن نئے میں آنے کی اداکاری شروع کرتے ہی 'میں قدرے بے راہ ہدی کا مظاہرہ کر سکتا تھا۔ اس لیے میں نے اپنے لیے کو بوجھل اور قدرے لگت آمیز بناتے ہوئے مدافعت طرز عمل کو اختیار کر دیا۔

جارحانہ دھڑکتے زیر اثر کی جانے والی ابتدائی چیمبر عمارت کو رلی نے خوشگوار حیرت کے ساتھ قبول کر لیا۔ اس کے نزدیک وہ اس کی کامیابی تھی کہ اس کا جادو میرے سرچرہ پر رول رہا تھا۔

میں ایک مدت دراز سے شراب نوشی کی قبیح عادت میں جلا تھا لیکن شراب پی کر کبھی بھی اپنے آپ سے باہر نہیں ہوا تھا۔ اس کے برعکس 'میں نے بارہا شائستہ لوگوں کو ندیدے پن کے مظاہرے کے نتیجے میں کھوپڑی سے باہر ہوتے دیکھا تھا اور اچھی طرح جانتا تھا کہ خمار میں پڑھونے کے بعد آدمی کیا کچھ کرنے لگتا ہے۔

آنکھوں میں خمار لانے کے لیے مجھے کسی اداکاری کی ضرورت نہیں تھی 'میں جتنی پی چکا تھا وہی آنکھیں لال کرنے کے لیے کافی تھی البتہ لب و لہجے میں ہلے ہوئے شرابی والی ہلکا ہٹ 'خند اور سکرام میں بتدریج اضافہ کرتے ہوئے 'جب میں نے لٹی کو ذرا زیادہ پریشان کرنا شروع کیا تو اس نے بے بسی کے ساتھ استفسار طلب لگا ہوں سے شری مان عکھ کی طرف دیکھا اور اس نے اپنے سر کی خفیف سی جنبش سے رلی کو وہ سب سننے کا اشارہ دے دیا۔

"تم ہمیں تھکا رہے ہو۔" لٹی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر میرے کان کے نیچے سرگوشی کی۔ اس کے منگتے ہوئے وجود کے لمس اور چہرے سے نکراتے ہوئے گرم سانسوں نے میرا ذہن بو جھل کر دیا۔

"ہم کہاں بھاگے جا رہے ہیں۔ رات اپنی ہے 'یہ آرام وہ ہٹ اپنا ہے۔ پھر تم اتنے بے مبرکیوں ہوئے جا رہے ہو؟" وہ اسی سرگوشیانہ لہجے میں کہہ رہی تھی "اور کچھ نہیں تو ذرا رادی اور شکر ہی کی شرم کرو۔"

"شرم تم کو مگر نہیں آتی۔" میں نے فضا میں ہاتھ لہرا کر ہانک لگائی "جس نے کی شرم 'اس کے پھوٹے گرم 'اب کو تو یہی خیال مالکوس میں سناؤں۔"

"بس 'بس اب تھوڑی دیر چپ رہو۔" اس نے میرے رخسار کو تھپتھپاتے ہوئے کہا "دیکھو 'غور سے سنو! کیسٹ پر چڑا کتنی خوب صورت غزل گاری ہے۔" اس کے انداز میں یک یک بے پروائی آگئی تھی۔

"وہ اپنے مزے کے بل پر گاتی ہے۔" میں نے کھینچ کھینچ کر کہا "جس دن بک جیت سکے نے اسے چھوڑ دیا 'وہ کاٹا بھانا بھول جائے

پھر اچانک ہی میرے ذہن میں ایک چھٹا کا ہوا۔ شراب اور

شری مان عکھ نے یہ دیکھ لیا تھا کہ میں نے اس کے بھرے کو نیٹ میں اپنی جان کی پروا کیے بغیر اس کے محافظوں کو غیر مسلح کر کے ان لوگوں کو زیر غلام بنالیا تھا۔ پھر سناج کی فکر کیے بغیر 'پوری بے فنی کے ساتھ وہ ہتھیار انیس 'لوٹا بھی دیے تھے۔ اس وقت بے دل و دماغ کی جو کیفیت تھی وہ میں ہی جانتا تھا لیکن شری مان عکھ کے نقطہ نظر سے وہ میری بے بکری اور دلیری کا ایک شاندار مظاہرہ تھا۔

اس تجربے کی بنا پر شاید شری مان عکھ نے یہ رائے قائم کر لی تھی کہ وہ محض طاقت کے بل پر مجھے جھکانے میں کامیاب نہیں ہو سکے گا اس لیے اُس نے ان دونوں ہتھیاروں کو بیک وقت اُڑانے کا فیصلہ کر لیا جو دنیا کے کسی بھی مرد کو زیر کرنے کے لیے نند کا درجہ رکھتے ہیں۔

اس وقت تک اس نے مجھ سے کام کی کوئی بات نہیں کی تھی۔ دوسری طرف 'بلی 'اس کے ایما پر مجھے نہ صرف تیزی سے ٹرپ پلائے جاری تھی بلکہ اپنی شوخ آوازیں سے مجھے مشتعل کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھی۔ دوسری طرف مجھے ترغیب و تحویل لانے کے لیے رومی خاصی نازبا صورت میں پادو کے ساتھ ڈرا بیٹھا تھا اور شری مان عکھ کسی تجربے کا گمگدہ کی طرح 'الگ بیٹھا چور نظروں سے لٹی کی کارکردگی کا جائزہ لے رہا تھا۔

شری مان عکھ کی اس غلیظ حکمت عملی کا ادراک ہوتے ہی میں اس لیے کو کوٹنے لگا جب میں نے لٹی کو چڑانے کی نیت سے نیٹ اسکاچ پینے کی فرمائش کی تھی۔

اس وقت صورت حال یہ تھی کہ لٹی نے پہلے گھاس کے بعد اسکاچ کی ایک بوند بھی نہیں لی تھی۔ وہ جتنی جتنی تھی گھاس میں صرف سوڈا ڈال کر اسی کو پورا کرتی تھی جب کہ مجھے وہ ہیرا فاصل اسکاچ دیے جاری تھی۔

مجھے اپنی حد کا بخوبی اندازہ تھا لیکن اس نازک مرحلے پر میں ڈال دیاؤ کے ساتھ ساتھ جسمانی جود سے بھی چپتا چاہ رہا تھا اس لیے نیٹ و سکی کے تین لارج میگ بخیر و خوبی ہضم کر لینے کے بعد مجھے نے فوری طور پر نئے میں آجانے کی اداکاری شروع کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

ان حالات میں میرے لیے وہی ایک طریقہ رہ گیا تھا جس پر لٹی کے کسی بھی شری مان عکھ کو کھل کر سامنے آنے پر آمادہ یا مجبور کر سکتا تھا۔

مجھے اس حقیقت کا اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں کہ لٹی کے ایک ایک منصف مخالف کے لیے بے پناہ مقناطیسی کشش تھی۔ اس کے ساتھ بیٹھے بیٹھے کسی بار میرے دل میں یہ

میں نے شکست لے لی تھی۔ میں نے کئی بار اس شروع کر دی۔ جو کہ میرے منہ میں آ رہا تھا، وہ منہ کے جا رہا تھا اور عجیب بات یہ تھی کہ ابھی ان حرکتوں سے مجھے ایک عجیب سا ذہنی سکون بھی مل رہا تھا۔ بغیر سوچے سمجھے بولنے کی آزادی نے شاید میرے ذہن کی کچھ تمام گہری باتیں نکال دی تھیں۔

”یار! اب کیا کر رہے ہو؟“ قلبیہ میرے دہانے پر ہاتھ رکھ کر شری مان شکم سے کہا ”بہی اور پامو کو باہر بھیج دو۔ یہ بھی چاندنی رات میں ساحل پر چل قدی کا مزمز لے لیں گے۔ یہ ایک بار نٹنے میں بے صبر ہو کر سو گیا تو پھر صبح کی خبر لائے گا۔ اب اس سے نمٹ ہی لیتا جاؤ۔“

”ہم جارہے ہیں ڈارنگ!“ دوی نے جو حملہ کواڑ میں لگا
 ”پامو خود کھلی ہو میں نکلے کے لیے بے چین ہے۔ تم یہاں پیش
 کرو۔ آئی وٹس ہو گئے نام انڈل!“
 وہ باؤ کی سر میں ہاتھ ڈال کر اسے اسی طرف لیتا چلا گیا بعد م
 سے ہم ڈارنگ دوم میں داخل ہوئے تھے۔

شرعی ان سگھ نے اپنی جگہ پر جا کر میز سے گلاس اٹھا اور ایک لمبی چسکی لینے کے بعد گلاس سمیت ہماری ہی طرف آکر اس وقت اس کی آنکھوں میں شیطانی چمک پیدا ہو چکی تھی۔
میرے برابر میں آجینا اور رتی اٹھ کر ہٹ کے اندرونی حصے کی طرف چل دی۔

”کسو‘ یہ لڑکی کیسے ہے؟“ لالہ کے چلے جانے کے بعد شری مان سنگھ نے میرے قریب کھٹک کر پوچھا۔

”یہ آج رات مجھے تڑپا کر مار دے گی۔“ میں نے غمناک آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے لڑکھائی ہوئی آواز میں کہا۔
 ”ایسی جنگ لڑنا بہت مدت بعد دیکھی ہے۔ تو میرے ہوش خواں رہ جائیگی۔“

لیکن میں نے یکے بعد دیگرے دو ہچکیاں لے کر ایک مرتبہ بھرا ہوا صوفے کی پشت گاہ مرزا لیا۔

شری مان سنگھ نے میرے اوسان بحال کرانے کے لیے پہلے ہوئے ہوئے پھر زور زور سے میرے دونوں رخساروں پر تھپکھپکاتے ہوئے مجھے پکارا لیکن میں بس غوٹ غاٹ کر کے رہ گیا۔ اس کی کوششوں میں آنے والی شدت جب تاکاری کی سرحدوں میں داخل ہونے لگی تو میں نے ذہنی الجھنے کا سلسلہ شروع کیا۔ کبھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر منہ چلانے لگتا اور کبھی پوری طرح غفلت ہو جاتا۔ اس دوران میں لڑکھائے ہوئے تھے اور نوٹے پھوٹے فقروں میں مہمل تقریر کے ساتھ اڑکاڑ کا ذہنی فقروں کا سلسلہ جاری رہا اور جب بالی ایک گلاس کے ساتھ دوبارہ نمودار ہوئی تو شری مان سنگھ کے ممبر کا پٹا نہ لبرز ہو چکا تھا۔ اس نے بالی کے مہوسہ وہ گلاس زبردستی میرے منہ سے لگایا اور لمبوں کا بست زناہ

گی۔۔۔" میں نے رک کر دو تین ہچکیاں لیں اور اپنا سر صوفے کی پشت گاہ سے نکا کر بات وہیں ادھوری چھوڑ دی۔

میں نے ادھ نعلی آنکھوں سے دیکھا کہ شری مان سنگھ میری حالت دیکھ کر پسندیدگی کے انداز میں سر ہلا رہا تھا۔ پھر وہ اپنی جگہ چھوڑ کر بڑی اور پاؤں کے پاس پہنچ گیا۔

میں نے اچانک آنکھیں کھول دیں اور ایک جھٹکے کے ساتھ جھوم کر میز پر سے سگٹ کا پیکٹ اٹھایا۔ اسی بہت غور سے میرا جائزہ لے رہی تھی اور اس کے چہرے پر شوخی کی جگہ سنجیدگی نے لے لی تھی۔

میں نے سرکٹ نکال کر ادانت فلٹر کے بجائے تھکوا والا سرا ہونٹوں میں دبایا۔ دیا سلائی سلگانی چابی تو وہ اڑ کر گرفت سے نکل گئی۔ تیسری دیا سلائی بدقت تمام روشن ہوئی تو فلٹر نے آگ پکڑنے سے انکار کر دیا۔ دیا سلائی ختم ہونے لگی تو میں نے اسے یوں ہی قالین پر پھینک دیا۔

ملنے کو کھلا کر اپنے سینڈل کے تلے سے وہ دیا سلائی بچھادی اور میرے دہانے سے سرگرمی اگ کرتے ہوئے بیزواکی "اب تم کام سے گئے، ہمیں کچے شریوں سے چڑھوتی ہے۔ ہواشت نہیں کرکتے تو اتنی پچے کیوں ہو؟ اب تمہیں الٹی اور سیدھی سرگرمی کی بھی تیز نہیں رہی۔"

”الٹی!“ میں نے دیر سے پھاڑ کر حیرت سے دہرایا ”تو تم ہی ایک سگریٹ سلاکو۔ تمہارے ہونٹوں سے تو وہ ویسے ہی جل اٹھے گی۔ کیا خوب ہوٹ پائے ہیں تم نے! اسر یا قوت کے ڈلے۔۔۔!“ وہ ہنس پڑی ”چڑھ چکی ہے پھر بھی ہمیں بنانے سے باز نہیں آتے۔ معلوم ہو تا ہے کہ جنوٹ اور شاعری سارے ہی مردوں کی گھنٹی میں بڑی ہوئی ہوئی ہے۔“

پھر وہ کھڑے کھڑے میرے لیے سگریٹ سلکانے لگی۔ اس کے ہاتھ سے سگریٹ لیتے ہوئے، میں نے اسے کھینچ کر صوفے پر ہی گرالیا اور وہ ارے ارے کرتی ہوئی ڈھیر ہو گئی۔

لڑکی ہلکی سی اضطرابی آواز پر شرمیلی ہان سگھ چوٹ کر ہماری طرف متوجہ ہو گیا۔ اس وقت تک وہ روی اور روپکے ساتھ بہت دھیمی آواز میں باتیں کرتا رہا تھا۔

”ہوشیار رہنا“ اس نے میری موجودگی کو گویا نظر انداز کرتے ہوئے لٹی سے کہا ”یہ اب خطرناک ہوتا جا رہا ہے۔ میں چند منٹ میں اس کا بندوبست کرتا ہوں۔“

”ہمیں یہ اچھا لگ رہا ہے۔“ لانی ہنستے ہوئے کہا ”بہن کے بعد تو سارے کا روپ کچھ اور نکھر آیا ہے۔“

”ہائے!“ میں اپنے سینے پر ہاتھ مار کر کہا ”کیا بات ہے کہ اب عورتوں کے بھی سالے ہونے لگے ہیں۔ سالے،‘ باہ سالے،‘ جیسے کرا رہے۔“

کے ساتھ کسل مندی کا اظہار کرتے ہوئے رفتہ رفتہ آنکھیں کھل دیں۔

اس وقت بالی کافسوں خیز چہرہ میرے اوپر جھکا ہوا تھا۔ مجھے لگاں چار ہوتے ہی وہ مسکرا کر بولی ”شکر ہے کہ تم بوش میں آگئے۔ اب تم یہاں آرام کرو۔ میں ذرا کپڑے بدل کر آئی ہوں۔“ اس نے نرمی اور آنکھوں کے ساتھ میرا سر صوفے پر رکھا اور وہاں سے چلی گئی۔

میں چند ثانیوں تک دیہے پھاڑے اسی سمت میں دیکھتا رہا جدھر وہ گئی تھی، پھر کسی محروم و مظلوم شرابی کی طرح اس کے فراق میں بیڑا لے لگا۔ شری مان سنگھ نے مجھے سارا دے کر بٹھا دیا۔

”مجھے معلوم ہے کہ تم بہت محنتی اور ایماندار آدمی ہو۔“ شری مان سنگھ نے اپنی مکارانہ گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا ”اور

دعے کے مطابق میرے لیے کام کر رہے ہو۔ میں اپنے دوستوں اور ساتھیوں کی بہت قدر کرتا ہوں اور اس لیے میں نے آج یہ بندوبست کیا ہے تاکہ تم خود دیکھ لو کہ میں تمسارا دشمن نہیں دوست ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے اپنی اب تک کی کارکردگی کی رپورٹ دے دو۔“

میں اس دوران میں خالی اللہ بھئی کے عالم میں اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ جب وہ خاموش ہوا تو میں نے حسرت بھری آواز میں پوچھا ”کہاں چلی گئی؟“

مجھے سے شری مان سنگھ کے چہرے کے خدوخال تک جھکا کر دیکھے۔ مجھے اندازہ تھا کہ میرے اس غیر متعلق سوال پر اس کی ہڈیاں تک سلگ اٹھی ہوں گی مگر اس نے خود کو بے قابو نہیں ہونے دیا اور نرمی سے بولا ”وہ بھی آجائے گی۔ سب کچھ ہو جائے گا۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ ملا سرکار کہاں ہے؟“

اس وقت میں نے ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں سوچا اور فیصلہ کر لیا کہ اس مرحلے پر مجھے بات آگے بڑھانی چاہیے۔ اگر میں ہال مٹول سے کام لیتا رہتا ملا سرکار کی طرف سے اپنی نیکر علمی کا اظہار کرتا تو میری ذات میں شری مان سنگھ کی دلچسپی ختم ہو جاتی پھر وہ تشدد کی راہ اختیار کر سکتا تھا۔ اس بارے میں اسے ذرا سی بھی امید دلادی جاتی تو اس کا معاملہ نہ دیتے برقرار رہ سکتا تھا۔

”ملا سرکار... وہ سرگرمیوں میں چھپا ہوا ہے۔“ میں نے جب تک کر کہا ”کیٹیوں کے علاقے میں ان لوگوں نے جنگل کے نیچے زمین کھود کر اندر ہی اندر راستے بنائے ہوئے ہیں، جن میں کوئی گھسنے کی بہت نہیں کرتا۔ وہ ان ہی سرگرمیوں میں اپنے دوستوں کے ساتھ رہا ہے۔“

میرا وہ امید افزا جواب سن کر شری مان سنگھ کا چہرہ دم اٹھا

ترش شہرت میرے معدے میں اتار دیا کیونکہ بہت زیادہ نشے کا وہی ایک سوٹر توڑ تھا۔

”بس اب اسے اس کے حال پر چھوڑ دو!“ شری مان سنگھ کی آواز میرے کانوں میں آئی ”تھوڑی دیر بعد ہی اس قابل ہو سکے گا کہ ہم اس سے مذاکرات کر سکیں۔“

”یار، تم بھی کمال کے آدمی ہو۔“ وہ بالی کی آواز تھی ”دشمن سے ایسے پیٹھے سلوک کا تصور ہمارے لیے انوکھا ہے۔“

”یہ بہت ڈھیٹ اور حرامی ہے۔“ شری مان کی آواز غصیل ہو گئی ”خند پڑ جائے تو جان تک کی پروا نہیں کرتا۔ یہ اردو حاض سے راہ راست پر آنے والوں میں سے نہیں ہے۔ آج کل اپنی ماہ سے چھڑا ہوا ہے۔ تم سے ملنے کے بعد خاصا کھلنا ہوا نظر آنے لگا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ تمہارے لالچ میں میرے جال میں پھنس جائے۔“

”یار، شری! کچھ تو شرم کیا کرو۔ تم نے جو کچھ کہا ہم اس پر پورے خلوص سے عمل کر رہے ہیں لیکن تم نے یہ تو سوچا ہوا کہ ہم کوئی عام بازار ی عورت نہیں تمہاری دوست ہیں۔“

”مگر صرف میری دوست نہیں ہو۔ تمہاری فرست بھی خاصی لمبی ہے۔ مرشد کی کمائی تم سنا ہی چکی ہو۔ دل پھینک پڑے بہت گھاگ اور چالاک ہوتے ہیں۔ ان ہی عورتوں کو دانہ ڈالتے ہیں جن سے توقعات ہوتی ہیں۔ تمہاری شہرت سے واقف ہونے کے بعد ہی اس نے فیاضیوں کا سلسلہ شروع کیا ہو گا۔“

”تم یہ کام بارے بھی لے سکتے تھے۔“ بالی نے شکایت کی۔ ”ہیں ہی کیوں آگے بڑھایا؟“

”وہ حسین ضرور ہے مگر سوکھی سڑی لڑکیوں سے میں گھبراتا ہوں، پتا نہیں کب کس کی پسلیاں ٹوٹ جائیں۔ پھر آج کل مدی اس کے بارے میں سنجیدہ ہے۔ وہ اسے روک سکتا تھا۔“

”مدی کا باپ پاؤ جیسی بے نام و نشان لڑکی کو مر کر بھی اپنی بہو نہیں بنائے گا۔ یہ مولیٰ سی بات ان دونوں کی عقل میں نہیں آ رہی۔ جس دن مدی کا باپ ماؤں میں آکر اسے ہر چیز سے عاق کرے گا، اسی دن پاؤ اپنے کنگال محبوب کو چھوڑ کر پھر سے کسی کے ساتھ اڑ جائے گی۔“

”بس! اب چپ رہو۔ دیکھو شاید اسے ہوش آ رہا ہے۔ اسے صوفے پر کر کے اس کا سر اپنے زانو پر رکھ لو۔“ میرے بدن کی خفیف سی جنبش پر شری مان سنگھ کی اضطرابی آواز ابھری۔

میرا خیال ہے کہ اس فرمائش پر بالی نے اسے ملاحت آمیز نظروں سے گھورا ہو گا کیونکہ اس نے زبان سے ایک لفظ بھی کہے بغیر چند ثانیوں بعد شری مان سنگھ کی ہدایت کو عملی جامہ پہنا دیا۔

شری مان سنگھ کی دشمنی کا وہ انداز واقعی بہت لطیف اور سرور

ایکمز تھا لیکن میں اس سے زیادہ دیر تک لطف اندوز نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے تھوڑی دیر بعد میں نے غصہ اور بھکی ہوئی آوازدوں

بھول جاؤ گے۔ بس مجھے دو چار باتیں اور بتا دو پھر میں تمہیں رات کے ساتھ چھوڑ دوں گا۔“

”اب اور کیا جانا چاہتے ہو؟“ میں نے خواب ناک نظروں سے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

”ملا سرکار کے بارے میں تمہاری اطلاعات کے کیا ذرائع ہیں؟“ وہ ایک بیک بنجیہ ہو گیا۔

”چنانچہ میں تمہارے اس سوال کا جواب دینے کا پابند نہیں ہوں۔“ میں نے نشتے کی جھونک سے نکلنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا ”تمہیں معلومات درکار تھیں“ وہ میں نے تم کو مہیا کر دیں۔ اب تم کو اپنا وعدہ پورا کرنا ہے جس کی ٹو سے خزانہ کو جلد از جلد میری تحویل میں ہونا چاہیے۔“

رات نے پیچھے سے آکر میری کمر میں ہاتھ ڈال دیا اور بے تکلفی کے ساتھ بولی ”ہمارے ہوتے ہوئے تم کس کو یاد کر رہے ہو؟ یہ خزانہ کون ہے؟ ہم سے اچھی اور دلکش تو ہرگز نہیں ہوگی۔“

مجھے بولنے کا موقع دیے بغیر شری مان سنگھ نے بولنا شروع کر دیا ”تمہاری معلومات کے ذرائع میرے لیے بہت اہم ہیں کیونکہ میں ہر قیمت پر جلد از جلد ملا سرکار سے رابطہ کرنا چاہتا ہوں۔ جب تک وہ لوگ سامنے نہیں آئیں گے میں اپنے مشن میں کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں کر سکوں گا۔“

”تم بظاہر ایک سفارتکار ہو۔“ میں لمحہ بہ لمحہ نشتے کے اثرات سے آزاد ہونے کا تاثر دیتے ہوئے بولا ”لیکن تمہاری پراسرار دلچسپیوں سے یہ ظاہر ہے کہ تمہیں زیر زمین دنیا کے لوگوں اور ان کے طور طریقوں سے خاصی واقفیت حاصل ہے۔ اندرون سندھ سے بہت سے ایسے لوگ جو قانون کو مطلوب ہیں، کراچی آتے رہتے ہیں اور یہاں عیش و عشرت کے چند روز گزارنے کے بعد دوبارہ اپنی دنیا میں لوٹ جاتے ہیں۔ ان ہی میں سے کسی کے ذریعے یہ خبر مجھ تک پہنچی ہے۔“

”میں اس کا نام جانا چاہتا ہوں۔“ شری مان سنگھ نے افسردہ لہجے میں کہا۔

”نام جانا تمہارے لیے بے سود ہو گا کیونکہ وہ تمہاری دسترس سے باہر ہے۔“

”وہ میرا کام ہے اور پھر تم کس کام آؤ گے میں تمہارے روابط استعمال کر سکتا ہوں۔“

”تم نام بتا کر اس قصے کو ختم کر دو!“ رات نے بے پروایانہ انداز میں مجھے اکساتے ہوئے کہا ”ان خشک باتوں سے فارغ ہو کر ہمیں آرام بھی کرنا ہے یہ حسین رات ایسی خشک اور بے سرو پا باتوں میں برباد نہیں کی جاسکتی۔“

”رحیم بخش چاچا!“ میں نے کہا ”ملا سرکار کے بارے میں خبر کا ذریعہ وہی بنا تھا۔“

”اور اب وہ کہاں ہے؟“ شری مان سنگھ نے فوراً ہی اگلا

اور اس نے پہلے جیسی آواز میں پوچھا ”اس کے دوست کون ہیں؟ نہیں یہ خبر کس سے ملی ہے؟“

”مجھے نہیں معلوم کہ اس کے دوست کون ہیں۔ جن لوگوں کی میری رسائی ہے میں ان سے آگے کسی کو نہیں جانتا۔ مگر مگرہاں جلی گئی؟“ آخر میں میں نے پھر نپ کا مصرعہ جڑ دیا۔

”وہ! میں اسے ابھی بلاتا ہوں۔“ شری مان سنگھ نے منہ بنا کر اٹھا اور رات کو آواز دینے لگا۔

”لیکن تم نے خزانہ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔“ میں نے اس سے شکوہ کیا۔

”ایک ہی بات کو بار بار دہرانا حاصل ہے۔“ اس نے جواب دیا ”میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ وہ نئی دہلی میں ہے۔ میں اسے جلد از جلد یہاں بلائے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اس سے آگے میرے بس کی بات نہیں ہے۔ دیکھنا ہو گا کہ وہ کب تک واپس آتی ہے۔“

”اور وہ ہانگ کانگ والی لڑکی؟“ میں نے مخمور آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”چنانچہ تمہیں کون انٹی سپیڈ می خبریں پہنچاتا رہتا ہے۔“ وہ برا سامنے ہاتھ بولا ”میں پہلے ہی تمہیں بتا چکا ہوں کہ وہ خزانہ نہیں شگفتہ دیوی ہے۔۔۔۔۔“

اسی وقت رات نے جیسی ہوئی واپس آگئی۔ اس بار اس نے چست لباس کی جگہ ”ڈھیل ڈھال مردانہ شب خوالی کلباس پہنا ہوا تھا۔“

”یہ بار بار تمہیں یاد کر رہا ہے۔“ شری مان سنگھ نے اسے آنکھ مار کر کہا ”تھوڑی دیر کے لیے اسی کے پاس بیٹھی رہو تاکہ یہ تسلی سے میری باتوں کا جواب دے سکے۔“

رات نے ہلکے سے قریب آگئی اور بولی ”ہمیں کیوں یاد کر رہے ہو؟“

اس نے تک میں اس کھیل میں دلچسپی لے رہا تھا لیکن رات کے آخری سوال میں کچھ ایسا بازاری انداز پنہاں تھا کہ مجھ پر ایک بیک الٹاٹ حملہ کر دیا اور میں اپنی جگہ چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

”کیا بات ہے؟ اُنھ کیوں گئے؟ ہمارے پاس ہی بیٹھے رہو نا!“

رات نے اٹھا کر کہا۔

”رات خاصی ہو گئی ہے، اب مجھے چلنا چاہیے۔“ میں نے شری مان سنگھ سے بوجھل لہجے میں کہا۔

”اب کہاں جاؤ گے؟“ اس نے حیرت سے کہا ”تمہاری بات اس قابل نہیں ہے کہ گاڑی چلا سکے۔ حالت سنبھلے گی تو نکل پلے۔ اس وقت کسی کھڈیا تالے میں جا کر دو گے۔“

”میں“ مازہ ہوا لگے گی تو میں خود بخود ٹھیک ہو جاؤں گا۔“ میں نے کہا ”تمہارے لیون نے خاصا کام دکھایا ہے۔“

شری مان سنگھ اپنی جگہ چھوڑ کر اچانک میرے سامنے اٹھیا اور

سوال چڑیا۔

ہوں۔

رجیم بخش چاچا کا کوئی وجود ہو تو ہو لیکن اس وقت وہ میرے ذہن کی اختراع تھی اس لیے میں نے بے پروائی سے کہا "کیس بھی ہو سکتا ہے کیونکہ میری اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔"

"جس کسی نے تمہیں خبر دی اس کا نام پتا کیا ہے؟" شری مان

عکھ نے پوچھا۔

"اب تم پولیس والوں کی طرح جرح کر رہے ہو۔" میں نے چڑ کر کہا "میں نے یہ معلومات چلنے پھرتے جمع کی ہیں۔ اتنی تفصیل مجھے یاد نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس ملاقات کا مقصد پورا ہو گیا ہے اور اب مجھے چلنا چاہیے۔"

میں نے فیصلہ کن انداز میں نکاسی کے راستے کی طرف قدم بڑھائے ہی تھے کہ شری مان عکھ تیزی کے ساتھ اگلے قدموں پیچھے ہٹا اور اس نے پھرتی کے ساتھ اپنی جب سے ایک ننھا سا مٹینی پتول نکال لیا جس کا بیک سائیگرین اس کی ٹال سے زیادہ لمبا تھا۔

"سمان اپنی مرضی سے آتے ہیں اور میزان کی مرضی سے جاتے ہیں۔" اس نے پتول کی ٹال کو جنبش دے کر کہا "واپس صوفے پر بیٹھ جاؤ ورنہ میں بے دریغ فائر کر دوں گا۔"

میں نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں پلکیں جھپکاتے ہوئے اسے گھورا اور آنکھی سے کہا "میں تمہاری اس حرکت کا مقصد نہیں سمجھ سکا۔ اس طرح تم مجھ کو کس بات پر مجبور کرنا چاہتے ہو۔"

"تم شری کے بارے میں بہت کم جانتے ہو۔" بلی نے جارحانہ انداز میں میرے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا "یہ ملا سرکار تک پہنچنا چاہتا ہے تو ہمارا بیچہ کرے گا اور تم اس کی مدد یا رہنمائی کرو گے۔"

"نت... تو تم بھی اس کی ہم نوا ہو؟" میں نے حیرت کے ساتھ سوال کیا۔

"ہم جس کا کھاتے ہیں اسی کا گاتے ہیں۔" وہ استہزائیہ لہجے میں بولی "ہم نے جو کچھ کیا وہ شری کی مرضی سے کیا ہے۔ اس خوش فہمی میں نہ رہنا کہ تم بڑے حسین ہو، اسی لیے میں تم پر مرضی تھی۔"

"اگر تم یہ کہتے ہو کہ ملا سرکار زندہ ہے تو مجھے اس کا سراغ چاہیے۔" شری مان عکھ نے سفاکانہ لہجے میں کہا "جب تک وہ مجھ سے نہیں ملتا، تم کو رہائی یا آزادی نہیں مل سکے گی۔"

"میں تم جیسے ذہنے دار سفارت کار سے ایسی گھٹیا حرکت کی توقع نہیں کر سکتا تھا۔" میں نے نشے میں ہونے کی اداکاری ترک کر کے تلخ لہجے میں کہا "اس کا مطلب ہے کہ تم مجھے یہ فعال بنارہے ہو؟"

"جو چاہے سمجھ لو۔" وہ بے پروائی سے بولا "جو لوگ اپنی مرضی سے تعاون نہیں کرتے، میں انہیں راہِ راست پر لانا جانتا

"میرا خیال ہے کہ تم ایک سنگین حماقت کا ارتکاب کر رہے

ہو۔" میں نے کہا۔

"اور ہم سوچتے ہیں کہ تم بہت بڑے حرامی ہو۔" بلی نے غلغلہ

اور ہنسنے ہوئے لہجے میں کہا "چند منٹ پہلے تم نشے میں بری طرح

ڈاؤن نظر آ رہے تھے اور اب تمہاری کھوپڑی خوب چل رہی

ہے۔"

"میرا دوسرا خیال یہ ہے کہ مجھے لیموں پانی پلا کر تم نے مجھ کا

احسان کیا ہے ورنہ یہ نشہ تو مجھے لے ہی ڈوبا تھا۔ میں تو یہ رات

تمہاری حسین اور سنہری زلفوں کے سامنے میں گزارنے کے خواب

دیکھ رہا تھا۔"

"یہ ممکن ہے؟" شری مان عکھ نے کہا "بلی برسوں سے میری

گہری دوست ہے۔ دوسروں سے مال ضرور کاٹتی ہے لیکن اس کے

شب و روز میرے ہیں۔ میرے سوا کسی کو اس کی خلوت میں رسائی

نہیں ہے۔ لیکن تم مجھے ملا سرکار سے ملو اور تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ

تمہارا دل بھر جائے تک یہ تمہاری رہے گی۔"

"تمہارے وعدے!" میں نے تلخی کے ساتھ کہا "ان پر اعتبار

کر کے اب تک کیا حاصل ہوا ہے جو میں آئندہ کے لیے کوئی نفعی

امید رکھوں۔ تم باتوں کے صوفیا ہو۔ عمل کا مرحلہ آتا ہے تو دم اٹھا

دیتے ہو۔"

"میرے وعدے نتائج پر منحصر ہوتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ

تم غلامِ رسول والے معاملے کا حوالہ دے رہے ہو لیکن مجھے بتاؤ کہ

میں نے کیا حاصل کیا؟ تم نے اس کی لاش میرے آدھیں کو سوپ

کر ٹھیکتی اعتبار سے اپنا کام پورا کر دیا لیکن اس کی لاش بھی میرے

قبضے میں نہیں آسکی۔ ایسی حالت میں، میں کیا کر سکتا تھا؟"

"جب اسے تمہارے آدمیوں کے حوالے کیا گیا تو وہ زندہ

تھا۔ دوم یہ کہ اسے یا اس کی لاش کو تم تک پہنچانا میری شرطیں

شامل نہیں تھا۔ میں نے طے شدہ شرائط کے مطابق اپنا کام پورا

کر دیا تھا لیکن تم اپنے وعدے پر قائم نہ رہ سکے اور آج پھر مجھ دی

کمانی دہرانے پر تے ہوئے ہو۔"

"یہ میری پیشہ ورانہ مجبوریوں ہیں۔ میں اپنی کارکردگی کے لیے

جن لوگوں کو جواب دہ ہوں، وہ مشینی ذہن کے مالک ہیں۔ وہ

کو مشینوں کو نہیں، نتائج کو پرکھتے ہیں اور میری کارکردگی کے نتائج

صفر پر ہے ہیں۔ غلامِ رسول کو ایک غدار اور سازشی کی حیثیت سے

یہاں دفن کیا گیا ہے۔ اسے میرے ملک کی مٹی ملی تو وہ ایک بہت

بڑے ہیرو کی طرح دھوم دھام سے قبر میں اتارا جاتا۔ ایسی صورت

میں، میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔"

"اور اب؟" میں نے بہت غور سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے

سوال کیا۔

"اب بھی وہی صورت حال ہے۔" اس نے زہنائی کے ساتھ

ہزاروں دھرمین صہب کی آواز
کی روشنی میں ہر وہ گمراہ کتاب



قیمت 45 روپے :- ڈاک خرچ 23 روپے

مساپیا..... دل سے دشمنی
مساپیا..... زندگی کا خاتمہ

کیا آپ چاہتے ہیں کہ یہ دونوں باتیں
آپ کے ساتھ نہ ہوں۔

تو پھر جلدی کیجئے.....

تمہاری مراد گردن کتاب

”مساپیا اور اس کا سد باب“ کا مطالعہ ضرور
کیجئے اس کتاب میں وہ سب کچھ ہے جس
پر عمل کر کے آپ ایک متناسب اور سڈول
جسم کے مالک بن سکتے ہیں۔

کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ بذریعہ بینک منی آرڈر
ڈرافٹ یا ٹرانسفر چیک ارسال کریں

مکتبہ تحفہ نسیبیت
74298 دھرمین صہب کی آواز
فون: 8802652-8802651
E-mail: dmasipia@yahoo.com

راہب
کاپڑا

63-C II تین بخش D.H.A. منی ٹرنکی...

ما جب تک میں ملا سرکار سے مل نہ لوں اس کا ہونا یا نہ ہونا
میں نے ہمتی لائی ہوئی خبر من گھڑت یا فرضی بھی ہو سکتی

میں نے اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب تم ملا سرکار تک رسائی کے لیے
نہ اپنی قید میں رکھنے کا ارادہ رکھتے ہو؟ میں نے عقاب نظروں سے
نہ دوں کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

”قید کا لفظ ذرا نامناسب ہے۔“ اس نے مکارانہ نرمی سے کہا۔
میرے ہاتھ میں پستول ہونے کا غلط مطلب اخذ نہ کرو۔ یہ تو صرف
یک دم کی سہی کارروائی ہے اصل بات یہ ہے کہ تم میرے مہمان
ہو تمہاری دیکھ بھال عمل طور پر میری ذمہ داری ہے اگر
میں کچھ ہو گیا تو میں کہیں بھی اپنا منہ نہیں دکھاسکوں گا۔“

”اگر میں ابھی اور اسی وقت جانا چاہوں تو تمہارا رد عمل کیا
ہوگا؟“ میں نے پوچھا۔

”ظاہر ہے کہ میں تمہارے اس پروگرام کی توثیق نہیں
کرسکوں گا۔“ اس نے کہا۔

اس وقت تک وہ باتوں میں الجھ کر اپنی بالادستی کے زعم میں
جلا ہو چکا تھا اور یہ بات بھول ہی گیا تھا کہ اس کے سازشی
منہوں سے انحراف کرتے ہوئے میں کوئی دوسرا فیصلہ بھی کر سکتا
تھا۔

اس وقت شری مان سنگھ مجھ پر مشینی پستول تانے ہوئے میرے
عقابِ املتہہ تھا جب کہ اس کی منظور نظر رٹلی میرے پہلو میں
کوئی ہوئی تھی اور وہ دونوں ہی یہ فرض کیے ہوئے تھے کہ میں ذہنی
دور پران کی مکمل اطاعت قبول کر چکا تھا۔ ان دونوں کا خیال تھا کہ
میں ان حالات میں ان کی بالادستی کو کسی بھی طرح چیلنج کرنے کی
ذات نہیں کرسکوں گا۔

لیکن میرے توران کے اندازوں سے کہیں مختلف تھے۔
میں نے پلک جھپکتے میں پوری صورت حال کا جائزہ لیا اور پھر
اپنا کسی لاپرواہانہ ڈال دیا۔

خوف اور حیرت میں ڈوبی ہوئی ایک چیخ کے ساتھ رٹلی نے
پستول کا انحصار کیا۔ لیکن اس وقت تک وہ میرے اور شری
مان سنگھ کے پستول کے درمیان حائل ہو چکی تھی۔

”اے چمور ڈورہو میں تمہیں شوٹ کردوں گا۔“ شری مان
سنگھ نے غمناک انداز میں غرایا۔

”غور شوٹ کرو۔“ میں نے رٹلی کے نرم و گداز شانوں پر اپنی
سارمانہ گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا ”تمہاری کوئی بھی گولی لٹی
سکے ان سے گزرے بغیر مجھ تک نہیں پہنچ سکے گی۔“

شری مان سنگھ نے اسی لمحے اپنے ہونٹ سکیز کر ایک تیز سیٹی
چلائی۔ فوراً ہی باہر سے کسی کے دوڑتے ہوئے قدموں کی دھمک
عقابِ املتہہ اور اس کا قوی الجھنے ذرا نیورڈوڑتا ہوا وہاں کھس آیا۔
اس کے غم جو بکوسے ہوئے تھے شاید شری مان سنگھ کی سیٹی

سننے ہی اسے اندر ہونے والی گزیر کا اندازہ ہو گیا تھا۔ ان سازشیوں کی بھینٹ میں ایک میں ہی اجنبی یا نورا تھا اس لیے شری مان سنگھ کے مشتعل ذرا یور کا ہدف بھی میں ہی تھا۔ اس نے ہٹ کے ڈرانگ روم میں گھسے ہی میری سیدھ کی تھی لیکن میری گرفت میں آئی کو دیکھتے ہی وہ راستے میں رک گیا پھر اس کی نگاہ شری مان سنگھ پر پڑی جو اپنے ہاتھ میں ہسپتال تھامے کھڑا تھا۔

”ہائی کو اس کی گرفت سے آزاد کراؤ!“ شری مان سنگھ نے اسے حکم دیا۔

وہ خطرناک تیروں کے ساتھ میری طرف بڑھنے لگا۔ میرے لیے وہ صورت حال بہت خطرناک تھی۔ لپٹ کے علاوہ میرے سامنے دو حریف تھے جن میں سے ایک جسمانی اعتبار سے کسی گینڈے سے کم نہیں تھا اور دوسرا بھروسے ہوئے ہسپتال سے مسلح تھا۔ جب تک میرے پاس بھی کوئی ہتھیار نہ ہوتا، میں ان کی براہری نہیں کر سکتا تھا۔

وہ اس وقت کی صورت حال تھی جب کہ روی اور پامو باہر گئے تھے اور کسی بھی لمحے واپس آکر میرے خلاف محاذ آرا ہو سکتے تھے۔ ان کے علاوہ اس ہٹ کا چوکیہ اور بھی ضرورت پیش آنے پر میرے بجائے شری مان سنگھ ہی کا ساتھ دیتا جب کہ میری مدد کے لیے آنے والے ایس ٹی ایف کے اہل کاروں کا دھڑ دھڑ تک پتا نہیں تھا۔ اگر وہ لوگ اس وقت تک ہٹ کے قرب و جوار میں پہنچنے میں کامیاب ہو گئے ہوتے تو سب سے پہلے باہروالوں کو زیر کرتے اور ایسی صورت میں شری مان سنگھ کی یکنی کے جواب میں اس کے ذرا یور کا آتنا نامکن ہو کر رہ جاتا۔

میں نے بہت تیزی کے ساتھ اس صورت حال کا تجزیہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے باہر سے کسی مدد کی توقع کیے بغیر اپنے بل پر صورت حال کا مقابلہ کرنا چاہیے لیکن بد قسمتی سے ایسی کسی بھی کوشش کے نتائج حوصلہ افزا نظر نہیں آ رہے تھے۔ البتہ اس وقت میرے لیے کچھ کر گزرنے کے علاوہ کوئی راہ باقی نہیں رہی تھی۔

جوں ہی وہ ذرا یور میرے قریب آیا، میں نے پوری طاقت سے ہائی کو اس کی طرف دھکیل دیا۔ وہ اگر ایک طرف ہو کر بچنے کی کوشش کرتا تو ہائی منہ کے بل کر گزرنی ہو سکتی تھی۔ اس لیے اسے مجبوراً اُلی کو اپنی بانوں میں سنبھالنا پڑا اور میں نے تیزی سے شری مان سنگھ کی طرف چھلانگ لگا دی۔

مگر شری مان سنگھ پہلے ہی میرا ارادہ بھانپ چکا تھا۔ وہ بھرتی سے اپنی جگہ چھوڑ کر ایک صوفے پر چڑھ گیا اور اس نے مجھے خوف زدہ کرنے کے لیے پے درپے دو فائر کر دیے۔ دونوں فائر بھٹ کے رخ پر کیے گئے تھے تاکہ ان گولیوں سے کوئی زخمی نہ ہو سکے۔

”جہاں ہو، وہیں رک جاؤ ورنہ میں تمہیں چھلی کر دوں گا۔“ فائر کرنے کے ساتھ ہی شری مان سنگھ اضطرابی انداز میں بولا۔ حقیقی مقابلے نے اسے قدرے زورس کر دیا تھا۔

اسی لمحے ایک عجیب و غریب واقعہ ہوا۔ اس کمرے کی پشت پر کھلنے والی ایک کھڑکی سے کھٹ کی ہلکی سی گھبراہٹ آواز آئی اور اسی کے ساتھ شری مان کے ہاتھ سے ہسپتال انڈر کورر جاگرا۔ وہ کسی بے آواز ہتھیار کا فائر تھا۔ جو شاید ساٹھ گز کی پستی سے ساتھ کیا گیا تھا۔ فائر کرنے والے کا نشانہ قابل رشک حد تک بے خطا تھا کیونکہ شری مان سنگھ کے ہاتھ پر خراش تک نہیں آئی تھی مگر وہ اپنے ہتھیار سے محروم ہو گیا تھا۔

اس صورت حال نے اسے میری طرح بدحواس کر دیا۔ اس نے تیزی کے ساتھ اپنے ہسپتال کی طرف چھلانگ لگائی۔ اس کا ذرا یور بھی اسی طرف چھپنا تھا مگر میں نے ان دونوں سے زیادہ پہلے کا مظاہرہ کرتے ہوئے، ٹھوکر مار کر ہسپتال کو بہت دور پہنچا دیا۔ ”یہ کون تھا؟ احمد کہاں مرا ہوا ہے؟“ شری مان کی بھائی خرابٹ ابھری اور وہ مجھ سے اچھے بغیر سیدھا بھاگتا چلا گیا۔ اس کا ذرا یور مجھ پر ٹوٹ پڑا تھا اور پلٹے ہی دہشت زدہ ہو کر چھپنا شروع کر دیا تھا۔

میرے ذہن میں پہلا خیال ایس ٹی ایف کا آیا۔ اس دوران اور دور افتادہ علاقے میں ان لوگوں کے علاوہ کوئی اور شری مان سنگھ کا دشمن نہیں ہو سکتا تھا اور شاید شری مان سنگھ نے بھی خطوط بھاپ لیا تھا۔ اسی لیے وہ مقابلے پر جے رہنے کے بجائے نکاسی کے اس راستے کی طرف بھاگتا تھا جو ساحل کی طرف واقع تھا۔

میری نگاہوں میں ذرا یور کی زیادہ اہمیت نہیں تھی اس لیے میں نے اس سے اپنا پیچھا چھڑانے کے لیے پوری قوت کے ساتھ اس کے چہرے پر گھر گھر سیدھی اور وہ کراہتا ہوا پیچھے الٹ گیا۔ اُس سے گلو خلاصی ہوتے ہی میں نے شری مان سنگھ کے پیچے دوڑ لگا دی۔

اس وقت تک وہ ہٹ کے برآمدے سے نکل کر ریت پر پٹا چکا تھا اور پوری قوت سے ساحل پر دم توڑتے ہوئے پانی کی طرف بھاگ رہا تھا۔ اس خطرناک موڑ پر اس کی چھٹی جس پورے طور پر اس کی رہنمائی کر رہی تھی۔ اپنے ہسپتال پر کیے جانے والے بے آواز فائر سے اس نے سمجھ لیا تھا کہ ہٹ کے عقبی حصے کا رخ کرنا اس کے لیے خطرناک ثابت ہو گا۔ میری اور اس کی گالیاں اسی سمت میں کھڑی ہوئی تھیں اور اگر اس کے کچھ دشمن وہاں آتی پیچھے تھے تو انہوں نے سب سے پہلے گالیاں کی تاکہ بندی کی ہوگی تاکہ بھگدڑ سے فائدہ اٹھا کر وہاں سے کوئی فرار نہ ہو سکے۔

میں ریت پر کچھ دور نکلا تو میرے پیچھے بھی کئی دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں آنے لگیں۔

”رک جاؤ، ورنہ میں گولی مار دوں گا۔“ پیچھے آنے والوں میں سے کسی کی گرفت آواز ابھری۔

”رک جاؤ، شری! اب تم بچ کر نہیں نکل سکتے۔“ میں نے بھی چیخ کر کہا۔ وہ میری ایک اضطرابی حرکت تھی اور اس طرح میں

لگا ”دونوں نشے کی حالت میں عجیب و غریب حرکتیں کر رہے تھے۔ چوکیدار ایک جگہ چھپ کر ان کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ ہم نے انہیں باندھ کر دیں ڈالا ہوا ہے۔“

ہم واپس ہٹ میں پہنچے تو وہاں بھی بازی سٹ چکی تھی۔ اشرف خان کے ساتھ آنے والوں کی کل تعداد پانچ نفوس پر مشتمل تھی۔ انہوں نے شری مان سنگھ کے سرکش ڈرائیور کے ساتھ رلی کو بھی بے رحمی کے ساتھ باندھ لیا تھا اور باہر سے رولی پارو اور احمد کو بھی اندر اٹھالائے تھے۔

مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ میری وحشیانہ فکر نے ڈرائیور کا چرو لہولہا کر دیا تھا اور وہ بدلی ہوئی صورت حال سے بہت زیادہ خوف زدہ نظر آ رہا تھا۔

ان سب کے ہاتھ پیریا بندھنے کے ساتھ ہی ان کے دہانوں میں بھی کپڑا ٹھونس دیا گیا تھا۔ میں نے بت غور سے باری باری ان کا جائزہ لیا پھر ہٹ کے چوکیدار کا دہانہ آزاد کرنے کا حکم دے دیا۔ منہ کھلنے ہی احمد نے مشینی انداز میں ”اٹنی بے گناہی کے حق میں بولنا شروع کر دیا لیکن میں نے پتھر کر اسے خاموش کر دیا اور اس سے اپنے سوالات کا آغاز کر دیا۔

احمد کے اس انکشاف نے مجھے حیران کر دیا کہ وہ ہٹ پارو کے باپ کی ملکیت تھا لیکن پارو یا اس کا باپ شاذ و نادر ہی وہاں آتا تھا۔ ہٹ عام طور پر شری مان سنگھ اور لی کے تصرف میں رہتا تھا۔ البتہ رولی اس کے لیے نیا چوتھا جو پہلی بار وہاں لایا گیا تھا۔

میرا خیال تھا کہ اس علاقے میں بھوں کی چوکیداری کے لیے کچھ اور لوگ بھی رہتے ہوں گے جو ہنگامے کی وجہ سے جاننے کے لیے کسی بھی وقت وہاں آسکتے تھے لیکن احمد نے خوشامد انداز میں مجھے یہ بتا کر مطمئن کر دیا کہ وہاں رہنے والے چوکیدار دوسروں کے پھٹے میں ٹانگ اڑانے کے قائل نہیں ہیں۔ کیونکہ پولیس کی جارحانہ تفتیش اور گواہیوں کے چکر سے ہر ایک دور بھاگتا ہے۔ ان کی زیادہ سے زیادہ فکر مندی اور دلچسپی اپنے آدمی کے بارے میں ہوتی ہے جو مطلع صاف ہونے کے بعد صحیح سلامت یا زخمی حالت میں خود ہی ان لوگوں کے پاس پہنچ جاتا ہے۔

میری نظروں میں لی پارو اور رولی کی کوئی بہت زیادہ اہمیت نہیں تھی۔ لی واضح طور پر ایک پیشہ ور کال گرل تھی اور شاید شری مان سنگھ کی فرمائش پر اس کے دوستوں وغیرہ کا دل بھلانے کا بندوبست کیا کرتی تھی۔ پارو کا کردار اس اعتبار سے قدرے اہم تھا کہ اس کے باپ نے اپنا ہٹ عملاً شری مان سنگھ کی تحویل میں دیا ہوا تھا۔ البتہ شری مان سنگھ کا ڈرائیور اس کا قابل اعتماد ساتھی معلوم ہوتا تھا جس پر تشدد کے خاصا کچھ معلوم کیا جاسکتا تھا۔ پہلے میں نے سوچا کہ اس کے علاوہ بقیہ تین افراد کو کڑی سرزنش کر کے وہیں آزاد کر دیا جائے لیکن پھر میں نے ارادہ بدل دیا۔ ان سب کو ایک بار ظفر کے سامنے لے جانا ضروری تھا تاکہ وہ ان سب سے

پہلے ہیچے آنے والوں کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ ان کا شکار کون ہے۔ شری نے دونوں دھمکیوں کا کوئی اثر نہیں لیا تو میرے پیچھے آنے والوں میں سے کسی نے بے درپے تین فائر کیے جو بے سود رہے۔ اول تو شری مان سنگھ نے عقاب کا اندازہ کرتے ہوئے سرخ بلیڈل کر بھاگنا شروع کر دیا تھا۔ پھر فائر کرنے والا بھی دوڑ رہا تھا لیکن کوئی گولی کارگر نہیں ہو سکی۔

”تم مجھے ہاتھ بھی نہیں لگا سکو گے۔“ ایک بڑیانی قہقہے کے ساتھ شری مان سنگھ کی آواز گونجی ”تم لوگوں کے ہاتھ آنے کے پہلے میں کھلے سمندر میں کود جانے کو ترجیح دوں گا۔“

اور پھر یہی ہوا۔ وہ مجھ سے کافی آگے تھا۔ وہ دوڑتا ہوا چاندی کی طرح چمکتے ہوئے پانی میں گھس لیا اور ساحل سے لوٹنے والی تیز لہروں کا رٹا اسے اپنے ساتھ سمندر کی بیکراں گہرائیوں کی طرف بلاتا گیا۔

میں ساحل پر پہنچ کر تھکے ہوئے انداز میں رک گیا۔ وہ سب ان تعداد میں ایک اور غیر متوقع انداز میں ہوا کہ میرا ذہن ماؤف ہو کر مالک میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ شری مان سنگھ یوں کھلے سمندر میں کود کر گناہ موت کو گلے لگانے کا فیصلہ کر بیٹھے گا۔

پھر میرے پیچھے آنے والے بھی میرے قریب آ کر رک گئے۔ ہاتھ اویں تین تھے۔ تینوں ہی مسلح تھے۔ میرے لیے ان میں سے مزید اشرف خان کا چہرہ شناسا تھا جسے ظفر نے اس مہم کا نگران قرار دیا تھا۔

”سمندر میں کود گیا؟“ اشرف خان نے بے اعتباری کے ساتھ پوچھا۔

”مہم دیکھی رہے تھے۔“ میں نے بے دلی کے ساتھ کہا ”بس چمکے کے فرق سے وہ ہمارے ہاتھ آنے سے رہ گیا۔ تم لوگوں کو ایک آدھ آدمی اس طرف بھی چھوڑنا چاہیے تھا۔“

”ہاں! اب تو یہی اندازہ ہو رہا ہے۔“ اس کا لہجہ متاسفانہ تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کوئی سمندر کی طرف بھاگنے کی بہت کسے گا۔ رات کے اندھیرے میں تو بڑے بڑے پیراک بھی سمندر میں اترنے سے گھبرا جاتے ہیں۔ پانی تیرے ہونے کے ساتھ ہی خطرناک سمندری جانور بھی ساحل کے نزدیک آجاتے ہیں۔ وہ تیرتا جاتا تھا۔

”تیرا نہیں“ تیرتا جاتا بھی ہو تو چھوٹے بڑے جانوروں سے کھانے لگے گا۔“

”تو کیا بڑا جرم یہی تھا؟“ اس نے تجسس لہجے میں سوال کیا۔ ”سب لوگ ہمارے قابو میں ہیں۔“

”اصل جرم یہی تھا۔“ میں نے واپس لوٹتے ہوئے کہا ”باقی دستاویز لے بیٹھا ہے۔“

”تم نے چوکیدار کے علاوہ ایک جوڑے کو ہم نے گاڑیوں میں قید کر رکھا تھا“ اشرف خان مجھے اپنی کارکردگی کی رپورٹ دینے

وہ لوگ تفتیش کے ذریعے یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو سکے کہ آخری بار وہ کھولا کس کے زیر استعمال تھی۔

دوسری وجہ کا تعلق بھی براہ راست شری مان سنگھ کی ذات سے تھا۔ اس نے ہماری نظروں کے سامنے، پورے شری مان سنگھ کی زندگی کا سفر میں اترنے کی حماقت کی تھی۔ اگر وہ سرکش سندری لاس میں یا خوشنوار بحری جانوروں کا نشانہ بن کر موت کی آغوش میں جاتی تو اگلے چند روز میں اس کے وجود کی باقیات کو وہاں ساحل پر مل جاتا۔ ایسا نہ ہونے کی ایک ہی وجہ تھی کہ کوئی جانور اسے مار کر کھا جاتا لیکن آباد ساحلی علاقوں کے اطراف میں عموماً ایسی دیوچر تھیں جنہوں نے حقوق نہیں پائی جاتی جو کسی انسان کو سالم نگلنے کی اہل ہو۔ حادثاتی یا اتفاقی طور پر شری مان سنگھ کے سواکت کے لیے ان پانچوں میں سے ایک کوئی جانور ممکن رہا ہو تو اور بات تھی۔

شری مان سنگھ کی لاش کی باقیات دستیاب ہونے کے بعد پولیس کے لیے یہ ثابت کرنا بائیس ہاتھ کا کھیل ہوتا کہ شری مان سنگھ لاوارث کھولا کے ذریعے پاس بے آیا اور کسی وجہ سے سندری لاس کی بھیڑی ہوئی موجود کی زد میں آکر لقمہ اجل بن گیا۔ وہ انتقال حادثے کی ایک سیدھی سادی کہانی ہوتی جس میں علاقے کے لوگوں کے عدم تعاون کی وجہ سے کوئی رنگ آمیزی نہ ہو پائی اور ابتدائی سنسنی کے بعد آخر کار وہ معاملہ داخل دفتر ہو جاتا۔ دوسرا امکان تھا جس کی نشاندہی ہٹ کے چوکیدار احمد نے کی تھی۔ اگر شری مان سنگھ ایک ناپا تو لا خضرہ مول لے کر سندری لاس میں اترتا اور اپنی سخت جانی یا مہارت کی بنا پر خود کو ہر قسم کے خطرات سے محفوظ رکھنے میں کامیاب ہو جاتا تو بیچ کا اجالا نمودار ہونے سے پہلے ہی کہیں بھی پانی سے باہر آسکتا تھا۔ ایسی صورت میں وہ کسی بڑے سفارتی اسکینڈل سے بچنے کے لیے، سب سے پہلے اپنی کار کھینچنے کی کوشش کرتا اور ہر درد سوری مول لے کر اسے شہر واپس لے جانے کی کوشش کرتا۔ یوں وہ کار، صبح نمودار ہونے سے پہلے ہی وہاں سے غائب ہو جاتی اور کسی کو کانوں کان بھی خبر نہ ہو پائی کہ رات کے اندھیرے میں وہاں ایک مشتبه کار موجود تھی۔ ان واقعات سے علاقے کے دوسرے چوکیداروں کا واقف ہونا ایک لازمی امر تھا لیکن احمد نے ان کی نفسیاتی حالت پر روشنی ڈال کر بتا دیا تھا کہ وہ پولیس، تھانے سے متعلقہ پیچیدگیوں سے اپنا دانا بچائے رکھنے کے لیے، خود کو ہر نگاہ سے بے خبر غائب کرنے میں اپنی غایت محسوس کرتے ہیں۔ احمد کو ہدایات دے کر دیں بچھا دینے کا فیصلہ کر لیا گیا۔

شری مان سنگھ مرحاٹا یا زندہ رہتا، ہر درد صورتوں میں اس کی کہ وہاں موجودگی بھرپور جواز کی حامل تھی۔ اس لیے ہم اسے وہاں چھوڑنے کا فیصلہ کر کے شہر کے لئے روانہ ہو گئے۔ میں سب سے اپنی کالی شیراز چلا رہا تھا جب کہ سرسبز کی ذرا نیوگ مینٹ اشراف خان نے سنبھال لی تھی۔

حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں دوسرے ملک دشمن عناصر کے خلاف کارروائیوں کا آغاز کرنا چکا۔

”صاب! اشری صاب کہاں ہے؟“ احمد کی خوف زدہ لور سہمی ہوئی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

”وہ بہت بڑا معاش تھا۔“ میں نے تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔ ”میری موت سامنے دیکھ کر اس نے سندری میں چلا گیا لگاوی۔“ وہ آہستگی سے عرملہ کر رہ گیا مگر میں اس کے چہرے پر نمودار ہونے والی اطمینان بخش تبدیلی پر ہنسنے لگا۔

”تمہیں اس کے ذوب مرنے پر حیرت نہیں ہوئی؟“ میں نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

”وہ نہیں ڈوبے گا۔“ احمد نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔ ”وہ مچھلی کی طرح سندری کو جانتا ہے۔ جب بھی یہاں آتا ہے، گھنٹوں پانی میں تیرتا رہتا ہے۔ وہ ساحل کے ساتھ ساتھ تیرتا ہوا کہیں دور نکل جائے گا اور وہاں پانی سے باہر آجائے گا۔ وہ تمہیں دھوکا دے کر نکل گیا ہے۔“

مجھے اپنے آپ پر غصہ آیا کہ میں نے اس کے ڈوبنے کے بارے میں اتنی جلدی نتیجہ کیوں اخذ کیا؟ اس کے زندہ ہونے کا امکان روشن ہوتے ہی اشراف خان نے اپنے ایک آدمی کو پوری طرح ہوشیار رہنے کی تاکید کرتے ہوئے باہر بھیج دیا۔

میری دانست میں اس کا وہ اقدام بالکل درست تھا۔ اگر شری مان سنگھ سندری سے زندہ سلامت باہر نکل آئے میں کامیاب ہو جاتا تو وہ موقع پاکر کوئی گاڑی لے کر فرار ہونے کی کوشش بھی کر سکتا تھا جس کے انداز کی واحد صورت یہی تھی کہ گاڑیوں پر کڑی نگاہ رکھی جائے۔

وہاں کی بساط لیٹی جا چکی تھی اور مزید قیام کی صورت میں کوئی نتیجہ حاصل ہونے کی امید نہیں تھی اس لیے میرے ایمان پر اشراف خان نے واپسی کی تیاری شروع کر دی۔

ان لوگوں نے اپنا ٹرک ہٹ سے خاصی دور چھوڑ دیا تھا۔ اشراف خان نے اپنے دو آدمیوں کو ادھر روانہ کر دیا تاکہ وہ ٹرک لے کر وہیں سے شہر کی طرف روانہ ہو جائیں۔ اپنے بقیہ آدمیوں کے ساتھ اس نے چاروں قیدیوں کو میری کالی شیراز اور ریلی کی مرشدی میں نکل کر لیا۔

شری مان سنگھ کی گاڑی کے بارے میں تھوڑی سی سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ اسے وہیں چھوڑ دیا جائے لیکن اس کے چاروں ٹائروں سے ہوا نکال کر دلو غائب کر دیے جائیں تاکہ اس کار کو آسانی کے ساتھ یا فوری طور پر وہاں سے ہٹایا نہ جاسکے۔

اس فیصلے کی دو وجہ تھیں۔ اول تو یہ کہ وہ غیر سفارتی نمبروں والی کار تھی جو شری مان کی ملکیت تھی یا پھر اس نے اپنے روابط کی بنا پر کسی سے مستعار لی ہوئی تھی۔ دونوں ہی صورتوں میں وہاں موجود لاوارث کار جلد یا بدیر علاقہ پولیس کی نظروں میں آجاتی اور

لا تبت آسان ہوگا۔“

”شاید تمہیں یہ جان کر حیرت ہو کہ دیرانے مجھے فون کیا تھا۔“ چند ثانیوں کے سکوت کے بعد ظفر نے ہلکی مگر بھرپور ہسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

میرے لئے وہ چونکا دینے والی اطلاع واقعی ناقابل یقین تھی۔ ”کیا واقعی؟“

”ہاں اس نے کوئٹہ سے میری عیادت کے لئے فون کیا تھا۔ وہ واقعی بہت عجیب و غریب عورت ہے۔“

ظفر اس کے ہاتھوں خاصی بری طرح زخمی ہو چکا تھا اس لئے اس کے لب و لہجے میں دیرانے کے لئے نرمی محسوس کر کے میں حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکا ”تو کیا تم نے اسے معاف کر دیا؟“

”وہ جہان باگتھی تو شاید میں اسے معاف بھی کر دیتا۔“ اس نے احمقانہ لہجے میں کہا ”وہ اپنے کیے پر ذرا بھی نادم نہیں تھی لیکن اسی کھے ساتھ میرے زخمی ہونے پر پریشان بھی تھی۔ البتہ اس نے یہ ضرور کہا کہ میرے ساتھ سفر کرتے ہوئے اس کے پاس بارودی پھول سے ہلکا کوئی شہدہ نہیں تھا ورنہ مجھے اتنے زخم نہ آتے۔“

”غضب خدا کا! یعنی وہ فون پر بھی اپنی اس حرکت کا دفاع کر رہی تھی؟“

”اب چھوڑو اسے جو ہوتا تھا وہ ہو گیا۔“ ظفر نے خفیف سی ہنسی کے ساتھ کہا ”بعض اوقات بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں بھی بہت اہم ثابت ہوتی ہیں۔ اسے آوارہ کر میں نے اس کی انا کو مجروح کیا تھا۔ بعد میں دوستی ہو جانے کے بعد بھی وہ اپنی اس توہین کو نہیں بھلا سکی اور ایک انتقامی کارروائی کر گزری۔“

راستے میں اشرف خان کی گاڑی آگے رہی تاکہ کہیں جاچکے کسی پولیس پائلٹ وغیرہ سے سامنا ہو تو وہ اپنے طور پر غلط فہمی سے باز رکھ سکے۔ شرم کی حدود میں داخل ہونے سے بچاؤ کے لئے وہ مقامات پر میں نے پولیس والوں کو سرگرم دیکھا لیکن ایک تہہ پل بروار گاڑیوں اور رکشا کیسی میں سفر کرنے والے جگہ لوگوں پر مرکوز تھی جنہیں ذرا دھمکا کر وہ اپنے لئے جب جگہ پا کر سکتے تھے۔ نسبتاً نئے ماڈل کی چمکتی ہوئی گاڑیاں عام اور ان کی توجہ سے محروم تھیں اس لئے ہمیں بھی نہیں روکا گیا۔ لیکن فی ایف کے اسٹیشن فور پر ہمارے پہنچنے ہی موقع اور پہل شروع ہو گئی۔ ان چاروں قیدیوں کی آنکھوں پر راستے ہی سے پٹیاں باندھ دی گئی تھیں تاکہ وہ غیر ضروری طور پر ایس ٹی بس کے اراکین اور ٹھکانے کے بارے میں واقف نہ ہو سکیں۔

وہاں موجود لوگوں نے ہلکی اور باؤ کو بہت حیرت سے دیکھا۔ وہاں سے اتارے جانے سے قبل ان کے پیر کھول دیے گئے تھے پت پر بندھے ہوئے ہاتھوں، بلانڈ فولڈز اور منہ میں ٹھنڈے پتے کے کپڑے سے صاف ظاہر ہوا تھا کہ وہ کسی سنگین جرم میں ملوث تھے۔ اسی لئے اس حالت میں پکڑ کر لائی گئی تھیں لیکن اس باوجود ایس ٹی ایف کے عملے کے کسی رکن نے ان سے کوئی بات نہیں کی۔

اشرف خان انہیں اندر بھجوانے کے اختیارات کر رہا تھا کہ ظفر کے فٹریک طرف چل دیا۔

ظفر کے دفتر کا نقشہ قدرے بدلا ہوا تھا۔ زخمی ہونے کی وجہ سے اس نے اپنے لئے بستر نمائش کا بندوبست کر لیا تھا جس کا اندازہ دیکھ کر ہلکی سیٹھریل پر کچھ کانٹاتارکھے ہوئے تھے۔ ”کوئی مہمان کیسا رہا؟“ مجھے دیکھتے ہی اس نے بائیں کمرے کے اشارتے ہوئے پوچھا۔

میں آج شرمی مان سنگھ کے ستارے ہی یاد رہے کہ وہ بیچ بند ہے آج اس کی بدینتی کھل کر سامنے آگئی۔ وہ غزالہ کے سامنے بھی اپنی کمائی پر اڑا ہوا تھا۔

ظفر کے استفسار پر میں نے اسے پوری کمائی سنا دی۔ اس کے جوابات حیرت ناک ثابت ہوئی کہ شرمی مان سنگھ نے مجھے لینے کے لئے پُر تشدد حربوں کے بجائے عیش و نشاط کی راہ اختیار کر لی۔

مجھے امید نہیں ہے کہ وہ سمندر سے زندہ لوٹ سکے گا۔“

میں غامض ہونے پر ظفر نے گھبراہٹ سے کہا ”وہ مر گیا تو تم کو کچھ بھی کا معاملہ ٹھکانے میں نہ جائے گا۔“

”نہیں اس کا اصل روپ دیکھ لینے کے بعد میری ہر خوش فہمی ختم ہو جائے گی۔ وہ زندہ بیچ بھی گیا تو غزالہ کو آسانی کے ساتھ واپس لے آئے گا۔ اب تو میں یہی دعا کر سکتا ہوں کہ ہانگ کانگ میں نہ لپکے بلکہ کسی شہنشاہ کے بجائے غزالہ ہو۔ اسے وہاں سے واپس

جاسوسی ڈائجسٹ کا نیکو خیر سلسلہ

ایک ایسے نوجوان کی داستان عبرت جو حالات کے جال میں پھنس کر جرائم کی دلدل میں پھنستا چلا گیا

انعام یافتہ مشہور مصنف جلال محمد کھٹک سرفراز پور

گمراہ

8 حصے

قیمت 60 روپے

ڈاک خرچ 23 روپے

کتابی شکل میں تیار ہے

کتابیات پبلی کیشنز

محکمہ برآمد و درآمد کراچی

فون: 5802552-5895313

کراچی 74200

www.kinabooks.com

خبری ہم تک پہنچ گئی۔" میں نے مسرت کے ساتھ کہا "دور نہ جانے کب تک بے یقینی میں جٹا رہے۔"

"سمندر سے شری مان سنگھ کی لاش برآمد ہوئی تو یہ بھی تسماری کا سیلاب ہوگی۔ میرا خیال ہے آنے والے دو دن ہمارے لئے خوشگوار ہوں گے۔ بس غزالہ کا معاملہ ذرا پیچھا ہوا نظر آتا ہے۔"

"میں اب اسی طرف توجہ مرکوز کروں گا۔" میں نے کہا۔

شری مان سنگھ کے ساتھیوں کو دیکھ لیتا۔ مجھے ان میں صرف شری مان سنگھ کا ذرا سیوریہ توجہ کا مستحق نظر آ رہا ہے۔

"نہیں، باری باری ان سب ہی کو دیکھنا ہوگا۔" وہ کہتی

سجید کی کے ساتھ بولا "ان میں یاد شاید مالدار گھرانے کی ہوئی لڑکی ہو لیکن ملی کا نام شاید میرے ریکارڈ پر ہے۔ تقریباً دلدادہ، اعلیٰ سطحوں میں وہ اسٹیک بیونی کے نام سے پہچانی جاتی ہے اور اہم سرکاری افسران سے قریبی مراسم رکھتی ہے۔"

"پھر وہ تم لوگوں کی نگاہوں سے کیسے بچی ہوئی ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ خفیہ سرکاری اداروں کا کھیل ہے۔ وہ شاید ہلاک ہو چکا بنا کر بڑی پھیلچوں پر پھانسی ڈالنے کی فکر میں ہیں۔ ہمیں تو صرف ری طور پر اس کے وجود کی اطلاع دی گئی ہے۔ ملی کا باپ ایک اہم تھانہ۔ وہ سیاحت کے لئے یہاں آیا اور ایک ہندو عورت کے ہاں میں پھنس گیا۔ ملی آٹھ برس کی تھی کہ اس کا باپ اپنی بیوی کی تیزی سے ڈھلچکی ہوئی جوانی سے اکٹرا کر کہیں لاپتا ہو گیا اور ملی کی آوارگی کی راہوں پر چل پڑی۔ دیکھا جائے تو اس نے اپنی باپ کی کمائی سے ملی کو پران چڑھانے کے ساتھ اعلیٰ تعلیم بھی دلائی تھی اسے اپنے رنگ میں رکنے سے نہیں بچا سکی۔ ملی اپنے تعلیمی میں ہی پر پڑے نکلنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔"

"تسماری اطلاعات قابل رشک ہیں۔ اچھا ہی ہوا کہ میں ان سب کو ہا کس ہے پر رہا کرنے کے بجائے اپنے ساتھ لے آیا۔ کسی ہٹ کے چوکیدار کو سمجھا بھگا کروں چھوڑ دیا۔ میرا خیال ہے کہ پولیس کے تعقیلوں سے اپنی جان بچانے کے لئے خودی خاموش رہے گا یا روپوش ہو جائے گا۔" میں نے کہا "اس کے لئے شک صورت حال اسی وقت پیدا ہوگی جب شری مان سنگھ سمندر میں غرق ہونے کے بجائے زندہ نکل آئے گا۔"

"وہ ایک سفارت کار ہے اس لئے ہمارے ملک میں اس ہر طرح کا سفارتی تحفظ حاصل رہے گا۔ زیادہ سے زیادہ اہل پابندیہ محض قرار دے کر ملک چھوڑنے کا حکم دیا جاسکتا ہے اس کے تعلیم، جرائم کے اعتبار سے اسے یہاں کوئی سزا نہیں

"اس کا مطلب ہے کہ تم اس کی حرکت کو حق بجانب تصور کرتے ہو؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"بڑی حد تک! " غفر بولا "اس کے شدید دماغ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے اندر ایک اچھی اور عزت دار عورت چھپی ہوئی ہے جو اپنی تذلیل برداشت نہیں کر سکتی۔ میرے ذہن سطحی ہیں۔ یہ آج نہیں توکل بھرجائیں گے لیکن اس کے دل پر لگا ہوا زخم مدتوں مندمل نہیں ہو سکے گا۔ آج اس سے بات کرنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ ایٹشن کے ساتھ اس کے مراسم میں پسند کے بجائے جبر کا دخل تھا۔"

"میں تسماری رائے پر تنقید نہیں کرتا لیکن میری نئی رائے یہ ہے کہ دیر اور کچھ ہونے کے ساتھ ہی اتنی بڑی اداکارہ ہے کہ اسے اس سال کا آسکر اوارڈ ملنا چاہیے۔"

"میں نے اپنی عمر کسی چیز سے میں نہیں، انسانوں کو دیکھتے پرکتے گزاری ہے۔" اس نے مجھے سمجھانے کی نیت سے محنت کے ساتھ کہا "اس کی دہائی آواز سن کر مجھے اس کی دلی کیفیت کا اندازہ ہو رہا تھا۔ دیکھا جائے تو وہ میرے ساتھ زیادتی کر کے دل ہی دل میں شرمسار بھی تھی لیکن اس کی انا اُسے معذرت کے دوہول بولنے سے روک رہی تھی۔ ایسے مواقع پر انسان کا قول نہیں، عمل دیکھا جاتا ہے۔"

"میں بحث میں نہیں پڑتا۔ اگر تسماری اور اس کی صلح معافی ہو گئی تو یہ بہت اچھا ہے۔ تم دونوں مشترکہ مفادات کے لئے آئندہ بھی مل جل کر کام کر سکو گے۔"

"میں بھی اس کی ذات میں بس اتنی ہی دلچسپی لے رہا ہوں۔" وہ جلدی سے بولا "اُسے اپنانے کے بارے میں، میں نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا ہے۔ وہ بہر حال ایک ذہین اور خطرناک لڑکی ہے جو اس وقت غلط راہوں پر چل رہی ہے۔ جب تک وہ اس گمراہی سے تائب ہو کر راہ راست پر نہ آجائے، میں اس کی طرف پیش قدمی نہیں کر سکتا۔"

"ہو سکتا ہے کہ تسماری فرمائش پر وہ یہ بھی گمراہ رہے۔" میں نے اس پر ہلکی سی چوٹ کی۔

"وقت آنے پر دیکھا جائے گا۔ فی الحال تو میں اس کی کامیابی کا آرزو مند ہوں۔"

"وہ ایران کب تک جاری ہے؟" میں نے چونک کر سوال کیا۔

"وہ اب تک ایرانی سرزمین پر کافی دور تک سفر کر چکی ہوگی۔" اس نے اپنی رست داچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا "اس کا ارادہ اس کے رابطہ ہو گا تھا۔ اسے ان کا جب میں راست

ساتھ کہا۔ اس کے لیے سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ اس کے پاس کوئی بری خبر نہیں تھی۔

”ہانگ کانگ والی مس تپاٹھی تم کو پہچانتی ہے؟“ مکاؤ سے سوال کیا گیا۔

”بالکل، بہت اچھی طرح پہچانتی ہے۔ وہ اس دنت کہاں ہے؟“ میں نے بے تابی سے پوچھا۔

”وہ ہانگ کانگ میں ہی ہے اور اس کی وجہ سے بہت بڑی مشکل کھڑی ہو گئی ہے۔ ذون کے اثر و رسوخ کی بنا پر سارا معاملہ خوش اسطولی سے نٹ گیا ہے کیونکہ ذون نے خود ہی اپنے خداداد ساتھیوں کو پولیس کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ دوپٹے سی ٹھکانے لگے جا چکے ہیں۔ باقی دو کو ان کی کہیں گاہوں سے نکال کر پولیس کے قبضے میں دینے کے بعد باقی لوگوں کی گلو خلاصی ہو گئی ہے۔“

”سڑکی کا کیا ہوا؟“ اس کے خاموش ہونے پر میں نے اضطرابی لہجے میں پوچھا۔

”اس نے ذون کے ساتھ آنے سے انکار کر دیا ہے۔“ اس نے خبر دی ”دوسری طرف اس کے ساتھ آنے والے مرد کی نیت بھی ڈانواں ڈول ہو گئی اور وہ مس تپاٹھی کو اپنے ساتھ ہی لے جاتا چاہتا تھا۔“

”تو کیا وہ اس کے ساتھ جانے پر رضامند ہے؟“ میں نے حیرت کے ساتھ سوال کیا۔

”یہی تو مصیبت ہے کہ وہ کسی کے ساتھ جانے پر آمادہ نہیں ہے۔ اس کی شناخت تپاٹھی کے پاس موجود کانگات سے ہوئی ہے۔ اس لیے ہانگ کانگ پولیس مسٹر تپاٹھی کو ہی لڑکی کا واحد قانونی وارث قرار دے رہی تھی۔ اس کے دست بردار ہوئے بغیر لڑکی ذون کے قبضے میں نہیں آسکتی۔“

”لیکن وہ کیا کہتی ہے؟ اسے ذون کے ساتھ جانے میں کیا اعتراض ہے؟“

”اس نے ذون کو بھی مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ اس کے دونوں دعوے وار جعلی اور اس کی جان کے دشمن ہیں۔ ان سے بچنے کے لیے وہ پولیس ہی کی تحویل میں رہنا چاہتی ہے۔“

”اوہ! اس سنگین اور غیر متوقع صورت حال نے مجھے بوکھلا کر رکھ دیا۔“

”اب چکر یہ ہے کہ لڑکی کے بیان کی بنا پر پولیس نے چھان بین مکمل ہونے تک مسٹر تپاٹھی کی سفری دستاویزات ضبط کر لیں تاکہ وہ ہانگ کانگ سے فرار نہ ہو سکے۔ اسی کے ساتھ ذون کو بھی ہانگ کانگ میں رہنے کا پابند کیا جا چکا ہے لیکن تپاٹھی اچانک ہی کہہ دیا کہ وہ اس کے ساتھ نہیں آئے۔“

”لیکن اس کی موت کو یقینی بنانا میرے اور تمہارے بس ہے باہر ہے۔“

ظفر معنی خیز انداز میں مسکرایا اور بولا ”تم جا کر غزالہ کی خیر خبر لو۔ ہو سکتا ہے کہ صبح تک میں تمہیں کوئی اچھی خبر سناسکوں۔ اگر میں صبح آدمی سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہو گیا تو تھوڑی سی دیر میں طاقتور سرج لائسنس سے لیس ہیلی کاپٹر ہاس کے لیے کی ساحلی بنی رہنچی پروازیں شروع کر دیں گے اور اسے کہیں امان نہیں مل سکے گی۔“

”خدا تمہیں اپنے ارادوں میں کامیاب کرے!“ میں نے اپنے دل کی گہرائیوں سے کہا اور ردائی کے لیے اٹھ گیا۔

ظفر کو چھوڑ کر میں فلیٹ پر پہنچا تو سلطان شاہ بے تابی کے ساتھ میرا منتظر تھا لیکن اس کا منہ بدستور پھولا ہوا تھا۔

میں نے اسے راضی کرنے کے لیے اپنی کتھانانی چاہی تو اس نے فنگ لیے میں مجھے روک دیا اور بولا ”تم جو کچھ کرتے ہو اس سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میرے لیے صرف اتنا ہی کافی ہے کہ تم کسی ٹوٹ پھوٹ کے بغیر لوٹ آئے ہو۔ اب اگر فرصت ہو تو ذرا مکاؤ فون کرلو۔ ان لوگوں کو تمہاری یادیر کی تلاش ہے۔“

”کیا کسی کا فون آیا تھا؟“ میں نے حیرت اور تیزی کے ساتھ سوال کیا۔

”ہاں، وی عورت تھی جس سے پہلے بات ہوتی رہی تھی۔“ وہ بے زاری کے ساتھ بولا۔

”تو تم نے اس سے بات کیوں نہیں کی؟ وہ کیا کہہ رہی تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”میری آواز اس کے ساؤنڈ اسکینر پر ریکارڈ نہیں ہے۔ اس نے اس نے مجھ سے بات کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ دیر اکو یا تمہیں پوچھ رہی تھی۔“

وہ ایک اہم اطلاع تھی۔ میں وقت کے فرق کو نظر انداز کرتے ہوئے فوراً ہی ڈرائنگ روم کی طرف چل دیا جہاں فون موجود تھا۔

مکاؤ میں کوئی فون کے ٹھکانے پر فون کے ذریعے رابطہ کرنا ایک عجیب و غریب تجربہ تھا۔ چلی جی کی کوشش میں فون کا سلسلہ مل گیا مگر وی آنت زدہ چوہے کی چوں چوں سنا دینے لگی۔ میں مکمل طور پر خاموش رہا۔ مقررہ وقت گزرنے کے بعد کوئی فون ٹیکسٹ کی لائن پر آگئی۔

”میں کراچی سے ڈی بی بول رہا ہوں۔“ اس کی پہلو کے جواب میں میں نے انگریزی میں کہا۔

”تم کہاں غائب تھے؟ اور وہ ذون کی منہ بولی جی کہاں ہے؟“ اس کا لہجہ بے تکلف تھا۔ شاید اس کے ساؤنڈ اسکینر نے میری آواز سن لی۔

اس کا وہ انکشاف سننے ہی مجھ پر چودہ طبق روشن ہو گئے۔ وہ بہت باریک لیکن بالکل سامنے کی بات تھی کہ کسی بھی الجھن کے نتیجے میں غیر ملکوں کو جبرا بے دخل کر کے ان کے ملک یا آخری منزل کی طرف بھیجا جاتا ہے۔ شاید غزالہ کو نئی دہلی سے ہانگ کانگ لانے والا اس رمز سے پہلے ہی آگاہ تھا۔ اسے یہ بھی معلوم رہا ہوگا کہ اس لڑکی کو مجبوراً ہانگ کانگ بھیجا گیا ہے۔ اسی لیے لشکر و شہادت کی فضا پیدا ہوئی ہے وہ روپوش ہو گیا تاکہ ہانگ کانگ کے حکام کوئی سیدھی راہ نہ پاتے ہوئے اسے دوبارہ نئی دہلی بھیج دیں۔

میرے لیے وہ بہت مشکل صورت حال تھی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس وقت مجھے یہ یقین نہیں تھا کہ ہانگ کانگ میں بیٹھی ہوئی لڑکی واقعی غزالہ تھی یا اس کے دھوکے میں کھنڈر کی شکستہ دیوی کو وہاں بھیج دیا گیا تھا۔ اگر میں مافیا والوں کی برہنہ کا خطرہ مول لے کر اس سفر روانہ بھی ہو جاتا تو اس امر کی کوئی ضمانت نہیں تھی کہ ہانگ کانگ میں غزالہ میرے سامنے ہوتی۔

میرے وہاں پہنچنے پر اگر وہ شکستہ ثابت ہوتی تو کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ اپنی الزام تراشی کا رخ میری طرف موڑ کر مجھے کسی ناکارہ جرم کی سزا میں پھنسا دیتی۔

”ٹھیک ہے، میں دیکھتا ہوں کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔“ میں نے تسکین دہانی آواز میں کہا ”یہاں کی صورت حال کا جائزہ لے کر میں تمہاری دیر میں تمہیں دوبارہ فون کروں گا۔“

”یہ یاد رکھنا کہ ہم تم سے چار گھنٹے آگے ہیں۔ میں تمہاری فون کال کے انتظار میں اپنی رات برباد نہیں کروں گی۔“ ہنسی کے ساتھ میں اپنی بات مکمل کر کے اس نے فون بند کر دیا۔

اس وقت تک سلطان شاہ میرے سر پر مسلط نہیں ہوا تھا اس لیے میں نے چند خانوں تک سوچنے کے بعد حبیب جیوانی کے گھر فون کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

میرے لیے وہ بہت نازک اور پے پیہہ مرحلہ تھا جس سے نمٹنا آسان نہیں تھا۔

ایک طرف غزالہ ہانگ کانگ میں مدھوش حالات میں گھری ہوئی تھی۔ اسے نئی دہلی سے وہاں پہنچانے والا، بھارتی ایجنٹ موپوش ہو چکا تھا اور ڈون کو انک فو، ویرا کی سفارش کے عین مطابق اسے اپنی تحویل میں لے کر بھگوانت کراچی بھیجنے کے لیے کوشاں تھا لیکن غزالہ اپنے تلخ ترین تجربات سے اس قدر خائف ہو چکی تھی کہ وہ پولیس کی محفوظ تحویل سے نکل کر کسی اجنبی پر بھروسہ کرنے کے لیے آمادہ نہیں تھی۔

اس کے دوسری بار اغوا ہونے کے بعد سے، اس سے میرا رابطہ منقطع تھا اور وہ مسلسل شری مان سنگھ یا اس کے ہم وطن سیکرٹ ایجنٹوں کی قید میں رہی تھی اسے سرے سے اندازہ ہی نہیں ہو سکا ہو گا کہ میں پس پردہ رہتے ہوئے اس کی رہائی کے لیے کیا کچھ جتن کر رہا تھا۔ اسی طرح اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کے

جلد از جلد اس جنجال سے لگنا چاہتا ہے۔
”میرا خیال ہے کہ وہ لڑکی اپنے حالیہ تجربات سے دہشت زدہ ہے اس لیے دوست اور دشمن کی تمیز کھو بیٹھی ہے۔ ڈون اسے پیادہ محبت سے راہ راست پر لا سکتا ہے۔“

”ناممکن!“ اس کا لہجہ دو ٹوک تھا ”موجودہ حالات میں پولیس ڈون کو لڑکی کے پاس پہنچنے بھی نہیں دے گی۔ وہ ڈون ہے اس لیے اپنے قیام و اشار ہوٹل میں محصور ہے اس کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو لڑکی کے خطرناک بیان کی بنا پر جیل یا حوالات کی ہوا کھار رہا ہوتا۔ تم لوگوں نے ڈون کو بڑی مشکل میں ڈال دیا ہے۔“

”ابھی تک تم صرف مسائل ہی بتا رہی ہو۔ تمہارے پاس اس صورت حال کا کیا حل ہے؟“

”ڈون کی بیٹی کو فوراً ہانگ کانگ پہنچ کر ڈون سے ملنا ہو گا تاکہ وہ دونوں مل کر کوئی راہ نکال سکیں۔“

”لیکن میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ وہ شر سے باہر مٹی ہوئی ہے۔“ میں نے الجھن آمیز لہجے میں کہا ”ہو سکتا ہے کہ وہ کئی روز تک واپس نہ آسکے۔ اسی لیے وہ مجھے تم سے متعارف کرا کے گئی ہے۔“

”اگر تمہیں پورا یقین ہے کہ مس تریامی تمہیں پہچان لے گی اور تمہارا مشورہ بھی قبول کر لے گی تو تمہیں بلا تاخیر ہانگ کانگ پہنچنا چاہیے۔ تم میری روانہ ہو جاؤ تو بہت بہتر ہو گا۔“

”ناممکن ہے۔ ابھی تو میرے پاس ہانگ کانگ کا ویزا بھی نہیں ہے۔“ میں نے پُر غفلت لہجے میں کہا۔ مجھے فوراً یہ یاد آ گیا تھا کہ اگلے دن سینٹ حبیب جیوانی نے مجھے ٹریڈ لائن کے دفتر میں طلب کیا ہوا تھا جہاں ایک اہم ترین اجلاس متوقع تھا۔ عرصہ دراز سے التوا میں پڑے ہوئے اس مرحلے کو نظر انداز کر کے، میں اچانک ہی ہانگ کانگ روانہ ہو جاتا تو نہ صرف حبیب جیوانی، بلکہ مافیا کے سارے بڑے میری طرف سے بدظن ہو جاتے۔

”اگر تمہارے پاس اپنے ملک کا پاسپورٹ ہے تو تمہیں ویزا لینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یا صحت اور خریداری کے نام پر یہاں تین ماہ کا ویزا ہاتھ مل جاتا ہے۔ یہ یاد رکھنا کہ تم نے آنے میں تاخیر کی تو پھر کچھ بھی نہیں ہو سکے گا۔ مس تریامی ہاتھ سے نکل جائے گی اور تمہیں بے نیل و مرام واپس لوٹنا پڑے گا۔“

”کیوں؟ لڑکی کہاں چلی جائے گی؟“ میں نے چونک کر سوال کیا۔

”تم بھول رہے ہو کہ ہانگ کانگ میں ہوٹلوں سے لے کر جیلوں تک میں جگہ کی قلت ہے۔ وہاں والے ہر معاملے میں بہت مستعد اور پھرتیلے ہیں اور بلاوجہ کسی کو نہیں پالتے۔ فوری طور پر کوئی حل سامنے نہ آیا تو وہ مس تریامی کو بھارت واپس بھیج دیں گے کیونکہ اس کے سفری کاغذات بھارتی ہیں اور وہ وہیں سے آئی تھی۔“

سے نکلنے کے بعد دوبارہ ان ہی کی قید میں پہنچ جاتی جس کے بعد اس کی بازیابی کے اتنے سازگار حالات دوبارہ پیدا نہیں کیے جاسکتے تھے۔

تحفظ اور بھاگنے کے لیے وہ دونوں ہی کام بہت اہم تھے لیکن مشکل یہ تھی کہ دونوں کا وقت ایک ہی تھا اور میرے لیے ان میں سے صرف ایک کام کو سرانجام دینا ممکن تھا۔

یہ ظاہر ہے کہ میرے لیے دنیا میں غزالہ سے بڑھ کر کوئی نہیں تھا۔ سنگی ماں، سنگے باپ، پھر سوتیلی ماں اور بھائیوں سے ہاتھ دھو لینے کے بعد درحقیقت دنیا میں کوئی ایسا فرد زندہ نہیں رہا تھا جسے میں خون کے محترم اور مقدس رشتے سے پہچان سکتا۔ اس زنجیر کی آخری کڑیاں بکھر جانے کے بعد صرف غزالہ ہی میری ذات کو تقویت اور سارا دینی چلی آرہی تھی کہ وہ خود بھی دنیا میں اکیلی رہ گئی تھی۔

اس کا گھرا نا ہیروئن کی تباہ کاریوں کی ایک عبرت ناک مثال تھا۔ اس کی ماں کا ماضی کسی بھی اعتبار سے قابل رشک نہیں تھا۔ کرمل زوار زیدی سے شادی کرنے سے قبل وہ اس بازار کی ایک بے آب و جنس تھی جہاں مال دزر کے دوز پر زن کو ٹھکر دوں کے شرتال پر ہر شب نچا کر بے حال کیا جاتا ہے پھر بھوکے بدست گدھ اپنا خراج شب وصول کرنے کے لیے، ان جسموں پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ شمع کرمل زوار زیدی کی بیوی بننے سے پہلے اسی محفل کی شمع تھی لیکن ایک مضبوط سارا ملنے کے بعد وہ صرف اور صرف ایک گھروار عورت بن کر رہ گئی۔ شمع اپنے کرب ناک ماضی کو بیکسر محمول جانا چاہتی تھی لیکن لوگ اسے ہر قدم پر یہ یاد دلاتے رہے کہ وہ سدا کی عزت دار نہیں تھی۔ اس بھارتی اور تیم شتر زنی نے شمع کی روح تک کو زخمی کر کے رکھ دیا۔ اس نے اپنے اس درد کو بھلانے کے لیے نشے کی بیساکھی کا سارا لیا اور خود فراموشی کے عالم میں مصنوعی سکون کے سہارے چبے لگی۔ غزالہ اس کی اکھوتی بیٹی اور کامران اس کا اکھوتا بیٹا تھا۔ شمع پان میں کو کین کھانے کی عادی تھی۔ ایک دن ننھے کامران نے اپنی ماں کی بے خبری میں اس کے پائے ان سے کو کین کی ڈیٹا نکال کر ساری کو کین اپنے معدے میں اتار لی۔ اس کی حالت مگر بگڑی تو کرمل زوار زیدی نے اپنے اکھوتے لختہ جگر کی زندگی بچانے کے لیے کوئی دقیقہ بانی نہ چھوڑا۔ ان دونوں کی کوششوں اور محنت سے کامران کی جان تونچ گئی لیکن وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا۔

اپنے ماضی کی آج میں سلگتی ہوئی دل نگار شمع کے ذہن پر ایک نیا اور خوف ناک عذاب مسلط ہو گیا۔ وہ خود کو اپنے بیٹے کے پاگل پن کا ذمے دار سمجھنے لگی۔ جوانی بھی کامران کی دیوانگی کو فرزا گئی میں نہ بدل سکی۔ اس کی بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ شمع کا کوب بھی روز بروز بڑھتا چلا گیا اور وہ شب و روز نشے میں غرق رہنے لگی۔ اور غزالہ اپنی بھولیوں کے دبے دبے طعنے سننے کے

واحد دھونے دار کے طور پر ہانگ ہانگ پولیس کے سامنے آنے والا ہونے واقعی اس کا بہرہ ور اور خیر خواہ تھا۔ سانپ سے ڈسے ہوئے توبی کی طرح وہ رسی سے بھی خوف زدہ تھی۔ اس رد عمل میں غزالہ کا کوئی تصور نہیں تھا۔ وہ جو کچھ کر رہی تھی وہ ذاتی تحفظ کے فطری تقاضوں کے عین مطابق تھا۔ غلطی میری تھی کہ میں دیر کے ساتھ اس پلان کو آگے بڑھاتے ہوئے اس ناگزیر امکان کو فراموشی کر بیٹھا تھا۔

بد قسمتی کی بات یہ تھی کہ غزالہ جن پر اسرار بلکہ مشکوک حالات میں گواہ کوئی اسپید بوٹ سے ہانگ ہانگ کی بحری پولیس کی تحویل میں گئی تھی، وہ گواہ کوئے کے حق میں نہیں تھے اس بوٹ سے ایک ایسا خفیہ کار اور اشتہاری چینی مجرم برآمد ہوا تھا جو چینی پولیس کو برقیقت پر مطلوب تھا۔ ان حالات میں یہ نتیجہ اخذ کرنے کے لیے کسی غیر معمولی ذہانت کی ضرورت نہیں تھی کہ گواہ کوئی اسپید بوٹ ایک مجرم کو محفوظ علاقے میں اسفل کرنے کے لیے استعمال کی جا رہی تھی۔ اس برطانوی نوآبادی کے سخت ترین انتظامی قوانین کے تحت اسپید بوٹ پر موجود ہر فرد کو سنگین الزامات میں ملوث کیا جاسکتا تھا لیکن یہ گواہ کوئے کے اثر و رسوخ کا کرشمہ تھا کہ اس نے قلیل سی مدت میں اس قفسے کو سنبھال لیا تھا۔

وہ نہ صرف خود حالات سے بچا رہا بلکہ اس نے گرفتار ہونے والے دیگر افراد کی رہائی کا بھی بندوبست کرایا لیکن غزالہ کی طرف سے عدم تعاون کے نتیجے میں ڈون کی پوزیشن پھر خراب ہو گئی تھی۔ اس سنگین صورت حال کا ازالہ صرف اسی صورت میں ہو سکتا تھا کہ میں پہلی پرواز سے بہ ذات خود ہانگ ہانگ پہنچ کر غزالہ کو اپنے قبضے میں لیتا اور اس سے ڈون کے حق میں بیان دلا کر اسے بھی عمرانی کے جیل سے آزاد کرادیتا۔

لیکن میری فوری ردائگی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ مجھے مافیا کے مقامی چیف سے کیے گئے، اپنے وعدے کے مطابق اگلے دن ٹریڈ لائن کے دفتر میں موجود رہنا تھا تاکہ مافیا کے ڈان قمری کے تازہ ترین احکام کی فوری تعمیل کو یقینی بنایا جاسکے۔ مہ مافیا میں اپنی شمولیت کے بعد سے، اکثر و بیشتر مختلف جیلوں اور بالوں سے دفتر سے غائب ہی رہتا تھا جسے حبیب جیوانی کسی نہ کسی وجہ سے نظر انداز کرتا چلا آ رہا تھا۔ اگر میں اس اہم موقع پر اسے مطلع کیے بغیر ملک سے باہر چلا جاتا تو وہ چراغ پا ہو کر میرے لیے ایسی مشکلات کمزی کر سکتا تھا کہ میرے لیے شرمیں دوبارہ اپنے قدم نمانے مشکل ہو جاتے۔

اور اگر میں مافیا کے چکر میں مزید ایک دو روز شہری میں رکا رہتا تو قوی امکان تھا کہ ہانگ ہانگ پولیس، غزالہ کو لا واپس اور جبر سے کی بنیاد تصور کرتے ہوئے ملک بدر کر دیتی۔ ان کے ریکارڈ کے مطابق غزالہ بھارتی شہریت کی حامل تھی اسی لیے اُسے کسی بھی بلاؤ سے نئی دہلی بھیج دیا جاتا اور یوں وہ بھارتی درندوں کے چنگل

دوسری طرف سے تیسری گھنٹی پر ایک محمور نسوانی آواز سنائی دی جس پر مجھے حیرت ہوئی کیونکہ اپنی بیوی کی موت کے بعد میرے حبیب جیوانی اپنے مکان پر اکیلا رہ رہا تھا۔

میں نے حبیب جیوانی کے بارے میں دریافت کیا تو رانگ نے فرمایا کہ کمرہ کرفور ای فون بند کر دیا گیا۔

میں نے دوسری بار بہت احتیاط کے ساتھ نمبر لایا اور اس بار بھی وہی آواز سنائی دی لیکن اس مرتبہ وہ خاصی جھٹکائی ہوئی تھی۔

”خاتون! یہ رانگ نمبر نہیں ہے۔ میں نے بہت احتیاط سے نمبر لایا ہے۔ میں حبیب صاحب سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“ میں نے بلا کسی تسمیہ کے اپنی بات شروع کر دی۔

”میں کبھی کبھی ہوں کہ یہ رانگ نمبر ہے“ غصیلے لہجے میں یہی بات کاٹ کر کہا گیا ”پتا نہیں تم لوگوں کو فون پر لڑکیوں کو ستانے میں کیا مزہ ملتا ہے؟ کیا تمہاری ماں ہمیشہ نہیں ہیں؟“

”اتفاق سے کوئی بھی نہیں ہے“ میں نے چند منٹ پہلے سوچی ہوئی حقیقت بلا تکلف دہرا دی ”لیکن پھر بھی میں تمہیں فون پر چھیڑ چھاڑ کر کے وقت برباد کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ تم چاہو تو کبھی مل کر دیکھ لیتا۔ میں ذہنی آوارگی کے بجائے عمل پر یقین رکھتا ہوں۔ اب ذرا حبیب صاحب کو بلا دو۔“

چند ثانیوں تک لائن پر سکوت طاری رہا پھر کہا گیا ”تم اب میری رات برباد کرنے پر تل گئے ہو۔۔۔۔۔ یہ بتاؤ کہ تم نے کیا نمبر ڈال کر کیا ہے؟“

”تم نے تم برباد کرنا کہہ دی ہو“ اسے رات آباد کرنا کہتے ہیں۔ اسی کے ساتھ میں نے حبیب کا نمبر دہرایا۔

”یہ غلط نمبر ہے“ سخت لب و لہجے میں جواب دے کر دوبارہ فون بند کر دیا گیا۔

”تم کیا کرنا چاہ رہے ہو؟“ سلطان شاہ نے میرے چہرے پر نگاہیں مرکوز کر کے سوال کیا۔ وہ ابتدا ہی سے میری جملہ حرکات و سکنات کو گہری خاموشی کے ساتھ، غور سے دیکھ رہا تھا۔

”جوابات یہ ہے کہ اس کی آواز نے مجھے جو دکھایا وہ نہ مکاؤ والی لڑکی سے فون پر بات ہونے کے بعد میں اپنے خیالات میں گم ہو کر گھر کی موجودگی کو ایک سرے سے فراموش کر بیٹھا تھا۔“

”حبیب جیوانی سے بات کر کے دو چار دن کی چٹنی لینی چاہتا ہوں۔ تاکہ میں فوری طور پر ہانگ کاٹک کے لئے روانہ ہو سکوں۔“ میں نے اپنی جگہ چھوڑ کر بے چینی سے نکلنا شروع کر دیا۔

”چٹنی کی ضرورت کیوں پیش آئی؟“ سلطان شاہ نے اپنی جگہ بیٹھ بیٹھے پوچھا۔

میں نے اختصار کے ساتھ اپنی مجبوریوں دہرا دیں جو میرے ذہن میں آجک مار رہی تھیں۔

”پتا نہیں تم پر خود سری اور خود پسندی کا کوئی دورہ پڑا ہے یا تم نے کسی وجہ سے مجھے مکمل طور پر نظر انداز کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے؟“

باوجود تعلیم حاصل کرتی رہی۔

اس مرحلے پر میری غزالہ سے شناسائی ہوئی تو وہ چار نفری گھرانے کی رونقوں کی امین تھی۔ اس کا پاگل بھائی آہنی جنگلے والے دودھ سے بچے ہر وقت ایک کمرے میں مقفل رہتا تھا۔ جنون کے عالم میں وہ کبھی اپنے باپ کو لو لمان کر دیتا، کبھی اپنی ماں پر ہاتھ اٹھاتا تھا لیکن غزالہ کے سامنے وہ ہمیشہ کسی بالٹو جانور کی طرح صلح جو، فرماں بردار بلکہ سہما سہما سمجھی نظر آتا تھا۔ کرل زوار زیدی کو غزالہ کے روپ میں ایک جوان بیٹائی نظر آتا تھا۔

کوئین کا بڑھتا ہوا استعمال آخر کار رنگ لایا اور نجف و نزار شیخ ایک دن اچانک ہی گل ہو گئی۔ کرل کے لیے وہ بہترین ساتھی تھی۔ کرل نے زندگی کے طویل سفر پر اسے اپنا ساتھی منتخب کر کے اپنے سارے خاندان کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا تھا کیونکہ ان میں سے کوئی بھی شیخ محفل کو چراغ خانہ کے طور پر قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اب جو شیخ یوں چپکے سے دنیا سے کوچ کر گئی تو کرل زوار زیدی نے زندگی کے پتے پتے اور بے رحم صحرا میں خود کو لپکایک تنہا پایا جہاں ہر طرف سراب ہی سراب تھے منزل کا کسی بھی سمت میں کوئی نشان نہیں تھا۔ شیخ کے ساتھ وہ اس صحرا میں صدیوں ہلک سکتا تھا۔ لیکن تنہائی کا احساس اس کے وجود میں ایسا سراپت ہوا کہ اس نے اپنی بیوی کے سرہانے اپنے سر میں گولی مار کر خود کشی کر لی اور یوں غزالہ چند ہی لمحوں میں ماں کی مٹا اور باپ کی شفقت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئی۔ بعد میں اس کا بھائی کا حراں بھی اپنے علاج کے آخری مراحل میں پوری طرح صحت یاب ہونے سے ذرا پہلے شی کے ان سفاک درندوں کا آلا کار بن گیا جو اُن دنوں میرے خون کے پیاسے بنے ہوئے تھے اور یوں غزالہ بھی میری طرح بھری دنیا میں اکیلی رہ گئی تھی جسے میں کسی بھی صورت میں بے یار و مددگار نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

یہ اور بات تھی کہ شری مان سنگھ کی دوغلی پالیسی کی وجہ سے میرے ذہن میں صورت حال صاف نہیں تھی۔ شری مان سنگھ اور دیرا کے معاہدے کے مطابق غزالہ ہی کو ہانگ کاٹک میں موجود ہونا چاہیے تھا لیکن اس مردود نے مجھ سے جو کچھ کہا ”اس کے مطابق“ غزالہ بدستور نئی دہلی میں قید تھی اور اس کی جگہ شگفتہ دیوی نامی ایک لکھنؤی لڑکی کو مس تریا بھی کے روپ میں ہانگ کاٹک بھیج دیا گیا تھا۔

اس غیر معمولی بے یقینی کے باوجود میں غزالہ کی بازیابی کے مہم ترین امکان کو بھی نظر انداز کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ وہ غزالہ ہوتی تو میں محرم جیت لیتا۔ اس کی جگہ تنگدست ہوتی تو میں اس کے ہر تریا چلتر کا بخوبی مقابلہ کر سکتا تھا۔ اس تمام ذہنی جتناہنگ کے بعد ہی میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ مجھے فون کر کے اپنے باپا چیف سے اگلے دو تین روز کے لیے فوری طور پر رخصت مانگ

اس کے چہرے کے ساتھ ہی اس کی آوازیں بھی اڑا رہی تھیں۔
 تھا ”تمہیں حبیب حیوانی کو پھینکنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔“
 میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور پھر اس کے قریب
 ہی بیٹھتے ہوئے مصالحہ لے لے کر چلا ”تمہارے ذہن میں کوئی
 تجویز ہو تو بتاؤ“ اس وقت میرا ذہن شدید انتشار کے عالم میں ہے۔
 ”مشکل یہ ہے کہ تم نے اب خود کو اکیلا سمجھنا شروع کر دیا
 ہے“ اس کی آنکھوں سے آنسو اور ہلکی سی ملامت کا کھلا اظہار
 ہو رہا تھا لیکن اس کا لہجہ سنا تھا ”تمہیں مجھ پر اعتماد ہو تو میں
 ہانگ کا ٹنگ جاسکتا ہوں۔“ غزالہ بھائی مجھے بھی نہیں ہوگی۔ وہ میری
 بات مان لے گی۔ تم آرام سے کل مانیہ کے دفتر میں وقت گزار سکتے
 ہو۔ اس طرح کسی بھی پریشانی کے بغیر دونوں کام بیک وقت کیے
 جاسکتے ہیں۔“

میں نے بے اختیار اسے اپنے سینے سے لگا لیا اور اضطرابی،
 جذباتی اہال کے تحت کہا ”میں تمہیں اپنی ذات سے الگ نہیں
 سمجھتا۔ بس پریشانیوں میں گھبرنے کے بعد مجھے کبھی میرا ذہن ماؤف
 سا ہو جاتا ہے اور سامنے کی کھلی کھلی باتوں کو نظر انداز کر کے، میں
 دور کی کوڑی لانے کے چکر میں الجھ جاتا ہوں۔“

اس نے جو کچھ کہا، وہ واقعی بہت سہل اور قابل عمل تھا۔ وہ
 غزالہ نہ صرف سلطان شاہ سے اچھی طرح واقف تھی، بلکہ اسے
 اپنے بھائی کی طرح عزیز رکھتی تھی۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ میں
 اپنے معاملات میں سلطان شاہ پر کس حد تک اعتماد کرتا ہوں۔ اگر
 میرے بجائے وہ ہانگ کا ٹنگ روانہ ہو جاتا اور وہاں غزالہ سے مل
 کر اسے یہ پیغام پہنچانے میں کامیاب ہو جاتا کہ کوئی فو اس کا
 دشمن نہیں، بلکہ خیر خواہ ہے تو غزالہ پہلی فرصت میں پولیس کی
 محفوظ تحویل کو خیرباد کہہ کر کوئی فو اس کے ساتھ چل جاتی اور ساری
 الجھنیں رفع ہو جاتیں۔

اسے روانہ کر دینے کے بعد میں پوری یکسوئی کے ساتھ مانیہ
 کے معاملات پر توجہ دے سکتا تھا۔

بچپن سے ہی ہمارے حالات بہت محدود تھے اس لیے ہم نے
 جعلی سفری دستاویزات پر غیر ملکی سفر کیا تھا اور پاکستان واپس پہنچتے ہی
 ان دستاویزات کو تلف کر دیا تھا لیکن اس مرتبہ میں سلطان شاہ کو
 جعلی پاسپورٹ پر سفر کرنے کا مشورہ نہیں دینا چاہتا تھا۔ میرا تجربہ تھا
 کہ ہانگ کا ٹنگ انٹرویو پر متعین، امیگریشن حکام بہت تجربہ کار
 اور اپنے کام میں ماہر تھے وہ اپنی سرزمین پر آنے والوں کی سفری
 دستاویزات پیشہ وارانہ مہارت کے ساتھ جانچتے تھے اور بالعموم
 فوراً ہی ہرگزبڑ کا سراغ لگالیتے تھے۔

”تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں“ اس مسئلے سے
 واقف ہونے کے بعد سلطان شاہ نے کہا ”تم بس فیصلہ کرو اور باقی
 کام مجھ پر چھوڑ دو۔ میں اپنے پاسپورٹ کا بندوبست خود ہی کر لوں
 گا۔“

”مگر میں جانا چاہتا ہوں کہ تم کیا بندوبست کرو گے میں اپنے
 مفاد کے لیے تمہیں آنکھیں بند کر کے کسی خطرے میں نہیں جھونک
 سکتا۔“
 ”میرے علاقے کے کچھ لوگ کراچی میں ایک بڑے ٹنگ ایجنسیوں
 چلا رہے ہیں۔ کچھ پیسے ضرور خرچ ہوں گے لیکن وہ چند محنتوں میں
 ہی میری باضابطہ روائی کا بندوبست کر ادیں گے۔ بات صرف
 تمہاری اجازت کی ہے۔ تم کو تو میں اسی وقت سے اپنی کو مشینوں کا
 آغاز کر سکتا ہوں۔“

سلطان شاہ کا مشورہ بہت معقول اور ذہنی تھا۔ وہ اپنے مرام
 اور پیسے کے زور پر کام نکال سکتا تھا تو اس سے اچھی کوئی بات ہی
 نہیں تھی۔ اس وقت میرے ذہن میں ایک تدبیر یہ بھی آنی لگی کہ
 مانیہ کے پروردہ، ان سرکاری افسران میں سے کسی سے رجوع کر
 جنہیں حبیب حیوانی نے رشوت کے ذریعے یا ان کی گھناؤنی اخلاقی
 کمزوریوں کی بنا پر بلیک میل کر کے اپنا ہم نوا بنایا ہوا تھا۔ ام
 سرکاری اور انتظامی افسران پر اپنی گرفت قائم کرنے کے لیے
 حبیب حیوانی نے اپنے تجربات کی بنا پر کراچی میں مغربی طرز پر جس
 ماہر پر آزاد کی کلب کی بنیاد ڈالی تھی، اس کی شرمناک کارکردگی
 مجھ سے دھکی چھپی نہیں تھی۔

سیٹھ حبیب حیوانی نے ساحل سمندر سے ذرا دور ایک خوب
 صورت اور وسیع وعریض عمارت میں حسین و جمیل، مقامی اور غیر
 ملکی لڑکیوں کی ایک بے حساب بھیر جمع کی ہوئی تھی۔ کلب کی
 بو جمل اور روبان پرورش میں ان لڑکیوں کو معزز بیگمات کی طرح
 ناز و داد کے پردوں میں لپیٹ کر، وہاں آنے والے با اختیار افسران
 کے سامنے پیش کرتی تھیں۔ بظاہر وہ سب آزاد خلیوں کی طرح
 گھومتی پھرتی یا تقریحات میں مصروف نظر آتی تھیں لیکن ان میں
 سے ہر ایک کا نشانہ پہلے سے طے ہوا تھا اور وہ دیدہ و دانستہ اسی
 کے گرد ناز و انداز دکھا کر اس کی آتش شوق کو ہوا دیتی تھیں۔ پھر
 جن، اسکاچ، روم اور واڈا کے سرور میں ڈوبے ہوئے شکار، اندھا
 گمراہ ہونے سے پہلے، اس جال میں پھنس کر غلوت میں طے جانے
 تھے جہاں خود کار یہیروں کی نگاہیں ہر منظر کو ویڈیو کے مقابلے میں
 پر محفوظ کر لیتی تھیں اور یوں یو رو کر کسی کے مضبوط ڈھانچے میں مانیہ
 کے مددگاروں کی تعداد میں اضافہ ہو جاتا رہتا تھا۔

مانیہ کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ ان مقتدر افسران سے
 کام نکلانے کے لیے صرف بلیک میلنگ پر ہی انحصار نہیں کیا جاتا
 تھا بلکہ اس کے ذریعے انہیں صرف راہ پر لایا جاتا تھا۔ مانیہ کے
 مفادات کے تحفظ پر آمادہ ہوجانے کے بعد ان سے جو بھی کام لیا
 جاتا تھا، اس کا معاوضہ انہیں باقاعدگی سے ادا کیا جاتا تھا۔

میرے پاس ایسے افسران کی فہرست موجود تھی جن سے
 مخصوص حوالوں کے ذریعے کوئی بھی غیر قانونی کام لیا جاسکتا تھا۔
 لیکن اس مرحلے پر ان لوگوں سے رجوع کرنے کے بجائے سلطان

لوکیاں، خودی شکار ڈھونڈتی پھرتی ہیں۔ سفر بے شرط، مسافر نواز
بھیرے، والی بات شاید ناک ہی کے لیے کہی گئی ہے۔

”اگر وہاں بے شری کا یہی حال ہے تو ان کی قوی حیت کہاں
سوری ہے؟ وہاں کے جو آسودہ حال گھرانے اس لعنت سے محفوظ

ہیں، وہ خود کو تھائی کتے ہوئے کس قدر شرمسار ہوتے ہوں گے؟“

”یہ تو وہی لوگ بنا سکتے ہیں۔ میں یہ ضرور بتا سکتا ہوں کہ جب
کسی بھی معاشرے میں بدی کے ہولناک عفریت پھڑپھڑا چھائیوں کو

نگل جائیں تو وہاں بسنے والوں کے دل و دماغ میں سے بدی کا احساس
مٹ جاتا ہے یا شاید معاشرتی ضمیر تباہ ہو جانے کے بعد بدی کی

قوتیں سرعام اپنا طاغوتی ناچ ناچنا شروع کرتی ہوں۔ یہ پہلے انڈیا
پہلے عربی و اسلامیہ مسئلہ ہے۔ میں نے سنا ہے کہ کاروباری ملاقاتوں تک

میں میزبان اپنے ہر مہمان کو انفرادی طور پر جس مخالف کی صحبت
فراہم کرنا اپنا کاروباری اور اخلاقی فرض تصور کرتے ہیں۔“

”میں نے تفریح کے لیے تھائی لینڈ کی مقبول اور شہرت تو
بہت سنی ہے لیکن تمہاری باتیں میرے لیے نئی ہیں۔ میں سوچ بھی

نہیں سکتا تھا کہ وہاں تفریح کا مفہوم اس قدر محدود اور مخصوص
ہو گا۔“

”وہ نام کی جنگ سے پہلے تھائی لینڈ کے لوگ بہت غریب
اور خستہ حال تھے لیکن وہاں ساری معاشرتی اقدار زندہ تھیں۔

سانیکاؤں اور دوسرے ویت نامی محاذوں سے تعطیل پر آنے والے
امریکی سپاہیوں کی دلداری کے لیے امریکیوں نے کچھ مقاموں کے

ساتھ ناچ کھڑوں، شراب خانوں اور قحبہ خانوں کی سرپرستی شروع کی
تو وہاں پیسہ برسنے لگا۔ امریکی سپاہی اپنے وطن سے ہزاروں میل

دور ایک بے مقصد جنگ کا ایندھن بنے ہوئے تھے محاذ پر ان کے
چاروں طرف موت کے ڈراؤنے ہیولے ناچتے رہتے تھے ہر سپاہی

ہر روز اپنے ہاتھوں سے اپنے ساتھیوں اور دوستوں کی لاشوں کے
بکھرے ہوئے اعضا سمیٹ کر تابوت میں ڈالتا تھا۔ وہ جانتے تھے

کہ کسی بھی لمحے وہ اچانک موت کی بے نام دایوں میں دھکیل
دیے جائیں گے۔ اس لیے چھٹی پر آیا ہوا ہر سپاہی اسے آخری

چھٹی سمجھ کر مینا اور اپنے الاؤں لٹاتا تھا۔ موت کی لاشوری
بلکہ شعوری دہشت انہیں زندگی کے ہر لمحے سے ستریں چھوڑ لینے پر

تیار کی تجویز کو قبول کر لیتا ہی بہتر تھا۔

”تم نے میرے ذہن پر سے بہت بڑا بوجھ اتار دیا ہے۔ تم اسی
رہنمائی روایت کی تیاریاں شروع کر دو۔ بس یہ خیال رکھنا کہ

پورٹ پر تمہارا اصل نام ہونا چاہیے۔ ہانگ کانگ کی پولیس
نماری شناخت کے لیے پاسپورٹ کے علاوہ کسی اور چیز کو قبول

نہیں کرے گی۔ اگر وہاں تمہارا کوئی اور نام غزالہ تک پہنچا تو وہ
بڑک کر تم سے ملنے سے انکار کر دے گی اور تم بلاوجہ پولیس کی

نظروں میں آ جاؤ گے۔“

”تم ان ریکورڈنگ ایجنٹوں کو نہیں جانتے“ وہ ہنستے ہوئے بولا۔
”ہمارا کام سیدھا اور قانونی ہو گا۔ میرے اصل نام اور تصویر سے

پورٹ بنے گا۔ وقت گزر چکا ہے ورنہ یہ کام آج ہی ہو جاتا۔
اب صبح فائر کھلتی ہی میرا کام ہو گا اور میں پہلی پرواز سے روانہ

ہو جاؤں گا۔“

”میں اسے ہانگ کانگ کے لیے براہ راست پروازوں کی
فہرست شاید بہت کم ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تمہیں ہانگ کانگ پولیس رکنا

پڑے۔ ہانگ کانگ اسے تو توڑا چاروں کھونٹ چوس کر رہتا۔“

”کیا وہاں بھی کوئی خطرہ ہے؟“ اس نے چونک کر سوال کیا۔
”ایمان کو سخت خطرات لاحق رہتے ہیں۔ سرکاری عمل داری

سے باہر آتے ہی وہاں کی صنعت کار ناز نہیں اور ان کے
نمائندے سرمایہ کاری کے لیے، مہمان پر لیفا کر دیتے ہیں۔ میں

نے ماضی کے تجربات کو یاد کرتے ہوئے کہا۔
”پہیلیاں بچھانے کے بجائے سیدھی طرح بتاؤ کہ تم کیا کتنا

چاہ رہے ہو؟“ اس کی نگاہوں سے الجھن ہو ائی تھی۔ شاید میری
بات اس کے لیے ہی نہیں پڑ سکی تھی۔

”وہ نام کی جنگ کے زمانے سے، عصمت فردوسی تھائی لینڈ
کی سب سے بڑی گھریلو صنعت ہے۔ سیاحت کے پیشے سے وابستہ ہر

فصل کسی نہ کسی طرح اس صنعت سے وابستہ ہے۔ ازپورٹ کے
قسطوں سے لے کر ہوٹل منیجر تک، سب ہی اس ہستی گنگائیں ہاتھ رکھنے

کی فکر میں گئے رہتے ہیں۔ ایڈز کی ہولناک وبا بھی ان کے کاروبار
پر بہت زیادہ اثر نہیں ڈال سکی ہے۔ جسے بھی اپنے اور زیادہ مہمان

پانچ تو فوراً ہی لالچل پڑھ کر اس سے ہزار قدم دور بھاگ لینا ورنہ
انہمازت و عنف سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔“

”لا حول و لا قوت“ وہ جھینپ کر بڑبڑایا۔ ”تم تو اس طرح ڈرا رہے
ہو جیسے وہ پورا ملک ہی ہیرا منڈی ہے۔ آخر کو شرفا بھی تو وہاں

جاتے ہوں گے۔“

”وہاں صرف شرفا ہی جاتے ہیں کیونکہ اپنے ملک میں ایسی
تفہات میں دلچسپی لے کر وہ اپنی شرافت کو داغدار کرنے کا خطرہ

مہل نہیں لے سکتے پورا تھائی لینڈ تو میں نے بھی نہیں دیکھا لیکن
ہانگ کانگ کے ساتھ ہی سیاحت کی دوسری آئے ہوئے دوسرے شہروں

اور ساحلی مقامات کا یہی حال ہے۔ ہر سن و سال کی عورتیں اور

سائنس دانچھٹ کا دلچسپ ترین سلسلہ

طالوت

3 حصوں میں (حصہ 1)

قیمت فی حصہ 50 روپے

23 روپے

کتابیات پبلی کیشنز

پوسٹ بکس 23 کراچی 74200

اسکاتی تھی جس کے نتیجے میں وقت نام کے ارد گرد ہزاروں اڈے تیزی سے کھلتے چلے گئے۔ اس طویل جنگ کے خاتمے کے بعد عیاشی کے دیگر نمکدانے سرعت سے ویران ہو کر اجڑتے چلے گئے لیکن تھائی لینڈ کا شباب کھڑا رہا کیونکہ اس ملک کی ایک تاریخ ہے وہاں خوب صورت سواحل اور قابل دید تاریخی مقامات ہیں۔ اس لیے اب امریکی کامیوں کے بجائے بین الاقوامی سیاح ان پر اسرار تفریح گاہوں میں بھرے رہتے ہیں اور امریکیوں کا لنگھا ہوا بے شرمی اور بے حیائی کا پورا ایک تناور درخت بن چکا ہے۔ تھائی جانتے ہیں کہ اس درخت کی ذہریلی جڑیں اندری اندر ان کی زمین کو چاٹ رہی ہیں لیکن وہ خاموش ہیں کیونکہ اس درخت کی گھنی اور ٹھنڈی چھادیں سے انہیں آن گت راحتیں ملتی ہیں۔ ترقی اور خوشحالی کے لیے زرببادلہ ضروری ہے اور تھائی لڑکیاں اپنے ملک کے لیے سب سے زیادہ زرببادلہ کماری ہیں۔ لمبے ترنگے اور سفید فام امریکیوں سے کھلے میل جول کے نتیجے میں ان کے خدو خال بھی دلکش ہو گئے ہیں۔ دوغلی نسل کی، تیزی سے ختم ہونے والی اور دراز قامت لڑکیاں اپنے گاہکوں کو غلوت میں ان بے وفا امریکیوں کی کمائیاں سناتی ہیں جنہوں نے عمر بھر کا پیمانہ وفا باندھ کر ان کی مقامی ماؤں سے شادیاں کر کے اپنے گھر سے ہزاروں میل دور ایک ناگہر آباد کیا اور اپنی مقامی بیویوں کو کئی کئی بچے بچیاں کی ماں بنادیا لیکن جنگ کا طبل بجنا بند ہوا تو وہ دغا باز اپنے بیوی بچوں کو بھول کر وطن واپس بھاگ گئے۔ ان کے جوان لڑکے اب سیرگاہوں میں دلا لیاں کرتے پھرتے ہیں اور ان کی نیلی اور سبز آنکھوں والی دلکش بیٹیاں سیاہوں کے دل لہکا کر اتنے پیسے جوڑنے کی فکر میں گلی رہتی ہیں کہ ایک بار امریکا جا کر ان بھگڑے پاؤں سے یہ پوچھ سکیں کہ جب انہیں بھاگ ہی جانا تھا تو انہوں نے اولاد کی آرزو کیوں کی؟ ان کی ماؤں کی آنکھیں تو امریکی سپاہیوں کے لیے ویسے ہی کھلی رہتی تھیں۔ وہ باپ بنے بغیر بھی اپنے سارے یادگار تجربوں سے گزر سکتے تھے۔

سلطان شاہ خاموشی اور پوری توجہ کے ساتھ میری وہ تقریر سنتا رہا۔ میں خاموش ہوا تو وہ مسکراتے ہوئے بولا ”تم امریکیوں کے بارے میں کچھ زیادہ ہی حساس ہو گئے ہو۔ جنگ کیس بھی اور کسی بھی دو قوموں کے درمیان ہو، وہ دوسری ہر تباہی لانے سے پہلے اخلاق اور کردار کو تباہ کرتی ہے۔ جنگ زدہ خطوں میں اعلیٰ اخلاقی کردار کا وجود شاید ہی کیس ملتا ہو۔ فتح یا شکست سے پہلے یہ ایک بنیادی نقصان ہوتا ہے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اخلاقی اور انسانی اقدار جنگ کا پہلا ایندھن بنتی ہیں لیکن وہ ایک فطری عمل ہوتا ہے لیکن امریکی ان خرابیوں کو جانتے ہوئے انداز میں تیزی سے پھیلانے کے مجرم تھے۔ وہ جانتے تھے کہ وہ اپنے ملک کا نہیں، دوسرے ممالک کا اخلاق اور کردار تباہ کر رہے ہیں۔ ان کی یہ خود غرضی ہر جگہ نمایاں نظر آتی ہے۔ تم شرم کی مثال ہی لے لو۔ یہ ہمارا ذاتی تجربہ بھی ہے۔ امریکی معاشرے کو ہیروئن کے تباہ کن اثرات سے بچانے کے لیے

ہماری نوجوان نسل کو اسی اندھے غامض دھکیل دیا کہ فزبر قانون یا ضابطے کی رو سے جائز ہے؟ لیکن یہ ہوا ہے میں سنا دانستہ ہیری کیگز اور اس کے پیش رو کی گھناؤنی سرگرمیوں کا حوالہ نہیں دیا کیونکہ ان سازشوں کو سیاسی اور معاشی مفادات کے تحفظ کی کوششوں کا نام دیا جاسکتا ہے لیکن ہیروئن تو ایک آفاق اور انسانی مسئلہ ہے۔ اس کے انسداد کی کوششوں میں ملک، قوم اور علاقے کا امتیاز برتا رہتا رہتا ہے۔ قابل نفرت سی کھائے گا۔

”میں تم سے بحث میں نہیں جیت سکتا۔“ وہ ہنسنے ہوئے بولا۔ ”مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ تم جو کچھ کہتے ہو، اس کے حق میں دلائل کا ایک انبار بھی رکھتے ہو۔ تم نے ذرا سی بات پر مجھے تھائی لینڈ کے بارے میں اتنی معلومات بہم پہنچادی ہیں کہ میں دوپہتے تک وہاں کرکھی یہ سب نہیں جان سکتا تھا۔“

”تمہیں اکیلے سفر کا تجربہ نہیں ہے اس لیے میرا فرض غاکر میں تمہیں نصیب و فراز سے آگاہ کر دیتا۔“ بنکاک میں ویسے بھی جرائم کی شرح روز افزوں ہے۔ جرائم پیشہ افراد سے ساز باز رکھنے والی لڑکیاں یا ٹیکسی ڈرائیور، سادہ لوح سیاہوں کو مضامانی ورافروں میں لے جا کر لٹوا بھی دیتے ہیں۔ تمہیں وہاں رکنا پڑا تو تمہارا قیام خانہ مختصر ہو گا۔ بہتر یہی ہو گا کہ تم اپنا وقت ٹرانزٹ لاؤنچ میں گزار دو۔ سلطان شاہ کو ہانگ کانگ بھیجے گا فیصلہ کر لینے کے بعد وہاں سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا تھا اور ہم دونوں کے پاس وقت بھی تھا۔ اس لیے میں سلطان شاہ کو اس کے سفر کے بارے میں ان تمام امکانات سے آگاہ کرتا رہا جو میری نظروں میں اہم تھے۔ پھر سلطان شاہ گاؤں کی چابی لے کر غلیٹ سے نکل گیا۔

اس کے چلے جانے کے بعد مجھے اچانک ہی خیال آیا کہ میں نے مکاؤ والی لڑکی سے تھوڑی دیر بعد بات کرنے کا وعدہ کیا تھا لیکن خاصا وقت گزر جانے کے باوجود میں اس وعدے کو بھولا ہوا تھا۔ میں نے فوراً ہی مکاؤ کا نمبر ملانا شروع کر دیا۔ میری پہلی ہی کوشش بار آور ثابت ہوئی اور مکاؤ سے سلسلہ مل گیا مگر مجھے اس وقت بدترین مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ جب وہاں سے دوسری ٹھکی کی آواز کے بعد چوہے کی مانوس چوں چوں کے بجائے نسوانی آواز میں کوئی پیغام سنائی دینے لگا۔

میں نے اس نسوانی آواز کا سلسلہ کلام قطع کر کے اپنی بات کرنی چاہی لیکن اس کے لب و لہجے پر اپنے الفاظ کا کوئی اثر محسوس نہ کرتے ہوئے میں نے سمجھ لیا کہ وہ ریکارڈ کیا ہوا کوئی پیغام تھا۔ اس فون سے سلسلہ ملنے ہی کسی خود کار نظام کے تحت چل پڑا تھا۔ پہلے چینی یا اسی سے ملتی جلتی زبان میں چند فقرے ادا کیے گئے پھر شاید وہی پیغام انگریزی میں دہرایا جانے لگا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ رات ہو جانے کی وجہ سے محل کے ملازمین آرام کر رہے ہیں اس لیے صبح ہونے سے پہلے فون پر کسی سے بات ہوئی ممکن نہیں تھی۔ میں نے ریسپورڈ کیڈل پر ڈال دیا۔

ذہن صاف ہوا تو سینہ حبیب جوانی کا مسئلہ ایک مرتبہ

بتاؤ کہ تم اپنی والدہ کو اپنے فلیٹ سے کب رخصت کر رہے ہو۔
اپنے وعدے کے مطابق اسے بارہ بجے تک میرے پاس پہنچ جانا
چاہیے تھا لیکن وہ اب تک غائب ہے۔“
شاید اسے اندازہ ہو گیا کہ مشتعل ہو کر وہ میرا کچھ بگاڑ سکتا تھا
نہ ہی میرے بارے میں کوئی بات معلوم کر سکتا تھا۔ اس لیے اس
نے فوراً ہی سنبھالا لیتے ہوئے کہا ”تم بلاوجہ مجھے اشتعال دلانے کی
کوشش کر رہے ہو۔ کھل کر بتاؤ کہ تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟ میرا
خیال ہے کہ اس سے پہلے بھی تم دوبار فون کر چکے ہو۔“
میرے دماغ پر اس وقت شیطان سوار ہو چکا تھا، اس لیے میں
نے پورے سکون کے ساتھ کہا ”یہ میرا پہلا فون ہے۔ ہو سکتا ہے
کہ تمہاری محبوبہ نے میرے علاوہ دوسروں کو بھی وقت دیا ہو اور
اور وہ بے چارے بھی میری طرح دل تھامے اس کا انتظار کر رہے
ہوں۔ وہ ان ہی میں سے کسی کے فون رہے ہوں گے۔ اگر وہ اب
بھی تمہارے پہلو میں موجود ہے تو اس سے میری بات کرادو۔
ہو سکتا ہے کہ اس کا دل پہنچ جائے۔“
”تم جو کوئی بھی ہو،‘ زے‘ آؤ کے پٹے ہو اور بلاوجہ اپنا وقت
برباد کر رہے ہو۔“

”وہ مجھے منع کرے تو میں اسے بھول کر سو جاؤں گا۔ ابھی
تک تو میں۔۔۔“ مجھے اپنی بات ادھوری چھوڑ دینی پڑی کیونکہ مجھے
دوسری طرف سے اسی عورت کی آواز سنائی دے رہی تھی۔
”یہ وہ آواز نہیں ہے“ وہ کہہ رہی تھی۔ شاید حبیب حیوانی
نے اپنا آخری فقرہ ادا کرتے ہی ریسپور اسے تھما دیا تھا کہ وہ میرا
جواب سن کر آواز شناخت کر سکے لیکن میری بدلی ہوئی آواز کی وجہ
سے اس نے فوراً ہی اپنی ناکامی کا اعتراف کر لیا تھا ”تم ہی دیکھو کہ
یہ کیا چاہتا ہے؟ میں اس آواز سے بالکل ناواقف ہوں۔“
”شاید تم نے سن لیا ہو گا کہ وہ تم سے بات کرنے پر آمادہ
نہیں ہے“ حبیب حیوانی نے لائن پر آکر کہا ”بچھلے فون بھی
تمہارے نہیں تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان بے وقت فون
کالز سے تم لوگ کیا مقصد حاصل کرنا چاہ رہے ہو؟“
”لوگ نہیں، میں ایک فرد ہوں اور تمہاری محبوبہ میں برابر کا
سامجھے دار ہوں۔۔۔۔۔“

اس نے میری بات کاٹ کر مجھے ایک شرمناک مقام پر جانے
کا مشورہ دیا اور فون بند کر دیا۔
میں چند ثانیوں تک ریسپور ہاتھ میں لیے بیٹھا رہا پھر میں نے
سلسلہ منقطع کر دیا۔

دو بجنے سے ذرا پہلے ایک مرتبہ فون کی گھنٹی بجی۔ میرا خیال
فوراً ہی حبیب حیوانی کی طرف گیا۔ کچھ بھی ہو، وہ آخر کار مافیا کے
مقامی ہیرو کا چیف تھا اور خود کو موصول ہونے والی فون کالز سے
تشویش میں مبتلا ہو کر، مجھے ٹولنے کا فیصلہ کر سکتا تھا۔ اگر میں اپنی
اصل آواز میں بولتا اور دوسری طرف اس کی محبوبہ ہوتی تو وہ میری
آواز فوراً پہچان لیتی۔ کوئی نئی آواز اختیار کرنے کی صورت میں وہ

برے دماغ میں سرا بھارتے لگا۔
میں نے دو مرتبہ اس کا نمبر ملایا اور دونوں مرتبہ ایک ہی
عورت نے نہایت ڈھٹائی کے ساتھ رانگ نمبر کا اعذر پیش کر کے
فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔
حبیب حیوانی اپنے گھر پر اکیلا رہتا تھا تو اس کے فون پر کسی
عورت کا سوچو دو ہوتا حیران کن نہیں تھا۔ وہ اپنی بیوی سے محرومی
کے بعد زیادہ عرصے تک تجڑ کی زندگی نہیں گزار سکتا تھا۔ ویسے بھی
مجھے بتانی چکا تھا کہ ان دونوں وہ دفتر سے غیر حاضر رہ کر اپنے گھر پر
آرام کرتا تھا۔ اس آرام میں کسی کرل فریڈ کا وجود بدیہی طور پر
ہمیز نظر آتا تھا لیکن پھر کیا وجہ تھی کہ اس عورت یا لڑکی نے
رانگ نمبر کا اعذر پیش کرنے کی ضرورت محسوس کی؟
میں کچھ دیر تک اسی تھکن کو سلجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ اس
دوران میں ذہنی سکون حاصل کرنے کے لیے میں نے وال کینٹ
میں سے بلو لیبیل اسکاچ کی بوتل نکال کر اپنے لیے ایک صحت مند
پیک مایا بنا تھا جو آہستہ آہستہ میرے معدے میں خنقل ہوتا
جاتا تھا۔

سگریٹ اور اسکاچ کے سکون پر دوران حیران نے بھی جب میری
مدد نہیں کی تو میں نے تیسری مرتبہ سینٹھ حبیب حیوانی کے گھر کا فون
نمبر ملانے کا فیصلہ کر لیا۔

رابطہ ہوتے ہی پہلی گھنٹی عمل ہونے سے پہلے دوسری طرف
سے ریسپور اٹھانیا گیا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی کال کے انتظار میں
فون سے لگا بیٹھا تھا۔

اس بار واضح طور پر حبیب حیوانی کی تردید آمیز آواز سنائی دی
تھی۔ پہلے میں خود حبیب حیوانی سے بات کرنے کے لیے بے چین
تھا لیکن سلطان شاہ کو ٹانگ روائہ کرنے کا فیصلہ کرنے کے
بعد مجھے حبیب حیوانی سے بات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں رہی
تھی۔ تیسری مرتبہ اس کا نمبر ملانے کا سبب صرف میرا تجسس تھا۔
میں یہ جاننا چاہ رہا تھا کہ وہ خود کیوں فون پر آکر جواب دینے سے گریز
کرتا تھا؟

مگر اس کی آواز سننے ہی میں نے کچھ سوچے سمجھے بغیر بدلی ہوئی
آواز سے پوچھا ”وقت کیا ہوا ہے؟“

الکھائے ہوئے گفتگو کے لیے وہ وقت واقعی نامناسب تھا اس
سے میرا سوال سن کر حبیب حیوانی بجا طور پر بھٹا گیا ہو گا۔ جواب
میں اس نے فون پر ایک گندی کالی دی اور میں زور سے ہنس پڑا۔
”میں تم سے صرف اتنا پوچھنا چاہ رہا تھا کہ وہ تمہارے پاس
سے کب واپس لوٹے گی؟“ میں نے ہنسی کے دوران ہی بدلی ہوئی
آواز میں سوال کیا۔

”وہ تمہاری بیٹی ہے یا ماں؟“ اس نے بے تماشاً مغلطات بکنے
کے بعد پوچھا۔

”میرا اس سے وہی رشتہ ہے جو تمہارا اس سے ہے“ ہلکے سے
نور کے عالم میں، مجھے اس کو چڑانے میں لطف آنے لگا تھا ”اب

ی تھی تو سلطان شاہ وہاں پہنچ کر اسے کو ایک فوسے تعداد کا مہل دے سکا تھا اور اگر وہ شکستہ دیوی تھی تو ہمیں ہانگ ہانگ کو مہل بحال کرنی دہلی پر اپنی توجہ مرکوز کرنی تھی۔

اسپیشل ٹانگ فورس کوئی سرکاری فوج تھی نہ میں کوئی سرکاری اہل کار۔ اگر غزالہ اس وقت تک نئی دہلی میں ہی پھنی ہوئی تھی تو میں اپنی ذاتی حیثیت میں انڈین کوئٹ کے کسی اہم عہدے دار سے اس کی واپسی کے لیے سوئے بازی کر سکتا تھا۔ شری مان سنگھ کی رہائی کے عوض وہ لوگ غزالہ کو میرے حوالے کرنے پر آمادہ ہو سکتے تھے۔

سلطان شاہ کے لیے 'میز پر ایک رتھ چھوڑ کر میں فوراً علیحدہ سے روانہ ہو گیا۔

سلطان شاہ 'جناگیر سے مستعار لی ہوئی 'کالی شیراڈے لے گیا تھا اس لیے میں نے اپنے ذاتی استعمال کے لیے لی ہوئی 'ٹریڈ لائن' کی گاڑی نکالی جو درحقیقت حبیب جیوانی بلکہ مافیا کی ملکیت تھی۔ اسٹیشن فور پر اندھیرے اور پراسرار سناٹے کا راج تھا لیکن اس کے تمکناں اپنی جگہوں پر پوری طرح مستعد تھے۔ جامع کی روشنی میں اسٹریٹک و مہل کے پیچھے مجھے پہچانتے ہی 'آہنی ہانگ کھول دیا گیا۔ میں ہیڈ لیمپس کھل کر چکا تھا لیکن اندھیرے میں پارکنگ لیمپس کی روشنی بھی دور تک پھیل رہی تھی۔ اسی انکشاف میں میں نے دیکھا کہ احاطے کی دیوار کے ساتھ مسلح محافظوں کی غیر معمولی تعداد پھیلی ہوئی تھی۔

مجھے فوری طور پر اس عمارت میں بنے ہوئے غیر آباد اور سیلن زدہ خانے میں پہنچایا گیا۔

اس خانے میں بیڑھیاں اترتے ہی 'ایک گرد آلود ہاتھ تھا جس میں کچھ متروک فرنیچر اور دیگر کاٹھ کباڑ پڑا ہوا تھا۔ وہیں ایک گوشے میں کئی جوانوں کے درمیان 'شری مان سنگھ فرش پر بندھا ہوا تھا۔

"صاحب ادھر ہیں" مجھے لانے والے نے خانے کے دور افتادہ حصے میں نظر آنے والے مختصر سے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور خود زنجیروں کے اختتام پر ہی رک گیا۔

میں اسپیشل ٹانگ فورس کے ڈپٹی سے بخوبی واقف تھا اس لیے اپنی شدید ترین خواہش کے باوجود شری مان سنگھ کی طرف نہیں جاسکا۔ مجھے لانے والے نے کمرے کی طرف اشارہ کر کے مجھے بتایا تھا کہ اس وسیع و عریض خانے میں مجھے کون سی راہ اختیار کرنی تھی۔ اس حتمین راہ سے انحراف کی صورت میں کوئی بھی کارکن 'پوری بے لگامی کے ساتھ مجھے ٹوک سکتا تھا۔

خانے کے اس دور افتادہ کمرے میں نہ جانے کب سے ایک مسمری پڑی ہوئی تھی۔ سیلن اور استہاذ زمانہ کے باعث اس کی باطن غائب ہو چکی تھی۔ گدے کی حالت بھی اتر اور خستہ تھا۔ ظفر اپنے ایک ماتحت کے ساتھ اسی گدے پر بیٹھا چند کاغذات کے مطالعے میں منہمک تھا۔

شعبہ میں بڑجاتا۔ تیسرا امکان یہ بھی تھا کہ حبیب جیوانی مجھ سے بات کرتے کرتے 'میری بے خبری میں ریسور اچانک اپنی داشتہ کو تھامتا اور یوں میری حرکت بہت آسانی کے ساتھ بے نقاب ہو جاتی اور وہ مجھ سے بدظن ہو جاتا۔

میں نے فیصلہ کر لیا کہ مجھے ریسور نہیں اٹھانا چاہیے لیکن رات کے سناٹے میں گھنٹی کی تیز آواز پڑوسیوں کی نیند میں خلل ڈال سکتی تھی 'اس لیے میں نے اپریٹس صوفے کے نرم کٹن پر رکھ کر اس کے اوپر بھی دو دفینر کٹن ڈال دیے اور مسلسل جیتی ہوئی گھنٹی کی آواز کافی دب گئی۔

ایک ڈیڑھ منٹ بعد تواتر سے جیتی ہوئی گھنٹیوں کا سلسلہ معدوم ہو گیا تو مجھے اچانک ہی سلطان شاہ کا خیال آگیا۔ وہ ایک اہم مشن پر گھر سے نکلا ہوا تھا۔ اور یہ امکان بھی تھا کہ مجھے کوئی اہم پیغام دینے یا کوئی مشورہ لینے کے لیے اس نے فون کیا ہو۔

وہ خیال آتے ہی 'میں دل ہی دل میں خود کو کلامت کرنے لگا اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ دوبارہ فون آیا تو ریسور اٹھا کر صورت حال کا سامنا ضرور کروں گا۔ اپنی اصل آواز کو غودہ اور خواب ناک بنا کر 'حبیب جیوانی کی داشتہ کی شناخت کے خطرے کا بھی سدباب کیا جا سکتا تھا۔

اور ابھی یہی کہ چند منٹ کے سکوت کے بعد میرے فون کی گھنٹی ایک بار پھر بج اٹھی۔

میں نے کھڑی سے ریسور اٹھا کر 'نیند کے خمار سے بوجھل آواز میں بھلو کہا تو دوسری طرف سے حبیب جیوانی یا سلطان شاہ کے بجائے ظفر کی چاقی بوجھل آواز سنائی دی۔

"مبارک ہو" تمہارا شکار زندہ و سلامت پکڑ لیا گیا ہے۔" وہ کہہ رہا تھا "وہ سمندر کی خونخوار اور بے رحم موجوں سے لڑکر ساحل پر آنے میں تو کامیاب ہو گیا لیکن اپنی اتر حالت کی وجہ سے فوری طور پر فراہی راہ اختیار نہیں کر سکا۔ وہ آریک ساحل کی گیلی ریت پر 'کسی لاش کی طرح اونڈھا پڑا ہوا تھا کہ کوسٹ گارڈز والوں نے اپنے پہلی کاہڑے اسے دیکھ لیا۔"

"اب وہ کہاں ہے؟" میں نے اپنی خوشی پر قابو پاتے ہوئے سوال کیا۔

"شری مان سنگھ جیسے بد معاشوں کو ہر راستہ اسٹیشن فوری کی طرف لانا ہے۔ ابھی تو اس کے گلیے کپڑے اتار کر 'اس کے پیٹ سے سمندر کا پانی نکالا گیا ہے اور وہ بدستور بحال ہے۔ تم چاہو تو چلے آؤ۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں صبح نمودار ہونے سے پہلے 'اس سے اپنی بات چیت مکمل کرنی چاہیے۔"

میں نے فوری طور پر وہاں پہنچنے کا وعدہ کر کے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

سلطان شاہ ابھی کراچی ہی میں تھا۔ شری مان سنگھ کے پکڑے جانے کی صورت میں قدرت نے ہمیں ایک سنہرا موقع دیا تھا کہ ہم اس سے ہانگ ہانگ والی لڑکی کی اصلیت اگھولیں۔ اگر وہ غزالہ

ہمارے حق میں جانے گا۔ پوسٹ مارم کی لمائی مٹی بتائے گی کہ
سندر میں کون سے چند گھنٹوں بعد ہی شری مان سنگھ مرچکا تھا۔
ہمیں اس پر تشدد میں بھی بڑی احتیاط رہتی ہوگی۔ اس کے لیے میں
نے کئی ڈنڈوں پر موٹا ریگ مال منڈھوا لیا ہے۔
”ریگ مال؟“ میں نے حیرت سے دہرایا ”ڈنڈوں پر ریگ
مال چڑھانے سے کیا حاصل ہوگا؟“

”ضربا سے“ اس کے جسم پر نیل پڑنے کے بجائے خراشیں
آئیں گی، جن پر نمک وغیرہ بھی چھڑکا جاسکتا ہے۔ یہ بات ہر شخص
جانتا ہے کہ ہمارے کسی ساحلی علاقوں میں موٹگی کی اور دوسری زیر
آب، حصاردار چٹانیں ہیں جو بدن کو زخمی کر دیتی ہیں۔ ریگ مال کی
خراشیں، غرقابی کے حادثے سے میل کھا جائیں گی۔
”تم کم سے کم وقت میں اس کو فارغ کرنا چاہتے ہو اس لیے
میں ابھی سے بتائے دیتا ہوں کہ غزالہ اور شکستہ والی پہیلی کے علاوہ
میں اس سے اور کچھ نہیں چاہتا۔ ملکی مفادات اور اپنی ضروریات
کو تم اچھی طرح سمجھتے ہو۔ اسی کے مطابق تم اپنے بقیہ فیصلے کرتے
رہنا۔“

ظفر نے مجھے جو کچھ بتایا، وہ قابل فہم تھا لیکن شری مان سنگھ
سے اتنی جلدی نجات پانے کی بات سن کر میرا دل بھر کر رہ گیا۔ اگر
ہانگ کانگ والی لڑکی شکستہ ثابت ہوتی تو میں نئی دہلی سے غزالہ کو
واپس لانے کے لیے شری مان سنگھ کو اپنا رہنمائی نہیں بنا سکتا تھا۔
میں نے ظفر کے تیور دیکھ لیے تھے۔ وہ کسی بھی صورت میں
شری مان سنگھ کو اپنے گلے کی چھوہوند رہانے کے لیے آمادہ نہیں تھا
اس لیے میں نے اپنے دل کی بات دل ہی میں رکھی۔ میں شری مان
سے غزالہ کے تادلے کا ذکر کر کے ظفر کو کسی امتحان میں نہیں ڈالنا
چاہتا تھا۔

ہم دونوں اس کمرے سے نکل کر خانے میں پہنچے تو شری مان
سنگھ بکری کے کسی نومولود بچے کی طرح، گردوغبار میں استغزا ہوا،
فرش پر پڑا ہوا تھا۔ اس کے بدن پر گیلیے انڈر ویئر کے علاوہ کوئی
تاریک نہیں تھا۔ اس کے بدن سے آمارے گئے، گیلیے کپڑے ایک
گٹھری کی صورت میں ایک طرف رکھے ہوئے تھے اور وہیں ایک
خاصا موٹا اور مجروحی ڈنڈا بھی رکھا ہوا تھا۔ بیس بال کے بلے سے
مشابہ اس ڈنڈے پر بہت کھدرا اور مضبوط ریگ مال چپکا ہوا تھا،
صرف پکڑنے کی جگہ ریگ مال سے خالی نظر آ رہی تھی۔

شری مان سنگھ منجھی سے وجود کا مالک تھا لیکن اس کا استخوانی
بدن بڑے بڑے بالوں سے بھرا ہوا تھا۔ تنزی کے ساتھ سفید ہوتے
ہوئے ان بالوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کے مزاج میں حیوانی
جہتوں کا غلبہ پایا جاتا تھا۔ بدن پر بالوں کی کثرت کو تقریباً سمجھی
کھوپڑی نے متوازن کر دیا تھا۔

اس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے، آنکھوں پر
سیاہ کپڑا تھا اور ہونٹوں پر نیپ چپکا ہوا تھا۔ وہ بائیں پہلو پر سٹرا
سٹرا پڑا ہوا تھا اور بہت کمرے کمرے سانس لے رہا تھا۔

”تم نے دیکھ لیا کہ وہ ہم سے بچ کر نہیں نکل سکا“ مجھ سے گرم
جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے ظفر نے کہا۔
”اس بار اس کے ستارے گردش میں تھے کہ وہ بچ نکلے کے
باوجود بچو گیا۔ اب ہم اسے اپنی تحویل میں رکھ کر اس سے بہت
بچہ اگلا سکیں گے۔“ میں نے جوابی جوش و خروش کا مظاہرہ کرتے
ہوئے کہا۔

”نہیں، نہیں!“ وہ اضطراری انداز میں ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔
”شری مان سنگھ ہمارے لیے خطرناک قیدی ثابت ہو سکتا ہے۔
اسے تو صبح کا اجالا نمودار ہونے سے پہلے فارغ کرنا ہوگا۔ اسی ہنگامی
ضرورت کے لیے میں نے ایک پہیلی کا پڑا شینڈ بانی کیا ہوا ہے تاکہ
صبح طلوع ہونے سے پہلے کام پورا ہو جائے۔“
اس کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی اور میں استفسار طلب
گاہ سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”بظاہر وہ اپنے ملک کا ایک سینئر سفارت کار مگر دراصل
بیکٹ ایجنٹ ہے۔ ایسے لوگ بہت ڈھینٹ اور سخت جان ہوتے
ہیں۔ وہ مرچانے کا لیکن کسی حساس معاملے پر اپنی زبان نہیں
بکولے گا۔ اس لیے اس پر زیادہ وقت ضائع کرنا بے سود ہے۔“ اس
نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ”ہمارے پاس“ وہ سندر
کی اہانت ہے اور اسے صبح طلوع ہونے سے پہلے سندر میں چلا جانا
چاہیے ورنہ سنگین دشواریاں پیدا ہو جائیں گی۔“
”تو کیا تم اسے دوبارہ سندر میں پھینک دو گے؟“ میں اس کے
انکشاف پر حیران رہ گیا۔

”اسے یہاں سفارتی مراعات حاصل ہیں اس لیے وہ مقامی
قوانین کے تحت طرم نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ پھر جب تک اس کی
لاش برآمد نہیں ہوگی، اس کا سفارت خانہ واپس چاکر ہماری
حکومت پر دباؤ ڈالتا رہے گا۔ اسی لیے میں نے کہا تھا کہ شری مان
سنگھ کا مرجانا بہتر ہے۔ ہم نے اسے دو چار دن زندہ رکھا تو پوسٹ
مارٹم کے ذریعے اس کی موت کے وقت کا تعین کر لیا جائے گا۔ پھر
لاپوشی اور موت کے درمیان حائل، طویل وقفہ بدترین تگنیوں
اور پیچیدگیوں کا سبب بن جائے گا اور اس کے قتل کی ذمہ داری
ہماری حکومت پر ڈال دی جائے گی۔ کھلے سندر کی طوفانی موجوں
سے لڑتے ہوئے کوئی شے زور تیراک بھی چند گھنٹوں سے زیادہ زندہ
نہیں رہ سکتا۔“

اس کی بات کسی حد تک میری سمجھ میں آنے لگی ”اس کا
مطلب یہ ہوا کہ تم آج ہی اسے دوبارہ سندر میں دھکیل دینے کا
فیصلہ کر چکے ہو؟“ بات سمجھ لینے کے باوجود میرا لہجہ تائید طلب تھا۔
”وہیلیں گے نہیں، پہیلی کا پڑا سے اسے کمرے سندر میں
پھینک دیا جائے گا تاکہ یہ فی الفور جہنم واصل ہو جائے۔ مقام کے
انتخاب میں یہ احتیاط رکھی جائے گی کہ سندر کی بھڑی ہوئی لہریں
اس کی پھولی ہوئی لاش کو کہیں اور لے جانے کے بجائے ایک آدھ
لاڈ میں ہمارے ہی کسی ساحل پر اگل دیں۔ اس طرح سب کچھ

ہاتھ جو ڈر کر تمہارے حوالے کر دیں گے۔

میں نے کن آنکھوں سے دیکھا کہ شری مان عکھ کی اس تجر پر ظفر کے چرے کے نقوش بگڑ گئے تھے۔ مجھے حیرت محسوس کی کہ اس غیبت نے اتنی آسانی کے ساتھ میرے دل کی بات کہہ دی تھی لیکن میں چور نظروں سے ظفر کا ردِ عمل دیکھ چکا تھا اس لیے میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا ”تم غزالہ کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دے رہے ہو۔ ہمیں تم سے زیادہ بڑے حسابات بے باقی کرنے ہیں۔ تمہیں بلاوجہ یہاں نہیں لایا گیا ہے۔“

”تم مجھ سے کچھ بھی نہیں اگلو اسکو گے۔۔۔ میری چھٹی حس مجھے بتا رہی ہے کہ تم لوگ کسی اور جگہ میں ہو۔ تم مجھے کسی چیم غنڈے کے بس کی بات نہیں کہ اپنے کسی دشمن کی تلاش کے لیے بیلی کا پڑوانہ کر سکتے ہیں تمہیں بتا رہا ہوں کہ کچھ لوگ تمہیں چار بار بتا رہے ہیں۔ اپنا کام نکل جانے کے بعد وہ تمہارا ہی پتہ صاف کر دیں گے اور تم اپنی نگاہوں میں حیرت لیے زنگبارش ہو جاؤ گے۔“ میں نے ظفر کے ہاتھ سے ڈنڈا لے کر ”شری مان عکھ کی غجی گردن پر رگڑ دیا اور وہ بری طرح تھلکا اٹھا۔ اس کی گردن پر خون کی لمبی لمبی خراشیں پڑ گئی تھیں۔

”ان وحشانہ حرکتوں کے ذریعے تم زیادہ سے زیادہ مجھے ہلاک کر دو گے لیکن یقین رکھو کہ تم مجھ سے کچھ بھی نہیں اگلو اسکو گے۔ بہتر یہی ہے کہ تم مجھے رہا کر دو۔ یہ نہیں چاہیے تو مجھے گولی مار کر میری لاش کیسے ڈال دو۔“

”ہم تمہاری قوت برداشت کو پرکھنا چاہتے ہیں“ اس بار ظفر آگے آگیا۔ اس کی آواز میں پیشہ ورانہ رقابت کی تپش بہت واضح تھی ”ہم تمہیں الٹا لٹکا کر تمہارے سر سے ایک فٹ کے فاصلے پر انگارے دھکا دیں گے جو تمہاری ہی دیر میں تمہارا ہیکھا بکھلا دیں گے، پھر دیکھیں گے کہ تم کیا بولتے ہو؟“

”زیادہ سے زیادہ میرا ہیکھا ہناک کے راستے بہ کر رہا ہر آجائے گا لیکن میری زبان نہیں کھلے گی۔“ اس کی آواز بدستور گزور لیکن پُر عزم تھی۔ جس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کا ارادہ اٹل ہے۔

”ہم تمہیں ماریں گے نہیں بلکہ کسی مردے سے زیادہ بدتر حالت میں واپس لوٹا دیں گے اور تم زندگی بھر دیوانگی کے عالم میں در بدر کی ٹھوکریں کھاتے پھرو گے“ ظفر کا لہجہ سفاکانہ ہو گیا۔ اس لیے تمہاری عافیت اسی میں ہے کہ جو کچھ پوچھا جائے اس کا صحیح جواب دیتے چلے جاؤ!“

”میں موت یا زلت سے نہیں ڈرتا۔ تم ضد کرتے ہو تو سوال کرتے جاؤ۔ میرا دل چاہتا تو جواب دوں گا ورنہ اپنی زبان بند رکھیں گا۔ تم مجھے بولنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔“

اس کے جواب پر ظفر غصے سے دانت چرس کر رہ گیا۔ چند ثانیوں تک یہ خانے کی فضا میں بوجھل سا سکوت چھایا مگر پھر ظفر کی سرود آواز گونجی ”آپریش سٹور سینڈ کا چیف آفیسر کون ہے؟“ اس سوال پر شری مان عکھ کے بدن کو ایک جھٹکا لگا۔ اس

ظفر نے کھدوے ریک مال والا ڈنڈا اٹھایا اور خاصا بجا کر ”اچانک ریتی کی طرح“ شری مان عکھ کی داہنی ران پر پھیر دیا۔ حلق ہی حلق میں گھسنے والی بے معنی غراہٹوں کے ساتھ شری مان عکھ کا پورا وجود بری طرح تڑپ اٹھا۔ ریک مال کے کاٹ دار دانوں نے شری مان عکھ کی جلد کو اوجیز کر خراشیں ڈال دی تھیں جن میں سے فوراً تازہ خون رسنے لگا تھا۔

”یہ عمل تمہارے پورے بدن پر دہرایا جائے گا“ ظفر نے سفاکانہ لہجے میں کہا ”پھر ان خراشوں پر نمک اور مردوں کا تیز آئینہ چمڑکا جائے گا۔ جب تک تم یہاں رہو گے، تمہارے ساتھ شب و روز یہی سلوک کیا جائے گا، حتیٰ کہ گلے ہوئے گوشت میں سے تمہاری ہڈیاں بھانکنے لگیں گی۔ یہاں سے گلو غلامی کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ تم چون و چرا کیے بغیر ہمارے ہر سوال کا جواب دیتے چلے جاؤ۔ اب میں تمہارا دہانہ آزاد کر رہا ہوں۔ یہ یاد رکھنا کہ چیخ کر تم اپنے ہیکھے پھڑپھڑے تباہ کر لو گے لیکن یہاں سے تمہاری آواز باہر نہیں جاسکے گی۔“

ظفر نے اپنی بات پوری کرتے ہوئے ”ایک جھٹکے سے اس کے دہانے سے ٹپ نوچ لیا۔

شری مان عکھ کے حلق سے ایک ہلکی سی اضطرابی چیخ آزاد ہو گئی کیونکہ ٹپ کے ساتھ ہی اس کی جلد سے شاید چند بال بھی اکھڑ گئے تھے۔

”ڈنڈی کہاں ہے؟ میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں“ لہجہ بھر کے بعد اس نے بھڑائی ہوئی اور گزور آواز میں کہا۔

ظفر نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے اشارہ کیا اور میں نے کہا۔ ”میں موجود ہوں۔ تم گھرنہ کر دو۔ یہ سب میرے ہی ساتھی ہیں اور جو کچھ کر رہے ہیں اس میں میری مرضی شامل ہے۔“

”تم انکم میری آنکھیں ہی کھلو دنا کہ میں کچھ دیکھ سکوں۔“ میری آواز سننے ہی اس نے ایک احتیاطانہ فرمائش کر دی جس پر ظفر اپنے سر کو نفی میں ہلا کر رہ گیا۔

”دیکھتی آنکھوں سے بند آنکھیں اچھی ہیں۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ تم رہا ہونے کے بعد میرے علاوہ کسی اور کی نشاندہی نہ کر سکو۔“

”اوہ!“ وہ میری بات کاٹ کر بول پڑا ”تم مجھے یہ بتانا چاہ رہے ہو کہ آخر کار مجھے زندہ چھوڑ دیا جائے گا۔ کاش تمہاری یہی نیت ہو لیکن میں تمہیں اتنا بتائے دیتا ہوں کہ مجھ پر ہاتھ ڈال کر تم نے ایک بہت بڑے سیاسی اسکینڈل کی ابتدا کر دی ہے جو تمہاری حکومت کو بہت متکا بنے گا۔“

”کیوں؟ بند کر دو اور یہ بتاؤ کہ غزالہ کہاں ہے؟“ میں نے ڈنڈ ٹپٹ کر پوچھا۔

”میں بتا چکا ہوں کہ وہ نئی دہلی میں ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تم اس کے بارے میں تذبذب میں جلا ہو۔ یہ تمہارے لیے بہت اچھا موقع ہے کہ تم میرے سفیر سے سودا کر لو۔ میرے بدلے وہ غزالہ کو

گاہ اچھی میرے پاس کئی گھنٹے کی مسلت باقی ہے۔“

ظفر سے زیادہ گھرا مناسب نہیں تھی، اس لیے میں خاموشی سے اس کے ساتھ واپس ہو لیا۔

ظفر کے ایما پر اس کے ایک آدمی نے شری مان سنگھ کے دہانے پر ایک بار پھر ٹیپ چپکایا پھر دوسرے آدمی نے اس کے زخموں پر علامتک پاشی شروع کر دی۔ یہ اور بات تھی کہ پارک پے ہوئے نمک میں مرجوں کی سرفی دوسری سے دیکھی جاسکتی تھی۔ شری مان سنگھ نے تشدد تو خامسے سکون سے سہلایا تھا لیکن نمک پاشی کے عمل نے اسے بری طرح تڑپا کر رکھ دیا۔ اس نے بللا کر کئی بار اپنے قدموں پر کھڑا ہوتا چاہا لیکن ہیرا کسی نہ کسی نے اسے بے رحمی کے ساتھ پیچے گرا دیا اور وہ فرش پر ہی مائی بے آپ کی طرح تڑپ رہا۔ اس دوران میں ظفر اس کے بدن پر ریگ مال والے ڈنڈے سے نئی خراشیں ڈالنے کے بجائے پرانے زخموں کو بار بار اوجھڑتا جا رہا تھا۔

میری دانست میں وہاں بس اتنا کی جنگ باقی رہ گئی تھی۔ میں نے چند جھلکیوں سے ہی اندازہ لگایا تھا کہ شری مان سنگھ موت سے خوف زدہ ہو کر ہتھیار ڈالنے والوں میں سے نہیں تھا۔ اس کے جم سے ایک ایک ریشہ بھی اوجھڑتا جاتا تو وہ زبان کھولنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ جلدیادیر ”اسے سمندر کے سبز روانہ ہو ہی جاتا تھا“ اس لیے میں نے علیحدگی میں لے جا کر ظفر کو سلطان شاہ کے پروگرام سے آگاہ کیا اور اس سے اجازت لے کر اسٹیشن فور سے اپنے قلیف کی طرف روانہ ہو گیا، راستے میں میرا ذہن شری مان سنگھ ہی میں الجھا رہا۔

وہ بادی النظر میں ایک عام سافارتی اہلکار نظر آتا تھا جو دامن بچا کر غیر قانونی ذرائع سے اپنے ملک کے مفادات کے لیے کام کرتا رہتا تھا۔ دونوں پڑوسی ممالک کے سیاسی اور سفارتی تعلقات عرصہ دراز سے سرد مری بلکہ کشیدگی میں جتا چلے آ رہے تھے اس لیے میرا اندازہ تھا کہ دونوں طرف سفارت کاروں کے کام کی نوعیت بھی تبدیل ہو کر رہ گئی تھی۔ شری مان سنگھ کی حد تک یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی تھی کہ وہ ہمارے ملک میں ملا سرکار جیسے خرب کار کی سرپرستی کر کے ملک کے ایک حساس علاقے میں شورش پھیلانے کی سازش کا سرکب ہو رہا تھا۔ اسی کے ساتھ اس نے اپنی بیوی، رجنی کے ذریعے ایک مقامی ہندو سرائے دار کو اس حد تک اپنے ساتھ ملا یا ہوا تھا کہ وہ موسیقی کے شوق پر وگراموں میں اپنی مخصوص دھنوں کے ذریعے، مقامی خرب کاروں کو پچنام رسائی کرتا تھا۔ موتن لعل کے جلتنگ پر دیے ہوئے پچنامات پر عمل کرتے ہوئے مقامی خرب کار طے شدہ مقامات پر بھوں کے دھماکے اور دوسری تباہ کن کارروائیاں کیا کرتے تھے۔ موتن لعل کو اپنی حرکات کے ان نتائج کا علم رہا ہو یا نہ رہا ہو لیکن وہ خود راود سبک اندام رجنی کے وجود کے سحر میں ڈوب کر اس گٹھاؤنے کام میں سر سے ہیر تک غرق تھا۔

چو سفید رنگی اور وہ اضطرابی انداز میں بولا ”مجھے معلوم ہے کہ افغانستان میں ہونے والی خانہ جنگی سے تم لوگوں نے چھاپا مار جنگ اور سر اغرسانی کے شعبوں میں بہت کچھ سیکھا ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ تم آئرش سلور سینڈ سے واقف ہو لیکن اس بار تم نے غلط آدمی پر ہاتھ ڈالا ہے۔ تمہارا یہ سوال سننے کے بعد میں قسم کھا سکتا ہوں کہ تم فوجی ہو اور تم لوگوں نے اپنے جنگی مقاصد کے لیے ڈینی کو بھی الہ تیا ہوا ہے۔“

وہ حالات کے کھینچے میں بری طرح جکڑا ہوا تھا لیکن پھر بھی مجھے یاد بار اکسانے اور ہمزگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں اپنی آزادانہ مرضی سے ان لوگوں کا ساتھ دے رہا تھا۔

ظفر نے ایک بار پھر اس کی داہنی ران کی پرانی خراش کو ریگ مال سے اوجھڑ کر رکھ دیا۔ اس مرتبہ شری مان سنگھ نے بے انتماضی سے کام لیا اور دہلی غراہوں کے ساتھ تڑپ کر رہ گیا۔ ”تم راکے بلیک کیٹس یونٹ سے منسلک ہو اس لیے یہاں کی آرمی انٹیلی جنس اور اس کے انٹرو گیشن سیل کے بارے میں بھی جانتے ہو گے لیکن ہم سیدھے سادے لوگ ہیں۔ اپنے شکار سے مطلوبہ معلومات نکالتے ہیں یا اس کی جان نکال لیتے ہیں۔“

شری مان سنگھ نے ظفر کی بات کاٹ دی ”آرمی نہیں تو پھر تم اسپیشل ٹاسک فورس کے ہتھیاریے ہو سکتے ہو۔ میں نے سنا ہے کہ غیر قانونی کاموں کے لیے، اس نام سے یہاں ایک متوازی تنظیم بنائی گئی ہے جو ہر قاعدے اور قانون سے آزاد ہو کر اپنی من مانی کرتی ہے۔ میں تم لوگوں کی بھی کھوج میں تھا۔“

شری مان سنگھ جیسے بے بس قیدی کا وہ پُرسکون انداز ظفر سے برداشت نہ ہو سکا اور اس نے اچانک ہی اپنے ذہنی جوتے کی ٹھوکر سے شری مان سنگھ کا چہرہ اوجھڑ کر رکھ دیا۔ اس بار شری مان سنگھ کی دردناک چیخ بہت تیز تھی۔ میں نے گھبرا کر چاروں طرف کا جائزہ لیا اور یہ دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا کہ یہ خانے کی دیواروں میں کسی روشتہ بان یا جالی کا وجود نہیں تھا اور شاید اسی لیے شری مان سنگھ کو وہاں لایا گیا تھا۔

میں نری سے ظفر کا بازو تھام کر اسے دور افتادہ کمرے کی طرف لیتا چلا گیا۔

”وہ تمہیں غصہ دلا کر کسی عظیم غلطی پر مجبور کر دے گا“ میں نے کہا ”ایک طرف تم اتنی احتیاط کر رہے ہو کہ اس کی جلد پر...“

یگمال سے گڑھے لگا رہے ہو اور اب غصے میں آکر اسے ٹھوکر رسید کر بیٹھے میرا خیال ہے کہ اس پر وقت برباد کرنے کے بجائے اپنے پروگرام کے اگلے حصے پر عمل شروع کر دو۔“

”لیکن یہ تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ اس سے تو بہتر تھا کہ اسے ساحل سے اٹھانے کے بعد ہی گمرے سمندر میں پھینک دیا جاتا۔ اسے یہاں لانے سے کیا فائدہ ہوا؟“ ظفر اپنی ناکا کی بری طرح بنایا ہوا تھا ”میں اتنی آسانی کے ساتھ اس کی جان نہیں چھوڑوں

مرکوز کرنے سے قاصر رہتا۔

اس ضمن میں صرف ایک کردار ایسا تھا جو ابھی تک ہر گرفت اور باز پرس سے محفوظ تھا اور وہ مغربی کونسلٹ کا ملازم ہیری کیسجر تھا۔ اس کا پیش رو، پیٹر ارنیٹ تو اول خان کے آدمیوں کے قہر کا نشانہ بن کر جہنم واصل ہو چکا تھا لیکن ہیری کیسجر کی معلومات مصلحتوں کی وجہ سے آزاد تھا۔

یہ سامنے کی بات تھی کہ ہیری ایک بہت بڑی طاقت کا نمائندہ تھا۔ ان لوگوں کو دنیا کے ہر خطے میں کام کرنے کی لامحدود مراعات ملی ہوئی تھیں۔ جو قومیں ان کے خصوصی حقوق کو تسلیم نہیں کرتی تھیں، انہیں جبراً مراعات دینے پر آمادہ کر لیا جاتا تھا۔ ان حالات میں اگر انجیل ٹانک فورس ہیری کیسجر کی خطرناک سرگرمیوں سے چشم پوشی کر رہی تھی تو وہ ناقابل فہم نہیں تھی۔

میں جانتا تھا کہ وہ لوگ ہیری کیسجر پر ہاتھ ڈالیں یا نہ ڈالیں، لیکن ایک بار نظروں میں آ جانے کے بعد اس کے کسی بھی منصوبے کو کامیابی سے ہم کنار نہیں ہونے دیں گے۔

میری وہ تمام سوچ بچار سلیبی وقت گزاری کے لیے نہیں تھی بلکہ اس اہم موڑ پر، میں اپنے لیے ایک نئے مستقبل کی تصویر دیکھ رہا تھا، جس کے لیے میں نہ جانے کب سے ترسا ہوا تھا۔

ابتدا میں میری زندگی پر شی کسی آہنی سائے کی طرح مسلط تھی۔ اس سے انحراف کرنے کے بعد مجھے اپنی زندگی بہت مختصر ہوتی نظر آ رہی تھی لیکن میں نے نہایت بے خوفی کے ساتھ اپنی ہاتھ کی جنگ لڑتے ہوئے شی کو ایسے ایسے چمکے کہ میرے دل سے اس طاقتور تنظیم کی وراثت بتدریج مندرج ہو گئی۔ دوسری طرف، جی لائیو نے بھی اپنے زخموں کو چاٹتے ہوئے میرے عقاب کا سلسلہ ترک کر دیا اور میں شی کے آسیب سے آزاد ہو گیا۔ میری اس آزادی میں دیرانے بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔ میرے باقی ہو جانے کے بعد اسی کو پاکستان میں شی کے مفادات کی دیکھ بھال کا کام سونپا گیا اور اس نے اپنی نکتون مزاحمتی کے باوجود مجھ سے دوستی پر رقرار رکھی۔ شی میں وہی ایک ایسی ہستی تھی جسے میری ذات تک رسائی حاصل تھی اور وہ چاہتی تو کسی بھی وقت مجھے بہ آسانی ہلاک کر سکتی تھی لیکن اس نے کبھی بھی بے خبری میں مجھ پر دار کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ جب بھی میرے خلاف صف آرا ہوئی، باقاعدہ لگا کر مقابلے پر آئی۔ کبھی ستاروں نے میری یادری کی اور کبھی ویرا خود دوستی کا ہاتھ بڑھانے پر مجبور ہو گئی۔

جن دنوں میں شی کے عقاب میں آیا ہوا تھا، مافیا کے ڈان تھری نے مجھے موثر تحفظ فراہم کرنے کی پیشکش کی۔ لیکن وہ بہت خطرناک پیشکش تھی جسے قبول کرنے کے علاوہ کوئی اور راہ نہیں تھی۔ میں انکار کرتا تو شاید ڈان تھری اسی لئے میرے دل میں پھٹلا ہوا سیسہ اتار کر میرا قصہ ختم کر دیتا۔

میری زندگی کے بدترین اور کڑے دور میں، مافیا والوں نے مجھے بھرپور تحفظ فراہم کیا جس کے جواب میں، میں نے کبھی بھی

شری مان سنگھ کو ظلم تھا کہ ہر چائی مزاج رکھنے والی رہتی اس کے کئی ہوتی بے وفائی کرتے ہوئے، نیشا گم عمر اور تندرست موتی لعل کے ساتھ کام کی آڑ میں پیشیں بڑھا کر رنگ رلیاں مٹاتی رہتی ہے لیکن وہ اپنے ملک کا سچا خدمت گار تھا اس لیے اپنی ذاتی خواہشات قربان کر کے بھی اپنے ملکی مقاصد کے لیے کام کرتا رہا۔ یہ اس کی بہت بڑی بد نصیبی تھی کہ رہتی اسٹیشن فور میں قید تھی اور وہ خود غارت خانے میں ظفر کا تندہ مسہر رہا تھا لیکن ان دونوں میاں بیوی کو ایک دوسرے کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔

ایک ظفر اور شری مان سنگھ کی براہ راست گفتگو سے کچھ اور اسرار بھی میرے سامنے آئے تھے شری مان سنگھ نے ایک مرتبہ میرے سامنے انجیل ٹانک فورس کے وجود کے بارے میں مبہوم سا شبہ غاہر کیا تھا لیکن اب اندازہ ہوا کہ بات شیعے سے خاصی آگے تھی۔ اسی طرح ظفر نے مجھ سے کبھی کسی اور خفیہ آپریشن کا ذکر نہیں کیا تھا لیکن میں نے اپنے کانوں سے آپریشن سلور سینڈ کا ذکر سن لیا تھا۔ وہ یقینی طور پر بھارتی خفیہ اداروں کا کوئی اہم اور تباہ کن منصوبہ تھا جس سے ایس نی ایف والے بے خبر نہیں تھے۔

ملک کی سلامتی اور مفادات کے خلاف وہ ایک بہت بڑا اور بے باک چکر چلا ہوا تھا جس کی ابتدا ملا سرکار کی ذات سے ہوئی تھی۔ اس سازش میں سفارتی اہل کار، مقامی جرائم پیشہ لوگ، اندرون سندھ پھیلے ہوئے ڈاکو، ہیروئن کا سرمایہ، جدید ترین اور مسلح جنگی ہتھیاروں کی بھاری تعداد کے علاوہ بھی بہت کچھ لوٹ تھا۔ جب تک میں انفرادی طور پر ان سب مسائل میں گھرا رہا، مجھے کوئی قابل ذکر کامیابی نہیں ہو سکی لیکن انجیل ٹانک فورس کے اول خان سے تعارف ہونے کے بعد صورت حال یکسر تبدیل ہو گئی۔

ایسی بین الاقوامی سازش کا سدباب کرنا، مجھ جیسے فرد واحد کے بس سے باہر تھا۔ ایس نی ایف والوں کے وسائل ہی ان لوگوں کی سرکوبی کر سکتے تھے۔ مجھے خوشی تھی کہ میری کوششوں کے نتیجے میں صورت حال پر ایس نی ایف کی گرفت بہت مضبوط ہو گئی تھی۔ ملا سرکار جہنم واصل ہو چکا تھا۔ شری مان سنگھ کسی بھی وقت سمندر کی خوبی لہروں کی بھینٹ چڑھنے والا تھا اور اس سازش کے تار و پود پوری طرح سامنے آ چکے تھے۔

ان حالات میں میری گلو خلاصی ہو چکی تھی۔ وہ پورا معاملہ ان لوگوں کے ہاتھوں میں جا چکا تھا جو اسے نمٹانے کی اہلیت اور وسائل رکھتے تھے اس طرح میں بڑے مسائل کو بھول کر اپنی ذات کے گرد پھیلے ہوئے جال کو کاٹ کر اپنی خوشحال زندگی کے آغاز کی کوششیں کر سکتا تھا۔

ظفر نے ایک اعتبار سے اچھا ہی کیا تھا کہ آپریشن سلور سینڈ کے بارے میں مجھے اعتماد میں نہیں لیا تھا۔ ایک بار میں ان تمام تفصیلات سے واقف ہو جاتا تو پھر مجھے اخلاقی ہر مرتلے پر ان کا ساتھ دینا پڑتا اور میں اپنے ذاتی مسائل کے حل پر اپنی پوری توجہ

تھے وہاں مایا کو بیشہ سے ناقابل شکست طاقت حاصل تھی اس لیے وہ لوگ اپنے ہر فیصلے کو نافذ کرنے کی طاقت رکھتے تھے لیکن پاکستان کی صورت حال بہت مختلف تھی۔

میاں مایا نے کسی تحریک کی کوکھ سے جنم نہیں لیا تھا بلکہ غنڈہ گردی کے عالمی اجارہ داروں نے انیم اور بیرونی کی اس زرخیز پیداواری منڈی کی شہرت سے سنا کر یہاں اپنے کرگوں کو مامور کیا تھا اور ان کی سربراہی کے لیے سینٹھ حبیب جیوانی کو برمنی کی ایک جیل سے فرار کر کے پاکستان پہنچایا تھا۔ حبیب جیوانی کوئی گھماگھم مجرم نہیں تھا۔ وہ ہوس کی دوندن میں آیا ہوا 'ایک بکرا ہوا' سینٹھ تھا۔ تجربے کے اعتبار سے وہ ناپختہ کار تھا۔ اسی وجہ سے ڈان قہری نے اس کی مدد کے لیے میرا قہر کیا تھا کیونکہ شہی سے فکر لینے کے بعد شاید میرا نام دنیا بھر کے زیر زمین حلقوں میں پھیل گیا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ میں ان لوگوں سے نانا توڑ لیتا تو کم از کم حبیب جیوانی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ اصل خطہ یہ تھا کہ حبیب جیوانی کے ناکام ہونے کے بعد 'میری سرکولی کے لیے باہر سے بھی کسی خزانہ قاتل کی آمد کے امکانات تھے اور مجھے اگلے روز اسی کے بارے میں صحیح اندازہ قائم کرنا تھا۔

میں ان ہی خیالات میں ڈوبا ہوا 'فلٹ' پر واپس پہنچا تو فلٹ خالی تھا البتہ میرے چھوڑے ہوئے رقبے کی پشت پر بگلت میں لکھا ہوا 'سلطان شاہ کا جوبلی پیغام موجود تھا۔

وہ میری غیر حاضری میں فلٹ پر آیا اور سفری ضروریات کا مختصر سامان لے کر فوراً ہی واپس چلا گیا تھا۔ اس کے پاسپورٹ کا حیرت ناک طور پر بندوبست ہو گیا تھا۔ میں حیران تھا کہ اس کھٹے کا وہ کون سا فرض شناس افسر تھا جس نے سلطان شاہ کی بنگالی ضرورت کا احساس کرتے ہوئے 'رات گئے اس کا پاسپورٹ تیار کر کے اسے تمنا دیا تھا۔ اس نے اپنے پیغام میں لکھا تھا کہ وہ صبح پانچ بجے والی پرواز سے بنگال چلا جائے گا اور وہاں اترنے کے صرف ایک گھنٹے بعد کیپتے پیسیفک ائیر لائنز کی اگلی پرواز سے بامگ کاتنگ چلا جائے گا۔

اس کا پیغام پڑھنے کے بعد میں دل ہی دل میں اس کی کامیابی کے لیے دعا کیے بغیر نہ رہا۔

سلطان شاہ نے اپنے پیغام میں 'فلٹ' سے میری غیر حاضری پر اپنی تشویش کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ وہ طیارے میں سوار ہونے تک ایئرپورٹ سے وقفہ وقفے سے فون کرتا رہے گا کہ سفر پر روانگی سے قبل 'آخری بار مجھ سے گفتگو کر سکے۔ اس کی روانگی کے انتظامات پر صرف پانچ ہزار روپے کا فاضل خرچ آیا تھا۔

پیغام پڑھ کر میں نے وہ کافہ تلف کر دیا اور ڈرائنگ روم ہی میں صوفے پر دراز ہو گیا۔ میرا چھوڑا ہوا پینے پلانے کا سا زرد سامان میز پر اسی طرح موجود تھا جس طرح میں چھوڑ کر گیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد سلطان شاہ کا فون آیا تو پتا چلا کہ وہ اس کی تیسری کال تھی۔

پورے غلوں کے ساتھ ان کا ساتھ نہیں دیا۔ میں بیرونی کے کاروبار سے بری طرح تنفر ہو چکا تھا۔ مجبوری کے تحت کیے گئے سمجھوتے کی اور بات تھی لیکن دل کی گمراہیوں سے میں کبھی بھی مایا کا وفادار نہ بن سکا۔

لیکن شہی کی طرح مایا بھی خطرناک تھی۔ اس میں شہولیت کے مقابلے میں اس سے اگلا بہت مشکل تھا، مایا کے مخرجین کو پاتال میں بھی ایمان نہیں ملتی تھی۔ سسلی میں بیٹھے ہوئے مایا کے بڑوں نے اپنی قدیم روایات کو ہریت پر برقرار رکھنے کا عزم کیا ہوا تھا۔ ان روایات میں ہر جگہ 'ہر حال میں اور ہریت پر جرم کی ترویج اور تحفظ کے ساتھ ہی مخرجین اور باغیوں کو کسی بھی قیمت پر زندہ نہ چھوڑنے کے نعرے شامل تھے۔

اسپیشل ٹانک فورس والوں کے اسٹیشن فور سے واپسی کے اس سفر میں 'میں محسوس کر رہا تھا کہ بین الاقوامی سازشیوں اور شہی کے پوجہ سے نجات مل جانے کے بعد میرے سامنے صرف مایا رہ گئی تھی جو میری ہر سکون گھریلو زندگی کی راہ کی واحد رکاوٹ تھی۔

ایک بار غزالہ واپس آجاتی تو میں اس کے ساتھ سکون سے اپنا گھر آباد کر سکتا تھا لیکن اس کے ساتھ باعزت زندگی کی ابتدا کرنے کے لیے مایا سے چھٹکارا حاصل کرنا ناگزیر تھا۔ جرم سے پوری طرح تائب ہوئے بغیر انسان کبھی بھی سکون کی زندگی نہیں گزار سکتا۔ یہ میرا مشاہدہ اور ایمان تھا کہ جرم کو جڑ سے نہ اکھاڑ پھینکا جائے اور اس کی ایک کونٹیل بھی باقی رہ جائے تو وہ بہت جلد دوبارہ تباہ و درخت کا روپ دھار لیتی ہے۔

اس اعتبار سے اگلا دن میرے لیے بہت اہم ثابت ہونے والا تھا۔ حبیب جیوانی نے مجھے ٹیڈ لائن کے دفتر میں طلب کیا تھا۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہاں میں ڈان قہری خود آنے والا تھا یا اس کا کوئی پیغام آنے والا تھا کہ میرے لیے ہر دو باتوں کی مساوی اہمیت تھی۔ میں موقع محل کی مناسبت سے یہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ ان لوگوں سے کتناہ کش ہونے کے بعد میرے زندہ رہنے کے کیا امکانات ہو سکتے تھے۔

سسلی مایا کی جنم بھومی کھلاتا تھا۔ روئے زمیں کی تاریخ میں منظم جراثیم کی تحریک نے اسی سرزمین پر جنم لیا تھا، غربت، بے روزگاری، قحط، چور بازار، سرکاری کارندوں کی کھلی ہوئی رشوت خوری اور اقربا پروری جیسے سنگین معاشی اور معاشرتی جرائم کی پھل میں پیتے ہوئے عام لوگوں نے مظالم سے نجات حاصل کرنے کی امید میں کھلے دل سے اس تحریک کا ساتھ دیا۔ اس کے قاتلوں اور ڈاکوؤں کو پناہ دی، مفوروں کو چوری چھپے خوراک اور لباس فراہم کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے مایا نے اس خطے میں ایک مضبوط موازی حکومت کا روپ دھار لیا، سرکاری احکام نظر انداز کر دیے جاتے تھے لیکن چوپال یا سرائے میں مایا کے کسی بڑے کے گئے ہوئے الفاظ 'فرمانِ اموزین کر سینہ بہ سینہ ہر طرف پھیل جاتے تھے اور لوگ ان نجات دہندوں کے احکام بجالانے میں فخر محسوس کرتے

جیوانی انٹرکام پر اس سے بات کر لیتا تھا۔

عملے کے اراکین کو ہر پہلی تاریخ پر تنخواہیں ادا کرنا ہوتی تھیں۔ مقررہ اسکیز کے مطابق تنخواہوں میں ہفت روزہ میں اضافہ ہو جاتا تھا۔

ایسے اچھے بلکہ قابل رشک حاحول میں ملازمین کو کیا دی جاتی تھی کہ وہ ادارے کے سرباہ کو دیکھنے کی کوشش کر کے اپنی اچھی کمائی کو لوٹ لیں؟

مجموعہ سرگرمیوں میں حصہ لینے والے بیشتر افراد دفتری محلہ کے رہائشی تھے جس میں رہتے تھے۔ درآمدی عملے کو تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ان کے دفتر کے کسی حصے میں مجتہد افراد کا رہنا ہے۔ ان دونوں طبقوں کے درمیان نا دیدہ حصار فاصلہ کھینچ ہوئی تھی جو انہیں ایک دوسرے کی سرگرمیوں سے بے خبر کر رکھتی تھی۔

نچلے درجے کے ملازمین میں چونکہ ادارہ اور ٹیلی فون آپریٹر کام بہت اہم اور دونوں حصوں کے لیے مشترک تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ ان کا انتخاب بہت احتیاط سے کیا گیا ہو گا اور ان کے ذریعہ اہم کی بات اُدھر ہونے کا کوئی امکان باقی نہیں رکھا گیا ہو گا۔ میرا تو شیرشاہ تھا جو کسی روک ٹوک کے بغیر ہر جگہ آ جا سکتا تھا۔ اسے آزادی سینڈو کی موت کے بعد ملی تھی۔ اس کی زندگی میں شیرشاہ بھی کسی گیلڈر کی طرح سما سکر رہتا تھا۔

میرے ذہن میں یہ سارا جائزہ بلا وجہ ہی نمودار نہیں ہوا تھا بلکہ اس کا بھی ایک سبب تھا۔

دفتری معاملات سے حبیب جیوانی کی لا تعلقی کی وجہ سے کبھی کبھار درآمدی شعبے کا راونڈ لگ لیتا تھا۔ اس روز بھی میں اپنے کمرے میں جا نے سے پہلے اس شعبے میں جا نکلا۔ وہاں کے عملے نے خوش دلی سے میرا استقبال کیا اور میں سرسری طور پر ہر ایک کی خیر خیریت معلوم کرتا ہوا ٹاپ راسٹر پر مصروف لڑکی کے قریب پہنچا تو اس کی متورم آنکھیں دیکھتے ہی میں چونک پڑا۔ وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر مسکرائی تو اس کی مسکراہٹ میں بھی جبر یا خوف کا عنصر نمایاں تھا۔

اپنے تجسس پر قابو پا کر، میں نے اس سے آگے بڑھ جانا چاہا لیکن اس نے تقریباً سرگوشیاں آواز میں مجھے خودی روک لیا "سرا میں آپ سے کچھ بات کرنی چاہتی ہوں۔" اس نے مجھے ہلکا سا "بولو!" میں نے اس کی طرف پلٹ کر ہمدردانہ نری کے ساتھ اس کی حوصلہ افزائی کی۔

اس نے میری جھپٹی ہوئی نظروں کی تاب نہ لا کر اپنا سر ہٹا لیا اور مجھ سے "بولی" میاں نہیں، میں دفتری تنچے میں بات کرنی چاہتی ہوں۔" بولتے ہوئے اس کی آواز کسی نامعلوم خوف سے لڑ رہی تھی "مجھے معلوم ہے کہ میری اس جسارت کے نتیجے میں مجھے ملازمت سے جواب بھی مل سکتا ہے۔ میں جان بوجھ کر زچہ کی خلاف ورزی کر رہی ہوں کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ سید صاحب میری بات کا جواب نہیں دے سکیں گے۔"

وہ پہلی مرتبہ کسی بین الاقوامی سفر پر تھا وہاں ہو رہا تھا اس لیے شاید پرواز کا پہلا اعلان ہوتے ہی ابتدائی مراحل سے گزر کر ڈیپارچر لائسنس میں پہنچ گیا تھا کیونکہ وہ فون اس نے لائسنس کے پبلک کال آفس سے کیا تھا۔ میں نے اسے اپنی خیریت سے آگاہ کیا اور اس نے مکمل کربات کرنے کے بجائے اشاریوں کنایوں میں یہ بات واضح کر دی کہ دیوگائی کے سلسلے میں ہر کام تسلیم کرنا ہی خیریت پر انجام پاتا تھا۔

مجھے اندازہ تھا کہ نئے آدمی کے لیے کسی بیرون ملک ہوائی اڈے پر دوسری پرواز لینے کے لیے ایک گھنٹے کی مدت بہت ہی قلیل ہوتی ہے۔ لائسنس کی طرف سے ٹرانزٹ مسافروں کی مناسب رہنمائی کا بندوبست نہ ہو تو ایمریشن والوں کی قائم کی ہوئی رکاوٹوں کی وجہ سے ہوائی اڈے کی عمارت بھول جاتیاں بن کر رہ جاتی ہے جس کے نتیجے میں انٹرنیٹ مسافر کا بوقت مقررہ لائسنس میں پہنچنا دشوار ہو جاتا ہے۔ ایک بار آگے جانے والی کنگریڈ پرواز نکل جانے تو ٹرانزٹ میں پہنچنے ہوئے مسافر کو کوئی سیٹ حاصل کرنے میں شدید دشواریوں کا سامنا ہوتا ہے۔ کسی مخصوص لائسنس کا رعایتی ٹکٹ ہو تو یہ دشواریاں مزید بڑھ جاتی ہیں اور پہنچنے ہوئے مسافر کو پردیس میں شبیہ کا احساس ستانے لگتا ہے۔

میں نے ان امکانات کی روشنی میں سلطان شاہ کو چند تھیمہ صرف تدابیر پر عمل کرنے کا مشورہ دیا اور پورے غلوں کے ساتھ اس کی کامیابی کی دعا کرتے ہوئے فون بند کر دیا۔



میں طویل غیر حاضری کے بعد ٹریڈ لائن کے دفتر پہنچا تو چونکہ اس سے شیرشاہ تک سب ہی نے خوشگوار حیرت کے ساتھ میرا استقبال کیا۔ مجھے اپنے درمیان پا کر وہ سب ہی خوش نظر آنے لگے تھے۔ ٹریڈ لائن کا دفتر شہر کے مصروف ترین کاروباری علاقے میں واقع تھا۔ یوں تو وہ مقامی مایا کا بیڈ کو ادارہ تھا لیکن اس ادارے کے وجود کا ظاہری جواز اس کی درآمدی سرگرمیوں میں مضمر تھا۔ درآمدی کاروبار کے شعبے میں جو عملہ ملازم تھا اسے سرے سے علم ہی نہیں تھا کہ ٹریڈ لائن کا مایا یا منشیات کی غیر قانونی تجارت سے بھی کوئی تعلق تھا، دفتری نظام کچھ اس انداز میں استوار کیا گیا تھا کہ درآمدی شعبے کے عملے میں سے کسی کو بھی اس طرف آنے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی جہاں میرے اور چیف کے دفاتر واقع تھے۔ سخت زچہ کے نام پر قائم کی گئی، اس تقریب کی وجہ سے کاروباری عملے میں تجسس آمیز سرگوشیاں ضرور ختم لیتی تھیں لیکن ان میں سے کوئی بھی ضرورت سے زیادہ تجسس ہونے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ اس کی وجہ بہت سیدھی سادی اور قابل فہم تھی۔

ان سب کو ان کی تعلیم اور تجربے کے اعتبار سے خاصی بہتر تنخواہیں دی جاتی تھیں۔ کام کی تقسیم بہت واضح تھی اور ہر شخص اپنی ذمہ داریوں کی انجام دہی کے سلسلے میں منیجر کو جواب دہ تھا۔ نیز، دفاتر تحریری ہدایات ملتی رہتی تھیں یا کبھی کبھار حبیب

کسی خوش دلی جھلک دہی تھی ”آج میں کافی دنوں کے بعد تمہیں دیکھ رہا ہوں۔“

”اور میں تمہارے دوبارہ موجود ہونے کے باوجود تمہیں دیکھنے سے قاصر ہوں۔“

وہ دھیمے سے ہنسا اور بولا ”ہاتھ پیروں کے ساتھ تم نیاں کے بھی بہت تیز ہو۔ پہلے روز تم نے سینڈو مرحوم اور اس کے ساتھیوں کی جو درگت بنائی تھی“ وہ مجھے اب تک یاد ہے اور تمہاری زبان کے جو ہر آہستہ آہستہ کھل رہے ہیں۔ یہ بتاؤ کہ ویرا کے بارے میں کیا خبریں ہیں؟“

”کچھ بھی نہیں“ میں نے مایوسی کے ساتھ شانے اچکا کر کلمہ ”شیر شاہ کے آتے ہی وہ اس طرح مفقود الخیر ہوئی ہے جیسے اپنا وجود ہی کھو بیٹھی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے زمین نکل گئی یا آسمان کھائی۔ میں نے اس کی تلاش میں شر کا کونا کونا چھان مارا ہے لیکن وہ کسی چھلاوے کی طرح غائب ہو گئی ہے۔“

”میرا اندازہ تھا کہ اس بار تم اسے مار لو گے لیکن خیر، کبھی نہ کبھی اسے سامنے آنا ہی پڑے گا۔ اتنا ضرور ہوا ہے کہ تمہاری حرکتوں سے پوکھلا کر ان لوگوں نے میدان کھلا چھوڑ دیا ہے۔ شہ کی دلچسپی ختم ہوتے ہی یہاں ہیروئن کے دام گر گئے ہیں اور مکمل منڈی میں مال کی ہستات نظر آنے لگی ہے۔“

”آج دو بجے ڈان کے آنے کا امکان ہے یا اس کا فون آنے گا؟“ میں نے پوچھا۔

”مجھے جو کچھ معلوم تھا وہ میں تم کو بتا چکا ہوں۔ اس وقت تمہیں یہ بات کیوں یاد آئی؟“

”میرا خیال ہے کہ کام بڑھانے کے لیے یہ بہترین موقع ہے۔ اگر ہم روادارٹی طریقوں سے ہٹ کرنے طریقے اپنائیں تو ہم روزانہ میاں سے کئی من ہیروئن ایکسپورٹ کر سکتے ہیں۔ اس بارے میں ڈان ہماری بہترین رہنمائی کر سکتا ہے۔ تم کو اس سے اس بارے میں بات کرنی چاہیے۔“

”تم کن نئے طریقوں کی بات کر رہے ہو؟“ اس نے گہری دلچسپی کے ساتھ پوچھا ”آج کل تو پاکستان سے برآمد کی جانے والی ہر روادارٹی اور غیر روادارٹی چیز پر ہیروئن کییر کا شبہ کیا جاتا ہے۔“

”آج کل میاں سے یورپ اور امریکا کے لیے سوئی کپڑوں کے پورے پورے جہاز جارہے ہیں۔ ہر کنٹینر میں لدے ہوئے سیڑوں ڈول میں آٹھ دس ڈبے ہیروئن کے ہوں تو ان کا پکڑا جانا ممکنات میں سے ہے۔ پورے کنٹینر کو خالی کیے بغیر“ آخر میں رکھے ہوئے ڈول کو چپک کر ناممکن نہیں ہو گا۔ منزل پر پہنچنے کے بعد کنٹینر بندرگاہ کے بجائے اپنے گوداموں میں خالی کیے جائیں تو پکڑے جانے کا امکان اور بھی کم ہو جاتا ہے۔“

”اس طرح تو چڑے کے لمبوسات کی آڑ بھی لی جاسکتی ہے۔ چڑے کا سامان عام طور پر ہوائی جہاز سے بھیجا جاتا ہے۔ ایک ہفتے میں مال ادرے سے اُدھر ہو سکتا ہے۔“ اس نے فوراً اپنی جوانی تجویز

میں اس کے نیچر کا نام تھا۔ لڑکی کا انداز اور لب و لہجہ تیار رہا کہ وہ کسی بدترین الجھن سے دوچار ہے۔

”بیٹے جاؤ“ میں تمہیں بتاؤں گا۔“ میں یہ کہتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ ”میں نے دیکھا ہے کہ تمہیں ہائیڈروجن کے کسی رکن کو پکڑا دیا ہے۔“ میں نے ہنسنا شروع کیا۔ ”میں نے دیکھا ہے کہ تمہیں ہائیڈروجن کے کسی رکن کو پکڑا دیا ہے۔“ میں نے ہنسنا شروع کیا۔ ”میں نے دیکھا ہے کہ تمہیں ہائیڈروجن کے کسی رکن کو پکڑا دیا ہے۔“ میں نے ہنسنا شروع کیا۔

”میں نے دیکھا ہے کہ تمہیں ہائیڈروجن کے کسی رکن کو پکڑا دیا ہے۔“ میں نے ہنسنا شروع کیا۔ ”میں نے دیکھا ہے کہ تمہیں ہائیڈروجن کے کسی رکن کو پکڑا دیا ہے۔“ میں نے ہنسنا شروع کیا۔

”میں نے دیکھا ہے کہ تمہیں ہائیڈروجن کے کسی رکن کو پکڑا دیا ہے۔“ میں نے ہنسنا شروع کیا۔ ”میں نے دیکھا ہے کہ تمہیں ہائیڈروجن کے کسی رکن کو پکڑا دیا ہے۔“ میں نے ہنسنا شروع کیا۔

”میں نے دیکھا ہے کہ تمہیں ہائیڈروجن کے کسی رکن کو پکڑا دیا ہے۔“ میں نے ہنسنا شروع کیا۔ ”میں نے دیکھا ہے کہ تمہیں ہائیڈروجن کے کسی رکن کو پکڑا دیا ہے۔“ میں نے ہنسنا شروع کیا۔

”میں نے دیکھا ہے کہ تمہیں ہائیڈروجن کے کسی رکن کو پکڑا دیا ہے۔“ میں نے ہنسنا شروع کیا۔ ”میں نے دیکھا ہے کہ تمہیں ہائیڈروجن کے کسی رکن کو پکڑا دیا ہے۔“ میں نے ہنسنا شروع کیا۔

”میں نے دیکھا ہے کہ تمہیں ہائیڈروجن کے کسی رکن کو پکڑا دیا ہے۔“ میں نے ہنسنا شروع کیا۔ ”میں نے دیکھا ہے کہ تمہیں ہائیڈروجن کے کسی رکن کو پکڑا دیا ہے۔“ میں نے ہنسنا شروع کیا۔

”میں نے دیکھا ہے کہ تمہیں ہائیڈروجن کے کسی رکن کو پکڑا دیا ہے۔“ میں نے ہنسنا شروع کیا۔ ”میں نے دیکھا ہے کہ تمہیں ہائیڈروجن کے کسی رکن کو پکڑا دیا ہے۔“ میں نے ہنسنا شروع کیا۔

”میں نے دیکھا ہے کہ تمہیں ہائیڈروجن کے کسی رکن کو پکڑا دیا ہے۔“ میں نے ہنسنا شروع کیا۔ ”میں نے دیکھا ہے کہ تمہیں ہائیڈروجن کے کسی رکن کو پکڑا دیا ہے۔“ میں نے ہنسنا شروع کیا۔

پیش کردی۔

”اول تو بندرگاہوں کے مقابلے میں ہوائی اڈوں پر کسٹم اور گمرانی کے کڑے انتظامات ہوتے ہیں۔ یورپ کے بعض ہوائی اڈوں پر تو کتے بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔ دوسری خرابی یہ ہے کہ چری بلبوسات کا ہر ذرا انفرادی طور پر گھولا اور دیکھا جاسکتا ہے۔ میں چالیس فٹ لمبے کنٹینرز کی بات کر رہا ہوں۔ انہیں خالی کرنا اور دوبارہ بھرنا آسان کام نہیں ہوتا ویسے بھی بندرگاہوں پر بحری کے بغیر بہت کم منشیات پکڑی جاتی ہیں۔“

”تمہاری آخری بات میں وزن ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔ ”میں ڈان سے بات کروں گا۔ میدان خالی ہونے کے بعد ہمیں اس موقع سے بھر پور فائدہ اٹھانا چاہیے۔ تمہاری اطلاع کے لیے بتاتا چلوں کہ پچھلے دنوں آئے ہوئے افغانیوں سے بہت اچھا سودا ہوا تھا۔ ان کی طرف سے پانچ کلو یومیہ کی مسلسل سپلائی مل رہی ہے۔“

”مال کیسے آ رہا ہے؟“ میں نے اس اطلاع میں دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے پوچھا۔

”ان کی سپلائی لائن بہت محفوظ اور قابل رشک ہے۔“ اندھیرے میں سے جواب آیا ”آزاد قبائلی علاقے میں سرحدی روک ٹوک نہ ہونے کی وجہ سے ان کا ایک آدمی افغان علاقے سے مال لے کر پشاور میں کسی کے حوالے کرتا ہے۔ پشاور سے دوسرا آدمی جنازہ سے برف کیس میں مال لے کر کراچی آتا ہے اور فون پر شیر شاہ سے رابطہ کر کے وقت اور مقام کا تعین کر کے اس کے مطابق برف کیس شیر شاہ سے بدل لیتا ہے۔ اس پورے بندوبست میں ہمیں دو طرفہ ٹکٹ کے علاوہ صرف دس ہزار روپے یومیہ دینے پڑے ہیں جو میری نگاہ میں بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔“

”لیکن کسی بھی آدمی کا روزانہ ہوائی سفر، ہوائی اڈوں کی گمرانی پر مامور اہل کاروں کو اس کی طرف متوجہ کر سکتا ہے۔ پھر پشاور کراچی روٹ پر تو ویسے بھی کڑی گمرانی رہتی ہے۔“ میں نے رائے ظاہر کی۔

وہ میرے اندیشے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ہنسا پھولا ”وہ لوگ کھانے پینے کے معاملے میں اجڑا اور وحشی نظر آتے ہیں لیکن اپنے کام کے ہر نشیب و فراز پر نظر رکھتے ہیں۔ انہیں ہوائی سفر اور کراچی دیکھنے کے بہت سے شوقین مل جاتے ہیں جو یہاں دو تین دن گزارنے کی خاطر۔ آسانی ان کے آواز کار بن جاتے ہیں۔ اس طرح ان کے پاس پندرہ بیس آدمیوں کی ٹیم ہے، وہ باری باری سفر کرتے ہیں اس لیے کوئی ان کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا۔“

قدرے توقف کے بعد وہ پھر بولنے لگا ”میرا خیال ہے کہ اب تمہیں ہمارے ساتھ آنے ہوئے کافی عرصہ ہو چکا ہے۔ بہتر ہو گا کہ مال کی وصولی اور پھر آگے روانگی کے انتظامات تم اپنے ہاتھ میں لے لو۔ تم اپنی ذہانت سے کام لے کر بزنس کو بہت آگے لے جا سکتے ہو۔“

”میں خود بھی ان ہی خطوط پر سوچ رہا ہوں۔“ میں نے ہنس کر جواب دے کر، وہ بات وہیں ختم کر دی کیونکہ میرے ذہن پر ایک بار پھر بیلا کا مسئلہ سوار ہونے لگا تھا۔

”میں کچھ دیر کے لیے باہر جا رہا ہوں لیکن ایک بجے تک واپس لوٹ آؤں گا۔ اس دوران میں تم دفتری میں موجود رہنا ہو سکتا ہے کہ باہر سے کوئی اہم کال آجائے۔“

میں واپس اپنے کمرے میں لوٹ آیا لیکن بیلا کا مسئلہ بدستور میرے سر پر سوار تھا۔

اس بارے میں وہ دبی صورتیں ممکن تھیں۔ میں ٹیڈ لائن کی دفتری روایات کو خیر یاد رکھتے ہوئے، بیلا کو اپنے دفتر میں طلب کر لیا اور اسے اپنے دفتری ساتھیوں کی بے رحمانہ جرح کا نشانہ بننے پر مجبور کر دیا۔ اس امکان سے وہ خود بھی واقف تھی بلکہ دفنی طور پر اس صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے تیار بھی تھی۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ میں دفتری اوقات کے بعد اس سے باہر ملاقات کر کے معاملے کی تک پہنچنے کی کوشش کرتا۔ اس طرح دفتری میں کیڑا کاٹوں کان بھی اس ملاقات کا علم نہ ہو پاتا اور حقائق میرے علم میں آجاتے۔

میں نے کچھ دیر تک سوچنے کے بعد انٹرکام پر بیلا سے بات کرنے کے بجائے اپنے ڈائریکٹ فون پر ٹیڈ لائن کے بورڈ کا نمبر دیا کیونکہ انٹرکام پر ہونے والی گفتگو بھی دوسروں کی توجہ کا مرکز بن سکتی تھی۔ میں نے آپریٹر کو اپنا فرضی نام بتاتے ہوئے نبیلہ سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ اسے دفتر میں بے تکلفی کے ساتھ بلا کہا جاتا تھا لیکن اس کا اصل نام نبیلہ تھا۔

آپریٹر نے فوری طور پر میری کال نبیلہ کو منتقل کر دی۔ مجھے معلوم تھا کہ در آمدی شعبے میں عملے کی نجی ضروریات کے لیے ایک الگ تھلگ گوشے میں فون موجود رہتا تھا جہاں کوئی بھی شخص پوری رازداری کے ساتھ فون پر گفتگو کر سکتا تھا۔

”تم مجھ سے کس سلسلے میں ملنا چاہتی ہو، بیلا؟“ میں نے نرمی سے پوچھا۔

”اوہ، آپ؟“ میری آواز سن کر شاید وہ حیران رہ گئی ”میں آپ کی احسان مند ہوں کہ میری وجہ سے آپ نے اتنی احتیاط سے کام لیا، لیکن میں جانتی ہوں کہ میں زیادہ دنوں تک اس دفتر میں نہیں رہ سکوں گی، آپ مجھے اپنے دفتر میں طلب کر لیں، تباہی کی ذمہ داری میری اپنی ہوگی۔“

”تم جاہو تو میں دفتر سے چھٹی ہونے کے بعد بھی تمہیں وقت دے سکتا ہوں۔“

”بے سود ہے“ اس کی آواز بھرا سنی ”دفتر سے نکلنے کے بعد بھی نادیدہ نگاہیں میرا پیچھا کرتی رہتی ہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے آپ بھی کسی کی نظروں میں آجائیں۔ میں آپ سے مل کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی ہوں۔ یہ کام دفتری میں مناسب

جواب میں اسے اپنے سامنے دیکھ کر خوف زدہ ہو گئی۔ میں اسے ڈانٹتی، پھٹکارتی تو وہاں ہنگامہ کھڑا ہو جاتا اور میں اکیلی رہنے کی وجہ سے بزدلیوں میں بدنام ہو جاتی۔ سستے کرائے کا وہ فلیٹ مجھ سے خالی بھی کرایا جاسکتا تھا۔ میری خاموشی اور بدحواسی سے وہ شیر ہو گیا اور اس نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھ سے دست دراز کر کے گھنیا حرکتوں کا مظاہرہ کرے گا لیکن وہ بہت شائستگی کے ساتھ میری تعریفیں کرتا ہوا ایک طرف بیٹھ گیا۔ اس کی شکل صورت اچھی تھی۔ وہ باحیثیت بھی نظر آتا تھا اور پھر میں بھی اپنے شوہر سے متعلقہ کے بعد تنہا کا غدا بھر رہی تھی۔ اس لیے میں اس کی نیچے دار باتوں میں آکر ہلک گئی۔

اس نے مجھے انعام اکبر علی بنایا تو مجھے شبہ بھی نہیں ہو سکا کہ وہ میرا چیف ہوگا۔ اگلے دن، میں اس کی ہدایت کے مطابق اپنے فلیٹ سے پہلے، حسن اسکو اتر پر بس سے اتر گئی اور وہ مجھے گاڑی میں اپنے شاہانہ فلیٹ پر لے گیا۔ وہ شراب کا رسیا ہے لیکن کبھی بھی آپے سے باہر نہیں ہوتا۔ اس دوران میں، میں نے کئی راتیں اس کے فلیٹ پر بھی گزاریں۔ وہ منہ اندھیرے مجھے گلشن اقبال چھوڑ آتا تھا۔ اس دوران میں مجھے پرانے اخبارات کا ایک بندوق مل گیا۔ اکبر علی سویا ہوا تھا۔ میں نے ہاتھ روم میں چھپ کر اخبارات کھولے تو میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ میں جس آدمی کے ساتھ رہ رہی تھی وہ ہیروئن کی اسٹنگ کا ایک سزا یافتہ مجرم تھا۔ اخباروں میں اس کی تصویروں کے نیچے سیٹھ حبیب حیوانی کا نام لکھا ہوا تھا۔ اسے جرمی میں قید کی سزا ہوئی تھی اور وہ قید ختم ہونے سے پہلے ہی مر گیا تھا۔ وہ تعصبات پڑھ کر میرے رو گئے کھڑے ہو گئے۔ کسی بد روح کے ساتھ راتیں بسر کرنے کے احساس سے میں دہشت زدہ ہو گئی اور میں نے اخبارات لپیٹ کر اسی طرح واپس رکھ دیے۔ اب میں اس شخص سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی ہوں لیکن وہ جو تک بن کر میرے وجود سے چٹا ہوا ہے۔ اس کا مطالعہ ہے کہ میں اپنی موجودہ رہائش ترک کر کے مستقل اس کے ساتھ رہنا شروع کر دوں لیکن یہ میرے بس سے باہر ہے۔ اس سے پیچھا چھڑانے کی بس ایک ہی صورت نظر آتی ہے کہ میں نوکری چھوڑ کر کمان واپس چلی جاؤں۔“

وہ خاموش ہو کر اپنی آنکھوں میں اتری ہوئی نمی کو خشک کرنے میں مصروف ہو گئی۔

میں سمجھ چکا تھا کہ وہ سیٹھ حبیب حیوانی کے ہی چنگل میں پھنسی ہوئی تھی، اپنی ویران اور بے رنگ راتوں میں شباب کی رونق بچانے کے لیے اس مردود نے اپنے ہی دفتر کی ایک حسین و جمیل لڑکی پر ڈورے ڈالے ہوئے تھے۔ پھر بھی میں نے انجان بن کر پوچھا ”تم نے یہ نہیں بتایا کہ اس قفسے میں چیف کہاں سے آیا۔“

”وہ اکبر علی کے نام ہی سے رہتا ہے۔ اخبارات دیکھنے کے بعد میں بہت زیادہ محنت ہوئی اور موقع پا کر اس کی چیزوں کی تلاش

ہے گا۔“ ”تھک ہے، میں تمہیں بلاتا ہوں۔“ میں نے تھکے ہوئے انداز میں فون بند کر دیا۔

میں نئی سکرٹ سلا کر چند ٹائیوں تک خالی اللہ بی کے عالم میں دھواں اڑاتا رہا پھر میں نے انٹرکام سے سعید کو ہدایت کی کہ وہ میرے کمرے کے دفتر میں پہنچ دے۔

شیر شاہ اپنے بیروں کے دفاتر کی دیکھ بھال کے لیے کسی شکاری کی طرح ان ہی اطراف میں منڈلاتا رہتا تھا اس لیے اس نے رات ہی میں یلا کو روک لیا اور اسے اپنے ساتھ لے کر میرے دفتر میں لایا۔

”تم جاؤ اسے میں نے ہی بلایا ہے۔“ میں نے شیر شاہ کو گھورتے ہوئے کہا اور وہ اگلے قدموں واپس چلا گیا۔

”بیٹہ بابا! میں نے یلا کو سر سے پیر تک غور سے دیکھے ہوئے ہوں۔“

یلا گوری جینی اور صحت مند لڑکی تھی۔ اس روز میں نے پہلی بار اندازہ لگایا کہ وہ خاصی پُرکشش بھی تھی لیکن اس وقت اس کی حور آنکھوں سے زندگی کی حرارت کے بجائے ویرانی مرعہ تھی۔ اس کے پتلے پننے ہونٹوں کے گوشے یوں کپکپا رہے تھے جیسے وہ کوشش کر کے رونے سے گریز کر رہی ہو۔

”س۔۔۔ سر! میں بہت خوف زدہ ہوں۔“ اس نے نظریں اٹھا کر بغیر لڑائی ہوئی آواز میں کہا۔

”تمہارے کیا ہے؟ جب تک تم مجھے تفصیل نہیں بتاؤ گی، میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتا گا۔“

”آپ کو معلوم ہے کہ ہم اس دفتر میں بہت پُر اسرار ماحول میں کام کرتے ہیں۔“ وہ رک رک کر بولنے لگی ”حد تو یہ ہے کہ ہم اس سے کسی نے آج تک اپنے چیف کا سایہ بھی نہیں دیکھا۔ ہمارے خطوط پر سعید صاحب دستخط کرتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ ہمارے چیف کا نام اکبر علی شیرازی ہے۔“ اس سرطے ہاں نے خاموش ہو کر استفسار طلب نگاہوں سے پہلی بار میری طرف دیکھا اور میں مشینی انداز میں اپنے سر کو خفیف سی اثباتی جھٹک دے کر رہ گیا۔

”میں جناب میں اپنے شوہر سے متعلقہ کے بعد کراچی آئی ہوئی ہوں۔“ اس نے اپنی کمانی جاری رکھی ”کیونکہ یہاں اچھی ٹائمنگ ملتی ہے۔ میں سکون کے ساتھ گلشن اقبال میں دو کمروں کے ایک فلیٹ میں رہ رہی ہوں اور دفتر سے سیدھی وہیں جاتی ہوں۔“ ”نہ ہر عورت پہلے ایک آدمی نے جیتی کار میں میرا پیچھا کرنا شروع کیا۔ پہلے ایک روز تک میں نے اتفاق سمجھ کر اسے نظر انداز کیا لیکن جب وہ بس سے آگے پیچھے گاڑی دوڑاتا ہوا باقاعدگی سے وہاں پہنچنے اور اشارے بازی کرنے لگا تو میں پریشان ہو گئی۔ ایک دن وہ دیدہ دلیری کے ساتھ میرے فلیٹ پر پہنچ گیا، دستک کے

”ابنہ امیں میری سوچ بھی تھی کہ دوستی آگے چل کر شاید بڑھ کر سارا میں جائے لیکن وہ آزاد بھونرے کی طرح زندگی بسر کرتا چاہتا ہے۔ اس کے بارے میں انکشافات ہونے کے بعد میں خود بھی ایک مجرم کی بیوی بننے کا تصور نہیں کر سکتی۔ میں ایک غریب گھرانے کی بچی تھی لکھی لڑکی ہوں۔ تعلیم نے مجھے عزت کا محسوس بخشنے میں بہت مدد دی ہے۔“

”ابکر علی یا حبیب حیوانی کے ہوس ناک عزائم کے سامنے سر جھکا کر تم نے کون سا باعزت کام کیا ہے؟“

”وہ میری بہت بڑی بھول تھی۔ اپنے اندر ایسے ہونے پر زور حیوانی جذبات کو لگام دینا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ راتوں کی سیاہی میں، کھیتوں اور کھلیانوں سے لے کر بڑے گھرانوں تک میں نہ جانے کتنے گناہ کیے جاتے ہیں۔ رازداری برقرار رہے تو کسی بھی شریف کے دامن پر ان گناہوں کا ہلکا سا داغ بھی نظر نہیں آتا۔ بات کھل جاتی ہے تو اپنی طرف سے لوگوں کی توجہ ہٹانے کے لیے سب ہی انکشت نمائی شروع کر دیتے ہیں۔ میں کوئی کتواری لڑکی نہیں تھی ہندم کے غمار سے آشنا ہونے کے بعد سے بزرگ اور ولی بھی اسی پر پلٹے پلٹے آ رہے ہیں۔ میں کوئی جواز نہیں دے رہی، سزا میں نے بہت برا کیا۔ وہ میرا گناہ تھا لیکن ایک انسانی لغزش تھی اور اب میں اس سے تائب ہونا چاہتی ہوں۔ چھوٹی اور پسماندہ بستوں والوں کو بڑے شہروں کی چکا چوند راس نہیں آتی۔ ملتان میں اپنی بوڑھی ماں اور شیر خوار بچے کے ساتھ میں زیادہ خوش رہوں گی۔“ میرے جیسے ہونے سوال پر وہ ایک بیک بنیادی ہوئی۔

”تمہاری آنکھیں مہو مہو ہیں۔ بچھلی رات تم کہاں تھیں؟“ میں نے اس کے چہرے پر نظرسر کاڑ کر سرسری لہجے میں سوال کیا۔ ”چیف کے فلیٹ پر ہی تھی۔“ اس نے سر اٹھائے بغیر ہنسنے لہجے میں کہا ”بچھلی رات چند فون کالز کی وجہ سے وہ پریشان تھا۔ کسی نے اس کے نمبر پر اس کے اصل نام سے فون کیا تھا۔“

”تو کیا اس کے جانے والوں میں سے کوئی اصلیت سے باخبر نہیں ہے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”نہم از کم وہ تو یہی کہہ رہا تھا۔ دو مرتبہ میں نے ایک ہی آواز سنی، تیسری مرتبہ کسی نے آواز دے کر اس کے چہرے کی کوشش کی تھی۔ ان واقعات کے بعد اس کا موڈ بہت خراب ہو گیا تھا اور وہ کسی معمولی غصے کی طرح اپنے نامعلوم حریفوں کو گندی گندی گالیاں دے کر سب کچھ تباہ کر دینے کے دعوے کر رہا تھا۔ اس سے بات کرنے والے نے شاید میرے بارے میں بھی ذہن لگا رکھا تھا۔ کیونکہ بعد میں اس نے مجھ سے اس بارے میں کافی سچ سچ کلامی کی تھی۔ وہ جانتا رہا تھا کہ کراچی منتقل ہونے کے بعد میں نے اس کے علاوہ اور کس سے دوستی کی تھی۔ مجھے قسمت کی اس قسم غریبی پر شدت سے رونا آتا کہ جو ظالم اور مجرم تھا وہ ساہوکار بنا ہوا تھا

لینے لگی۔ اسی دوران میں مجھے ایک خفیہ خانے سے کچھ خطوط اور وزینٹ کارڈ ملے۔ ان سب پر ابکر علی شیرازی کا نام تھا۔ اس انکشاف نے مجھے بالکل ہی بے جان کر دیا۔ اب میں چیف سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے آپ سے مدد کی بھیک لینے آئی ہوں۔“ وہ سبکوں کے ساتھ چپکے چپکے رونے لگی۔

”اسے معلوم ہے کہ تم اس کے کاغذات اور فیروزہ دیکھ چکی ہو؟“ میں نے اسے ترم آئینہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

اس نے اپنے سر کو زور زور سے نیچی میں جھنجھٹ دی اور روتے ہوئے بولی ”مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ کوئی بہت بڑا مجرم ہے جو ٹریڈ لائن کی آڑ میں کوئی اور ہی چکر چلا رہا ہے۔ میں اسے خوش رکھنے کی کوششوں کے باوجود اپنے خوف پر قابو نہیں پاسکی۔ جب بھی مجھے یہ یاد آتا کہ سینٹ حبیب حیوانی مرکا ہے تو میرا بدن ٹھنڈا پڑ جاتا۔ اس تبدیلی کو اس نے بھی محسوس کر لیا۔ پھر اسے پتا چل گیا کہ میں نے اخبارات سے چھین چھڑا کی تھی۔ شاید میں نے خوف اور گھبراہٹ میں اخبارات کا بنڈل غلط جگہ پر رکھ دیا تھا۔ میرے سامنے اعتراف کرنے کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں تھا لیکن میں نے اسے خطوط اور اس کے وزینٹ کارڈز کے بارے میں ابھی تک کچھ نہیں بتایا۔“

”اخبارات کے بارے میں اس کے پاس کیا جواب تھا؟“ میں نے سوال کیا۔

”اس نے میری دہشت کا دل کھول کر مذاق اڑایا اور کہا کہ وہ حبیب حیوانی ہی ہے۔ اسے غلط فہمی میں سزا ہوئی لیکن وہ جرمی کی جیل سے بھاگ آیا۔ جیل کے حکام نے اپنی مانی پر پردہ ڈالنے کے لیے ایسا کسی اور وجہ سے کسی لاوارث لاش کو حبیب حیوانی کا نام دے دیا اور وہ ابکر علی کے نام سے پاکستان میں میس کر رہا ہے۔“

”اس کی یہ وضاحت قابل قبول معلوم ہوتی ہے۔ مغربی ممالک میں پاکستانیوں کے جرائم کو عموماً بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بھی ایسے ہی حالات کا شکار ہوا ہو۔“

”اس سے مجھے کوئی مطلب نہیں۔ میرے دل سے یہ دہشت بھی نکل چکی ہے کہ میں ایک مرمہ شخص کے بھوت کے ساتھ رنگ رلیاں مٹا رہی ہوں لیکن پھر بھی میرے دل میں اس کی طرف سے خوف، نفرت اور کراہت جاگزیں ہو چکی ہے۔ میں نے آج تک ٹریڈ لائن کے چیف کی جھٹک تک نہیں دیکھی لیکن وہ نہ جانے کب سے مجھ پر نگاہ رکھے بیٹھا تھا۔ اچھی تنخواہوں اور سوتلوں نے سب کی زبانیں بند کی ہوئی ہیں لیکن دفتر میں ہر شخص جانتا ہے کہ ٹریڈ لائن کی آمدنی کے ذرائع خفیہ اور غیر قانونی ہیں۔ میں اب یہاں رک رہی تو تصدیقاً میری طرف سے کچھ جانے پہنچے جاؤں گی۔“

”وہ تمہیں اس قدر پسند کرتا ہے تو تم اس سے شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟ ایک مضبوط رشتے میں بندھ جانے کے بعد بہت سے رازوں سے خود بخود پردہ اٹھ جاتا ہے۔“

اور میں اپنی بے گناہی کے باوجود اس کے سامنے مجرم بن گئی تھی۔“

اس کے جواب نے میرے ذہن سے الجھن دور کر دی۔ یہ بڑا نصیحت ہوا کہ بیلا مجھ سے دو بدویات کرتے ہوئے میری اصل آواز اور فون پر سنی ہوئی آواز میں کوئی مماثلت محسوس نہیں کر سکی تھی۔ اسے میری آواز پر ذرا سا بھی شبہ ہو جاتا تو وہ پل بھر میں مجھے بھی حبیب حیوانی دانی صف میں گھرا کر دیتی۔

”جھوٹے موٹے دفتروں میں مالکان اپنی دہشتگی کے لیے اپنی من پسند لڑکوں کو ملازم رکھ لیتے ہیں۔“ وہ کہہ رہی تھی ”لیکن بڑے اداروں میں سربراہ کو عملے کا سرپرست بلکہ باپ تصور کیا جاتا ہے۔ میں نے یہی سوچ کر ٹریڈ لائن میں ملازمت کی تھی مگر میں تو کھلا اندھیر ہے۔ اپنے ماتحتوں کی عزت کا رکھوالا ہی شکاری بھیڑنا بنا ہوا ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ آپ جیسا شریف اور نفیس آدمی اس کے ساتھ کیسے چل رہا ہے!“

”میں یہاں اکبر علی شیرازی کے ساتھ کام کرتا ہوں۔“ میں نے نئی سگرتہ سلاگتے ہوئے کہا ”مجھے تو تم بتا رہی ہو کہ اس کی شخصیت کا کوئی دوسرا روپ بھی ہے۔ مجھ میں اور دوسرے ملازمین میں صرف اتنا فرق ہے کہ میں سب سے سینئر ہوں اور وہ میرے ماتحت ہیں۔ اپنی نئی زندگی میں اکبر صاحب کیا کرتے ہیں اس سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں نے بہت سے ایسے لوگ دیکھے ہیں جو خوب صورت عورت کو دیکھتے ہی اسے گھبرنے کی فکر میں لگ جاتے ہیں۔ تمہارا اپنا کردار مضبوط ہوتا تو تم پہلے ہی مرحلے پر انہیں دھکے دے کر اپنے فلیٹ سے بھاگ سکتی تھیں۔“

”کم از کم مجھے یہ خوشی ہے کہ آپ نے میری کمائی پر یقین کر لیا۔ میں کسی اور کے سامنے زبان کھولتی تو وہ میری باتوں پر ہرے سے اعتبار ہی نہ کرتا۔ آپ خود ہی بتائیں کہ ان حالات میں، میں اپنی نوکری کس طرح جاری رکھ سکتی ہوں؟ اگر آپ آج ہی میرا حساب ادا کرادیں تو میں عمر بھر آپ کی احسان مند رہوں گی۔“

”میں کچھ نہ کچھ کرتا ہوں۔ تم اپنی جگہ پر جاؤ اور اپنے کسی بھی ساتھی سے کسی بات کا ذکر نہ کرنا۔ کوئی حماقت کی تو اس کے سنگین نتائج کی تم خود دتے دار ہو گی۔“

اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں اور اس نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا ”آپ کن سنگین نتائج کا حوالہ دے رہے ہیں؟ اپنے درندہ صفت چیف کا کھلونا بننے کے بعد میرے لیے ایسا کون سا خطرہ باقی رہ گیا ہے جس کی مجھے پروا ہو۔ یا وہ مجھے ہلاک بھی کر دے سکتا ہے؟“

اپنے آخری سوال پر وہ خود بھی دہشت زدہ ہو گئی۔ وہ امکان ہی اس قدر لرزہ خیز تھا کہ میں اس پر کھل کر بات نہیں کر سکتا تھا لیکن میرے دل میں وہی خوف جاگزیں ہو چکا تھا۔ حبیب حیوانی کو

بھٹک بھی مل جاتی کہ بیلا اس کی اصلیت سے واقف ہو چکی ہے توں ایک لمحہ بھی شائع کے بغیر اس کی موت کا پروانہ جاری کر سکتا تھا۔ ”میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ میں نے نرمی اور آہستگی کے ساتھ کہا ”ہر بات کا انحصار اس امر پر ہے کہ جو کچھ تم نے بتایا اس میں صداقت کتنی ہے۔ میری معلومات محدود ہیں لیکن احتیاط اور محض مندی کا تقاضا ہے کہ تم تحقیق کے ساتھ اپنی زبان بند رکھو۔ کوئی بھی محض اپنے رازوں کی حفاظت کے لیے آخری حدوں تک جا سکتا ہے۔“

”ان مشوروں کا شکریہ!“ وہ بھڑائی ہوئی آواز کے ساتھ کرسی سے اٹھ گئی ”آپ کی ذات سے مجھے امید ہے کہ کل مجھے اس منحوس دفتر میں نہیں آنا پڑے گا جہاں مجازی باپ اپنی بیٹیوں پر دانت لگائے بیٹھا رہتا ہے۔“

میں نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ بس خاموشی کے ساتھ اسے واپس جاتے دیکھتا رہا۔

نبیذ کی کمائی نے مجھے شدید ذہنی جھٹکا پہنچایا تھا۔ اس کی بعض باتوں میں خاصا وزن تھا۔

پھر دوسری طرف حبیب حیوانی کا ناقابلِ فہم رویہ تھاجس کا کوئی بھی جواز نہیں تھا۔

اپنی بیوی کی ہلاکت کے بعد وہ جبری تجویز کی زندگی گزار رہا تھا اور یہ بات تسلیم کی جا سکتی تھی کہ اپنی ضروریات کے لیے اسے کسی سہارے کی ضرورت تھی۔ وہ جوان، خوب رو اور صحت مند تھا۔ اس کے پاس دولت کی کوئی کمی نہیں تھی شکر کے ہولٹوں اور دیگر تقریباً گاہوں میں اسے بیلا سے ہزار درجے بہتر اور خوب صورت لڑکیاں کی رفاقت مل سکتی تھی پھر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ اس کی نگاہ انتخاب بیلا پر ہی کیوں پڑی۔

ہاٹ لائن پر آنے والے پیغام نے میرے ان پریشان کن خیالات کا تسلسل توڑ دیا۔

حبیب حیوانی خفیہ راستے سے باہر جانے کے بعد دوبارہ اپنے دفتر میں آچکا تھا اور مجھے بلا رہا تھا۔

”بیلا تمہارے پاس کیوں آئی تھی؟“ میرے بیٹھے ہی اس نے سوال کر کے مجھے چونکا دیا۔ شاید اسے شیر شاہ کے ذریعے اس واقعہ کی خبر مل چکی تھی اور وہ اسی پر مجھ سے بات کرنے کے موڈ میں تھا۔

”وہ تم سے خوف زدہ بلکہ دہشت زدہ ہے اور نوکری چھوڑنا چاہتی ہے۔“ میں نے کسی گھماؤ پھراؤ کے بغیر براہِ راست اسے اصل بات سے آگاہ کر دیا۔

”کیوں؟“ اس کی خیر زندہ آواز ابھری ”وہ مجھے کیسے جانتی ہے؟“

”وہ حبیب حیوانی عرف اکبر علی نامی ایک محض سے خوف زدہ ہے۔ وہ محض زبردستی اس کا عاشق بن بیٹھا ہے۔ بیلا کو یہ معلوم نہیں کہ وہی آدمی ٹریڈ لائن کا چیف بھی ہے۔ اس کی کمائی سننے کے

معصومانہ حرمت سے کہا ”اس نے مجھے اپنے کسی شناسا کا قصہ سنایا ہے۔ اسے خود بھی یہ معلوم نہیں ہے کہ حبیب حیوانی ہی ٹریڈ لائن کا چیف ہے۔ پھر میں ایک انجینی کے بارے میں اسے کیا کہہ سکتا ہوں؟“

میری تاویل پر وہ قدرے چڑکھوٹا ”ایک عمومی ہدایت تو دے ہی سکتے ہو کہ وہ اپنی کمائی اپنے ساتھ ہی لے جائے ورنہ اس کے قصے ہمارے دفتر میں گردش کرتے رہیں گے۔“

”ٹھیک ہے!“ میں سر ہٹا کر اس کے دفتر سے باہر نکلتا چلا گیا۔ میرے باہر جاتے ہی اس کے دروازے پر سرخ بلب روشن ہو گیا جس کا مطلب تھا کہ وہ ختم ہو جاتا تھا۔

حبیب حیوانی اپنے دفتر میں بیٹھ کر بھی ساری باتوں سے باخبر رہتا تھا اس لیے میں نے ایک بار پھر بیلا کو اپنے دفتر میں طلب کیا۔ خوف اور پریشانی سے اس کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ وہ میرے سامنے زبان تو کھول بیٹھی تھی مگر اسے یقین نہیں تھا کہ اس جسارت کے نتیجے میں اس کے ساتھ کوئی اچھا سلوک کیا جائے گا۔

اس کے اندر آتے ہی میں نے انٹرکام پر سعید کو ہدایت کی کہ وہ فوراً بیلا کا حساب تیار کرادے تاکہ میرے دفتر سے واپسی پر اسے فوراً ملازمت سے فارغ کیا جاسکے۔

میری ہدایت سن کر بیلا کے چہرے پر ممنونیت کے جذبات اُمڈ آئے اور وہ اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر ’دلی دلی آواز میں بے ساختہ رونے لگی۔“

”جو تم چاہتی تھیں اس کا بندوبست ہو گیا ہے لیکن دفتر کے کسی آدمی سے اپنے مسئلے پر بات نہ کرنا۔ حساب وصول کرو اور خاموشی کے ساتھ چلی جاؤ۔ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ تمہیں کراچی میں ٹھہرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ یہاں سے جلد از جلد ملتان روانہ ہو جاؤ۔ تمہارے حق میں یہی بہتر رہے گا۔“

”میں چلی جاؤں گی لیکن مجھے اس طرح خوف زدہ نہ کریں۔“ وہ رونے کے دوران میں بولی ”میں نوکری چھوڑ کر شاید بالکل ہی اکیلی رہ جاؤں گی۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ میرا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔“

اسے کچھ دیر تک سمجھانے بھگانے کے بعد میں نے واپس لوٹا دیا۔

نبیلہ ایک لڑکی تھی۔ اس نے دفتر آتے ہی مجھے اپنے مسئلے میں الجھایا تھا لیکن اس کا معاملہ طے ہوتے ہی میرا ذہن غزالہ کی طرف چلا گیا۔ اس کے حالات بہت مختلف اور باقار تھے لیکن وہ بھی ایک لڑکی ہی تھی اور پردیس میں غیر یقینی صورت حال سے دوچار تھی۔ میں صرف امید ہی کر سکتا تھا کہ سلطان شاہ نے وہاں پہنچ کر صورت حال کو سنبھال لیا ہو۔

میرے اپنے حساسے ڈان کے پیغام کا صرف ایک ہانہ تھا ورنہ قدرت نے مجھے تیلان کی مدد کرنے کے لیے کراچی میں روکا تھا۔

بعد میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یہ مکمل تمساری ہو سکتا ہے۔ میں اتنا اسے نوکری سے فارغ کرادوں گا۔“

”میرا خیال تھا کہ وہ راہِ راست پر آجکی ہے لیکن اس کے دماغ میں ابھی تک زہر بھرا ہوا ہے۔“ اندھیرے میں اس کی عصبیلی برہادٹ ابھری پھر اس نے مجھ سے سوال کیا ”اس کا مطلب ہے کہ اس نے تمہیں پوری کمائی سنائی ہوگئی۔ پتا نہیں وہ کیا چاہتی ہے؟“

”کچھ بھی نہیں۔۔۔ وہ بڑے شرکی بڑی باتوں سے خوف زدہ ہو چکی ہے اور اپنے پرانے ماحول میں واپس لوٹ جانا چاہتی ہے۔ میں آج بھی دفتر نہ آیا ہوتا تو وہ کسی اور کو اپنا رازدار بنا لیتی۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس کے مصروفیت کا پیمانہ بالکل لبریز ہو چکا ہے۔۔۔“

اس نے میری بات کاٹ دی اور تیز لہجے میں غزایا ”وہ بالکل اُلٹی ہوئی ہے۔ میں اس کی زندگی سنوائی چاہ رہا تھا لیکن وہ خود کو تباہ کرنے پر تلی ہوئی ہے تو پھر ایسا ہی سہی، تم اس کو فارغ کرادو۔“ اندھیرے کی وجہ سے میں اسے دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن اس کی گفتگو سے بخوبی اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کے تور خراب تھے۔ ایسے ماحول میں اس سے مزید کوئی بات کرنی بے سود تھی۔ اس لیے میں نے خاموش رہنے میں ہی عافیت سمجھی ورنہ میں اس سے اتنا ضرور پوچھنا چاہ رہا تھا کہ کیا اس کے لیے کراچی جیسا وسیع و عریض شہر خرابات بالکل ہی بگڑ گیا تھا جو اس نے اپنی آتش ہوس سرود کرنے کے لیے اپنے ہی گھر پر بری نگاہ ڈالنے کا فیصلہ کیا تھا؟

”وہ ابھی لڑکی معلوم ہوتی ہے۔ تمہارے گھر پر پرانے اخبارات کا بندل اس کے ہاتھ نہ لگا ہوتا تو اس کے ساتھ تمہاری دوستی برسوں چل سکتی تھی۔“ تنقید کرنے کے بجائے میں نے دوسرے انداز سے اسے چھیڑا۔

”معلوم ہونے اور واقعی ہونے میں بہت فرق ہوتا ہے۔“ اس کی تلخ آواز ابھری ”وہ نیک ہوتی تو میری لاعلمی میں درازوں اور الماریوں کی تلاشی نہ لیتی پھیرتی۔ یہ تو بہت اچھا ہوا کہ وہ زیادہ دقت گزرنے سے پہلے ہی میرے سامنے بے نقاب ہو گئی ورنہ وہ کی دن ہی سراغ بھی لگا سکتی تھی کہ میں ہی ٹریڈ لائن کا چیف بھی ہوں۔ دراصل مٹالی میں پلنے والے کیزے غلاعت ہی میں خوش رہتے ہیں۔ انہیں خوشبودار پھولوں کی کیا یوں میں پالنے کی کوشش کی جائے تو بہت جلد گھٹ کر مرجاتے ہیں۔“

”اجازت ہو تو میں تمہارے انٹرکام سے ہی سعید کو ہدایت دے دوں۔“

”یہ کام تم اپنے کمرے سے کرو تو بہتر ہوگا۔“ اس نے خشک لہجے میں کہا ”نبیلہ کو یہ ضرور بتا دینا کہ اس نے دوسروں میں زہر پھیلاتے کی کوشش کی تو میں اس کا شر خراب کردوں گا۔“

”میں اسے ایسی ہدایت دے ہی نہیں سکتا۔“ میں نے

تاپندیدہ لوگوں کی برہمی یا بے نیازی بھی ذہنی سکون کو بھلا کر رکھ دیتی ہے۔

”ڈان تھری آج رات کراچی پہنچ رہا ہے۔“ حبیب حیوانی ہاٹ لائن پر کہہ رہا تھا ”تمہیں رات کو آٹھ بجے ڈینس کے فیوچاؤ میں مکان نمبر تیس پر پہنچنا ہے۔“

”تو کیا وہاں ڈان ہے بھی ملاقات ہونے کا امکان ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”بعض اوقات تم بالکل خالی الذہن ہو جاتے ہو!“ اس کا لہجہ خشک ہو گیا ”رات کے آٹھ بجے میں تمہیں راگ رنگ کی کسی مغل میں تو نہیں بلایا رہا۔ تم نے ڈان کے سامنے اسی ذہنی حالت کا مظاہرہ کیا تو وہ خاصی درشتی سے پیش آئے گا۔“

”تم فکر نہ کرو۔ میں پوری احتیاط سے کام لوں گا اور تیار کے ساتھ وہاں آؤں گا۔“

”اب دفتر میں موجود رہنے کی ضرورت نہیں۔ تم چاہو تو واپس جا سکتے ہو۔“ اس نے مجھے خوش خبری سنائی اور اس کے بعد ہاٹ لائن یک بیک بے جان ہو گئی۔

میں نے اُس کی خشک گفتگو سے اُس کے گہرے ہوئے موڑ کا اندازہ لگایا تھا۔ بیلا والا معاملہ اس قدر پیچیدہ اور اعصاب شکن تھا کہ حبیب حیوانی کا پریشان ہونا حق بجانب تھا۔ اس نے اپنی دانست میں ہاتھ پاؤں پچا کر بیلا کے ساتھ رنگ رلیوں کا بازار چلایا تھا لیکن نہایت قلیل سی مدت میں وہ معاملہ میرے علم میں آ گیا تھا۔ حبیب حیوانی کے لیے وہ بات ایسی ہی تھی جیسے آسمان کی طرف پچکا ہوا وزنی جو تو بچپن کے والے کے منہ پر واپس آئے۔ ایسی صورت حال میں وہ جھلاہٹ اور چڑچڑے پن کا مظاہرہ کرنے کے علاوہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

میں فوری طور پر دفتر چھوڑ کر اپنے فلیٹ کے لیے روانہ ہو گیا۔ میرے حساب سے سلطان شاہ کو ہانگ کانگ پہنچے ہوئے کئی گھنٹے ہو چکے تھے اگر حالات سازگار تھے تو اسے اس وقت تک خوالہ سے ملاقات کرنے میں کامیابی ہو جانی چاہیے تھی۔ اسے خوالہ کے بارے میں میری پریشانی کا پورا پورا ادراک تھا اور مجھے قوی امید تھی کہ وہ کامیابی حاصل کرنے کے بعد مجھے فون کرنے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہیں لگائے گا۔

گھر پہنچنے کے بعد میرے پاس انتظار کرنے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں تھا اس لیے میں نے دھونے بعد شہناز گل کے کٹنگ ستم، مصطفیٰ زیدی کا رومان انگیز مجموعہ کلام سنبھال کر بسترہ دراز ہو گیا۔

ایک طرف وہ لطیف اور دل میں اتر جانے والی شاعری تھی جس کے ایک ایک لفظ سے عشق و محبت کا مارا رانی قریب جھلکتا ہے تو دوسری طرف حبیب حیوانی کی نفسانی چیرہ دستیوں کی کہانی میرے ذہن میں تازہ تھی۔ وہ ایک ہی جذبے کی دو انتہا تھیں۔ جن میں سے

اس مدد میں ٹیڈ لائن کے دفتر آنے کے بجائے ہانگ کانگ روانہ ہو گیا ہو تا تو بیلا اپنی مدد کے لیے کسی سے بھی رجوع نہیں کر سکتی تھی۔ وہ دفتر میں جس کسی کو یہ بتائی کہ اس کا چیف ایک مجرم ہے اور روپ بدل کر نہایت ڈھٹائی کے ساتھ اسے اپنا کھلونا بنائے رکھنے پر تیار ہوا ہے تو وہ اس کی الزام تراشی پر ہرگز اعتبار نہ کرتا۔ قوی امکان یہ تھا کہ شیر شاہ وغیرہ کے ذریعے وہ خیر حبیب حیوانی تک پہنچ جاتی اور بیلا کو اسی عمارت کے کسی کمنام گوشے میں نہایت بے رحمی کے ساتھ ذبح کر دیا جاتا۔

حبیب حیوانی اپنا کا پوہ چیف تھا اور اس پر الزام تراشی کی سزا معمولی نہیں ہو سکتی تھی۔

میرا خیال تھا کہ میں نے ایک نیک کام انجام دیا ہے تو اس کے صلے میں قدرت کو خوالہ پر مہربان ہو جانا چاہیے۔

دو بج گئے لیکن حبیب حیوانی نے مجھے اپنے کمرے میں طلب نہیں کیا تو مجھے تشویش ہونے لگی۔ کمرہ بھر کے لیے میرے دل میں خیال آیا کہ کیس اس نے بیلا کو اپنے کمرے میں نہ طلب کر لیا ہو۔ بیلا وہاں جاتی تو اپنے چیف کی آواز سننے ہی پر احتیاط کو فراموش کر کے جذباتی ہو جاتی اور ہڈیاں کے عالم میں ایسی باتیں بھی اگل سکتی تھی جو اس نے حبیب حیوانی سے چھپائی ہوئی تھیں۔

ایسی باتیں سننے کے بعد وہ بیلا کا توجہ شہر کرتا، سو کرتا لیکن میری طرف سے بھی اس کے دل میں بدگمانیاں پیدا ہو سکتی تھیں کہ میں نے اس کے مقابلے میں دفتر کی ایک معمولی ملازمہ کو ترجیح دیتے ہوئے اس کو تحفظ دینے کی کوشش کی۔ جب مزید دس منٹ گزر گئے تو مجھے شبہ ہونے لگا کہ وہ مجھ سے ناراض نہ ہو گیا ہو۔

اندروں کی صورت حال کا سراغ لگانے کے لیے میں نے شیر شاہ کو طلب کیا تو پتا چلا کہ وہ فوری نوعیت کے کسی اہم کام سے باہر جا چکا تھا۔ وہ کمال اور ترقی دیر کے لیے گیا تھا؟ اس بارے میں سب لاعلم تھے۔

میرے ذہنی خاؤ میں بہت تیزی کے ساتھ اضافہ ہونے لگا جس کے نتیجے میں میری ایٹھ ٹرے میں ادھ جلی سگریٹوں کی تعداد میں بھی تیزی سے بڑھنے لگی۔

میں نے اضطرابی طور پر سعید سے دریافت کیا تو پتا چلا کہ میری ہدایت ملنے کے دس منٹ بعد ہی بیلا کو اس کے واجبات ادا کر کے دفتر سے روانہ کر دیا گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ حبیب حیوانی نے بیلا کے معاملے میں ذاتی طور پر دخل انداز ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس وضاحت سے میرا ذہنی دباؤ خاصا کم ہو گیا لیکن پریشانی کم نہ ہو سکی۔

ڈھائی بجے سے چند ثانیے قبل ہاٹ لائن کا بڑبڑاؤ تو میرا دل خوش ہو گیا۔

ایچھے لوگوں کی ناراضی سے تشویش کا لاحق ہونا ایک قدرتی امر ہوتا ہے لیکن اس مدد مجھے اندازہ ہوا کہ بعض حالات میں

جائے واردات سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

وہ خبر سن کر کچھ بھر میں پوری بات مدوڑوش کی طرح عیاں ہو گئی۔ لیکن اسی کے ساتھ میرا ذہن باؤف ہو کر رہ گیا۔ وہ سفاکی اور زندگی کی نہایت شرمناک مثال تھی۔

حبیب حیوانی کو یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ بیلا اس کے ہر راز سے واقف ہو چکی تھی لیکن اس نے پھر بھی اس لڑکی کو چند گھنٹے بھی زندہ نہیں رہنے دیا۔ شیر شاہ سے بیلا کو کچلنے والی کار کے بارے میں کچھ پوچھا بے سود تھا۔ اپنے چیف کی ہدایت پر اس نے بیلا کی بس کا تعاقب کیا اور جب وہ سڑک عبور کرنے لگی تو شیر شاہ نے ایک بیک اپنی کار کی رفتار بڑھا کر اسے روندنا اور تیزی کے ساتھ فرار ہو گیا۔ یہ بیلا کی بد قسمتی تھی کہ اس دن وہ دفتر سے قبل از وقت ہی چلی گئی تھی۔ وہ ایسا وقت تھا کہ سڑکیں عموماً ویران ہوتی ہیں۔ شام میں ٹریفک کے ازدحام کا وقت ہوتا تو شاید شیر شاہ کو اسے چھوٹا بھی نصیب نہ ہوتا اور وہ خیریت کے ساتھ اپنے گھر پہنچ جاتی۔

”اللہ اس کی مغفرت کرے۔ وہ اچھی لڑکی تھی۔“ میں نے ابتدائی جھٹکے سے شہیلے کے بعد اپنے جذبات کو چھپاتے ہوئے کہا پھر غیر ضروری طور پر اسے ہدایت کی ”اب اسے بھول جاؤ۔ چیف اپنے معاملات کو ہم سب سے بہتر سمجھتا ہے۔ اب کسی اور سے اس افسوس ناک حادثہ کا ذکر نہ کرنا۔“

”بہتر۔ لیکن تم نے اس وقت مجھے کیوں یاد کیا تھا؟“ اس نے پوچھا۔

”اس کا وجہ، بسکی کی دو بوتلوں کی ضرورت تھی۔“ میں نے بات بناتے ہوئے کہا ”لیکن بیلا کے حادثے کی خبر سن کر موڈ غارت ہو گیا۔ اب اسے بھی بھول جاؤ۔ سوڈو ہوا تو کل دیکھا جائے گا۔“

شیر شاہ بیلا جیسی معصوم اور مظلوم لڑکی کا قاتل تھا۔ وہ اس وقت میرے سامنے ہوتا تو میرا ہوا چوہہ دیکھ کر سمجھ لیتا کہ اس خبر سے مجھے کتنی اذیت پہنچی تھی لیکن غیبت یہ تھا کہ وہ مجھ سے بہت دور تھا۔ میں نے اس سے مزید کوئی بات کیے بغیر ریسپور رکھ دیا۔

بیلا کی نامگامی موت کی خبر نے میرا دل بو جھل کر دیا تھا۔ میں نے کتاب ایک طرف پھینکی اور بستر پر اونڈھا کر گیا۔

چھ بجے فون کی گھنٹی نے مجھے دوبارہ بستر چھوڑنے پر مجبور کیا تو میری آنکھیں غمناک تھیں اور دل بدستور بہت بھاری ہو رہا تھا۔ بیلا سے میری کوئی گہری شناسائی نہیں تھی لیکن وہ جس بے بسی کی موت ماری گئی تھی اس نے میرے وجود کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ کیا غنڈوں بد معاشوں اور مجرموں کے سوا کسی کو اپنی پسند کے مطابق زندہ رہنے کا حق حاصل نہیں ہے؟

میں نے ریسپور اٹھایا تو دوسری طرف سے آنے والی نسوانی آواز پہچان کر میری اداسی اور باپوسی یک بیک کافور ہو گئی کیونکہ وہ کوئٹہ فوکی سیکٹری کی ریلی آواز تھی۔

”میں ڈیٹی بول رہا ہوں، کوئی خبر ہے؟“ میں نے اس کے

کاہر ہوتا تھا کہ فرشتوں کو شر دینے والا انسان انسانیت کا لبادہ اتار دیتے تو وہ شیطان کو بھی بات کر سکتا ہے۔

میرے خیالات ادھر ادھر بھٹکتے رہے لیکن ایک بات میرے ذہن میں تسلسل کے ساتھ چبھ رہی تھی کہ شیر شاہ دفتر سے اچانک ہی کہاں غائب ہو گیا تھا۔ اس کے بارے میں دفتر کے سب لوگ غلط تھے جس کا مقصد تھا کہ وہ حبیب حیوانی کی براہ راست اور بیکانی ہدایات پر کبیں روانہ ہوا تھا۔

ایک امکان یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ڈان تھری کی متوقع آمد کے پیش نظر، حبیب حیوانی نے شیر شاہ کو مہمان خانے کی صفائی، تراش اور کچھ بھال کے لیے روانہ کیا ہو لیکن میرا ذہن اس امکان کو قبول نہیں کر رہا تھا۔ آخر کار پونے باؤف بجے کے قریب میں نے ٹرفون کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میرا خیال تھا کہ شیر شاہ جہاں بھی گیا ہو گا اس وقت تک اپنی ذمے داریوں سے فارغ ہو کر واپس دفتر لوٹ چکا ہو گا۔

فون ملنے پر میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ چیف دفتر میں موجود نہیں تھا لیکن شیر شاہ واپس آ چکا تھا۔

”خیریت تو ہے؟ آج تم دفتر سے اچانک ہی کہاں غائب ہو گئے تھے؟“ میں نے اس کی آواز سن کر پوچھا۔

”آج چیف کا موڈ بہت خراب تھا۔ اسی کے ایک کام سے گیا تھا۔ تمہاری دیر پہلے واپس آیا ہوں۔“

”کیا کوئی بہت خفیہ کام تھا؟“ میں نے کسی تجسس کا اظہار کیے بغیر سرسری انداز میں پوچھا۔

”نہیں“ اس کی آواز سے اداسی مترشح تھی ”بیلا کو پہچاننے کے لیے گیا تھا۔“

”بیلا کو پہچاننے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا ”یقین نہیں آتا کہ ہمارے دفتر سے کسی کو اتنی عزت کے ساتھ رخصت کیا گیا ہو۔“

”اس نے اپنی کسی حرکت سے چیف کو غصہ دلایا تھا۔ اس نے خود اپنے حق میں کانٹے بوئے ہوں گے ورنہ چیف اپنے عملے کے بارے میں ایسا سنگدلانہ رویہ اختیار کرنے کا عادی نہیں ہے۔“

بات غمی تو میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

”تم کو مل مول باتیں کیوں کر رہے ہو؟ خود ہی بات چھیزی ہے تو کل کرناؤ کہ کیا معاملہ ہے؟“

”تو کیا تم واقعی بے خبر ہو باس؟“ میرے استفسار پر اس کی حقیرانہ آواز سنائی دی ”میں نے تو سنا ہے کہ وہ دوبار تمہارے دفتر میں آئی تھی اور تم ہی نے اسے نوکری سے نکالنے کا حکم دیا تھا۔“

”یہ درست ہے لیکن اس سے آگے مجھے کچھ معلوم نہیں۔ ایسے چیف اس سے واقف ہی نہ رہتے۔“

”وہ اس سے اترنے کے بعد سڑک پار کرتے ہوئے ایک غورنار کار کی زد میں آکر ماری گئی۔ اسے ٹکر مارنے والا کار سمیت

براہ راست سوال کے جواب میں کہا۔

”تم نے سلطان شاہ کو ہانگ کا ٹک بھجھا ہے؟“ اس نے پوچھا اور میں چینی لب و لہجے میں سلطان شاہ کے نام کی درگت سن کر دل میں ہنس پڑا۔

”ہاں ہاں!“ میں نے جلدی سے کہا ”تمہیں کیسے معلوم ہوا؟ وہ کہاں ہے؟“

”اوہ! پھر تو واقعی غلطی ہو گئی۔“ اس کی متاسفانہ آواز ابھری۔ ”ذون کے آدمی اسے پکڑ کر مکاؤ لے آئے ہیں۔“ تم اس سے بات کرلو۔ وہ ہمارے پاس ہی موجود ہے۔“

”میں اب تک غزالہ سے مل چکا ہوں لیکن ان چپٹوں نے میری ساری محنت پر پانی پھیر دیا۔ میں تھوڑی دیر پہلے بوٹ سے مکاؤ لایا گیا ہوں۔“ سلطان شاہ کی غصیلی آواز سن کر میرا دل باغ باغ ہو گیا۔

”لیکن یہ ہوا کیسے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا ”ان لوگوں کو تو تمہاری مدد کرنی چاہیے تھی۔“

”انہوں نے اپنی دانت میں غزالہ کی مدد ہی کی ہے۔“ سلطان شاہ کی آواز زہریلی ہو گئی ”مجھے یہاں آنے کے بعد پتا چلا ہے کہ یہ کواٹک فو کے آدمی ہیں ورنہ میں تو پریشان ہو گیا تھا کہ ہانگ کا ٹک میں میرے کون سے دشمن پیدا ہو گئے جو میرے بچنے ہی میری آزادی کے دشمن ہو گئے۔“

”ان سے تمہارا ٹکراؤ کہاں اور کیسے ہو گیا؟“ میں اس صورت حال سے محفوظ ہو رہا تھا۔ میرے لیے یہ امر اطمینان کا باعث تھا کہ سلطان شاہ وقت ضائع کیے بغیر، خبر و عافیت کے ساتھ منزل مقصود پر پہنچ چکا تھا۔

”نئے آدمی کے لیے ہانگ کا ٹک اور لولون کا چکر بہت الجھا دینے والا ہے۔ اس سے واقف ہونے کے بعد میں کولون پولیس اسٹیشن میں اپنا نام ریکارڈ کرائے میں کامیاب ہو گیا۔ ان لوگوں نے غزالہ سے ملاقات کرائے کے لیے مجھے کل صبح دس بجے کا وقت دے کر فارغ کر دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کواٹک فو کے آدمی اس پولیس اسٹیشن کے اندر اور چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں اور دن رات کڑی نگرانی کر رہے ہیں۔ میں پولیس اسٹیشن سے نکل کر ضلعا ہوا تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ ایک گلی میں اچانک دو کسٹمیں لڑکوں نے دونوں طرف سے مجھے گھیر کر اپنی بیجوں میں چپے ہوئے پستولوں کی ٹالیں میرے پستولوں سے لگا دیں اور دو ہتھیار دی کر میں نے ذرا بھی مزاحمت کی تو وہ مجھے کتے کی موت مار دیں گے میرے کچھ کھینچنے سے پہلے ہی ایک کار آئی اور انہوں نے مجھے ہتھیلی سیٹ پر بٹھا کر سفر شروع کر دیا۔ بارود فٹ بازاروں اور سڑکوں سے گزرنے کے بعد اس سفر کا اختتام ایک نیم دیر ان سمندری گھاٹ پر ہوا جہاں کئی بڑی کشتیاں لنگر انداز تھیں۔ ان لوگوں نے مجھے ایک کشتی کے انجن روم کی تنگ اور گرم جگہ میں بند کر دیا۔ پستول سے مسلح ایک آدمی وہاں بھی میرے سر پر مسلح تھا جو رات بھر پلک بچکے بغیر

کسی سانپ کی طرح مجھے گھورتا رہا۔ دو ڈھائی گھنٹے کے بعد مجھے یہاں اتار دیا گیا تو پتا چلا کہ میں مکاؤ میں ہوں اور مجھے لانے والے کواٹک فو کے آدمی ہیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے یہ فیصلہ پہلے سے میری گھات میں لگے ہوئے تھے۔“

”پہلی بات تو یہ یاد رکھنا کہ چروں سے کم سن نظر آنے والے چینی دراصل کم سن نہیں ہوتے۔“ میں نے اس کی چٹان سے گفتہ لگاتے ہوئے کہا ”مجھے خوشی ہے کہ یہ لوگ غزالہ کی اتنی حفاظت کر رہے ہیں۔ تم نے پولیس اسٹیشن میں غزالہ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا اور تم ان کی نظروں میں آ گئے۔ انہیں اندازہ نہیں ہو سکا کہ تم غزالہ کے دوست ہو یا دشمن۔ اس لیے یہ تمہیں پکڑ کر مکاؤ لے آئے اب فون ڈون کی سیکرٹری کو دے دو۔ غلط فہمی دور ہو جانے کے بعد یہ لوگ شاید راتوں رات تمہیں دوبارہ کولون پہنچا دیں گے۔“

”یہ مجھے دیکھ کر مسکرا رہی ہے۔ تم اسے سمجھاؤ کہ میں اپنا زیادہ وقت ہانگ کا ٹک میں نہیں گزارنا چاہتا۔ غزالہ سے ملاقات ہوتے ہی میری واپسی کا بندوبست ہو جانا چاہیے۔“

”شاید تمہارا سامنے غصے میں ہے۔“ قدرے توقف کے بعد وہی نسوانی آواز آئی۔ اردو نہ جاننے کے باوجود اس نے سلطان شاہ کے لب و لہجے اور چہرے کے تاثرات سے اس کے موڈ کا اندازہ لگایا تھا۔

”غصے میں ہونا ہی چاہیے۔ تمہارے آدمیوں کو اسے مکاؤ لانے سے پہلے یہ تو دیکھ لینا چاہیے تھا کہ وہ دوست ہے یا دشمن کا کوئی کارندہ۔ اسے صبح دس بجے لڑکی سے ملنا ہے۔ اب تمہارے آدمیوں کو دوبارہ ہانگ کا ٹک کی طرف دوڑ لگانا پڑے گی۔ تمہاری سی عقل خرچ کر کے اس بھگت دوڑ سے بچا جاسکتا تھا۔“

”تم خدا کا شکر ادا کرو کہ تمہارے جذباتی سامنے نے کوئی مزاحمت نہیں کی اور زندہ سلامت یہاں پہنچ گیا۔ اس نے ذرا ہی بھی گریز کی ہوتی تو ڈون کے آدمی اسے مار کر ہار رہی کے پانیوں میں پھینک دیتے ہوتے۔ ڈون کی سخت بدایت ہے کہ جو بھی اس لڑکی کے حوالے سے سامنے آئے اسے اٹھا کر مکاؤ پہنچا دیا جائے آج کل اس نے ہانگ کا ٹک میں اپنی تمام سرگرمیاں بند کی ہوئی ہیں۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ وہ اپنی توہین پر کتنا برہم ہے۔“

”پھر اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟“ میں نے ڈون کی برہمی پر کوئی تبصرہ کیے بغیر پوچھا۔

”تم سے بات ہو جانے کے بعد سلطان شاہ کو کولون بھیج دیا جائے گا۔ مجھے امید ہے کہ یہ اس لڑکی کو خود نکالے کے بجائے ڈون کی پناہ میں جانے کا مشورہ دے گا کیونکہ پولیس کی نظروں میں ڈون کی پوزیشن اسی طرح صاف ہو سکتی ہے۔ اس طرح ڈون کا قصہ بھی ٹھنڈا ہو جائے گا۔“

”تم فکر نہ کرو۔ ایسا ہی ہو گا۔ لڑکی کو پولیس کی تحویل سے نکال کر کراچی پہنچانے کا کام ڈون کے علاوہ اور کسی کے ہاں

شاہ کو اگلی صبح کا وقت دے کر یہ عندیہ دے دیا تھا کہ ان کی قید میں پھنسی ہوئی لڑکی اس سے ملنے پر آمادہ تھی۔ جس کا واضح ترین مطلب یہی تھا کہ وہ غزالہ تھی۔ ڈون کو ایک فوکا نام اس کے لیے نیا تھا اس لیے غزالہ نے اس پر بھروسہ کر کے اسے انکار کر دیا لیکن جب پولیس والوں نے سلطان شاہ کا نام اس کے سامنے پیش کیا تو وہ فی الفور اس سے ملنے پر آمادہ ہو گئی۔

پچھلی رات اچھا ہی ہوا کہ میں نے ظفر کے ساتھ شری مان سنگھ کو یہ غزالہ بنا کر غزالہ کی واہبی کے لیے کوشش کرنے کے معاملے پر بات نہیں کی۔ ظفر اس پر بے معاملے کو ذاتی سطح سے بہت بلند ہو کر قوی مفاد کے مطابق ملے کرنا چاہ رہا تھا۔ اگر میں اس وقت زبان کھول ہی بیٹھتا تو بعد میں مجھے شرمندگی اور سبکی کے علاوہ کچھ حاصل نہ ہوتا۔

شری مان سنگھ ایک سازشی تھا۔ اس کا بہترین انجام یہی تھا کہ اسے میب بندی سے سمندر کی جھاگ اڑاتی ہوئی خولی موجوں میں پیٹک دیا جائے۔ اگر پچھلی رات ظفر کے منصوبے میں کوئی نمایاں تبدیلی مودنا نہیں ہوئی تھی تو شری مان سنگھ اس وقت تک زندگی کے جھمیوں سے آزاد ہو چکا تھا۔

اس نے مرنے سے پہلے بھی مجھے غزالہ کے معاملے میں فریب دینے کی کوشش کی تھی لیکن اس روز میرے ستارے یاد رہے کہ مجھے مکاؤ سے اچھی خبریں ملنی شروع ہو گئی تھیں۔

میں نے اپنی اس خوشی کا جشن منانے کے لیے ایک گلاس تیار کیا اور گلاس کے ساتھ ہی توپالے کر غسل خانے میں گھس گیا۔

ڈان تھری سے ملاقات سے قبل دوبارہ غسل کر کے میں زیادہ تروتازہ ہو سکا تھا۔

ڈان تھری سے ملاقات کے لیے تیاری کرتے ہوئے میں نے ایک بار نیم گمن کی نکالی جو اہم مواقع پر میرا خصوصی ہتھیار ہوا کرتی تھی لیکن پھر میں نے اسے ساتھ لے جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس میننگ میں مذاکرات سے ہٹ کر کسی قسم کی بار دھاڑ کا کوئی امکان نہیں تھا۔ پھر اگر ان دونوں میں سے کسی کو شبہ بھی ہو جاتا کہ میں اس موقع پر مسلح ہو کر دہاں پہنچا تھا تو میں نیم گمن استعمال کرتا یا نہ کرتا ان دونوں کی نگاہوں میں سزا کا حق دار ٹھہر سکتا تھا۔

ٹھیک ساڑھے سات بجے میں اپنا والی گاڑی میں فلیٹ سے روانہ ہو گیا۔

کچھ عرصے قبل مجھے یہ خبریں مل چکی تھیں کہ میرے معاملے پر شی اور اپنا کے بیوں کا ایک مشترکہ اجلاس ہونے والا ہے جس میں میری وجہ سے مودنا ہونے والے باہمی اختلافات کو ختم کرنا مقصود تھا لیکن بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر اس مشترکہ اجلاس کے انعقاد کی نوبت نہیں آ سکی تھی۔ اس لیے میں نے ذہنی طور پر خود کو ایسی کسی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کر لیا تھا۔

سیاست کی طرح منظم جرائم کی دنیا میں بھی مدتوں سے

سلطان شاہ تو اس لڑکی کی رہائی کے بعد اگلی پرواز سے اپنے گھر آئے گا۔

فیصلہ ڈون ہی کرے گا۔ اس کا بوجھ فیصلہ کن تھا۔ فی ل تو ہم لوگ صرف اتنا چاہتے ہیں کہ لڑکی اپنی آزادانہ مرضی ڈون کے ساتھ جانے کی خواہش ظاہر کرے تاکہ ڈون کو ہونٹ نظر بندی سے نجات ملے۔ پچھلے دس برسوں میں ڈون پہلی بار

جس کے کسی پیکر میں ملوث ہوا ہے۔
اب یہ معاملہ ڈون کے ماہر ہاتھوں میں ہے اس لیے مجھے فکر نہیں ہے۔ میں نے سکون کے ساتھ کہا "اب تم سے صبح ہو گئی ہو سکے تو کام لینے کے بعد تم خود ہی مجھے باخبر کرنا۔"

ڈون کی منہ بولی بیٹی کہاں ہے اور کب تک واپس آ رہی ہے؟
"ہاں نہیں" میں نے اپنی لامعلیٰ ظاہر کی پھر سوال کیا "تم بار بار کے بارے میں کیوں پوچھتی ہو؟"

وقت آنے پر ہمیں بھی معلوم ہو جائے گا۔ فی الحال ڈون واپس کی جڑا کر دو۔ اس الوداعی فقرے کے ساتھ ہی دوسری سے فون بند کر دیا گیا۔

میرے لیے مکاؤ سے آنے والی وہ فون کال بہت اہم تھی۔ ان شاہ کے لیے شاید وہ معاملہ سیدھا سا رہا ہو لیکن میں اس فونٹ ناک پیچیدگیوں سے مری طرح خائف تھا۔

سب سے پہلی اور اہم ترین خبر یہ تھی کہ غزالہ کی مہری لٹ کی جاری تھی۔ ایک طرف وہ پولیس کی کڑی نگرانی میں اور دوسری طرف ڈون کو ایک فوکے گھاگ آدمی اس سرکاری سٹیشن پر پہنچا رہے تھے جس میں غزالہ کو مجبوس رکھا گیا۔ اتنے سخت احتیاطات کی موجودگی میں تپاٹھی کے نام سے لکے ساتھ سفر کرنے والا بھارتی اہل کار یا اس کا کوئی ساتھی کو کوئی نقصان پہنچانے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔

دوسری اہم بات کہ سلطان شاہ شاید بالکل ہی فراموش کر بیٹھا تھا کہ غزالہ کے دو غلط پن کی وجہ سے مجھے ابتدا سے ہی یہ فکر کہ ہانگ کانگ پہنچنے والی لڑکی واقعی غزالہ تھی یا اپنی دہلی کے شری مان سنگھ کے کہنے کے مطابق اس کی جگہ شکنتلا نے لڑکھنیا کر لیا تھا۔

بھال تک دیر اور کو ایک فوکے درمیان ہونے والے سوسائڈ کا تعلق تھا تو کو ایک فوکا اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ وہ لڑکی غزالہ ہی تھی یا اس کی جگہ شکنتلا کو بھیج دیا گیا تھا۔
میں تپاٹھی کے نام سے ہانگ کانگ پہنچنے والی کسی بھی لڑکی کو اپنی جگہ کا پابند تھا۔

اگر وہ لڑکی شکنتلا تھی اور ڈون سے ملنے سے انکار کر رہی تھی تو اسے سلطان شاہ سے بھی ملنے سے انکار کر دینا چاہیے تھا۔
اس کے کیپ کا آدمی نہیں تھا۔ پھر سلطان شاہ کا نام بھی اس کے لیے اچھا نہیں تھا۔ لیکن پولیس والوں نے سلطان

میری کار کی چالی لیتے ہوئے مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ میں برآمدے سے گزر کر لانچ میں پہنچا تو سامنے سی ڈرائنگ روم میں حبیب جیوانی کی جھلک نظر آئی اور میرے قدم اس طرف ہولے۔ حبیب جیوانی اس وقت اکیلا ہی تھا۔ اس نے رکھی انداز میں مجھ سے ہاتھ ملایا اور میں احقانہ انداز میں ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ میری نگاہیں اس کمرے میں موجود پیش قیامت اشیاء اور فرنیچر وغیرہ کے جائزے میں مصروف ہو گئیں۔ آٹھ بج کر پانچ منٹ پر اندرونی کمرے سے بھاری جسم والا ایک پست قامت سفید فام نمودار ہوا تو ہم دونوں ہی متحیر انداز میں اس کے استقبال کے لیے کھڑے ہو گئے۔

وہ ایک غیر رسمی ملاقات تھی لیکن آنے والے کے بیان پر میں قیمت سیاہ سوٹ اور سفید قمیص کے ساتھ ہی ٹائی بھی موجود تھی اس کی رنگت سرخ و سفید تھی لیکن اس کے متونم پتوں کے درمیان سکری ہوئی آنکھیں اس کے چہرے پر زیادہ ہونے کا اعلان کر رہی تھیں۔

وہ ہم دونوں سے ہاتھ ملانے بغیر بے پرواانہ انداز میں ایک صوفے میں دھنس گیا۔ اس کی تھلید میں ہم دونوں بھی اپنی جگہ پر براجمان ہو گئے۔

”تو تم ڈینی ہو!“ ڈان نے غور سے میری طرف دیکھتے ہوئے نہایت شائستہ اور نکھر ی ہوئی انگریزی میں کہا۔

”یہ میری خوش نصیبی ہے کہ تم میرے نام سے واقف ہو۔ میں نے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دے کر خوشامد لہجے میں کہا ”میرے لیے یہ بہت بڑا اعزاز ہے کہ تم نے چیف کے ساتھ مجھے بھی ملاقات کا موقع دیا ہے۔“

وہ اپنی انگلیوں میں دبا ہوا سگار سلگانے میں مصروف ہو گیا۔ چند ثانیوں بعد اس نے سگار کا پہلا کش لے کر دھوئیں کے مرغولے نکھیرے تو ڈرائنگ روم نفیس تربا کو کی خوشبو سے بھر گیا۔ ”ابھی تک یہاں کے معاملات تسلی بخش نہیں ہیں۔“ ڈان نے چند ثانیوں کی خاموشی کے بعد فکر انگیز لہجے میں بولنا شروع کیا۔

”پچھلے برسوں میں افغانستان کے حالات کی وجہ سے سرحدی علاقوں میں انیم کی کاشت اور ہیروئن کی تیاری میں اچانک سی قابل رگہ اضافہ ہوا ہے اور یہ علاقہ دیکھتے ہی دیکھتے ہیروئن کی سب سے بڑا پیداواری منڈی میں تبدیل ہو گیا ہے لیکن بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر ہم آج تک اس تجارت میں اپنا جائزہ حصہ حاصل کرنے میں نام رہے ہیں۔“

وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوا تو حبیب جیوانی فوراً ہی بول پڑا۔ ”میں تمہارے اس تجزیے سے پوری طرح متفق ہوں لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ اس ناگاہی میں ہماری کوئی تاسی سے بچہ کر ان عناصر کا دخل ہے جن پر ہمیں کوئی اختیار حاصل نہیں۔ ہمارے کام شروع کرنے سے پہلے یہاں موجود تھے۔“ ڈان کے ہونٹوں پر سرد اور استہزائیہ مسکراہٹ پھیل چکی تھی۔

دستور چلا آ رہا ہے کہ حرف حقیموں کے اراکین ہر سطح پر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بنے رہتے ہیں۔ اوپر والوں کی جانب سے ایسی کشیدگی کو خوب ہوا دی جاتی ہے لیکن جب بڑے ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو ان کے مزاج اور لب و لہجے میں اس کشیدگی کا دور دور تک شائبہ بھی نہیں ہوتا۔ ایسی خطرناک صورت حال میں کسی ماتحت رکن کو اپنے کسی اقدام کی وضاحت کرنے کی ضرورت پیش آجائے تو اس کی حالت قابل رحم ہو جاتی ہے۔ اسے اپنے سربراہ کی جانب سے ذرا سی بھی حمایت کا سارا نہیں ملتا جب کہ فریق ثانی اپنے دل میں چھپی ہوئی ساری تنگیوں اسی پر اعنیل دیتا ہے۔

میں اسی اوجھڑن میں ڈوبا ہوا، دس منٹ میں مطلوبہ مقام تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ ایک ویران سی سڑک پر بہت وسیع و عریض مکان تھا جو غالباً چار ہزار مربع کے دہرے پلاٹ پر بنا ہوا تھا۔ وہ علاقہ غیر آباد نہیں تھا لیکن وہاں رہنے والے لوگوں کے ساتھ ہی ان کے ملازمین بھی غالباً اپنی اپنی چار دیواریوں میں گن رہنے کے عادی تھے جس کی وجہ سے پکلی سی ذیلی سڑک بالکل ہی ویران نظر آ رہی تھی۔

میرے مطلوبہ مکان میں چلنے والی روشنیوں سے اندازہ ہوا کہ اس پلاٹ کے رہنے کے لحاظ سے وہاں کا تعمیری رقبہ بہت کم تھا۔ چھانک سے کالی اندر واقع عمارت کے گرد بقیہ زمین پر غالباً باغ یا لان وغیرہ پھیلا ہوا تھا جس کی وجہ سے دوسرے محل نما کماتات کے مقابلے میں وہ عمارت خاصی حقیر نظر آ رہی تھی۔

حبیب جیوانی نے مجھے وہاں پہنچنے کے لیے آٹھ بجے کا وقت دیا تھا اس لیے میں بیس منٹ پہلے وہاں کھنٹی بجانے کے بجائے وقت گزاری کے لیے آگے نکلتا چلا گیا۔

ساحل کے ساتھ بنی ہوئی میرن ڈرائیو کا ایک طویل چکر لگانے کے بعد میں نے دوبارہ اپنی منزل کا رخ کیا تو وقت پورا ہو چکا تھا۔

اس علاقے کے رواج کے مطابق مجھے عمارت کے آہنی چھانک کے سامنے گاڑی روک کر ہارن بجانا چاہیے تھا مگر میں حبیب جیوانی یا ڈان سے مساویانہ سطح پر ملنے نہیں آیا تھا بلکہ ان کا ماتحت تھا اس لیے میں نے کار ایک کنارے سے لگا کر کیل کاٹن دبا دیا۔

جواب میں چھانک کی ذیلی کڑی کھلی اور ایک مسلح چوکیدار نے باہر آکر میرا نام دریافت کیا۔ اسے شاید میرے بارے میں ہدایت ملی ہوئی تھی۔ اس لیے اس نے مجھے گاڑی سمیت اندر آنے کا اشارہ کرتے ہوئے پورا چھانک کھول دیا اور میں انجن اشارت کر کے گاڑی کو طویل ڈرائیو پر لیتا چلا گیا۔

اندر مختصری عمارت چاروں طرف سے باغ اور درختوں میں بکھری ہوئی تھی۔ میرے پوسج میں رکھے ہی برآمدے سے ایک دراز قامت شخص برآمد ہوا اور اس نے پارکنگ کے لیے مجھ سے

میرے بس میں ہو گا۔" میں نے پورے غلوص سے کہا۔

"سب سے پہلے وہ تین سلور آئیز کی داہی چاہتے ہیں جو تمہارے قبضے میں ہیں۔"

"مجھے افسوس ہے کہ میں ان سے محروم ہو چکا ہوں۔" میں نے ایک گمراہ سانس لے کر کہا "تینوں سلور آئیز دیر کی تحویل میں ہیں۔"

"اور ہم گمن کماں ہوتی ہے؟" ڈان نے میرے چہرے پر سے

نظریں ہٹائے بغیر پوچھا۔
"اس کا چارج ختم ہو چکا تھا اس لیے میں نے اسے پیچیک دیا۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"یعنی ان کے دونوں مطالبے متنازع ہیں۔" ڈان نے گہری سنجیدگی کے ساتھ کہا "اس بارے میں میرے بجائے جی لائیڈ کا اطمینان ضروری ہے اور میرا خیال ہے کہ....."

ڈان کا فقرہ ادھورا رہ گیا کیونکہ اچانک ہی ہر طرف اندھیرا پھیل گیا۔ اسی کے ساتھ باہر کھڑے والی ایک کھڑکی کی طرف سے بے آواز فائز ہوا اور گولی میرے سر کے اوپر سے گزر کر دیوار میں پھوٹ ہو گئی۔

ڈرانگ روم میں اچانک ہی ہڑبومگ اور افزائری پھیل گئی۔ میری طرح وہ دونوں بھی صوفوں وغیرہ کے پیچھے پناہ لینے کی کوشش کر رہے تھے۔

اس وسیع و عریض مکان میں یکایک پھیل جانے والے گھور اندھیرے میں آنکھیں ہتھیرا سے کیا ہوا بے آواز فائز بہت ہولناک اور لرزہ خیز تھا۔ اس وقت میرے ستارے یاد رہے تھے جو اندھیرے میں چلائی گئی گولی میری کھوپڑی سے ذرا اوپر سے گزر کر دیوار میں پھوٹ ہو گئی تھی۔ ورنہ وہی بے آواز گولی میری کھوپڑی کے چھینٹے بھی اڑا سکتی تھی۔ موت کو اتنے قریب سے دیکھ لینے کے بعد میرا دل تیزی کے ساتھ دھڑکنے لگا تھا اور پورے وجود میں سنسنی کی لہریں سی سرایت کر گئی تھیں۔

سلاوا رخا ہو گیا تھا لیکن مسلح حملہ آور کسی بھی لمحے دو سرا فائز کر سکتا تھا اس لیے خفیف سی دہشت اور سنسنی کے باوجود میں اپنی جگہ جموڑ کر تیزی سے ایک صوفے کی اوٹ میں ہو گیا تھا۔ تاریک کمرے میں پیدا ہونے والی آوازوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ ڈان تھری اور سیٹھ حبیب جیوانی نے بھی اپنی جگہوں پر جے رہنے کی حماقت نہیں کی تھی اور فائز ہوتے ہی پھرتی سے پوزیشن لے لی تھی۔

وہ فائز اس امر کا کھلا ثبوت تھا کہ حملہ آور جو کوئی بھی تھا،

اپنے ہاتھ سے حبیب جیوانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔
"اہم یہاں بے لاگ جائزہ لینے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ ہمیں مزیدی تنقید اور مدافعت سے گریز کرنا چاہیے۔"
ڈان کے ان الفاظ پر حبیب جیوانی کے چہرے کا رنگ اڑ گیا اور سر راتی ہوئی آواز میں بولا "مجھے افسوس ہے ڈان! اب میں زوریں گا۔"

"میں نے ان ہی عناصر کو نامزیر وجود میں شامل کیا تھا جو بارے ذہن میں ہیں۔ شی ہم سے پہلے یہاں موجود اور منظم تھی۔ پینڈ شی کو اپنا حرف سمجھ کر اس کے مقابلے کی کوششیں کرتے ہیں لیکن جھپٹے دنوں یہ بات سامنے آئی ہے کہ ہمارے اور شی "ایمان کوئی گھراؤ نہیں ہے۔ یہاں ان لوگوں کے کچھ محدود مدد تھے جو پورے ہو چکے ہیں اب وہ ہیروئن کی مندی ہمارے لے کرنے پر آمادہ ہیں۔ ان کی پسپائی سے پیدا ہونے والے خلا بھرور کاروباری فائدہ اٹھانے کے لیے ہمیں پیشہ ورانہ انداز منظم ہو کر آگے بڑھنا ہو گا۔ ایسا نہ کیا گیا تو اس علاقے میں بی سادہ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا جسے مدبرانہ کیا قیمت پر نشت نہیں کرے گی۔"

اس نے ایک مرتبہ پھر خاموش ہو کر استفسار طلب نگاہوں باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھا اور ڈان سے ہم کلائی کے نامیں "اس مرتبہ پھر حبیب جیوانی نے ہی جواب دیا "گرکشی سے راستے سے ہٹ جاتی ہے تو ہم تیزی کے ساتھ پیش قدمی

کئے ہیں۔ اس علاقے میں ہم ہر کاروباری چیلنج کا مقابلہ کرنے لے چکے ہیں۔"

"لیکن شی کی کچھ شرائط ہیں۔" ڈان نے اپنی تیز نظریں سے چہرے پر مرکوز کر دیں۔ "وہ چاہتے تھے کہ ڈینی کو غیر مشروطیت پر ان کے حوالے کر دیا جائے۔" ڈان کی زبان سے وہ

ٹریفک کر میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ وہ کہہ رہا تھا "ڈینی پاکستان میں ہی نہیں بلکہ مغربی ممالک میں بھی ان کے بات کو ہماری نقصان پہنچایا ہے۔ جی لائیڈ ہر قیمت پر اسے اپنا ٹیڈ لکنا چاہتا ہے لیکن ہانیا کی کچھ اپنی روایات ہیں۔ ہم اپنی پناہ مانگے ہوئے ہر شخص کو اس وقت تک بھرور تحفظ فراہم کرتے مانع تک وہ ہم سے وفادار رہتا ہے۔ ہم ڈینی کو بے دست و پا

کئے ان کو نہیں سوچ سکتے تھے۔ ایسا کوئی بھی اقدام ہانیا کی روح متاثر ہوتا اس لیے ہم نے ان سے طویل مذاکرات کیے اور اب باتیں سمجھوتہ ہونے کے آثار نظر آنے لگے ہیں۔ ان کی چند نوفاصلے آج بھی ڈینی کی ذات ہی سے ہے۔ اسی لیے میں آج

میں غم آہا ہوں۔"

رائیگاں نہیں جائے گی۔“ ڈان تھری سمیت اس وقت سب لوگ ہی انگریزی بول رہے تھے اور خاموشی کے ساتھ ڈرانگ سب لوگ کھس آنے والے انجینی نے بھی اپنے عزائم کے اظہار کے لئے اسی زبان کا سہارا لیا تھا۔ اس کے لب و لہجے سے ظاہر ہوا تھا کہ وہ کوئی مقامی نہیں بلکہ غیر ملکی تھا۔

”تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟“ ڈان تھری کی سرداں ستمگرہ آواز ابھری۔

”ہمیں معلوم تھا کہ تم پتھر میں سے تیل نکالنے کا عزم کیا یہاں پہنچے ہو اس لیے ناکام رہو گے۔“ انجینی کی خمیر آواز ابھری ”ڈینی بہت حرام الدہر آدمی ہے۔ سپر آئی مین جانتا تھا کہ ڈینی بھی صورت میں اس کے مطالبات پورے کرنے پر تیار نہ تھا۔“

”تم تو جمی لائیڈ کے ہر کارے ہو؟“ ڈان تھری کا لہجہ بالکل اور سپاٹ ہو گیا۔

اندھیرے میں ہنسی کی خفیف سی آواز ابھری پھر جواب آیا ”اس کے علاوہ کس کی مجال ہو سکتی ہے کہ دریا کے ایک کس ڈان کی قیام گاہ میں قدم رکھ سکے؟ ہمارے لیے مانیفیسٹ کا اس کا ہر عددے دار معزز اور محترم ہے لیکن ہم ڈینی کو سوار نہیں کر سکتے۔ تم سے ساز باز کر لینے کے باوجود وہ تم میں سے ہم سے ہم حال میں اسے اپنا غدار اور باغی تصور کرتے رہے گئے۔“

”لیکن تمہارا یہ رویہ ہمارے مذاکرات کی روح کے لئے ہے۔“ ڈان تھری نے احتجاج کیا۔

”ہرگز نہیں!“ سخت لہجے میں جواب دیا گیا۔ ”مذاکرات آئیز اور بیج گمن کی واپسی سے مشروط تھے۔ ان دونوں نکات پر کا جواب تم سن ہی چکے ہو۔ اس کے بعد ہم اسے مزید ڈھکیں دے سکتے۔ اس نے تمہارے معاملہ جذبات کا احترام نہیں کیا اب ہم اسے سرکشی کا مزہ چکھائیں گے۔“

”تمہیں یہ جسارت منگنی پڑے گی۔“ ڈان تھری نے بلا توجہ جواب دیا۔ ”ڈینی جو بھی اور جیسا بھی ہے۔ ہمارا آدمی ہے اور اپنے آدمیوں پر کسی کی بالادستی برداشت نہیں کر سکتے۔“

”یہ نظر ثانی باتیں ہیں۔“ انجینی کہہ رہا تھا۔ ”بہت سی باتیں نہ چاہتے ہوئے بھی برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ اس وقت تمہیں مسلح ہو اور میں اعشاریہ تین دو کا سائٹنسنگ ہوا۔“ ”تمہارا براؤنی لیے ہوئے“ اس کمرے کے دروازے پر موجود ہوا۔ ”ڈینی اس دروازے سے زندہ نہیں نکل سکے گا۔“

”تو کیا تم ڈینی کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہو؟“ تھری کی آواز ابھن آئیز تھی۔

”مجھے ڈینی کا سراغ بھی مل جاتا تو میں اسے وہیں ڈھک رہا ہوں۔“ انجینی کی آواز تلخ ہو گئی۔ ”مجھے اس کا پیچھا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ سلور آئیز اور بیج گمن کی واپس

میرے خون کا پیا سا تھا اور یقینی طور پر اکیلا نہیں تھا۔ اس کے کسی مددگار نے اسی مکان میں اندھیرا پھیلا کر اسے حملہ کرنے کا موقع فراہم کیا تھا۔ اندھیرے کا اصل مقصد یہ تھا کہ مجھ پر گولی چلانے والا کسی جوابی کارروائی کا نشانہ بننے سے محفوظ رہے لیکن وہی اندھیرا شاید میرے لیے زندگی کی نوید بن گیا تھا۔

میں اس وقت ڈان تھری کا ایک ملاقاتی تھا۔ وہ ٹی کے بیروں کے ساتھ معاملہ مذاکرات کو آگے بڑھانے کی نیت سے میرے ساتھ گفتگو میں مصروف تھا تاکہ جمی لائیڈ کی شرائط پوری کر کے اس کے ساتھ جاری تصادم کو ختم کر سکے۔ جس مکان میں ہم موجود تھے، وہ بھی ڈان تھری یا مانیف کی ملکیت معلوم ہوتا تھا۔ اس اعتبار سے وہ وادرات ڈان تھری کے اختیار اور اقتدار میں براہ راست مداخلت کے مترادف تھی۔ مجھ پر فائر کر کے ڈان تھری کی بالادستی کو توہین آمیز انداز میں لٹکا رہا تھا اور وہی اس مداخلت بے جا کا مناسب جواب دینے کا حق رکھتا تھا۔

کوئی اور موقع ہو تا تو میں سنبھال لیتے ہی اپنی جان کے دشمن پر کسی خفیہ مقابلے کی طرح جوابی حملہ کرنے کی تیاری کرتا لیکن اس وقت صورت حال مختلف تھی۔ میں ڈان تھری کے وسیع و عریض مکان میں اس کا اہم مہمان یا ملاقاتی تھا اس لیے میں نے دفاعی پوزیشن اختیار کرنے پر ہی اکتفا کیا۔

”ہو اذ میرے؟“ تاریکی میں ڈان تھری کی غراتی ہوئی اور قہر بار آواز ابھری۔

جواب میں کوئی کچھ نہ بولا لیکن باہر دوڑتے ہوئے قدموں کی دھمک میں ایک فائز کی آواز گونجی۔ شاید حملہ آوروں میں سے کسی نے اس مکان کے محافظوں پر گولی چلائی تھی۔ پہلا فائز بے آواز تھا جب کہ دوسری گولی سے فضا لرز کر رہ گئی تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ حملہ آوروں کی تعداد کے بارے میں میرا قیاس غلط نہیں تھا۔

”چیف!“ اندھیرے میں ڈان تھری کی غضبناک آواز ابھری۔

”یہ کیا تماشا ہے؟ یہاں کیا ہو رہا ہے؟“

”میں خود حیران ہوں“ ڈان!“ حبیب حیوانی کی لرزتی ہوئی مداخلت آواز سنائی دی۔ ”محاطے کی حفاظت اور نگرانی کے لیے چھ آدمی مامور ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ سب کہاں مرے ہوئے ہیں۔“

”انہیں الزام نہ دو!“ اندھیرے ڈرانگ روم میں اچانک ایک بھاری سی انجینی آواز گونجی۔ ”یہاں جو کچھ ہو رہا ہے اس میں تمہارے آدمیوں کی نالی سے زیادہ میرے آدمیوں کی اعلیٰ کارکردگی کا دخل ہے۔ میرا پہلا بے آواز فائر ضائع ہوا ہے لیکن میں اپنے فکار کو تلاش کر لوں گا۔ اندھیرا ہونے سے پہلے میں دیکھ چکا ہوں کہ تم تینوں غیر مسلح ہو“ اس لیے جو جہاں اور جس حال میں ہے، وہیں اور اسی طرح پڑا رہے۔ کسی نے ذرا بھی حرکت کرنے کی کوشش کی تو میں بے دریغ گولی چلا دوں گا۔ یہ یاد رکھنا کہ میں اندھیرے میں آواز پر نشانہ لینے کا عادی ہوں اس بار میری گولی

پر خود کو بہت ہلکا محسوس کر رہا تھا۔ اس گفتگو میں میری شرکت کی سرے سے کوئی ضرورت نہیں تھی اس لیے میں نے اپنے حواسِ غم کو صورتِ حال کے تجزیے پر مرکوز کیا ہوا تھا۔

اندروہ مذاکرات جاری تھے اور مجھے اتنا وقت مل گیا تھا کہ میری آنکھیں وہاں پھیلے ہوئے گھور اندھے میں کسی نہ کسی حد تک دیکھ لینے کی عادی ہو گئی تھیں۔ میں جس وزنی صوفے کے عقب میں دھکا ہوا تھا۔ اس سے دس بارہ فٹ کے فاصلے پر وہ اجنبی کھلے دروازے میں کھڑا تھا۔ دوسری طرف باہر بھی دھما چو کڑی جاری تھی۔ وقفے وقفے سے! کا کا افراد کے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں ابھرتیں اور پھر لامتناہی سکوت چھا جاتا۔ اس سکوت میں صرف تین ناز ہوئے تھے جو بے آواز نہیں تھے لیکن ان میں سے کوئی بھی ناز کار گر ثابت نہیں ہو سکا تھا۔ کسی مرنے والے کی چیخ تو درکنار مجھے کسی زخمی کی کراہ تک نہیں سنائی دی تھی۔

باہر سے آنے والی ان آوازوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ ڈان تھری کے آدمی بالکل سی غافل نہیں تھے۔ ان کی حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی کی وجہ سے اجنبی اور اس کے ساتھیوں کو اس عمارت میں داخل ہونے کا موقع ضرور مل گیا تھا لیکن ان کی طرف سے کارروائی کا آغاز ہوتے ہی مزاحمت کا عمل بھی شروع ہو چکا تھا جس کے نتیجے میں کسی بھی لمبے بازی ان کے خلاف اٹھ سکتی تھی۔ مجھے اتنا اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ باہر والے اپنے مصائب میں الجھے ہوئے تھے اور ان کی طرف سے اندر کے معاملات میں کسی بھی قسم کی مداخلت کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اگر کسی طرح اجنبی کو غیر مسلح کر دیا جاتا تو اندر چھڑنے والے مقابلے میں اسے جھسانا زبرد کیا جاسکتا تھا۔

اس قہیے میں ڈان تھری یا حبیب جیوانی کی ذات کے لیے کوئی مملکت خلوہ نہیں تھا۔ اجنبی ڈان تھری کے لیے مسلسل مظاہرہ جذبات کا اظہار کر رہا تھا۔ حبیب جیوانی، قہیوں کی لڑائی کی زد میں آئے ہوئے کسی مینڈک کی طرح کسی گوشے میں چھپا ہوا تھا اور سارا خطرہ صرف میری سلامتی کو لاحق تھا۔

اجنبی کے لب و لہجے سے خون کی بو آ رہی تھی۔ اس نے اپنی دانست میں فیصلہ کن بلا دستی حاصل کر لی تھی اور وہ مجھے ہلاک کیے بغیر وہاں سے واپس جانے کے موڈ میں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس لیے میرے پاس مارنے یا مرجانے کے علاوہ کوئی تیسری راہ باقی نہیں رہی تھی۔

میں نے کوئی قدم اٹھانے سے قبل صورتِ حال کا آخری جائزہ لیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ حالات میرے حق میں نہیں تھے۔ کمرے بلکہ پوری عمارت میں اندھرا ضرور پھیلا ہوا تھا لیکن جس طرح میری آنکھیں اس اندھے میں کسی حد تک کام کرنے کی عادی ہو گئی تھیں، اسی طرح وہ غیر ملکی اجنبی بھی اپنے قریب و جوار میں رونما ہونے والی فعل و حرکت کو دیکھ لینے پر قادر ہو سکتا تھا جب کہ میرے اور اس کے درمیان کم از کم دس فٹ کا ایسا غیر محفوظ

آبادہ نہیں ہو گا۔ تم اس کا جواب سن ہی چکے ہو۔ ایسے ہٹ و مہم اور موزی شخص کا چچھا کرنا اپنے وقت کو برباد کرنے کے مترادف ہوتا۔ مجھے تو اس کا سایہ بھی نظر آتا تھا تو میں اسے خاک و خوں میں نہلا کر رکھ دیتا۔

”تھر تم یہاں کیسے پہنچے؟“ ڈان تھری نے سوال کیا۔ ”کیا میرا حاقب کیا گیا ہے؟“

”تمہارا قیاس درست ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ تم ڈینی سے ملاقات کا مشن لے کر بنگالہ سے نکلے ہو اس لیے میں ابتدا ہی سے سائے کی طرح تمہارے پیچھے لگا ہوا تھا۔ ڈینی میرے سامنے یہاں آیا تھا۔ مجھے صرف اتنا انتظار تھا کہ تم اس پر اپنی جرح ختم کر لو۔ جب ڈینی نے تمہیں مایوس کر دیا تو میرا کام شروع ہو گیا۔“

”جی لائیڈ کی طرف سے کھلی بدعدی ہے۔ ہم شی کے بڑوں کو بیش عمل احترام دیتے چلے آئے ہیں۔ میرا حاقب کر کے میری توہین اور تذلیل کی گئی ہے۔ میں جی لائیڈ سے اس پر احتجاج کروں گا۔“

”ضرور کرنا!“ اجنبی نے کہا۔ ”لیکن تمہارا احتجاج حقائق کو نہیں بدل سکتا۔ میرے ہاتھ میں بھرا ہوا ہسٹول ہے اور تم تین غیر مسلح ہو۔ مجھے تم سے کوئی پر خاش نہیں لیکن آج میں ڈینی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اس نے ہماری زندگی اجڑن کی ہوئی ہے۔ اس کی ہلاکت کے بعد“ جی لائیڈ تمہارے احتجاج پر فراخ دلی کے ساتھ معذرت طلب کرے گا اور تمہارے پاس اسے معاف کر دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہو گا۔ اہم بات یہی ہے کہ اصل اہمیت تنظیم کی ہوتی ہے۔ افراد کے آنے جانے سے ان کی کارکردگی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”تم کتنے کے پلے اور سحر کے بیچ ہو۔“ ڈان تھری اشتعال کے عالم میں گلگایا۔

اجنبی کی بے ساختہ ہنسی ابھری اور وہ بولا۔ ”ڈان! میں تمہاری عزت کرتا ہوں لیکن غصے میں آ کر آپ تم غیر منطقی باتیں کر رہے ہو۔ میں بیک وقت کتنے کا پلاؤ اور نوڑ کا بیج نہیں ہو سکتا۔ ایک وقت میں تم مجھے ایک ہی گالی دے سکتے ہو لیکن موجودہ صورتِ حال میں گالی بھی رانچا ل جائے گی کیوں کہ میں اس وقت جو کچھ کر رہا ہوں اس کے بارے میں مجھے اپنے سپر آئی مین کی مکمل پشت پناہی حاصل ہے۔“

”جی لائیڈ کو تمہاری یہ جرات بہت مہلکی پڑے گی۔“ ڈان تھری کسی بھیڑیے کی طرح غرایا۔

”میں نے اس وقت سوچ سمجھ کر سامنے آنے کا خطرہ مول لیا ہے۔ ڈینی کے فتنے کا خاتمہ کرنے کے بعد میں سپر آئی مین کی آنکھوں کا آرا بن جاؤں گا۔ ڈینی کی موت کا سودا اسے کسی بھی طرح مہنگا نہیں پڑے گا۔“

وہ دونوں اپنے تیز و تند مذاکرات میں الجھے ہوئے تھے۔ مجھے حبیب جیوانی کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں تھا لیکن میں ذاتی طور

گاہوں سے نکل آئے۔

میں نے اس وقت اپنے حریف کو زیر کر کے اپنی زندگی کی اپنی ہوئی بازی جیتی تھی۔ اس لیے میں سخت مشتعل تھا لیکن اس عالم میں بھی میں نے محسوس کیا کہ میں اپنے حریف کی مرمت کرتے ہوئے، اسے انگریزی، اردو اور پنجابی میں گالیاں دے رہا تھا۔

زبانوں کا وہ انتخاب قطعی غیر ارادی تھا لیکن بچے ہوئے حریف کے دم توڑتے ہوئے، بد افغانہ انداز کی وجہ سے جو ہی میرا ذہنی دباؤ کم ہوا تو گالیلوں کے معاملے میں بیک وقت تین زبانوں کے استعمال کا جو ابھی میرے ذہن میں واضح ہو گیا۔

میری گرفت میں آیا ہوا دشمن، غیر ملکی تھا۔ اس نے اپنا مافی الضمیر ظاہر کرنے کے لیے ابتدا ہی سے شستہ انگریزی کا سارا لیا تھا۔ اس وجہ سے یہ لازمی ہو گیا تھا کہ میں اپنے دلی جذبات اس تک پہنچانے کے لیے وہی زبان استعمال کرتا جو اس کے لیے قابل فہم تھی لیکن انگریزی زبان میں روانی سے دی جانے والی گالیلوں کی تعداد کم ہونے کی وجہ سے دل کی کدورت، عادتاً اردو کا روپ دھار رہی تھی۔ بات وہیں ختم نہیں ہو جاتی تھی۔ روزِ شو گالیلوں کے معاملے میں اردو کا ذخیرہ بڑا ہونے کے باوجود، صوتی اعتبار سے ان مفایم کا آئینہ دار نہیں تھا جو بولنے والے کے دلی و دماغ میں قیو نفرت کی آگ بھڑکانے رکھتے ہیں۔ ان جذبات کی کشتی کے لیے

پنجابی زبان کا استعمال ناگزیر تھا۔ پنجابی زبان میں گالیاں دینے کر میں اطمینان بخش طور پر اپنے دل کی بھڑاس نکال سکتا تھا اور اگر فرق ثانی اس زبان سے آشنا ہوتا تو محض بھاری بھر کم گالیاں سن کر ہی جنم واصل ہو سکتا تھا۔

پھر اچانک ہی بھیجی ہوئی روشنیاں جل اٹھیں۔ شاید اس مکان کے محافظوں نے بد اخلاقت کاروں کو زیر کر کے بجلی کا مین سوچ آن کر دیا تھا۔

روشنی ہوتے ہی سیٹھ حبیب جیوانی نے نہایت چھجھورے انداز میں، میرے نیچے دے ہوئے سفید فام کی بلیوں پر ٹھوکر سید کی اور غراتے ہوئے بولا۔ ”اس کی ہڈیوں کو ریزہ ریزہ کر دو۔ اس کتے کی یہ مجال کہ اس نے ڈان تھری کی رہائش گاہ میں گھسنے کی جسارت کی ہے۔“

”تو!“ ڈان تھری نے اپنا ہاتھ فضا میں بلند کر کے سردار پر سکون آواز میں کہا۔ ”یہ نستا ہونے کے ساتھ ہی، معقول حد تک دشمنی بھی ہو چکا ہے۔ اس لیے اسے چھوڑ دو۔ میں اس سے کچھ باز پرس کرنی چاہتا ہوں۔“

میں نے اپنے قیدی کی ناک پر ایک دھشیانہ ٹھکر سید کی اور وہ رچ کر پوری قوت سے بچ پڑا۔

میں اسے چھوڑ کر الگ ہوا تو اس کا خون میں لتھڑا ہوا چہرہ بہت بھیاںک لگ رہا تھا۔

وہ تقریباً جموستا اپنے قدموں پر اٹھا لیکن پھر لڑکھارے کا قائلین پر ڈھیر ہو گیا۔ زخموں سے بھاری مقدار میں خون بہہ جانے کی وجہ سے

فاصلہ حاصل تھا جہاں مجھے کوئی آڈیا رکاوٹ میسر نہیں آ سکتی تھی۔ اضطراب اور عدم تحفظ کے ان جان لیوا لمحات میں مجھے اچانک ہی خیال آیا کہ میں جس صوفے کے عقب میں چھپا ہوا تھا، اس سے ملحق میز پر سبک مرمر کی بنی ہوئی ایک آرائشی ایش ٹرے موجود تھی۔

وہ خیال کوندتے ہی، میں نے کوئی آواز پیدا کیے بغیر داہنی طرف حرکت کی اور چند ثانیوں بعد ہی میرا لرزنا ہوا ہاتھ ایش ٹرے کا سرد اور بے جان لمس محسوس کر رہا تھا۔

کھلے ہوئے دروازے کے پیش منظر میں انجینی کا ہیولا پوری طرح میری نظروں میں تھا۔ وزنی ایش ٹرے سے اس کے سر کا نشانہ لے کر میں بے آسانی اسے ڈھیر کر سکتا تھا لیکن پورے بدن کے مقابلے میں، کھوپڑی کا نشانہ خطا ہونے کا امکان زیادہ تھا اس لیے میں نے پوری احتیاط کے ساتھ بائیں گھٹنے اور داہنے پنجے پر اپنے بدن کا توازن درست کر کے اچانک ہی وہ وزنی ایش ٹرے پوری قوت کے ساتھ غیر ملکی انجینی کے سینے پر پیچھ مارا۔

میں نے اپنی وہ کارروائی اتنی سرعت اور خاموشی کے ساتھ عمل کی کہ میرے شکار کو کچھ سمجھنے یا سنبھلنے کا موقع ہی نہیں مل سکا اور فضا میں اڑتی ہوئی ایش ٹرے کی بھرپور ضرب پڑتی ہی فضا اس کی دردناک بچ سے لرز اٹھی۔

میرے لیے وہ موقع ختمیت تھا۔ تاریک ہیولا جوں ہی لڑکھڑاتا ہوا پیچھے کی طرف گرا، میں نے کسی خوف یا خطرے کی پروا کیے بغیر اپنی جگہ چھوڑ کر اس پر چھلاٹ لگا دی۔

مجھے اس کوئی انقور زیر کر لینے سے زیادہ فکر اس کے بے آواز پستول کی تھی۔ میں نے اس پر حملہ آور ہوتے ہی اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنی گرفت میں لے لیا اور یہ جان کر مجھے خوشی ہوئی کہ اس کے دونوں ہاتھ خالی تھے شاید ایش ٹرے کی غیر متوقع اور شدیدے چوٹ کھاتے ہی پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دبیز قائلین پر گر گیا۔ تھا اس کی برتری کا احساس ختم ہوتے ہی میں نے دھشیانہ انداز میں اسے نیچے گرا کر اس کے چہرے پر گھونسلوں اور ٹکڑوں کی بھرا کر دی۔

وہ اس افتاد سے قبل اپنی مکمل برتری اور فتح کے محمدنڈ میں جھلا تھا، اس لئے میرے اچانک اور تیز حملوں کے خلاف منوثر بد افعت کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا اور چند ہی ثانیوں میں اس کا چہرہ خون ہی خون میں نہا گیا۔ اس کے زندہ اور گرم گرم لہو کی چچچا ہٹ مجھے اپنے ہاتھوں اور چہرے پر محسوس ہو رہی تھی۔

میری جارحانہ کارروائی اتنی غیر متوقع اور تیز تھی کہ حبیب جیوانی کے علاوہ ڈان تھری بھی فوری طور پر میرا ساتھ دینے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ وہ دونوں سمجھ ہی نہیں سکے تھے کہ اندھیرے میں اچانک کیا مکمل شروع ہو گیا تھا لیکن وہ کیفیت زیادہ دیر تک برقرار نہیں رہ سکی۔ پٹنے والے کی چیخوں اور میری بلند آہنگ، مار زاد گالیلوں نے انہیں سب کچھ سمجھا دیا اور وہ بھی اپنی کین

کسی گرگے کو میرے پیچھے لگا رکھا ہے۔“

”اور تم کہتے ہو کہ تمہارا نشانہ صرف ڈبئی تھا۔ تم ڈان تھری کو کسی بھی قسم کا نقصان پہنچانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے؟“ سکوت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے حبیب حیوانی نے سوال کیا۔

”تمہیں اس میں کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیے۔ شکاگو سے نیو یارک، لندن اور ڈبئی کے راستے کراچی پہنچنے تک میرے پاس کئی مواقع تھے جب میں تمہارے مسٹر نیٹشلی کا ڈوگر نقصان پہنچا سکتا تھا لیکن مجھے ان کا مرتبہ معلوم تھا اس لیے میں نے کہیں بھی ان کا راستہ کاٹنے کی کوشش نہیں کی۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم خود کو مسٹر نیٹشلی کا ڈو سے زیادہ ہوشیار سمجھ رہے تھے؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے اس پورے معاملے پر اس انداز میں سوچنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ میری یہاں موجودگی اس بات کا ثبوت ہے کہ میں نے اپنی ڈیوٹی پوری ڈسے داری کے ساتھ سر انجام دی ہے۔ اس سبب میں اصل اہمیت رازداری کی تھی۔ اگر مسٹر نیٹشلی کا ڈو یہ علم ہو جاتا کہ میں ان کا پیچھا کر رہا ہوں تو راستے ہی میں میرا کام تمام ہو سکتا تھا۔ کراچی کے ہوائی اڈے پر اترنے کے بعد میرا خیال تھا کہ میں اپنے مشن میں ننانوے فیصد کامیابی حاصل کر چکا ہوں لیکن آج اندازہ ہوا کہ مجھے ایک فیصد بھی کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ میرے لیے، تم نیٹشلی کا ڈو سے زیادہ خطرناک ثابت ہوئے ہو۔“

بلی گینگ کے ذریعے ڈان تھری کا اصل نام میرے علم میں آ گیا تھا اور یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ وہ چینی نژاد ہونے کے باوجود امریکی شہری تھا اور مجھے زیر کرنے کے مشن پر شکاگو سے کراچی پہنچا تھا۔ البتہ بلی گینگ نے جس انداز میں میری تعریف کی تھی اس سے مجھے کوئی خوشی حاصل نہیں ہو سکی۔ ڈان تھری اول و آخر میرا پاس تھا اور اچھے نامت اپنے پاس سے کسی بھی صورت میں اپنا موازنہ کیا جانا پسند نہیں کرتے۔

”ہوش میں رہ کر بات کرو۔“ میں نے بلی گینگ کے چہرے پر تھپڑ رسید کرتے ہوئے کھدوے لہجے میں کہا۔ ”میں جو کچھ بھی ہوں، اپنے بیوں کی ذات کا پر تو ہوں۔ تم ڈان تھری کے مقابلے میں مجھے چڑھا کر ہمارے درمیان بدگمانیاں پیدا کرنا چاہتے ہو لیکن یاد رکھو کہ تمہاری یہ کوششیں ناکام ہوں گی۔“

میرے بھرپور تھپڑ سے اس کا دہانہ اندر سے زخمی ہو گیا۔ اس نے بے پروائی سے انداز میں خون آلود تھوک کی پچکاری قالین پر اگلنے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔ ”مجھے معلوم ہے کہ میں بازی ہار چکا ہوں۔ میں نے کئی کئی بار رکتے بغیر وہ بات کہی ہے جو میری دل میں ہے۔ تم میرے بدترین دشمن ہو لیکن مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں کہ تم نے آخری لمحات پر میری بازی الٹ کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ کئی کا سپر آئی میں تم سے بلاوجہ ہی خائف نہیں ہے۔ وہ تمہاری بوڑھلک ہوا ہے اور جلد ہی تمہیں ٹھکانے لگوا دے گا۔“

اس پر غائب طاری ہو رہی تھی۔ میں نے اس کا گریبان جکڑ کر اسے زبردستی اس کے قدموں پر کھڑا کر دیا۔ وہ میری گرفت میں ہونے کے باوجود ادھر ادھر محسوس ہوا تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ ڈان تھری کی سرد اور جذبات سے عاری رہنے والی نگاہوں میں بھی میرے لیے پسندیدگی کے آثار نمودار آئے تھے۔ اس نے اپنے سر کی خفیف سی اثباتی جنبش سے میری تائید کی اور میں نے اپنے حریف کو تقریباً گھٹینے ہوئے ایک صوفے میں ڈال دیا۔ اس کا مہیب ہسٹول ڈان نے اٹھایا تھا۔

اس اثنا میں ڈان تھری کی انگلیوں میں دبا ہوا سگار بجھ گیا تھا لیکن اعصاب شکن صورت حال سے دوچار ہونے کے باوجود اس نے بجھا ہوا سگار نہیں پھینکا تھا۔ اس نے خون میں نہائے ہوئے ہڈی کے سامنے پہنچ کر اٹھیمان سے اپنا بجھا ہوا سگار سلگایا پھر سرو نظروں سے اسے گھورنے لگا۔

قیدی نے نہایت بے رحمانہ انداز میں اپنے زخموں سے بہتے ہوئے خون کو اپنی دونوں آستینوں سے صاف کیا اور مجھے گھورتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”آج کی ناکامی کا صدمہ میں زندگی بھر نہیں بھول سکوں گا۔ ڈبئی جیسے چلاک درندے کو جسم واصل کر کے میں اپنے پر آئی میں کے سامنے سرخرو کی حاصل کر سکتا تھا۔“

”سرخرو تو تم ہو ہی گئے ہو۔“ میں اس کی ہرزہ سرائی پر خاموش نہیں رہ سکا۔ ”یہ اور بات ہے کہ تمہارے چہرے کی سرشتی خود تمہارے ہی لو کی احسان مند ہے۔ اس اعتبار سے تم نے اپنا آج کا برف حاصل کر لیا ہے۔ میرے ڈان نے مجھے اجازت دی ہوئی تو میں تمہارے پورے بدن سے خون کی کیرس ہما سکتا تھا۔“

”غیر ضروری باتوں کی ضرورت نہیں!“ ڈان نے اپنے خوشبودار سگار کا ایک کمرائش لے کر، کسی سے خصوصی طور پر غائب ہونے بغیر حکمانہ لہجے میں کہا پھر اس نے اپنی بے رحمانہ نگاہیں زخمی قیدی کے چہرے پر مرکوز کرتے ہوئے پوچھا۔ ”اب یہ بتاؤ کہ تم کون ہو اور یہاں تک کیسے پہنچے؟“

”میرا نام بلی گینگ ہے۔“ اس نے بدستور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”شاید تم سے معاہدہ ہونے کے بعد سپر آئی میں نے مجھے اس کام پر مامور کیا تھا اور میں فوراً ہی نیو یارک سے شکاگو چلا آیا جہاں تمہارا مسکن تھا۔ چینی نژاد امریکیوں کی آبادی میں تم تک پہنچا دشوار نہیں تھا۔ مجھے بتا دیا گیا تھا کہ تم اولین فرصت میں امریکا سے پاکستان پہنچ کر ڈبئی سے ملنے کی کوشش کرو گے اسی لیے میں سامنے کی طرح تمہارے پیچھے لگ گیا لیکن میری بد قسمتی نے آخری مرحلے پر مجھے تمہارا اسیر بنا دیا ہے۔“

”ہوں!“ ڈان تھری کے حلق سے ایک دہلی دہلی غراہٹ ابھری اور اس نے تقریباً خود کھالی کے انداز میں کہا۔ ”تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم شکاگو سے میرا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک آئے لیکن مجھے شہ نہ ہو سکا کہ جی لائیو نے مجھ سے وعدہ خلافی کرتے ہوئے اپنے

کے بعد حبیب حیوانی فارغ ہوا تو ڈان تھری اس کی طرف متوجہ تھا۔

”اس کے ساتھیوں کے بارے میں اطلاع تھی۔“ حبیب حیوانی نے چالاکی سے کام لیتے ہوئے ”خبر کا انکشاف کیے بغیر ڈان تھری کو آگاہ کیا۔

”ان دونوں کا کیا بنا؟“ ملی گینگ حوصلہ شکن صورت حال سے نبرد آزما ہونے کے باوجود اپنے تجسس پر قابو نہ رکھ سکا۔

”دونوں مار لیے گئے۔“ حبیب حیوانی نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”وہ دو مقامی سی رہے ہوں گے۔“

”ظاہر ہے،“ امریکا سے پورا جلوس تو نہیں لایا جاسکتا تھا۔ اب تم لوگوں کو تین لاشیں ٹھکانے لگانے کا بندوبست کرنا ہو گا۔ ان دونوں کے دلی وارث اب تمہارے پیچھے لگ جائیں گے۔“

حبیب حیوانی نے ملی گینگ کے دونوں ساتھیوں کے مارے جانے کی خبر سنائی تھی لیکن اس کے لب و لہجے سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ شاید اس نے ملی گینگ کا حوصلہ پست کرنے کے لیے وہ خبر سنائی تھی جب کہ انٹر کام پر کچھ اور ہی بتایا گیا تھا۔

”ان دونوں کی لاوارث لاشیں کسیں بھی پھینک دی جائیں گی۔“ ڈان تھری نے اپنے سگار کا دھواں اڑاتے ہوئے بولا۔ ”اور تمہارے لیے چوڑے وجود کو ایک جھوٹے سے وزنی پیکٹ میں جی لائیڈ کو بھیج دیا جائے گا۔“

ڈان تھری کے ان الفاظ پر میرے بدن میں سنسنی کی لہر سراپت کر گئی۔

ملی گینگ نے بھی اپنی جگہ پر بے چینی کے ساتھ پہلو بدلا اور اضطرابی لہجے میں بولا۔ ”اب یہ بتانا شروع نہ کرو تا کہ وہ پیکٹ کیسے بنایا جائے گا۔“ میرے مرجانے کے بعد تم میری لاش کے ساتھ جو بھی سلوک کرو گے، اس سے مجھ پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ مرنے کے بعد آدمی اور موم کے پتلے میں کوئی فرق نہیں رہتا۔“

”مافیا ڈپلن کا دو سرائام ہے۔“ ڈان تھری نے اپنی جگہ سے اٹھ کر شیطنت سے بولے۔ ”تم نے مافیا کے معززین میں سے ایک کا بیچا کر کے ناقابل معافی جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ اس لیے تمہیں ایسی عبرت ناک سزا دی جائے گی کہ آئندہ تم سے دوسرے کارکن ایسی حماقت کے بارے میں نہ سوچ سکیں۔“

”لیکن یہ میرا فیصلہ نہیں تھا، تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ٹی کا ڈپلن بھی اتنا ہی سخت ہے۔ ہم لوگ سپر آئی مین کے حکم پر تنقید کا کوئی حق نہیں رکھتے۔“ ملی نے مدافعت کرنے کی کوشش کی۔

”پھر تم اس کی سزا بھگتو گے۔ شاید تم نے ایس پے لٹائی مشین کا نام سنا ہو گا؟“

ایکس پے لرا کا ذکر سننے ہی میرے روٹنے لگے ہوئے تھے۔ قبیلہ ٹھکانے والی روایتی مشین کی طرح، بہت بڑے اسکرول والی اس مشین میں ایک طرف سے بنولیا دو سرائیچ ڈالا جاتا ہے، ”اقتدر موز

”ڈینی کی باری بعد میں آئے گی۔ فی الحال تم اپنی فکر کرو۔“ ڈان تھری کی سرد آواز گونجی۔

”مجھے معلوم ہے کہ تم مجھے زندہ نہیں چھوڑو گے۔“ ملی گینگ نے حیرت ناک بے خوفی کے ساتھ کہا۔ ”میں نے خوب سوچ سمجھ کر یہ مشن اپنے ذمے لیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میں کا سیاب رہا تو مجھ پر سپر آئی مین کی نوازشات کی اندھا دھند بارش شروع ہو جائے گی اور ناکام رہا تو شاید میری لاش کا بھی سراغ نہیں مل سکے گا۔“

”جی لائیڈ نے تمہیں ہر حال میں مجھے مار ڈالنے کی ہدایت کی تھی؟“ چند ثانیوں کے بوجھل سکوت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، میں نے وہ سوال پوچھ لیا جو خاصی دیر سے میرے ذہن میں چبھ رہا تھا۔

”مجھے معلوم تھا کہ تم یہ سوال ضرور پوچھو گے۔“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”دل تو یہ چلے رہا ہے کہ میں اپنی زبان نہ کھولوں تاکہ یہ سوال ہمیشہ تمہارے ذہن کو دستار ہے لیکن میں تمہاری ہمدردی میں نہیں، بلکہ سپر آئی مین اور نیٹش کاؤ کے درمیان پیدا ہونے والی متوقع غلط فہمی کو دور کرنے کی نیت سے بتائے دیتا ہوں کہ میرا مشن مشروط تھا۔ مجھے تمہارے اور نیٹش کاؤ کے مذاکرات کے موقع پر موجود رہنا تھا۔ تم سلور آئیز اور بیٹم گمن کی دایہی پر آمادہ ہو جاتے تو میں یہ خبر لے کر خاموشی سے واپس لوٹ جاتا لیکن تم نے اپنے ڈان کا مطالبہ ٹال دیا اس لیے مجھے اپنا کام شروع کرنا پڑا۔“

سپر آئی مین کو پہلے سے شبہ تھا کہ تم آسانی کے ساتھ راہ راست پر آنے والوں میں سے نہیں ہو۔ وہ تمہاری فطرت اور رگ رگ سے اچھی طرح واقف ہے۔“

”یہ سب ثانوی باتیں ہیں۔“ ڈان تھری نے دوہرے صوفے پر دراز ہوتے ہوئے، فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”نتیجے سے قطع نظر، بنیادی بات یہ ہے کہ جی لائیڈ نے مافیا سے کیے ہوئے معاہدے کا پاس نہیں کیا۔ ہمارے درمیان ایک بات طے ہو گئی تھی تو اسے ہمارے آخری جواب کا انتظار کرنا چاہیے تھا لیکن اس نے ہمارے اعتماد کو دھوکا دیتے ہوئے، تم کو میرے تعاقب اور ڈینی کے قتل پر مامور کر دیا۔“

”سب کچھ اسی طرح ہوا ہے۔“ ملی گینگ نے اس کی بات کاٹ کر، اپنا موقف سمجھانے کی کوشش کی۔ ”تم اپنی طرف سے کوئی جواب دینے کی پوزیشن میں ہوتے تو شکاگو سے کراچی تک دوڑ نہ لگاتے۔ تمہارا جواب وہی ہوتا تھا جو تمہیں ڈینی کی طرف سے ملا تھا۔ فرق صرف اتنا پڑا ہے کہ تمہیں اپنا جواب سپر آئی مین تک پہنچانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ میں نے اس کے خود مختار نمائندے کی حیثیت سے، جواب سن لینے کے بعد اگلی کارروائی شروع کر دی۔ یہ میری بد قسمتی ہے کہ میں اپنی اس کوشش میں بری طرح ناکام ہوا ہوں۔“

اسی وقت ڈرائنگ روم میں موجود انٹر کام کی گھنٹی بجی اور حبیب حیوانی نے لپک کر ریسپور اٹھایا۔ چند ثانیوں تک بات کرنے

اچانک فضا میں شیش ٹوٹنے کا تیز چھٹکا ہوا بھر بھاگتے ہوئے قدموں کی تیز دھمک سنائی دی۔

”رک جاؤ، ورنہ جان سے مار دوں گا۔“ میرے قریب ہی سے حبیب حیوانی کی مٹھی کھٹی غرابٹ سنائی دی۔ وہ اس نئی ہڑنگ سے بہت زیادہ بولکھایا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

پھر یک بیک کوئی بھاری بھر کم دودھ میرے اوپر آ پڑا۔ اپنے نیچے کسی زندہ انسانی وجود کا ادراک ہوتے ہی حملہ آور نے میرا گلا دوپٹے کی کوششیں شروع کر دیں۔

زبردست جدوجہد کے دوران میں اس کے دہانے سے جوں سی پہلی گالی برآمد ہوئی تو میں بری طرح جھٹک گیا کیوں کہ وہ حبیب حیوانی تھا جو سیاہ دھوئیں میں گھرا ہوا ہونے کی وجہ سے مقابلے میں مجھ ہی سے لپٹ رہا تھا۔

”اٹک ہو، چیف! یہ کیا کر رہے ہو؟“ میں نے اس کی انگلیوں سے اپنی گردن پچاتے ہوئے ہنسا کر کہا۔

”اوہ ڈینی؟“ اس کی بولکھائی ہوئی آواز کے ساتھ ہی اس کے تڑپے ہوئے اعصاب یک بیک ڈھیلے پڑ گئے۔ چند لمحوں کے سکوت کے بعد اس کی احتیاطی آواز ابھری۔ ”یہ تم ہو تو وہ کہاں گیا؟“

”میرے اوپر سے تو ہو، میرا دم کھٹ رہا ہے۔“ میں نے بے رحمی کے ساتھ اسے اپنے اوپر سے اچھال دیا۔

میں قالین سے اٹھ ہی رہا تھا کہ باہر سے کھٹ کی ایک مخصوص گونج سنائی دی۔ وہ یقینی طور پر کسی بے آواز پستول کا فائر تھا۔

ساتھ ہی فضا میں موت کی دہشت میں ڈوبی ہوئی ایک جھنجھلند ہوئی اور فوراً ہی دم توڑ گئی۔ باہر کسی وزنی شے کے پتہ فرش پر گرنے کا دھماکا ہوا پھر متعدد دوڑتے قدموں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

کثیف دھوئیں کا ہم بلی گینگ کا کوئی شعبہ تھا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ شی والے جدید سے جدید تر سائنسی کمالات سے بھرنا سارے پیدا کرنے میں یہ طوطی رکھتے ہیں۔ ہمارے گرد و پیش میں پھیلا ہوا تاریک دھواں رفتہ رفتہ اوپر اٹھ کر ہوا میں تحلیل ہو رہا تھا۔

پھر میری نگاہ سرکے والی بڑی سی کڑک کی ٹوٹنے ہوئے شیش پر پڑی جس میں سے ڈان قہری اتنے اطمینان کے ساتھ کمرے میں داخل ہو رہا تھا جیسے اس کے نزدیک وہی آمدورفت کا راستہ ہو۔

”تمہارے سب آدمی گدھے ہیں!“ اندر آنے کے بعد ڈان قہری ہانپتے ہوئے غرایا۔ ”میں بروقت اس کا راستہ نہ روک لیتا تو وہ ہماری آنکھوں میں دھول جھونک کر نکل گیا ہوتا۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ حبیب حیوانی ڈان قہری کے غصے سے خوف زدہ ہو گیا۔ ”ان دونوں کے فرار ہو جانے کے بعد وہ سب مطمئن ہو گئے تھے۔ انہیں اندر کی صورت حال کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔“

چلنے والی وہ مشین آٹا فائبرس بیجوں سے تیل کی ہر لونڈی نچوڑ کر دوسری طرف سے خشک کھلی کی پپر پاں باہر پھینک دیتی ہے۔

ڈان قہری اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”ایکس پلے لرا اسکو بہت طاقت ور ہوتا ہے۔ ایک بار تمہاری انگلیاں اس میں پھنسا دی جائیں تو وہ رفتہ رفتہ تمہارے پورے جسم کو اڈر کھینچ کر ہڈیوں پسیلوں کا سرمایہ بنا دے گا، خون، پانی اور چھٹی کشید ہونے کے بعد دوسری طرف سے تمہاری خشک کھلی برآمد ہوگی جسے ایک چھوٹے سے ڈبے میں بھر کر وہ پارسل جی لائیڈ کو روانہ کر دیا جائے گا۔“

ڈان قہری نے اس مشین کی کارکردگی کے بارے میں غالباً ماننے سے کام لیا تھا لیکن پھر بھی وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، وہ ناممکن نہیں تھا۔ لمبی چوٹی انسانی لاش کو ٹھکانے لگانے کے مقابلے میں اس کی کھلی کو ہم سانی خورد برد کیا جاسکتا تھا۔

لمبی کے خون میں تھڑے ہوئے چہرے سے اس کے تاثرات کا اندازہ لگانا دشوار تھا لیکن اس کی مضطرب حرکات سے یہ معلوم ہو رہا تھا کہ وہ خود کو اپنے انجام کی طرف سے بے پروا ظاہر کرنے کے باوجود، فکر مند تھا۔

اسے صوفے پر بیٹھے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی جس کی وجہ سے اسے اپنے اوسان بحال کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ اس نے اچانک ہی پسیلوں اور بجلی کی سرعت کے ساتھ اپنی جیب سے ایک چھوٹی سی سیاہ گیند نکال کر ہم لوگوں کے درمیان قالین پر دے ماری۔

فضا میں ہلکا سا دھماکا ہوا اور پھر وہاں تیزی کے ساتھ سیاہ دھواں بھرا چلا گیا۔

لمبی اس دھماکے اور دھوئیں کی آڑ لے کر وہاں سے فرار ہونے کے پکڑ میں تھا۔ مجھے سیاہ دھوئیں میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن میں نے اندازے سے اس طرف چھٹا نگ لگا دی جہاں سے گزرے بغیر لمبی کا سرعت کے ساتھ دروازہ تک پہنچنا ناممکن تھا اور یہ اتفاق ہی تھا کہ وہ بھاگتے ہوئے میری زد میں آ گیا۔

وہ اس وقت اپنی زندگی اور موت کے سنگین مسئلے سے دوچار تھا، اس لیے اس کے بدن میں سوئی ہوئی تمام حیوانی جبلتیں یکایک بیدار ہو چکی تھیں۔ اپنے بدن پر میری گرفت محسوس کرتے ہی وہ بلی طرح پھڑکا اور اس نے اپنے جسم کو ایک جھٹکا دے کر مجھے آگے اچھال دیا۔

میں منہ کے بل قالین پر گرا۔ میرا داہنا ہاتھ میز کے پائے میں الجھ گیا تھا۔ میں جھلا کر اٹھا تو ہر طرف اس قدر سیاہ دھواں پھیلا ہوا تھا کہ کمرے میں چلتے ہوئے بلب بھی صرف روشن نقطوں میں محسوس ہو کر رہ گئے تھے۔

اس تاریک دھوئیں میں بصارت بالکل مفلوج ہو کر رہ گئی تھی اس لیے میں اٹھتے ہی اندازہ کر کے ایک طرف دوڑا لیکن فوراً ہی ایک میز سے الجھ کر دو باہر وہیں ڈھیر ہو گیا۔

”اس بندوبست سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا پھر بھی میں ندامت اور شرمندگی محسوس کر رہا ہوں۔“ میں نے سر جھکا کر اپنے صدمے کا اظہار کیا۔

”کیا تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ تمہارے عمل دخل سے اس صورت حال میں فرق پڑ سکتا تھا؟“

اس کے اس سوال پر میں چونک پڑا۔ ”میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ آدمیوں کا انتخاب احتیاط سے کیا جاتا تو شاید ان ناخوشگوار واقعات سے بچا جاسکتا تھا۔ ماتحت ناکارہ ہوں تو عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے۔“

”لیکن میں سوچ رہا ہوں کہ حبیب حیوانی کو کچھ دن کے لیے رخصت پر بھیج کر، تمہیں اپنی کارکردگی دکھانے کا موقع دیا جائے آنے والے دنوں میں یہ علاقہ ہماری سرگرمیوں میں کلیدی کردار ادا کرے گا۔“

اس کی وہ تجویز میرے لیے نہایت خطرناک تھی۔ میں اپنے دل کی گمراہیوں سے کسی بھی طرح مانیا کا وفادار نہیں تھا۔ جب تک میں دسے داریوں سے بچا ہوا تھا، بالا ہی بالا مانیا کے مفادات کو نقصان پہنچا کر، ایسا تمام کارروائیوں کی دسے داری کا طوق حبیب حیوانی کے گلجے میں ڈال سکتا تھا۔ اگر ڈان تھری چوری کو کو تو ال مقرر کر دینے پر تزل جانا تو میرے لیے بدترین دشواریاں کھڑی ہو سکتی تھیں اور ان کے نتیجے میں مجھے پوری طرح مانیا کا حق تک ادا کرنے پر مجبور ہونا پڑتا۔

”میری ناقص رائے میں یہ وقت ایسی کسی تبدیلی کے لیے سازگار نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

”میں اس کی وجہ جانتی جا ہوں گا۔“ ڈان تھری نے اپنی سانپ جیسی نظریں میرے چہرے پر گاڑ کر پوچھا۔

”تنظیم کے اندرونی معاملات پر میری توجہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ گئے چنے لوگوں کے علاوہ ایقہ افزادی وسائل ابھی تک میری نگاہوں میں نہیں آسکے ہیں۔ مجھے عام آپریشن کو چلانے میں دقتیں پیش آئیں گی۔“

”لیکن کیوں؟ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ کیا تمہیں دیدہ وادانت الگ تھلک رکھنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں؟“ اس کی تیاریوں پر برہمی کی علامات ابھر آئیں۔

”دانتہ نہیں۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”شاید ابھی تک اس کا وقت نہیں آیا۔ کام میں تیزی پیدا ہوگی تو بہت سی باتیں خود بخود میرے سامنے آتی چلی جائیں گی۔“

”تم اپنے چیف سے بہت زیادہ مرعوب ہو یا پھر اول درجے کے فریبی اور مکار ہو۔“ چند ثانیوں کے بعد وہ ایک گمراہ سانس لے کر بولا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم دسے داری قبول کرنے سے گریز کیوں کر رہے ہو؟“

”میں نے جو کچھ کہا اس میں میری ذرا سی بھی بدعتی داخل نہیں ہے۔ چیف بہر حال میرا بڑا ہے اور میں اس کا مناسب احترام

”کون دونوں فرار ہو گئے؟“ ڈان تھری اس پر پرس پڑا۔ ”کام پر بات کرنے کے بعد تو تم بتا رہے تھے کہ ملی کے دونوں ساتھیوں کو مار دیا گیا ہے؟“

”میں نے ملی کو دھوکا دینے کے لیے جھوٹ بولا تھا۔“ حبیب حیوانی نے سر جھکا کر مردہ آواز میں کہا۔

”میں نے آج تک اپنے کسی یونٹ میں اتنی اہتری اور بدانتظامی نہیں دیکھی۔ تم نے اس کاروبار کو چور اچکوں کا کھیل بنایا ہوا ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ ملی تمہارے چھ آدمیوں کے سروں پر چھاپ کر ہوا میرے بد مقابل آگیا اور ان میں سے کسی کو اس معاملے کی سنجیدگی کا احساس نہیں ہو سکا۔ کیا ان ہی صلاحیتوں کے مل بوتے پر ہم یہاں اپنے کاروبار کی بنیادیں وسیع کرنے کی آرزو کر رہے ہیں؟“

”میں شرمندہ ہوں، ڈان!“ حبیب حیوانی رو دینے والی آواز میں گڑگڑایا۔ ”جب سے میرا ایک آدمی مارا گیا ہے میرے نظام میں دراڑیں پڑ گئی ہیں۔ سینڈوکی جگہ لینے والا رفتہ رفتہ اس کی سطح پر آجائے گا تو ایسی خرابیاں پیدا نہیں ہوں گی۔ وہ بہت محنت کر رہا ہے۔“

”اور اس وقت تک ہم سب جہنم واصل ہو چکے ہوں گے۔“ وہ دانت پیٹتے ہوئے غرایا۔ بھاگ دوڑ میں اس کے ہاتھ سے سگار کھینچ کر نکلتا تھا اس لیے وہ اپنی جب سے نیا سگار نکالتے میں مصروف ہو گیا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ اس نے اپنا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے اپنی توجہ سگار کی طرف مبذول کی تھی۔

وہ کمرے میں ٹھل ٹھل اور رک رک کر سگار سلگانے کے مختلف مراحل طے کرتا رہا اور میں اپنی جگہ کھڑا دلچسپی کے ساتھ حبیب حیوانی کی اہتر حالت سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ وہ کسی پیدا انٹی مجرم کی طرح اپنا سر جھکائے کھڑا ہوا تھا۔

سگار کے چند کمرے کش لینے کے بعد ڈان تھری کا غصہ فرو ہوا تو اس نے دوبارہ بیٹھے ہوئے کہا۔ ”وہ دوا دسے سے بھاگا تھا۔ اگر میں کڑکی سے نکل کر اس سے پہلے باہر نہ پہنچتا تو وہ بھاگ جاتا۔ اب تم جاؤ اور اس کی بگڑی ہوئی لاش ٹھکانے لگانے کا بندوبست کر کے واپس آؤ۔“

ڈان تھری نے کھڑکی کی راہ اختیار کر کے واقعی عقل مندی کی تھی۔ فرق صرف اتنا ہوا تھا کہ کھڑکی کے دو میں سے ایک پٹ کھلا ہوا تھا اور ملی ٹینگ نے اسی غلامی سے مجھ پر فائز کیا تھا۔ اگر کمرے میں سیاہ دھواں نہ پھیلا ہوتا تو ڈان تھری کھلے ہوئے پٹ میں سے بے سانس باہر نہیں نکل سکتا تھا لیکن اندھیرے کی وجہ سے اس سے اندازہ کی غلطی ہوئی اور وہ بند بندیش توڑتا ہوا باہر نکل گیا۔

اس کی ہدایت پر حبیب حیوانی ڈرانگ دوم سے چلا گیا تو ڈان تھری پوری سنجیدگی سے میری طرف متوجہ ہو گیا۔

”تفہم و ضبط کی اس شرمناک صورت حال پر تمہارے کیا احساسات ہیں؟“

ہے لیکن جب ہمارے حرف مذاکرات کی میر پر آجاتے ہیں تو ہم جھوٹ بولتے ہیں، نہ وعدہ خلافی کرتے ہیں۔ اسی سادھ کے سارے ہم تیزی کے ساتھ ترقی کرتے جا رہے ہیں۔ اگر سلور آئیز کے بارے میں تم کچھ چپا رہے ہو تو اب بھی اپنے بیان پر نظر ثانی کر سکتے ہو۔ میں نے ایک بار جی لائیڈ کے سامنے زبان کھول دی تو کچھ نہیں ہو سکے گا۔ بعد میں تمہاری بات غلط ثابت ہوئی تو میں خود مانیا کے سارے مفادات کو نظر انداز کر کے، اپنے ہاتھوں سے تمہیں ذبح کر دوں گا۔“

اس کی دھمکی کے سرد الفاظ پر میں اندر سے لرز کر رہ گیا۔ میرا بیان جزوی طور پر درست تھا۔ میں نے دیر کی ایران روانگی سے پہلے دو سلور آئیز اس کے حوالے کر دی تھیں لیکن تیسری سلور آئی بدستور میری تحویل میں تھی جس سے میں کسی بھی قیمت پر دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس لیے میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”مجھے ابھی طرح اندازہ ہے ڈان! کہ میں کس سے بات کر رہا ہوں۔ جی لائیڈ کو اس لڑکی پر دباؤ ڈالنا چاہیے جو اسے زبردستی اپنا باپ بنانے پر اصرار کرتی رہتی ہے۔ اس معاملے میں میرا ضمیر مطمئن ہے۔“

”اور تم گمن؟“ ڈان قہری کے ٹھیکے سوالات سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ میرے ابتدائی جوابات کو من و عن تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔

”وہ بھی میرے پاس نہیں ہے۔“ میں نے اس سے نظریں چار کر کے ڈھٹائی سے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے!“ وہ فیصلہ کن انداز میں بولا۔ ”مجھے بتایا گیا ہے کہ لیزر سے چلنے والی اس گمن کے نوزل سے خارج ہونے والی ’ملک‘، نینکوں شعاعیں پتھر تک کو آٹا فائنا میں جلا کر راکھ کر دیتی ہیں۔ اب اگر اس خٹلے میں ایسی کوئی بھی واردات ہوئی تو تم مشکل میں پڑ جاؤ گے۔“

”یہ زیادتی ہے ڈان!“ میں نے پہلی بار احتجاج کیا۔ ”ملی ٹینگ کی موت سے ظاہر ہوتا ہے کہ شی والے ابھی تک یہاں کام کر رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ دیر ابھی ابھی اسی شرمیں موجود ہو۔ اگر ان میں سے کسی نے ہم گمن سے کوئی شکار کھیلنا تو مجھ پر اس کی ذمہ داری کیسے ڈالی جاسکے گی؟“

”اسی کا بندوبست کیا جا رہا ہے۔ وہ یہاں سے پہائی اختیار کر لیں گے اور پھر تم یہ بھی بھول رہے ہو کہ جی لائیڈ ہماری ہی طرح پیشہ ور ہے۔ پرو فیشنل لوگ جھوٹ نہیں بولا کرتے۔“

”مجھے ان کی پردا نہیں لیکن مجھے تمہارا تحفظ ضرور درکار ہے۔ مجھے یہ اطمینان ہونا چاہیے کہ میرا ڈان مجھے جھوٹا نہیں سمجھتا۔ تم کو اندازہ نہیں کہ جی لائیڈ میری طرف سے اپنے دل میں کتنے زخم لیے بیٹھا ہے۔ دیرا وینا کے ہر خٹلے میں رنگ رلیاں سناتی پھرتی ہے لیکن جی لائیڈ کو اس بات کی غفلت ہے کہ میں ایک طرف اسے زک پر زک پہنچا رہا تھا اور دوسری طرف دیرا میرے لیے

کڑا ہوں۔ اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں ہے۔“

”تمہاری پرانی شہرت مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہی ہے۔“ اس نے کہا۔

”مجھے اعتراف ہے کہ مکاریوں اور چال بازیوں کے سلسلے میں بہت بدنام رہا ہوں لیکن مانیا میرا گھر اور میرا مسکن ہے۔ اس میں میں بالکل سیدھا چلنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“

”میں کیسے مان لوں کہ تم نے سلور آئیز لوٹا دی ہوں گی۔ تم ان کی اہمیت سے پوری طرح واقف تھے پھر تم نے دیرا جیسی دشمن سے سمجھنا کیسے کر لیا؟ تم ایک طرف خود کو ناقابل شکست ثابت کرنے چلے آئے ہو اور اب خود کو اول درجے کا بے وقوف ظاہر کرنے پتلے ہوئے ہو۔“

”شاہد میری کم گوئی کی وجہ سے ایسی غلط فہمیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ حقیقت یہ ہے میں سلور آئیز کے بوجھ سے ان ہی دنوں میں بری الذمہ ہو چکا تھا جب دیرا کے ساتھ میری گاڑی چھن رہی تھی۔“

”وہ بہت پرانی بات ہے۔ اگر دیرا اس وقت سلور آئیز لے چکی تھی تو اس نے اپنے ہتھوں کو اندھیرے میں کیوں رکھا؟“

”اس بات پر وہی روشنی ڈال سکے گی لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ وہ اپنے مفادات کو کبھی بھی فراموش نہیں کرتی۔ جی لائیڈ کے بارے میں، وہ اکثر جھلٹ کا شکار ہوتی رہتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایسی ہی کسی رو میں آکر اس نے سلور آئیز پر قابض ہونے کا راز اپنی ذات تک محدود رکھا ہو۔“

”لیکن وہ خود آئی دو سن ہے۔ شی میں ہر ایک جانتا ہے کہ اس کا پرانی میں ایک مرد ہے۔ ایسی صورت میں دیرا فاضل سلور آئیز سے کیا فائدہ حاصل کر سکتی ہے؟“

”میں کیا عرض کر سکتا ہوں؟“ میں بے بسی کے ساتھ اپنے شانے اچکا کر رہ گیا۔ ”ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے اس اہم کارنامے کی اطلاع کسی مناسب وقت پر دینا چاہتی ہو۔ ان لوگوں نے اس معاملے میں تم سے رنجوع کیا ہے تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ لوگ سلور آئیز کی طرف سے کتنے فکر مند ہیں۔“

”اور اب دیرا کہاں ہے؟“ وہ چمکیں جھپکائے بغیر مجھے گھورے جا رہا تھا۔

”دو روز پہلے تک میں اس کی راہ پر تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ میں کی بھی وقت اسے گھیر کر مار لوں گا لیکن پھر اچانک ہی وہ کسی جہاز سے کی طرح غائب ہو گئی۔ ہو سکتا ہے کہ اب تک وہ شہری شکار نہیں چھینی ہوئی ہو۔“

”دھمکو، ڈنی! یہ یاد رکھنا کہ ہم لوگ پرو فیشنل ہیں۔ ہم نے کی مجبوری یا حادثے کے تحت اپنی راہ کا انتخاب نہیں کیا ہے۔ ہمارے کسے کم مدت میں زیادہ سے زیادہ دولت کمانے اور اختیار ہانک مارنے کے لیے، بہت سوچ سمجھ کر یہ کا دوبار اپنایا ہے۔ ہمیں اہل سادھ بہت عزیز ہے۔ دشمنی میں ہر دھوکے اور فریب روا ہونا

”عوام!“ حبیب حیوانی نے گھسا پٹا جواب دیا۔ ”منا کی حمایت سے قیادت اور آتی ہے۔“

”جو اس!“ ڈان نے غارت سے کہا۔ ”یہ سب ترقی یافتہ ملکوں کی باتیں ہیں۔ تیسری دنیا کے ملکوں میں غلام رسول جیسے لوگ ابھر کر آتے ہیں جنہیں سازشوں، کالے دھن اور خفیہ ہتھیاروں کے ذریعے آگے لایا جاتا ہے۔ ان ملکوں میں اقتدار صرف جاگیردار اور سرمایہ دار طبقے کا ہوتا ہے۔ عوام سے صرف نمائش کا کام لیا جاتا ہے۔ وہ دھوپ میں گھنٹوں دھکے کھا کر ووٹ دے آتے ہیں۔ نتیجہ آتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ سارے ووٹ اسی کو ملے ہیں جسے کوئی پسند نہیں کرتا۔ ووٹر، جیتنے والے کی بد معاشیوں کے امکانات پر غور کیے بغیر ایک دوسرے پر شبہ کرنے لگتے ہیں لیکن ہوا تو یہ ہے جو ایک مخصوص طبقے کی مرضی ہوتا ہے۔ ہمیں قوت اور اختیار کے ان سرچشموں تک رسائی حاصل کرنی ہے تاکہ ہم بے خوف و خطر ہو کر اپنا کام آگے بڑھا سکیں۔“

”کی کلب کے مقاصد بھی یہی تھے۔“ حبیب حیوانی نے یاد دلانا چاہا لیکن ڈان نے فوراً ہی اُس کی بات کاٹ کر اپنی تقریر شروع کر دی۔

”وہ نظریہ میاں نہیں چن سکتا۔“ وہ کہہ رہا تھا۔ ”بلیک میلنگ کے ذریعے لوگوں کو مجبور کیا جا سکتا ہے۔“ ان سے دوستانہ مراسم استوار نہیں کیے جا سکتے۔ کی کلب ایک بہت کھلا ہوا راز تھا۔ وہاں ایک حمام میں سب ننگے ہوتے تھے۔ ہر شخص کو معلوم تھا کہ وہاں دوسرے کس صورت حال سے دوچار ہوتے ہیں۔ اب ہمیں منظم ہو کر اوپری سطح پر کام کرنا ہو گا۔“

”بلیسی دے دی جائے تو ہم ہر کام کرنے کے لیے تیار ہیں۔“ اس بار بھی حبیب حیوانی نے ہی لین دہانی کرائی۔

”اس بار کرپٹ سیاستدان وغیرہ ہمارا ٹارگٹ ہوں گے۔ ہم ان میں سرمایہ کاری کریں گے اور وہ ہمارے کاروبار کو تحفظ فراہم کرنے کے ذمہ دار ہوں گے۔“ ڈان تھری بولا۔ ”پچھلے دنوں امیر جان نامی ایک سیاستدان کے بیٹے نے نیویارک میں دو دھوکہ بازوں ہمارے ایجنٹ کو فروخت کی ہے۔ اس کی لاطینی میں پورے لیسن دین کی ویڈیو فلم بنائی گئی ہے۔ آنے والے دنوں میں باپ بیٹے کو سیاسی کامیابیوں کے لیے خلیفہ سرمائے کی ضرورت ہے جو ان کی زرعی جاگیر سے نہیں مل سکتا۔ امیر جان بہت آسانی کے ساتھ ہمارے پھندے میں آ سکتا ہے۔ وہ پارسی جٹا کر بیچنے کی کوشش کرے تو اس کے بیٹے کی فلم کا حوالہ اسے راہ راست پر لے آئے گا۔ اس فلم کا انکشاف ان دونوں کی سیاسی زندگی تباہ کر سکتا ہے۔ امریکی ایف بی آئی وہ فلم منہ مانگے دامنوں پر خریدے گی۔ اس کی مدد سے وہ میاں والوں کو بے نقاب کر سکتی ہے۔۔۔“

وہ بولتا رہا لیکن میرے لیے وہ باتیں نئی نہیں تھیں۔ غلام رسول کے معاملے میں میں وہ حربہ آزما چکا تھا۔ ہمارے پاس اس کی کوئی قسم نہیں تھی لیکن فرضی قلموں کا حوالہ دیتے ہی اس نے

ایک کھلوانی ہوئی تھی۔ مجھے تھس تھس کرنے کے لیے وہ اپنے اصولوں اور پیسے کے وقار تک کو داؤ پر لگا دے گا۔“

”ہم اپنے حریفوں کی شکایت پر اپنے آدمیوں کو فطرتی میں بھا کر ان کے سامنے نہیں ڈال دیتے۔ میں تمہیں صرف امکانات سے آگاہ کر رہا تھا۔ تم فکر نہ کرو۔ وقت آیا تو تمہارے ساتھ پورا پورا انصاف کیا جائے گا۔“

”میں تمہارا شکر گزار ہوں“ ڈان!“ میں نے ممنونیت سے لہرز لہے میں کہا۔ ”تمہارے ان الفاظ کے سارے اب میں سکون کے ساتھ اپنا کام جاری رکھ سکوں گا۔“

”دیکھو، تمہارا چف کماں رہ گیا؟ باقی باتیں اس کی موجودگی میں ہونی ضروری ہیں۔“

میں اپنی جگہ سے اٹھ کر نکاسی کے راستے کی طرف لپکا تو حبیب حیوانی کسی اداس کمرے کی طرح منہ لٹکائے برآمدے میں کھڑا تھا۔

”اے! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر حیرت سے کہا۔ ”اندر کیوں نہیں آتے؟“

اس نے گھور کر میری طرف دیکھا اور اداسی کے ساتھ بولا۔ ”میں سمجھ گیا تھا کہ ڈان مجھے باہر بھیجتا چاہ رہا تھا۔ اس کی اجازت کے بغیر میں نے دوبارہ اندر آنا مناسب نہیں سمجھا۔“

”تم غلط سمجھے۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ جلدی آؤ، وہ تمہارا انتظار کر رہا ہے۔“

میرے اس فقرے پر حبیب حیوانی کے پنرے سے مایوسی دور ہو گئی اور وہ فوراً ہی میرے ساتھ ہو لیا۔

”تم نے غلام رسول نامی ایک مقامی سیاستدان کو پولیس کے قبضے سے آزاد کرایا تھا۔“ قدرے توقف کے بعد ڈان نے بولنا شروع کیا۔ ”یہ ہماری بد قسمتی ہے کہ وہ بھارتیوں کی تحویل میں جانے سے پہلے، مرده حالت میں دوبارہ پولیس کے ہاتھوں میں پہنچ گیا اگر وہ کام ہو جاتا تو اس کے بدلے میں بھارت میں ہمیں کام کرنے کی بہت زیادہ آزادی مل سکتی تھی۔ غلام رسول میاں ایک نیک نام سیاستدان تھا لیکن تم نے سن لیا ہو گا کہ وہ ڈاکوؤں اور رسرہ کیوں کی سرپرستی کی پشت پناہی کر کے اس مقام تک پہنچا تھا۔ اندر کی خبریں ظاہر کرتی ہیں کہ وہ بھارتیوں کے ساتھ مل کر سندھ میں مسلح بغاوت پھیلانے کے ایک ایسے منصوبے پر کام کر رہا تھا جس میں چند اہم سفارت خانوں کے ساتھ ہی، شی کا بھی اہم کردار تھا۔ ایک ایسے ملک میں جہاں ممتاز سیاست دانوں کا یہ حال ہو، ہمارے لیے کام کرنا بہت آسان ہو جاتا ہے۔“

اس کی وہ تمہید ہم دونوں ہی کے لیے ناقابل فہم تھی۔ اس لیے ہم خاموشی کے ساتھ اس کے دوبارہ بولنے کا انتظار کرتے رہے۔

”تم جانتے ہو کہ اقتدار کا سرچشمہ کیا ہوتا ہے؟“ وہ ڈان کی طرف سے ایک واضح سوال تھا۔

خفیف سی رقت نمودار ہوئی اور اس نے تیز زدہ لمبے میں پوچھا۔ ”تم اس کے بارے میں کیسے جانتے ہو؟ یہ خبر تو کبھی منظر عام پر ہی نہیں آئی تھی۔“

”میں مانیہ کے ساتھ۔ لمبے سے پہلے شی کے ساتھ تھا۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”مومن خان آفریدی کے ساتھ ہی“ سردار پابندہ گل کی کنایاں بھی سینہ بہ سینہ پہنچتی رہی ہیں۔ سنا ہے کہ اس نے تمام دوسروں پر اپنے دہشتناک فائرنگ اسکاؤڈ کے بھرے ہوئے میگزین خالی کر دیے تھے۔“

”وہ دوسری“ افغان گوریلوں کی انیم کی فضلیں تباہ کرنے آئے تھے۔ ”ڈان تھری نے حبیب جیوانی سے مخاطب ہو کر اسے رُخِ خیال انداز میں بتایا۔ ”لیکن سردار پابندہ گل نے ان کی لاشیں‘ سنگلاخ زمین میں دفن کر کے اس پر پوسٹ کی فصل لگوا دی تھی۔ سنا ہے کہ دوسری فوجیوں کی لاشوں پر قائم دھمیت آج بھی سب سے زیادہ زرخیز سمجھا جاتا ہے۔“

”ایسے جنونی شخص سے ہمیں دور ہی رہنا ہو گا۔ انسانی کھاد سے انیم کی فصل کی آبیاری کا تصور ہی وحشت انگیز ہے۔ یقین نہیں آتا کہ بیسویں صدی میں بھی ایسے لوگ بستے ہیں۔“

”وہ کٹر قوم پرست ہے۔“ میں نے حبیب جیوانی کی تصحیح کرتے ہوئے کہا۔ ”دوسروں کو وہ اپنی قوم اور ملک کا قاتل قرار دیتا ہے اور اُن کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے والے ہر عمل کو جائز سمجھتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب گورے ان ملکوں میں سگریٹ اور شراب کی بھاری کرنے کا حق رکھتے ہیں تو اسے بھی گوروں کے ممالک میں بیرون کی دبا پھیلانے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ اس نے اپنے تین ایسے کارکنوں کو اپنے ہاتھوں سے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا جنہوں نے تجسس سے مجبور ہو کر چوری چھپے پلی بار بیرون کی تھی۔“

”پھر تو وہ کوئی نظریاتی جنونی معلوم ہوتا ہے۔“ حبیب جیوانی نے برا سائمنہ بنا کر تبصرہ کیا۔

”مہر حال“ فی الحال ہمیں اس سے دور رہنا ہے۔ ”ڈان تھری نے ہاتھ اٹھا کر وہ موضوع دہیں ختم کر دیا۔

پھر اب ہمارے لیے کیا حکم ہے؟“ میں نے چند لمحوں کے سکوت کے بعد ڈان سے پوچھا۔

”تم جا سکتے ہو۔ میں بھی اب آرام کروں گا۔ ملی ٹینک کے واقعے نے میری طبیعت کدڑ کر دی ہے۔ اگر جی لائیڈ کی نیت میں شروع ہی سے کھوت تھا تو میں نے شکا کو سے یہاں تک دوڑ لگا کر اہادوت ضائع کیا ہے۔ میں تم سے فون پر بھی سوال وجواب کر سکتا تھا۔ میرے آنے کا مقصد یہ تھا کہ میں تم سے وہ دُرو بات کر کے معاملہ کی = تک پہنچ سکوں مگر جی لائیڈ نے اپنے طرزِ عمل سے میرے اہاد کو ٹھیس پہنچائی ہے۔“

”میں اپنے بارے میں“ اس کی ایسی ہی کسی غیر پیشہ درانہ حرکت کی طرف سے متروک ہوں۔ ”ڈان کے آخری فقروں پر مجھے

اپنی بھارتی آقاؤں کو گالیاں دیتے ہوئے اعتراضات کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ اس کے لیے وہ تصویر ہی لرزہ خیز تھا کہ اس کے مک دشمن جرائم کے تصویری ثبوت اسٹیکل ٹائیک فورس کے قبضہ میں آئے تھے۔

اس کے برعکس‘ امیر جان کے بیٹے کی قلم واقعی موجود تھی۔ اس قلم کے سارے‘ ان دونوں باپ بیٹے کو بہ آسانی ٹکیل ڈالی جا سکتی تھی۔

”اس کے علاوہ سردار پابندہ گل ایک چھوٹا ریکٹ چلا رہا ہے۔ بیرون سے کمائی کی دولت لٹا کر اس نے اپنی سخاوت کی بحر انگریز دھاک بٹھائی ہوئی ہے۔ کراچی کا نوجوان صنعت کار‘ مختار تفتی بیرون کے سارے راتوں رات کوڑ بیٹا ہے۔ پاکستان میں بہتر بیرون بیرون تھوڑی سی محنت کے بعد ہر ایک خرید سکتا ہے۔ عالمی بازار کے ہماؤ آئے دن ہر اخبار میں چھپتے رہتے ہیں۔ قیمت خرید‘ رشمنی اور دوسرے تمام اخراجات پندرہ‘ بیس لاکھ روپے فی گلو سے زیادہ نہیں آتے۔ پیرس‘ ایمسٹرم‘ فریکٹرٹ‘ برلن‘ لندن اور نیو یارک پہنچتے ہی اس کے دام ایک کوڑ سے اوپر پہنچ جاتے ہیں۔ دنیا کی تاریخ میں کسی جنس پر داموں اور منافع کی شرح اتنی ہوشیاری نہیں رہی لیکن رکاوٹ صرف اتنی سی ہے کہ مال کے جانے والوں کو یہ معلوم نہیں ہو تا کہ ان پر جھوم شہروں میں بیرون کے تھوک خرید اموں کے ٹھکانے کہاں ہیں۔“ ڈان تھری سگار کے کمرے کی ٹوکوں کے درمیان میں بولے جا رہا تھا۔ ”میں شہروں میں پہنچنے والے ہر پاکستانی کا پیچھا کیا جاتا ہے۔ سیکرٹ ایجنٹ اور پولیس فوٹ مانیٹر خفیہ مشینوں کنایوں میں مال کی خریداری کا عندیہ دیتے ہیں تو تازی لوگ انہیں کام کا آدمی سمجھ کر ان کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔ ہمیں ان تماشوں کو ختم کر کے اس تجارتی منڈی کو پوری طرح اپنی محنت میں لینا ہے۔“

”امیر جان‘ سردار پابندہ گل اور مختار تفتی کے نام میں یہ یاد کر لیے ہیں۔ ان پر ہم فی الفور کام شروع کر دیں گے۔ اسی سے آگے راہ جتنی چلی جائے گی۔“ حبیب جیوانی نے کہا۔

”صرف امیر جان اور مختار تفتی!“ ڈان تھری نے زور دے کر کہا۔ ”فی الحال سردار پابندہ گل کے قریب بھی نہ جانا۔ وہ اپنے قتلوں سے بڑی بے دردی سے پیش آتا ہے۔ پہاڑی دتوں میں قائم اس کے نجی قید خانے سے آج تک کوئی زندہ سلامت واپس نہیں لوٹ سکا۔ اس پر اوجھا ہاتھ ڈالا تو تم بھی وہیں پہنچا دیے جاؤ گے وہاں قانون چلتا ہے نہ لا قانونیت کام آتی ہے۔ وہاں سردار پابندہ گل کی مرضی چلتی ہے۔“

”یہ سردار پابندہ گل وہی تو نہیں ہے جو سرحد کے اُس بار‘ انیم کی فضلوں کو تباہ کرنے والے‘ دس گاڑیوں اور بانوے افراد پر مشتمل ایک پورے دوسری فوجی قافلے کو اغوا کر کے پہاڑوں میں لے گیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

ڈان تھری کی سرد اور سپاٹ آنکھوں میں پل پل بار حیرت کی

سرپرست تھا۔ وہ لاکھ ڈان تھری کا جیکی دوست سی لیکن ٹی کا نمک خوار بھی تھا۔ وہ دھیلے دھالے وعدے وعدے کر کے نیٹی کاڈر مال دیتا اور غزالہ آسمان سے گر کر کھجور میں انک جاتی۔ وہ اس قدر غیر متوقع اور خطرناک صورت حال تھی کہ میرے ذہن میں فوری طور پر اس کا کوئی حل نہیں آسکا۔

”وہ میرا کام ہے۔ تم میں سے کسی کو اس بارے میں فکر نہ ہونے کی ضرورت نہیں۔“ نیٹی کاڈر نے اٹھتے ہوئے کہا اور پھر ہم سے مزید کوئی رسمی بات کیے بغیر اسی دروازے کی طرف بڑھ گیا جس سے وہ ذرا تنگ روم میں داخل ہوا تھا۔

ہم دونوں اس کے احترام میں اپنی جگہوں پر کھڑے رہ گئے۔ ڈان تھری کے اوچل ہوتے ہی ایک بیک میرے دماغ نے تیزی کے ساتھ کام کرنا شروع کر دیا۔

آگے جو کچھ ہوتا تھا، سو ہوتا تھا۔ میری سب سے پہلی ضرورت تھی کہ میں ٹیڈ لائن یا مافیا سے فوری غیر حاضری کا کوئی غیر محکوک عذر تراش کر حسیب جیوانی کو ذہنی طور پر اپنی روپوشی کے لیے آمادہ کر لوں۔ بعد میں مجھے روپوشی کی ضرورت پیش نہ آئی تو میں کسی بھی وقت ٹیڈ لائن کے دفتر پہنچ سکتا تھا۔

”ڈان نے امیر جان کے معاملے پر خاص طور سے زور دیا ہے۔“ میں نے فوری طور پر تشویش آمیز لہجہ اختیار کرتے ہوئے چیف کو اپنی راہ پر ڈالنے کی پہلی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں، یہ بات میرے ذہن میں بھی چھ رہی ہے۔“ اس نے احتیاطاً انداز میں اعتراف کیا۔ ”لیکن بی کے گلے میں ٹھنی باندھنے کی ذمہ داری ہم دونوں میں سے کون قبول کرے گا۔“

”تم چیف ہو۔“ میں نے سوچے سمجھے انداز میں اسے اکیلا۔ ”حکم دو تو ابھی اسلام آباد جانے کی تیاری شروع کر رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ دو چار روز میں اس تک رسائی کی کوئی راہ نکل ہی آئے گی۔“

”لیکن ابھی تو ڈان نے اس کے لڑکے کی فلم بھی نہیں دی ہے۔ اس کے بغیر تم کیا کر گے؟“

”ضروری نہیں ہے کہ فلم میرے پاس ہی ہو۔ ابتدا میں تو اس کا حوالہ ہی کاٹی ہو گا۔ ضرورت پیش آئی تو بعد میں فلم کی ایک نقل امیر جان کی خدمت میں بھی پیش کر دی جائے گی۔ ایسے معاملات عموماً ایک ہی جست میں حل نہیں ہوتے۔“

”ٹھیک ہے۔ تم جیسا چاہو، کر سکتے ہو۔ جب تک ڈان کراچی سے روانہ نہیں ہو جاتا، میرا خیال رہتا ضروری ہے۔ پتا نہیں کہ کب مجھے طلب کر بیٹھے۔ پھر مجھے اس سے فلم بھی لینی ہے۔ یہ ایک آدھ دن تو میں اسی مکان میں گزار دوں گا۔“

”میں اسلام آباد نکل جاؤں تو میری طرف سے فکر مند نہ ہوں۔ مناسب موقع پر میں خود تم سے فون پر رابطہ کر لوں گا۔ مجھے امید ہے کہ میں فلم سامنے لائے بغیر امیر جان کو شیشے میں اندر لں گا۔“

ایک مرتبہ پھر اپنی بات دہرانے کا موقع مل گیا۔ ”اب مجھے اپنی واپسی کے پروگرام پر نظر ثانی کرنی پڑے گی۔ میں یورپ کے بجائے مشرق بعید سے ہوتا ہوا ’لاس اینجلس‘ کے راستے شیکاگو جاؤں گا۔ مکاڈم میں جی لائیڈ کا ایک بہت پرانا آئی میں رہتا ہے۔ اس سے میری بچپن کی دوستی ہے۔ میں اس سے بات کروں گا کہ وہ تمہارے معاملے میں جی لائیڈ کو سمجھانے کی کوشش کرے۔“

ڈان تھری کی زبان سے مکاڈر اور پھر وہاں مقیم آئی مین کا ذکر سننے ہی مرادل اچھل کر حلق میں آگیا۔

اس وقت تک میں ڈان تھری سے جلد از جلد فارغ ہو کر وہاں سے نکل بھاگنے کی فکر میں تھا کہ غلطی سے مکاڈر فون کر کے غزالہ اور سلطان شاہ کے بارے میں ہونے والی پیش رفت سے واقفیت حاصل کر سوں لیکن ڈان کی زبان سے مکاڈر اور پھر شیشی کے آئی مین کا ذکر سننے ہی میرا ذہن ڈون کو تنگ فوکی طرف گیا تھا۔

اس لمحہ پھر میں شیکاگو گنگراچی اور مکاڈر کے سارے فاصلے فنا ہو کر رہ گئے تھے۔ سات سمندر پار، ایک دوسرے سے ہزاروں میل دور رہنے والے یوں ایک دوسرے کے شناسا نکلے آ رہے تھے جیسے برسوں سے ساتھ رہ رہے ہوں اور دنیا ایک مرتبہ پھر اپنے اختصار کا ثبوت دے رہی تھی۔

میرے ذہن میں دیرا، غزالہ، سلطان شاہ، کو انک فو اور ڈان وغیرہ سب ایک دوسرے میں گنڈ ہو کر رہ گئے تھے اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں ڈان کو کس طرح بات آگے بڑھانے پر آمادہ کر دوں۔

”ہو سکتا ہے کہ جی لائیڈ مکاڈر والے آئی مین کے کانوں میں میری طرف سے پہلے ہی زہر اندیل چکا ہو۔ ایسی صورت میں بات الٹی بھی پڑ سکتی ہے۔“ میں نے تیزی سے سوچتے ہوئے بات آگے بڑھانے کی کوشش کی۔

”نہیں۔“ وہ اعتماد کے ساتھ بولا۔ ”کو انک فو میرا بچپن کا ساتھی ہے۔ ہماری دوستی تمام پیشہ ورانہ مصلحتوں سے بالاتر ہے۔ چین سے رضا کارانہ جلا وطنی اختیار کرنے سے پہلے ہم دونوں کے خاندان مدبول سے، شنگھائی کے مضافات میں اکٹھے رہتے چلے آئے تھے۔ ہمارے درمیان پرانی وضع داری اب بھی برقرار ہے۔“

کو انک فو کا نام لے کر ڈان تھری نے میری رہی سہی امیدوں پر بھی پانی پھیروا دیا۔

غزالہ کی بازیابی کے سلسلے میں، دیرا کے ذریعے میرا نام کو انک فو تک پہنچ چکا تھا۔ میں خود اس کی سیکرٹری سے کئی مرتبہ بات کر چکا تھا۔ اس وقت نہ صرف غزالہ ہانگ کانگ یا مکاڈم میں چھپی ہوئی تھی بلکہ سلطان شاہ بھی وہیں جا چکنا تھا۔ ان حالات میں ڈان تھری مکاڈر بچ کر کو انک فو سے میرا ذکر چھیڑتا تو اسے بھی معلوم ہو جاتا کہ میں اس کے آقا، جی لائیڈ کے بدترین دشمنوں میں

کر ہوا ہو گئی۔ وہ حبیب حیوانی کی کار تھی جسے وہ خود چلا رہا تھا۔ اس کے برابر والی نشست پر مجھے ڈان کی ہلک نظر آتی تھی۔ میں نے گھبر کر تبدیل کر کے اپنی کار بھی آگے دوڑا دی۔ مرشد کی موجودگی نے صورت حال کو یک بیک بہت زیادہ سنسنی خیز اور اہم بنا دیا تھا۔

حملہ آوروں کی کار بہت تیزی کے ساتھ فرار ہوئی تھی لیکن ویران سڑک پر اس کا کافی مرشدی سے جیتنا آسان کام نہیں تھا۔ آگے ٹانٹا میں مرشد نے اس کار کو جالیا پھرو دونوں کاریں خالی سڑک پر برابر برابر دوڑنے لگیں میں نے اپنی کار کی رفتار غیر ارادی طور پر تیز کر دی۔

پھر اچانک ایک ہولناک دھماکا ہوا، حملہ آوروں کی کار نفا میں کئی فٹ اچھل کر ٹپک اور دھوئیں کے گولے میں تبدیل ہوئی اور دور تک لڑھکتی چلی گئی۔ مرشد سبک رفتاری کے ساتھ بہت آگے نکل چکی تھی حتیٰ کہ اس کی عقبی روٹھیاں، چلتی ہوئی کار کے دھوئیں میں معدوم ہو گئیں۔

میں نے بوکھلا کر اپنی کار قریب ترین گلی میں سمھالی۔ وہ سب جس طرح ظہور پذیر ہوا اس کی بنا پر تباہ ہونے والی کار کے دونوں سواروں میں سے کسی کا زندہ بچنا محال نظر آ رہا تھا۔ مجھے اس امر میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ ڈان نے کوئی طاقتور دستی ہم پیچک کر اس کار کو تباہ کیا تھا۔

خالی الدینی کے عالم میں کئی پُر بیج گلیوں میں گھومنے کے بعد مجھے خیال آیا کہ ڈان نے وہ سب میرے ہی لیے کیا تھا مگر مجھے حیرت تھی کہ وہ خاموشی سے میرے پیچھے کیوں آیا تھا؟

مجھے امید تھی کہ حملہ آوروں کی کار کو تباہ کرنے کے بعد ڈان کہیں اور جانے کے بجائے واپس اپنی قیام گاہ کا ہی رخ کرے گا اس لیے میں نے بھی اپنی گاڑی واپس کے راستے پر ڈال دی۔

میں نے سوچے مجھے بغیر گلیوں میں فرار کی راہ اختیار کی تھی اس لیے مجھے دوبارہ راستہ تلاش کرنے میں قدرے دشواری کا سامنا کرنا پڑا اور جب میں واپس ڈان کی قیام گاہ پر پہنچا تو پوچھ سے ذرا آگے مرشد نیم تاریکی میں پارک کی ہوئی تھی جیسے اسے کئی دنوں سے وہاں سے نہ ہٹایا گیا ہو۔

میری آمد کی اطلاع پاتے ہی حبیب حیوانی بوکھلائے ہوئے انداز میں برآمدہ میں نکل آیا۔

”تنت نہ تہ واپس کیوں آئے ہو؟“ اس نے آتے ہی خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

”یہ سب کیا ہوا تھا؟ میرے اعصاب مل کر رہ گئے ہیں۔ وہ لوگ کون تھے؟“

”وہ ملی ٹینک کے آدمی تھے جو موقع کی تلاش میں کسی تاریکی گلی میں چپے ہوئے تھے۔ میرے دو آدمی ان کی تلاش میں باہر نکل رہے تھے۔ انہوں نے جون ہی ایک کار کو ہمارے پیچھے روانہ ہونے دیکھا، وائلیس پر مجھے خردی اور ڈان نے فوراً روانہ ہونے کا

حبیب حیوانی کاٹھ کے آلو کی طرح سر ہلا کر رہ گیا اور میری ناپائیدار آسانی کے ساتھ گلو خلاصی کی راہ نکل آئی۔ میری تجویز سے اس کے فوری اتفاق کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ وہ میری موجودگی میں احساس کمتری ہو کر، دبا دبا سا رہتا تھا۔ اس نے سوچا ہو گا کہ میرے دفع ہو جانے کے بعد اسے ڈان ہماری کا خصوصی قرب حاصل رہے گا۔ اس کی بھرپور توجہ سے حبیب حیوانی کی انا کو خاصی تسکین مل سکتی تھی۔

وہ مرحلہ طے ہوتے ہی میں نے وہاں سے نکل بھاگنے کا فیصلہ کر لیا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں ڈان اندر سے دوبارہ باہر نکلا تو میرے ہر گرام سے آگاہ ہوتے ہی، اسے منسوخ کرنے کا حکم صادر کر سکتا تھا۔

میں اپنی گاڑی میں ڈان کی قیام گاہ سے روانہ ہوا تو میرے ذہن میں خیالات کا ایک طوفان برپا تھا۔ مہوہم اور بہت سے دور از کار اندیشے ہولناک صورتوں میں ابھرا بھر کر مجھے خوف زدہ کر رہے تھے۔ میں اپنے خیالات میں اس قدر منہمک تھا کہ اس گاڑی کو بھی نوٹ نہیں کر سکا جو میرے روانہ ہونے کے بعد ڈان کی قیام گاہ کے قریب ہی ایک ویران گلی سے نکل کر میرے پیچھے روانہ ہوئی تھی۔ قدرے آگے نکلنے کے بعد اس کار سے دو تین مرتبہ میرے اوپر ہینڈ گنیں کھینچی گئی تھیں لیکن میں خیال ہوا کہ وہ گاڑی مجھ سے راستہ بانگ رہی تھی اس لیے میں نے اپنی کار بائیں طرف دبا کر ویران سڑک بالکل خالی چھوڑ دی لیکن وہ گاڑی آگے نکلنے کے بجائے بدستور میرے پیچھے ہی لگی رہی اور تیز روشنی بھینکنے کا سلسلہ جاری رہا تو مجھے تشویش ہونے لگی لیکن میں اس وقت بھی اصل خطرے کا ادراک نہیں کر سکا۔ میرے ذہن میں یہی خیال آیا کہ وہ کوئی اداشاں لڑکا تھا جو بلا وجہ دوسروں کو پریشان کر کے خوش ہونے کا عادی تھا۔

لیکن جب میں ایک دھلان عبور کر کے داہنی طرف گھوم رہا تھا تو وہ کار سرعت کے ساتھ میرے پسلوں آگئی۔ میں اس کار کی اگلی نشستوں پر بس دو بیوے ہی دیکھ سکا کیوں کہ برابر میں آتے ہی گارڈ سے دو بے تین فائر ہوئے جو میری کار کی دوسری طرف کی کھڑکی کے شیشے توڑتے ہوئے گزر گئے۔

اگر میں نے اضطرابی طور پر پوری قوت سے بریک لگا کر اپنا برا سٹرک پر نہ نکالیا ہوتا تو تیز رفتار کار سے چلائی جانے والی کوئی نہ کوئی گولی میری کھوپڑی میں پھوست ہو گئی ہوتی۔

میری گاڑی رگ چکی تھی اور حملہ آور کار تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھتی چلی گئی۔ چند ثانیوں کے لیے میرا ذہن ماؤف ہو کر رہ گیا۔ میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا تھا کہ شاید ڈان نے اپنے پورے فنڈز کی مدد سے مجھے خوفزدہ کرنے یا ٹھکانے لگانے کی کوشش کی تھی۔

مگر میرا وہ بے بنیاد خیال زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکا۔ اگلے ہی لمحے، نئے ماڈل کی سیاہ مرشد غرائی ہوئی میری کار سے آگے نکل

شرکت کے بغیر لطف ادھر ہے۔

”میں وی سنتا چاہ رہا ہوں۔ تم نے بلاوجہ تو پانچویں بار فون نہیں کیا ہوگا۔“

”پہلی اطلاع تو یہ ہے کہ آپریشن سطور سینڈ کے خالق، شری مان سنگھ کو کھلے سندر میں پھینک کر ہنسنے والی کر دیا گیا تھا۔ سندر بھی زیادہ دیر تک اس پانی کی لاش کا بوجھ نہیں سہار سکتا آج دوسرے ہر ڈاکٹر پوائنٹ کی بے رحم چٹانوں میں اس کی مسخ شدہ لاش دریافت کی گئی ہے۔“

”میرے حساب سے تو وہ اسی وقت مر چکا تھا جب میں اسے تمہارے پاس چھوڑ کر آیا تھا۔ لیکن تم نے اب تک یہ نہیں بتایا کہ آپریشن سطور سینڈ کیا بلا ہے اس سے پہلے سارے سرکار بھی ان لوگوں کے ایک منصوبے کی سمیٹ چڑھ چکا ہے۔“

”یہ منصوبہ بہت خطرناک تھا۔ یہ کامیاب ہو جاتا تو ہماری حکومت سیاسی اعتبار سے بدترین دفاعی پوزیشن میں آ جاتی۔ اس کے مطابق جرائم پیشہ لوگوں کا ایک بڑا لشکر ہماری جانب سے بھارتی علاقے پر حملہ کرتا اور وہ جوابی کارروائی کے نام پر ان کو روندتے ہوئے ہمارے علاقے میں گھس آتے۔ اس لشکر میں سے پکڑے جانے والوں کو عالمی ذرائع ابلاغ کے سامنے پیش کر کے اس بات کا مدعہ حورا چکا جاتا کہ داخلی امن و امان کے لیے ہماری حکومت نے جرائم پیشہ افراد کو بھارتی علاقے پر لشکر کشی اور لوٹ مار کرنے کی ترغیب دی ہے۔ اس بارے میں ان کے سرغٹوں سے حسب مرضی اقبالی بیانات دلوائے جاسکتے تھے۔“

”آج کے ترقی یافتہ دور میں کون اس جھوٹے الزام کو مانے آج کل تو پیشہ ور فوجوں میں بھی مہارت اور فنی برتری کا ہی مقابلہ ہوتا ہے۔ قبائلی دور کی لشکر کشی سے ملک فتح کرنے کے زمانے لہ پکے ہیں۔ ایسی کوشش کو کھلی خودکشی کے علاوہ اور کوئی نام نہیں دیا جائے گا۔“

”امن و امان کی اندرونی صورت حال خراب ہو تو ایسے مضحکہ خیز الزامات بھی قرن قیاس بن جاتے ہیں۔ شری مان سنگھ کی موت کے بعد یہ باب خود بخود بند ہو جائے گا۔“

”تم نے ابھی تک اگلی خوش خبری کا ذکر نہیں کیا۔“ میں نے اسے یاد دلایا۔

”دیرا کے بارے میں اس سال کی سب سے بڑی خوش خبری ملی ہے۔“ آخر کار وہ وفور جوش سے پھٹ ہی پڑا ”اس مرد کی ہڈی نے جو کما تھا، وہ پورا کر دکھایا ہے۔“

”مرد کی نہیں، وہ خود کو جی لائیڈ کی بیٹی کہتی ہے۔ اب چپ کیوں ہو گئے؟ جلدی بات پوی کرو!“

”اہم ایسی آلات اور ساز و سامان لانے والا، ایرانی طاقت ہماری سرحدوں میں داخل ہو چکا ہے۔ راستے میں صرف ایک ٹرک ہولناک دھماکے میں تباہ ہوا ہے۔ اس پر وہی بیٹا ایکس پیٹرنڈا

فیصلہ کر لیا۔ تمہارا مقدر اچھا تھا کہ تم ان کی اندھا دھند فائرنگ سے بچ گئے لیکن وہ ڈان کے آہنی چنگل سے نہیں بچ سکے۔ اس بھاگ دوڑ کے نتیجے میں وہ تینوں ہی جہنم واصل ہو گئے۔ یہ دو جھگڑے نہ مارے جاتے تو شکست کا احساس میرے ذہن پر کچھ کے لگا تا رہتا۔“

”میں اپنی اس خبر گیری پر ڈان کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔“ میں نے ممنونیت سے کہا۔

”تم جلد از جلد اس علاقے سے دور نکل جاؤ۔ یہ شکر ہے و ذکر یہ میں پچھا دوں گا۔ تم بچ گئے ہو لیکن تمہاری کار پر گولیوں کے نشانات ضرور آئے ہوں گے۔ تمہاری دیر میں ہر طرف پولیس پھیل جائے گی اور تم دشواریوں میں پڑ جاؤ گے۔ اب جاؤ اور ڈان کو لباس تبدیل کر کے آرام کرنے دو۔“

”میں ڈان کے ساتھ تمہارا بھی ممنون ہوں کہ مجھ پر حملہ آور ہونے والوں کو سختی سے پکڑ دیا گیا۔ ہو سکتا تھا کہ وہ آگے نکلنے کے بعد دوبارہ میری طرف پلٹ پڑتے۔“ میں نے صدق دل سے کہا۔

”اب جاؤ!“ اس نے میرے بازو تھام کر مجھے تھمادیا ”ذکر کرو گے تو پھنس جاؤ گے اور پولیس والوں سے میں تو کیا ڈان بھی نہیں بچا سکے گا۔“

میں خاموشی سے اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔



میں فلیٹ کے دروازہ پر پہنچا تو اندر فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ میں نے بھٹی قفل کھولنے میں خاصی پھرتی سے کام لیا لیکن جب تک میں اندر پہنچا فون کی گھنٹی تھک کر خاموش ہو چکی تھی۔

نہ جانے وہ کس کا فون تھا اور کب سے گھنٹی بج رہی تھی؟ اس بھاگ دوڑ میں میری بھوک خاصی چمک اٹھی تھی۔ اس لیے میں نے ریفریجریٹر میں سے خورد نوش کی کچھ اشیائیں نکالیں اور فون کے قریب ہی بیٹھ کر کھانا کھانے میں مصروف ہو گیا۔

گیارہ بجے کے قریب دوبارہ فون کی گھنٹی بجی تو میں کھانے سے فارغ ہو کر صوفے پر سستا رہا تھا۔ میں نے پہلی ہی گھنٹی پر ریسور اٹھایا تو دوسری طرف سے ظفر کی آواز سنائی دی۔

”تم کہاں غائب تھے؟ شام سے یہ میری پانچویں فون کال ہے۔“ اس نے تیزی سے پوچھا تھا۔

”کیلا آوی کوچہ نور دی کے علاوہ اور کیا کر سکتا ہے؟ بس شہر کی سڑکیں تپا پھر رہا تھا۔“

ریسیور پر اس کے جاندار قبضے کی آواز ابھری، پھر وہ بولا ”آج کل تو تم واقعی اکیلے ہو گئے ہو، غزال کے بعد دیر اور پھر سلطان شاہ بھی ہمیں داغ مفارقت دے گیا۔ اس کی کیا خبر ہے؟“

”کچھ بھی نہیں۔ ابھی تک انتظار ہو رہا ہے۔“ میں نے اداس لہجے میں کہا۔

”لیکن میرے پاس کچھ خوش خبریاں ہیں جن میں تمہاری

ہونے سے پہلے، زمین یہ سب نگل چکی ہوگی۔ زلزلوں پر سے دھوپ بکھل مٹھیں اور آلات ان ہی زیر زمین گوداموں میں اتارے جائیں گے اور ابراہیم زلزلہ خالی ہونے کے ساتھ ہی کے بعد دیگرے واپس لوٹنے چلے جائیں گے۔ کچھ دن گزر جانے کے بعد اس تمام سازو سامان کو اکاؤڈا زلزلوں کے ذریعے خاموشی کے ساتھ منزل مقصود پر پہنچا دیا جائے گا۔ کسی کو کانوں کان بھی علم نہیں ہو سکے گا کہ پاکستان میں داخل ہونے کے بعد یہ زبردست کھپ کہاں غائب ہو گئی۔

”یہ واقعی مناسب بندوبست معلوم ہوتا ہے۔“ میں نے اطمینان کا سانس لے کر کہا ”لیکن بلیو کراس ذیل کے لیے تو یہ ساری تیاریاں پہلے سے مکمل ہو جانی چاہیے تھیں۔ اب بھاگ دوڑ کیوں ہو رہی ہے؟“

”سچ بات یہ ہے کہ ابراہیم کی طرح ہمارے بعض اعلیٰ حکام بھی بلیو کراس ذیل کی تباہی کے خطرے کو خیال طرازی یا افواہ سے زیادہ اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ یہ سب دشتِ لوت میں ٹرک اور ٹریلر کی تباہی کے بعد ہوا ہے۔ اس واقعے نے ہر طرف کھلبلی مچا دی ہے۔“

”سب کچھ اسی طرح پایہ تکمیل کو پہنچ گیا، جس طرح تم سوچ رہے ہو تو بہت بڑا کام ہو گا۔ جو لوگ خلائی اشاروں سے پہنچنے والے حساس ہتھیاروں سے کام لینے کے اہل ہیں، وہ بڑے پیمانے پر ہونے والی زلزلہ نقل و حرکت کا بھی سراغ لگا سکتے ہیں۔ ان سے تو کچھ بھی نہیں چھپایا جاسکے گا۔“

”اپنی سائنسی برتری کے سارے وہ بہت کچھ کر سکتے ہیں لیکن پھر بھی سب کچھ کر گزرتا ان کے بس سے بھی باہر ہے۔ جب تک اس علاقے پر مستقل طور پر ایک مصنوعی سیارہ مطلق نہ ہو، وہ چوبیس گھنٹے ہر چیز کی نگرانی نہیں کر سکتے۔ ہمارے ذمے دار اپنی بساط کے مطابق سب کچھ کر رہے ہیں۔ اللہ کی مرضی ہے۔ ہمیں بہترین نتائج کی توقع رکھنی چاہیے۔ صبح ہونے تک پوری صورتِ حال واضح ہو چکی ہوگی۔“

اس وقت میرے ذہن میں بہت تیزی کے ساتھ ’چوکنڈی کے قدیم اور تاریخی قبرستان کے کھنڈرات کے قریب شی کے ڈی ڈی یا ولدہ آغا کے ساتھ ہونے والی جاں مسل جدوجہد ابھر آئی۔ ڈی ڈی‘ اپنے دوست اور شریک کار اسرار رضوی کی مدد سے مجھے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت چوکنڈی کے علاقہ میں لے گیا تھا کیونکہ ان دنوں چوکنڈی کے اطراف میں پھیلا ہوا وسیع و عریض علاقہ خلا میں موجود سیارچے کی زد میں تھا۔ وہاں جو کچھ بھی کھیل کھیلایا گیا وہ اس سیارچے کی حساس آنکھوں کے ذریعے ہزاروں میل دور من و عن دیکھا گیا اور پھر جی لائینڈ نے ان چشم دید واقعات کی بنیاد پر آٹا فائٹس اپنے اگلے فیصلے صادر کر دیے جن میں وزیر اکراچی بھجکا جانا سرفرست تھا۔

ہوا تھا۔ جس کا ذکر ویرانے کیا تھا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ جدید ترین ’خلائی کنٹالوجی کے سارے لائی جانے والی اس تباہی میں کسی آدمی کی تکسیر تک نہیں بھولی۔ یہ ویرا کا ایک لازوال کارنامہ ہے۔“

”یہ خبر کب اور کیسے ملی؟ کیا ویرا لوٹ آئی ہے؟“ میں نے بے تابی کے ساتھ سوال کیا۔

”وہ ٹرک دشتِ لوت میں نصرت آباد کے قریب چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس پر ہونے والا دھماکا اس قدر شدید تھا کہ ڈیڑھ انچ موٹی آہنی چادر ریزہ ریزہ ہو کر ٹیکڑوں میں ریزہ ریزہ ٹک بکھیل گئی۔ ٹرک اور زلزلہ کسی نازک کھلونے کی طرح تباہ ہو گئے۔ دھماکے کے وقت وہ زلزلہ کارواں کے ساتھ ہوتا تو دنیا کی کوئی طاقت اس کھپ کو مکمل تباہی سے نہیں بچا سکتی تھی۔ دھماکے کی آواز میلوں دور تک سنی گئی تھی۔ یہ کمائی ہماری سرحد میں پہنچنے والے کارواں کے عملے نے سنا ہی ہے اور ایرانی فضائیہ نے اس تباہی کی تصدیق کی ہے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ ان لوگوں کو کبھی ادھوری تباہی کا علم ہو گیا ہو گا۔ وہ جھلکار تباہی کھپ پر کوئی بہت بڑا فضائی حملہ بھی کر سکتے ہیں۔“ میں نے تشویش ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

”اب شاید کچھ نہیں ہو سکتا۔ زمین پر وہ کارواں کمانڈوز اور انٹر سوزائیکلی جس کے محاصرے میں ہے۔ فضا میں لڑا کا گیاروں کی مسلسل پروازیں جاری ہیں۔ کارواں کی نقل و حرکت خفیہ رکھی جا رہی ہے۔ جب ہماری طرف سے تخریب کاری کا امکان ظاہر کیا گیا تو ایرانی حکام کو ہمارے اندیشوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ شہنشاہ کے دوستانہ دور میں دی جانے والی امداد میں کوئی ہولناک گھٹلا کیا گیا ہو گا۔ اب ان کی بھی آنکھیں کھل گئی ہیں۔“

”لیکن ابھی بھی بلوچستان کی سرحد سے ہنڈی یا کونہ تک کا طویل سفر باقی ہے۔“ ویرا کی سنائی ہوئی لرزہ خیز کمائی کے درست ہونے کی اطلاع سننے ہی میرا دل انجانے اندیشوں سے لرزنے لگا تھا۔

”ہنگامی طور پر یہ سفر مختصر کر دیا گیا ہے۔“ شاید غیر ارادی طور پر ظفر کی آواز دھیمی اور رازدارانہ ہو گئی ”اس معاملے میں شروع سے اب تک، تمہارا کردار ناقابلِ فراموش رہا ہے اس لیے میں تمہاری جذباتی شکست کو سمجھ رہا ہوں۔ اسی لیے زبان کھول رہا ہوں کہ تم اب فکر نہ کرو۔ ماہرین ہنگامی بنیادوں پر صورتِ حال کو سنبھال رہے ہیں۔“

”مگر کیسے؟ زلزلوں کا وہ لشکر جہاں بھی رکے گا، تماشا بین جانے گا۔“ میں نے کہا۔

”گوئو گے قرب و جوار میں کنکرت کے بنے ہوئے‘ زیر زمین امیونیشن ڈسپ خالی کرائے جا رہے ہیں‘ جدید ترین کرینیں اور فورک لفٹ ٹرک تیزی سے وہاں پہنچائے جا رہے ہیں۔ صبح کا اُجالا

”خدا کے لیے“ دیرانے کے سامنے تعریفوں کے ہمارے نہ کھیل بیٹھنا۔ وہ رہے سے کام سے بھی جاتی رہے گی۔ ”میں نے بول کھاکر کہا ”تعریفوں کے بغیر ہی اس کا داغ ساتویں آسمان پر رہتا ہے۔“

”تمہارا موڈ تو اِدھر چلے آؤ۔“ اس نے جوالی ہنسی کے ساتھ کہا ”آج تمہارے ساتھ باتیں کرنے کو طبیعت چاہ رہی ہے۔“

”ضرور چلا آتا، لیکن طویل آوارہ گردی نے تھکا دیا ہے۔ اس کے علاوہ میں شخص میں بھی لگا ہوا ہوں۔ راستے میں کسی پولیس والے نے روک کر منہ سوکھ لیا تو مشکل کھڑی ہو جائے گی۔“

”میں آج تک یہ کھجے میں کامیاب نہیں ہو سکا کہ لوگ شراب کیوں پیتے ہیں۔ امتناع سے پہلے ہر میس میں بھی یہی سب ہو آ رہتا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ عقل و خرد سے بیگانہ ہو کر“

”آئی تو میں اتنی نہیں چٹاکہ عقل و خرد سے ہاتھ دھو
دوم یہ کہ میں اپنی اس بری عادت کی کوئی بھی تائید دینی
چاہتا ہوں، نہ اس کا دفاع کرتا پسند کرتا ہوں۔ یہ ایک بری عادت
ہے اور میں اس میں گرفتار ہوں۔ تم دعا کرو کہ مجھے اس سے چھٹکارہ
مل جائے۔“

”میں دعا کروں؟“ اس کی تھیرتھیر آواز ابھری ”تم کوشش نہیں کرو گے؟“

”سوچ جھٹلے کے ساتھ ہی میری مزاحمانہ کوششیں دم توڑ جاتی ہیں۔“ میں نے بے بسی کا اعتراف کیا ”اسی لیے تم سے دعا کا مطالبہ کر رہا ہوں۔“

”دراصل میں رجنی کے بارے میں بات کرنی چاہ رہا تھا۔“
مذہبے توقف کے بعد اس نے اچانک ہی موضوع بدل دیا ”شری
ان حکم کے جنم واصل ہونے کے بعد ہمارے لیے اس کا کیا
صرف ہو گیا ہے؟“

”نی الحال اسے رہا کرنے کی غلطی بھی نہ کریا۔“ میں نے بولکھا
 کرکھا ”شری مان کی موت کا واقعہ تازہ ہے۔ رجنی کی رہائی سے اس
 معاملے میں منت بنے پہلو نکل آئیں گے اس کے بیانات صورت
 حال کو یاد دکر رکھ دیں گے جب شری مان حکم کا معاملہ ٹھنڈا
 جائے تو اسے ملک سے باہر بھجوا کر آزاد کر دینا۔ وہ لاکھ شہر چائی

لیکن اس نازک موقع پر، میں نے ماضی کے ان تجربات کو بدھٹھوئی سمجھتے ہوئے، ان کا ذکر ہی گول کر دیا۔ وہ لحاظ ایسے تھے کہ آدمی ہر طرف سے بے بس ہو کر بس دعا دے گا اور معجزوں پر انحصار کرنے لگتا ہے۔ اس وقت میرا دواں دواں یہ دعا مانگ رہا تھا کہ کاش ایرانی کارواں کی باقی ماندہ گزرگاہ کسی جاہل و غلامی سیارہ کی زد میں نہ آئی ہوئی ہو، کیونکہ اسی ایک نکتے پر ہر چیز کی سلامتی کا دواں رہا تھا۔

”میں دست بردار ہوں گا۔“ میں نے آہستگی سے کہا۔
 ”بیرا خیال کہ اس معاملے میں، میری اور تمہاری فکر مندی
 سب سے زیادہ ہے کیونکہ ہمیں علم ہے کہ ہم کن لوگوں سے مقابلہ
 کر رہے ہیں۔ دوسروں کے لیے متوقع خطرات کا ادراک کرنا ہی
 ناممکن ہے۔ بلکہ اس ڈیل کے بعض ذمے داروں نے کارواں اپنی
 سرحد میں پہنچنے پر باقاعدہ جشن منایا ہے۔ ان کے خیالات میں سب
 کچھ منٹ چکا ہے اور اب ٹرکوں کو ایک مقررہ مقام پر لے جا کر خالی
 کرنا باقی نہ رہ گیا تھا۔ اگر دشتِ لوت کے دھماکے نے سنسنی اور
 افزائری نہ پھیلائی ہوتی تو بہت پیچیدہ صورتِ حال سامنے آسکتی
 تھی۔“

”اب اس معاملے پر مزید مغز زنی بے سود ہے“ میں نے ہنستے ہوئے کہا ”یہ بتاؤ کہ ویرا کی کیا خبر ہے؟“

”میرے دل میں اس کی قدر و منزلت ایک بیک بڑھ گئی ہے میں تم سے شروع سے کہہ ہوں کہ بظاہر وہ بہت گندی اور بگڑی ہوئی نظر آتی ہے لیکن اس کے اندر ایک اچھی لڑکی موجود ہے۔ ابھی تک اس کے بارے میں کہیں سے کوئی اطلاع نہیں ملی۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ دشتِ لوت میں روکے جانے والے ٹریڈر کا قصہ اس کے منطقی انجام تک پہنچانے کے لیے پیچھے رہ گئی ہوگی اور کل پرسوں تک وہاں لوٹ آئے گی۔“

”اس کے بارے میں تمہارے ارادے مجھے اب بھی واضع نہیں ہوئے۔“

”میں کلے ذہن کا آدمی ہوں۔“ اس کی سنجیدہ آواز ابھری۔
ایسا ہو بھی تو کون سا میرا ہے۔ دنیا میں اس سے زیادہ بری عورتوں
بھی میرا رہے۔ وہ سب پوری عمر کی کٹی ہوئی چنگ کی طرح نہیں
بلکرائی رہیں۔ درمیانی عمر کو پہنچنے سے پہلے ہر عورت، شہت کے
ساتھ اپنا گھر بنانے کی آرزو کرتی تھی ہے اور عموماً یہ آرزو پوری
جاتی ہے۔ اگر دیر ابھی سنجیدہ ہو جاتی ہے تو اس میں کیا برائی ہے؟
صرف لیے تو اب وہ ایک ہیرو کا درجہ حاصل کر چکی ہے۔ ہم لوگ
بچے محسنوں کے بارے میں حد درجہ جذباتی ہوتے ہیں۔
”ہم لوگوں سے تمہاری کیا مراد ہے۔ سارے پاکستانی تو ایسے

عام آدمی نہیں، جب کہ میں ایک معمولی سا انسان تھا۔ میں اپنی چھوٹی چھوٹی خواہشات اور آرزوؤں کے حصول میں شب و روز سرگرداں رہنے کا عادی ہو گیا تھا۔ اور اسی وجہ سے ہر وقت غم، تشویش، غم اور اضطراب میں گھرا رہتا تھا۔

اس وقت دیرا کا کہیں پتا نہیں تھا، غزالہ ہانگ ہانگ یا غائب مکاؤ میں پھنسی ہوئی تھی، میرا دل اس کا طلب گار تھا اور میں اس کی طرف سے بہت زیادہ غورمند تھا۔

میں نے اپنی رست و راج پر نگاہ ڈالی تو وہ چند منٹ بعد رات کے بارہ بجانے والی تھی۔ اس اعتبار سے ہانگ ہانگ اور مکاؤ میں صبح کے چار بجے کا عمل ہونا چاہیے تھا۔ وہ ایسا وقت تھا جب نیند کا غمار گرا ہوتے ہوئے اپنی انتہا کو پہنچا ہوا ہوتا ہے اور بے خوابی کے دائمی مریض بھی چند گھنٹی کو سو لیتے ہیں۔ میں نے ایسے نامناسب وقت پر فون کرنے کا ارادہ ملتای کر دیا۔

ڈون کو ایک فونی غیر حاضری میں اس کا عملہ شاید رات کے مخصوص اوقات میں آرام کرنے کے لیے فون بوڑ بند کر دیتا تھا۔ ڈون کی موجودگی میں ایسا ہونے کا امکان نہیں تھا لیکن پھر بھی اونگھتے ہوئے کسی فرد سے خوش دلی کی امید نہیں کی جاسکتی تھی جب کہ غزالہ کا کھوج لگانے کے لیے مجھے دوسری جانب والوں کے بھرپور تعاون کی ضرورت تھی۔ اس کے بغیر مجھے غزالہ کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں مل سکتی تھی۔

میں نے بستر پر دراز ہو کر دو تین گھنٹے تک سونے کی بہت کوششیں کیں لیکن ہلکے ہلکے جھپکاتے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اعلیٰ قسم کی اسکاچ کا بخار بھی نیند کی حسین دہلی کو رام کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ میں اپنے ارد گرد کے حالات کے بارے میں سوچتا ہوا مسلسل سکریشیں بھونکتا رہا۔ اسی بے آرا می میں دو بج گئے اور میں نے آتا کر بستر چھوڑ دیا۔

نیم گرم پانی کی تیز دھاروں میں غسل کرنے اور پھر تیز کانی کا ایک کپ معدے میں شعل کرنے کے بعد میں فون پر آگیا۔ اس وقت پونے تین بج رہے تھے۔ باہر گرے سائے کا راج تھا لیکن مکاؤ میں یقیناً رات کا محرم چٹکا تھا۔

نمبر لٹنے کے بعد ڈون کو ایک فون کے محل کے امتحانہ احتیاطی نظام سے گزرنے کے بعد جب ریسیور پر ڈون کی بیکہ بھری کی تروا تازہ اور شناسا آواز سنائی دی تو میں نے سکون کا سانس لیا۔

”تم ڈینی ہی بولی رہے ہو نا؟“ اس نے اپنے ساؤنڈ اسکینر پر میری آواز پہچان لی تھی۔

”ہاں! میں نے پچھلے تین چار گھنٹے کرناک انتظار میں گزارے ہیں۔ مجھے اپنی تشویش سے کہیں زیادہ تمہاری نیند عزیز تھی۔“ میں نے اس کا موڈ خوشوار رکھنے کی نیت سے کہا۔

”میں ساری رات فون پر موجود تھی۔“ اس کے بے پردہ پانہ

رہے لیکن یہ ثابت نہیں کر سکتے گی کہ اسے پاکستان میں قید رکھا گیا تھا۔

”بعض اوقات تم واقعی بہت دور کی کوڑی لاتے ہو!“ وہ بے اختیار کہہ اٹھا۔

اس سے دوسرا دوسری باتیں کر کے، میں نے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں نے اس سے ذکر نہیں کیا تھا لیکن مجھے یاد تھا کہ دیرانے روانگی سے پہلے یہ امکان ظاہر کیا تھا کہ اسے ہدایت ملی تو وہ ایران میں اپنا مشن سرانجام دینے کے بعد، وہیں سے امریکا یا کسی اور منزل کی طرف نکل جائے گی۔ ایران سے اس کی پاکستان واپسی کا امکان خاصا سوہم تھا۔

دوسری طرف، مافیا کے ڈان قمری نے اپنے اگلے پروگرام کا ذکر کر کے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ مجھے اپنی بہت زیادہ فکر نہیں تھی۔ میں نیشی کا ڈور کو ایک فونی ملاقات سے پیدا ہونے والے اثرات کا بخوبی مقابلہ کر سکتا تھا۔ میرے لیے اہم ترین بات یہ تھی کہ نیشی کا ڈور کے مکاؤ پہنچنے سے پہلے غزالہ وہاں سے نکل آئے۔ اگر وہ نیشی کا ڈور کے پہنچنے تک مکاؤ ہی میں پھنسی رہتی تو اس کے لیے خاصی پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی تھیں۔

اس معاملے میں دیرا کی ذات بہت اہم ثابت ہو سکتی تھی۔ وہ کو ایک فون مڈ بولی جی تھی اور ضد کر کے بھی اس سے اپنی بات منوانے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ اگر سلطان شاہ کی کوششوں کے نتیجے میں، غزالہ کو ایک فون پر اپنے اعتماد کا اظہار کر چکی تھی تو دیرا کی مجلس ایک فون کال پر اسے مکاؤ سے روانہ کیا جاسکتا تھا۔

دیرا ایران میں اپنا کام، بحسن و خوبی عمل کر چکی تھی۔ شی والوں نے اسے ہتھیاروں کی کھپ میں نصب، تباہ کن ڈیوائس کو متحرک کرنے کا کام سونپا تھا جو اس نے پورا کر دیا تھا۔ ہم نے اس سے ایک ٹرک کے علاوہ باقی آلات اور ساز و سامان کو بچانے کا مطالبہ کیا تھا۔ دیرانے ہماری خواہش بھی پوری کر دی تھی۔ اس سرے پر میں اپنی اس خواہش پر قابو نہیں رکھ سکا تھا کہ دیرا ایران سے فارغ ہو کر کراچی چلی آئے۔

وہ کراچی آجاتی تو اس کے ذریعے نیشی کا ڈور کو ایک فون اور غزالہ کی الجھن ہوئی تھی بہت آسانی اور خوش اسلوبی کے ساتھ سلجھ سکتی تھی لیکن انسان صرف خواہش ہی کر سکتا ہے۔ ان کا پورا ہونا نہ ہونا کاتب تقدیر کے اختیار میں ہوتا ہے۔ انسان کی خواہش اور کاتب تقدیر کی رضا کے درمیان پائے جانے والے فرق حق کو حسرت کہا جاتا ہے اور ان حسرتوں سے مدد سے اور غم جنم لیتے ہیں۔ زندگی کے غموں سے بس وہی لوگ بے نیاز رہتے ہیں جو اپنی خواہشات کو بالکل فنا کر کے، اپنی زندگی کاتب تقدیر کے کھلے کے مطابق ڈھال لیتے ہیں۔ اس کی رضا کے آگے سرعہ کار اپنے نفس فراموش کرنے والے دلی، قطب اور ابدال تو ہو سکتے ہیں لیکن ایک

میرے لیے وہ امکان بہت لرزہ خیز تھا۔

مجھے شبہ ہوا کہ کس ذہن تھری اپنے پروگرام کے سلسلے میں کو ایک فو کو فون نہ کر بیٹھا ہو۔ اگر اس نے میرے بارے میں کو ایک فو کو کوئی اشارہ بھی دے دیا تھا تو وہ میری طرف سے بھڑک سکتا تھا۔ شاید اسی وجہ سے اس نے اپنی سیکرٹری کو مجھ سے مکمل کلی باتیں کرنے سے روک دیا تھا۔

اس بدترین امکان کو اپنے ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے نہایت محتاط لہجے میں کہا ”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ مجھے ذہن کی نقل و حرکت کے بارے میں اس قدر تجسس ہونے کا کوئی حق نہیں ہے۔ البتہ میں غزالہ اور اپنے ساتھی کے بارے میں بہت بے چین ہوں۔ وہ دونوں کہاں اور کس حال میں ہیں؟“

”اب تم نے کچھ قاعدے کی بات کی ہے“ میرا بیٹنزا کارگر ثابت ہوا ”ان دونوں کے بارے میں تم سے کوئی بات نہیں کی جائے گی۔ ذہن کی منہ بولی بنی فون کرے گی تو وہ خود اس سے بات کرے گا۔“

”لیکن اس سے پہلے تم مجھ سے بات کرتی رہی ہو۔ ذہن کی منہ بولی بنی خود مجھے اختیار دے کر مہنی تھی۔ تمہیں معلوم ہے کہ وہ کسی لیے سنہرے نگلی ہوئی ہے۔ میں اب اسے کہاں سے پیدا کروں۔“

”اس کی واپسی کا انتظار کرو! یہ تمہارا مسئلہ ہے جو ہم میں سے کسی نے پیدا نہیں کیا۔“ اس نے نکاسا جواب دے دیا ”لیکن میں تمہیں اتنا ضرور بتا دوں کہ اس لڑکی نے ذہن کی جو توہین اور تذلیل کرائی ہے اس پر وہ بہت زیادہ مشتعل ہے۔ اسے اس بات کا بھی دکھ ہے کہ بات بڑ جانے کے باوجود اس کی منہ بولی بنی نے ہانگ کاٹک پتختی کی زحمت نہیں کی اور اپنے کسی آدمی کو بھیج دیا۔ دن رات اپنے محل میں بسر کرنے والا ذہن دیر کے ایک اشارے پر مکاؤ سے ہانگ کاٹک کے لیے چل پڑا تھا لیکن دیر کا جوابی رویہ واپس کن تھا۔ اب وہ خود دیر سے ہی بات صاف کرے گا۔“

اس کی وہ کہانی سن کر میری جان میں جان آنی۔ مکاؤ والوں کی سردمہری میں نیٹھی کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ وہ خالص پروگرام فو کی انا کا معاملہ تھا۔ اس کی دانست میں غزالہ نے اس کی مٹی پلید کرائی پھر جب وہ پولیس کے رننے میں آگیا تو دیر نے مرکز اس کی خبر نہیں لی۔ وہ دیر سے ناراض تھا اور دل کھول کر اس کی گوشائی کیے بغیر، غزالہ یا سلطان شاہ کے بارے میں کسی سے کوئی بات کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔

اس کہانی سے یہ پتا نہیں چلتا تھا کہ غزالہ اور سلطان شاہ کا کیا مشر ہوا تھا لیکن وہ صورت حال برا اعتبار سے قابل فہم تھی جس کا کوئی نہ کوئی توڑ نکالا جاسکتا تھا۔

”ذہن کا غصہ اپنی جگہ بجائے لیکن تمہیں معلوم ہے کہ دیر سنہرے نگلی ہوئی ہے۔ وہ ہانگ کاٹک کیسے پہنچ سکتی تھی۔ اس کے تو فرشتوں کو بھی علم نہیں کہ غزالہ نے ذہن کی تحویل میں جانے سے انکار کر کے اسے مشکل میں ڈال دیا تھا۔“ میں نے قدرے توقف

جواب نے مجھے حیران کر دیا ”ذہن کی غیر حاضری میں میں نے ایک دو مرتبہ رات کو فون بند کر دیا تھا۔ اس کی موجودگی میں تو ایک لمحے کے لیے بھی فون بند کرنے کا تصور نہیں کیا جاسکتا کیونکہ وہ اپنے محل سے شاذ و نادر ہی باہر نکلتا ہے اور سارے کام فون پر سرانجام دیتا ہے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ ذہن واپس مکاؤ آچکا ہے؟“ میں نے مسرت آمیز حیرت کے ساتھ سوال کیا۔

”میری کسی بات کا کوئی مطلب نکالنے کی کوشش نہ کرو۔ میں نے تمہیں ایک عام سی بات بتائی ہے۔“ اس نے تیز لہجے میں فوراً ہی میری بات کی تصحیح کرتے ہوئے کہا۔

”چلو تو اب مجھے بتا دو کہ ہانگ کاٹک کی کیا خبریں ہیں؟ میرا آدمی کہاں ہے؟“

”مجھے افسوس ہے کہ مجھے اس بارے میں تم سے کوئی بات کرنے کی اجازت نہیں ہے۔“ اس کی آواز میں اچانک ہی سرد مہری اور بے رحمی پیدا ہو گئی۔

”کیا یہ ذہن کی ہدایت ہے؟“ میں نے بے اعتباری کے ساتھ سوال کیا۔

”اس کے محل کے ملازمین صرف اسی کے احکام کی پابندی کرتے ہیں۔ دوسروں کو اس انتظام میں دخل انداز ہونے کی کوئی اجازت نہیں ہے۔“ اس کی آواز میں بے اعتنائی برقرار تھی۔

”یعنی ذہن اپنے محل میں واپس آچکا ہے؟ تب ہی تو اس نے تمہیں ہدایت دی ہوگی؟“

”قطعی ضروری نہیں“ اس مرتبہ اس کی آواز میں رکھائی کے ساتھ سختی بنی عود کر آئی ”وہ قیدی نہیں تھا۔ اپنے ہوٹل کے کمرے میں محصور تھا۔ وہ جب چاہتا وہاں سے اپنے محل فون کر سکتا تھا۔“ سینتالیس سالہ، چھٹی لڑکی کے اس رویے نے مجھے بیجان اور سنسنی میں مبتلا کر دیا۔ اس کا انداز بالکل ہی بدلا ہوا تھا۔ پہلے وہ مجھے پیل پیل کی خبر دے رہی تھی اور اب یہ تک بتانے کی روادار نہیں تھی کہ کو ایک فو اس وقت کہاں تھا۔

اس نے اپنے آخری فقروں میں کو ایک فو کی ہوٹل میں نظر بندی کے بارے میں ماضی کا مینڈ استعمال کیا تھا جس کا مطلب تھا کہ ذہن کو اس نا پسندیدہ حصار سے نجات مل چکی تھی۔ وہ اس قدر کامل الوجود آدمی تھا کہ پولیس کا محاصرہ ختم ہونے کے بعد اپنے پریش محل کے علاوہ کہیں اور جانے کی بہت ہی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ یقینی طور پر اپنے محل میں واپس آچکا تھا لیکن کسی مصلحت کی وجہ سے وہ خبر مجھ سے چھپائی جا رہی تھی۔ اس عورت کے خشک رویے کے پیش نظر میں نے اس سے بحث کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ میں اس سے ماضی کے مینڈ کا ذکر کرتا تو وہ چڑکرات کر بات کرنے سے بھی انکار کر سکتی تھی۔

اسی لمحے میرے ذہن میں اچانک ایک ہولناک دھماکا ہوا اور مجھے اپنی آنکھوں میں گرہیں سی پڑتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔

نازک پھول کو اگر تم دمل میں ڈال دو تو دملی بخارات سے وہ چند ہی سیکنڈ میں کھلا جائے گا۔ حوالات میں پائے جانے والے حشرات الارض نے اس کو تیار اور زخمی کر دیا ہو گا۔ اگر فوری طور پر اس کی خبر گیری نہیں کی گئی تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اسے دوبارہ زندہ نہیں کر سکے گی۔ تم صرف ایک بار ڈون سے میری بات کراؤ!"

"میں ڈون سے تمہاری بات نہیں کر سکتی" اس کے لیے میں مکمل بے اعتنائی کی جگہ بلکی سی زری پیدا ہو گئی "لیکن میں تمہیں اتنا یقین دلا سکتی ہوں کہ وہ بالکل صحت مند اور تروتازہ ہے۔ اس کے بارے میں تمہارے تفکرات بالکل بے بنیاد اور بے سود ہیں۔" "اسی یقین دہانی پر میں تمہارا شکر گزار ہوں۔" میں نے دل ہی دل میں "وہ مارا" کا خوں لگا کر وہاں انداز میں کہا "لیکن مجھ پر رحم کھا کر یہ بھی بتا دو کہ تم نے اسے کب اور کہاں دیکھا ہے؟" میرا وہ سوال قطعی خیر ضروری تھا۔ وہ عورت اپنے فرائض منصبی کے سلسلے میں شب و روز ڈون کے محل میں ہی رہتی تھی اس لیے یقینی بات تھی کہ اس نے غزالہ کو بھی وہیں دیکھا ہو گا لیکن میں اپنے دل و دماغ پر سے بوجھ ہٹنے کے بعد "اسے پوری طرح مجھنے پر قی کیا تھا۔"

"اب میرے لیے دشواریاں پیدا کرنے کی کوشش مت کرو!" اس کی آواز میں غفلت آگئی "میں نے جو کچھ بتایا ہے، وہ تمہارے سکون کے لیے کافی ہونا چاہیے۔"

"لیکن اس کی واپسی کے لیے میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟" میں نے ایک بار پھر اضطرابی لب و لہجہ اختیار کر کے ہونے فریاد کے انداز میں کہا "وہ کب تک اس طرح در بدر کی ٹھوکریں کھاتی رہے گی؟"

"اس کی واپسی کے لیے تمہیں دیرا کو تلاش کرنا پڑے گا۔ ڈون تم سے ہرگز بات نہیں کرے گا۔"

"میں دیرا اور غزالہ کی غلطیوں پر اس کے جبر پکڑ کر معافی مانگنے کے لیے تیار ہوں۔" میں نے پورے خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ اپنے ارادے کا اظہار کیا "لیکن میں دیرا کو کہاں سے لاؤں؟"

"فون پر کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔" اس نے اکتائے ہوئے انداز میں اپنا فیصلہ صادر کر دیا "اگر دیرا سے رابطہ ہوتا تو اسے قدر دشاوار ہے اور تم انتظار نہیں کر سکتے تو پھر مکاؤ آکر ڈون سے ملنے کی کوشش کرو۔ ہو سکتا ہے کہ اسے تم پر رحم آجائے۔ اس کے علاوہ کوئی تیسرا راستہ نہیں ہے۔"

میں نے خوشامدانہ انداز میں مزید بات بڑھانے کی کوشش کی لیکن اس نے دوسرے نمبر پر کال کا غذر کرتے ہوئے فون بند کر دیا اور میں نے بھی سلسلہ منقطع کر دیا۔

وہ عورت اول درجے کی بے وقوف تھی یا بھریہ وہ دانستہ میری مدد کرنے کی کوشش کر رہی تھی کیونکہ اس سے ہونے والی

بداعے سمجھانے کی کوشش کی "تم ڈون کو اس پورے نہیں سمجھا کر تمہیں تو وہ بھی اتنا برہم نہ ہوتا۔"

"تم بھول رہے ہو کہ میں ڈون کی میسر نہیں اس کی سیکرٹری ڈون جب غصے میں پھر کر چنگھاڑتا ہے تو اس کے محل کے پالتو زربک دہشت زدہ ہو کر کونوں کھدووں میں چبچتے پھرتے ہیں۔ اسے سمجھانے کی کوشش کرتی تو وہ اسی وقت میری ٹانگیں چیر کر دھڑکھڑکاتے ہوئے قسیم کر دیتا۔"

ڈون کو ایک فوکی وہ کردار کئی بہت بھیا تک تھی جس میں ناپت سے زیادہ درندگی کا عنصر غالب تھا لیکن غصے میں ہر شخص اپنی اپنی سطح سے کافی نیچے گر جاتا ہے اس کا اصل روپ اس نے سامنے آیا تھا جب اس نے ویرا کی فراکش پر "ایک نرم دل کی طرح بڑا ت خود ہانگ ہانگ جانے کا ارادہ کیا تھا۔ وہ اپنے اپنے ایک بالادست آدمی تھا۔ اس نے چہ ہوں جیسا منحنی وجود نے والے ہانگ ہانگ پولیس کے سپاہیوں کی زیر دستی صرف اس پر رداشت کی تھی کہ ان کے جسموں پر برطانوی راج کی فراہم کی آوریوں کا مندرجہ ہوئی تھیں۔ اس گرداب سے باہر نکلتے ہی ہانگ فو کا پھٹ پڑنا قابل فہم تھا۔"

ایک اچھی بات یہ تھی کہ کو ایک فو کی سیکرٹری ایک طرف بے اتفاقی و نقل و حرکت کے بارے میں مجھے کچھ بھی بتانے پر آمادہ نہ تھی لیکن دوسری طرف ہاتھوں کی دوائی میں بسہ کر بلا واسطہ طور پر سہی ہادی کہہ سکتی تھی کہ ڈون پولیس کی عمرانی سے نکل کر مکاؤ پناہ گزین بن رہا تھا۔

میں نے اسے اس کی بے وقوفی کا احساس دلانے کا ارادہ کر لیا۔ اسے لہجے دار باتوں میں الجھا کر میں غزالہ اور سلطان اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلومات اکٹھا کر سکتا تھا۔

"پھر ڈون سے میری ہی بات کراؤ!" میں نے لہجائی ہوئی آواز نکال کر کہا "تمہیں اندازہ نہیں کہ میں غزالہ کی طرف سے کس قدر بڑھان ہوں۔ اس کی وجہ سے میں کئی راتوں سے مسلسل جاگ رہا ہوں۔"

"تم اس کے عاشق معلوم ہوتے ہو۔" اس کا فوری تبصرہ اٹھائی بے پکارت تھا "میں تمہاری پریشانی کا اندازہ لگا سکتی ہوں کیونکہ میں ڈون کی ہدایات سے انحراف کرتا، میرے بس سے باہر ہے۔" فون لڑکی کے بارے میں ویرا کے علاوہ کسی سے بات نہیں کرے گا۔

"مجھے یہ فکر کھانے جارہی ہے کہ وہ بے چاری نہ جانے کہاں ہوئی؟ اس کی پرورش بہت ناز و نعم کے ساتھ ہوئی ہے۔ حوالات کی صورت میں دو چار روز میں اس کا کام تمام کر دیں گی۔"

میں اسے اپنے ردِ عمل کے اظہار کا موقع دینے کے لیے فون ہوا لیکن وہ کچھ نہ بولی۔ اس کی خاموشی میرے لیے معنی خیز نہ تھی اس کا مطلب تھا کہ برف کھٹکنے کا عمل شروع ہو چکا تھا۔

کر میرا مل اور اس ہو گیا کہ میرے گرد و پیش ہر کوئی ایسا ہمدرد غم گسار موجود نہیں تھا جسے میری دوا کی بھی فکر ہو۔
لے دے کر ایک جاکیر ہی میرا دوست رہ گیا تھا لیکن وہ بھی اپنی چھوٹی سی دنیا میں تنگ رہنے کا عادی ہو گیا تھا۔ میں اسے فون کے اپنی دوا کی کی اطلاع دیتا تو وہ یقیناً پوری فکر مندی کے ساتھ قلیٹ پر دوڑا چلا آتا اور شاید مجھے انرپورٹ تک چھوڑنے بھی جاتا لیکن میں اسے اٹھانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

دوسرا انجیل ٹانگ فورس کا ظفر تھا۔ وہ میرا دوست نہیں لیکن ہمدرد ضرور تھا۔ اسے غزالہ اور سلطان شاہ کی ہانگ کاٹک میں موجودگی کا بھی علم تھا اس لیے اس سے بات کرنے میں کوئی ہرج نہیں تھا۔

میرے جانے کی اطلاع اس کے لیے حیرت ناک ثابت ہوئی جس پر مجھے وضاحت کرنی پڑی کہ دیرا کے مکاؤ والے مرے نے غزالہ کو پولیس کے جھیلوں سے تو آزاد کرا لیا تھا لیکن کچھ غلطیوں کی وجہ سے اسے مکاؤ میں روک لیا تھا۔ ان غلطیوں کے ازالے کے لیے میرا فوری طور پر مکاؤ پہنچنا ناگزیر ہو گیا تھا۔

ظفر کو اس معاملے میں شی اور فانیالوں کے پیچیدہ الجھاؤ کا کوئی علم نہیں تھا لیکن میں اپنے اس سفر کے بارے میں غور نہ تھا۔ ایک طرف شی کا آئی میں تھا اور دوسری طرف فانیالوں۔ اس وقت تک وہ دونوں ہی میرے دوست اور ہی خواہ بے ہوئے تھے۔ آئی میں نے غزالہ کی مدد کی تھی۔ ڈان نے پچھلی رات میں مجھ پر چلتی کار سے حملہ کرنے والے دو بد معاشوں کو جہنم واصل کر دیا تھا مگر مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ میرے مکاؤ پہنچنے پر کیا صورت حال رونما ہونے والی تھی۔

ان دونوں میں سے کوئی بھی 'یا دونوں ہی اچانک میرے فون کے پیاسے بن سکتے تھے۔

میں جانتا تھا کہ ہانگ کاٹک میں دنیا بھر کا سامان قیش اڑان و امون پر دستیاب ہوتا ہے لیکن سامراجی حکومت کے سخت کنٹرول کی وجہ سے وہاں کھلے بازاروں میں تھپیابوں کی خرید و فروخت پاید تھی۔

نیلے پانیوں پر تیرتے ہوئے پُر قیش بجزوں اور بکے بکری جمانوں میں پورے دفتری ٹھاٹھ ہانگ کے ساتھ تھو سڑنے والے عالمی اسمگلروں کی اور بات تھی جو ہر پر تفریحی ماحول میں کودنے کی مالیت کے غیر قانونی تھپیابوں کی اسٹاکنگ کے سودے لے کرتے تھے اور ان کے ایک پیغام پر بین الاقوامی سندھوں میں سڑ گشت کرتے ہوئے تھپیابوں سے لدے ہوئے بکری جمانوں کے راستے تبدیل ہو جایا کرتے تھے۔

وہ بڑے سوداگر میرے لیے بے فیض تھے۔ میری صرف اتنی سی خواہش تھی کہ جب میں مکاؤ میں قدم رکھوں تو میرے پاس اپنے دفاع کے لیے کوئی نہ کوئی تھپیاب ضرور ہو تاکہ میں بے بسی کے نام میں نہ مارا جاؤں۔

مفتگو ہر اعتبار سے نتیجہ خیز ثابت ہوئی تھی۔ اس نے میرے کسی سوال کا براہ راست جواب نہیں دیا تھا لیکن اس کی گفتگو میں میرے ہر سوال کا جواب پناہ تھا۔ صرف سلطان شاہ کا مسئلہ باقی رہ گیا تھا لیکن فون کا سلسلہ منقطع ہو جانے کی وجہ سے مجھے اس کے بارے میں کچھ پوچھنے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔

یہ بات تو تقریباً طے ہو گئی تھی کہ کو انک فو غزالہ سمیت ہانگ کاٹک سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اسے اپنے ساتھ مکاؤ لے آیا تھا۔ وہ غزالہ اور دیرا سے برہم تھا۔ اس لیے اغلب امکان یہ تھا کہ اس نے غزالہ کو اپنے وسیع و عریض محل کے کسی حصے میں قید کر دیا ہو۔

میرا اندازہ تھا کہ سلطان شاہ بھی غزالہ کے ساتھ کو انک فو کی برہمی اور عتاب کا نشانہ بنا تھا اور غزالہ کے ساتھ ہی کو انک فو کی نجی قید میں تھا۔ اگر وہ غزالہ سے الگ اور اپنی مرضی کا مالک ہوتا تو رات بھر میں کسی بھی وقت مجھے فون کر کے تازہ ترین صورت حال سے باخبر ضرور کرتا۔

صورت حال بہت غیر متوقع طور پر تبدیل ہوئی تھی۔ ایک طرف نیشی کاؤ مکاؤ جانے کے لیے تیار بیٹھا ہوا تھا اور دوسری طرف حالات مجھے بھی اسی سمت دھکیل رہے تھے۔ پریشان کن بات یہ تھی کہ ہم دونوں ہی مکاؤ میں کو انک فو سے نکلنے کے متنی تھے۔ ہم نے جو بھی اس تک پہلے پہنچ جانا وہ کو انک فو کی ہمدردیاں سمیت لینے میں کامیاب ہو جاتا اور بعد میں جانے والے کو ناکامی کے سوا کچھ پاچھ نہ آتا۔

میری پریشانی یہ تھی کہ اگر میں کو انک فو تک دیر سے پہنچتا تو نہ صرف غزالہ کی رہائی خطرے میں پڑ سکتی تھی بلکہ میں خود بھی کو انک فو کا قیدی بن سکتا تھا۔ مجھے اس بارے میں ذرا بھی شک و شبہ نہیں تھا کہ کو انک فو مجھے پکڑنے کے بعد 'براہ راست جمی لائیڈ کے حوالے کر دیتا جس سے زہی کی کوئی امید نہیں تھی۔

اس وجہ فرسا خطرے کے باوجود میں غزالہ کو غیر معینہ مدت تک کو انک فو کی قید میں نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ ان ضمنی لمحات میں مجھے ایک بار پھر دیرا بہت شدت کے ساتھ یاد آئی۔ وہ موجود ہوتی تو میں خود سامنے آئے اور کوئی سنگین خطرہ مول لیے بغیر 'غزالہ کو کو انک فو کے چنگل سے نکال سکتا تھا۔

میرے پاس 'میرے اصل نام سے بنا ہوا وہ پاسپورٹ موجود تھا جس کی مدد سے میں پاکستان میں داخل ہوتا تھا۔ ابتدا میں خود کو شکاری کتوں کے حملوں سے بچانے رکھنے کے لیے میں نے اس پاسپورٹ کو خیر یاد کہہ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن نئے حالات میں وہ پاسپورٹ محفوظ تھا۔

پاسپورٹ اس وقت بھی قابل استعمال تھا۔ میں فوری طور پر کسی بھی انٹر لائن کا دو طرفہ ٹکٹ خرید کر 'ہانگ کاٹک روانہ ہو سکتا تھا کیوں کہ وہاں انرپورٹ پر ہی دیرا دینے کا موثر نظام رائج تھا۔ میں شہر بلکہ ملک سے دوا کی کا ارادہ لیے بیٹھا تھا لیکن یہ سوچ

سے دبے سمے نظر آ رہے تھے۔ دوسری نسلوں کے انکاؤ کا مسافر اس جہوم میں اپنی انفرادیت بالکل ہی کھو بیٹھے تھے۔

میں نے بارہا بین الاقوامی راستوں پر فضائی سفر کیے ہیں اس روز مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ ایشیائی مسافر عموماً اپنی قومی ازلاسن پر ہی سرخیں پسند کرتے ہیں۔ زبان، معاشرت اور ماحول کی ششاسانی انہیں جہاز میں بھی اپنے ملک کی یاد دلاتی رہتی ہے اور وہ عموماً خود کو دوسرے ہم سفروں کا میزبان تصور کرتے ہوئے اس بالا دستی سے فیض یاب ہونے کی کوشش کرتے ہیں جو عام گھروں میں بھی میزبان کو مہمان پر حاصل ہوتی ہے اور مہمان بیچارہ کیسے نکال کر رہ جانے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر پاتا۔ وہ یہ بھی نہ کرے تو میزبان کی سرد مری کا نشانہ بن جاتا ہے۔

کراچی میں دن نکلا ہوا تھا لیکن بنگاک میں شام ہو چلی تھی اس لیے روشن حفاظتی علامات کے معدوم ہونے کے بعد میں نے بنگاک کے وقت کے حوالے سے اسکاچ طلب کر لی۔ پلاسٹک کے شفاف گلاس میں "سمرے سیال میں تیرتی ہوئی برف کی ڈلیاں بھلی لگ رہی تھیں۔

طیارے کے عملے میں تھائی لینڈ کے خصوصی انداز میزبانی کے اثرات بہت واضح تھے۔ میٹھی، دھیمی، نرم اور معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ ہر بار دہری خاتون فرمائش پوچھتے ہوئے، مسافر پر اس حد تک جبک آتی تھی کہ اس کے بدن اور اس پر لگے ہوئے سینٹ کی خوشبو میں واضح طور پر تیز کی جاسکتی تھی۔ وہ اداس ب کے لیے عام تھی۔ جو بوائے اس کے لیے بھی اور جو صرف مسکرا دے اس کے لیے بھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ ہنسی مسکراتی ستیلیاں اپنے وجود کی فسون خیر لطافتوں سے جلد از جلد ہر ایک کو محروم کرنے پر متل گئی ہوں۔

میں نمکین مونگ پھلی کے دانوں کے ساتھ اپنے فضل کے دوران ذہنی طور پر مکاؤ پہنچا ہوا تھا کہ بھینسی بھینسی خوشبو اور گرم سانسوں کی مکار نے مجھے چونکا دیا۔

دیکھا تو ایک نازک اندام اور خوش خصال خاتون کی مسکراتی ہوئی سیاہ آنکھیں براؤ راست میری آنکھوں میں اتری جا رہی تھیں۔ اس کا لباس بتا رہا تھا کہ وہ فضائی میزبانوں میں سے نہیں تھی۔

"اجازت ہو تو میں یہاں بیٹھ جاؤں؟" اس نے شائستہ انگریزی میں سوال کیا اور میں نے غیر ارادی طور پر اپنی نشست میں سٹ کر اسے اجازت دے دی۔ حالانکہ براہروی سیٹ خالی ہونے کی وجہ سے مجھے سننے کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔

اس کے بیٹھے ہی ایک انزووشنس نے اس کے سامنے والی کرسی کی پشت گاہ سے میز کھول کر اس پر اسکاچ کا گلاس "کانڈی" دوایا اور نمکین مونگ پھلی کا پکٹ رکھ دیا۔

"گر تم برا نہ مانو۔" اس نے اپنا گلاس لیوں کی طرف لے جاتے ہوئے رہنما کلام اور میرے سر کی جنبش کے ساتھ تھوچہ جڑز کہہ کر

میں نے اپنا وہ مسئلہ غفلت کو ستایا تو اس نے فوراً ہی بڑے بور ایک خود کار ہسٹل کی پیش کش کی جسے سامان میں پیک کر کے ٹرانس کے علیے کے حوالے کر دیا جاتا تو روک ٹوک کا کوئی امکان نہیں تھا۔

"اور اگر میں اپنا ہی ہسٹل لے جاتا چاہوں؟" میں نے نیم گن لے بیٹھ کر پوچھا۔

"وہ بھی اسی طرح لے جاسکتے ہو۔ یہاں کوئی نہیں پوچھے گا۔ ایک کامک میں چپک کر لیے گئے تو پریشان ہو جاؤ گے۔" اس نے ہسٹل لیوے میں جواب دیا۔ "سنا ہے کہ مکاؤ میں ہتھیار اچھے اور سنبھلے جاتے ہیں۔"

"لیکن مکاؤ میرے لیے نئی جگہ ہوگی۔ اس شر خرابات کے بارے میں سنا تو میں نے بھی بہت کچھ ہے لیکن اور دھرنے کا یہ پشلا فائن ہوگا۔ خیر میں دیکھوں گا کہ کیا کر سکتا ہوں۔"

غفلت سے گفتگو ہے سو درمی لیکن میں نے نیم گن ساتھ لے جانے کا ارادہ کر لیا۔ میرے خیال میں "پچاؤ کا اہم ترین نکتہ یہ تھا کہ اس میں کوئی گولی یا بامدوی میگزین وغیرہ استعمال نہیں ہوتا۔

غافل طور پر نیم خارج کرنے والے اس ہونا تک ہتھیار کو ذاتی بلکہ پیشہ ورانہ استعمال کا کوئی خاص اوزار قرار دے کر چھپایا جاسکتا تھا۔ میں غلیٹ پر الودی نظرس ڈال کر تن کے کپڑوں اور نیم گن کے ساتھ وہاں سے نکل کھڑا ہوا۔

میرے اگلے چند گھنٹے، شہر میں اور دھرم بھگتے ہوئے

گزرے اس دوران میں "میں نے ٹکٹ بنوانے کے علاوہ سامان

کے لیے برف کیس سے بڑا ایک سوٹ کیس اور نیم گن کو لپیٹنے کی

ضرورت کے تحت اپنے لیے کچھ کپڑے خریدے۔ ایک بچے سے

پلازہ پورٹ پہنچ گیا۔

سوٹ کیس کو آئیں رے مشین سے گزارنے پر بھی کسی نے

کچھ نہیں پوچھا تو مجھے احساس ہوا کہ نااہلی یا قصور میں آنے کے

بوجہ ترین ایجادات بھی اپنا مفہوم اور مصرف کھو بیٹھتی ہیں۔

ایک طرف عالمی غنڈے ہماری ایسی ترقی کہ مٹی انداز میں خراج

نہیں پیش کرنے پر مجبور تھے تو دوسری طرف ہستی کی انتہا یہ تھی

کہ آئیں رے مشین کی دکھائی ہوئی چیزوں کو بھی دیکھنے اور پہچاننے

سے انکار کیا جا رہا تھا۔

پرواز میں زیادہ وقت نہیں تھا اس لیے جب میں آخری جامہ

عاشی کے بعد روحانی کے لاؤنج میں داخل ہوا تو تھائی انڈیز کی پرواز

لاؤڈنگ کا اعلان ہو رہا تھا۔

طیارے میں مسافروں کی تعداد بہت کافی تھی لیکن پھر بھی

حصہ نشین خالی تھیں۔ میری سیٹ کھڑکی کے ساتھ تھی۔ برابر

میں کوئی نہیں تھا۔ گو کراچی سے مسافروں کی خاصی تعداد سوار ہوئی

تھی لیکن اس پرواز پر تھائی لڑکے لڑکیوں کی اکثریت تھی۔ وہ سب

بہت خوش دلی اور بے فکری تھے ساتھ اونچی آواز میں ہنس بول

سہتے تھے جب کہ پاکستانی مسافر نسبتاً دھیمی آواز میں بولنے کی وجہ

ہوٹل میں قیام کرو گے؟“

سوزی خوش لباس، خوب صورت اور خوش گفتار بھی تھی لیکن چند منٹ کی ٹھیک سی مدت میں وہ جس سطح پر آگئی تھی اس سے مجھے کراہت سی ہونے لگی۔ میں نے اسے صاف بتا دیا کہ میرے بنگا انزپورٹ پر صرف دو گھنٹے کے لیے ٹرانزٹ تھا اور ایک ہیک اس کا منہ بن گیا جیسے اس نے شکر کے دھوکے میں کوئین کی کمانچہ لی ہو۔

”مگر تم تو کہہ رہے تھے کہ کاروبار اور تفریح کے لیے آئے ہو!“ اس کے چہرے سے مسکراہٹ کا نور ہو چکی تھی۔
”ہر گرام یہی ہے مگر بنگاک میں نہیں بلکہ پلانٹ میں۔ بنگاک سے تو مجھے صرف پرواز بند لنی ہے۔“

میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی اس نے اپنا گلاس خالی کر اور سیٹ چھوڑ کر گھڑی ہو گئی۔ اس نے اتنے اخلاق کا مظاہرہ ضرور کیا کہ میری پوری بات سن لی اور پھر ”سوزی! میں ابھی آئی، کتنی ہوئی، تیری سے کہیں کے پچھلے حصے کی طرف چلی گئی اور میں نے اپنے لیے اسکاچ کا نیا پیگ طلب کر لیا۔

سوزی کا جہاز پر سفر کرنا اور پھر مجھ سے مل بیٹنا محل افغان نہیں تھا۔ وہ غالباً متوکل گاؤں کو پھانسنے کے لیے، مقررہ راستہ پر سفر کرتی رہتی تھی۔ میرے قریبی لباس اور اکیلے پن نے اسے میری طرف توجہ کیا تھا۔ جہازوں پر طے ہونے والے معاملات میں وہ یقیناً ہماری معاوضے لیتی ہو گی ورنہ مختصر راستوں پر بھی فضائی سفر کے اخراجات پورے ہونے مشکل تھے۔ میں بنگاک کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا لیکن سوزی اس کتاب کا بالکل نیا باب ثابت ہوئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد میں نے سوزی کا دیا ہوا کارڈ اپنی جیب میں رکھ کر اپنی نشست سے باہر نکل کر، جہاز کے کہیں کا جائزہ لیا تو چار نشستوں والی ایک قطار میں سوزی تین ادوجہ عمر مردوں کے درمیان بیٹھی نظر آئی۔ وہ تینوں پاکستانی اور سرایہ دار نظر آ رہے تھے۔ شاید سوزی نے انہیں بیٹھے میں اتار لیا تھا کیوں کہ وہ چاروں نمائندہ بے فکر کے ساتھ بیٹھے اور ہنسنے بولنے میں مصروف تھے۔

کھانے کے دوران میں سوزی اگلی قطاروں میں کوئی ٹائڈ ٹاک پچی تھی۔ وہ کسی عسشی سلا گرل کی طرح جہاز میں محوم پھر کر اپنا کام کر رہی تھی۔ وہ اپنا وقت وہیں لگا رہی تھی جہاں لوگوں میں تیل ہونے کی امید نظر آتی تھی۔ مجھ جیسے خشک ریکوں سے دور دروازہ تھی۔

میرا ارادہ بنگاک میں چند گھنٹے گزارنے اور شہر کا آئندہ زمانہ رنگ روپ دیکھنے کا تھا لیکن نیم گمن کی وجہ سے میں سامان کو باہر چینگ کے مراحل سے گزارنے سے بچنا چاہتا تھا اس لیے میں نے ہانگ کانگ کے لیے اگلی پرواز کی نشست لی تھی اور کراچی کی بجائے اپنا بیگ ہانگ کانگ کے لیے بک کر دیا تھا۔

پچھلے چند برسوں میں قیود و ترمیم اور انتظامات کے اعتبار سے

گلاس سے ایک بڑا گھونٹ اپنے معدے میں اتار لیا۔

”میرا نام سوزی ہے۔“ اپنا تعارف کرانے کے ساتھ ہی اس نے اپنے بلاؤز کے گریبان سے انگریزی میں چھپا ہوا ایک خوبصورت کارڈ نکال کر مجھے پیش کیا۔ اس کی پشت پر شاید وہی سب قحالی زبان میں چھپا ہوا تھا۔

”مجھے ڈیڑھ گھنٹے ہیں مگر میں تمہیں کارڈ نہیں دے سکوں گا۔“ میں نے وقت گزاری کے لیے اس سے گفتگو شروع کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا نام بہت خوبصورت ہے۔“

اس نے غور سے میری طرف دیکھا جیسے میرے چہرے کے تاثرات سے میرے الفاظ کی گمراہی کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی ہو پھر کاندھی ردال سے اپنے ہونٹ تھپتھپاتے ہوئے بولی۔
”بنگاک اکیلے ہی جا رہے ہو؟“

”فی الحال تو اکیلا ہی ہوں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور وہ میرا بازو دباتے ہوئے ہنس پڑی۔

”دلچسپ آدمی معلوم ہوتے ہو۔ تفریح کے لیے نکلے ہو یا برنس کے لیے؟“

”دونوں ہی سمجھو۔ انہیں ایک دوسرے سے الگ کرنا مشکل ہوتا ہے۔“ میں نے مختصر جملے میں کہا۔

اس نے ایک چھوٹا سا گھونٹ لیا اور میری طرف جھک کر بتانے لگی۔ ”میں سنیا روڈ کے قریب لڑکیوں کا ایک نجی ہاسٹل چلاتی ہوں۔ وہاں کالج اور یونیورسٹی میں پڑھنے والی بیس لڑکیاں رہتی ہیں لیکن ان میں سے کسی کی عمر چودہ برس سے کم اور بائیس سے زیادہ نہیں ہے۔“

”تعلیمی ہاسٹل میں عمر کی اتنی کڑی پابندی؟“ میں نے اس کی بات کاٹ کر حیرت سے پوچھا۔

”بڑے عمر کی لڑکیوں کی عادتیں پختہ ہوتی ہیں۔ وہ دوسری لڑکیوں کو بھگانے لگتی ہیں۔ میرے ہاسٹل کا ماحول بہت صاف ستھرا ہے۔ میری لڑکیاں بہت فرمانبردار ہیں۔ وہ سب ہی غیر ملکیوں کے ساتھ پارٹ ٹائم جاب کر کے اپنے اخراجات پورے کرتی ہیں۔ تم آؤ گے تو ان سے مل کر خوش ہو جاؤ گے ہم لوگوں میں غیر ملکیوں سے دوستی کرنے کا شوق جنوں کی حد تک ہے۔ اس شوق میں کبھی کبھار ہم حد سے بھی بڑھ جاتے ہیں۔“

”لڑکیاں دن میں پڑھتی ہیں تو جاب کب کرتی ہیں؟“ میں نے ایک مرتبہ پھر اس کی بات کاٹ دی۔

”دوسرے رات گئے تک ان کی ٹانگ رہتی ہے لیکن ان کے جاب ہاسٹل ہی تک کرتا ہے۔“ وہ آہستہ آہستہ کھلنے لگی۔ ”کوئی ایجنٹل آفرو تو میں لڑکیوں کو چھٹی بھی کرا دیتی ہوں۔ پڑھائی کھائی تو عمر بھر چلتی رہتی ہے لیکن عمر ڈھلنے لگے تو قدر دان ملنے مشکل ہو جاتے ہیں۔ جو لوگ منہ مانگے معاوضے دیتے ہیں، وہ بہترین سے کم پر راضی نہیں ہوتے۔ بنگاک میں میرے نام کی اسی وجہ سے دھوم ہے کہ میں نے سروس کا معیار مگر کرنے نہیں دیا۔ بنگاک میں تم کس

ستاروں کی ایک حسین ترین کسکشاں جگمگاتی ہوئی نظر آنے لگی۔ ہار کے ایک طرف کولون کے میدان کی جھے میں لاکھوں چھوٹی بڑی اور رنگ برنگی روشنیاں جگمگ رہی تھیں۔ دوسری طرف تیزی سے اٹھتے ہوئے پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر بنی ہوئی بلند و بالا عمارتوں کی بے شمار روشنیوں نے سماں باندھا ہوا تھا۔ ہانگ کانگ کے پہاڑی جزیرے پر چمکے ہوئے روشنیوں کے سیلاب کے انعکاس نے ہار کے بانیوں کو بھی دور تک منور کیا ہوا تھا۔ ہار میں متعدد چھوٹی بڑی کشتیوں اور دفعتی جہازوں کی نقل و حرکت نے پورے ماحول کو افسانوی رنگ دیا ہوا تھا۔

جہاز فضا میں چکر کاٹتا ہوا نیچے آتا جا رہا تھا۔ کولون میں ساحل کے ساتھ ساتھ دن دے کی زدو روشنیاں دور تک متوازی لیکسوں کی طرح پھیلی ہوئی تھیں۔ کولون سے آگے چین کی سرزمین پر روشنیاں بہت کم تھیں اور ان ہی اطراف میں کسی کھاڑی میں مکاؤ کی ساحلی آبادی بھی جہاں غزالہ "دون کو انک فو کے محل میں قید کسی نیک ساعت کا انتظار کر رہی تھی۔

طیارہ اٹھلا اٹھلا کر، انگڑائیاں لیتا ہوا زاویے بدل بدل کر فضا میں محو پرواز تھا۔ شاید رات کی لینڈنگ سے پہلے ہر طیارے کے ہوا باز اپنے مسافروں کو ہانگ کانگ کے روشن چہرے کا بھرپور دیدار کرانے کی خصوصی کوششیں کرتے ہیں پھر جب جہاز نے اپنی چوٹی نیچے کر کے رن دے کا رخ کیا تو وہ عجیب منظر تھا۔ اندازہ ہی نہیں ہو پاتا تھا کہ جہاز سمندر کے پانی میں اترنے جا رہا ہے یا ساحل کے ساتھ بہتے ہوئے رن دے پر لنگے گا۔

ہانگ کانگ ازپورٹ رن کے مقابلے میں رات کی لینڈنگ کا محری کچھ اور تھا۔ میں پہلے بھی اس نئے سے ملک میں آتا رہا تھا لیکن فضا کی مختلف بلندیوں سے اس شہر کی رات دیکھنے کا وہ پہلا موقع تھا جو یادگار تھا۔

جہاز کے انجنوں کے بند ہونے سے پہلے ہی طیارے کے مسافروں نے اپنی نشستیں چھوڑ دیں اور جھٹ کے ساتھ بہتے ہوئے خانوں سے اپنا اپنا دستی سامان سنبھالنے لگے۔ منزل مقصود آ جانے پر مسافروں میں تجسس آمیز اضطرابی کیفیت کا پیدا ہونا ایک قدرتی امر تھا لیکن بعض مسافر کچھ زیادہ ہی بوکھلائے ہوئے تھے اور راہداریوں میں اپنے آگے کھڑے ہوئے مسافروں کو کندھے کنبیاں مار کر جلد از جلد آگے بچنے کے لیے کوشاں تھے۔ انہیں دیکھ کر یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے انہیں غصہ رہا ہو کہ تاخیر ہونے کی صورت میں طیارہ انہیں اتارے بغیر، اگلی منزل کی طرف پرواز کر سکتا ہے اور ایسے کسی خطرے کے سد باب کے لیے وہ دواؤں کھلنے ہی باہر بھاگ نکلنے کی تیاریاں کر رہے ہوں۔

میں کسی بھی قسم کے دستی سامان کے بغیر سفر کر رہا تھا اس لیے اپنی نشست سے دوسرے مسافروں کا جائزہ لیتا رہا۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں کہ عملی طور پر کسی بوکھلاہٹ یا حماقت کا ارتکاب نہ کرنے کے باوجود میں اپنے وجود میں ایک

ہانگ ازپورٹ میں نمایاں تبدیلیاں آئی تھیں۔ میں ٹرانزٹ فلور پر چپک ان کرانے اور بوڈنگ کارڈ لینے کے بعد گینگ وے سے بائیں طرف بنے ہوئے کینے میں جا بیٹھا۔ قیمت یہ تھا کہ ہانگ ازپورٹ پر ہر اعتبار سے سکون تھا۔ پہلے بھی کسٹم ہال سے باہر نکلتے ہی ان لوگوں سے ملاقات شروع ہو جاتی تھی جو رن رٹائے اور سنٹی خیر فقروں کے ذریعے بوکھلائے ہوئے مسافر کو اُن دیکھے شہنشاہ میں لے جانے کے دعوے کرتے تھے۔

میں نے کینے میں سرود کرنے والی لڑکی سے چائے لانے کی زبانی کی لیکن جب اس نے سگھانائی مقامی بیڑ کا ڈبا کھول کر میرے سامنے رکھا تو میں حیران رہ گیا۔ میں نے اسے اس کی غلطی کا احساس دلایا تو اس کے گہرے گندے چہرے پر شرمندگی پھیل گئی۔ اس نے ٹوٹی چھوٹی انگریزی میں معذرت کرتے ہوئے درخواست کی کہ میں نے وہ کھلا ہوا ڈبا واپس کیا تو اسے اپنی تنخواہ سے پچاس ہات کنوائے پڑ جائیں گے جب کہ وہ دیسے ہی تنخواہ میں کمی کی وجہ سے مسائل سے دوچار رہتی تھی۔ میں نے خاموشی کے ساتھ دو ڈالے اسے تھما دیے۔

بیڑ غصندی ضرور تھی لیکن بے کیف تھی۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے اس میں غلطی سے صابن کا محلول کھول دیا گیا ہو۔ میں وہ ڈبا واپس ہی چھوڑ کر اٹھ گیا۔

اس وقت پورے کینے میں میرے علاوہ صرف ایک سفید فام بوڑھا بیٹھا ہوا آنکھ رہا تھا۔ وہ شاید ایک آنکھ موندے، دوسری آنکھ سے بغور میرا جائز لے رہا تھا۔ مجھے اتنی جلدی اٹھنے دیکھا تو وہ ہلکے بجاتے ہوئے زور سے ہنس پڑا اور انگریزی میں بولا۔ "شیش۔ میاں غورتوں کے علاوہ ہر چیز شیش ہے اور اب تو ایڈز کی دہشت نے اس ملک کا وہ چارم بھی ختم کر دیا ہے۔ پتا نہیں اب یہ بے چارے کہاں سے کھائیں گے!"

میں خود بھی اس ملک سے خوش نہیں تھا۔ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن آخر کار وہ ایک ایشیائی ملک ہے۔ ایک سفید فام کا زہر میں ڈوبا ہو تبصرہ کن میری کھوپڑی پتھی لیکن میں نے کی نقلی کا اظہار کیے بغیر "سردیجے میں کہا۔ "تم سچ کہہ رہے ہو۔ یہ سب تیزی سے بے روزگار ہوتی جا رہی ہیں لیکن یہاں پہلے بڑھنے والی امریکیوں کی لڑکیاں سمجھ دار اور صحت کے معاملے میں حساس ہیں۔ وہ باقاعدگی سے ایڈز کے خلاف ویکسین لیتی رہتی ہیں۔ تم اگلی بار یہاں آؤ گے تو پوری ٹیڈ پر ان ہی کی حکمرانی ہوگی۔"

میرے زہریلے جواب پر اس کا منہ کھلا اور پھر کھلا ہی رہ گیا۔ میں اسے ہکا بکا چھوڑ کر بے پروا یا نہ انداز میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ عام تھا بی باشندے ایسے تبصروں کا کیا جواب دیتے ہوں گے۔

اگلے پرواز سے ہانگ کانگ تک کا مختصر فاصلہ بہت تیزی کے ساتھ طے ہو گیا۔ منزل مقصود کی آمد کے اعلان کے ساتھ ہی ملاسے کی بلندی میں تیزی سے کمی واقع ہونی شروع ہوئی تو زمین پر

اس رد عمل کے نتیجے میں، میری طرف مرکوز نگاہیں، لا تعلقاتانہ انداز میں دوسری سطحوں میں جھٹکنے لگیں البتہ چند جنبیوں نے یکایک سی ادھجی آوازوں میں بیک وقت بولنا شروع کر دیا۔ میں ان کی زبان سے نابلہ ہوتے ہوئے بھی اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ میرے بارے میں باتیں بنا رہے تھے۔

”کس سیاسی گروپ سے وابستہ ہو؟“ امیگریشن افسر کے آخری سوال نے مجھے چونکا دیا۔

”کسی سے نہیں۔“ میں نے قدرے حیرت سے جواب دیتے ہوئے دل میں سوچا کہ پاکستان کے سیاسی گروپوں سے بھلا اس کو کیا واقفیت ہو سکتی ہے۔

وہ اپنے سامنے رکھے ہوئے کمپیوٹر مانیٹر پر نظریں جماکر، تیزی کے ساتھ کی بورڈ پر انگلیاں چلانے لگا۔

اس نے مرزا لگا کر، امیگریشن کارڈ کی کاربن کاپی کے ساتھ، پاسپورٹ مجھے لوٹایا تو میں اس سے سوال کیے بغیر نہ سکا۔ ”وہا کے معاملے میں پاکستان کی اندرونی سیاست کی کیا ضرورت پیش آتی ہے؟“

اس معنک چینی کے ستے ہوئے ہونٹوں پر ایک معنوی مسکراہٹ رنگ آئی اور وہ جلدی سے بولا۔ ”ایک بار ویزا لینے کے بعد پاکستانی، انسانی حقوق کی پامالیوں کے حوالے سے سیاسی پناہ کی درخواست کر دیتے ہیں۔ ہمارا حکمہ ایسے پاکستانیوں سے تنگ آچکا ہے جو یہاں نوکریاں کرنے کے لیے سیاسی مخالفین پر حکومت کے بدترین تشدد کی منت نئی کمائیاں لے کر آتے ہیں۔ اب ہم سیاسی رجحان کا شبہ ہوتے ہی پاکستانیوں کو ویزا دینے سے انکار کر دیتے ہیں۔“

اپنی بات مکمل کرتے ہی وہ قطار کی طرف متوجہ ہو گیا اور میں بوجھل قدموں سے آگے بڑھ گیا۔

میرے لیے وہ تجزیہ شرمناک اور توہین آمیز تھا لیکن میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ خود غرض اور تنگ نظر افراد کی حرکتوں سے ملک کے نام کو بڑے لگ رہا تھا۔ سبز پاسپورٹ والوں کے ساتھ امتیازی سلوک کرنے میں، اس امیگریشن افسر کا کوئی قصور نہیں تھا۔ اس نے اپنے تجربے سے جو کچھ سیکھا تھا، وہ اسی پر عمل کر رہا تھا۔

تین کھال میں سامان بیٹھ رہا تھا شروع ہو گیا تھا۔ میں نے اپنا مختصر سا سوٹ کیس اٹھایا اور پہلے تجربے کی روشنی میں گرین چمیل سے گزرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

ریڈ چمیل سے گزرنے پر، لمبی میز پر، کسٹم آفیسر کے سامنے رکا تو اس نے متنی خیز انداز میں میرے پاسپورٹ پر نظر ڈالنے ہوئے پوچھا۔ ”کیا لے کر آئے ہو؟“

”کچھ بھی نہیں!“ میں نے اپنا سوٹ کیس اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

”پھر ریڈ چمیل سے کیوں آئے ہو؟“ اس نے میرے چہرے؟ نظریں گاڑ دیں۔ اس کی انگلیاں میرے سوٹ کیس کے بالوں سے

عجیب سا جذباتی ابال محسوس کر رہا تھا جو شاید کسی بھی نئی منزل پر پہنچنے پر انسان کو نئی زمین سے رشتوں کی تلاش پر اکساتا ہے لیکن اس وقت میرے سامنے تلاش کا کوئی مرحلہ نہیں تھا۔ جب تک میں اس سرزمین سے ہزاروں میل دور، گراچی میں بیٹھا ہوا تھا تو نظرات کی پیلانے میرے ذہنی سکون کو درہم برہم کیا ہوا تھا لیکن اس وقت مجھے طمانیت ہی محسوس ہو رہی تھی کہ میں آخر کار ایک ایسی سرزمین پر پہنچ چکا تھا جہاں سے تھوڑی سی مسافت پر مکاؤ کا ساحلی شروائع تھا اور مکاؤ میں سلطان شاہ کے ساتھ عزیز از جان، غزالہ بھی، ذون کو ایک نوکی قید میں تھی۔ ہانگ کانگ پہنچنے کے بعد، اپنے نصیبیوں کے وہ قیدی میری دسترس میں آنے والے تھے جس کے بعد میں خیالی گھوڑے دوڑانے کے بجائے، ان کی مدد کے لیے عملی اقدام اٹھا سکتا تھا۔

طیارے سے گینگ وے گئے کے ساتھ ہی مسافروں کو جہاز سے اخلا کی اجازت مل گئی۔ نشستوں سے دوسری طرف والی راہداری میں، تیزی کے ساتھ بڑھتی ہوئی قطار میں مجھے کئی پاکستانی چہرے بھی نظر آئے اور مجھے یہ دیکھ کر خوش ہوئی کہ وہ سب ہی مذہب اور باوقار نظر آ رہے تھے۔

دو یا تین راہداریوں میں سے گزرنے کے بعد اس پرواز کے مسافرا امیگریشن کے شیبے کے متعدد کاؤنٹرز کے سامنے خود بخود صف آرا ہوتے چلے گئے۔ خوش قسمتی سے اس وقت وہاں دوسری پروازوں سے آنے والے مسافروں کا جھج نہیں تھا اس لیے چھ مختلف قطاریں تیزی کے ساتھ آگے بڑھنے لگیں۔

ہانگ کانگ میں آمد کے اندراج اور ویزا کے حصول کے لیے امیگریشن کارڈ طیارے میں ہی تقسیم کر دیے گئے تھے۔ اس مختصر سے کارڈ پر مسافر کے کوائف خود بخود ڈی پی کیٹ کا پی پر آ جاتے تھے اور ردائی کے وقت امیگریشن کا عملہ اسی کارڈ کی دوسری نقل کے نمبر اور کوائف کے ذریعے، اپنے کمپیوٹر کے مرکزی ریکارڈ پر ردائی کا اندراج کر لیتا تھا۔

مجھ سے آگے والے کئی مسافروں کو کسی بھی پوچھ کچھ کے بغیر فوری طور پر قانع کر دیا گیا لیکن میری باری آئی تو سبز پاسپورٹ لینے ہی امیگریشن آفیسر نے غور سے میری طرف دیکھا، کئی مرتبہ پاسپورٹ کے اوراق کی ورق گردانی کی اور پھر مجھ سے سوالات کا سلسلہ شروع کر دیا۔

میرے پاس اس کے ہر سوال کا مسکت جواب موجود تھا لیکن میں یہ بات محسوس کیے بغیر نہ سکا کہ ہانگ کانگ جیسے پناہ بھر کے ملک میں، اس امتیازی سلوک کی بنا پر میں اپنے پیچھے اور دوسری قطاروں میں کھڑے ہوئے مسافروں کی جیبتی ہوئی نگاہوں کا نشانہ بن چکا تھا۔ بعض ہونٹوں پر خفیف سا استہزائیہ مسخر تھا۔ ”پاکستانی معلوم ہوتا ہے۔“ کسی مسافر کی دہلی دہلی سی آواز میرے کانوں میں آئی تو میں برداشت نہیں کر سکا۔ میں نے مرکز فٹنک ٹکا ہوں سے اپنے پیچھے والوں کو گھورا تو سب خاموش تھے۔ میرے

دی۔ ”اپنے بجٹ کے مطابق اس سٹ میں سے ہونے کے فن
نمبر لے لو اور پبلک بوتھ سے بنگ کرالو۔“
”یہ کام تم نہیں کر سکتے؟“ میں نے فہرست کو چھوئے بغیر سرو
لبے میں پوچھا۔
اس نے میری بات کا کوئی جواب دیے بغیر اپنی کرسی چھوڑی
اور اندر چل دیا۔

میری کھوپڑی بھٹا کر رہ گئی۔ دوسری قوموں کے افراد کے
ساتھ ”ہانگ کانگ کے چینی نژاد باشندوں کے دویٹے میں وہ بے
نیازی، انانیت اور تکبر وہاں کی روایات میں شامل تھا۔ دفتری
کھڑکوں سے لے کر دکانداروں تک ہر چینی اسی رنگ میں رنگا ہوا
تھا۔ میں غصے کے عالم میں بس اسٹاپ کی طرف چل دیا۔

دوٹ نمبر اے ون کی بس ان دنوں بھی انرپورٹ سے شمس
چوکی کے لیے چلتی تھی۔ آٹھ ہانگ کانگ ڈالر میں وہ سفر خاصا
خوشگوار ثابت ہوا۔ راستے میں شرکی موقوف معدوم ہو چکی تھی لیکن
سالبری روڈ سے گزرتے ہوئے تھیں اسٹریٹ پر اس وقت بھی بھیڑ
بھاڑ نظر آرہی تھی۔ بائیں ہاتھ پر ایسی تھیں اور اس سے تقریباً
تین فٹ فاصلے پر چل رہی تھیں۔ برسوں بعد بھی ہانگ کانگ
میں بہت زیادہ تبدیلیاں رونما نہیں ہوئی تھیں۔

اسٹار ڈاؤس سے ملحق بس اسٹاپ پر سفر ختم ہوا تو میں اپنے ہلکے
پھلکے سوٹ کیس کے ساتھ گھاٹ کی طرف بڑھ گیا۔ دن میں
مسافروں کی آمد و رفت سے مصروف رہنے والے ”اسٹار فیری“ کے
گھانٹوں سے آنے والے راستے ”اس وقت بہت کشادہ نظر آرہے
تھے۔ میں برآمدے سے جاتے جاتے اسٹار فیری کے بنگ آفس کے
سامنے رک گیا جہاں سفید قیام ساحوں کی ایک نئی تقریبی کتابچوں کا
مطالعہ کر رہی تھی۔ میں نے وہاں سے اپنے مطلب کے چند کتابچے
اٹھا لیے۔

میں نے بورڈ پر نظر ڈالی تو رات کے بارہ بجے اسٹار فیری والوں
کا ایک تقریبی سفر شروع ہونے والا تھا لیکن اس میں مکاؤ کا کوئی ذکر
نہیں تھا۔ میں کتابچے ”سمیٹ کر آگے بڑھا اور اسٹال سے بیڑ کاغذ
بستہ کین خرید کر کھلے ساحل کے کنارے بٹے ہوئے ٹنگرٹ کے
واک ویز کی طرف بڑھ گیا۔

سین میکیل ہانگ کانگ کی روایتی بیڑ تھی جو بنگاک کی سمٹھا
سے ہزار درجہ بہتر اور مغربی معیار کے قریب تھی۔ میں نے
اسٹیشن بس اسٹال کی رنگ کے ایک چتر لیے ستون پر جگہ سنبھالی اور
سگریٹ سٹاکر سمندر میں تیرتی ہوئی چھوٹی بڑی کشتیوں پر نظریں جما
دیں۔ بھانت بھانت کی چھوٹی بڑی سٹ واد اور تیز رفتار بوس پر
سین میکیل کے متعدد روشن اشتہارات نمایاں تھے۔ سمندر میں
گند کی پھیلانے والوں پر بھاری جرمانے کی متعدد اشتہاری تنبیہات کے
باوجود، میرے قریب وجوہ میں اس بیڑ کے بہت سے خالی ڈبے
ٹھہرے ہوئے تھے جن سے ظاہر ہوا تھا کہ سین میکیل روز بہ روز
قبول تر ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے اس خیال کی کچھ مقدار اپنے

میل ری تھیں اور میرا دل لمبوں اچھل رہا تھا کیوں کہ سوٹ کیس
میں بکڑوں کی تنوں میں نیم گن چھپی ہوئی تھی۔
”میں یہاں کے قانون سے لاعلم ہوں۔ احتیاطاً ریڈ چینل
استعمال کیا ہے۔ کیا پتا ذاتی استعمال کی اشیاء میں بھی کوئی چیز ڈیوٹی
کے قابل نکل سکتے۔“ اس سے نظریں چرانے کے لیے میں اپنی
میں ٹونے لگا جیسے سوٹ کیس کھولنے کے لیے چابی تلاش کر رہا
ہوں۔ ”تم چیک کر لی تو بہتر ہوگا۔“
”کوئی ڈرگ؟“ اس نے تجسس لبے میں پوچھا۔ میں نے سختی
سے انکار کر دیا۔

”جاؤ۔“ اس نے میرے سوٹ کیس پر ہاتھ مار کر کہا۔ اس بار
میرے اعتماد نے اسے مطمئن کر دیا تھا اور اس طرح میں کسی زحمت
سے دو چار ہوئے بغیر ”نیم گن سمیت ہانگ کانگ میں داخل ہونے
میں کامیاب ہو گیا۔

اس مرحلے پر مجھے وہ لوگ یاد آئے جو سیاسی پناہ کے بہانوں
سے... وہاں قیام کی اجازت لینے کی کوشش کرتے ہیں اور مجھے
محسوس ہوا کہ اپنے عمل کے اعتبار سے میں ان سے زیادہ مختلف
نہیں تھا۔ وہ بہتر روزگار کے متلاشی ہوتے ہیں اور اپنی اسی
ضرورت سے مجبور ہو کر قانونی رعایتوں سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی
کوشش کرتے ہیں۔ میں نیم گن کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ اپنی
اس ضرورت کے لیے میں نے ان کے قانون کو بالال کیا تھا۔ اگر
میں پکڑ لیا جاتا تو میری اصل شناخت ایک پاکستانی کے طور پر ہوتی،
میرا نام ثانوی حیثیت اختیار کر لیتا۔ وہ ہمارا قومی مزاج بن گیا تھا کہ
ہر شخص اپنی ذاتی ترجیحات کے حصول کے لیے ہر فریب اور مکاری
کو اپنا حق تصور کرنے لگا تھا لیکن ایسی ہی حرکتوں پر ”دوسروں پر
میں طعن اور تنقید کرنے کے شوق میں بھی مبتلا تھا۔

”میں کون سا سیاسی رہنما یا مصلح ہوں جو ان چکروں میں پڑتا
ہوں۔ قوم اور قومی شناخت کے حوالوں کو برقرار رکھنا تو ہمارے
سیاسی رہنماؤں کا کام ہے۔ وہ جائیں اور ان کا کام۔ میں نے تو اپنی
ذاتی ذہانت، تجربہ اور خود اعتمادی سے کام نکال لیا ہے۔“ میرے
ذہن نے جواز پیش کیا اور میں اندر سے مطمئن ہو گیا۔ اصل خرابی
لیکھی تھی کہ ہماری قیادت نے عوام کو ملک اور قوم سے بالکل الگ
تھک کر کے وہ ٹھیک خود لیا ہوا تھا۔ کڑوٹوں کی بھیڑ میں ہر شخص
انفرادی طور پر ممتاز نظر آنے کے لیے ہاتھ پیرا رہا تھا۔ ملک اور
قوم کا درد ان لوگوں کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا جو اس کے وسائل پر
قائم ہو کر لوٹ مار میں مصروف تھے۔

اس وقت رات ہو چکی تھی اور فوری طور پر مکاؤ روانگی
مناسب نہیں تھی اس لیے میں نے وہ رات وہیں گزارنے کا فیصلہ
کر لیا۔ ہمارے اس ”پار“ ہانگ کانگ میں زندگی کا چلن ذرا مختلف
ہوا کرتا تھا اس لیے میں نے کولون ہی کے کسی ہوٹل میں کمرہ
عائل کرنے کی نیت سے معلومات کاؤنٹر کا رخ کیا تو وہاں بیٹھے
ہوئے چینی نے بے رخی کے ساتھ ایک فہرست میرے آگے ڈال

لوگوں تک تمہاری رسائی نہیں ہے۔“

”ہو سکتا ہے کہ تمہارا خیال درست ہو۔ میں تمہیں صرف یہ

بتانا چاہتا تھا کہ میں تمہارے مشورے پر عمل کرتے ہوئے ابھی
ابھی ہانگ کانگ آچکا ہوں۔ کل میں مکاؤ پہنچنے کی کوشش کر رہا
گا۔“

”واقعی؟“ اس نے میری بات کاٹ کر حیرت سے پوچھا۔
”اس وقت تم کہاں سے بول رہے ہو؟“

”کمرانمبر سوڈ“ اوسنی ہوئی۔ مجھے دیر نہ ہوئی ہوئی تو میں
ابھی مکاؤ کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ میں نے آٹھ ہند کر کے تمہارے
مشورے پر عمل کیا ہے۔ اب ڈون تک رسائی کے لیے تمہیں میری
مدد کرنی ہوگی۔“

”اے طور پر مکاؤ کا رخ کرنے کی غلطی نہ کرنا۔“ اس نے
جلدی سے کہا۔ ”جنیوں کے لیے مکاؤ بہت خطرناک جگہ ہے۔
اب تم ہانگ کانگ آئی گئے ہو تو صبح الفا ہاؤس میں چائنا ٹریل
سروس کی مس روڈ سے مل لیتا۔ میرا حوالہ دو گئے تو وہ تمہاری
کائی مدد کرے گی اور تمہاری یہاں آمد کا انتظام کرا دے گی۔“

”لیکن یہ الفا ہاؤس کہاں ہے؟“ میں نے اس کے تعاون پر
خوشی محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

”تمہارے ہوئل سے چند منٹ کا راستہ ہے۔ تاہم روڈ پر یہ
عمارت خاصی مشہور ہے۔ چاہو تو ۷۷۳۳۱ پر فون کر لیتا، بلکہ جانے
سے پہلے فون کرنا ہی بہتر ہے گا۔ تمہارے بارے میں وہ مجھے باخبر
رکھے گی۔ موقع ملا تو میں مکاؤ میں خود تم سے رابطہ کر لوں گی۔ تم
مجھے فون کر سکتے ہو لیکن مجھ تک پہنچنے کی کوشش نہیں مہنگی پڑ سکتی
ہے۔“

”اس ہمدردی کے لیے میں تمہارا بہت شکر گزار ہوں لیکن تم
مجھے خوف زدہ کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ مکاؤ انجینیوں کے لیے
خطرناک ہے، تم تک پہنچنے کی کوشش مہنگی پڑ سکتی ہے۔ آخر ان
باتوں سے تمہارا کیا مطلب ہے؟“

”میں کچھ نہیں بتا سکتی۔ یہاں آؤ گے تو ساری باتیں خود بخود
سمجھ میں آتی۔“ اس کا قہر اوجھڑا دیا اور ایک بیک فون کی
لائن کٹ گئی۔

ہانگ کانگ جیسے ترقی یافتہ شہر میں ٹیلی فون لائن کا یوں اچانک
منقطع ہو جانا، میرے لیے ناقابل فہم بلکہ تشویش ناک تھا۔ میرے
ذہن میں پھلا خیال یہی آیا کہ کہیں ڈون کے کسی نمک خوار نے وہ
مفتگو سن کر اس عورت پر ہاتھ نہ ڈال دیا ہو۔ وہ فون پر کسی ایسے
مفتض کے ساتھ ہمدردانہ گفتگو میں مصروف تھی جس سے ڈون نے
کوئی بھی بات نہ کرانے کی ہدایت کی ہوئی تھی۔

اگر وہ عورت عتاب میں آگئی تھی تو پھر غزالہ بھی خطرے میں
تھی۔ اس امکان کا دھیان آتے ہی میرے بدن میں سنسنی کی لہر
سرایت کر گئیں اور میں دوبارہ ڈون کا نمبر ملانے میں مصروف ہو
گیا۔

معدے میں انڈیلی اور ہارر کے اس بار، ہانگ کانگ کے پہاڑی
جزیرے کے دامن سے اوپر تک پہنچی ہوئی روشن اور چمک دار
عمارتوں سے لطف اندوز ہونے لگا۔

اس وقت میں اداس اور تنہا لیکن میں نے دل ہی دل میں
ارادہ کر لیا تھا کہ غزالہ کو ڈون کو ہانگ فو کی تحویل سے نکالنے کے
بعد میں اسے ہانگ کانگ، کا چپہ چپہ دکھاؤں گا اور دنیا بھر کی
مصنوعات سے لدے ہوئے، پر شکوہ شاپنگ مالز میں اسے دل کھول
کر خریداری کراؤں گا۔

میں اپنے خیالات کی دنیا میں غم، کافی دیر تک وہاں کھڑا رہا۔
جب فضا میں خنکی کا احساس پڑنے کا تو میں وہاں سے آہستہ آہستہ
واپس چل دیا۔

مجھے اگلے روز مکاؤ روانہ ہو جانا تھا پھر وہاں سے شام سا چوٹی کا
مرکزی علاقہ بھی بہت قریب تھا اس لیے میں نے کہیں دور جانے
کے بجائے کیٹون روڈ پر واقع اوسنی ہانگ کانگ ہوئل کا راستہ
لے لیا۔ خریداری اور سیاحت کے لیے آئے ہوئے غیر ملکیوں کی
بھاری تعداد کی وجہ سے ہانگ کانگ کے اچھے ہوٹلوں میں پیشگی بکنگ
کے بغیر عموماً کمرے دستیاب نہیں ہوتے لیکن میری خوش قسمتی تھی
کہ مجھے اوسنی ہوئل کی قیمتی منزل پر کمرال گیا۔

ٹھکانا میرا آتے ہی، مکاؤ کی فکر میرے سر پر سوار ہو گئی۔ میں
آرام وہ بستر دراز ہو کر دیر تک غزالہ اور اس کی مشکلات کے
بارے میں سوچ کر اداس ہوتا رہا اور جب وہ لہر میرے لیے ناقابل
برداشت ہونے لگی تو میں نے مکاؤ فون کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے
بستر چھوڑ دیا۔

جس طرح مجھوں کو لپٹی کی طرح سب لپٹی بھی عزیز تھا اسی طرح

مجھے غزالہ کے حوالے سے کوئٹہ فو کی سیکرٹری سے کچھ انسیت ہو
چلی تھی۔ غزالہ سے میری بات ہوئی تاہم ممکن تھی لیکن یہ تو ہو سکتا تھا
کہ میں کوئٹہ فو کی سیکرٹری کو اپنی ہانگ کانگ آمد کی اطلاع دے

دیتا۔ اگر اس عورت کے دل میں ترحم اور انسانی ہمدردی کا ذرا سا
بھی جذبہ موجود ہو تا تو موقع نکال کر وہ خوش خبری غزالہ تک پہنچا
سکتی تھی۔

کوئٹہ فو کے محل کے فون سے پہلی ہی کھنٹی پر رابطہ ہو گیا۔

روایتی مراحل سے گزرنے کے بعد اس کی سیکرٹری لائن پر آئی تو
اس نے میری آواز سنتے ہی مجھے پہچان لیا۔

”کو، دیر کا کوئی سراغ ملا؟“ اس نے چھوٹے سی سوال کیا۔
”یا تم ابھی تک بھگ رہے ہو؟“

”میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ مجھے دیر کے بارے میں کچھ معلوم
نہیں۔ میں اس کی نقل و حرکت کے بارے میں اندازہ میرے میں
ہوں۔“

”کوئی نہ کوئی اس کے بارے میں ضرور جانتا ہو گا۔ شاید ایسے

وہ یکسر بے بنیاد ثابت نہیں ہوئے تھے۔ دوسری بار ہونے والی بات چیت سے یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ ہماری گفتگو کہیں اور بھی سنی جا رہی تھی یا بھر سیکرٹری کے پاس، 'ڈون' کا کوئی پرانا نمک خوار جا بچا تھا، جس کی موجودگی میں وہ بے پروایانہ انداز میں گفتگو جاری نہیں رکھ سکتی تھی۔

اس سے دوبارہ بات کر کے مجھے کم از کم یہ اطمینان ہو گیا تھا کہ میری اور اس کی ابتدائی گفتگو کے نتیجے میں وہ فوری طور پر کسی مقام کا نشانہ نہیں بنی تھی۔ وہ خود محفوظ تھی جس کا مطلب تھا کہ غزالہ پر بھی کسی سختی کے آغاز کا خطرہ نہیں تھا اور اس وقت میرے لیے وہی بڑی بات تھی۔

میں کمرے کی روشنیاں مغل کر کے، آرام دہ بستر پر دراز ہو گیا تاکہ آنے والے دن کی بگاہہ خیر بھاگ دوڑ کے لیے اپنی توانائیاں مجتمع کر سکوں لیکن نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

اوشی ہانگ ہانگ ہوئی کے کمرانبرچہ سود میں میں ایک عجیب و غریب ذہنی کیفیت سے دوچار تھا۔ میرے لیے اس شرمناک ملک کی حیثیت نراستے کی ایک سرانے سے زیادہ نہیں تھی۔ میں اس وقت اپنے وطن سے ہزاروں میل دور تھا اور میری منزل بھی بہت قریب نہیں تھی۔ اس درمیانی پوزیشن کی وجہ سے میرا ذہن دو طرفہ پلغار کی زد میں آیا تھا۔

کبھی غزالہ اور سلطان شاہ کے بارے میں دوسوے سرباہار رہے تھے تو کبھی کراچی کی پیچیدہ صورت حال میرے ذہن پر مسلط ہو جاتی تھی۔

غزالہ کے ساتھ ساتھ، میرے لیے بلجو کراس ذیل بھی بہت اہم تھی۔ ایک طرح سے وہ دونوں ذاتی اور قوی افتخار کے معاملات تھے۔ غزالہ کے تحفظ، بلکہ حصول کے لیے میں نے پاکستان سے ہانگ کالنگ کی طرف دوڑ لگا دی تھی اور بلجو کراس ذیل کی حفاظت کے لیے، ویرا کویشے میں اتار کر، ایران جانے پر آمادہ کر لیا تھا۔ اسٹیشن ٹاسک فورس کے مقامی سربراہ ظفر کے ذریعے مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ ویرا نے اپنا مشن بہت خوبصورتی کے ساتھ پورا کر لیا تھا اور محض ایک ٹرک کی قربانی دے کر، اپنی آلات اور ساز و سامان کی پوری کھپ کو پاکستان کی سرحدوں میں داخل ہونے کا موقع فراہم کر دیا تھا۔

اس کے بعد مانیا کے 'ڈان' نیٹھی کاؤ کے عزائم کی باری آتی تھی۔ وہ شکی پسندی سے پیدا ہونے والے فنون خیر ظلا کو مانیا کی سرگرمیوں سے چُر کرنا چاہتا تھا۔ اس کے مربوط منصوبے میں' منشیات کی اندھمی کمانی کی سیاست میں سرمایہ کاری کو کلیدی اہمیت حاصل ہو گئی تھی۔ اپنے عزائم کے استحکام کے لیے اس نے جی لائیڈ سے سمجھوتہ بھی کر لیا تھا جس کی رو سے اگر میں نیم کن اور سلور آئینز داہیں کر دتا تو شکی سربراہ میرا پیچھا چھوڑ سکتا تھا لیکن میرے لیے، آنے والے دن بہت غیر یقینی تھے۔ ویرا کو دو دطلانی سکوں کا مالک بنا دینے کے بعد میرے پاس صرف ایک سلور آئی د

تیسری کو شش میں ڈون کو ایک فوکے نمبر سے رابطہ ہو گیا۔ اس خصوصی نمبر ڈون کے اعتقادہ حفاظتی نظام سے مفر ممکن نہیں تھا۔ جو لوگ چوہے کی کرب آمیز آوازوں کے ریز سے واقف تھے، وہی ڈون کی سیکرٹری سے ہم کلام ہونے کا شرف حاصل کر سکتے تھے اور میرا شمار ایسے ہی گئے چکے خوش نصیبوں میں کیا جا سکتا تھا اس لیے میں اپنے متاثرہ تھکان کے باوجود، تروڈ کے عالم میں ان بات کے گزر جانے کا انتظار کرتا رہا۔

وہ مراحل گزر جانے کے بعد، جون ہی سلسلہ کلام کی ابتدا ہوئی ڈون کو ایک فوکے سیکرٹری نے اپنے ساؤنڈ اسکینر کے ذریعے ہمیں آواز پہچان لی اور اس کا لب و لہجہ خلگ ہو گیا۔

"تم بار بار فون کر کے مجھے پریشان نہ کرو!" اس کی تیز و تند آواز ابھری۔ "تم کراچی میں رہو یا مکاؤ آؤ۔ یہ سب تمہاری اپنی مرضی پر منحصر ہے۔ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ اب ڈون تم سے اس مسئلے پر کوئی بات نہیں کرے گا۔ نہ ہی میں تمہاری کوئی مدد کر سکتی ہوں۔"

اس کے فقرے معنی خیز تھے۔ میں نے چند منٹ پہلے ہی 'فون پر اسے بتایا تھا کہ میں کراچی سے ہانگ کالنگ پہنچ چکا تھا۔ جواب میں اس نے مجھے چائنا ٹریول سروس میں ایک لڑکی سے رجوع کرنے کا مشورہ بھی دیا تھا لیکن اب وہ ہر بات سے انجان بن کر یہ ظاہر کرنا چاہ رہی تھی جیسے اسے میری ہانگ کالنگ میں موجودگی کا علم ہی نہ ہو۔ اس کا مطلب تھا کہ میری پہلی کال اتفاقاً منقطع نہیں ہوئی تھی۔ شاید اسے اپنے قرب و جوار میں کسی کی موجودگی کا شبہ ہو گیا تھا اور اس نے اپنی چڑی بچانے کے لیے لائن کاٹ دی تھی۔ دوسری بار گفتگو کی ابتدا ہوتے ہی اس نے مکاری کے ساتھ مجھے اپنی پوزیشن سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ میرے لیے وہ بہت اچھی علامت تھی کہ ڈون کے ناقابل رسائی مغل میں میری ایک ایسی ہمدردی ہو چکی تھی جو ڈون کی لاعلمی میں میری مدد کر سکتی تھی۔

"اگر میں ڈون سے فون پر بات نہیں کر سکتا تو پھر مجھے مکاؤ ہی آنا پڑے گا۔" میں نے اس کی گفتگو کی روشنی میں کہا۔ "میں پہلی فرمت میں مکاؤ پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں اپنا سر ڈون کے قدموں میں رکھ دوں گا پھر اس کی مرضی ہو گی کہ وہ مجھے اٹھا کر سینے سے لگائے یا میری گردن اڑا دینے کا حکم صادر کر کے پورا قصہ ہی تمام کر دے۔ تمہ۔"

"بس! بس! اب میں تمہاری مزید تقریر نہیں سنوں گی۔" میری بات کانٹے ہوئے، اس کی ترش آواز ابھری۔ "اب تیسری بار فون کر کے اپنا اور میرا وقت برباد کرنے کی کوشش نہ کرنا۔"

اسی کے ساتھ، دوسری طرف سے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔ میں چند خاموشی تک بے جان ریسیور کو اپنے کان سے لگائے غالی الذہنی کے عالم میں بیٹھا رہا پھر اسے کڑیل پر ڈال دیا۔

ڈون کی سیکرٹری سے گفتگو کرتے ہوئے پہلی بار فون کا رابطہ یقیناً منقطع ہونے پر میرے ذہن میں جن اندیشوں نے جنم لیا تھا

سے ملاقات کا بہانہ کر کے کراچی سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اپنے چیف، حبیب جیوانی اور نیٹھی کاؤ کی دانست میں، اس نے جان سے معاملات طے کرنے کی نیت سے اسلام آباد کے سفر روانہ ہوا تھا جب کہ میری اصل منزل مکاؤ میں ڈون کو ایک فوکی ہوئی تھی۔

اس مرحلے پر میرے لیے صرف ایک ہی بات تشویش ناک تھی کہ نیٹھی کاؤ اور ڈون کو ایک فوپیڈ انٹی اعتبار سے ہم وطن اور قدیم پر دسی ہی نہیں، بچپن کے گھر کے دوست بھی تھے۔ ان میں سے ایک مانیا کا ڈان تھا تو دوسرا شی کا ناقابل شکست آئی۔ لیکن نیٹھی کاؤ کو اپنے بچپن کے حرام پر اتنا ناز تھا کہ وہ پیشہ ورانہ رقابت کے عنصر کو نظر انداز کر کے ڈون کو ایک فو سے مکاؤ میں ملاقات کرنے کا ارادہ کر چکا تھا اور اس ملاقات کا سبب بھی میری ہی ذات تھی۔

ڈان نیٹھی کاؤ مکاؤ میں ڈون کو ایک فو سے مل کر اُسے یہ سمجھانا چاہتا تھا کہ وہ میرے معاملے میں اپنے سپر آئی، جی لائیڈ کو اعتدال کی راہ پر رہنے کا مشورہ دے تاکہ میری وجہ سے شی اور مانیا کے پیشہ ورانہ حرام میں کوئی دراڑ نہ پڑے۔

نیٹھی کاؤ کی تجربہ کار نگاہوں نے یہ بھانپ لیا تھا کہ آئے والے دنوں میں، مانیا کی کارکردگی میں میرا کردار بہت سی اہم فو میت کا حامل ہو گا اور اگر شی یا جی لائیڈ کی طرف سے حاوی آرائی کا تسلسل برقرار رہا تو اس کے نتیجے میں میری اعلیٰ کارکردگی متاثر ہو سکتی تھی۔

ان ہی پیچیدہ اور گھٹک خیز حالات سے لاتے ہوئے میرے ذہن پر ٹھکان طاری ہونے لگی اور میں سگریٹ سٹاک کرانے کے لیے اس کھڑکی کے سامنے جا کھڑا ہوا جو بار کے نیلے پائوں اور اس کے پار پھیلے ہوئے ہانگ ہانگ کے پھاڑی جزیے کی طرف کھلتی تھی۔

کھڑکی سے باہر کا منظر اس قدر حسین اور خوبصورت تھا کہ چند ثانیوں کے لیے، میں مبسوت ہو کر رہ گیا۔ میں کچھ پہلے ہی کولون کے ساحل سے، روشنیوں میں نہائے ہوئے ہانگ ہانگ کا منظر دیکھ کر محظوظ ہو چکا تھا لیکن اومنی ہانگ ہانگ ہوئی کی چمکی منظر سے اس منظر میں کچھ عجیب سا حسن پیدا ہو گیا تھا۔

ہانگ ہانگ ہانگ ہانگ کی ٹنگ سی آبی گزر گاہ پر ایک طرف سے جزیہ ہانگ ہانگ کی روشنیوں کا بحر و انکسار پڑ رہا تھا تو دوسری طرف کولون کے ساحل پر جھنگاتی ہوئی روشنیوں نے سمندر کے پانی کو روشنی کا غسل دیا ہوا تھا۔ اس طرح مشرق بعید کی اس ٹنگ سمندری راہداری کا چہرہ چہ خیز نہ سہی تو خاصی خوشنویس نما ہوا تھا۔ بظاہر سمندر کی سطح بالکل پرسکون تھی لیکن اس پر روشن اور تاریک وجہوں کا مخصوص احتزاج سمندر کے سینے پر موجوں کے

زیرویم کی نشان دہی کر رہا تھا۔ ان وجہوں میں نمودار ہونے والی روشن لکیریں ان برق رفتار اپنیڈ بولس کی نشان دہی کر رہی تھیں جو اپنے سینوں میں عیش و طرب کی مختصر سی کائناتیں سجائے، سمندر

کلی تھی جو کسی بھی آڑے وقت میں میرے کام آسکتی تھی۔ رہی نیم گن، تو وہ ہانگ ہانگ میں بھی میرا واحد ہتھیار تھی۔

اپنی ناگزیر ضروریات کے پیش نظر، میں نے نیٹھی کاؤ سے کہہ دیا کہ میرے پاس جی لائیڈ کی مطلوبہ اشیا موجود نہیں تھیں۔ اس سے انکار کرتے ہوئے میرے ذہن میں یہ امکان پوری طرح روشن تھا کہ نیٹھی کاؤ کا جواب ملنے کے بعد جی لائیڈ مشتعل ہو کر میرے خلاف زیادہ شدہ سے صف آرا ہو سکتا تھا اور شاید مانیا والے بھی میری بھرپور حمایت سے کناہہ کش ہو کر مجھے، شی کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے۔

لیکن میرے ستارے میرا ساتھ دے رہے تھے۔ قدرت نے کافی عرصہ پہلے میری مدد کے امکانات کی داغ بیل ڈال دی تھی۔

جی لینگ جوش کا ایک مکار اور خوشخوار ایجنٹ تھا، ابتدا ہی سے نیٹھی کاؤ کے پیچھے لگا رہا تھا۔ مرنے سے قبل اس نے اپنی ہتھکڑیوں میں یہ بتا دیا تھا کہ وہ نیٹھی کاؤ کی بوسہ کھینچا ہوا، شکاک کے چاٹنا ڈانوں

میں اس کے ٹھکانے پر پہنچا تھا اور پھر نیویارک، لندن اور دہلی کے راستے اس کا تعاقب کرتا ہوا ڈیفنس کے اُس مکان میں پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا جہاں نیٹھی کاؤ میرے ساتھ اہم ہتھکڑیوں میں مصروف تھا۔ شی کے اس ایجنٹ نے اپنی ہتھکڑی ابتدا میں یہ ذکر بھی کیا تھا کہ نیٹھی کاؤ مجھ سے ملاقات کا مشن لے کر بنگال سے نکلا

تھا۔ بیک وقت شکاک اور بنگال کے ذکر سے میں صرف ایک ہی نتیجہ اخذ کر سکا تھا کہ نیٹھی کاؤ نے میرے بارے میں سو بے بازی کے لیے، شی کے کسی آئی مین یا شاید جی لائیڈ سے بنگال میں

خدا کر کے ہوں گے جن میں یہ طے پایا ہو گا کہ اگر میں سلور آئیز اور نیم گن واپس کرنے پر آمادہ ہو جاؤں تو جی لائیڈ میرے خلاف اپنی حاوی آرائی ترک کر دے گا۔ وہ سمجھتا ہونے کے بعد نیٹھی کاؤ

شکاک کو لوٹ گیا ہو گا اور شی نے جی لینگ کو اس کے پیچھے لگا دیا تاکہ وہ نیٹھی کاؤ کے تعاقب میں مجھ تک پہنچ سکے۔ میں نیٹھی کاؤ کو اُس کی

مطلوبہ اشیا لوٹانے پر آمادگی ظاہر کرتا تو شاید جی لینگ، کوئی بھی کارروائی کیے بغیر واپس لوٹ جاتا لیکن میری ہٹ دھرمی کا مظاہرہ دیکھ کر وہ مجھے قتل کرنے کے ارادے سے سامنے آنے پر مجبور ہو

گیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ جی لینگ اور اس کے دونوں ساتھی، نیٹھی کاؤ کے ہاتھوں بے رحمانہ انداز میں جہنم واصل کر دیے گئے

لیکن نیٹھی کاؤ پر شی اور جی لائیڈ کی بدینتی واضح ہو گئی۔ نیٹھی کاؤ کے لیے یہ تصویر ہی چمک آمیز تھا کہ شی کے بیٹوں نے

مانیا کے ایک ڈان پر اعتماد نہ کرتے ہوئے، اپنے ایک معمولی ہر کار سے کو ابتدا ہی سے اس کے تعاقب میں لگایا ہوا تھا۔

شی کی طرف سے بے اعتمادی کے اس شرمناک مظاہرے کی پینا پر نیٹھی کاؤ میرے انکار کے مضمرات کو نظر انداز کرنے پر مجبور ہو

گیا اور میں مانیا میں اپنا مقام برقرار رکھنے میں کامیاب رہا۔ مجھے دوسری بڑی کامیابی یہ ہوئی کہ میں ڈان کی طرف سے

مقامی سیاست میں سرمایہ کاری کی ہدایت کی آڑے کر، امیر جان

کے فون ہی بند نہ کر دے۔

”بزنس کی بات ہے تو بلا تکلف چلے آؤ!“ ریسور پر پہلی بار اس کی خوش دلانہ ہنسی کی آواز سنائی دی۔ ”ہمارا دفتر ستائیس“ ناخن روڈ پر الفا ہاؤس کی پہلی منزل پر ہے۔ سیڑھیاں ناخن روڈ کی بنگلہ سڑک پر ہیں۔ ہمارا بڑا سا بوڈووری سے نمایاں نظر آتا ہے۔“

”ٹھیک ہے“ میں آ رہا ہوں۔ ادنیٰ ہوٹل سے ہمارے دفتر آئے میں مجھے بنگلہ چند منٹ لگیں گے۔“ میں نے اس کے بدلے ہوئے روپے پر مسرت کے ساتھ کہا اور فون بند کر دیا۔

ناخن روڈ، شمس سا جوئی کی شہر رگ کی جاسکتی تھی جہاں سڑک کے دونوں طرف دنیا بھر کی اشیائے فحش سے لدی ہوئی دکانیں، گلیوں میں دو در دو رنگ پھیلی ہوئی تھیں۔ اسی سڑک پر چنگ سینٹر نامی وہ دو منزلہ مارکیٹ بھی تھی جو پاکستانیوں اور ہندوستانیوں کا گڑھ سمجھی جاتی ہے کیوں کہ وہاں تمام تر دکانیں ان ہی اقوام کے لوگوں کی ملکیت ہیں جن میں غلبہ بھارتیوں کا ہے۔ میرا خیال تھا کہ میں وہاں پہنچنے کے بعد آسانی کے ساتھ الفا ہاؤس تلاش کر سکتا تھا لیکن ہوٹل سے اترنے کے بعد میں نے ارادہ بدل دیا۔

تلاش میں وقت ضائع ہونے کی صورت میں مجھے روٹنے کے سامنے شرمندگی کا سامنا ہو سکتا تھا اس لیے میں نے قریب ہی سے گزرتی ہوئی سرخ نیکی روکی جو ٹوٹا کر آؤں تھی۔

پاکستان میں پچھوا، مرشدز اور اکاڑے کے ساتھ ہی ٹوٹا کر آؤں بھی طبقہ امرا کی پسندیدہ گاڑیوں میں شمار کی جاتی ہے ہانگ کانگ کی سڑکوں پر اسے نیکی کی صورت میں رواں دیکھ کر اس تصور کو خاصی نہیں ملتی ہے۔

میز گرتے ہی، براہ راست نو ہانگ کانگ ڈالر کی رقم سامنے آگئی جو خاصی تشویشناک تھی لیکن فوراً ہی دو دانے کی اندرونی سمت میں چسپاں سرخ عبارت پر نظر پڑی تو معلوم ہوا کہ اس ملک کے دونوں حصوں میں ٹھیک فاصلوں کے پیش نظر، نیکیوں کا کم سے کم کرایہ نو ڈالر مقرر تھا جو تین کلو میٹر تک کے لیے تھا۔ اس سے آگے نی کلو میٹر تین ڈالر کی شرح سے اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ مسافر کے سامان کے لیے چار ڈالر فی عدد کی شرح مقرر تھی۔ اسی طرح پرندوں کے لیے بھی شرح مقرر تھی۔ ہارر کے پار جانے کے لیے میز سے بیس ڈالر فاضل ادا کرنے ضروری تھے کیوں کہ زیر زمین سمندری سڑک استعمال کرنے کے لیے دس ڈالر ایک طرف ٹول نیکی ادا کرنا ہوتا تھا۔

میں جیسی میں چسپاں اس معلوماتی پوسٹر کو پوری طرح پڑھنے بھی نہ پایا تھا کہ جیسی ایک جھگٹے سے رک ٹکی اس کے پیچھے آنے والا ٹریفک کسی بے تابی کا مظاہرہ کیے بغیر قائم کیا میں نے جلدی سے اس ڈالر کا نوٹ ڈرائیور کو تھمایا اس نے سرسری انداز میں نوٹ اپنی پیشانی تک لے جا کر مجھے آگاہ کیا کہ نو ڈالر کرائے کے علاوہ اس نے بغیر ایک ڈالر کو ٹپ تصور کر لیا تھا۔

کے سینے پر دو اں تھیں۔

سیما صفت اور برقی رفتار کشتیوں کے اس دور میں کئی دھانی کشتیاں بھی نظر آ رہی تھیں جو ست رو تفریح کے مسافروں کی دل جوئی کے لیے نیلے پانچوں پر محو خرام تھیں۔ برقی رفتار اسپید بولس کے مقابلے میں، دھانی کشتیوں کی دھواں اگھتی ہوئی، خال خال چٹیاں سمندر میں ایک ہی جگہ ٹھہری ہوئی نظر آ رہی تھیں میں کافی دیر تک کھڑکی کے شیشے میں سے ہانگ کانگ کی اونچی عمارات پر نصب، دیو بیکل روشن اشتہارات کی عبارتوں کے مطالعے کے ساتھ سمندری چل چل کا جائزہ لیتا رہا پھر دوبارہ بستر پر آگرا۔

اس رات وہ کہہ کر میری آنکھ کھلتی رہی اور میں نے عملاً وہ پوری رات نیم خوابی اور بے خوابی کے عالم میں گزاری اور جو ہی کھڑکی سے باہر راہوار مشرق کا نور پھیلتا نظر آیا، میں بستر چھوڑ کر غسل خانے میں جا گھسا۔ بدن پر گرنے والی، پانی کی نیم گرم اور لٹھڑی دھاریں چند ہی منٹ میں ساری ٹھکان بنا کر لے گئیں اور میں ناڈی کے ایک نئے احساس کے ساتھ غسل خانے سے باہر نکل آیا۔

ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں، میں نے بہت دھیمے دھیمے ناشتا ختم کیا۔ میرا مدعا صرف وقت گزارنے کا تھا کیوں کہ چائنا ٹریول سروس کا دفتر جج سے پہلے نہیں کھلتا تھا۔

مقررہ وقت پر میں نے اپنے کمرے سے چائنا ٹریول سروس کا نمبر لایا تو دوسری طرف سے فون اٹھانے والی ہی میری مطلوبہ خاتون ثابت ہوئی۔

”مس روٹا! میرا نام تو یہ ہے!“ میں نے آہستگی سے کہا۔ ”مجھے مس شوائے نے تم سے رابطہ کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ میں اسی وقت تم سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”اوہ!“ روٹا کی نرم اور حرم آواز ابھری۔ ”شوائے میری بہت اچھی اور پرانی دوست ہے لیکن کیا یہ ممکن نہیں کہ ملاقات کے لیے تم شام تک انتظار کر لو۔ میں چھ بجے آف ہو جاتی ہوں۔“ ”لیکن میرا ابھی ملنا ضروری ہے کیوں کہ۔۔۔“ میں نے زور دیتے ہوئے وضاحت کرنی چاہی لیکن روٹا نے اضطراری طور پر میری بات کاٹ دی۔

”میں دفتر میں بہت مصروف ہوتی ہوں۔ ویسے بھی یہاں کام کے اوقات میں نجی ملاقاتوں کو معیوب سمجھا جاتا ہے۔ میں تمہیں مناسب توجہ نہ دے سکتی تو تم بھی برا محسوس کرو گے۔“

’پھر دینی خالص کاروباری ذہنیت‘ جس نے ہانگ کانگ میں بے ہوئے خوش حال چینیزوں کو جذبات سے عاری مشین بنا کر رکھ لیا ہے۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا پھر جلدی سے کہا۔

”میری ملاقات کا تعلق ہمارے کام سے ہے۔ میں جلد از جلد مکان پر آنا چاہتا ہوں۔“

مجھے تو تھا کہ میں نے اسے قائل کرنے میں تاخیر سے کام لیا تو کس وہ وقت کی کفایت کے لیے ایک بیک کوئی الوداعی فقرہ ادا کر

ساتھ کام میں مصروف تھے۔ ہر شخص کے سامنے کوئی نہ کوئی بھٹا ہوا تھا۔ بظاہر وہاں محافظ کے علاوہ کوئی ایسا خالی فرد نظر نہیں آیا جس سے میں ددھکا کے بارے میں معلوم کرتا۔ کاؤنٹر کے پیچھے تین عورتیں یا لڑکیاں بھی تھیں لیکن وہ مردوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی مصروف نظر آ رہی تھیں۔ میں چند خاتون تک وسط میں کھڑا ہوا اور اُدھر دیکھتا رہا۔ مجھے توقع تھی کہ میری بے بسی کو دیکھتے ہوئے کوئی نہ کوئی میری طرف متوجہ ضرور ہو گا لیکن اس دفتر میں ایسا کوئی رواج نہیں تھا۔

آخر کار میں محافظ کی طرف بڑھا۔ وہ کرسی پر دراز یا نیم ہاتھ سے مسلسل اپنا رخسار سمجھانے میں مصروف تھا۔ اپنے سامنے کسی کی موجودگی محسوس کر کے اس نے نیم دا آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور میرے منہ کھولنے سے پہلے ہی کاؤنٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”نمبر کی پرچی لے لو۔“

”مجھے کس روٹ سے ملنا ہے۔ میں نے ابھی اس سے فون پر وقت لیا ہے۔ میرا انتظار کر رہی ہو گی۔“ میں نے اپنی بکھڑپڑ پر قابو رکھتے ہوئے ”زی“ سے اُسے سمجھانا چاہا۔ میری بات سن کر اُس کی آنکھوں میں ششدر آمیز چمک پیدا ہو گئی اور وہ بے پروائی کے ساتھ بولا۔ ”میں اس کوئی کسی کو وقت نہیں دیتا۔ پرچی لے کر اپنی باری کا انتظار کرو۔“

اس سے الجھتا ہے سو رہا تھا۔ میں نے خالی کاؤنٹر سے نمبر کی پرچی اٹھالی جس پر ایک سو اسی نمبر درج تھا۔ اس گڈی میں سارے نمبر ترتیب وار لگے ہوئے تھے۔

کرسی سمجھانے کے بعد جب مجھے مائیکروفون پر پندہ نمبر کی گونج سنائی دی تو اس دفتر کا نظام میری سمجھ میں آ گیا۔

اہل نما کاؤنٹر کے پیچھے چھت کے ساتھ ایک الیکٹرانک بورڈ لٹک رہا تھا اور اسی کے نیچے ایک لڑکی مائیک سمجھانے اعلان کر رہی تھی۔ اس کے اعلان کرتے ہی الیکٹرانک بورڈ پر چوہ کی جگہ پندہ نمبر لے لے لی۔ اس وقت تک کاؤنٹر کے سامنے سے ایک اوجڑ عمر عورت اٹھ چکی تھی اور پندہ نمبر والا ”لبا ترنگا امر کی اپنا بیگ سمجھانے کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا تھا۔

گویا وہاں انتظار کرنے والوں کو ہر وقت یہ معلوم رہتا تھا کہ ملاقاتوں میں کون سا نمبر چل رہا ہے۔ کاؤنٹر خالی ہوتے ہی اگلے نمبر کو پکار لیا جاتا تھا۔ یہ طریقہ کار بہت سیدھا سا اور اچھے ضرر تھا لیکن ایک نجی کاروباری ادارے کے بجائے کسی سرکاری یا سفارتی مرکز کے لیے زیادہ موزوں نظر آتا تھا۔

میں نے غیر ارادی طور پر سگریٹ سلگانے کا ارادہ کیا تو وہاں تمباکو نوشی کی ممانعت کی کئی علامات نظر آئیں۔ میں نے دیکھا کہ پورے دفتر میں کوئی بھی سگریٹ نہیں پانی رہا تھا اور نہ ہی وہاں ایش ٹرے کی قسم کی کوئی چیز نظر آ رہی تھی۔

وہاں مصروفیت اور کام کی تقسیم کا یہ عالم تھا کہ مائیک والی لڑکی پندہ نمبر کا اعلان کرنے کے بعد ”اپنے سامنے رکھے ہوئے

ڈرائیور کی اس زبردستی بلکہ دیدہ دلیری پر مجھے تاؤ آیا لیکن اس مصروف مقام پر اس سے بحث کرنے کا موقع نہیں تھا۔ اسے آگے بڑھنے میں ڈرائی بھی دیر ہوئی تو اس کے پیچھے رکی ہوئی گاڑیوں کے ڈرائیوروں کے ممبر کا پٹا نہ لہرزا ہو سکتا تھا۔ زمین کی شگ کی وجہ سے وہاں کے راستے بھی تنگ تھے اور لوگ بائزر رکادوں کو مہمو حقل کے ساتھ برداشت کرنے کے عادی تھے لیکن بے جا رکادوں پر وہ نہایت سرعت کے ساتھ آپے سے باہر بھی ہو جاتے تھے۔

میں ٹیکسی سے اتر کر پڑھوں اور تنگ فٹ ہاتھ پر چڑھا تو تنگ اور چھوٹی چھوٹی گاڑیاں، دروازوں تک سامان سے بھری ہوئی تھیں اور ان ہی کے اوپر چائنا ٹریول سروس کا بورڈ نظر آ رہا تھا۔

بورڈ کے سارے ”عمارت کا تین کر کے میں تیزی سے اندر گھس گیا۔ لفٹ کے سامنے ٹاکا لی جگہ میں چند افراد انتظار میں کھڑے ہوئے تھے۔ مجھے صرف پہلی منزل تک جانا تھا اس لیے میں زمینوں کی طرف بڑھ گیا۔ پہلی منزل کے چھوٹے سے کوریڈور میں تینوں طرف بیٹھے کے دروازوں والی گاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ میں کے بعد دیگرے تیسری منزل بھی طے کر گیا لیکن چائنا ٹریول سروس کے آثار نظر نہیں آئے، میری حیرانی پر گھڑیوں کے ایک شو دم میں سے ایک مسلح چینی باہر آیا اور اشتباہ آمیز نظروں سے میرا جائزہ لینے لگا۔

”چائنا ٹریول سروس کا دفتر کہاں ہے؟“ میں نے سہل انگریزی میں پوچھا۔

میرا سوال سن کر اُس کے چہرے پر غلٹیں پھیل گئیں۔ وہ منہ ہی منہ میں کچھ بدایا پھر چینی زبان میں مجھے سمجھانے لگا۔ میرے چہرے پر پانی جانے والی حیرانی اور شاید بے حلقی نے اسے فوراً ہی احساس دلا دیا کہ مجھ پر اس کی زبانی محنت رائیگاں جا رہی تھی۔ وہ اندازہ کر لینے کے باوجود اس کی زبان بدستور چلتی رہی لیکن اس نے ہاتھ کے اشاروں سے بھی کام لینا شروع کر دیا۔ ان اشاروں سے معلوم ہوا کہ میں غلط عمارت میں داخل ہوا تھا۔ مجھے نیچے اتر کر لہجہ عمارت میں جانا چاہیے تھا۔

اس کا مفہوم سمجھنے ہی میں سر کی خیف سی جنبش سے اُس کا شکر یہ ادا کر کے واپس چل دیا۔ میرے لیے اتنی ہی کافی تھا کہ اس چینی محافظ نے میری مدد کرنے کی حتی الامکان کوشش کی تھی۔

براہر والی عمارت کی پہلی منزل پر چائنا ٹریول سروس کا دفتر سامنے ہی موجود تھا۔ وہ دفتر ایک ہال پر مشتمل تھا جو ہانگ کانگ کے خصوصی حالات کے تحت وسیع و عریض سمجھا جاتا ہو گا۔ دفتر کے داخلی دروازے پر محافظ کے بعد اندر ایک خالی کاؤنٹر تھا جس پر نمبر والی پرچیوں کی ایک گڈی رکھی ہوئی تھی۔ ایک طرف پلاسٹک کی چھوٹی چھوٹی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں جن میں مختلف رنگوں اور نسلوں کے لوگ، نمبر کی پرچیاں لیے اپنی باری کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ دو دیواروں کے ساتھ انگریزی کے اہل کی صورت میں لمبا سا کاؤنٹر تھا جس کے پیچھے چار پانچ افراد انہماک کے

ہوئی تھی۔

”میرا خیال ہے کہ فون پر میری تم ہی سے بات ہوئی ہو گی۔“ اس نے اپنی کرسی سے اٹھ کر مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے گرم جوش کے ساتھ کہا۔ ”میرا نام روونا ہے۔۔۔ روونا بین!“

”اور مجھے تو یہ کہتے ہیں۔“ اس کی گرم جوشی نے پہلے میری ہر طرف غصہ تحلیل کر دیا۔

”میں جلد از جلد مکاؤ جانا چاہتا ہوں۔“ کرسی سنبھالتے ہی میں نے مطلب کی بات جمیز دی۔

”کب واپسی کا ارادہ ہے؟“ اس نے اپنی کنکیناں کاؤنٹر پر رکھ کر دھیمی آواز میں پوچھا۔

”دو چار دن۔۔۔ یا شاید ایک ہفتہ بھی لگ سکتا ہے۔ ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“

”میں تم سے فون پر بات کرتے ہی سمجھ گئی تھی کہ ایسی ہی کوئی بات ہو گی ورنہ شوائے تم کو مجھ سے رجوع کرنے کا مشورہ نہیں دیتی۔ کس مکاؤ کے جوئے خانوں کی شہرت تو تمہیں وہاں نہیں سا جاری؟“

”کیا غیر ملکیوں کے لیے ان جوئے خانوں میں داخلہ ممنوع ہے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”ان کی روٹنی ہی غیر ملکی یا حوں کے دم سے ہے۔ بات مزہ اتنی ہی ہے کہ لمبی رقبیں جیتنے والے جواری مکاؤ سے بہت کم مچا کر سلامت واپس آتے ہیں۔“

”تو کیا وہاں لا قانونیت اتنی زیادہ ہے کہ نوبت قتل وغارتگری تک آگئی ہے؟“

”اول تو وہاں کبھی بھی قانون کی بہت زیادہ بالا دستی نہیں رہی۔ سارا امن و امان اس لیے نظر آتا ہے کہ اس میں مکاؤ کے بد معاشوں کا مفاد ہے۔ وہاں ہر دقت و فساد ہونے لگے تو گھنٹہ بھر جواری اُدھر کا رخ بھی نہیں کریں گے۔ بس جیتنے والے کو ان کے ایجنٹ جو ٹکوں کی طرح گھیر لیتے ہیں پھر لڑکیوں اور شراب کے پیکر میں انہیں گھیر گھار اپنی کسی لالچ میں لے جاتے ہیں۔ کھلے سہارے واپسی پر اُن کا شکار اپنی ساری جمع پونجی سے محروم ہو چکا ہوتا ہے اور شرم کے باعث کسی سے شکایت تک نہیں کرتا۔“

”تم تو مکاؤ پر احماتی معلوم ہوتی ہو؟“ میں نے ہنس کر کہا۔

”میرا جوئے بازی کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں ڈون کو اننگ فوٹے

لٹنے کے لیے وہاں جانا چاہتا ہوں۔“

میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں پھر اس نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ ”وہ مکاؤ کا بہت خطرناک اور بڑا آدمی ہے۔ وہاں اس کا نام لینے والوں کی زبانیں تک کاٹی جا چکی ہیں۔ سب لوگ اسے صرف ڈون یا بڑا بھالی کہتے ہیں۔ مکاؤ جا رہے ہو تو آئندہ اس کا نام لینے کی غلطی نہ کرو۔“

اُس کے اس انکشاف پر مجھے اپنا حلق خشک ہو چکا تھا۔

لیکن میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ہدایت کا شکر ہے۔“

کاغذات کے پلندے کو نمٹانے میں مصروف ہو چکی تھی۔

وقت و قد سے نبیوں کا اعلان ہوتا رہا لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ ابجیسی کا دوباری اعتبار سے خاصی مصروف اور مقبول تھی کیوں کہ لوگوں کے جانے کے باوجود میرے قریب وجوہاتیں بھری ہوئی کرسیوں کی مجموعی تعداد میں ہدیرج اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

میرا نمبر آیا تو کاؤنٹر پر ایک سٹنک نوجوان، اپنے ہونٹوں پر کا دوباری مسکراہٹ سجائے، میرا استقبال کرنے کے لیے تیار تھا۔

اس نے ادب اور احترام سے مجھے خالی کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا اور پھر سوالیہ انداز میں میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

”مجھے مس روونا سے ملنا ہے۔“ میں نے اسے گھورتے ہوئے خشک لبے میں کہا۔

”برنس؟“ اس نے تائید طلب لبے میں سوال کیا اور میرے اقرار پر فوراً ہی روونا کو آواز دی۔

وہ اس سے تیسری نشست پر کسی گاہک کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھی۔ ان دونوں نے اپنی جگہیں چھوڑے بغیر چینی زبان میں چند فقرات کا تبادلہ کیا پھر میرا یہ بیان مسکراتے ہوئے بولا۔ ”تم تیسرے کاؤنٹر پر چل جاؤ!“

”لیکن وہاں تو کرسی خالی نہیں ہے۔“ میں نے جبکہ کر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

”تم جاؤ۔ روونا اُس شریف آدمی کو میرے پاس بھیج رہی ہے۔“ وہ بولا۔

اس وقت میری تہی ہوئی کھوپڑی ہر بات کا منفی مفہوم اخذ کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے روونا کے پاس بیٹھے ہوئے شخص کو شریف آدمی قرار دے کر مجھے مزیل آدمی کہا ہو۔ میں اس سے اُلجھنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا اس لیے اپنے دل کا غبار نکالنے کے لیے، میں اسے اردو میں ایک گالی دیتا ہوا وہاں سے اٹھ گیا۔

”واہ! دل خوش کر دیا۔“ اردو میں کہے گئے ان الفاظ پر میں بُری طرح جو کھنکھنایا۔

پھر مجھے وہ شخص نظر آگیا جو اپنی باری کے انتظار میں گود میں ایک نقشہ پھیلائے بیٹھا تھا۔

”پردیس میں اپنی زبان اور وہ بھی گالی کی صورت میں، من کر دل نہال ہو گیا۔“ مجھ سے نگاہیں چار ہونے پر وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے خوش دلی کے ساتھ بولا۔

”سالے اپنے کام کے پیسے لیتے ہیں لیکن اس طرح پیش آ رہے ہیں جیسے مفت خدمتِ خلق کر رہے ہوں۔“ میں نے اپنے دل کا غبار مزید ہلکا کرتے ہوئے کہا اور وہ ہنستا ہوا واپس بیٹھ گیا۔

اس اثنا میں روونا کے سامنے والی کرسی خالی ہو چکی تھی۔ میں نے دیکھا کہ چُپے نقوش اور متورم آنکھوں کے باوجود وہ خاصی دلکش اور قبول صورت لڑکی تھی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس کے چہرے پر قلقیانہ سنجیدگی کے بجائے بارونقی مسکراہٹ رہی

میں بھٹی راستوں سے آگے بڑھا تو ایک چھوٹے سے پارک کے کنارے دو عورتیں ٹیلیوں پر گھڑیاں بیچتی ہوئی نظر آئیں، میں وقت گزاری کے خیال سے ایک ٹیبلے پر رک گیا۔

ٹیبلے پر ہر رنگ اور ساخت کی سیکڑوں خوبصورت گھڑیاں بکھری ہوئی تھیں اور کئی غیر ملکی مرد اور عورتیں بہت حیرت اور اشتیاق کے ساتھ اس ڈھیر میں اپنی پسند کے ماڈل تلاش کر رہی تھیں۔ مول تول کا کوئی حساب نہیں تھا۔ بیچنے والی جس گھڑی کے سودا ر ہانکتی تھی، خریدار چالیں لگاتا تھا اور پھر ساٹھ، ستر میں سودا ہو جاتا تھا۔ آس پاس کچھ اور ہر کبھی منڈا رہے تھے کسی کے ہاتھوں میں نفیس لائنز تھے تو کوئی سلک کی ٹائیوں کی سودا گری کر رہا تھا۔

میں اس بھیڑ سے ہٹا تو قرب و جوار سے نکل کر اچانک ایک چینی نوجوان میرے قریب آگیا۔
 ”عمدہ کھڑاں خریدو گے؟“ اس نے شائستہ عمریزی میں سرگوشی کرتے ہوئے، اپنے ہاتھ میں دلی ہوئی فونو ایلم کی ورق

میں نے عمل کروں گا لیکن مجھے یہ تو بتا دو کہ میں اپنی منزل کی تکب تک روانہ ہو سکوں گا؟ میرے لیے وقت کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ تم جانتی ہو کہ شوائے ڈون کی سیکرٹری ہے اور میں اس کے مشورے پر تمہارے پاس آیا ہوں تو ضرور کوئی نہ کوئی بات ہوگی۔“

میں پوری کوشش کروں گی کہ آج شام تک تمہاری روانگی کا وقت نہ کر سکوں۔ اپنے کاغذات وغیرہ میرے پاس چھوڑ دو۔ دو گھنٹہ میں تمہیں دوبارہ آنا ہوگا۔“

روڈ نے مجھ سے چند فارمولہ وغیرہ پر دستخط لیے اور ہارٹ کے ساتھ ہی پانچ سو ڈالر لے کر ایک بڑے لفافے میں لپیٹے ہوئے اپنی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

وہ اس کی طرف سے اشارہ تھا کہ کام کی بات پوری ہو چکی تھی
میں نے مجھے روانہ ہو جانا چاہیے۔ میں نے اٹھ کر اس کا نرم و
لہذا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔
میں نے اندازہ لگایا کہ اس دفتر کے ہر کاؤنٹر کا بھی دستور تھا۔
وہی آنے پر ہر گاہک کو ایسی بھرپور توجہ دی جا رہی تھی جیسے اس
کا وہاں دوسرا کوئی ضرورت مند وجود ہی نہ رکھتا ہو لیکن اس
کا تمام سفری مسائل حل کرنے کے بعد اسے نرمی و خوش اخلاقی
کا ساتھ رخصت کر کے نئے گاہک پر توجہ مرکوز کر دی جاتی تھی۔
وہی وہی کے لیے مزاحیہ الیکٹرانک بورڈ پر چوبیسواں نمبر روشن تھا۔
میں نے باہر نکلنے سے پہلے خالی کاؤنٹر پر موجود نمبر والی پرچیوں
کی گڈی گڈی کو دیکھا تو وہاں انیسویں نمبر تھا جس کا انتظار انتظار گاہ
تھا۔ بیٹھے اور منتظر ہوئے سیاحوں کی تعداد اسے بھی ہو رہا تھا۔
اگلے چار گھنٹوں کے لئے میرے پاس کوئی کام نہیں تھا اس
لئے میں ٹر سکون انداز میں فٹ پاتھوں پر رواں، مقامی اور غیر ملکی
سیاحوں کی بھڑم، شامل ہو گیا۔

چین سے فرار ہو کر ہانگ کانگ میں پناہ گزین ہونے والوں کی بارہوہ شہر ملک ہمیشہ سے آبادی کے شدید دباؤ کا شکار رہا ہے۔ پھر تیز محرکاتوں نے چین کی بغل میں واقع اس بندرگاہ کو آزادانہ تجارت کی مکمل چھوٹ دے کر اس خطے کی تجارتی منڈی میں اہم ترین گڑ میں تبدیل کر دیا تھا جس کی بنا پر وہاں پورے سال سیاحت اور تفریح کے شوقین، غیر ملکیوں کا ازدحام رہتا تھا۔ ہانگ کانگ میں خشک اور مسطح زمین کی بے انتہا قلت تھی جس کا سدباب کرنے کے لئے زمین زیرِ ماس ٹرانزٹ ریلوے اور زیرِ آب سرنگوں کے ساتھ ہی فلک بوس عمارتوں کا سارا لایا گیا تھا۔ ساحلی غیبی سہت کر سمناج پہاڑی دھلانون تک کے سینے چر کر کنکریٹ اور بے کی اوچی اوچی عمارتیں بنائی گئی تھیں۔ وہ سلسلہ رکائیں تھا جو پورے زور و شور کے ساتھ جاری تھا لیکن اس کے باوجود ہانگ کانگ کے مکانات، دکانوں، راستوں اور فٹ پاتھوں تک سے زمین نشینہ قلت کا اظہار ہوتا تھا۔ جسے صرف قلیقہ اور قلم و ضبط کی ماہر قابو میں رکھا گیا تھا۔


سنی سکران کامیابوں کا سہ ماہی رسالہ

کالے خال
25 روپے

کالے خال، بھوئے خال

(انقلابی نثر سے اداسی و محبت کا عالم)

قیمت
50 روپے



آپ کے لیے سنی سکران کامیابوں کا سہ ماہی رسالہ

جو کہ دنیا کی سب سے دلچسپ اور دلکش نثریں

صرف 50 روپے میں آپ کو ملے گی

- - لکیر وال کے بچے غلطیوں سے بڑے بچے کا گھون جو سنا ہے میں تو اور بڑا دکھ رہتا ہوں کہ کون سے بچے لکیرتے ہیں۔
- - ان کامیابوں کے دوروں کو دیکھ کر دانا بھوئے خال اور کالے خال آج کے معاشرے سے اُلٹ نہیں ہیں۔ آپ نہیں بچا رہا رہے محسوس کرتے ہیں۔

کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ بذریعہ بینک منی آرڈر ارسال فرمیں

کتابیات پبلی کیشنز

ملتان، سندھ، خیبر، پنجاب، گلگت، بلتستان

فون: 58025512-58953133 عیس: 58025511

کتابیات1970@yahoo.com

پس منظر
74200 روپے

کچھ بیوپاریوں کی بھی دکانیں ہیں۔ اسی وجہ سے عمارت میں عام آدمیوں کے داخلے پر سخت پابندی ہے۔
چوتھی منزل پر لفٹ سے اترنے کے بعد ہم ایک متعلیٰ دروازے پر رک گئے۔ پیشے کے دروازے کے اس پار ایک صوفے پر ایک موٹا سا چینی کوٹ لیے سوہا تھا۔ دو آدمی ایک سر کے گرد بیٹھے، تماشہ کھیل رہے تھے۔ اپنے ساتھی کو دیکھتے ہی ان میں سے ایک نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

ہمارے اندر داخل ہوتے ہی ان دونوں نے میز سے رنگ تاونامی چینی بیڑی لمبی بوتلیں اٹائیں اور اندر والے کمرے میں غائب ہو گئے جہاں پہلے سے کسی کی موجودگی کے آثار تھے۔

اس کمرے میں ایک طرف ذنی تجوری رکھی ہوئی تھی۔ چان پر بستروں کا ذخیرہ نظر آ رہا تھا۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری نہیں ہوئی کہ وہ پانچ سات چینی ان ہی کمروں کو رہائش کے طور پر استعمال کرتے تھے اور دن میں بستر سمیٹ کر انہیں دکان و دفتر کا رخانے کا روپ دے دیتے تھے۔

”بیڑے چائے یا کافی؟“ مجھے کرسی پر بٹھانے کے بعد لانے والے نے رہنما سوال کیا۔

”کچھ بھی نہیں“ میں نے اس اجازت دفترا کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔
”اگر یہ تمہاری دکان ہے تو گھڑیاں یا دوسرا سامان کہاں ہے؟ یہاں تو کچھ بھی نظر نہیں آ رہا۔“

اس نے گھڑیوں کی تصاویر والی البم میرے سامنے ڈال دی۔
اس میں سے مائل پسند کر کے بتاؤ، میں ابھی پیدا کردوں گا۔ چند چینی گھڑیاں تو اس وقت بھی تجوری میں موجود ہوں گی لیکن مال ویر کرنے کے بجائے تمہاری پسند کا اندازہ ہو جائے تو بہتر ہے گا۔“

میرے اور اس کے مذاکرات کے دوران میں اندر والے چنگی پُراسرار انداز میں بابا رہا ہمارے کمرے میں جھانکتے رہے ان کے درمیان کچھ باتیں بھی ہو رہی تھیں۔ میں اس ماحول میں خود کو نہایت غیر محفوظ اور بے یار و مددگار محسوس کر رہا تھا۔ مجھے لانے والے نے اپنے مشتبہ کاہنہ کے بارے میں پہلے ہی اعلیٰ خیال کر دیا تھا۔ اس وقت میں ان کے دفتر میں محسوس تھا۔ اگر وہ کھلی کو شش میں ناکام رہنے پر جھلا کر میرے خلاف کوئی الزام عائد کر دے تو میرے پاس اپنے دفاع کے لیے ”تیم مکن کے علاوہ کوئی مؤثر دلیل نہیں تھی۔“

میں نے البم میں سے چند قیمتی گھڑیوں کے مائل پسند کیے۔ اس نے مجھے صرف دو گھڑیاں دکھائیں۔ کھلے بازار میں ان اصلی گھڑیوں کی قیمت کسی طرح دس بارہ ہزار ڈالر سے کم نہ ہوتی لیکن اس نے مجھے صرف ہزار ہائے کاٹک ڈالر کے لگ بھگ بتائے۔ اس اصرار تھا کہ وہ فیکٹری سے چرائی ہوئی اصلی گھڑیاں تھیں جب کہ میں مشہور عالم گھڑیوں کی چربہ سازی میں ہائیک کاٹک کی شہرت سے بخوبی واقف تھا لیکن اس دفتر کے پُراسرار اور غیر محفوظ ماحول میں میں کھٹن محسوس کر رہا تھا اس لیے ان ہی میں سے ایک گھڑیاں؟

گردانی کی۔ البم میں گھڑیوں کی تصاویر تھیں۔

”تم جس عورت کے ٹیبل پر کھڑے تھے وہ اتنی پٹی بہت مکار بلکہ کچی ٹھک ہے“ میرے تردد پر اس نے جلدی سے کہا ”دو گنی قیمت بتا کر ڈیڑھی قیمت تک گاہکوں کو لوٹی رہتی ہے۔ خوب صورت کیس میں بند کی ہوئی واہیات مشین تھوڑے ہی دن میں داغ مفارقت دے جاتی ہے۔“

”اور تم کیا بیچتے ہو؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

”راڈو، یکو، ڈیلا، ڈنسل، کارڈیٹر۔ تمہیں جو بہترین گھڑی ورکار ہو، وہ نہایت مناسب داموں پر دلا سکتا ہوں۔ سامنے ہی میری دکان ہے۔ میری دیر انی دیکھ کر تم حیران رہ جاؤ گے۔“ اس نے میرے ساتھ چلتے ہوئے مجھے پیشے میں انارنے کی کوشش کی۔
”اصلی یا دو نمبر؟“ میں نے اس سے مرعوب ہوئے بغیر جیسا ہوا سوال کیا۔

”گھر بننے کے ساتھ اصلی مال ہو گا“ اس نے پورے اعتماد کے ساتھ کہا ”تم گھڑیوں کے شوقین معلوم ہوتے ہو، بھلا تمہیں دھوکا کون دے سکتا ہے؟“

میں اس کی چال چلی پر دل ہی دل میں ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ فنکارانہ چابک دستی کے ساتھ میری انا کو ابھار کر مجھے اپنے جال میں پھانسنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”دراصل ہمارے پاس فیکٹریوں سے پار کی ہوئی گھڑیاں آتی ہیں“ اس نے اپنی جمل سازی کا انکھاراز کھڑتے ہوئے بات جاری رکھی ”ہر چینی سے سال میں دس پانچ گھڑیاں آتی ہیں جو تم جیسے خوش نصیب خریدار کو ڈیڑیوں کے مول لے جاتے ہیں۔“

اس وقت تک ہم خاصی دور چل کر ایک تنگ مارکیٹ میں داخل ہو چکے تھے، اس لئے میں نے پوچھا ”تمہاری دکان اب کتنی دور رہ گئی ہے۔“

”بس تھوڑی ہی دور ہے۔ تم میرے ساتھ چلتے رہو۔ دراصل ہم لوگ اپنی قیمتی گھڑیاں ہر گس دھاس کو دکھا کر، اپنا اور اس کا وقت برباد نہیں کرتے۔ آدمی کو پہچان کر بات کرتے ہیں۔ مجھے فخر ہے کہ گاہک کی پہچان میں مجھے آج تک دھوکا نہیں ہوا ہے۔“

وہ اپنی چینی چڑی باتوں میں ابھار کر، مارکیٹوں اور گلیوں سے گزرتا ہوا، تقریباً ڈیڑھ دو کلومیٹر دور لے گیا۔ آخر اس مشن کا اختتام ایک ایسی چلی سی عمارت کے سامنے ہوا جس کا داخلی دروازہ بندی نہیں بلکہ اندر سے متعلیٰ بھی تھا۔

اس نے دروازے کے پیشے پر دستک دی تو مسلح دیبان نے دروازہ کھول دیا اور وہ مجھے لے کر لفٹ میں داخل ہو گیا۔

”تم تو دکان کمرہ رہتے تھے۔ یہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟“ میں نے ہلکا سا احتجاج کیا۔

”یہ ہائیک کاٹک ہے“ وہ ہنستے ہوئے بولا ”یہاں آدمی دکانیں ایسی ہی عمارتوں میں ہیں۔ اس عمارت میں ہمارے علاوہ بیروں کے

وقت بھی تین گھنٹے باقی تھے۔ میں خالی الدینی کے عالم میں ایک طرف چلا رہا۔ بانگ کانگ جیسے گھنجان آباد ملک میں تقریبی مقامات کی شدید قلت تھی۔ کولون ہو یا ہارر کے اس پار بانگ کانگ کا علاقہ دونوں ہی عجب اور بلند عمارات پر مشتمل تھے۔ ٹکریٹ کے اس جنگل میں خال خال کوئی جھوٹا سا ویران میوزیم وغیرہ نظر آ جاتا تھا اور بس۔ دراصل انسانوں کی رہائش، سرکاری دہلی دفاتر اور وکانوں کے بعد اس ملک میں اتنی جگہ ہی نہیں رہی تھی کہ دوسری ضروریات کی طرف توجہ دی جاسکتی۔ عام آدمی کی سب سے بڑی تفریح، دونوں طرف کے سواحل تھے۔ جن کی جب میں فاضل رقم ہوں، ان کے لیے بے کدے اور ٹائٹ کلب تھے جو عام طور پر دن ڈھلنے کے بعد ہی شراب میں غسل کر کے شباب پر آتے تھے۔

ہانکو روڈ کی ایک گلی میں چھوٹی چھوٹی دکانوں پر چینی خد اس اور پانچ شیطانوں کے چھوٹے بڑے بھتسوں نے میری توجہ اپنی طرف مبذول کرائی۔ انتہائی باریکی کے ساتھ، مٹی میں تراشے گئے، چھوٹے بھتسوں کے ایک ایک نقش میں بھرپور تاثر موجود تھا۔ ان بھتسوں میں پنڈتوں اور پردہتوں کی شرمناک خرسیوں کو نمائت چابک دستی کے ساتھ سمایا گیا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے بدستی کے عین عروج کے وقت کسی ساحر نے ان سب کو جادو کر کے سیفر دیا ہو۔ کمال کی بات یہ تھی کہ مٹی کے ان پتلوں کی تشکیل میں کسی مٹین کا کوئی حصہ نہیں تھا بلکہ یہ سب دستکاری کے شاہکار تھے۔ اس سڑک سے بے فونک روڈ پر نکلنے ہی، مجھے داہنی طرف ایک بلند عمارت نظر آیا تو میرے قدم بے اختیار اسی طرف اٹھ گئے۔ زیر زمین ریلوے اسٹیشن کو اترنے والے راستے کے قریب ہی کولون کی عالیشان جامع مسجد واقع تھی جس کی سیڑھیوں پر متعدد باریش پاکستانی اور افغان براجمان تھے۔

میں نے اس مسجد کا طواف کرتے ہوئے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی کہ وہ کولون پارک کی زمین پر اسی کے ایک کونے پر اس طرح واقع تھی کہ اس کا کافی حصہ پارک لین شاٹنگ پولیو اڈے آگے نکلا ہوا تھا۔ اس شاٹنگ سینٹر کی حد اور مسجد کے سرے کے درمیان واقع طویل و عریض پٹی کو خریداریوں کی چمک قدی کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ یہ انگریزی کا کمال تھا کہ اس نے کولون کے اہم ترین علاقے کی ترمیم و توسیع کرتے ہوئے بھی مسجد کی عمارت کو، پارک کی تفصیل تک محدود کرنے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ مسجد اور پارک کی حد کے فرق کو نمائت خوبصورتی کے ساتھ اپنی منصوبہ بندی میں سمویا تھا۔

مسجد سے ہوتا ہوا، میں کولون پارک میں چلا گیا۔ باہر سے اندازہ ہی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ شہر کے عین وسط میں ایک پہاڑی پر اس قدر خوبصورت اور وسیع تفریح گاہ ہو سکتی ہے۔ میں چلی دفعہ اس پارک میں داخل ہوا۔ پہاڑی شیبہ و فراز پر پھیلے ہوئے سبزہ زاموں، پھولوں کے سج، عمارات، گلاب گھر اور دور تک پھیلے ہوئے چڑیا گھر میں کسی گٹ کے بغیر گھومتے ہوئے مجھے اپنی رائے

مول قتل کر کے چار سو میں سودا کر لیا۔ میں امریکی ڈالروں میں رقم ادا کر رہا تھا تو اندر والے کمرے سے ایک سفید فام برآمد ہوا۔ اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی مسرت سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ہزاروں کا بلی سیکڑوں میں خریدنے پر خوش تھا۔ مجھ سے نگاہیں چار ہوئے ہی اس کے لبوں پر آسودہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

اسے عزت اور احترام کے ساتھ باہر ہانکنے کے بعد، اس کا میزبان چینی بھی میرے پاس آگیا۔

”یہ سفید فام اپنے پورے خاندان کے لیے دس گھڑیاں خرید کر لے گیا ہے۔“ اس نے آتے ہی، مجھے بھانسنے والے سے کہا۔ ”اب اندر صرف تین گھڑیاں رہ گئی ہیں۔“

”بولو!“ میرے میزبان نے ڈالروں کی کتنی ترک کر کے مجھ سے کہا۔ ”تین دور اور ایک میرے پاس ہے۔ چاہو تو یہ چاروں بھی لے لو، بہت کم پیسوں میں دے دوں گا۔“

”میرے پاس اتنی رقم نہیں ہے۔“ ان بد معاشوں میں اکیلا رہ جانے کے احساس کے تحت میں نے اپنی کم مائیگی کا اعلان ضروری سمجھتے ہوئے کہا۔

دونوں ماہر سائنہ انداز میں شانے اچکا کر رہ گئے اور ڈالر سمجھنے کا عمل دوبارہ جاری ہو گیا۔

”رسید اور گارنٹی؟“ میں نے روانہ ہونے سے پہلے سوال کیا۔

وہ تسخرفرانہ انداز میں ہنسنے ہوئے اٹھ گیا۔ ”رسید اور گارنٹی کے ساتھ یہ گھوڑی بامیہ ہزار میں کبھی ہے۔ چوری کے مال کے لین دین میں یہ غرے کماں چلے ہیں۔“

اس نے بڑھ کر نکاسی کا دروازہ کھول دیا۔ جو میرے لیے دواغی کی ہدایت کے مترادف تھا۔

”لیکن گارنٹی کے بارے میں تو تم نے خود کہا تھا!“ میں نے احتجاج کیا۔

”میں نے کہہ دیا، بس یہی گارنٹی ہے۔“ اس نے مشتقانہ انداز میں میرے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا اور میں سر جھکائے باہر نکل گیا۔ میری نظروں میں وہ جھلی گھڑی ان دامنوں میں گئی لیکن وہ لوگ دوسروں کو زیادہ رقم میں بھی بھانستے ہوں گے۔ ایسے چلتے پھرتے ہنرمندوں کے ساتھ سودا کر کے کوئی بھی خریدار مطمئن نہیں ہوتا۔ اسے یہی فتن رہتا ہے کہ اس نے مزید کم دام لگائے ہوئے تو شاید ان ہی دامنوں پر سودا طے ہو جاتا لیکن یہ سب بعد کی باتیں ہوتی ہیں۔ تجسس خریدار اور سیاح سب کچھ جاننے کے باوجود دنیا بھر میں ایسے سودا گردوں کے حال میں پھنستے رہتے ہیں۔ جہاں بے وقوف بننے کے ساتھ ہی نفع بخش خریداری کا بھی پورا پورا امکان رہتا ہے اور چالاک ٹھک خریداریوں کی اسی نفسیاتی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ بازار کی حد تک وہی ایک تجربہ کافی تھا۔ میرے پاس اس

سے ایک لگافہ نکال کر میرے آگے ڈال دیا۔ ”اس میں تمہارے سب کاغذات ہیں۔ چار بجے گھاٹ سے مکاؤ کے لیے فیری روانہ ہو گی۔ اس میں تمہارے لیے اپریک کی بنگ کرا دی گئی ہے کہ کوشل کے باوجود کہیں کا انتظام نہیں ہو سکا۔“

”ہمت بہت شکر ہے۔ کاغذی تیاریوں کے بعد اس سے پہلے روانگی شاید ممکن ہی نہیں تھی۔“

”مجھے یقین ہے کہ تم نے انتظار کے چند گھنٹے گن گن کر گزارے ہوں گے۔“ وہ جیسے ہوئے بولی۔

”ایک گھڑی خریدنے کے بعد کولون پارک میں جا بیٹھا تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ میاں کے فوجوان بھی اپنی محبت کے اظہار میں اسی طرح پرجوش اور بے مہرے ہوتے ہیں جیسے کہیں اور کے۔“

”تو کیا انہیں نہیں ہوتا چاہیے؟“ اس نے ترجمی نفیس میرے چہرے پر گاڑ کر پوچھا۔

”اوی غنی جگہ جاتا ہے تو غنی چیزوں کی تو قعات لے کر جاتا ہے۔ ہر جگہ پرانی چیزوں اور طریقوں سے واسطہ پڑتا رہے تو سیاحت کا لطف ختم ہو جاتا ہے۔ یکسانیت اور جمود سے آگیا کر اوی کو اپنا گھرا د آنے لگتا ہے جہاں کی یکسانیت سے فرار حاصل کرنے کے لیے وہ سیاحت پر لگتا ہے۔“

”اسی لیے تو کہتے ہیں کہ دنیا گول ہے۔“ وہ تھوہنی کے ساتھ بولی۔ ”ایسا نہ ہو تو ہر سال کروڑوں حواریا وطن اور گھریار پھوڑ کر نئے آشیانے بسالیں۔ ہر طرف ایسی افزائش ہوئی کہ محبت اور وفا کا تصور تک ختم ہو کر رہ جائے گا اور پھر تم کون سی سیاحت پر نکلے ہو؟ تمہیں تو مکاؤ میں کسی سے ملنا ہے۔ سیاحت میں کسی کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔“

دوونٹا خاصی سمجھدار اور باتونی معلوم ہوتی تھی لیکن میرے پاس اُس کی دلچسپ گفتگو سے لطف اندوز ہونے کے لیے وقت نہیں رہا تھا۔ اس لیے میں نے موضوع بدل کر حساب کتاب کی بات پھینڈی۔

”تم فیری کے کپتان ریوہیائیک سے ضرور مل لیتا۔“ اس نے رقم دراز میں رکھتے ہوئے مجھے ہدایت کی۔ ”اس سے میری بات ہو گئی ہے۔ وہ تمہیں مکاؤ کے کسی ایسے ہوٹل میں پہنچا دے گا۔“

”اور مس شوائے سے ملاقات کی کیا صورت ہو گی؟“ میں نے آہستہ سے پوچھا۔

”وہ تمہارا اور اس کا معاملہ ہے۔ ویسے اسے اطلاع مل چکی ہو گی کہ تم آج چار بجے والی فیری سے مکاؤ کے لیے روانہ ہو رہے ہو لیکن ڈون کے بارے میں میری ہدایت یاد رکھنا۔ بے خبری میں بھی تمہاری زبان سے اُس کا نام نکل گیا تو تم زندگی بھر بچھتا رہو گے۔“

میں نہایت گرجوئی کے ساتھ اسے الوداع کہہ کر اُس کے دفتر سے نکل آنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ اچانک فون کی تھننٹ اٹھی۔

پہل کرئی پڑ گئی۔ ہانگ ہانگ میں ساحل کے علاوہ کولون پارک کو بلاشبہ سب سے بڑی عوامی تفریح گاہ قرار دیا جاسکتا تھا۔

پارک کے ابتدائی حصے میں دیوار کے ساتھ متعدد گراج نما کمرے بنے ہوئے تھے جو سامنے سے بالکل کھلے ہوئے تھے ان میں سے بعض خالی تھے اور چند پر چٹک کے لیے آئے ہوئے مختلف خاندان قابض تھے۔ وہ سب دھول، تاشوں، بگل اور کٹھ پر اپنے اپنے قوی انداز میں تانے کا تے ہوئے بہت بھلے معلوم ہو رہے تھے کسی بھی خوف اور فکر کے بغیر کی جانے والی وہ تفریحات مقامی باشندوں کے ساتھ ہی انتظامیہ کی رواداری اور فراخ دلی کی منظر

نقصیں۔ اگر ہانگ ہانگ کی آبادی میں سے متوسط طبقہ کے چینی نژاد بدماغ و کاغذاموں کو نکال دیا جاتا تو وہ ملک ہر اعتبار سے قابل رشک تھا لیکن اس مغفونے کا دوسرا رخ یہ بھی تھا کہ ہانگ ہانگ کے مزاج اور شناخت میں چینیوں کا بڑا ہاتھ تھا۔ وہ نہ رہتے تو ہانگ

کاٹک بھی شاید ہانگ کاٹک نہ رہتا۔ اپنی شناخت کھو کر دوسرے بین الاقوامی شہروں میں گم ہو جاتا۔

اس پارک میں لندن کے ہائٹ پارک اور پیرس کے باغات جیسے شرمناک نظارے تو نہیں تھے لیکن دور افتادہ گوشوں، پھولدار بیلوں سے ڈھکی ہوئی نشستوں اور پُرتچ ڈھلانوں پر ظالم سماج کے ستارے ہوئے متعدد جوڑے دنیا و مائیسے بے خبر ایک دوسرے کی ذات میں کھوئے ہوئے تھے۔ ان لیے بیٹھے اور کھٹے ہوئے جوڑوں کی حرکات میں عشق اور مہ زور جوانی کی بے قراریاں بے شک نمایاں تھیں لیکن وہ مقامی اور غیر مقامی جوڑے بالکل ہی مادر پدر آزاد نہیں تھے اور عشق میں جب تک جذبات کی ریگینیاں اور

والمانہ پن نہ ہو اسے عشق نہیں کہا جاسکتا۔ ایسی دوسری سوکھی محبت پگھلاؤ میں بدھ کی موتی کے سامنے کیاں دھیان میں بیٹھے ہوئے بکھشو کی نفس کش عبادت بن کر رہ جاتی ہے جس سے صرف عابدی مزہ لیتا ہے۔ دیکھنے والوں کے حصے میں زری عبرت آتی ہے۔

انسانوں، حیوانوں اور پرندوں میں میں نے اپنا وقت بہت آرام سے گزار لیا۔ اس وسیع و عریض پارک کے بعض حصوں میں خود نوش کی اشیاء کے اسٹال بھی تھے جنہوں نے میری شکر پڑی میں ناقابل فراموش کردار ادا کیا اور جب میں نے دوونٹا کی طرف

واپسی کی راہ اختیار کی تو دل و دماغ کے ساتھ میرا شکم بھی بیزرق تھا۔ میں چائنا ریل سروس کے طریقہ کار سے واقف تھا اس لیے وہاں پہنچتے ہی نمبر لینے کے لیے خالی کاؤنٹر کی طرف بڑھا جہاں ایک

سو بار حوال نمبر نمایاں تھا۔ وہاں اس وقت بھی خاصی تعداد میں لوگ موجود تھے لیکن میں نمبر لے کر پلٹا تو دوونٹا نے آواز دے کر مجھے کاؤنٹر کی طرف بلالیا۔

کاؤنٹر پر اس وقت دوونٹا کی جگہ کوئی مرمو مسافروں کی ضروریات پوری کر رہا تھا جب کہ وہ خود کچھ کاغذات میں ابھی ہوئی تھی۔

اس نے مجھ سے نہایت گرجوئی کے ساتھ ہاتھ ملایا، پھر دراز

ملازم اسی لیے اُس کی خوشنودی حاصل کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ درحقیقت وہ مکاؤ میں بے تاج بادشاہ ہے۔ جب تک وہ اپنے کسی ملازم، مہمان یا قیدی کو کوئی سزا نہیں سنانا، حویلی میں ہر شخص خوش رہتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگلے دو چار دن بھی وہ دونوں ہنس کھیل کر گزار لیں گے۔ اس وقت تک تم ڈون کو رام کرنے کی کوئی نہ کوئی راہ نکال سکتے ہو۔“

”تم مجھ پر اتنا احسان تو کری سکتی ہو کہ غزالہ کو میری مکاؤ آمد کی خبر دے دو؟“

”ہرگز نہیں۔“ اس کی تیز اور اضطرابی آواز سنائی دی۔ ”یہ ڈون سے کھلی انداز ہوگی۔ میں تمہارے اور ان کے درمیان کوئی پیغام رسانی نہیں کر سکتی۔ بانی۔“

میں نے خاموشی کے ساتھ ریسور کریٹل پر ڈال دیا۔ ابتداء میں دھونیا اس امر پر خوش نظر آئی تھی کہ شوائے کی فون کال میری موجودگی ہی میں آئی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ میری طرف سے کتنی فکر مند تھی لیکن گفتگو کے اختتام پر میری مایوسی کا مشاہدہ کر کے وہ حیران نظر آنے لگی تھی۔

”کلیا ہوا؟ شوائے سے بات کرنے کے بعد تم کچھ فکر مند ہو گئے ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”اس کی بھی کچھ مجبوریاں ہو سکتی ہیں۔ بہر حال تمہارے تعاون کا بہت بہت شکریہ۔ واپسی پر وقت ہوا تو تم سے ضرور ملاقات ہوگی۔“ میں نے گرجبوشی کے ساتھ اُس سے ہاتھ ملایا اور تیزی کے ساتھ چائنا زبول سردس کے فنیٹے بکھتا چلا گیا۔

میرے پاس بہت زیادہ وقت باقی نہیں رہا تھا اس لیے میں تیزی کے ساتھ اپنے ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔ میرے ساتھ زیادہ ساز و سامان تو نہیں تھا لیکن بیم گمن کو کپڑوں وغیرہ میں چھپانے کے لیے میں کراچی سے ہی ایک چھوٹا ساٹھ کپس لے کر چلا تھا۔ بیم گمن کا مسئلہ درپیش نہ ہوتا تو میں اپنے تن کے ٹین کپڑوں کے ساتھ بھی مکاؤ روانہ ہو سکتا تھا لیکن جب تک وہ مجبوری حائل تھی، میں ساٹھ کپس کو اپنے ساتھ لیے پھرنے پر مجبور تھا اور اسی لیے میری ہوٹل واپسی بھی ضروری تھی ورنہ میں وہاں ایک دن کا کرایہ پیشگی ادا کر چکا تھا اور میرے ذمے دیگر کوئی ذمہ واجب الادا نہیں تھا۔

میں ہوٹل کے کاؤنٹر پر اپنی فوری روانگی کا ارادہ ظاہر کرتا ہوا اور اپنے فلور پر پہنچا اور چند منٹ کی قلیل سی مدت میں اپنے کوٹ کی اندرونی جیب سے بیم گمن نکال کر، اسے ساٹھ کپس میں بھرے ہوئے کپڑوں کی تھوں میں چھپا دیا۔

رہل پٹنن اور کیشز کو شاید میری غلت کا اندازہ نہیں ہو سکا تھا اس وجہ سے کوئی پر زور نہیں آیا تو میں خود ہی اپنا ساٹھ کپس اٹھا کر لفٹ کی طرف چل دیا۔ دوم سردس والی دولڑکیوں نے مجھے دیکھا لیکن رسمی مسکراہٹ کے ساتھ آگے نکلتی چلی گئیں جیسے میرے مسائل سے وہ بیکرہری اندمہ ہوں۔

دھونیا نے ریسور پر لچہ بھر خاموش رہنے کے بعد بڑے ہنچاک کے ساتھ ہی ہاڈکما پھر گفتگو شروع ہو گئی جو چینی زبان میں تھی۔ اس دوران میں دھونیا ایک عجیب اور دلکش ترنم کے ساتھ دے، ہائے اور جیہیے مختصر الفاظ کی گردان کرتی رہی۔ میرے لیے چینی بلکہ کینٹونی زبان کے وہ الفاظ بالکل مہمل اور بے معنی تھے لیکن دھونیا کے دلکش اور شیریں انداز نے ان الفاظ میں گویا رس گھول دیا تھا۔

میں کہیں سن یا پڑھ چکا تھا کہ کینٹونی، لب و لہجہ والی زبان تھی جس میں بہت سے الفاظ ایسے تھے کہ صرف انہیں ادا کرنے کے انداز کو بدلنے سے نو مختلف مفاہیم ادا کیے جاسکتے تھے۔ اس قدر حساس اور نازک زبان جب اجنبی بھی ہو تو سننے والا اس کی طرح مٹھنکا رہ جاتا ہے لیکن دھونیا کے بولنے کا انداز اس قدر پیارا تھا کہ میں واقعی اس کی حلاوت میں گم ہو کر رہ گیا۔

میں اس وقت بری طرح چونکا جب دھونیا نے ریسور میری طرف بدھادیا۔

دوسری طرف سے ڈون کو ایک فوکی بیکہ پڑی شوائے کی آواز سن کر میرے بدن میں سنسنی سراپت کر گئی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”تم مکاؤ آرہے ہو تو مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ ایسی کوشش جنہیں منگی پڑے گی۔ یہاں کسی کو شبہ ہو گیا ہے کہ میں تمہاری مدد کر چاہ رہی ہوں۔“

”آخری بار تمہاری باتوں سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ حالات میں کوئی ناخوشگوار تبدیلی رونما ہو چکی ہے۔ اس وقت تم کہاں سے فون کر رہی ہو؟“

”میں ڈون کی حویلی سے باہر ہوں۔ جب بھی موقع ملا میں خود تم سے رابطہ کر لوں گی۔“

”لیکن تم سے بات کیے بغیر میں ڈون سے کیسے رابطہ کر سکوں گا؟“

”تم ڈون کے لیے فون کر لیتا۔“ اس نے چند ثانیوں کے سکوت کے بعد جواب دیا۔ ”لیکن ایسی کوئی بات نہ کرنا جس سے میری پوزیشن پر خراب اثر پڑے۔“

”تم بہت نیک اور مہربان عورت ہو۔“ میں نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ ”اب تو بتا دو کہ غزالہ اور میرا آدمی کہاں ہے؟ وہ دونوں کس حال میں ہیں؟“

”وہ دونوں حویلی میں ڈون کے قیدی ہیں لیکن فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ ڈون کے قیدیوں کی بھی مہمانوں کی طرح خبر گیری کی جاتی ہے۔ بس وہ ایک کمرے میں محبوس ہیں اور اپنی آزادانہ مرضی سے کہیں آجائیں سکتے۔“

”لیکن کسی وقت ڈون کی کھوپڑی سنک بھی سکتی ہے۔“ میں نے تشویش ظاہر کی۔

”یہ امکان تو ہر وقت اور ہر ایک کے بارے میں رہتا ہے۔ اس کے لیے کسی کا قیدی ہونا ضروری نہیں۔ اس کے سارے

داخل ہوا تو تینکوں سمندر میں دور تک بڑھی ہوئی پختہ بیٹی کے دونوں طرف بحری جہازوں کے سائز کی بڑی بڑی بولس نظر انداز تھیں اور پورے علاقے میں متوقع مسافروں کی تہجان آمیز چل پھل نظر آ رہی تھی۔

مجھے سب سے بڑی خوشی یہ ہوئی کہ جانچ پڑتال کے مراحل میں کسی نے بھی میرے ہاتھ میں جھوٹے ہوئے سوٹ کیس کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی اور مجھے بانسٹاپ طور پر مکاؤ کی طرف روانگی کی اجازت مل چکی تھی۔ فیری کی روانگی میں خاصا وقت باقی تھا اس لیے میں ایک کاؤنٹر سے مکاؤ کے بارے میں پوچھا ہوا کتا بچہ لے کر ان بچوں پر بیٹھ گیا جن پر مسافر بر اجماع تھے۔

میں نے یہ خاص بات نوٹ کی کہ مکاؤ جانے والوں میں بھاری اکثریت چینیوں کی تھی۔ اس بھیڑ میں غیر ملکی خال خال ہی نظر آ رہے تھے۔ جو تھے، وہ بھی اپنے فیصلے پر کچھ پشیمان اور سسے سے نظر آ رہے تھے۔

ہانگ کانگ سے مکاؤ کا فاصلہ تقریباً پینسٹھ کلومیٹر ہے اور وہ بھی پہاڑی پر رنگ رنگ عمارتوں کے وسیع سلسلے پر مشتمل ہے۔ تیل 'اناج' غلہ اور والوں کی تجارت کی بڑی منڈی ہونے کے ساتھ ہی اسے سونے کی کھلی بین الاقوامی منڈی میں کلیدی اہمیت حاصل ہے۔ قمار بازی اور قحبہ گری میں مکاؤ کے شہتاون کو ایک عالمگیر شہرت حاصل ہے۔ چین میں ایک طرف انگریز ہانگ کانگ پر قبضہ

لغٹ سے نکلنے ہی ایک پورٹرنے ٹپ کی امید پر میرے ہاتھ سے سوٹ کیس لے لیا۔ میں نے کیسٹر سے اپنا حساب صاف ہونے کی تصدیق کی اور بارہ نکلا تو اس اثنا میں پورٹرنے کیس روک چکا تھا۔

ہانگ کانگ میں ٹیکسی ڈرائیوروں کی بڑی تعداد امن موتی اور غاسی بے لگام ہے۔ موڈ نہ ہو تو پرجوش علاقوں سے بھی خالی ٹیکسی دھراتے گزر جائیں گے اور مسافروں کی ذرا بھی پروا نہیں کریں گے۔ ہاں کوئی اکیلی لڑکی نظر آجائے تو ہزاروں امیدوں کے ساتھ اس کی خدمت کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ ٹیکسی کے باقاعدہ آڈول پر قطار میں بٹھ جانے والے ڈرائیور البتہ باری کے مطابق ہر مسافر کو اٹھانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ڈرائیور اپنے مسافروں سے سامان کا کرایہ الگ سے وصول کرتے ہیں لیکن عام طور پر سامان اتارنے میں مسافر کی مدد کرنا کسر شان سمجھتے ہیں۔ دل اور پسند کا معاملہ ہو تو بات مختلف ہوتی ہے۔ جو ڈرائیور قدرے باضمیر ہوتے ہیں اور پسند کی سواریوں کی گھات میں خالی گھونٹنے کے شوقین ہوتے ہیں، وہ ڈیش بوڈ پر "آن کال" کی سختی رکھ دیتے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں اپنے ریڈیو آپریشن پر کسی خاص جگہ پہنچنے اور مسافر کو اٹھانے کی ہدایت کی گئی ہے۔ ماضی میں میرے ساتھ بھی کئی بار ایسا ہوا کہ آن کال ٹیکسی کا ڈرائیور مجھے نظر انداز کر کے کسی جوان سال لڑکی یا سفید فام سیاح کے اشارے پر رک گیا۔ ایسے ڈرائیور حُسن کی دیدہ یا بھاری ٹپ بنانے کے شوقین معلوم ہوتے تھے۔ ہاں کوئی مرتعناں مرغ ڈرائیور ٹیکسی روک لے تو وہ عمناء منزل کے بارے میں سوال کرنے سے پہلے میز مٹھا کر ٹیکسی کو حرکت میں لے آتا ہے۔ قیمت ہے کہ ہانگ کانگ کے دونوں حصوں میں بسوں اور زیر زمین ریلوے کے ساتھ ہی ٹیکسیوں کی اتنی بڑی تعداد سڑکوں پر رواں رہتی ہے کہ پندرہ فیصد من چلے ڈرائیوروں کی خرسستیوں کے باوجود ہر ضرورت مند کو چند منٹ میں سواری میسر آ جاتی ہے۔ درمیانے اور بڑے ہوٹلوں میں یہ سہولت ہوتی ہے کہ ہر آنے والی ٹیکسی خالی ہونے کے بعد سواری لے جانے کی پابند ہوتی ہے اور میرے پورٹرنے شاید ایسی ہی کسی ٹیکسی پر قبضہ کیا ہوا تھا۔

میں نے پورٹرنے کو پانچ ڈالر کی ٹپ دی اور ٹیکسی چل پڑی۔ میٹر میں حسب معمول نو کا ہندسہ نمودار ہو چکا تھا۔ "چائنا مکاؤ پیئر" میں نے ڈرائیور کو اپنی منزل سے آگاہ کیا اور وہ سہل کر رہ گیا۔ چائنا اور مکاؤ کے لیے چلنے والی باقاعدہ فیری سروس کا گھات کینٹون روڈ کے اختتام پر کولون پارک کے عقب میں واقع تھا۔ صبح سے رات گئے تک تقریبی سفر کے لیے اشار فیری کے علاوہ دوسرے آریز بھی اشار ہاؤس کے قریب و جوار سے مسافر لے جاتے تھے لیکن میرا مسئلہ مختصر تقریب کا نہیں بلکہ مکاؤ میں قیام کا تھا۔

میں کانڈاٹ وغیرہ کی جانچ پڑتال کے مراحل سے نمٹ کر اندر

نکا ہونا چھوڑیے

کامیاب ہونا سیکھئے

کامیابی

زندگی میں کامیاب ہونے کے رہنما اصول اور طریقے

قیمت 25 روپے

23 روپے

کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ

مکتبہ کتابیات

72886 فون

5802582-5806313 فون

kitabiat1970@yahoo.com

پھر اچانک ہی فضا میں چٹا چٹ کی آوازوں کے ساتھ متعدد تیلیاں روشن ہوئیں اور اپر ڈیک میں جا بجا سرگرمی دھومیں کے مرغولے تیرنے لگے۔ میں نے اُنھ کے حیرت سے جائزہ لیا تو متعدد غیر ملکیوں کو اپنے سے زیادہ حیران پایا۔ سگریٹ نوشی کرنے والے، سب ہی چٹنی یا مقامی تھے۔

میرادل چاہا کہ میں بھی سگریٹ سلگا لوں لیکن بہت نہیں کر سکا۔ مناسب یہی تھا کہ عملے کے کسی فرد سے بات صاف کر لی جائے۔ اس کے لیے مجھے زیادہ دیر تک انتظار نہیں کرنا پڑا کیوں کہ گول، چکر دار زنبور سے کئی مردوں اور عورتوں کے ڈار کی ڈار برآمد ہوئی اور وسط میں بنے ہوئے گول بار کاؤنٹر کی دیرانی کو دھکیں میں بدلتے گئی۔ ہر قسم کی شرابوں اور پٹلے مشروبات کے ساتھ کھانے کی اشیاء کی تحیلیوں کے نمونے عقبی الماریوں میں سجائے جا رہے تھے۔ بقیہ سامان گتے کے ڈبوں میں کاؤنٹر پر ڈھیر کر دیا گیا تھا۔

میں اپنی جگہ چھوڑ کر کھٹا ہوا، وہیں جا پہنچا اور ایک خوش رو عورت کو ٹھہر لیا۔ ”س! یہاں سگریٹ نوشی کے بارے میں کیا صورت حال ہے؟“

میری زبان سے اپنی لمبے مس کا خطاب سنتے ہی اُس کی آنکھوں میں گزرے ہوئے دنوں کی چمک تازہ ہو گئی اور وہ شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ ایک قریبی پوسٹری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ”یہ پڑھ لو۔ چینی کے ساتھ ہی انگریزی میں بھی لکھا ہوا ہے۔“

”لیکن یہاں تو مردوں کے ساتھ عورتیں تک سگریٹ پی رہی ہیں۔“ میں نے حیرت سے کہا۔

”ان میں سے کوئی بھی ہم سے پوچھ کر نہیں پی رہا۔ ہم کسی کو اجازت دیتے ہیں، نہ روکتے ہیں۔ تم بلاوجہ کیوں پریشان ہو رہے ہو؟“ وہ میری حیرت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولی۔

”پھر ان پوسٹرز کا کیا فائدہ؟ ان کی جگہ تمہاری تصویر بھی لگائی جا سکتی تھی۔“

اُس کے زرد چہرے پر ہلکی سی سرخی پھیل گئی اور وہ جلدی سے بولی۔ ”جرمانہ کرنے کا اختیار ہمارے حکام کو ہے۔ جب تک فیو لنگر انداز رہتی ہے، کوئی سگریٹ نہیں پیتا، تھوڑی دور نکل آنے کے بعد پابندی عملاً ختم ہو جاتی ہے۔ ہم بھی آنکھیں بند کر لینے ہیں۔“

اُس سے کچھ دیر تک باتیں کرنے کے بعد میں نے بارے میں بستی بیئر خریدی اور اسے بھی پیش کرنی چاہی لیکن اس نے زری سے انکار کر دیا۔

”میں تمہارے پکستان سے ملنا چاہتا ہوں۔“ میں نے اس سے فرمائش کی۔

”وہ راؤنڈ پر آئے گا تو تم سے مل لے گا۔ تمہاری سیٹ کمال ہے؟“

میں نے اشارے سے اسے اپنی سیٹ دکھائی اور اپنی جگہ پر

کیے بیٹھا ہے تو دوسری طرف مکاؤ کو پر غلیزیوں نے اپنی نو آبادی بنایا ہوا ہے۔

ایک سگریٹ اور کتابچے کے مطالعے سے فارغ ہو کر میں بیٹھی کی طرف بڑھا جہاں نچلے اور اوپری ڈیک کے لیے الگ الگ راستے تھے۔ وہیں میری نگاہ ایک بوڑھے پر پڑی جس کے مطابق ہارر کے صاف و شفاف پانی میں کسی بھی قسم کا گواہ کرکٹ پھینکنے والے پر دس ہزار ہانگ کا ٹک اور جرمانہ کی توقع کی جا سکتی تھی جب کہ ممنوعہ مقامات پر تباہ کو نوشی کی سزا پانچ ہزار ڈالر تھی۔

دھولان اور طویل راہداری پر چڑھنے کے بعد ٹکٹ دیکھنے کا مرحلہ آیا۔ اسی رکاوٹ پر میں نے عملے کے ایک رکن سے پکستان رپورٹر چانگ کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ وہ فیو پر دوا لگی کی تیاروں میں مصروف تھا۔ سفر شروع ہونے کے بعد اس سے ملاقات ممکن تھی۔

گولڈن ڈرگین نامی فیو اپنے حجم کے باوجود پانی کی لہروں کے ساتھ دھیمے دھیمے ڈول رہی تھی۔ چوبی ریپ پر سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ نچلا عرش یا لوئر ڈیک چاروں طرف سے کھلا ہوا تھا۔ آگے بڑھنے پر اوپری ڈیک میں مسافروں کی وہ بھیڑ بھار نظر نہیں آئی جو لوئر ڈیک پر تھی۔

نرم اور آرام دہ نشستوں کے ساتھ ہی اپر ڈیک چاروں طرف سے بند تھا۔ دواہوں کے اوپری حصے میں کھلنے والے شیشے نصب تھے جنہیں سرکار سمندر کی تازہ ہوا سے لطف اندوز ہوا جا سکتا تھا۔

میری نشست تقریباً وسط میں کھڑکی کے ساتھ تھی۔ میرے آس پاس کی نشستیں خالی تھیں۔ سب سے بری اور پریشان کن بات یہ تھی کہ نمایاں مقامات پر جا بجا تباہ کو نوشی سے نمائندگی کے سرخ نشانات نصب تھے گویا پانچ ہزار ڈالر جرمانہ والی حدود شروع ہو چکی تھیں۔ میں حسرت کے ساتھ شفاف شیشوں کے اُس پار ہانگ کا ٹک اور کولون کے سوا حل کا الوداعی جائزہ لینے لگا۔

ٹھیک چار بجے چوبی ریپ اٹھا لیے گئے۔ فیو کا بوڑھنچنا پھر کنکرت اور شہتیروں سے بنی ہوئی بیٹھی پر کھڑے ہوئے غلامیوں نے گولڈن ڈرگین کے مضبوط اور موٹے رتے ڈھیلے کرنے شروع کیے۔ انجن کی غرابٹ قدرے تیز ہوئی پھر گولڈن ڈرگین کسی کبی... سجائی سواری کی طرح اپنے محور پر گھومنے لگی۔ اس کا اٹکا حصہ آہستہ آہستہ بیٹھی سے دور ہوتا جا رہا تھا اور پیچھے کھڑے ہوئے خلاصی لمبے لمبے بانسوں کے ذریعے فیو کے پچھلے حصے کو بیٹھی سے ٹکرائے سے روکے ہوئے تھے۔

آخر کار بیٹھی والے غلامیوں نے شیشوں کے ساتھ رتوں کے برے ان لمبے بانسوں کے کھوں میں پھنسا دیے۔ اگلے رتے پہلے ہی نچلے ڈیک پر پھینکے جا چکے تھے۔ پکاک فیو کی رفتار بڑھنے لگی اور ہم دھیمے دھیمے بیٹھی سے آگے نکلنے لگے۔

لوٹ آیا۔

فیری گھرے سمندر میں جانے کے بجائے، ساحل سے ڈیڑھ دو کلومیٹر کے اندر ہی سفر کر رہی تھی۔ رفتہ رفتہ ہانگ ہانگ کے آثار شام کے گھنٹے کے میں معدوم ہو کر پیچھے رہ گئے۔ البتہ دایہی طرف، چین کی ساحلی آبادیوں کے آثار ہمارے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

آخر کار گوئلن ڈریمن کا پستان، ریور چینگ میرے پاس آ پہنچا۔ وہ متوسط عمر کا ایک خوش مزاج شخص تھا۔ اس نے نہایت بے تکلفانہ انداز میں اپنا تعارف کرایا اور میرے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

”مجھے روئے بتانا تھا کہ تم اس کے خاص دوستوں میں سے ہو اور شاید پہلی بار مکاؤ جا رہے ہو۔“ اس نے رسمی تقیروں کے تباوے کے بعد کہا۔ ”تمہارا پیغام نہ بھی ملتا تو میں تمہارے پاس ضرور آتا۔ تمہاری بنگ کے وقت ہی میں نے تمہارا سیٹ نمبر نوٹ کر لیا تھا۔“

مجھے اٹھانے لگ گیا کہ وہ میرے اور شوائے کے تعلق سے لاعلم تھا اس لیے میں نے کہا۔ ”دو بیٹا بہت خوش مزاج اور لٹریچر لڑکی ہے۔ اس نے مجھ سے تمہاری بہت تعریف کی ہے۔“

وہ زور سے ہنسا اور بولا۔ ”میں خود کو تمہاری توقعات کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کروں گا۔ ویسے یہ بتاؤ کہ تمہیں قمار بازی سے کس حد تک دلچسپی ہے۔“

”شوق نہیں ہے لیکن کبھی کبھار کارڈز کھیل لیتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”مکاؤ میں کارڈز پر ہی تو سب سے زیادہ جوا ہوتا ہے۔ وہاں دنیا بھر کے چھپے ہوئے شارپرز کی فوج در فوج پڑی ہوئی ہے۔ آدمی ان کے چکر میں آجائے تو اس کے کپڑے تک اتروا لیتے ہیں۔“

”میں کسی لیے کھیل کا عادی نہیں ہوں۔“ میں نے جلدی سے وضاحت کی۔

”پھر میں تمہیں ایک اچھے ہوٹل میں پہنچا دوں گا۔ وہاں تمہاری شائیں حسین اور خوشگوار گزر رہی گی۔“ وہ دایہی آنکھ دبا کر بولا اور میں اس کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنس دیا۔

”ویسے تم بڑے مناسب وقت پر آئے ہو۔“ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”پرسوں ڈون کی حویلی میں بل فائٹنگ کا زبردست پروگرام ہے۔ تم چاہو تو اس میں شرکت کر سکتے ہو۔ مکاؤ کے لوگ ڈون کی حویلی میں قدم رکھنا بہت بڑا اعزاز سمجھتے ہیں۔“

”ضرور۔ بل فائٹنگ میں نے صرف ٹی وی پر ہی دیکھی ہے۔ لیکن ڈون مکاؤ کا اتنا اہم آدمی ہے تو میں اس کی کسی تقریب میں کیسے شرکت کر سکوں گا؟“ میں نے پوچھا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ ریور چینگ خود ہی مجھے میرے مطلوب مقام پر پہنچانے کی پیش کش کر رہا تھا۔

ڈون کسی بھی موقع پر اپنے خیر خواہوں کو نہیں بھولتا۔ میرا کارڈ ضرور آئے گا۔ پرسوں میں ہانگ ہانگ میں رہوں گا۔ میرے کارڈ پر تم چلے جانا۔“

”لیکن وہ کارڈ تو تمہارے نام پر ہو گا؟“ میں نے الجھن ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

”میں نے کہا تھا کہ ڈون کی تقریبات مکاؤ والوں کے لیے فخر اور اعزاز کا درجہ رکھتی ہیں۔ اس کے دعوت نامے لوگ اپنے عزیز ترین دوستوں کو بہترین تحفے کے طور پر دیتے ہیں۔ یہ بات ڈون بھی جانتا ہے اس لیے اس کے دعوت ناموں پر نام نہیں، صرف کارڈ نمبر والا جاتا ہے۔ ایک کارڈ پر کوئی بھی ایک آدمی ڈون کی تقریب میں شرکت کر سکتا ہے۔ تم سے کوئی، کسی قسم کا تعرض نہیں کرے گا۔“

”تو کیا یہ بل فائٹنگ کوئی روایتی قسم کی تقریب ہوتی ہے؟“

ریور چینگ کے انداز بیان نے میرے دل میں تجسس پیدا کر دیا تھا۔

”ڈون کی ہر تقریب مکاؤ کی روایت بن جاتی ہے۔ سنا ہے پرسوں اس کا بچپن کا کوئی دوست مکاؤ آنے والا ہے۔ اسی کے اعزاز میں ڈون نے بل فائٹنگ کا پروگرام بنایا ہے۔ وہ اسی میدان میں اپنے پرانے دوست کا استقبال کرے گا۔ یہ کل کی تازہ ترین خبر تھی۔“

ریور چینگ کے وہ الفاظ سنتے ہی میری کھوپڑی سن ہو کر رہ گئی۔

کراچی میں نیش کاؤ نے وہی کچھ کہا تھا جو ریور چینگ ڈھراوا تھا۔ اگر اس کے بیان میں سے بل فائٹنگ کا ذکر حذف کر دیا جاتا تو سیدھی سی یہ بات باقی رہ جاتی تھی کہ فایا کا ڈان، نیش کاؤ میرے معاملے پر مذاکرات کرنے کے لیے تیسرے ڈون کو ایک فوکے پاس پہنچنے والا تھا۔

ایک طرف وہ اہم ترین اطلاع تھی اور دوسری طرف یہ

صورت حال تھی کہ ڈون کو ایک فوکے، غزالہ اور سلطان شاہ کے بارے میں دیرا کے علاوہ کسی اور سے بات کرنے کا بھی روادار نہیں تھا اگر شوائے کے تعاون سے ڈون کی خوشامد آمد کا کوئی سلسلہ شروع بھی کیا جاتا تو دور دور تک ایسا کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا کہ ڈون، نیش کاؤ کی آمد سے پہلے، اگلے دن تک پہنچ جاتا۔

اگر ریور چینگ کی اطلاع درست تھی تو میرے پاس کچھ کر گزرنے کے لیے صرف اٹھانہ رہ گیا تھا۔ ڈون کو ایک فوکے اور نیش کاؤ کو ایک بار سرجو ڈر پیٹنے کا موقع مل جاتا تو میرے فرشتے بھی ڈون کے قریب جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے جب کہ غزالہ اس کی قید میں تھی۔

”کیا بات ہے؟ تم چپ کیوں ہو گئے؟“ مجھے خاموش پا کر ریور چینگ نے نوا کا۔

”ہی! اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ”اس کے بارے میں برسرِ عام ایسے غیر محتاط گفتگو نہ کرنا ورنہ دشواریوں میں پڑ جاؤ گے۔“

”آخر یہ ڈون کون ہے؟ تمہاری باتوں سے اندازہ ہو رہا ہے کہ مکاؤ کے لوگ اس سے بہت زیادہ خائف رہتے ہوں گے۔ یہ کوئی اچھی بات تو نہیں ہے۔“

”تمہیں کوئی نہیں بتائے گا کہ ڈون کیا شے ہے لیکن مکاؤ کی سرزمین پر قدم رکھنے کے بعد تم جلد ہی اُس کے بارے میں بہت کچھ جان لو گے۔“ وہ خائفانہ ہنسی کے ساتھ بولا۔

”تم نے مجھے تجسس میں ڈال دیا ہے۔ اب میں اسی کے بارے میں سوچتا رہوں گا۔“

”وہ اپنے دوستوں، مہمانوں اور خیر خواہوں کو بہت عزت دیتا ہے۔ اُس کے ذاتی ٹیلی کاپڑ ایسے لوگوں کو کولون کے ہیلی پڈ سے براہِ راست اس کے محل میں لاتے ہیں اور دشمنوں کے ساتھ حیرت انگیز طور پر کوئی نہ کوئی جان لیوا حادثہ پیش آ جاتا ہے۔“

میری ریزہ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ مجھے یاد آیا کہ چند روز پہلے ڈون نے اپنے چند مشتبہ آدمیوں کو خود ہی ہلاک کرا دیا تھا۔ اسے پورا یقین تھا کہ وہ لوگ اُس کی لاعلمی میں اُس کے نام کی آڑ میں ناجائز ذاتی مفادات حاصل کر کے رہیں، بخور رہے تھے اور محض اسی وجہ سے وہ ہانگ کانگ کی بحری پولیس کے ہاتھوں خوار ہوا تھا۔

اگر ڈون اسی قدر مشہور، معزز اور بھیاک آدمی تھا تو اُس کی اسپینڈ بوٹ کی گرفتاری اور خود ڈون کی نظر بندی کا قصہ پورے علاقے میں مشہور ہو جانا چاہیے تھا لیکن حیرت کی بات تھی کہ ریور چینگ نے اس بارے میں کوئی اشارہ تک نہیں کیا تھا۔

”تمہیں یقین ہے کہ وہ بل فائننگ میں تمہیں ضرور مدعو کرے گا؟“ میں نے بات بکلی کرنے کے لیے اشتباہ آمیز بیویں ریور چینگ سے سوال کیا۔

”نہیں تو۔“ میں بوکھلا کر احمقانہ انداز میں ہنس پڑا۔

”میں سوچ رہا تھا کہ قسمت نے مجھے تمہارے ذریعے مکاؤ کا ایک عظیم الشان ٹھیل دیکھنے کا موقع فراہم کر دیا ہے۔ آج کل کی مطلب رست دنیا میں کتنے ایسے لوگ ہوں گے جو اپنے پرانے ”خون کے استقبال کے لیے اس طرح سوچتے ہوں؟“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ ریور چینگ سنجیدہ ہو گیا۔ ”شاید ایک بھی نہیں لیکن ڈون قدامت پرست ہونے کے ساتھ ہی وضع دار بھی ہے۔ وہ دوستی اور دشمنی کو آخری حدوں تک لے جانے کے فن سے خوب واقف ہے۔“

بظاہر بہت سے واقعات اور کردار میری کمائی سے الگ تھلگ نظر آرہے تھے لیکن ریور چینگ سے ملاقات ہوتے ہی ان کی اہمیت واضح ہونے لگی تھی اور پھر جب اس نے مافیا کے ڈان، نیشی کاؤ کی آمد کی صحیح اطلاع فراہم کی تو مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے ریور چینگ کے روپ میں کسی فرشتے نے آکر میری رہنمائی کی تھی ورنہ اتنی اہم اطلاع کایوں آسانی سے ملنا ممکن نہیں تھا۔

ڈیفنس والے مکان میں ڈان تھری سے ملاقات اور پھر جی لانڈ کے ”گرگس“، ٹیلی ٹینگ سے خون ریز ٹکراؤ کے بعد سے میرے ذہن پر مسلسل یہی ایک خوف سوار تھا کہ کیسی نیشی کاؤ مجھ سے پہلے ڈون کو ایک فونک پچھنے میں کامیاب نہ ہو جائے اس خوف کی وجہ سے میں ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھانے کا ارادہ کر چکا تھا تاکہ بے خبری میں میں کسی بھیاک خطرے سے دوچار نہ ہو سکوں۔

یہ درست تھا کہ ریور چینگ نے تیسرے دن نیشی کاؤ کی آمد کی اطلاع دی تھی اور پھر مجھے ہوئے ڈون کو براہِ راست پر لانے کے لیے دو سہائی مدت بہت ٹھیل بلکہ ناگانی تھی لیکن پھر بھی محمل بے خبری میں رہنے سے بہتر تھا کہ ریور چینگ نے مجھے متوقع امکان سے آگاہ کر دیا تھا۔

اس بے چارے کے فرشتوں کو بھی اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ اس نے مکاؤ میں میری دل جوئی کے چکر میں مجھے کس قدر اہم بات

سے آگاہ کر دیا تھا لیکن وہ میرے اضطراری ردِ عمل سے کچھ پریشان نظر آنے لگا تھا اس لیے میں نے دوبارہ سنبھالا لیتے ہوئے کہا۔

”ڈون مکاؤ میں اس قدر معزز اور محترم سمجھا جاتا ہے تو اس کے دشمن کہاں سے پیدا ہو جاتے ہیں؟“

مقامی سیاست اور واقعات، شاید اس خطے کے ہر چینی زباز باشندے کے لیے محبوب ترین موضوعات کا درجہ رکھتے تھے اس لیے اس نے پرجوش انداز میں نفست پر پہلو بولتے ہوئے کہا۔ ”تم ان چکروں میں نہ پڑو تو کچھ سے تفریح کے چند روز گزار لو گے۔ یہ مقامی کمائیاں ہیں۔ بس یوں سمجھ لو کہ جہاں پیشہ ورانہ رقابت موجود ہو وہاں دشمنی ناگزیر ہوتی ہے۔“

”پھر تو ڈون اپنے دشمنوں کو ہی بچھڑے ہوئے سانڈوں کے سامنے ڈالتا ہو گا؟“

شہور ترین نفسیات کی آرا پر مشتمل کتاب

احساس کمتری

اسباب، آثار، علامات

اس کتاب کا مطالعہ آپ کو بتائے گا کہ

- احساس کمتری کیسے طرح طرح کی نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔
- کامیاب زندگی گزارنے کے اصول کیا ہیں۔

قیمت 25 روپے • ڈاک خرچہ 23 روپے

بکسٹ فائنسٹ

پیشہ ورانہ نفسیات اور نفسیات کی کتابیں

0302253-0888133

0302253-0888133

0302253-0888133

لہراتے ہوئے نرم بالوں کا رنگ سیاہ اور ہلکے دار تھا۔

”معاف کرنا، تمہارا تعلق سویڈن سے تو نہیں ہے؟ میں اس کے بدن کو چھونے کی شدید حیوانی خواہش پر قابو نہ پاسکا۔ میں نے شہادت کی انگلی سے اُس کا نرم بازو چھوتے ہوئے سوال کیا تو اس نے بڑے بغیر اپنا سر میری طرف تھمایا۔

اُس کی آنکھیں گہری ہنزا اور تھیں نظر آئیں۔ اُس کے چہرے کے نقوش تھیکے اور گردن قدرے دراز تھی۔ اُس کے بدن کی اوپر کی پٹائش کے لیے نی شرت کا سائز خاصا کافی تھا جس کا اعمار لچک دار کپڑے کے کچھاڑے ہو رہا تھا۔ اسے شاید زبردستی جہم پر منہ نہ لایا گیا تھا۔

”تم نے کیسے اندازہ لگا لیا؟“ اُس نے مسکراتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

اس حسین چہرے پر، مسکراتے ہوئے گلابی ہونٹوں کے پیچھے موتیوں جیسے آبدار دانتوں کی قطاریں دیکھ کر میں جھنجھکی لے کر کہہ گیا۔ ”اس قدر خوبصورت چہرے سویڈن کے علاوہ پورے یورپ میں کہیں نہیں پائے جاتے۔“ میں نے کسی آزاد منش سیاح کی طرح الجمانہ انداز میں کہا۔

”میرے ساتھی نے تمہاری تعریف سن لی تو ابھی تمہیں سمندر میں پھینک دے گا۔“ اس بار وہ باقاعدہ ہنسنے ہوئے پوری اور اُس کے سفید دانتوں کی قطاریں مزید نمایاں ہو گئیں۔

”اوہ تو تمہارا کوئی ساتھی بھی ہے؟“ میں نے پوچھنے کی اداسی کی۔ حقیقت یہ تھی کہ میں اکیلے بیٹھے بیٹھے اکتا تھا اور اس وقت طبیعت اس کے ساتھ کچھ وقت گزارنے پر چل گئی تھی۔ ”شاید تم نے غور نہیں کیا کہ میں نے دو کاک بیل کا آؤر دیا ہے۔“ اس کی آواز میں ہلکا سا طعنے تھا لیکن ہنسی اور چہرے کے تاثرات میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

”میں سمجھا کہ ایک غروب آفتاب سے پہلے اور دوسرا بعد کے لیے بنوا رہی ہو۔“

وہ میرے ہاتھ پر ہاتھ مار کر قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ”ہو سکتا ہے کہ ایسا ہی ہو۔ بل اتنی اکھل لے چکا ہے کہ اس پر اوگھ سوار ہو رہی ہے۔ وہ سو گیا تو دونوں بیگ میرے ہی حصے میں آئیں گے۔“

”اگر وہ اوگھ رہا ہے تو تم تھوڑی دیر باتیں کیوں نہیں کرتیں؟“ میں نے اُسے دعوت دی۔

”مجھے پہلی ہی نظر میں اندازہ ہو گیا تھا کہ تم اکیلے ہیں کی بورت سے اکتائے ہوئے ہو۔ تم جیسے بے باک اور زیادہ بولنے والے لوگ عموماً صاف دل ہوتے ہیں۔ کچھ دیر کے لیے مل بیٹھنے میں کوئی ہرج نہیں۔“

”میری سیٹ بہت پرسکون مقام پر ہے“ میں نے اُس کی بات کاٹ کر کہا۔ مقصد یہ تھا کہ بلی میرے اور اس کے درمیان کباب

مرفی صدمہ! اُس نے پورے اعتماد کے ساتھ کہا۔ ”میری طرف سے وہ کارڈ تمہارے لیے ایک یادگار تحفہ ہو گا۔ ایسی مغللوں میں سیکڑوں حسین و جمیل لڑکیاں برائے نام لباس میں مسمانوں کے ساتھ ساقی گری کرتی ہیں۔ کمال کی بات یہ ہے کہ مسمانوں کی چمچر چھاڑ کو خوش دلی اور شائستگی کے ساتھ قبول کرنے کے باوجود کوئی لڑکی کسی مسمان کے ساتھ نوک جھونک میں پل نہیں کرتی۔ یہ ذوق کی مکمل دعوتوں کے آداب میں شامل ہے۔ اسی وجہ سے لوگ اپنی بیویوں کو بھی ساتھ لے جانے سے نہیں بچھکاتے۔“

”تم مسلسل میرے جنس کو ہوا دے رہے ہو۔ ایسی کہانیاں تو راجہ اندر کے رنجیلے دربار کے بارے میں ہی سننے میں آتی ہیں۔ وہ خود بھی عورتوں کا بہت رسیا ہو گا؟“

”ایسا ویسا! وہ زور سے ہنسا۔ ”کسی کے ساتھ زبردستی نہیں کرتا۔ شاید مکاؤ کی آدمی عورتیں اور لڑکیاں اُس کے محل میں بیچنے کے خواب دیکھتی رہتی ہیں۔ یوں سمجھ لو کہ اس کا سرتاج سے محروم ہے لیکن وہ پھر بھی مکاؤ پر راج کرتا ہے۔“

”اُس کی آمدنی کے کیا ذرائع ہیں؟ وہ کوئی کام بھی تو کرتا ہو گا؟“

”کوئی اور بات کرتے ہیں۔“ وہ میرے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ”ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے ہم نے آج کی شام ذوق کے نام کر دی ہو۔ دیکھو! ساحل سے دور، چین کی سرزمین پر سورج غروب ہو رہا ہے اور اُدھر نیلے پاندوں میں اتر رہا ہے۔ اس قدر حسین شام کو ذوق کے ذکر میں کیوں ضائع کرتے ہو؟ اس ستر کو یادگار بنانے کی کوشش کرو۔“

وہ میرے پاس سے اٹھ گیا۔ میں اس کے ساتھ بار تک آیا اور اپنے لیے اسکاچ کے لاراج بیگ کا آؤر دے دیا۔ سورج کسی بھی لمحہ اُفق سے نیچے اترنے والا تھا۔ اس وقت کوئی تیز سیال ہی طبیعت کو رنگ پر لاسکتا تھا۔ میرے لیے بانی بن کر رہ گئی تھی۔

”کسم سے فارغ ہونے کے بعد میرا انتظار کرنا!“ یورجیا تک نے مجھ سے رخصت ہوتے ہوئے آہستگی سے کہا۔ ”چھانچ دینے کے بعد میں تمہیں اپنے ساتھ لے چلوں گا۔“

وہ گیا تو اسی لمحے ایک نرم و نازک سفید فام دو شیر ذوق کاؤنٹر پر میرے قریب آکھڑی ہوئی۔ اس نے باریک دو دو کاک بیل کا آؤر دیا تھا۔ اپنی پسندیدہ کاک بیل کے اہم اجزاء اُسے زبانی یاد تھے۔

میں نے غور سے اُس کے گداز سراپا کا جائزہ لیا تو قدرت کی صنائی کی داد دیے بغیر نہ سکا۔ وہ بغیر بازوؤں والی ٹہنی نیلی نیان یا ٹی شرت کے ساتھ نیلی ڈنیم کا مختصر سا ٹیکر پہنے ہوئے تھی۔ وہ دونوں ہی کپڑے اتنی احتیاط سے منتخب کیے تھے کہ اس کے بدن پر چھنے چھنے نظر آ رہے تھے۔ اُس کے سٹول اور سرسری بازو اور سبک ٹانگیں بلاشبہ بہت خوبصورت تھیں۔ شانوں سے نیچے تک

ہوئے کہا۔ ”تمہارے آجانے کے بعد یہ مناظر میرے لیے اپنی کشش کو بیٹھے ہیں۔“
”میری ٹانگ کھینچنے کی کوشش کر رہے ہو؟“ اس نے مجھے گھورتے ہوئے پوچھا۔

”اتنی سڈول اور پھسلوان ٹانگوں کو کون احمق کھینچ سکتا ہے؟“ میں نے محاورے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہاری خوبصورتی سے واقعی مرعوب ہوا جا رہا ہوں۔“
اس نے میرے گلاس سے گلاس نکرا کر کاک ٹیل کا ایک گھونٹ لیا پھر بنجیدگی کے ساتھ بولی۔ ”تم کس سلسلے میں مکاؤ جا رہے ہو؟“

”اس وقت تو یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے یہ سفر تم سے ملاقات کا بہانہ رہا ہو۔“ میں نے اس کے لطیف جود کے حرارت آگئیں لے کر اسے لذت اندوز ہوتے ہوئے کہا۔

”میں تمہیں یہ بتانا بھول گئی کہ بل ہر وقت نشہ میں نہیں رہتا۔“ وہ اپنی مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے بولی۔
”اسی کے ساتھ تم اپنا نام بتانا بھی بھول گئی ہو۔ دیے مجھے تنویر کہتے ہیں۔“

”میرا نام روزینی ہے۔ ہم دونوں تقریباً مکاؤ جا رہے ہیں۔“ اس نے کہا۔

معاً مجھے اس کا کہا ہوا ایک فقہیاد آگیا اور میں نے پوچھا۔
”بل اور تم، دوسروں کی نگاہوں میں آنے سے خائف کیوں ہو؟ تمہارے ساتھ کوئی گزرتو نہیں ہے؟“

میرے سوال پر اُس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا اور وہ ہچکچی ہنسی کے ساتھ بولی۔ ”نہیں... نہیں گزرتو کوئی نہیں ہے بس یہ احساس ہے جین کر رہا ہے کہ ہمت ی آئیں تمہاری طرف گھراں ہیں۔“

میں نے فوری طور پر جرح کر کے کشیدگی پیدا کرنے سے گریز کیا اور ہم دونوں ہلکی پھلکی باتوں سے لطف اندوز ہونے لگے۔ اس لڑکی میں مزاح کی حس کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ لطیف مزاح کو بھی نہ صرف سمجھ لیتی تھی بلکہ پلٹ کر، لطیف تر جوابی وار کرنے کی کوشش بھی کرتی تھی۔

وہ سویڈن کی ایک غیر معروف یونیورسٹی میں سینئر لیکچرار تھی اور دو سال کی تعطیلات کیجھا کرنے کے بعد ’بل‘ کے ہمراہ فنونِ خیر مشرق کی سیاحت کرنے نکلی تھی۔ اس کے بارے میں، میرے بچے کو توفیق اس بات سے ملی کہ وہ دونوں راستے میں کہیں قیام کرنے کے بجائے، اسناک ہوم سے چل کر سیدھے ٹانگ کا ٹانگ پہنچے تھے۔ اس سفر میں، یہی میں طیارہ بدلنے کے علاوہ انہوں نے آرام نہیں کیا تھا جب کہ یورپ سے مشرق بعید کی پروازوں پر، ہر کنبی کسی اضافی کرائے کے بغیر ایک یا دو مقامات پر ٹھہرنے کی سہولت دیتی تھی۔ روزینی نے بتایا کہ واپسی کے سفر میں وہ دونوں بیکاک، بمبئی

میں بڑی بننے کی کوشش نہ کرے۔
اس کے کاک ٹیلز کے پیگ تیار ہو گئے تھے۔ میں نے پھرتی کے ساتھ ان کی رقم ادا کر دی۔
”یہ میرا آڈر تھا۔“ اس نے احتجاج کیا۔ ”تم نے پیسے کیوں ادا کر دیے؟“

”کوئی ہرج نہیں۔ تم میری مسمان ہو اور ہاں بل سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟“

”ہوائے فریڈ۔“ وہ کاک ٹیل کا ایک گلاس اٹھاتے ہوئے بولی۔ ”یہ میں اُسے دے کر آتی ہوں۔ میرا گلاس تم اپنی سیٹ پر لے جاؤ۔ میں خود بھی جگہ بدلتی چاہ رہی تھی۔“
”کیا بل سے اتنی زیادہ آگاہی ہو؟“ میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے سنی خیر مجھے میں سوال کیا۔

”بل نہیں، میں اپنے آس پاس موجود چینی مسافروں سے آگاہی ہوئی ہوں۔ وہ اپنے پھیلوں سے نکال کر خشک پھلیاں، سانپ کے پارچے اور سوکھے کیڑے دانتوں سے نونچ نونچ کر کھائے جا رہے ہیں۔ انہیں دیکھ کر حسی ہوئے لگی ہے۔“
”اس ڈیک پر بہت سی نشستیں خالی ہیں۔ تم جگہ بدل سکتی تھیں۔“

”بل کا خیال ہے کہ الگ تھلگ بیٹھ کر ہم خود کو بلاوجہ دوسروں کی نگاہوں کا مرکز بنا لیتے، اس لیے کراہت محسوس کرنے کے باوجود وہیں بیٹھا بیٹھا ہے۔“
میں اپنی سیٹ کی طرف مڑ گیا اور وہ زہد شکن چال میں آگے بڑھتی چلی گئی۔

مغرب میں رنگت کی سرخی و سفیدی، جسمانی تناسب اور صحت مندی کے مظاہر بہت عام ہیں۔ یہ وہ خوبیاں ہیں جو لباس کے اختصار اور بے حجابی کے ساتھ مل کر ہر لڑکی کو قابلِ دید بنا دیتی ہیں لیکن مجموعی طور پر مغرب میں بھی حقیقی حسن کا تناسب وہی ہے جو مشرق میں نظر آتا ہے اور وہ لڑکی ہر اعتبار سے حسین کسی جا سکتی تھی۔ سفر کا بقیہ حصہ اُس کی رفاقت میں گزارنے کا تصور میرے لیے خاصا سنسنی خیز تھا۔

میں نے کھڑکی کے ساتھ بیٹھ کر، اپنی طرف کی ساحلی پٹی پر نگاہیں مرکوز کر دیں۔

چند منٹ بعد وہ بھی آگئی اور بے تعلقانہ انداز میں میرے بائیں پہلو سے چپک کر بیٹھ گئی۔

”ڈوبتے ہوئے سورج کی سرخ روشنی میں، ساحل کس قدر حسین اور راسخا نظر آ رہا ہے۔“ وہ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے، چڑا شوق لہجے میں بولی۔ ”ہیں بائیں طرف جگہ ملی تھی۔ وہاں سے سمندر کے پانی کے علاوہ کچھ بھی نظر نہیں آ رہا اور اوپر سے سڑی ہوئی کچی پھلیاں!“

میں نے اُس کا کاک ٹیل کا گلاس اس کے حوالے کرتے

کراچی اور پشاور کی سیاحت کا ارادہ رکھتے تھے۔
ابتدائی تین شہر تو نضائی راستے پر واقع تھے لیکن پشاور کا
معاملہ مختلف تھا۔

میں نرم اور پیٹھے انداز میں، وقفہ وقفہ سے اسے چھیڑتا رہا
اور آخر کار اس نے دوستانہ فضا کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنا مسئلہ
میرے سامنے رکھ دیا۔

ان دونوں کے پاس کچھ بیش قیمت ہیرے تھے جو انہیں مکاؤ
میں ایک ایسی عورت کو پہنانے تھے جو مقررہ وقت پر مقررہ مکاؤ کے
ذریعے ان تک پہنچتی۔ انہیں صرف اتنا بتایا گیا تھا کہ وہ ہیرے
بست قیمتی تھے لیکن بل اور روزنی کو شبہ تھا کہ ان ہیروں کا تعلق
ہالینڈ کے قدیم شاہی نوادرات سے تھا کیوں کہ ان کے ٹوٹ ہونے
سے تقریباً سات ماہ قبل، ہالینڈ کے شاہی میوزیم میں نقب زنی کی
ایک سنسنی خیز واردات ہوئی تھی جس میں چور صرف چند زیورات
اور بعض قدیم ترین ہیرے لے اڑے تھے۔ ان دونوں کو پورا یقین
تھا کہ بات صرف ہیرے لے جانے کی نہیں تھی بلکہ اس معاملے کا
تعلق ایمرسٹرمز والی چوری سے بھی تھا۔

روزنی کو یاد تھا کہ شاہی میوزیم میں چوری کے بعد، آثار قدیمہ
کے ماہرین نے مسروقہ ہیروں کی مالیت کا تعین چالیس کو ڈگھڑ کیا
تھا جو ان کے ملک کی کرنسی میں ایک ارب ستر کو ڈکھانے سے زائد
ہوتی تھی۔

انہیں وہ ہیرے بحفاظت مکاؤ پہنچانے کے لیے آدورفت
کے جملہ اخراجات کے علاوہ پچاس ہزار امریکی ڈالر کی پیش کش کی
گئی تھی۔ بیک وقت چار لاکھ کرونا مل جانے کا تصور اس قدر سحر
آفریں تھا کہ روزنی نے وہ پیش کش قبول کر لی اور پھر بل نے بھی
اس منصوبے پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔

روزنی نے اعتراف کیا کہ ان دونوں نے اسٹاک ہوم سے براہ
راست ہانگ کانگ کا سفر اسی وجہ سے اختیار کیا تھا کہ راستے میں
انہیں جا بجا مختلف ممالک کے کسٹم حکام کا سامنا نہ کرنا پڑے۔
ہانگ کانگ سے فارغ ہونے کے بعد ان کے سامنے صرف مکاؤ کا
مرحلہ تھا جس کے بارے میں وہ دونوں ہی خوف اور بے یقینی میں
جلا ہو گئے تھے۔ انہیں علم تھا کہ اس علاقے میں مکاؤ منظم جرائم
کاسب سے بڑا، عالم گیر اڈا تھا جہاں بحری قزاقوں سے لے کر
انسانوں کی خرید و فروخت میں ملوث مجرموں کی بلا دستی تھی۔ اس
بت پر وہاں کسٹم اور قانون نافذ کرنے والے دوسرے اداروں کا
مستعد اور چمکا ہوا ناگزیر تھا۔ اگر وہ لوگ کسی بھی شبہ کی بنا پر ان
کے سامان میں سے مسروقہ تاجری ہیرے برآمد کر لیتے تو ان دونوں
کی زندگیاں تباہ ہو سکتی تھیں۔

میں خود سوئڈن نہیں گیا تھا لیکن میں نے اسکینڈے نیوین
ممالک کے بارے میں بہت کچھ سنا اور پڑھا ہوا تھا۔ وہاں صحیح
معنی میں قلاچی مملکت کا تصور رائج تھا۔ خواندگی کا اوسط سو فیصد

کے لگ بھگ تھا۔ روزگاری فراوانی ہونے کے ساتھ ہی، حکومت
کی طرف سے بے روزگاروں کے لیے ہفتہ وار وظائف کی اسکیم
رانج تھی۔ ان انفرادی وظائف کی مالیت بعض ملازمتوں کی
اجرتوں سے زیادہ ہوا کرتی تھی۔ اس کے باوجود وہاں کے باشندوں
میں حرام خوری کا وہ رجحان نہیں تھا جو برطانیہ میں عام نظر آتا تھا۔
ان کے حکمرانوں نے اپنی بے در بے اصلاحات اور منظم
پروپیگنڈے کے ذریعے ایک ایسا معاشرتی انقلاب برپا کیا تھا کہ بے
روزگار رہ کر زیادہ وظائف لینے والے شہری بھی خود کو نکما بلکہ بڑے
حرام تصور کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ وہ اپنی ذات میں شرمارہ کر
خود کو دوسرے درجے کا ایسا شہری تصور کرتے تھے جسے اس کے
دوسرے ہم وطن، زیادہ محنت کر کے اپنے خرچ پر پال پوس رہے
ہوں۔ اسی وجہ سے وہاں بے روزگاری کا تناسب غیر معمولی حد تک
کم رہتا تھا۔ لوگ کم کماتے میں فخر محسوس کرتے تھے۔

”تمہاری یہ ساری بکواس درست ہے“ میری جرح سے تنگ
آکر روزنی نے تنگ کر کہا۔ ”میں مانتی ہوں کہ سوئڈن میں باعزت
طور پر خوشحالی کی زندگی گزارنے کے لیے غیر معمولی جدوجہد کی
ضرورت نہیں پڑتی۔ کوئی مرد یا عورت ملازمت کر کے اپنے بنیادی
اخراجات پورے نہ کر سکے تو ریاست اس کی مدد کرتی ہے۔ نوکری
چھوٹ جائے تو سرکاری خزانے کے منہ کھل جاتے ہیں لیکن تم یہ
کیوں بھول رہے ہو کہ انسان ایک سماجی حیوان ہے۔ وہ مرتے دم
تک سماج میں اپنی سے اپنی تر مقام حاصل کرنے کی جستجو میں لگا
رہتا ہے۔ چار لاکھ کرونا کا ذکر سن کر تو میرے بہت سے ہم وطنوں کا
ہارٹ ٹیل ہو سکتا ہے۔ بل نے یہ مشن کامیاب ہونے کے بعد
پیرس میں بسنے کا پروگرام بنایا ہوا ہے۔ اب تم خود ہی بتاؤ کہ پیرس
جیسے شہر انداز میں ڈھائی تین لاکھ فرانک کی اشیائے رکھتے ہیں؟
سوئڈن میں رہنے والوں کے لیے یہ بڑی رقم ہو سکتی ہے لیکن پیرس یا
لندن والوں کے لیے نہیں!“

”مگر میری جان!“ میں نے درو مندی کے ساتھ کہا۔ ”تم
اسٹاک ہوم کو چھوڑ کر لندن اور پیرس کے خواب کیوں دیکھ رہی
ہو؟ اسٹاک ہوم میں تم کم از کم لکھتی ہو تو ضرور کسلاؤ گی۔“

وہ غصہ بڑی اور بولی۔ ”یہ بعد کی بات ہے۔ پہلی اور بنیادی
بات یہ ہے کہ تم مجھ سے متفق ہو گئے ہو۔ اب سنو کہ بل اس مشن
کی کامیابی کے بعد اپنے ماضی کو یکسر فراموش کر دیتا چاہتا ہے۔
ماضی سے نجات حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی اپنی
تاریخ کے ساتھ ہی جغرافیہ بھی بدل لے۔ جغرافیہ یعنی شہریت کی
تبدیلی کے لیے سرمایہ بہت ضروری بلکہ ناگزیر ہے اور موجودہ مشن
ہمیں یہ موقع فراہم کر رہا ہے۔“

”تو کیا میں یہ سمجھ لوں کہ وقتی دل لگی کے علاوہ ہمیں ایک
دوسرے کی کوئی ضرورت نہیں ہے؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں
آنکھیں ڈال کر سوال کیا۔ ”ایک بار تم مسروقہ ہیرے ملے شدہ

پھر وہی ڈون کا ذکر آیا تو میں پریشان ہو گیا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے ڈون کو اتک فوکسی بد معاش کی طرح پورے مکاؤ اور اس کے متعلقین کے سروں پر سوار ہو۔
 ”اس کا مطلب ہے کہ کسٹم حکام کے ساتھ ہی حریف کردہ بھی تمہارے مقابل صف آرا ہو سکتا ہے؟“ میں نے حیرت کے ساتھ سوال کیا۔

”اصل خطرہ ڈون کے آدمیوں کی طرف سے ہے۔“ آخر کار روزنی کو اعتراف کرنا ہی پڑ گیا۔ ”جب تک ہم اسٹاک ہوم میں تھے، ہمیں اس خطرے کی گنجین کا اندازہ نہیں ہو سکا تھا لیکن ہانگ کانگ پہنچنے کے بعد ہمیں معلوم ہوا ہے کہ مکاؤ میں ڈون کی مرضی کے خلاف کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ اگر اس کو بیرون کی بجائے مل چکی ہے تو وہ ہر قیمت پر انہیں حاصل کر لے گا۔ وہ اس قدر بے رحم ہے کہ بیرون کی خاطر اس کے آدمی ہم دونوں کو ذبح بھی کر سکتے ہیں۔“
 ”ڈون کو تم پر شبہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اس سخریں تمہارے علاوہ بھی بہت سے سفید فام شامل ہیں۔ اتنی بھیڑ میں اصل جوڑے کو پہچانا آسان کام نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

”دیکھو، تم اصل بات سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہے۔“ روزنی کی ساری تیزی طراری اور وضع داری دھری کی دھری رہ گئی اور وہ واضح طور پر بہت زیادہ پریشان اور بدحواس نظر آنے لگی تھی۔ ”یہ ٹھیک ہے کہ ڈون کو میرے یا بل کے بارے میں کچھ علم نہیں ہے لیکن وہ مکاؤ میں بہت بار سوچ رہے ہیں۔ وہ دن سے مکاؤ کے حالات بہت محسوس ہو گئے ہیں۔ وہاں پہنچنے والے ہر سفید فام کے سامان اور لباس کی تفصیلی تلاشی لی جاتی ہے۔ کمال کی بات یہ ہے کہ منشیات اور دیگر ممنوعہ اشیاء برآمد ہونے کے باوجود کسی کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جارہی۔ ہم دونوں کا خیال ہے کہ مکاؤ کے کسٹم والے، ڈون کے ایما پر صرف بیرون کی تلاش میں ہیں۔ ان حالات میں ہماری کامیابی کا کوئی امکان نہیں رہتا۔۔۔“
 ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہارا چار لاکھ کروڑ کا معاوضہ خطرے میں ہے؟“

”چار لاکھ کروڑ ہر لعنت بھیجو۔“ وہ جل کر بولی۔ ”اس وقت تو ہماری جانوں کے لالے بڑے ہوئے ہیں۔ ہمارے پاس سے ہیرے برآمد ہوتے تو ہم زندہ نہیں چھوڑے جائیں گے۔ بل جیسا نذر آدمی جس کی صورت حال سے بری طرح خوفزدہ ہے۔ اس کا ہاتھ بگڑ گیا ہے اور وہ خود فراموشی کے لیے مسلسل شراب پئے جا رہا ہے۔“

”اگر مجھ سے تمہاری ملاقات نہ ہوتی تو تم کیا کرتیں؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔
 ”تم کیا سمجھ رہے ہو؟“ اس نے تقریباً مجھ سے پٹ کر مجھے بری طرح جھنجھوڑ ڈالا۔ ”میری اور تمہاری ملاقات کسی اتفاق کا نتیجہ نہیں ہے۔ میں نے کپتان کو تمہارے ساتھ بیٹھے ہوئے، کیمہ کر

پائی کے حوالہ کرنے میں کامیاب ہو جاؤ تو تمہاری راہ میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہے گی۔“
 ”نہیں، ڈارلنگ!“ وہ اٹھلا کر مسکرائی۔ ”وقتی دل لگی کے علاوہ بھی ہم اچھے دوست بن سکتے ہیں، شرط صرف اتنی ہی ہے کہ تم مکاؤ میں کسٹم سے نکلنے پر ہماری مدد کرو۔“

”میری مدد لے کر تم مشکلات سے دوچار ہو سکتی ہو۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”جن لوگوں نے تمہیں یہ کام سونپا ہے انہوں نے کسی نہ کسی کو تمہاری نگرانی پر ضرور مامور کیا ہو گا۔ تمہیں اس کا تحفظ حاصل ہو گا جب کہ میرے آگے پیچھے کوئی بھی نہیں ہے۔“

”اس فیرو کی کپتان سے تمہاری دوستی ہے۔“ اس کے تبرے نے مجھے بری طرح چونکا دیا۔ ”وہ کافی دیر تک تمہارے ساتھ رہا ہے۔ میرے پہنچنے سے لے کر بھر پیلے ہی وہ بارے رخصت ہوا تھا۔“

میں ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اتفاقاً مجھ سے متعارف نہیں ہوئی تھی بلکہ ریور چپانگ کی وجہ سے مجھ پر نگاہ رکھے ہوئے تھی اگر میں اسے نہ چھیڑتا تو شاید وہ خود ہی کسی نہ کسی بہانے سے مجھ سے مل بیٹھنے کی کوشش کرتی۔
 ”وہ کیا کر سکتا ہے؟“ میں نے روزنی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

وہ میری طبیعت کی بد مزگی فوراً ہی بھانپ گئی اور خوشامدانہ لہجے میں بولی۔ ”دیکھو! میرے لیے یہ زندگی اور موت کا معاملہ ہے۔ جن لوگوں نے مجھے اس کام کے لیے چننا ہے انہوں نے ضرور سوچا ہو گا کہ میرا تعلق مدریس کے مقدس پیشے سے ہے۔ اس پیشے کی وجہ سے جو پاسپورٹ پر بھی درج ہے، مجھے ہر جگہ عزت اور احترام سے دیکھا جائے گا۔ اب تم خودی سوچو کہ اگر میں مسرودہ بیرون کی اسٹنگ کے جرم میں پکڑی جاتی ہوں تو میرا مستقبل کیا رہ جائے گا؟ میری تو زندگی تباہ ہو جائے گی۔۔۔“

”یہ میرے نہیں تمہارے سوچنے کی باتیں تھیں اور وہ بھی گھر سے نکلنے سے پہلے اب تو تم دلیل میں قدم رکھ ہی چکی ہو۔ پھر یہ ضروری تو نہیں کہ مکاؤ میں تمہیں واقعی کوئی مشکل پیش آئے۔ ہو سکتا ہے کہ اپنے پیشے کی نیک نامی سے فائدہ اٹھا کر تم ہیرے نکال لے جانے میں کامیاب ہو جاؤ۔“

”میری چمنی جس مجھے خبردار کر رہی ہے۔“ چند ثانیوں کے توقف کے بعد وہ ایک گہرا سانس لے کر بولی۔ ”جن لوگوں نے یہ کام مجھے سونپا ہے، انہوں نے مجھے ڈون کو اتک فوکسی ایک بد معاش سے ہوشیار رہنے کی ہدایت کی تھی اگر اسے بجائے مل گئی تو یہ ہیرے ہمارے ہاتھ سے نکل جائیں گے۔ ڈون کسی بھی قیمت پر یہ فائدہ ہیرے اپنے حریفوں تک نہیں پہنچنے دے گا۔ ہم اسی وجہ سے پریشان ہو رہے ہیں۔“

ہی تم سے مل بیٹھے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اس فیری پر اس وقت صرف تم ہی ہماری کچھ مدد کر سکتے ہو؟

”مجھے آسان زبان میں بتاؤ کہ تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟“ میں نے خشک لہجے میں پوچھا۔ اس کی نیت اور مدعا سے واقف ہونے کے بعد اس کے گداز سراپا کی نیم برہنگی میرے لیے ایک بیک کشش کھینچتی تھی۔

”ہم بیرون کا وہ پکٹ تمہیں دے دیتے ہیں۔ کسٹم سے نکلنے کے بعد تم وہ پکٹ ہمیں واپس لوٹا دیتا۔ اس کام کے لیے ہم تمہیں اپنا حصہ دار بنانے کے لیے تیار ہیں۔“ اس نے بے چارگی کے ساتھ کہا۔

اس کا منصوبہ سنتے ہی میرے اندر سويا ہوا شفاک اور خود غرض ڈبئی اگھڑائی کے لریدار ہو گیا۔ روزی کے عزائم میں مجھے ایک بیک اپنی کامیابی کی ایک راہ نظر آگئی تھی۔

”مجھے حصہ دار بنانے کے لیے تم ایک لاکھ کروٹیا اس کے مساوی رقم فوری طور پر ادا کر سکو گی؟“

”فی الحال تمہارے پاس ڈھائی تین ہزار ڈالر سے زیادہ نہیں ہے۔“ اس نے ناپوسی کے ساتھ کہا۔ ”ہمیں اشاک ہوم لوٹنے پر معاوضہ ملے گا۔ اس وقت ہم تمہیں چوتھائی رقم دے دیں گے۔ اس نے میرے مطالعے کو بے چوں و چرا تسلیم کر لیا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اس وقت رقم سے زیادہ اپنی اور بل کی سلامتی کے لیے فکر مند تھی۔ زندگی نہ رہے تو اربوں کا خزانہ بھی مٹی سے زیادہ حقیر ہو جاتا ہے۔

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجھے تمہارے ساتھ سوئین تک دوڑ لگانی ہوگی۔“

”وہ بہت سربز شاداب اور حسین ملک ہے۔ ایشیائی بھی اسے اپنے خوابوں کی جنت سمجھتے ہیں۔ وہاں جا کر تمہیں ناپوسی نہیں ہوگی۔ وہاں پہنچتے ہی رقم تمہارے حوالے کر دی جائے گی۔“ اور اگر وہ لوگ اپنا کام نکلنے کے بعد معاوضے کی ادائیگی سے منکر ہو گئے؟

”اس کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔ ہم نے بھی پورے اطمینان کے بعد ہی اس سفر پر نکلنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ڈون کے مقابلے میں ان سے جیتنا زیادہ مشکل نہیں ہو گا۔“

”تمہارا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ تم اس وقت اپنی زندگی بچانے کے لیے ان بیرون سے چھکارا بنا چاہتی ہو۔ اس کے بعد میرے رہیں یا جائیں، تمہیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے؟“

”میرے کھو دینے کے بعد ہم چار لاکھ کروٹا سے محروم ہو جائیں گے۔“ اس نے یاد دلایا۔

”لیکن تمہاری زندگیاں چار لاکھ کروٹا سے زیادہ قیمتی ہیں۔ تم بیرون کا پکٹ بنا کر سمندر میں کیوں نہیں پھینک دیتیں؟ یہ تمہارے مسئلے کا سب سے آسان اور سیدھا حل ہے۔“

میری تجویز پر وہ شکست خوردہ انداز میں ہنس پڑی۔ ”تم سمجھ رہے ہو کہ شاید تمہاری ہی عقل کام کرتی ہے۔ ہم ان تمام امکانات پر غور کر چکے ہیں۔ مکاؤ پہنچنے تک کوئی راہ نظر نہ آئی تو شاید یہی کرنا پڑے گا لیکن اس میں بھی ایک بہت بڑی خرابی ہے۔ ہیرے سمندر میں پھینک دینے کی صورت میں ہم کسی کو اصلیت کا یقین نہیں دلا سکیں گے اور مسرودہ بیرون کے مالک بھی سمجھیں گے کہ ہم نے بددیہتی کی بنا پر ہیرے خود برد کر لیے ہیں۔ امید کی واحد کرن یہ ہے کہ وہ لوگ مکاؤ کے ڈون کی طرح شفاک اور سنگ دل نہیں ہیں۔“

”مجھے یہ جان کر صدمہ ہوا ہے کہ میں نے تمہیں اپنی کوششوں سے اپنی طرف متوجہ نہیں کیا، بلکہ تم خود جانے بولنے انداز میں مجھ سے متعارف ہوئی ہو۔ تم بلاشبہ بہت خوبصورت اور خوش بدن ہو لیکن تم نے اس ملاقات کو دوستی کے بجائے کاروبار کا رنگ دے دیا ہے۔“

”ناپوسی کی ضرورت نہیں!“ اس نے ہنستے ہوئے میری بات کاٹ دی۔ ”میں تبدیلیوں کی شیدائی ہوں۔ تم نے میرے ساتھ تعاون کیا تو میں تمہیں کسی بھی اعتبار سے ناپوس نہیں کر دوں گی۔“ ”اور بل؟ وہ مجھے پھاڑ نہیں کھائے گا؟“ میں نے اسے یاد دلایا۔

”وہ خود بہت بے وفا ہے۔“ وہ تو بیاں چھا کر بولی۔ ”خدمت کرانے کے لیے ہر رات میرے ساتھ گزارتا ہے لیکن دن بھر درخون لڑکیوں کے ساتھ قہر کرتا پھرتا ہے۔ ہفتے میں دو چار دن کاروباری مصروفیات کا بہانہ کر کے ان کی نازیداریاں بھی کرتا ہے۔ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ میں اُس کی تمام حرکتوں سے واقف ہوں اسی لیے وہ بھی میری کبھی کبھار کی بے اعتدالیوں سے چشم پوشی کر لیتا ہے۔“

”ہمارے معاشرے میں اول تو بوائے فرینڈز گرل فرینڈ کا کوئی تصوری ناقابل قبول ہے پھر وہ بھی ایسے کہ دن رات ایک دوسرے کے اعتماد کو دھوکا دیتے رہتے ہوں۔ یہ بات تو سراسر ناقابل قبول ہے۔“

وہ ایک بار پھر ہنس اُڑی۔ ”تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ تمہارا تعلق کس ملک سے ہے؟“

”پاکستان۔“ میں نے آخری گھونٹ لے کر اپنا گلاس خالی کرتے ہوئے کہا۔

”اوہ!“ اس کے لیے میں اشتیاق سے آیا۔ ”میں نے سنا ہے کہ پاکستان دنیا کے ان چند ممالک میں سے ہے جہاں گرمیوں کے موسم میں بھی سخت گرمیوں کے ساتھ کچھ علاقوں میں سردی پڑتی ہے۔“

”واپسی میں تم پاکستان جا ہی رہی ہو۔ کراچی اور پشاور کے موسم کا فرق دیکھ لیتا۔“

میں سات عدد ہیرے، موٹی میں لپیٹ کر اس طرح رکھے گئے ہیں کہ ان پر خراشیں نہ آسکیں۔ اب تم اس کے ذمے دار ہو۔“
”تم ٹھکر نہ کرو۔“ میں نے وہ پیکٹ اپنی جیکٹ کی اندر موٹی جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ بتاؤ کہ تم مکاؤ کے کس ہوٹل میں قیام کرنے کا ارادہ رکھتی ہو؟“

”وان مین ہوٹل میں ٹھہریں گے۔ ہیروں کی وصولیابی کے لیے دو سری پائل کا آدمی ہم سے وہیں رابطہ کرے گا۔“ اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”ذرا میں مل کو بھی یہ خوش خبری سنا دوں تاکہ اس کا ذہنی دباؤ کم ہو سکے۔“

چلتے چلتے وہ پھر واپس آئی اور بولی۔ ”اب میں اپنی سیٹ پر رہوں گی۔ اگر فیوری پر کوئی میری نگرانی کر رہا ہے تو میرے بار بار آنے جانے سے اسے شبہ ہو جائے گا۔ باہر نکلنے تک ہمارا ایک دوسرے سے دور رہنا ہی بہتر رہے گا۔“

وہ پریشانی مجھے لاحق تھی لیکن موذینی نے آخری تجویز میں مسئلہ بھی حل کر دیا۔

حالات کی بحرور خرابی کے بعد ستارے ایک بار پھر مجھ پر مہمان ہوتے نظر آ رہے تھے۔ ایک طرف ریور چیمپ کے ڈان نیٹی کاؤ کی آمد کے پروگرام سے آگاہ کر دیا تھا اور دوسری طرف موذینی نے ایسٹریڈ سے چرائے گئے وہ شای ہیرے میرے حوالے کر دیے تھے جن میں ڈون کو ایک فومری دلچسپی لے رہا تھا۔

موذینی نے اپنے خوف کی وجہ سے نہایت آسانی کے ساتھ مجھ پر اعتماد کر لیا تھا لیکن بنیادی طور پر وہ ایک حریص لڑکی تھی۔ تعلیم کے مقدس پیشے سے وابستہ ہونے کے باوجود اس نے ایک ہیڈ رلم کے لالچ میں جرائم پیشہ لوگوں کا آلہ کار بننا منظور کر لیا تھا۔ اسی پر بھی نہیں تھا بلکہ مزید پیسہ کمانے کے لیے وہ واپسی کے سفر میں پاکستان سے دو چار کلو ہیروئن بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتی تھی تاکہ سویڈن میں اسے بیچ کر بیل کے ساتھ اپنا مستقبل سنوارنے کے منصوبے پر کام کا آغاز کر سکے۔

ایسی عورت کو قریب دینا میری دانت میں کوئی جرم نہیں تھا۔

مجھے ان پیش قہمت اور نادر ہیروں میں براہ راست کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ البتہ ان کے ذریعہ میں مجھے ہونے والے ڈون کو راہ راست پر لاسکتا تھا۔ غزالہ کے بارے میں وہ اپنی ضد پر اڑا ہوا تھا کہ صرف ویرای سے بات کرے گا لیکن ہیروں کا ذکر سن کر اسے اپنے موقف میں نرمی لانی پڑ جاتی۔ وہ ایک ایسا معاملہ تھا جس کے لیے ڈون نے مکاؤ میں بنگا بیٹا نے پر سرگرمیوں کا آغاز کیا ہوا تھا۔

ایک اعتبار سے ان ہیروں کو زرا تاوان بھی سمجھا جاسکتا تھا کیوں کہ میں ان کے بدلے میں دیگر کو ڈون کی قید سے آزادی دلانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

کچھ دیر بعد مکاؤ کے آمار نظر آنے لگے۔ اس وقت تک مری

”اور وہاں بہترین ہیروئن بھی کوڑیوں کے دام ملتی ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”ہیروپ کی منڈی کے مقابلے میں مفت ہی سمجھو۔“ میں نے اسے شہ دی۔

وہ فوراً ہی مزید کھلنے پر مجبور ہو گئی۔ ”ہم داہپی پر اپنے بیٹ کے مقابلے دو چار کلو ہیروئن ساتھ لے جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہ کوشش کا سیاب رہی تو ہمارے دن پھر جائیں گے۔ عمدہ قسم کی ہیروئن کی خریداری میں تم ہماری کوئی مدد کر سکو گے؟“

”ہم پاکستانی ہیروئن فروش نہیں ہوتا۔“ میں نے سختی کے ساتھ کہا۔ ”لیکن تم جیسی خود نازک اندام اور بے لگام لڑکیاں انہیں آسانی کے ساتھ بکا لیتی ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے تم مجھے بکا رہی ہو۔ مجھے نہ چاہیے ہوئے بھی تمہاری مدد کرنی پڑے گی۔“
”عورتوں کے معاملے میں پاکستانی عام طور پر نرید سے ثابت ہوتے ہیں۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”کیا تمہارے ملک میں عورتوں کا شدید قتل ہے؟“

”ایسا بھی قتل نہیں ہے۔ مردوں کی آبادی صرف تین فیصد ہے لیکن مذہبی اور معاشرتی پابندیوں کی وجہ سے عورتوں کی جملہ آبادی منگیت سے شروع ہو کر ہیرو پر ختم ہو جاتی ہے۔“

”اور عورتیں ان پابندیوں پر احتجاج نہیں کرتیں؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”کری نہیں سکتیں کیوں کہ مذہب نے مردوں اور عورتوں پر یکساں پابندی عائد کی ہوئی ہے۔ ہمارے میاں نفسانی اور حیوانی آزادیوں کا وہ تصور نہیں ہے جو مغرب میں سرچڑھ کر بول رہا ہے۔“

”غیر میں اس معاملے پر بحث نہیں کرنا چاہتی۔ یہ بتاؤ کہ تم نے میری تجویز کے بارے میں کیا سوچا ہے؟“ اس نے اچانک ہی موضوع بدل کر سوال کیا۔

”میں اب بھی خود کو الگ رکھنا چاہتا ہوں۔ تم ٹھہرو تو میں ڈپا لے لوں گا۔“

”اوہ تم کتنے شریف آدمی ہو۔“ وہ میرا ہاتھ دباتے ہوئے مسرت آمیز لہجے میں بولی۔ ”میرے سر پر سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہے۔ یہ کام بخیر و خوبی ہو گیا تو میں زندگی بھر تمہاری احسان مند رہوں گی۔“

”لیکن یہ امید نہ باندھ لینا کہ میں تمہارے ساتھ سویڈن بھی چلوں گا۔ میرے حصے کی رقم تمہیں ایمان داری کے ساتھ خود ہی بھیجی ہوگی۔“

اس نے اپنا شولڈر بیگ کھولا اور اس میں سے ایک براؤن پیکٹ نکال کر میرے حوالے کر دیا۔ اس پیکٹ کا وزن بمشکل ایک ڈیڑھ پونڈ رہا ہو گا۔

”مجھے بتا گیا تھا کہ اس کاغذ میں پلاسٹک کا مضبوط ڈبہ جس

شکار کھیلنے نکل پڑتا ہے۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

”تم مجھے کس ہوٹل میں لے جانے کا ارادہ رکھتے ہو؟“ میں نے سوال کیا۔

”کیوں؟“ اس نے چونک کر پوچھا۔ ”ظاہر ہے کہ میں تمہیں کسی اچھے ہوٹل میں ہی گھبراؤں گا۔“

”مجھے اچھے یا برے ہوٹل کی فکر نہیں، بس ذرا وان ریان ہوٹل سے دور رہنا چاہتا ہوں۔“

ایک ٹیکسی ہمارے قریب آ کر رکی اور ہم دونوں اس کی عقبی نشست میں دھس گئے۔ ریو پچانگ نے ڈرائیور کو چینی زبان میں ہدایات دیں اور ٹیکسی حرکت میں آئی۔

”کیا وان ریان والوں سے کوئی خطرہ محسوس کر رہے ہو؟“ اس نے مجھ سے پوچھا۔

”خطرہ نہیں، بس اپنے بوائے فرینڈ سے آگاہی ہوئی ایک لڑکی میری جان کو آگاہی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ مجھے ڈھونڈتی ہوئی میرے کمرے میں آجائے۔“

”یہ وہی خوبصورت لڑکی تو نہیں جو سارے راستے تم سے باتیں کرتی آئی ہے؟“

”اس بارے میں تم کیا جانو؟“ اس کے سوال پر میں بھونچکا ہوا گیا۔

”تم بھول رہے ہو کہ میں گولڈن ڈریمین کا کپتان ہوں۔ میں نے عملے کی دو لڑکیوں کو تمہاری خصوصی دیکھ بھال کی ہدایت کی تھی لیکن انہوں نے بتایا کہ تم نے خود اپنی دیکھ بھال کا بندوبست کیا ہوا ہے۔ اچھا ہوا کہ تم خود ہی اس سے دور بھاگ رہے ہو ورنہ وہ تمہارے لیے ناہودہ دشواریوں کا پیش خیمہ بن سکتی تھی۔“

”ڈرا مکمل کرنا دو کہ تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟“ اس کی باتوں نے مجھے الجھا کر رکھ دیا۔

”مجھے اندر کی کمائی کا علم نہیں مگر میں یہ جانتا ہوں کہ وان لین کا ایک آدمی اس جوڑے کا پیچھا کر رہا تھا۔ وان لین مکاؤ کا ایک خاصا بدنام آدمی ہے۔ وہ ڈون کا باج گزار ہونے کے باوجود ادھر ادھر ہاتھ پیر مارتا رہتا ہے۔ وان ریان ہوٹل اور کلب اسی کی ملکیت ہے اگر وہ اس جوڑے میں دلچسپی لے رہا ہے تو یقیناً کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہونے والی ہے۔“

ریو پچانگ کی باتیں سن کر مجھے دشت ہونے لگی۔ مکاؤ کے بارے میں ایسا معلوم ہو رہا تھا مجھے وہاں رہنے والے بہ آسانی ہر بات کی تہ تک پہنچ جانے کے باوجود انجان بنے رہنے کے عادی ہو گئے ہوں۔ روزی نے اپنے جس سفر کے بارے میں انتہائی رازداری کے ساتھ کام کیا تھا۔ اس کے بارے میں ریو پچانگ نے دور رس سے بہت کچھ جان لیا تھا۔ عین ممکن تھا کہ کشم والے بھی اسی انداز میں اس پر ہاتھ ڈال دیتے۔

رات ہو چکی تھی۔ فیوری پر تمام روشنیاں بجلی ہوئی تھیں اور دور مکاؤ میں اس قدر روشنی ہو رہی تھی کہ اس کا عکس فضا تک کو منور کیے ہوئے تھا۔ روشنیوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ مکاؤ میں بلند عمارات کی تعداد بہت کم تھی۔

مکاؤ کے ساحل کے ساتھ، مکاؤیوں میں بے شمار کشتیاں اور موٹر بوس نظر انداز تھیں۔ ان میں سے بعض ساحل سے اتنی دور تھیں کہ ان سے متصل دس باغ کشتیوں پر سے گزر کر ہی ساحل تک پہنچا جاسکتا تھا۔ ساحل پر جگہ کی کمی کے باعث وہ کشتیاں قطار در قطار نظر انداز تھیں۔ بعض پر سامان لدا ہوا تھا۔ کچھ خالی تھیں۔

اس نیم تاریک حصے میں ہر قسم کی سرگرمیاں دیکھی جاسکتی تھیں۔ فیوری وہاں سے آگے بڑھتی جلی گئی اور پھر چوٹی بیٹی کے ساتھ جا لگی۔ ملاحقوں نے اسکر راڈز کے ذریعے فیوری کو بیٹی کے ساتھ برابر کیا اور پھر ریپ گرتے ہی سامان سے لے کر پھندے مسافروں نے ایک بیڑی کی صورت میں فیوری سے اترا شروع کر دیا۔

روزنی اور پٹی پیچھے تھے۔ میں نے ان کے گزرنے کا انتظار کیے بغیر اپنی جگہ چھوڑ دی۔ اس وقت تک بل سے میرا سامنا نہیں ہوا تھا اور میرے نئے پردگرم کی روشنی میں، میرا اس کی نظروں میں نہ آتا ہی بہتر تھا۔

ریو پچانگ فیوری کے انجن بند کروانے کے بعد امپریک کے ریپ پر کھڑا، مسافروں کو الوداع کہہ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے مجھے اپنا انتظار کرنے کی یاد دہانی کرائی اور میں ہاتھ ہلاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

کشم ہال میں بالکل وہی منظر تھا جو روزنی مجھے بتا چکی تھی۔ دو کشم افسر، مسافروں کی گزرگاہ کے دونوں طرف کھڑے سفید فام مسافروں کو الگ کر رہے تھے۔ چینی اور دیگر نسلوں سے تعلق رکھنے والے افراد کو براہ راست باہر نکلنے کی آزادی تھی۔ الگ کیے جانے والے سفید فام ایک لمبی سی میز پر جمع ہو رہے تھے جہاں ان کے دینی سامان سے لے کر لباس تک کی سخت تلاشی لی جا رہی تھی۔

میں کسی روک ٹوک کے بغیر باہر نکل گیا۔ بیڑیوں کے پمکٹ کے ساتھ ہی، میری بیگ من بھی کشم والوں کی دست برد سے محفوظ رہی تھی اور وہ میرے لیے بہت بڑی کامیابی تھی۔

باہر نکلنے ہی چند چینی دلالوں کا ایک گروہ میری طرف لپکا۔ وہ رنے رٹائے انگریزی فقرہوں میں ٹیکسی اور ہوٹل وغیرہ کی پیشکش کر رہے تھے لیکن میں ان سے جان چھڑا کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

چند منٹ بعد ہی ریو پچانگ اپنا کوٹ بازو پر لیے آموچو ہوا۔

”اب یہاں سے نکل چلو۔“ میں اس کا بازو تھام کر بولا۔

”میں فوراً بہتر کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں۔“

”مگر نہ کوسہ رات ہوتے ہی مکاؤ کے ہوٹلوں کے سرپرست راز کھلنے شروع ہو جاتے ہیں۔ ایسے وقت، ہر شخص بہتر چھوڑ کر

سوال کیا گیا۔

”میں پاکستان سے آیا ہوں اور اس وقت مکاؤ میں موجود ہوں۔ ڈون کی سیکرٹری میرے معاملات سے واقف ہے۔ میں ہر ایک کے سامنے زبان نہیں کھول سکتا۔“

”ہنگ آں!“ انگریزوں کی نقل کرتے ہوئے کہا گیا، پھر ریسور پر نہایت الجھتی موسیقی سنائی دینے لگی۔ چند لمحوں بعد ہی وہ لائن شوائے کو منتقل ہو چکی تھی۔

”بالکل نہیں۔“ میرا مطالبہ سنتے ہی شوائے نے سرد مری سے

کہا۔ ”اس وقت ڈون سے بات ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ وہ آرام کرنے جا چکا ہے اگر تم ڈیٹ بن کر مکاؤ آئی گے ہو تو میں ڈون سے دریافت کر لوں گی۔ اس نے اجازت دی تو تمہاری بات کرا دی جائے گی۔ تم صبح نو بجے فون کرنا۔“

”معاذ بہت اہم۔“ میں نے بولنا چاہا لیکن شوائے نے رکھائی سے میری بات کاٹ دی۔

”سوری! اپنا اور میرا وقت برباد مت کرو۔ مکاؤ کی راتیں انہنیوں کے لیے بہت رنگین اور منشی خیز ہوتی ہیں۔ ابھی عیش کرو۔ صبح اپنا مقدر آزمایا۔ ڈون کا موڈ ہوا تو تمہاری اور اس کی بات ہو جائے گی۔“

”یہ دوسرا معاملہ ہے۔“ اس بار میں نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔ ”اس کا تعلق ایئر سٹزم کے ہیروں سے ہے۔“

تشویش کی بات یہ تھی کہ جب موڈزنی کے پاس سے میرے آئینہ ہوتے تو وان لن کے کیپ میں لپٹ جاتی اور ان دونوں کا تعاقب کرنے والا شخص میری تلاش شروع کر دیتا۔

مکاؤ میں رنگ برنگی عمارات پر محکمہ ساکن اور ناچتی ہوئی تیز روشنیوں کے سائن بورڈ آویزاں تھے اور ان روشنیوں کے سامنے میں سوئیں اور فٹ پاؤں پر ہجوم نظر آ رہی تھیں۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ عام شہر کے بجائے کوئی رنگا رنگ میلہ ہو جانا۔ بھانت بھانت کے لوگ سٹ آئے ہوں۔

ہنگ کلب نامی عمارت کے سامنے عیسوی رک گئی۔ پورٹرنے فرما رہی میرا ہنگ سائوٹ کیس لے لیا۔ ہم اندر داخل ہوئے تو وہاں ہوش رہا ماحول کا سامنا کرنا بڑا۔ لاؤنج میں متعدد خورو عورتیں بن سنور کر نیچے گر بائوں والے بھگندہ رلباس پہنے سگریٹ اور شراب نوشی میں مصروف تھیں۔ ان میں سے کئی نے ریور چینگ کو دیکھ کر شائے کے انداز میں ہاتھ ہلائے۔ ایک دوئے آنکھ بھی ماری اور ریور چینگ سیدھا کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا۔

اس کلب کی عمارت کے اندر دینی جھے میں شاید ڈسکو دنیو کا پروگرام بھی چل رہا تھا کیوں کہ ڈرم اور تیز سازنیوں کی دھمک فرش میں محسوس ہو رہی تھی۔ ساؤنڈ پرو تنک کی عمدگی کی وجہ سے اندر کی تیز آوازیں باہر نہیں سنائی دے رہی تھیں۔

مکاؤ میں جرائم پیشہ افراد جس انداز میں منظم تھے اس کے پیش نظر مجھے پورا یقین تھا کہ موڈزنی کے ذریعے میری چال بازی سے واقف ہونے کے بعد وان لن یا اس کے آدمیوں کو مجھ تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ دوسری طرف میں ڈون سے بات کرنے سے پہلے ریور چینگ کو اعتماد میں نہیں لے سکتا تھا۔ وہ مجھے رووٹا کا دوست اور من چلا سیاح سمجھ کر میری مسمان داری کر رہا تھا اسے میرے چکروں کا علم ہوتا تو وہ بدک کر مجھے اس دعوت نامے سے بھی محروم کر سکتا تھا جس کے سارے میں ڈون کی حویلی میں پہنچ سکتا تھا۔

ہنگ کلب میں میرا کراہک کرانے کے بعد ریور چینگ لابی سے ہی واپس چلا گیا اور میں نے اپنے کمرے میں پہنچنے ہی سب سے پہلے ہنگ من سوٹ کیس سے نکال کر اپنی جیب میں رکھ لی تاکہ ضرورت کے وقت میں اس سے بھرپور کام لے سکوں۔ میرے لیے صورت حال ایک بیک نازک اور مخدوش ہو گئی تھی۔

اپنا کراہقتل کر کے میں نے فون پر ڈون کی حویلی کا نمبر ملایا تو دوسری طرف سے ایک مردانہ آواز سنائی دی، شاید ڈون کے انجینئر پر مقامی فون کالز کے لیے کوئی حفاظتی نظام یا اسکیئر نصب نہیں تھا۔

”میرا نام ڈون ہے اور میں ڈون سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“ میں نے چینی کے جواب میں انگریزی میں کہا۔

”ڈون مصروف ہے، تمہیں کیا کام ہے؟“ خشک لہجے میں



ٹیلی پیٹھی
کی

جدید تحقیقات



ہے۔

لہ بھر کے لئے میرا اعتماد متزلزل ہو گیا۔ روزنی نے مجھے سر ہنڈ پکٹ دیا تھا۔ میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس میں ہیرے ہی تھے یا ان کے دزن کے پتھر رکے ہوئے تھے۔

”میں نے وہ سر ہنڈ پکٹ حاصل کیا ہے جسے وہ دونوں اپنی جان سے لگائے پھر رہے تھے۔ تم اجازت دو تو میں ڈبا کھول کر دیکھ لوں کہ اندر ہیرے ہی ہیں یا کچھ اور بھرا ہوا ہے۔“

”اے چھینڑنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“ تفصیل جاننے کے بعد دونوں کے غصے میں قدرے کمی آگئی ”اگر وہ ہیرے ہی ہیں تو اب تم لڑکی اور اس کے ساتھی کی آزادی کے لئے سووے بازی کرو گے؟“

”ہرگز نہیں!“ میں نے جلدی سے کہا ”شاید تمہیں علم ہوگا کہ ان ہیروں کی ماییت چالس کروڈ گڈرز کے لگ بھگ ہے مگر انہیں بچنا میری سباط سے باہر ہے۔ میرے پاس وہ پکٹ تمہاری امانت ہے۔ تم جاہو تو میں ابھی وہ پکٹ تمہارے محل پہنچائے دیتا ہوں۔ جب تمہارا غصہ فرو ہوگا تو تم ان دونوں کو خودی ہا کر دو گے۔ میری یہ مجال کہاں کہ تم کے کوئی سووے بازی کروں۔“

”تم کہاں گھرے ہوئے ہو؟“ میری چالپوسی سے وہ بندرتاج نرم پڑنا جا رہا تھا۔

میں نے اسے ہوش کا نام اور کیرا نمبر بتایا تو وہ بولا ”میرے آوی ابھی بنگہ کلب کے مالک کو مطلع کر دیں گے کہ تم میرے مسمان ہو۔ پھر کوئی تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکے گا۔“

وان لن کے آوی ابھی گئے تو ہوش والے انہیں باہری روک لیں گے۔ میں تمہارے لئے گاڑی بھیج رہا ہوں۔“

میرا دل خوشی سے لہلہا اچھل پڑا۔ میں نے اپنی خوشی پر قابو پاتے ہوئے کہا ”میں اس عزت افزائی کے لئے تمہارا ممنون ہوں“

دون۔ لیکن میں تمہارے ڈرائیور کو کیسے پہچانوں گا؟“

”وہ موٹا جا پانی ہے۔ اس کا نام فلوڈا ہے“ میں تمہارا انتظار کروں گا۔“

میں نے اس کی طرف سے سلسلہ منقطع ہونے پر ریسیور رکھ لیا پر رکھ دیا۔ میں نے روزنی کے اعتماد کو دھوکا دے کر بہت برا بھلا کھلا تھا۔ مجھے خوشی تھی کہ میرا تہنشانے پر بیٹھا تھا اور دونوں میری پیشوائی کے لئے آمادہ ہو گیا تھا۔ اس نے ہیروں کی تلاش میں جو جال بچھایا ہوا تھا اس کی موجودگی میں یہ بات یقینی نظر آتی تھی کہ روزنی کسی بھی صورت میں اپنے مشن میں کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ ہیرے ہر حالت میں دونوں تک پہنچتے تھے۔ یہ اور بات تھی کہ دونوں کے سارے حکار اپنی بنیاں سنبھالے بیٹھے رہے تھے اور میں نے دیدہ دلیری کے ساتھ ان کا شکار آؤا کر دونوں کو رام کرنے کا سامان تیار کر لیا تھا۔

چند منٹ بعد ہی میرے کمرے میں گھونپا زلزلہ آیا۔ ہوش کا

”اودہ تو اب تم نے دونوں کے معاملات میں بھی اپنی ٹانگ اڑانی شروع کر دی!“ شوائے کی غصیلی آواز ابھری۔ وہ سیکریٹری ہونے کی وجہ سے شاید دونوں کے بہت سے رازوں سے واقف تھی۔

”اس وقت دونوں سے میری بات نہیں ہوئی تو کسی بھی لمحے دشمن مجھے گھیر لیں گے۔ وان لن کے کتے شرمیں چاروں طرف میرے خون کی بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ انہیں میرے ہوش کا سراغ لگانے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ تم دونوں سے دریافت کر لو۔ بات کرنا یا نہ کرنا اس پر منحصر ہوگا۔“

اس بار شوائے نے قطع کلائی کیے بغیر میری پوری بات سنی نہیں نے ریور چپانک سے سنا ہوا نام زبردستی اپنی کمانی میں ڈال دیا تھا تاکہ میں شوائے پر دباؤ ڈال سکوں اور یہی ہوا۔ میرے خاموش ہونے پر وہ بولی۔ ”اس کا مطلب ہے کہ تم اس معاملے کے بارے میں واقعی کچھ جان چکے ہو۔ تم ہولڈ کر۔ میں دونوں سے بات کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ اسی کے ساتھ ریسیور پر ایک بار پھر رقت آمیز چینی موسیقی شروع ہو گئی۔

خامسے طویل وقفے کے بعد اس موسیقی کا سلسلہ ختم ہوا اور اچانک ہی میرے کان میں کسی بھیڑیے جیسی تیز اور درشت غراہٹ ابھری۔ ”ہا۔۔۔ آ۔۔۔ لو! تم کسی کی اجازت سے مکاؤ آئے ہو اور ہیروں کے بارے میں تم نے کہاں سنا ہے؟“

”دون! میں تمہارے پیر پکڑ کر تم سے اس توہین کی معافی مانگتے آیا ہوں جو غزالہ کی وجہ سے تم کو برداشت کرنی پڑی لیکن اسی اثنا میں ایک مشکوک جوڑا میری نظروں میں آگیا اور میں نے محنت کر کے یہ معلوم کر لیا کہ وہ ایسٹ سڈم سے چرائے ہوئے کچھ نادر ہیرے مکاؤ لا رہے ہیں۔“

”وہ کون لوگ ہیں؟“ میری بات کاٹ کر دونوں کی غصیلی آواز گونجی ”مجھے ان کے بارے میں بتاؤ۔ میں ان پر مکاؤ کی زمین تک کھدوں گا۔ وہ ہیرے ہر قیمت پر میری تحویل میں آئیں گے۔“

”مجھے معلوم تھا کہ تم ان ہیروں میں دلچسپی لے رہے ہو جب کہ وہ دونوں وان لن کے لئے کام کر رہے ہیں۔“ میں نے بات کو دانستہ طور پر دیتے ہوئے کہا۔

”مجھے یہ سب نہ بتاؤ۔ میں ہزار آنکھیں رکھتا ہوں۔ میں اس جوڑے کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں جو ہیرے لے کر مکاؤ پہنچا ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ یہ خبر دوسرے ذرائع سے کیوں نہیں آئی۔ میں نے ہیروں کی تلاش میں مکاؤ کی تمام داخلی سرحدوں کی تاکہ بندی کر لی ہوئی ہے۔“ اس کے غصے پر بھلاہٹ غالب آگئی۔

”اس جوڑے پر برا وقت آیا ہوا ہوگا“ دون! وہ ہیرے تمہارے اس غلام کے گھنے میں ہیں۔“

”بات؟“ وہ شاید حیرت سے حلق کے نکل رہا تھا ”کیس تم بھگت تو نہیں بنی گئے ہو؟ میں جموٹوں کے بدن سے کمال تک اوجھڑا لیتا ہوں۔ شاید اس لڑکی کے فراق میں تمہارا داغ چل گیا

چلانے میں دیر لے نہیں کموں گا۔

اس کی آنکھوں میں ناچتی ہوئی دیوانگی دیکھ کر میں نے ہاتھ اٹھائے۔

”مشرطان لہن!“ اچانک حرم نے خوف سے طلق میں بھستی ہوئی آواز میں پست قامت کو مخاطب کیا ”تم بہت ٹھہین غلطی کے مرتکب ہو رہے ہو۔ یہ ڈون کا خاص مہمان ہے۔“

اگر وہ دان لہن ہی تھا تو وہ میری توقع سے کہیں زیادہ سرعت کے ساتھ حرکت میں آیا تھا۔

اس نے دانت پیس کر ڈون کو ایک موٹی سی گالی دی پھر بولا۔ ”میں نے ساری عمر ڈون کی زیادتیاں برداشت کی ہیں۔ اب میں اس کی چیروہ دشتیاں نہیں سہہ سکتا۔ میں اس کے منہ پر پہلا اور آخری تھپڑ مار کر اس علاقے کو خیر باد کہہ دوں گا۔“ پھر اس کی شعلے برساتی ہوئی نگاہیں میرے اوپر مرکوز ہو گئیں ”وہ پکٹ کہاں ہے؟“

”میری جیب میں۔“ میں نے اس پر سے نظریں ہٹائے بغیر پورے سکون کے ساتھ کہا۔

”کھلاؤ!“ اس نے اضطرابی لہجے میں حکم دیا ”کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو تیسری ڈھیر کر دوں گا۔“

ہیروں کا پکٹ میری اندرونی جیب میں تھا۔ میں نے آہستگی کے ساتھ اس جیب میں ہاتھ ڈالا جس میں بیم گن پڑی ہوئی تھی لیکن میں بیم گن نکالنے کی ہمت نہیں کر سکا کیونکہ دان لہن کے ہتھول کی نال براہ راست میرے سینے کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ اس کی انگلی کا خفیف سا اشارہ میرا کام تمام کرنے کے لئے کافی ہوتا۔

اسے پوری طرح میری طرف متوجہ پا کر وائنگ ماؤ کے ملازمین میں سے ایک نے دسپے قدموں دان لہن کی طرف بڑھنا چاہا لیکن وہ غبیث بیک وقت ہر طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ بھڑک کر پلٹا اور میرے لئے وہی ایک لہجہ کارگر ثابت ہوا۔ میں نے بجلی کی سی سرعت سے بیم گن نکال کر دان لہن کے بائیں پلو پر غائر کر دیا۔

بیم گن کے نوزل سے موت کی نیکیوں شعاعیں کوئی آواز پیدا کئے بغیر دان لہن کی طرف لپکیں۔ میری طرف دیکھنے والوں کی آنکھیں دہشت سے اٹلی پڑیں اور پھر دان لہن ایک بجلی سی چمک کے ساتھ قاتلین پر گر کر مایا بے آب کی طرح تر پڑے لگا۔ میں نے بڑھ کر اگس کا بھرا ہوا ہتھول اپنے قبضے میں لے لیا۔

چند ثانیوں بعد دان لہن نے سسک سسک کر دم توڑ دیا۔ اس واقعہ پر وائنگ ماؤ اور اس کے آدمیوں کی زبانیں دہشت سے تنگ ہو کر رہ گئی تھیں۔ انہیں مرعوب کرنے کے لئے میں نے ٹھوکرے دان لہن کا چوسیدہ حاکیا بھر پڑھ کر اپنے کمرے کا کھلا ہوا دروازہ بند کر دیا۔

”یہاں جو کچھ ہوا ہے“ اسے تم سب بالکل بھول جاؤ گے۔“

اور میرا ملک ہانپتا کاٹتا ہوا میرے کمرے میں پہنچا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر چینی زبان میں کچھ منسنانے لگا۔ اس کے پیچھے ہوٹل کے چار ملازمین بھی تھے۔ ان میں سے تین کے ہاتھوں میں تے تولے، براتی چادریں اور دیگر اشیاء تھیں۔ وہ تیزوں فوراً ہی کمرے کی ہر چیز بدلنے میں مصروف ہو گئے۔ چوتھا جو ہوٹل کا استقبالیہ کلرک تھا، زبانی کے فرائض ادا کرنے کے لئے اپنے آقا کے ساتھ ہی کھڑا رہا۔

اس نے مجھے بتایا کہ وائنگ ماؤ نامی وہ شخص اس بات پر معذرت کر رہا تھا کہ اسے میرے مرتبے کا علم نہیں تھا۔ اس لئے ہوٹل کے عملے سے میری شان میں کوئی گستاخی سرزد ہوئی ہو تو میں اسے معاف کر دوں۔ اسے ڈون کے محل سے فون پر بتایا گیا تھا کہ میں ڈون کا مہمان تھا اور ڈون کو مکاؤ کے بیشتر شرفا اپنا عیازی باپ تصور کرتے تھے۔ بلکہ کلب والوں کے لئے ڈون کے کسی مہمان کی میزبانی ”ایک اعزاز سے کم نہیں تھی۔“

میں نے نہایت سیر چمکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ”ان لوگوں کی ناکر وہ غلطیوں کو معاف کر دیا۔ پھر وائنگ ماؤ نے ترجمان کے کمرے پر میری دیگر ضروریات کے بارے میں استفسار کیا۔ مجھے پیشکش کی گئی کہ میں چاہوں تو میری خدمت کے لئے مساج اور دیگر خدمات میں ماہر چند گھنٹوں لڑکیوں کو میری خدمت پر مامور کیا جاسکتا تھا۔ وہ مذاکرات جاری تھے۔ تین ملازمین کمرے کو نئے سرے سے

بٹانے اور سنوارنے میں مصروف تھے کہ اچانک ہی ایک پست قامت چینی ”دوڑنی کو تقریباً گھٹیتا ہوا“ کمرے میں کھس آیا۔ ”افزاتری میں وائنگ ماؤ کے ملازمین میرے کمرے کا دروازہ بند کرنا بھول گئے تھے۔“

دوڑنی کی پہلی جھلک دیکھتے ہی میرے فرشتے کوچ کر گئے۔ ”اوجھر دوڑنی نے مجھے دیکھتے ہی ہڈیاں انداز میں ”ہمیں ہے۔ ہمیں ہے۔“ کا نمونہ لگاتے ہوئے میری طرف بھجنے کی کوشش کی مگر مجھ تک پہنچنے سے پہلے ہی بے ہوش ہو کر سانچہ قاتلین پر گر گئی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے، چہرہ دھواں ہوا تھا اور آنکھوں میں دہشت کے سائے ناچ رہے تھے شاید اصل قصہ کھانے کے بعد اس کے ساتھ نہایت بے رحمانہ سلوک کیا گیا تھا کیونکہ اس کے بھرے بھرے ”سرخ و سفید رخساروں پر تھپڑوں کا نچلا ہٹ مائل درم بہت نمایاں تھا۔“

وہاں کسی کو کچھ سمجھنے کا موقع نہیں مل سکا کیونکہ دوڑنی کو لانے والے پست قامت چینی نے اچانک ہی ہتھول نکال کر سب کو چینی زبان میں کوئی حکم دیا اور ہر شخص نے اپنی تمام سرگرمیاں موقوف کر کے اپنے ہاتھ سر سے اوپر اٹھائے۔ میں اپنی جگہ جمجھمدا کھڑا رہا۔

”ایو بائو!“ پست قامت نے جھٹلا کر ہتھول کی نال لہراتے ہوئے ”تھرا لہجے میں مجھے لگاکار“ تم بھی ہاتھ اٹھاؤ ورنہ میں کوئی

میں نے اضطراب اور مجبوری کے عالم میں ہم گمن استعمال ویر ڈالی تھی لیکن میرے ذہن میں ایک نیا خوف سوار ہو گیا تھا۔ اس وقت تک ڈون کو ایک نوکری یہ علم نہیں تھا کہ میں شی کا باغی تھا اور ان لوگوں سے جتنی ہوئی ایک بیم گمن بھی میرے قبضے میں تھی۔ اگر وان لن کی لاش پوری سے نکالی جاتی تو ڈون اس کے ذمہ پر پکلی نظر ڈالتے ہی سمجھ لیتا کہ وہ بیم گمن کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ وہ انکشاف میرے لئے بدترین پریشانیوں کو جنم دے سکتا تھا۔ ڈون لازمی طور پر یہ جاننے کی کوشش کرنا کہ میرے پاس بیم گمن کہاں سے آئی ہے میرے افکار کی صورت میں وہ کونج نکالنے کے لئے اپنے بڑے سے رجوع کرتا اور میں ہی طرح اُس کے چنگل میں پھنس کر رہ جاتا۔ جی لائیڈ کے لئے اس سے بڑی خوشی کیا ہو سکتی تھی کہ میرے ساتھ ہی میری محبوبہ اور میرا دست راست بھی گھر بیٹھے اس کی گرفت میں آجائیں۔ وان لن اور روزنی کی بے وقت مداخلت نے میرے لئے یک بیک ایک سنگین غلطوبید اکوٹا تھا جس کا کوئی حل نہیں تھا۔

میں نے وانگ ماؤ اور اس کے محلے کو رخصت کر دیا۔ اگر ٹھکانے کے آئے میں دیر تھی تو میں ڈون سے وان لن کی لاش کوئی انور ٹھکانے لگانے کی اجازت لے کر بیم گمن کے استعمال کے ثبوت کو تائید کر سکتا تھا۔ ڈون کے ایمار وانگ اور اس کے ملازمین لاش کو ٹھکانے لگانے میں میری مدد کرنے پر مجبور ہو جاتے۔ اصل بات صرف ڈون کو اپنے ڈھب پر لانے کی تھی۔

میں نے ڈون کا نمبر لایا تو اس بار شوائے نے ہی ریپورر اٹھایا اور وہ فوراً ہی میری آواز پہچان گئی۔

”مبارک ہو۔ تم نے ڈون کو مٹانے میں کامیابی حاصل کر لی لی ہے۔“

”لیکن اس کے ساتھ میں ایک مشکل میں پڑ گیا ہوں۔ میرے کمرے میں ایک لاش پڑی ہوئی ہے!“

”لاش؟“ اس کی تھوڑی آواز ابھری ”کس کی لاش؟“

”وان لن نے میرے کمرے پر دھاوا بول دیا تھا۔ وہ ڈون کو تنگی تنگی گالیاں دے رہا تھا۔ میں نے موقع ملنے ہی اسے ٹھکانے لگا دیا۔ ذرا ڈون سے میری بات کرادو۔ لاش کو ٹھکانے لگانے کے لئے مجھے اس کا مشورہ درکار ہے۔“

”یہ تو بہت بڑی خبر ہے۔ لیکن ڈون یہاں سے نکل چکا ہے۔“

”ٹھکانے کے ساتھ تمہیں لینے گیا ہے بس وہاں پہنچنا ہی ہوگا۔“

”خبرائے کا وہ انکشاف سن کر میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے اور میرا دل بے ہوش ہو کر رہ گیا۔“

میں نے باری باری ان سب کو گھورتے ہوئے ”سرد“ لہجے میں کہا۔

”وان لن یہاں آیا۔ اس نے ڈون کی شان میں، بے در پے گستاخیاں کیں اور میں نے اسے مار دیا۔ کیسے مارا؟ یہ کسی کو یاد نہیں رہے گا۔ اس واقعہ کی بجائے بھی تو تم لوگ ڈون کے عتاب سے نہیں بچ سکو گے۔“

میرے خاموش ہوتے ہی مترجم میری بات کا چینی زبان میں ترجمہ کرنے لگا۔ وہ سب کچھ پتلیوں کی طرح سر ہلا رہے تھے۔ مترجم نے شاید میری ہدایت میں کچھ موثر حاشیہ آرائی بھی کی تھی کیونکہ وہ خاصی دیر بعد خاموش ہوا تھا۔

”اس لڑکی کو کسی دوسرے غیر آباد کمرے میں ڈال دو۔“ میں نے روزنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”یہ ہوش میں آئے تو اسے بتانا کہ وان لن اسے اس کمرے میں چھوڑ گیا ہے۔ میری اور اپنی موجودگی سے صاف مکر جانا۔ لڑکی کو یہ یقین دلانا ہے کہ اس نے یہاں جو کچھ دیکھا، وہ حقیقت نہیں بلکہ اس کا خواب تھا۔“

فوری طور پر اس ہدایت کا بھی ترجمہ مع تشریح کر دیا۔ مترجم خاموش ہوا تو وانگ ماؤ ذری سخی آواز میں کچھ بولنے لگا۔

”لڑکی سے ہم وان لن کے بارے میں کیا کہیں گے اور لاش کا کیا بے گا؟“ مترجم نے وانگ ماؤ کے سوال کا ترجمہ کیا۔

”وان لن اسے چھوڑ کر چلا گیا۔ لڑکی ہوش میں آنے کے بعد جانا چاہے تو اسے عزت کے ساتھ روانہ کر دیتا۔ اس لاش کو ایک پوری میں ڈال دو“ اسے میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔“

وہ چینیوں نے مل کر ”روزنی کے مرمریں وجود کو اپنے مضبوط ساقی کے کندھے پر لا دیا پھر وہ تینوں ہی باہر نکل گئے۔ شاید مترجم نے میری ہدایت دہرانے کے ساتھ ہی انہیں کام بھی باٹ دیے تھے۔

پہلے وہ چینی آئے اور وانگ ماؤ کو اپنی کارکردگی کی رپورٹ دینے لگے۔ پھر تیسرا شخص بھی وہ خالی بولیاں لے آیا۔ وہ تینوں

وان لن کی لاش کو چھوتے ہوئے بہت خائف نظر آرہے تھے۔ ان کی دہشت زدہ نظریں اس لاش کے کوئلہ بنے ہوئے پہلو پر مرکوز تھیں۔ جہاں خون کے کسی قطرہ تک کا نشانہ نہیں تھا۔

اس وقت وان لن کی لاش تازہ اور گرم تھی اس لئے انہیں اس کے ہاتھ پر موڑ کر پوری کے نچلے حصے میں ٹھونسنے میں زیادہ وقت نہیں ہوئی۔ خالی پوری لاش کے اوپر ٹھونسنے کے بعد انہوں نے ٹائیلوں کی مضبوط ڈوری سے پوری کا منہ باندھ دیا۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات گیارہویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں